جام ساقی / کمیونسٹ سازش کیس

(1980 تا 1987)

عدالتی کارروائی



اسلم خواجہ

جام ساقی / کمیونسٹ سازش کیس

(1980 تا 1987)

عدالتی کاروائی

اسلم خواجہ

پروگریسو کتاب پبلشرز، کراچی

جام ساقی/ کمیونسٹ سازش کیس

(1980 تا 1987) عدالتی کاروائی

اسلم خواجہ

اشاعت: 2022

پبلشرز: پروگریسو کتاب پبلشرز، کراچی

ٹائٹل تصویر: زاہد حسین

تمام ''سازشیوں'' کے نام
جنہوں نے دنیا کو بدلنے کے
سپنے دیکھے

فہرست

سازش کے مقدمے کا پس منظر

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں سال 1977 انتہائی اہم واقعات کا حامل رہا ہے جس کی ابتدا جنوری میں ذوالفقار علی بھٹو کی جانب سے قبل از وقت عام انتخابات کا اعلان کرانے سے ہوئی۔ اپنے مقررہ وقت سے ایک سال قبل ہونے والے ان انتخابات کا سبب بنیادی طور پر دو عوامل کو سمجھا جاتا ہے، ایک تو بھٹو ملک بھر میں انتہائی مقبول رہنما تھے جبکہ ان کے مخالفین تتر بتر اور کسی ہم آہنگ اتحاد سے محروم تھے۔ تاہم، مارچ کے مہینے میں انتخابات منعقد کرانے کے اعلان کے فوراً بعد حزبِ مخالف کی جماعتوں نے خود کو مولانا مفتی محمود کی قیادت میں قائم ہونے والے پاکستان قومی اتحاد میں منظّم کیا جو کہ جماعت اسلامی، جمعیت العلماء پاکستان اور جمعیت العلماء اسلام جیسی دائیں بازو، تحریکِ استقلال جیسی میانہ رو اور کالعدم نیشنل عوامی پارٹی کے متبادل کے طور پر قوم پرستانہ اور ترقی پسندانہ عناصر کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی پر مشتمل تھا۔

نئے انتخابات اور پاکستان قومی اتحاد کی تشکیل کے اعلانات نے ملک بھر میں سیاسی تحرک پیدا کر دیا۔ بائیں بازو کے گروہ جو بھٹو دور میں ریاستی جبر کا شکار رہے تھے، اپنے اندرونی بحث و مباحثوں میں مصروف ہو گئے کہ آیا انہیں لبرل سوچ کے حامل تاہم سویلین آمر ذوالفقار علی بھٹو کی حمایت کرنی چاہیئے یا مجموعی طور پر دائیں بازو کے رجحانات رکھنے والے قومی اتحاد کا ساتھ دینا چاہیئے، جس کے پروگرام کے اہم نکات میں ملک میں نظامِ مصطفیٰ نافذ کرنا بھی شامل تھا۔

ڈاکٹر ناظر محمود اپنے اخباری مضمون ''1977 کے عام انتخابات'' میں لکھتے ہیں کہ،

’’ان کے والد محمد رشاد بھٹو کے حمایتی نہ ہونے کے باوجود ملاؤں کی حمایت کرنے سے انکاری تھے جو کہ ملنے کے لیے آنے والے دیگر کامریڈز کو پسند نہیں تھا اور وہ ان سے این ڈی پی سے تعلق رکھنے کی بنا پر پاکستان قومی اتحاد کی حمایت کرنے کے متقاضی تھے۔‘‘ ناظر محمود کے مطابق زندگی میں پہلی مرتبہ ان کے والد کو سی آئی اے کا ایجنٹ، پرولتاریہ کے نظریات کا غدار اور پیٹی بورژوا دکاندار قرار دیا گیا، جنہوں نے اپنا طبقاتی کردار تبدیل کر کے انقلاب کے مقاصد سے غداری کا ارتکاب کیا ہے۔(بحوالہ: کتاب، ’’پاکستان: متبادل تاریخ، ناشر وین گارڈ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ 2020)

بھٹو حکومت کے آخری مہینوں کے دوران فلم ساز مشتاق گزدر اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کے تحت پاکستان بھر کا دورہ کرنے کے بعد کراچی واپس پہنچے تو انہوں نے مارکسی دانشور سبطِ حسن کو آنے والے ایام میں دائیں بازو کی بالادستی ہونے سے متعلق اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے انہیں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی قیادت کو کسی طرح دائیں بازو کا اثر رسوخ روکنے کے لیے بھٹو کے ہاتھ مضبوط کرنے کا مشورہ دینے کی غرض سے رابطہ کرنے کو کہا۔ کچھ ہی دنوں میں سبطِ حسن کا جواب تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کسی طور بھی بھٹو کا ساتھ دینے کو تیار نہیں ہے۔

کمیونسٹ پارٹی نے 1970 کے عشرے کے وسط میں اپنی عوامی تنظیموں پر مشتمل ایک ’’مزدور، طلبہ، کسان عوامی رابطہ کمیٹی‘‘ قائم کی تھی، اس کمیٹی کے پختونخواہ یونٹ نے جولائی 1977 میں جنرل ضیا کی جانب سے مسلط کردہ مارشل لا کا خیر مقدم کیا جس کی پریس ریلیز اگست 1977 کے ہفت روزہ ’’الفتح‘‘ میں بھی شائع ہوئی۔

ابتدائی تین چار ماہ کے دوران پاکستان کے لوگوں اور سیاسی جماعتوں کا خیال تھا کہ یہ مارشل لا بھٹو۔ضیا گٹھ جوڑ ہے تا کہ ملک میں قومی اتحاد کی تحریک کے نتیجے میں بھٹو کی حمایت میں ہونے والی کمی کا ازالہ کیا جاسکے تاہم آگے چل کر جب جنرل ضیا نے پیپلز پارٹی کی قیادت اور اس کے کارکنوں کے خلاف اپنی کارروائیوں کو تیز کیا تو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سمیت تمام تر سیاسی جماعتوں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ مارشل لا انتظامیہ پیپلز پارٹی کے خلاف ہی کاروائی کرتی رہے گی اور دیگر تمام سیاسی قوتیں ریاستی جبر سے محفوظ رہیں گی۔ دیگر جماعتوں بالخصوص بائیں بازو کے اکا دکا کارکنوں کی گرفتاریوں کے باوجود ان جماعتوں نے مارشل لا کو اپنے لیے کوئی خطرہ نہیں

سمجھا۔کمیونسٹ پارٹی پر پہلا سنجیدہ حملہ مئی 1978 میں حیدرآباد سے کامریڈ نذیر عباسی کی گرفتاری تھا، جو کہ کمیونسٹ پارٹی کی طلبہ تنظیم سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے مرکزی صدر ہونے کے علاوہ کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے رکن بھی تھے۔انہیں گرفتاری کے بعد کوئٹہ کے بدترین تشدد مرکز قلی کیمپ میں بدترین تشدد کے بعد متنبہ کیا گیا کہ اگر وہ سیاست جاری رکھیں گے تو انہیں زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔اس دور کے کچھ سینئر کامریڈز کا کہنا ہے کہ نذیر عباسی نے بھٹو کی پھانسی کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو سے تعزیتی ملاقات کر کے انہیں دونوں جماعتوں کے مشترکہ طور پر مارشل لا مخالف تحریک کی پیشکش بھی کی تھی، تاہم اس ضمن میں کوئی خاطر خواہ عملی صورتحال سامنے نہیں آئی۔

بعدازاں، دسمبر 1978 میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے عوامی چہرے کامریڈ جام ساقی کو حیدرآباد سے گرفتار کر کے پہلے حیدرآباد چھاونی میں واقع ٹارچر کیمپ اور بعدازاں بدنام زمانہ شاہی قلعہ لاہور منتقل کر دیا گیا۔اس گرفتاری نے کمیونسٹ پارٹی کو کسی حد تک چوکنا کر دیا، جس کے بعد اس کی مزدوروں اور طالب علموں کی تنظیموں کے رہنماؤں کی درجنوں کی تعداد میں گرفتاریاں ہوئیں۔تاہم، پارٹی پر سب سے کاری وار جولائی 1980 میں ہونے والی گرفتاریوں کی صورت میں ہوا، جن کی بنیاد پر بننے والے مقدمے کی روداد زیرِ نظر کتاب میں بیان کی گئی ہے۔کامریڈ نذیر عباسی کی شہادت کے بعد کچھ برسوں تک بلا مقدمہ قید کے بعد یہ مقدمہ شروع ہوا جس نے اولاً ملکی اور بعدازاں سیاسی رہنماؤں بالخصوص محترمہ بے نظیر بھٹو کے گواہان کے طور پر پیش ہونے کی بنا پر بین الاقوامی تشہیر حاصل کی۔دورانِ مقدمہ اس کے تمام ملزمان کو انسانی حقوق کی بین الاقوامی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل نے ضمیر کا قیدی قرار دیا۔

اس مقدمے میں ملزمان کی مرضی کے گواہان پیش ہونے اور کسی حد تک تشہیر کی اجازت ہونے کے معاملات ان دنوں سے لیکر تاحال مختلف سیاسی کارکنوں اور دانشوروں کے ہاں زیرِ بحث رہے ہیں۔اگرچہ اس ضمن میں حتمی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا تاہم عمومی آرا یہ سامنے آتی رہی ہے کہ جنرل ضیا کمیونسٹوں کے خلاف مشتہر مقدمے کے ذریعے افغان جہاد کی مدد کرنے والے مغرب کو یہ پیغام دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنے ملک میں کمیونسٹوں کے ساتھ نبرد آزما ہے جن کو

تقریباً تمام سیاسی جماعتوں کی تائید وحمایت حاصل ہے، جبکہ کمیونسٹ اس مقدمے کی تشہیر کے ذریعے نہ صرف اپنی زندگیاں محفوظ بنانا چاہتے تھے بلکہ اپنا پروگرام بھی لوگوں تک لے جانا چاہتے تھے اور جہاں تک باقی سیاسی رہنماؤں کے اس مقدمے میں گواہان کے طور پر پیش ہونے کے فائدہ کا تعلق ہے تو اُن تمام رہنماؤں کو اپنی سیاسی تنہائی سے نکلنے کا موقعہ ملا۔ یہاں یہ امر دلچسپی کا حامل ہوگا کہ کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھنے والے افراد یہ دعویٰ بھی کرتے رہے ہیں کہ 1983 میں چلنے والی ایم آر ڈی تحریک کو تحرک فراہم کرنے میں ان کے مقدمے اور اس میں سیاسی رہنماؤں کی گواہی کا ایک بہت بڑا حصہ ہے۔

کئی ماہ تک مقدمے کا فیصلہ محفوظ رکھنے کے بعد احمد کمال وارثی اور شبیر شر کو سات سال قید کی سزا دینے کے علاوہ باقی تمام ملزمان کو اس مقدمے میں بری کر دیا گیا، تاہم انہیں نظر بندی کے احکامات کے تحت بدستور قید میں رکھا گیا جہاں سے وہ سول عدالتوں میں ضمانت منظور ہونے پر رہا کیے گئے۔

دورانِ مقدمہ انتہائی تشہیر اور اس کے نتیجے میں اراکین اور حامیوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافے کے باوجود، اگست 1988 میں ایک فضائی حادثے میں جنرل ضیا کی ہلاکت کے بعد برسرِ اقتدار آنے والی جمہوری دور کے ابتدائی ایام میں ہی کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان توڑ پھوڑ کا شکار ہوگئی اور ابتدائی طور پر پارٹی کے اندر اکثریتی اور اقلیتی گروپوں میں منقسم ہونے کے بعد بالآخر پارٹی تحلیل ہی ہوگئی۔

اس مقدمے کے بڑے ملزم کامریڈ جام ساقی بعدازاں پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے اور 1993 تا 1996 وزیرِ اعلیٰ سندھ کے مشیر برائے انسانی حقوق مقرر ہوئے۔ ان کا 5 مارچ 2018 کو حیدرآباد میں انتقال ہوا۔ اس مقدمے کے دوسرے ملزم پروفیسر جمال نقوی جیل سے رہائی کے بعد کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے سیکریٹری جنرل ہوئے تاہم بعدازاں وہ کمیونزم سے دست بردار ہو گئے اور فورم برائے جمہوریت تشکیل دیتے ہوئے ملک میں جمہوریت کے استحکام کی بات کرتے رہے، جس دوران انہوں نے محترمہ بےنظیر بھٹو کے مقابلے میں نواز شریف کی ان کے سرمایہ دار ہونے کی بنا پر حمایت کی۔ بدر جمال ابڑو نے رہائی کے بعد ابتدائی

طور پر مختلف سندھی اخبارات میں بطور صحافی کام کیا اور بعدازاں وہ آرکیالوجی اور تاریخ پر اپنی تحقیق میں مصروف ہو گئے جس دوران ان کی افسانوں، آرکیالوجی، ادبی تنقید، جیل ڈائری سمیت انگنت کتب شائع ہوئیں۔ سہیل سانگی جیل سے رہائی کے بعد صحافت کی دنیا میں واپس چلے گئے اور تا حال فری لانس کالم نگار اور تجزیہ نگار کے طور پر اپنی آرا پیش کرتے رہتے ہیں۔ شبیر شر کچھ عرصہ صحافت کرنے کے بعد وکالت کے پیشے سے منسلک ہو گئے اور ایک مرحلے پر سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے مرکزی نائب صدر بھی منتخب ہوئے۔ احمد کمال وارثی بیرونِ ملک منتقل ہو گئے۔

اس مقدمے سے متعلق اولین نامکمل کتاب ''ضمیر کے قیدی'' نثار حسین نے ترتیب دیکر ضیا مارشل لا کے دوران ہی 1987 میں شائع کی، جو کہ بلاشبہ ایک جرات مندانہ اقدام تھا۔ زیرِ نظر کتاب کو اس کے تسلسل کے طور پر دیکھا جانا چاہیئے۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ کے اس اہم مقدمے کی عدالتی دستاویزات کی فراہمی پر میں اس مقدمے کے ایک ملزم بدر جمال ابڑو کا تہہ دل سے مشکور ہوں، جبکہ اسی مقدمے کے ایک اور ملزم سہیل سانگی نے کتاب کی تیاری کے ہر مرحلے پر رہنمائی فرمائی، جس پر ان کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر لازم ہوتا ہے۔

کتاب میں شامل تصویروں کی فراہمی کیلیئے میں نامور پریس فوٹو گرافر زاہد حسین اور اس تاریخی مقدمے کے ایک ملزم سہیل سانگی کا اور مقدمے میں شامل دو دیگر ملزمان بدر ابڑو اور شبیر شر کی سندھی میں شائع ہونے والی جیل ڈائریوں بالترتیب ''جیل جی ڈائری'' اور ''ڈانڈرس قیدی جی ڈائری'' کا مشکور ہوں۔

اس کتاب کی تیاری کے حوالے سے برسوں کی تگ و دو کے بعد حاصل ہونے والی عدالتی دستاویزات سے استفادہ کیا گیا ہے، تاہم یہ ممکن ہے کہ اس مقدمے سے متعلق کئی دستاویزات ہماری دسترس میں نہ آسکی ہوں، جن کو حاصل کرنے کی ہماری جستجو جاری رہے گی۔

اسلم خواجہ

کراچی

فروری، 2022

پہلی اخباری اطلاع

3 ستمبر 1980 کو ملک کے تمام اخبارات میں ایک ہی شہ سرخی اور تصویر کے ساتھ ایک خبر شائع ہوئی۔

''ملک دشمنوں کے خفیہ سیل کا انکشاف''

بڑی تعداد میں تخریبی مواد برآمد۔ کراچی اور حیدرآباد میں مجسٹریٹ کی نگرانی میں کچھ گھروں پر چھاپے۔ پانچ افراد غلام شبیر شر، احمد کمال وارثی، پروفیسر جمال نقوی، نذیر عباسی اور سہیل سانگی گرفتار۔

خفیہ سیل کا مقصد پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو مسمار کرنا اور ملکی سلامتی کو نقصان پہنچانا تھا، سرکاری اعلامیہ

تخریب پسندوں کو ایک ملک سے مالی امداد حاصل ہوئی تھی۔ نازش امروہی کے ذریعے مذکورہ ملک اور خفیہ سیل کے درمیان رابطہ تھا۔ سیل کی سرگرمیاں پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ مزید تحقیقات جاری۔

اسلام آباد-29 اگست (اپ پ-پ پ ا) آج یہاں سرکاری طور پر اعلان کیا گیا ہے کہ ایک ایسے خفیہ سیل کا پتہ لگایا گیا ہے جو گذشتہ کئی سالوں سے ایسا تخریبی لٹریچر تیار اور تقسیم کر رہا تھا جس کا مقصد پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو مسمار کرنا اور ملکی سلامتی کو نقصان پہنچانا تھا۔ انتہائی کوششوں کے بعد حکومت تخریب کاروں کے خفیہ سیل تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی۔ اس ضمن میں ایک مجسٹریٹ کی سربراہی میں سندھ پولیس نے کراچی اور حیدرآباد کے کچھ گھروں پر چھاپے

مارے، جس کے نتیجے میں سائیکلو اسٹائیل مشینیں، ٹائپ رائٹرز، خفیہ اخبارات سرخ پرچم اور ہلچل کے مسودے برآمد کیے گئے۔ علاوہ ازیں بڑی تعداد میں پمفلٹ، پوسٹر اور اشتہارات برآمد کیے گئے۔ سیل اراکین کی جانب سے تحریر کردہ خفیہ ہدایات اور خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستانی عوام کا حوصلہ پست کرنے اور پاکستان کے مستقبل پر ان کے اعتماد کو مجروح کرنے کیلئے ایک منظّم منصوبہ بندی کے ساتھ سازش تیار کی گئی ہے۔

خفیہ دستاویزات سے یہ بھی انکشاف ہوا ہے کہ ان تخریبی سرگرمیوں کی جڑیں پورے پاکستان میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس خفیہ سیل پر چھاپے اور خفیہ لٹریچر کی بازیابی کے دوران سیل کے کچھ اراکین کو گرفتار بھی کیا گیا ہے جن میں غلام شبیر شر، احمد کمال وارثی، نذیر عباسی، پروفیسر جمال الدین نقوی اور سہیل سانگی شامل ہیں۔ پولیس کے ضبط شدہ لٹریچر سے یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ ان تخریب پسند سرگرمیوں کی بیرون ممالک سے مالی امداد کی جاتی تھی اور نازش امروہی، جو اس وقت بیرونِ ملک ہیں، اس گروہ اور ایک بیرون ملک کے درمیان رابطہ کار تھے۔ مزید تحقیقات جاری ہیں۔''

رودادِ جام ساقی

اس مقدمے جو کہ بعد ازاں، جام ساقی کیس کے طور پر مشہور ہوا، کے بڑے ملزم کامریڈ جام ساقی 10 دسمبر 1978 کو حیدر آباد کے رہائشی علاقے ہیر آباد کے داؤد منیشن کی سیڑھیوں سے گرفتار ہوئے جہاں وہ اپنے ایک دوست کے گھر پر روپوشی کی حالت میں قیام پذیر تھے۔ ان کی گرفتاری کیلئے فوج کی دو گاڑیوں اور پولیس کی چار گاڑیوں نے پنجاب رجمنٹ کی 17 ویں بٹالین کے کمانڈنگ افسر کی قیادت میں منیشن کا محاصرہ کیا۔ کمانڈنگ افسر کی ذاتی طور پر موجودگی کی وجہ یہ تھی کہ سیاسی اور عسکری حلقوں میں یہ بات گرم تھی کہ کوئی بھی سندھی افسر جام ساقی کو گرفتار نہیں کرے گا۔

ایک گھنٹہ سٹی تھانہ لاکپ میں رکھنے کے بعد انہیں آنکھوں پر پٹی باندھ کر پنجاب رجمنٹ کے کوارٹر گارڈ پہنچایا گیا جہاں کچھ وقفے کے بعد انہیں کرنل رحمان اور میجر ظہیر نے پیشکش کی کہ اگر وہ سیاست سے کنارہ کش ہو جائیں تو انہیں رہا کر دیا جائے گا، اس سے انکار پر انہیں دوسری پیشکش کی گئی کہ اگر وہ سردار شیر باز مزاری کی زیرِ صدارت نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی (NDP) میں شمولیت اختیار کریں تو حکومت نہ صرف انہیں رہا کر دیگی بلکہ نفع بخش کاروبار، زمین یا نقد رقم بھی فراہم کریگی تا کہ وہ پر آسائش زندگی گذار سکیں۔

دس دن تک حیدر آباد چھاؤنی میں رکھنے کے بعد انہیں 20 دسمبر کو کراچی میں واقع ایف آئی یو/ایف آئی سی 715 کی اذیت گاہ منتقل کیا گیا جہاں پر انہیں مسلسل جگانے کے ساتھ شدید زدوکوب بھی کیا گیا۔ انہیں 20 دسمبر کو اپنی نظر کی عینک سے محروم کیا گیا جس کیلئے ڈاکٹر کا

انہیں مشورہ تھا کہ مسلسل لگائی جائے بصورت دیگر انکی بینائی جانے کا خدشہ ہوگا۔ یہ عینک فروری 1979 کے پہلے ہفتے میں واپس کی گئی۔ دسمبر اور جنوری کی سرد راتوں میں ان پر یخ بستہ ٹھنڈا پانی ڈالا گیا اور اکثر اوقات انکے سر، بازؤں اور موچھوں کے بال بھی نوچے گئے۔

دورانِ حراست ان پر بنگال میں فوجی آپریشن کا مخالف ہونے پر خصوصی طور پر تشدد کیا جاتا رہا۔ ایک مرحلے پر انہیں دھمکی دی گئی کہ اگر انہوں نے پانچ وقت کی نماز ادا نہیں کی تو انہیں ہلاک کر دیا جائے گا۔ اس دوران انکی بیگم مائی سُکھاں پر بداخلاقی کے الزامات عائد کیے گئے جبکہ وہ جام ساقی کی گرفتاری کے بعد انکی ہلاکت سے متعلق افواہوں پر دلبرداشتہ ہوکر تھر کے اپنے آبائی قصبے کے کنویں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر چکی تھیں۔

دورانِ حراست اُن پر سوویت جاسوسی ادارے کے جی بی سے افغانستان کے ذریعے اسلحہ حاصل کرنے اور پاکستانی فوج کے افسران کو بائیں بازو کے حامی انقلاب کیلئے بغاوت پر اُکسانے کا الزام عائد کیا گیا۔

7 مارچ کو پاکستان ورکرز فیڈریشن کے جنرل سیکریٹری شمیم واسطی اور نورالدین سرکی ایڈووکیٹ کی سندھ ہائی کورٹ کے حکم پر جام ساقی کے ساتھ ایک ملاقات کرائی گئی۔ ایف آئی یو کے ایک میجر کی موجودگی میں ہونے والی اس ملاقات کے دوران قیدی اور ان کے درخواست گذار اور وکیل کو مقدمے سے متعلق گفتگو کرنے سے روک دیا گیا۔ اسی شام انہیں انتہائی ڈرامائی انداز میں بذریعہ ہوائی جہاز لاہور منتقل کیا گیا جہاں بدنام زمانہ لاہور شاہی قلعہ کی اذیت گاہ ان کی منتظر تھی۔

قیدِ تنہائی میں ابھی ہلکا پھلکا تشدد شروع ہوا ہی تھا کہ کسی طرح جام ساقی کے شاہی قلعے میں قید ہونے کی اطلاع باہر سیاسی کارکنوں تک پہنچ گئی اور اندرونِ ملک تو بہت کم لیکن دنیا بھر، بالخصوص سوشلسٹ ممالک میں انکی رہائی کیلئے مظاہروں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ اسی دوران لاہور ہائی کورٹ نے انہیں اپنے ایک وکیل چوہدری اصغر خادم سے سی آئی ڈی کے ایک ڈی ایس پی اور دو انسپکٹروں کی موجودگی میں ملاقات کی اجازت دی۔

مارچ 1979 میں اُس وقت دلچسپ صورتحال پیدا ہوئی جب دورانِ تفتیش کامریڈ جام ساقی نے فوجی اہلکاروں کے اس دعویٰ کہ رواں سال کے دوران جنرل ضیا عام انتخابات کرائیں گے، شرطیہ انداز میں کہا کہ اگر جنرل ضیا انتخابات منعقد کرائے گا تو وہ سیاست سے دستبردار ہوجائیں گے۔ حالات نے جام ساقی کے سیاسی شعور کو درست ثابت کیا اور جنرل ضیا ایک مرتبہ پھر اکتوبر 1979 میں عام انتخابات منعقد کرانے کے اپنے وعدے سے منکر ہوگیا۔

لاہور ہائی کورٹ نے انہیں رسائل کا مطالعہ کرنے کی اجازت تو دی تاہم شرط عائد کی کہ یہ سیاسی رسالے جماعت اسلامی کی جانب سے شائع کردہ ہی ہوں۔

تقریباً چار ماہ تک لاہور کے شاہی قلعے کی اذیت گاہ میں قید رکھنے کے بعد 15 جولائی کو جام ساقی کراچی منتقل کیے گئے۔ اگرچہ حیدرآباد پولیس ہوم سیکریٹری کے احکامات کے تحت انہیں حیدرآباد سینٹرل جیل منتقل کرنے کے تحریری احکامات کے ساتھ کراچی ایئرپورٹ پر موجود تھی تاہم کورکمانڈر کے احکامات پر ایف آئی یو کے اہلکاروں نے انہیں اپنی حراست میں لے لیا۔

لاہور ہائی کورٹ کے واضع احکامات کے باوجود انہیں اخبارات اور رسائل سے محروم رکھا گیا تو کامریڈ جام ساقی نے احتجاجاً بھوک ہڑتال کردی، جسکے پانچویں دن انہیں صرف روزنامہ جنگ اور کچھ رسائل کی فراہمی کی یقین دہانی کرائی گئی تاہم ان پر یہ واضع کیا گیا کہ انہیں کوئی بھی سندھی اخبار یا رسالہ، بشمول حکومتی سرپرستی میں سندھی ادبی بورڈ کے تحت شائع ہونے والا رسالہ 'مہران' بھی نہیں دیا جائے گا۔

گیارہ ستمبر کو ان کی اپنے والد محمد سچل سے ملاقات کرائی گئی۔ یہ ملاقات کامریڈ جام ساقی کیلئے اذیت کا باعث بنی کہ اس ملاقات کے دوران انہیں اپنی محبوب بیوی مائی سکھاں کی اپنے فراق میں خودکشی کرنے کا علم ہوا۔

22 نومبر کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر انہیں حیدرآباد لاکر 17 ویں پنجاب، 23 ویں بلوچ کی تحویل میں قید تنہائی میں رکھا گیا۔ 10 فروری 1979 کو انھوں نے اہلکاروں کو نوٹس دیا کہ اگر فوجی اہلکاروں سے حاصل شدہ معلومات کے تحت انہیں جنگی قیدیوں سے متعلق پاکستانی

ضوابط کے تحت ایک ماہ میں چھ خط لکھنے، اخبارات اور رسائل پڑھنے، ھلال احمر کو خون کا عطیہ کرنے اور ریڈیو رکھنے کی اجازت نہ دی گئی تو وہ 14 فروری سے بھوک ہڑتال کر دیں گے، بعدازاں انہوں نے اپنے مطالبات میں مقدمہ چلانے یا عدالتی تحویل میں جیل منتقلی کی شرائط بھی شامل کیں۔14 فروری سے شروع ہونے والی اس بھوک ہڑتال کے نتیجے میں انہیں 27 فروری کو حیدرآباد جیل منتقل کیا گیا تاہم قید تنہائی میں رکھ کر، اپنے والدین کو خط لکھنے یا جیل کے عملے یا قیدیوں سے کسی نوعیت کی بات چیت کرنے کی ممانعت کی گئی۔

بعدازاں حیدرآباد میں قائم کی گئی ایک خصوصی فوجی عدالت میں مقدمہ چلا کر انہیں دس سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔

ان کی گرفتاری کے تقریباً سوا دو سو سال بعد کراچی سے دیگر ترقی پسند کارکنوں کی گرفتاری کے بعد انہیں ’کمیونسٹ سازش کیس‘ میں بھی شامل کیا گیا۔

بدر ابڑو پر کیا بیتی؟

بدر ابڑو جیل ڈائری میں اپنی گرفتاری کے روداد کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''یہ چار نومبر کی دوپہر تھی، دوپہر کے دو بج چکے تھے، دنیا کی ہر چیز اپنے محور پر گردش میں تھی۔

اچانک دفتر کے بیرونی کمرے کا دروازہ زور سے کھلا اور دو انتہائی طویل القامت اور موٹے تگڑے اشخاص اندر داخل ہوئے، ان کے پیچھے ایک دبلا پتلا، چھوٹی سفید داڑھی اور سفید کپڑے پہنے ہوئے ایک شخص ہاتھوں میں ایک رجسٹر اٹھائے داخل ہوا۔ دونوں موٹے تگڑے افراد یقیناً کسی فورس سے متعلقہ ہوں گے۔ میرا اندازہ ایف آئی اے یا امیگریشن سے متعلق تھا تاہم ذہن کے کسی کونے میں بار بار نذیر عباسی کے حوالے سے سوال اٹھ رہے تھے۔

28-29 جولائی کو کامریڈ نذیر عباسی، پروفیسر جمال نقوی، سہیل سانگی، کمال وارثی اور شبیر شر خفیہ فوجی کاروائی کے ذریعے گرفتار کیے گئے تھے۔ امر لال ستمبر کے اواخر میں حیدرآباد سے گرفتار ہوئے تھے۔ ابتدا میں یہ اطلاعات تھیں کہ امر لال کے سوا دیگر تمام افراد کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا ہے جبکہ امر لال پر کسی نامعلوم مقام پر تشدد کیا جا رہا ہے۔

دونوں افراد بڑی شان سے بیرونی کمرہ پھلانگ کر اندرونی کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کا انداز انتہائی غصے کا باعث تھا لیکن اپنے دیس کی بدنصیبی یہ ہے کہ یہاں ظلم کے خلاف غصے کا اظہار انتہائی جرم اور خوفزدہ ہو کر کانپنا عظیم حب الوطنی ہے۔ مجبور ہو کر ہم جیسوں کو خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے۔

میرے پاس کچھ مہمان بیٹھے تھے جن کے ساتھ میں صوفہ پر بیٹھ کر کاروباری امور پر بات چیت کر رہا تھا۔ زیادہ موٹے تنگڑے شخص نے ہر ایک کے چہرے کو گھور کر دیکھا۔ کمرے میں ہر چیز پر نظر دوڑائی۔ مجھ سے رہا نہیں گیا اور کھڑے ہو کر بات کرنے کی کوشش کی تو زوردار آواز گونجی۔ ''بیٹھ جاؤ! تم میں سے بدر جمال ابڑو کون ہے؟۔''

آگے بڑھ کر میں نے اپنا تعارف کرایا، ''میں ہوں، کیا بات ہے؟۔'' کوئی جواب نہیں ملا۔ زیادہ موٹا تنگڑا شخص چھلانگ مار کر میز کے پیچھے روالونگ چیئر پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا، ایک مرتبہ پھر ہر ایک کو گھور کر دیکھنے لگا، اور پھر اپنے ماتحتوں کو حکم جاری کرنے لگا، ''تلاشی لو!۔''

''لیکن کیوں؟۔'' میں نے احتجاج کیا۔ ''کون ہیں آپ لوگ؟ کس چیز کی تلاشی؟۔''

جواب ملا، ''چپ ہو کر بیٹھو! کچھ دیر میں سب معلوم ہو جائے گا۔'' دفتر میں موجود ہر ایک کو باہر جانے سے روک دیا گیا۔

اگرچہ بین الاقوامی قانون اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ میں کسی اجنبی کو، جو مجھے اختیار نامہ نہ دکھائے، اپنے گھر یا دفتر میں داخل ہونے نہ دوں لیکن جس ملک میں قانون لولا لنگڑا اور بنیادی حقوق معطل ہوں وہاں عوام، عوام نہیں رہتی بس فقط بھیڑ بکریاں اور آزاد غلام ہوتے ہیں۔ میں بھی مصلحتاً خاموش ہو گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ دفتر کے ماحول پر خوف و ہراس چھا جائے اور یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ اُسکا رویہ اتنا سخت ہو گیا تھا کہ ان کا دوسرا اقدام جسمانی تشدد ہوتا۔ میرے لئے کوئی اور راستہ نہیں بچا تھا اس لئے عملے پر چھائے خوف کو ختم کرنے کیلئے انہیں ہدایت کی کہ وہ اپنی جگہ پر بیٹھ کر اپنا کام کریں۔ یہ لوگ یقیناً کسی اسپیشل ٹیم کے تھے۔ ان سے تصدیق کیلئے ان کی شناخت کا دریافت کیا تو انتہائی سخت اور روکھا جواب ملا، ''تمہارے لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ ہم کسی بالائی ادارے سے تعلق رکھتے ہیں۔''

بغیر سرچ وارنٹ اور کسی مجسٹریٹ کی عدم موجودگی میں تلاشی جاری رہی، ہر ایک چیز الٹ پلٹ کی گئی۔ وہ لوگ تقریباً ساڑھے تین بجے فارغ ہوئے۔ کوئی چیز نہیں چھوڑی، دفتر کے تمام کاغذات، کتابیں، پاسپورٹ، ڈائریاں تمام تر اپنے قبضے میں کیں۔ زیادہ موٹے تنگڑے شخص

نے فون کا رسیور اٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کیا اور کامیاب چھاپے کی رپورٹ دیتے ہوئے کہا، "Its over sir"۔ مجھے لگا کہ جیسے کوئی چھوٹا نپولین، اصل نپولین کی نقل کرتے ہوئے کہہ رہا ہو، ''میں نے دیکھا، میں آیا، میں نے فتح کیا۔''

سو تلاشی مکمل ہونے پر حکم جاری ہوا، ''چلو!'' کاروباری مہمان کو بھی دھر لیا، بچارے نے بہت وضاحتیں کیں لیکن ایسی ڈانٹ ڈپٹ ہوئی کہ یاد رکھے گا۔ عملے کے تمام افراد کے چہروں کی ہوائیاں اڑی ہوئیں تھیں۔

''چلو!۔'' گو کہ انتہائی شرافت سے کہا گیا تھا لیکن لہجے کا زہر کسی سے ڈھکا چھپا نہیں رہا ہوگا۔ ''کہاں؟ کیوں؟۔'' میرے ذہن میں موجود سوالات میری زبان تک آ گئے۔

''تمھیں کوئی اندازہ نہیں؟۔'' طنز اور حیرت سے دریافت کیا گیا۔

''کیا ہوسکتا ہے؟۔'' میں نے پھر پوچھا تھا۔

''واقعی۔'' موٹے تنگڑے شخص نے 'واقعی' کو طول دیتے ہوئے کہا تھا۔

''نہ آپ لوگوں نے شناخت کرائی، نہ تلاشی کا مقصد بتایا، نہ مجھے یہ بتایا جا رہا ہے کہ کہاں چلوں۔۔۔ میں کون سا ولی اللہ ہوں کہ راز جان سکوں۔'' میں نے انتہائی شرافت سے جواب دیا۔ جانتا تھا کہ مزاحمت کا نتیجہ خراب نکلے گا۔

انتہائی روکھے لہجے میں کہا گیا، ''تم نذیر عباسی کے مقدمے میں مطلوب ہو۔''

''کیوں۔۔۔؟۔''

''یہ تمھیں وہاں جا کر معلوم ہوگا۔۔۔ اب وقت خراب نہ کرو۔ تمہارے ساتھ اتنی رعایت ہے کہ اپنے گھر اطلاع کر دو۔'' مجھے آج تک ان کی اس مہربانی کا سبب سمجھ میں نہیں آیا، اگرچہ اس مہربانی کا کوئی فائدہ بھی تو نہیں تھا۔ میں تو اپنے پورے عملے کے سامنے گرفتار کیا جا رہا تھا۔ میں نے مہربانوں سے زیادہ کچھ جاننے کی غرض سے پہلے ان کا شکریہ ادا کیا اور بعد ازاں 'دوستی' میں رہنمائی چاہی کہ ''گھر کیا بتاؤں کہ آپ لوگ کون ہیں اور کہاں لے جا رہے ہو؟۔'' تاہم مہربانوں نے مزید مہربانی نہیں کی اور جواب دیا۔ ''ہم نہیں بتا سکتے، جلدی کرو!'' اسکے بعد

میں نے گھر فون کیا۔ بہن نے فون اُٹھایا تھا۔ میں اُنہیں کچھ بھی نہیں بتا سکا تھا، سوائے اس کے کہ میں نذیر عباسی کے مقدمے میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ بہن نے انتہائی سراسیمگی میں دریافت کیا تھا ''کیوں؟۔'' اس کیوں کا کیا جواب دیا جائے؟ اور کیا نہ دیا جائے؟ سوالات اور جوابات کی کئی ایک ٹوٹی پھوٹی نشانیاں ذہن میں پھڑ پھڑاتی گم ہوتی گئیں۔ بہن نے فوراً دوسرا سوال داغا، ''ہیلو۔۔۔!۔۔۔ بھائی۔۔۔اب کیا ہوگا۔۔۔!!!؟؟؟'' میں اس سوال کا جواب دوں اس سے قبل مجھ سے فون چھین لیا گیا اور لائن ڈس کنکٹ کر دی گئی۔

یہ چار نومبر کی شام تھی، جب ایک نیا سلسلہ شروع ہوا اور زندگی نے ایک نئی پٹڑی پر چلنا شروع کیا تھا۔ نئی پٹڑی سے میری مراد سوچ۔ دھارے میں تبدیلی نہیں بلکہ تجربات کے ایک نئے سفر کی ابتدا ہے۔ سہ پہر کو اپنی گرفتاری کے بعد منگھوپیر کے مگرمچھوں کے تالاب کے قریب میں نے دوسرے مگرمچھ دیکھے تھے۔ سچ پچ ان کی آنکھوں میں مگرمچھ کے آنسو بھی تھے۔ یہ جگہ منگھوپیر پولیس اسٹیشن کے برابر میں ایک خالی جگہ تھی۔ ایس ایچ او مخدوم حیات وہاں کا انچارج تھا۔ اس نے میرے ساتھ اچھا برتاؤ رکھا۔ پہلے پانی پلایا۔ پھر کھانے کی جھوٹی صلاح کی۔ پھر میٹھے بول بولنے لگا، ''سائیں! مجھے دکھ ہو رہا ہے، آپ کو یہاں دیکھ کر! لیکن ہماری بھی مجبوری ہے۔ سائیں! اپنے کیے کا بھگت رہے ہو۔۔۔تم شریف گھرانے کے فرد، وہ کنگلے لوفر، غلط صحبت میں مارے گئے۔ اب بتاؤ نذیر عباسی سے دوستی کا تمہیں کیا فائدہ ہوا؟ تمہیں ان کے ساتھ دوستی نہیں۔۔۔'' نہ جانے وہ کیا کیا کہتا گیا، لیکن میں سترہ اٹھارہ برس پیچھے ماضی میں چلا گیا۔

گورنمنٹ پرائمری اسکول، بعدازاں میونسپل ہائی اسکول ٹنڈوالہیار۔ اسکولوں کے کلاس اور میدان، شام ہوتے ہی 'نونہال کلب' کی لائبریری، کھیل کود اور اس چھوٹے سے کلب کی تنظیم سازی کے مسائل! نذیر، میں اور کئی ایک چھوٹے چھوٹے دوست۔ آہ!! کیا نہ خوبصورت دن تھے! اسکول، باغات، کھیل کود، مار پیٹ، قہقہے، سب کچھ ایک ساتھ دیکھا، کیا، بھگتا۔ کس طرح یہ سب کچھ بھول سکتا ہے کوئی؟ ناممکن!

اب یہ خیر خواہ مگرمچھ مجھے میری بہتری کی راہ بتا رہا ہے۔ ابھی دو گھنٹے قبل جب یہاں

پہنچنے سے قبل میں نے جیپ میں اس سے منزل سے متعلق دریافت کیا تھا تو جواب دیا تھا، ''پہاڑوں کی دوسری جانب جارہے ہیں!۔'' یقینی طور پر اُس نے یہ جملہ کہہ کر مجھے ''پہاڑوں کے دوسری جانب'' کسی خفیہ ٹارچر کیمپ سے خوفزدہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

گرفتاری کے مقام سے ایک موٹر کار استعمال کی گئی تھی۔ اُس وقت وہاں کچھ دیگر 'مشکوک' گاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں اور کئی اجنبی چہرے بھی، لیکن جب موٹر کار شہر کی کھلی شاہراہوں پر پہنچی تو تنہا محسوس ہوئی تھی۔ وہ شہر کے مختلف رہائشی علاقوں میں مختلف بنگلوں کے باہر رکتے، انتظار کراتے، آگے بڑھ رہی تھی، یقیناً یہ بنگلے غیبی اداروں اور مختلف ایجنسیوں کے اعلیٰ اہلکاروں کے تھے۔ غروبِ آفتاب کے وقت موٹر کار شہر کے بارونق علاقوں کو چھوڑ کر نئی کراچی کی جانب بڑھنے لگی، جہاں موٹر کار چھوڑ کر جیپ لی گئی۔ پھر جیپ نے نئی کراچی کو چھوڑ کر پہاڑوں کا رخ کیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب میں اپنی زندگی سے ہاتھ اُٹھا چکا تھا اور خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ نہ جانے کیوں دنیا ہمیشہ سے کئی گنا زیادہ خوبصورت نظر آنے لگی تھی۔ اُبھری ہوئی گول اور تکونی چٹانیں۔۔۔ کہیں کہیں آسمان میں بادل، ٹیلوں کے آغوش میں بستیاں، کام کرتے مزدور، کھیلتے کودتے بچے، چھوٹے پودوں پر منڈلاتی چڑیائیں اور گگن میں اُڑتے پنچھی۔۔۔ پوری کائنات میں خوبصورتی بھر گئی تھی اور ہاں، مٹی کی خوشبو! ایک عجیب مسحورکن احساس محسوس ہو رہا تھا۔ اگرچہ دھرتی بھیگی ہوئی نہیں تھی لیکن سوکھی مٹی کی خوشبو بھی کیسی خوشبو ہے! یقیناً وہ شام میری زندگی کی بہترین شاموں میں سے ایک تھی۔

جیپ جیسے ہی پہاڑیوں سے آگے بڑھی تو سامنے سیمنٹ فیکٹری نظر آئی۔ ہم قریب پہنچے تو ایک مزدور نے جیپ کی آواز سُن کر اپنا کام چھوڑ دیا۔ شاید اُس نے کچھ سمجھنے کی کوشش کی تھی لیکن اُسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا ہوگا! مجھے اُس پر انتہائی پیار آیا۔ سامنے منگھوپیر پولیس اسٹیشن تھا۔ جیپ رُکی تو سپاہیوں نے محاصرہ کرلیا۔ اب میں پولیس کی تحویل میں تھا۔

خیر خواہ مگرمچھ نے میرے خیالات جھنجھوڑ کر دوبارہ کھانے کی جھوٹی صلاح ماری اور خود کھانا شروع کر دیا۔ اُس نے چپاتی کا نوالا توڑ کر، آملیٹ کا ٹکڑا اُٹھا کر اپنے منہ میں ڈالا، اُس کا

منہ سچ مچ مگر مچھ جیسا تھا۔ اتنا بڑا نوالہ! منہ بھر گیا تھا اُس کا۔ صحیح سے چبا بھی نہیں پا رہا تھا، دو تین منٹ لگ گئے، بالآخر نگل پایا۔ نگلنے کے بعد، طنزیہ کہنے لگا، ''سائیں! انڈہ اچھا نہیں لگتا تو مرغی منگواؤں؟۔'' لہجے میں کاٹ زہر جیسی ہی تھی۔ خود کو حالات کے بہاؤ پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا، ''دیکھا جائے گا!'' خشک نان، نوالہ حلق سے نیچے نہیں اُتر رہا تھا، چائے کے گھونٹ سے وقت ٹلا، تاہم وہ صاحب کھانے کو اس طرح جھنجھوڑ رہا تھا جیسے کوئی بھوکا بھیڑیا شکار کی گئی بکری کو جھنجھوڑ رہا ہو۔ کھانے کے بعد بھی اس کا خیر خواہی والا لہجہ برقرار رہا۔

آدھے گھنٹے میں مالِ غنیمت یعنی مجھ سے برآمد ہونے والے کاغذات کی جانچ پڑتال شروع کی گئی۔ اور کوئی کام کی چیز تھی یا نہیں، وہ فیصلہ تو اس کا تھا تاہم وہ میرا قیمتی قلم جو ایک انتہائی پیارے دوست کا تحفہ تھا اور کلکیو لیٹر ہڑپ کر گیا۔ قلم جیب میں ڈالا اور کلکیو لیٹر میز کی دراز میں۔ میں کچھ بھی کہہ نہیں سکا۔

جانچ پڑتال مکمل ہوئی۔ مجھے حکم دیا گیا کہ میں ہیڈ محرر کے کمرے میں بیٹھ کر مزید احکامات کا انتظار کروں جبکہ وہ فون کے مختلف نمبر ملاتا رہا، نہ جانے کس کس سے کیا کیا ہدایات حاصل کیں، مجھے دوبارہ طلب کیا گیا۔ میں نے خیر خواہ سے دریافت کیا کہ میرے ساتھ کیا کاروائی کریں گے۔ جواب دینے لگا، ''سائیں آرام کرو'' اب اس کا لہجہ مختلف تھا۔ لیکن طنز! سو وہ کہاں جائے گا؟ حاکم جتنا چھوٹا اتنی ہی ہلکی طبیعت۔ ایسا محسوس کرائے گا کہ جیسے ادارے کا سربراہ وہ خود ہو۔ بہر حال، اس کی گفتگو اب بھی گول مول تھی۔

وہ انتہائی آرام اور اطمینان سے اپنی کرسی سے اُٹھا، میز کی دراز سے صبح سے جمع ہونے والی رقم سے 'حصہ' نکال کر جیب میں ڈال کر، ہیڈ محرر کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگا، ''سنو! ابڑو صاحب دو تین دن تک اپنا مہمان ہے، انہیں کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہئے۔'' میں نے اس کی آنکھ کا اشارہ دیکھ لیا تھا، جس میں کوئی معنی تھی، جو بہر صورت، میرے فائدے میں نہیں تھی۔

پھر وہ میری جانب متوجہ ہوا، ''ابڑو صاحب! میں نے ان کو بول دیا ہے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ آپ ہماری پوزیشن تو سمجھتے ہوں گے۔'' اس کے لہجے میں کوئی نئی تبدیلی نہیں تھی۔ ''میری غیر موجودگی میں کوئی کام ہو تو ہیڈ محرر کو کہہ سکتے ہو۔'' میں نے خاموش رہنا مناسب

نہیں سمجھا اور اخلاقاً اس کا شکریہ ادا کیا، وہ ایک مرتبہ پھر ہیڈ محرر کی جانب متوجہ ہو کر ہدایات دینے لگا، ''ابڑو صاحب کو اگر چائے یا سگریٹ کی ضرورت ہو تو میرے حساب سے منگوا لینا۔''

''یس سر!۔'' ہیڈ محرر مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ جسمانی تلاشی لی۔ گھڑی، انگوٹھی اور نقدی لے کر جمع کی۔ گارڈ انچارج نے بوٹ اتارنے کا حکم دیا، اور پھر مجھے بتایا گیا کہ مجھے برابر والے کمرے میں رات گذارنی ہے۔ برابر والا کمرہ جس میں مَیں تنہا ہوں گا اور جہاں اٹیچڈ باتھ روم کی سہولت میسر تھی۔

برابر والے کمرے کا سلاخوں والا دروازہ تھا، جس کا تالا باہر برآمدے کی جانب دیوار میں لگا ہوا تھا، دروازہ ایک کھٹاک سے کھُلا۔ میرا جسم سلاخوں کے پیچھے دیواروں کی آغوش میں آیا اور دروازہ دوبارہ کھٹاک سے بند ہو گیا۔ تالے میں چابی گھوم گئی۔

یہ لاک اپ تھا، جس میں مجھ سے قبل ایک اور قیدی بند تھا، مجھے داخل کرنے سے قبل اس کو باہر نکال کر، ہتھکڑیاں لگا کر برامدے میں جافری کے دروازے کے ساتھ باندھ دیا گیا، ہدایات کے مطابق کسی کو بھی مجھ سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی، نہ کسی قیدی کو اور نہ ہی کسی سپاہی کو۔ قیدی کی بے دخلی کا سبب میں تھا یا یہ یقین کہ میں اس سے یقیناً بات چیت کروں گا، سو، یہ امکان ختم کیا گیا اور مزید احکامات تک ہر چیز جوں کی توں رک گئی، ہیڈ محرر نے خوش اخلاقی اور خیال رکھنے کی جھوٹی ہدایات فراموش کر دیں۔

رات کو تقریباً ساڑھے دس بجے پولیس اسٹیشن کے طاقتور وائرلیس کی آواز میرے کانوں تک آئی۔ میں نے اپنا نام سنا میری bio-data اور گرفتاری کی اطلاع نہ جانے کن غیبی اداروں کی جانب منتقل ہو گئی۔ یہ سب کچھ شاید عجیب نہیں تھا، لیکن میں کتنا خطرناک ہوں! یہ سوچ کر ہنسی آ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے نیند آ گئی، بالکل بے ہوشی والی نیند اور اس وقت تک بیدار نہیں ہو سکا جب تک تفتیش کرنے والوں نے نہیں آ کر اُٹھایا۔

سولہ روز طویل دن

روزانہ صبح:

ماچس کی تیلی اُٹھا کر دیوار پر دستی کلینڈر جوڑنا (1+) ایک اضافی دن

پھر جائزہ:

ایک ایک کونہ، چھت، دیواریں، روشندان اور پنجرے کا دروازہ

ایک کونے میں:

کھُلا بدبودار لیٹرن، برابر میں غسل کا چبوترہ

دوسرے کونے میں:

ایک پلاسٹک کی پلیٹ جُھریاں لگی، شاید برسوں سے رکھی ہوئی اور فقط رکھی ہوئی۔ اُس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی

تیسرے کونے میں:

تین کمبل، تینوں میں بڑے بڑے شگاف، کھٹملوں اور چرس کی بدبو۔ بے انتہا، سر چکرا دینے والی (میرا بستر)

چوتھ کونا:

خالی۔

سلاخوں والے آہنی دروازے کے باہر:

ایک نالی، نالی پر رکھا ہوا پرانا مٹکا اور اس پر کسی بلب کا پرانا آہنی چینی کا پرانا شیڈ (ڈھکن) اور اس کے اوپر ایک چپکا ہوا ایلومینم کا گلاس، مٹکے کا پانی بیک وقت پینے کیلئے اور لیٹرن کے استعمال کیلئے بھی، جس کو بھرنے کی ڈیوٹی ایک بھنگی کے ذمے ('بھنگی' قابلِ احترام ہے۔ اعتراض کی بات غیر صحتمند طریقہ کار ہے)

روشن دان:

جس پر چڑیوں کی بیٹ، بے حساب

چھت:

ایک بلب، چوبیس گھنٹے روشن۔ ایک کنڈا، سپاہیوں کے مطابق جس سے امر لال کو کئی مرتبہ الٹا لٹکا کر پیٹا گیا تھا۔

دیواریں:

ان پر لکھے اَنگنت اشعار اور قیدیوں کے نام۔''جمیل''،''بادشاہ''،''شہنشاہ''،''دادا''، ''مجبور قیدی''،''فرمان علی''،۔۔۔ایک کونے میں بُجھے ہوئے سگریٹ کے ٹوٹے سے''امر''،شاید امر لال!۔۔۔اور روشندان سے دیوار پر دھوپ کا سرکتا سایہ (میرا شغل اور گھڑی)۔ایک دیوار پر ادھورا شعر اور کسی ادھورے آرٹسٹ کی کوشش: اسکیچ میں ایک شخص سلاخوں کے پیچھے دکھایا ہوا:''نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے۔''

دو وقت کھانا:

ہاتھ کی پلیٹ پر چپاتی، چپاتی پر دال کی ڈوئی۔

چوبیس گھنٹے:

مکھیاں، مچھر، کیڑے مکوڑے بھنبھوڑتے، بلیاں دن رات، صبح کو چڑیاں، رات کو گیدڑ کی آواز اور دن میں بھیڑیوں کا گھیراؤ۔

سوال پر سوال:''اور کون کون ہے؟۔''''فلاں کہاں ہے؟۔'' ''فنڈ کون دیتا ہے؟۔'' ''تنظیم کس طرح کی ہے؟۔''''یہ کیا ہے؟۔''''وہ کیا ہے؟۔''''۔۔۔؟۔''''۔۔۔؟۔''

اور پھر دھمکیاں اور سختیاں۔

باقی وقت:

گھنیر خاموشی، تنہائی اور سانت۔

ہر وقت:

ذہن میں ہلچل، کسی بھی لمحے جسمانی تشدد کی ابتدا کا احساس، چھت میں لگا ہوا کنڈا۔ تصور میں امر لال اور دیگر کئی قیدی باری باری الٹے لٹکے ہوئے۔ مار پیٹ، اپنے آپ سے لڑائی، ذہنی کشمکش۔

سپاہیوں کی آنکھیں:

ہر وقت گھڑی ہوئی۔

چہل قدمی:

ایک ایک قدم۔

ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، واپس۔

ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، واپس۔

ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، واپس۔

وہی چکر، وہی راہ، ہر وقت۔

ذہن میں شاہ لطیف کے مصرع کی گردش:

سول کورٹ میں

20 نومبر کو صبح ہی صبح اچانک کھٹاک سے دروازہ کھلا۔ لاکپ میں آج مسلسل سولہ دن ہو گئے تھے۔ مسلسل قید تنہائی سے میں تنگ آ چکا تھا، تفتیش کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ جاری تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ پچھلی مرتبہ تفتیش کیلئے کچھ زیادہ ہی افسر آئے تھے، جن میں سے خفیہ محکمے کے ڈی ایس پی کو میں نے پہچانا تھا، دو مزید چہرے جو ہمیشہ ہوتے ہی ہیں، بھی موجود تھے۔ سپاہیوں سے میں نے انہیں کئی مرتبہ 'میجر صاحب' مخاطب کرتے ہوئے سنا۔ مجھے ہمیشہ شک رہا کہ ان کا تعلق آئی ایس آئی اور ایف آئی یو سے ہے۔ ڈی ایس پی صاحب بھی ان کے سامنے مسکین محسوس ہوتا تھا، اس مرتبہ فوٹوگرافر بھی موجود تھا۔

ان کی تفتیش کا طریقہ کار مکمل طور پر نفسیاتی تھا۔ ماحول تبدیل کرنا انکے لئے پلک جھپک کا کام تھا، خوف اور دباؤ کو دوستانہ ماحول میں، اور دوستانہ ماحول کو اذیت گاہ میں تبدیل کرنا انکے لئے ایک لمحے کا کھیل تھا کہ باتوں باتوں میں ایسی دھمکی دے جاتے تھے کہ روح تک کانپ جائے۔ اُلٹا لٹکانا، ہڈیاں توڑنا، رشتہ داروں کو گرفتار کرنا، انہیں اذیت دینا، لامحدود عرصے تک قید تنہائی میں رکھنے کے علاوہ نذیر عباسی جیسا حشر کرنا (تشدد کر کے ہلاک کر دینا) تک سب کچھ۔ یہ فقط دھمکیاں نہیں تھیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ یہ سب کچھ کر سکتے ہیں اور کرتے رہے ہیں۔

سو، 20 نومبر کی صبح دروازہ کھلا اور میں کنڈے میں ٹانگے جانے کیلئے خود کو روز کی طرح

تیار کرنے لگا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ پچھلی مرتبہ وہ کہہ کر گئے تھے کہ، ''اس مرحلے سے گزر آ ؤ تو پھر بات کریں گے۔''

وہ دن کچھ سرد تھا۔ میں پولس اسٹیشن کا پھٹا ہوا بد بودار کمبل اوڑھ کر بیٹھا تھا۔ اس وقت تک بد بوناک میں گھر کر چکی تھی۔ چوبیس گھنٹے کے ساتھ میں یہ نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟

تالا کھلنے کے بعد ایک سپاہی اندر داخل ہوا، ''اُٹھو!'' میں کھڑا ہو گیا۔ غیر شعوری طور پر میرے قدم انٹروگیشن والے ویران بنگلے کی جانب بڑھے جہاں تفتیش کا کمرہ تھا۔

''سوئیٹر پہن لو۔۔۔ دور جانا ہے۔'' سپاہی نے کچھ جلدی اور ہمدردی سے کہا۔

''کہاں؟''۔ میں نے لاشعوری طور پر پوچھا تھا۔

''وقت ضائع نہ کرو، جلدی کرو سب کچھ معلوم ہو جائے گا!'' وہی پرانا روایتی جواب ملا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سوچنے لگا، ''شاید ایف آئی یو سنٹر!'' تھکے ہوئے اعصاب کو ایک مرتبہ پھر مجتمع کر کے جسمانی اذیت برداشت کرنے کیلئے اپنے آپ کو تیار کرنے لگا۔ سوئیٹر پہن کر باہر نکلا، ہتھکڑیاں لگائی گئیں۔ ایک پرائیویٹ موٹر کار میں تین سپاہیوں، ایک اے ایس آئی اور ایک پولیس ڈرائیور کی تحویل میں مجھے کہیں جانا تھا۔ کہاں؟ ہمیشہ کی طرح کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس سے قبل بھی میں دو تین مرتبہ ان کی تحویل میں فوجی چھاونی لے جایا گیا تھا۔ ہمیشہ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، تین چار سپاہی، پرائیویٹ نمبر پلیٹ والی موٹر کار یا پولس جیپ اور ہمیشہ نئی منزلیں اور میں ہمیشہ بے خبر۔

موٹر کار نے پولس اسٹیشن چھوڑ کر وہ راستہ لیا جو شہر کو جاتا تھا۔ لمحے بھر کی خوشی اُبھر آئی کہ مجھے شہر کی رونق دیکھنے کا موقعہ مل رہا تھا۔ زیادہ دن تو نہیں ہوئے تھے لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے سال بیت گئے ہوں۔ موٹر کار لمحہ بہ لمحہ بارونق علاقوں کی جانب بڑھ رہی تھی۔ نارتھ ناظم آباد، ناظم آباد، گولیمار، لسبیلہ چوک۔۔۔ اور میں شہر کی زندگی میں گم ہو گیا۔ مجھے سسیفس یاد آ گیا جو کچھ عرصے کیلئے پاتال سے دھرتی پر لوٹ آیا تھا۔ راستے پر گاڑیاں۔۔۔ فٹ پاتھوں پر انسان۔۔۔ بالکل میرے جیسے انسان! تمام کے تمام سویلین، سب کے سب بغیر وردی کے، چھوٹے بچے، بسیں

اور ٹیکسیاں ۔۔۔تاہم مجھے اس وقت حقیقی دنیا میں واپس آنا پڑا جب گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی۔ میں نے دیکھا کہ یہ سول کورٹ تھی، آنکھوں پر اعتبار ہی نہیں آیا۔ حیرانگی اس بات پر تھی کہ وہ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں۔ اس سے قبل میرے تمام ریمانڈ مختلف چھاونیوں سے کرنیلوں نے دیئے تھے۔ مجھے ایک مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا۔ عین اس وقت عدالت کے احاطے میں سیاہ کوٹ میں ملبوس ایک وکیل صاحب میرے برابر سے اور سرگوشی میں یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا کہ، ''تمہیں ریمانڈ کیلیئے لایا گیا ہے، مجسٹریٹ کے سامنے کوئی اعتراف نہ کرنا، وہاں کہنا کہ تم پر تشدد کیا جا رہا ہے، تمہیں جان سے مار دیا جائے گا، تمہیں عدالتی تحویل میں دیا جائے!۔'' وہ نہ جانے کون تھا اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ عدالتی تحویل کیا ہوتی ہے، تاہم اتنا سمجھ میں آیا کہ کوئی اعتراف نہیں کرنا ہے، تشدد اور جان لیوا دھمکیوں سے آگاہ کرنا ہے۔ میں حقیقتاً حیران تھا کہ اُس وکیل کی میرے ساتھ ہمدردی کیوں تھی؟ اور اس نے میری رہنمائی کیوں کی؟ یہ حیرت اُس وقت تک برقرار رہی جب تک مجسٹریٹ نے مجھے خود یہ نہیں بتایا کہ میں اپنے 'جرائم' کا اعتراف کرنے کیلیئے لایا گیا ہوں۔

فاضل مجسٹریٹ نے مجھ سے تقریباً جرح کی، جبکہ میرا خیال تھا کہ مجھ سے پوچھا جائے گا کہ مجھ پر کیا گذری اور مجھے کیا کہنا تھا؟ میں نے خود پر ہونے والی ذہنی اذیت، دھمکیوں اور زیادتیوں کا ذکر کیا۔ میں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ جب میں لاکپ میں بیمار ہوا تو ڈاکٹر کو بھی نہیں بلایا گیا۔ اُسے یہ بھی بتایا کہ میری زندگی خطرے میں ہے اس لئے مجھے عدالتی تحویل میں دیا جائے۔ مجسٹریٹ خاموش ہو گیا۔ شاید اُسے مایوسی ہوئی تھی۔ اُس نے گھنٹی بجا کر کسی میجر سلیم کو طلب کیا۔ لمحے بھر میں وہی میجر اندر داخل ہوا جسے میں تقریباً روزانہ دیکھتا آیا ہوں۔ سفید رنگ کی شلوار قمیص، مناسب قد بت اور آنکھیں۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ سانپ کا تصور آتا تھا۔ اس کے پیچھے موٹا تگڑا ڈی ایس پی اور خیر خواہ مگر مچھ انسپکٹر مخدوم حیات داخل ہوئے۔ مجسٹریٹ کے حکم پر مجھے اپنی کتھا دوبارہ ان کے سامنے دہرانی پڑی، میری شکایت سُن کر وہ فقط مسکراتے رہے۔ پھر مجھے حکم ہوا کہ کمرے سے باہر جا کر کھڑا ہو جاؤں کہ مجسٹریٹ کو ان اہلکاروں سے کچھ بات کرنی تھی (میٹنگ کرنی تھی)

دس پندرہ منٹ کے بعد مجھے دوبارہ اندر بلایا گیا اور 'خوشخبری' سنائی گئی کہ مجھے لاکپ سے آزاد کر کے سنٹرل جیل کی کشادہ دنیا بھیجا جا رہا ہے۔ سپاہیوں نے ہتھکڑیاں سنبھالیں اور ہم سول کورٹ کی سیڑھیاں اُترنے لگے۔ خیر خواہ مگر مچھ نے برابر سے گذرتے ہوئے عجیب لہجے میں کہا، ''سائیں! مبارک ہو۔'' پھر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ پرائیوٹ نمبر پلیٹ والی موٹر کار کہیں گئی ہوئی تھی اس لئے ہمیں طویل انتظار کرنا پڑا۔ موٹر کار آئی اور تھکی ہوئی ٹانگوں کو آرام نصیب ہوا۔ ٹھیک اُس لمحے میں نے مجسٹریٹ اور میجر سلیم کو عدالت کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے دیکھا۔ دونوں ایک ہی موٹر کار میں سوار ہوئے۔ یہ موٹر کار یقیناً میجر سلیم کی نہیں تھی بلکہ مجسٹریٹ کی تھی کیونکہ میجر سلیم کی سفید ڈاسٹن کئی مرتبہ انٹروگیشن بنگلے کے باہر دیکھ چکا تھا۔

وہ دونوں اس موٹر کار میں بیٹھ کر کہاں گئے، وہ سب کچھ قابلِ فہم تھا۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کسی بات پر زوردار قہقہے لگا رہے تھے، اس سے بے خبر کہ ملزم پر عدلیہ اور انتظامیہ کی دوستی کا راز کھُل چُکا تھا۔

جیل میں پہلا دن

سول کورٹ کا 'احسان' تھا کہ میں عدالتی تحویل میں دیا گیا تھا اور اس طرح غیبی اداروں کی تفتیش، ذہنی دباؤ اور مسلسل تنہائی سے چھوٹ گیا تھا، دماغ کی رگوں کو کچھ آرام ملا۔

لیکن آج بھی ذہن میں عجیب کشمکش تھی۔ جیل جانے کا تصور کچھ اچھا نہیں تھا۔ ذہنی دباؤ سے آزاد ہونے کی خوشی اور دل کے کسی کونے میں خوفزدہ کرنے والا تجسس دو متضاد جذبات باہم پیوست ہو گئے تھے۔

عدالت سے جیل تک پورا راستہ جیل کا تصوراتی خاکہ ابھرتا اور مٹتا رہا۔ سوچ رہا تھا کہ معلوم نہیں کہ وہاں بھی ہر وقت بند رکھیں گے یا مار پیٹ کریں گے یا مشقت لیں گے۔ اور بالآخر سینٹرل جیل کراچی کا شاہی دروازہ نظر آیا۔

تین سپاہیوں اور ایک افسر کے گھیرے میں سیاہ گیٹ پھلانگ کر اندر داخل ہوئے۔ داخل ہوتے ہی بائیں جانب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ دائیں جانب اوپر

جانے کیلئے سیڑھی، دائیں جانب ہی UTP برانچ (کچے قیدیوں کا شعبہ) اور بائیں جانب بالکل سامنے دوسرا کمرہ، 'ملاقات کا کمرہ' تھا۔ UT (زیرِ مقدمہ) برانچ میں رکھی بہت بڑی میز کے پیچھے بیٹھے کلرک نے جیل ریمانڈ وصول کر کے، رجسٹر میں نام لکھا اور ہتھکڑیاں کھلوائیں۔ گھڑی ایک مرتبہ پھر اُتاری گئی، جیب میں رکھے پیسے نکل گئے۔ ان دو چیزوں کے علاوہ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

''جاؤ!۔'' حکم ملا۔

''لیکن کہاں؟ کس طرف؟۔'' کہاں جاتا؟

''اس بڑے گیٹ سے اندر جاؤ!۔'' مین گیٹ کے اندر ایک اور بڑے گیٹ کی جانب اشارہ کیا گیا۔ اندرونی گیٹ پر دوبارہ تلاشی لی گئی اور اس کے چھوٹے دروازے (Wicket) سے میں اندر داخل ہوا۔ پیچھے چھوٹا دروازہ بند ہو گیا۔

عجیب وحشتناک دنیا تھی، اندر۔ ایکدم سہم گیا۔ شور وغوغا مچا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں پہنچ گیا ہوں۔ بالکل سامنے ایک ہشت کونہ عمارت تھی جس پر جلی حروف سے main kitchen لکھا تھا۔ ننگ دھڑنگ عجیب وحشیوں جیسے لوگ تھے۔۔۔ کوئی پانی کا ڈول بھر رہا تھا، تو کوئی بردا گھما رہا تھا، تو کوئی چکی چلا رہا تھا، کچھ کے سروں پر سرخ تو کچھ کے سروں پر سفید ٹوپیاں تھیں۔ اکثر کی داڑھی بڑھی ہوئی، آنکھوں میں گند منہ سے رال ٹپک رہی تھی جبکہ زبان پر گالیاں۔ کوئی مار رہا تھا تو کوئی مار سے بچنے کیلئے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ سامنے کئی سپاہی کھڑے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس پورے ماحول اور افراتفری سے ان کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ یہ مار پیٹ، یہ بچاؤ، یہ شور وغوغا سب کچھ کوئی معمول کی بات تھی۔

میری نظروں کے سامنے یونانی دیو مالائی کردار گھومنے لگے، ڈینائڈن، اکسی یان، ٹینٹالس، ٹٹیس، سسیفس اور پاتال کا والی ھیڈیز۔۔۔ ایسا محسوس ہوا کہ میں بھی جیسے یونانی دیوتاؤں کی بنائی ہوئی زمین کے اندر پاتال جیسی کسی پاتال میں پہنچ گیا ہوں اور بہت جلد ہیڈیز کا کوئی بغل بچہ اپنا چابک ہوا میں لہراتا ہوا آئے گا اور مجھ پر حملہ کر دے گا۔۔۔ اور میں خود کو اُسی

طرح ہی بچاؤں گا جس طرح سامنے کوئی 'اکسی یان' خود کو بچا رہا ہے۔ ایک لمحے میں یہ بالکل ہی بھول گیا کہ میں لاکپ سے سول کورٹ اور سول کورٹ سے جیل پہنچا ہوں اور عدالت کی تحویل میں (محفوظ) ہوں۔

میں گم سم تھا، کچھ معلوم نہیں کر پا رہا تھا کہ کہاں جاؤں؟ عجیب نفسا نفسی کا عالم تھا۔ عقب میں بڑے دروازے کا چھوٹا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ راستے سے ہٹ کر خاموشی سے ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ برابر میں کھڑی پاتال کے ایک داروغہ کو احساس ہوا کہ کوئی نیا انسان دھتکارے ہوئے لوگوں کی دنیا میں داخل کیا گیا ہے۔ اس نے اپنے نائب کو آواز دی اور ایک سرخ ٹوپی پہنے، بکھری اور بے تحاشہ بڑھی ہوئی داڑھی والا کبڑا، وحشتناک آنکھوں سمیت میری جانب بڑھا۔ میں اپنے قدم پیچھے کرنے کو ہی تھا۔ اس نے اپنی لاٹھی اُٹھائی، لہرائی۔۔۔ لیکن اُسے نہ جانے کیا ہوا۔۔۔ ہاتھ ہوا میں ہی جامد ہو گیا۔ اسکی وحشتناک آنکھوں میں یکا یک انسانیت کی جھلک نمودار ہوئی، ''کون سا مقدمہ ہے؟'' وہ بولا۔ اس کی آواز کسی ایسے پرانے گھسے ہوئے ٹیپ کی مانند تھی جو چل چل کر گھس کر سپاٹ ہو گئی ہو۔

''سیاست'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔! وہاں جاؤ صوبیدار صاحب کے پاس!'' پھر وہی لہجہ۔ مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا کہ وہ داروغے کا بغل بچہ تھا۔ وہ بھی 'دیوتاؤں' کا دھتکارا ہوا تھا، اس لئے ہر سیاسی قیدی کو ضدی سسیفس سمجھنا اس کیلئے قدرتی بات تھی۔ سسیفس، جس نے جھیلنے سے انکار کیا اور یہ خود، جس نے زیوس کا کوئی قانون قبول نہ کر کے اس کی خلاف ورزی کی ہوگی، لیکن سزا کے قانون سے انکار نہیں کر سکا اور دوبارہ تابعدار رعیت میں شامل ہو گیا۔۔۔ اور اب اس پاتال میں پہنچنے والے دیگر باغیوں اور دھتکارے ہوئے انسانوں پر لاٹھیاں برسانے اور انہیں ہنکالنے کی مشقت پر لگایا گیا ہے تاہم اسکے باوجود، وہ خود نہ کسی سسیفس پر ہاتھ اُٹھاتا ہے اور نہ ہی اُٹھانا چاہتا ہے۔

حلق میں دم آیا۔ خود کو تقریباً گھسیٹتے ہوئی صوبیدار کے پاس پہنچا، میں اس کے پاس جانا

نہیں چاہتا تھا لیکن یہ پاتال تھی، یہاں پر پاتال کا قانون ہی چلنا تھا۔۔۔پھر صوبیدار کی خوامخواہ تفتیش شروع ہوگئی،''کون سا مقدمہ ہے''اس نے اپنے مخصوص اندازِ عظیم بے پرواہی اور شہنشاہی شان سے مجھ حقیر قیدی پر نظر ڈالی۔اُس نے اپنے سفید سر اور کپاس جیسی مونچھوں کو مہندی سے سرخ کیا ہوا تھا کیونکہ سیاہ خضاب اس کے چہرے کی جھریوں کو چھپا نہیں سکتا تھا۔مجھ پر گہری نظر ڈال کر، سگریٹ کا طویل اور بھرپور کش لگا کر، اُس نے جمی ہوئی راکھ شاندار اسٹائل سے جھڑکی۔ اسکے کردار کا لازمی جُز یعنی نیٹ کی ایک عدد لاٹھی اس کی کرسی کے برابر میں مالک کی طرح عظیم الشان اسٹائل سے ٹیک لگائے ایستادہ تھی۔

سیاسی مقدمے کا سن کر اُسے مزا نہیں آیا۔کہنے لگا،''کیوں کرتے ہو سیاست؟ گھر میں سکون نہیں ملتا؟ وزیر بنو گے ہاں؟۔۔۔وہاں جا کر بیٹھو!''میں نے خاموش رہنے کو ترجیح دی۔کیا کیا جا سکتا تھا؟ اجنبی دنیا، اجنبی ماحول، کیا معلوم کہ اس نگری میں کونسا قانون رائج ہے!تھوڑی دیر میں، میں نے اپنے اردگرد کافی تعداد میں سلجھے ہوئے نوجوان محسوس کیے۔

''ساتھی! کس پارٹی کے ہو؟ میرا نام جاوید اختر ہے، یہ راشد ربانی ہے۔۔۔یہ شفیع بلوچ اور وہ سلیم انصاری۔ہم سب پیپلز پارٹی کے ہیں۔۔۔''اور پھر کئی ایک نوجوان آتے گئے لیکن میرے لئے سب نئے تھے، اس لئے پوچھا،''لطف پیرزادو اس جیل میں ہے؟۔''جواب ملا،''ہاں! لطف بھی ہے، امام بخش بھی اور امر لال بھی۔۔۔وہ آ رہے ہیں، فکر مت کرو!''

اور بالآخر لطف، امام بخش اور انکے ساتھ رفیق صفی کو مسکراتے ہوئے اپنی جانب آتا دیکھا۔تھکاوٹ اڑن چھو ہوگئی۔میں نے یکا یک خود کو پاتال سے نکلتا محسوس کیا۔

سہیل سانگی

حیدرآباد سے نکلنے والا سندھی اخبار روزنامہ سندھ نیوز میں جہاں میں کام کرتا تھا جنرل ضیاء کے مارشل لاء کے بعد بند ہوگیا اور رکراچی میں روزگار کی تلاش میں چل پڑا۔ یہاں کچھ صحافی اور سیاسی دوستوں سے رابطے کئے ۔لیکن سنسرشپ اور سیاسی سرگرمیوں کی پابندی کی وجہ سے اظہار رائے پابند سلاسل تھی۔ اور اخباری صورتحال مجموعی طور ڈاؤن ہو رہی تھی۔ حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے دو ذاتی دوستوں علی حسن اور ادریس بختیار نے بھی ذاتی طور پر کوشش کی۔ ایسے میں پرانے دوست اور ترقی پسند نظریات کے حامل بشیر انصاری سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ مائننگ ڈپارٹمنٹ میں کسی اچھے عہدے پر تھے۔ انہوں نے ڈان گروپ کے مجل صاحب سے بات کی۔ جمعرات کو مجل صاحب سے بشیر انصاری کے دفتر میں میری ملاقات بھی ہوئی۔ ان نہوں ڈان کے ایڈیٹر بات کرلی تھی۔ طے ہوا کہ پیر کے روز میں ان سے دفتر میں ملوں گا اور اور جاب ہوجائے گی۔

دوپہر کو ادریس بختیار اور علی حسن کے سات پریس کلب میں کھانا کھایا۔ اگلے روز چھٹی تھی۔ علی حسن مساوات بند ہونے کے بعد حیدرآباد میں چند ماہ بیروزگاری کے گزارنے کے بعد چند ہفتے قبل شام کے اخبار ''لیڈر'' میں اسٹاف رپورٹر بھرتی ہوئے تھے۔ ہفتہ وار چھٹی کی وجہ سے وہ حیدرآباد جانا چاہ رہے تھے۔ شاید ادریس بختیار بھی حیدرآباد جا رہے تھے۔ مجھے بھی کہا کہ چلو، میں نے کہا کہ میں ٹھہر جاتا ہوں۔ دوستوں سے ملتا ہوں۔ جاب ہو جائے گی تو رہنے کا بندوبست بھی کریں۔ انہوں نے خاصا اصرار کیا، اور پکڑ کر گھسیٹنے کی کوشش کی لیکن میں ان سے ہاتھ چھڑا کے بھاگ گیا۔ اس لئے ادریس بختیار آج تک کہتے ہیں کہ اگر حیدرآباد چلتے تو گرفتار نہیں ہوتے۔

ان سے علحدہ ہونے کے بعد میں نے کمال وارثی کے کزن محمد احمد وارثی کوفون کیا جو کہ جہانگیر روڈ کے پاس ڈاک خانے میں کام کرتے تھے۔انہوں نے کہا کہ آجائیں۔ میں پروفیسر جمال نقوی سے ملنا چاہ رہا تھا۔ کیونکہ انہوں نے کہلوا بھیجا تھا کہ مقدمہ اور کامریڈ جام کے بارے میں وہ تفصیلی بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔اس مقدمے کے وکیل یوسف لغاری تھے۔اوراس کو مجموعی طور پر میں ہی دیکھ رہا تھا۔کمال وارثی پارٹی کام کے حوالے سے حیدرآباد آتے جاتے رہتے تھے۔اور جام ساقی کی گرفتاری اور تقریبا دوسال بعدان پرفوجی عدالت میں چلنے والے مقدمے کے حوالے سے ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔انہوں نے بتایا تھا کہ کراچی میں ملنا ہوتوان کے کزن محمد احمد وارثی کے ذریعے مل سکتے ہیں۔

محمد احمد وارثی کے دفتر سے ہم بس میں بیٹھے اور پاکستان کوارٹرز پہنچے۔ جہاں کمال وارثی رہتے تھے۔ہم نے پاکستان کوارٹرز پہنچ کر ایک کوارٹر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ایک ناشناسا اور نامعلوم چہرہ فوجی کٹ سر دیکھا۔ مجھے یہ سب کچھ عجیب لگا۔لیکن مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وارثی کے ساتھ کون کون رہتا ہے۔محمد احمد نے کمال وارثی کا پوچھا، انہوں نے کہا کہ ہاں وہ ہیں آپ اندر آجائیں۔جب ہم اندر پہنچے اور پیچھے مڑ کے دیکھا تو دو بندے کھڑے تھے۔نہ کچھ سمجھ میں آرہا تھا اور نہ کوئی چارہ تھا۔اندر پہنچے تو چار پانچ اٹے گٹے لوگ بیٹھے تھے۔جن میں سے دو بندوق بردار تھے۔ان کا رویہ اور لہجہ تحکمانہ تھا۔انہوں نے وراڈے میں پڑی ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ مجھے اور محمد احمد کوذرا فاصلے پر بٹھایا۔

چند لمحوں تک کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ یہ تو ذہن میں آرہا تھا کہ یہ لوگ ایجنسی ہیں۔اتنے میں میری نظر حمیدہ گھانگھرو پر پڑی۔حمیدہ نے جیسے ہی مجھے دیکھا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔اب ہم دونوں یہ کوشش کررہے تھے کہ نہ ایک دوسرے سے نظریں ملائیں اور نہ ہی یہ شو کریں کہ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔تقریبا ایک گھنٹے بعد تین چار لوگ آئے۔ان میں ایک افسر گریڈ کا لگتا تھا۔اس نے ہاتھ ملایا۔اور ساتھ والی کرسی پر بیٹھ کر نام وغیرہ پوچھا۔اس کا رویہ نسبتا لہجہ نرم تھا۔میرے نام بتانے پر انہوں نے فلوک مارا اور کہا ’’او ہوسانگی صاحب ہم تو آپ کو

آسمانوں میں تلاش کر رہے تھے، آپ ہمیں زمین پر مل گئے اور وہ بھی خود چل کر آ گئے۔'' میں نے کہا کہ ''مجھ میں ایسا کیا ہے کہ آپ مجھے آسمانوں میں ڈھونڈ رہے تھے''۔ انہوں نے کہا کہ '' آپ اتنے بھولے نہ بنیں۔ بات اتنی سادہ بھی نہیں، خیر۔'' میں پوچھا کہ کیا میں خود کو گرفتار سمجھوں''۔ انہوں نے کہا کہ ہاں۔ میں نے پوچھا '' مجھے وجہ تو پتہ چلے،'' تو کہا کہ وہ سب پتہ لگ جائے گا۔ وہ پوچھنے لگے کہ آپ یہاں کیوں آئے تھے۔ میں نے بتایا کہ کمال وارثی سے ملنے آیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا ٹھیک ہے۔ اچانک انہوں نے کہا کہ اب ہمیں چلنا ہوگا۔

دو بندوں نے بڑی مضبوطی سے دونوں طرف پکڑا۔ لیکن باہر دیکھنے والے کو یہ لگے کہ دوست ہیں باہوں میں انہیں ڈال کر جا رہے ہیں۔ مجھے اور محمد احمد وارثی کو الگ الگ گاڑیوں میں بٹھایا۔ گاڑیاں جب باہر نکلیں تو اس افسر نے مجھے بہت ہی لکھنوی نداز سے کہا کہ آپ کو زحمت دیں گے، آپ کی آنکھوں پر پٹی باندھیں گے۔ میں نے کہا کہ اب تو میں آپ کی قید میں ہوں، اور بے بس بھی، آپ کی مرضی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ ضروری ہے۔ چند منٹ کے بعد گاڑی ایک جگہ پر رکی۔ وہ گاڑی سے اترے۔ لیکن میرے دائیں بائیں ایک ایک بندہ بیٹھا رہا۔ دس منٹ کے لگ بھگ گاڑی وہیں کھڑی رہی۔ ایسے لگا کہ کوئی بڑا سا میدان ہے، پیڑوں کے پتے ہلکی ہوا میں سرسراہٹ کر رہے ہیں۔ کوّوں کی آوازیں آ رہی تھی۔ واپس آئے تو انہوں نے چلنے کا کہا اور گاڑی روانہ ہوئی۔

آدھے گھنٹے تک گاڑی چلتی رہی۔ پھر کہیں آ کر رکی۔ اب مجھے پکڑ کر اتارا گیا۔ پہلے اس عمارت کے وارنڈے ٹائپ میں بٹھایا گیا۔ اس کے بعد کھینچ کر ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ شام ہو چکی تھی۔ رمضان کا مہینہ تھا اور فطار کا ٹائیم ہو رہا تھا۔ اس کمرے میں اندھیرا تھا۔ مجھے لگا کہ محمد احمد کو بھی یہیں لائے ہیں۔ کمرے میں کچھ دیر کے بعد ہماری آنکھوں سے پٹیاں کھول دی گئیں۔ لیکن اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پوچھا گیا کہ کس کس کو روزہ ہے؟ میں نے کہا کہ میرا روزہ نہیں۔

افطار کے بعد کسی نے مجھے نام سے پکارا۔ اور کہا کہ باہر آئیں۔ باہر آئے تو وہی افسر

اور کچھ اور لوگ کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ سہیل سانگی ہیں۔ ان کو اپنی کسٹڈی لیں۔ اس نے پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا اچھا سہیل صاحب۔ میں نے بے ساختگی سے بولا آپ سے دوبارہ ملاقات رہے گی؟ اس نے کہا کہ ممکن ہے، ویسے مشکل ہے۔

اب میں کسی اور کی کسٹڈی میں تھا۔ مجھے وہیں پر آنکھوں پر پٹیاں کس کے باندھ دی گئیں اور جیپ میں پیچھے بٹھا کر کہیں لے جایا گیا۔ رات ہو چکی تھی۔ جب مجھے گاڑی سے اتار کر کہیں لے جایا گیا۔ وہاں پر کرسی پر بٹھایا گیا۔ ایسے لگا کہ میں ورانڈے میں ہوں اور ساتھ میں کمرہ ہے۔ وہاں سے مجھے لا کر ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔

کچھ دیر کے بعد کسی نے کہا کہ اس کی پٹیاں کھول دو۔ جب آنکھوں کی پٹیاں کھولی تو خود کو فوج کے کوارٹر گارڈ میں پایا۔ تھوڑی دیر میں ایک سپاہی آیا اور پوچھا کہ کھانا کھایا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ لیکن کھانے کو طبیعت بھی نہیں چاہ رہی۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ کھانا کھایا ہوا ہوگ تو نیند تنگ کرے گی اور یہ اگر ٹارچر کے طور پر جگائیں گے تو تکلیف ہوگی۔ یہ بات کامریڈ جام نے اپنے کورٹ بیان میں کہی تھی۔ اس کے علاوہ دنیا بھر میں گرفتار ہونے والے کمیونسٹوں کے تجربے میں نے پڑھے تھے اس وجہ سے ذہن میں آئی۔ اس نے واپس جا کر اپنے انچارج کو رپورٹ کیا۔ کوارٹر گارڈ کا انچارج نائیک یا حوالدار ہوتا ہے۔ وہ میرے پاس آئے۔ انہوں نے مختصر اتعارف پوچھا، میں نے بتایا کہ صحافی ہوں۔ کیونکہ گرفتار کیا ہے یہ مجھے بھی نہیں پتہ۔ حوالدار نے کہا کہ آپ سیاسی ہو۔۔ میں نے کہا کہ ہاں ایسا ہی ہوگا۔ اس نے کہا کہ ایسا ہوتا رہتا ہے کھانا کھا لو۔ اس لمحے یہ خیال آیا کہ اگر کھانا کھایا ہوا ہوگا تو طبیعت اور موڈ صحیح رہے گا۔ انٹروگیشن اور ٹارچر کو اچھے طریقے سے face کر پاؤں گا۔ اب میں خود کو انٹروگیشن کے لئے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا۔

خیر میں نے کھانا کھایا۔ اپنی جیب میں سگریٹ نکال کر جلائی۔ اور بچوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ اور یہ بھی کہ یہ گرفتاری کا پورا چکر کیا ہے؟ کون کون گرفتار ہے؟ کیا کیس ہے کیا معاملہ ہے؟ مجھے کیا موقف اختیار کرنا چاہیئے؟ گتھی سلجھ ہی نہیں رہی تھی۔ اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ کمال وارثی گرفتار ہے۔

تھوڑی دیر میں گارڈ پر موجود سپاہیوں کی ڈیوٹی تبدیل ہوئی۔ نئے سپاہیوں میں سے دو نے آ کر پوچھا کہ کون ہوں، کیا کیس میں ہوں وغیرہ۔ ان میں سے ایک پیپلز پارٹی کا جیالا تھا۔ وہ جنرل ضیاء ؒ اور مارشل لا کو برا بھلا کہ رہا تھا۔ اس نے کہا کہ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ بھارتی فوج کا میجر ہے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے، اس کا لہجہ ہمدردانہ تھا۔

میں نے کہا کہ یار مجھے ایک مدد چاہئے۔ اس جیالے نے کہا کہ بولیں۔ میں نے بتایا کہ میرے گھر والوں کو میری گرفتاری کا پتہ نہیں۔ میں انہیں اطلاع دینا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا کہ دیکھتے ہیں۔ پھر چکر لگا کے آیا اور کہا کہ آدھی رات کے بعد وہ پین اور کاغذ لیکر آئے گا۔ وہ آدھی رات کو پین اور کاغذ لیکر آیا۔ میں نے میری بیوی کو مختصر خط لکھا اور بتایا کہ گرفتار ہو گیا ہوں۔ بچوں کا خیال رکھنا۔ کچھ پتہ نہیں کہ کیا کیس ہے۔ جلدی جان چھڑانے کی کوشش کرونگا۔ خط اس جیالے کے حوالے کیا۔ ویسے یہ بھی ڈر تھا کہ خط پوسٹ کرنے کے بجائے وہ ایجنسی کو دے دے۔ لیکن ایجنسی کو دے گا تو کیا ہوگا؟ اس میں کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔ یہ بھی خیال تھا کہ وہ پوسٹ نہ کرے۔ لیکن اس میں بھی میرا کوئی نقصان نہیں تھا۔ اس پر میں مطمئن ہو گیا۔ مجھے اچھا لگا کہ خواہ وہ خط نہ بھی پوسٹ کرے لیکن ان حالات میں اس نے ایک امید تو بندھا دی کہ کوئی ہے جو معمولی ہی سہی ساتھ دے سکتا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے یہ خط پوسٹ کر دیا تھا جو کہ میری بیوی کو ملا تھا۔

سخت ٹینشن میں تھا، کیونکہ میں اس بات کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں تو نوکری کی تلاش میں آیا تھا۔ یہ کیا ہو گیا؟ زمین پر ہی لیٹ گیا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ابھی تک کی بات چیت سے لگا کہ کمیونسٹ کیس میں گرفتار ہوں۔ اب خود کو انٹروگیشن فیس کرنے کے لئے تیار کرنے لگا، کچھ پتہ نہیں کہ میں جہاں سے گرفتار ہوا وہ کس کا مکان تھا؟ اور کس مقصد کے لئے استعمال ہو رہا تھا۔

مجھے کیا موقف لینا ہے؟ یہ سوال ایک بر پھر ذہن میں آیا۔ کیس کی نوعیت کا بھی اندازہ نہیں؟ کون کون اور لوگ گرفتار ہیں وغیرہ۔ کوئی حکمت عملی بنانا مشکل نظر آ رہی تھی۔ یہ طے کیا کہ انٹروگیٹر کے سوالات سے ہی مجھے زیادہ سے زیادہ معلومات مل سکتی ہے۔ لیکن بہتر پوزیشن یہ ہے

کہ میں ایک حقیقت پسندانہ موقف پر کھڑا ہوجاؤں۔ وہ یہی کہ اب عملی طور پر اس طرح سے سیاست نہیں کررہا۔ ملازمت کرتا تھا۔ کراچی جاب کے لئے آیا تھا۔ اب جاب کرکے بچوں کا پیٹ پالنا چاہتا ہوں۔ جام ساقی کزن ہے، اس کا مقدمہ لڑا ہے۔ جوکہ قانونی حق تھا۔ یہ چیز بولنی چاہیئے کہ اسٹوڈنٹس لائیف میں ایکٹوسٹ تھا۔ باقی جس طرح سے کیس کا معاملہ انٹروگیشن میں سامنے آئے گا اس طرح سے دیکھوں۔ میں نے اپنے تیئں یہ بھی فیصلہ کیا کہ انٹروگیشن کے ضوابات انگریزی میں دونگا۔ اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت آپ کو اپنی بات کو ایڈٹ کرنے کا موقعہ مل جائے گا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اس کو پتہ چلے کہ پڑھے لکھے بندے واسطہ پڑا ہے۔

مجھے کوارٹر گارڈ کے انچارج نے بتایا کہ یہاں کسی سے بھی بات کرنا منع ہے۔ ہمیں اوپر سے یہ آرڈر ہیں۔ سحری کے وقت اٹھایا گیا۔ روزہ تو مجھے نہیں رکھنا تھا۔ لیکن سحری کرائی گئی۔ اور پورا دن خالی گزر گیا۔

دوروز کے بعد انٹروگیشن شروع ہوا۔ جو اسی فوجی کیمپ کے اندر کیا گیا۔ ایک بڑے سے ہال میں ہوا۔ پہلے روز آنکھوں پر پٹی باندھ کر الٹے ہاتھوں ہتھکڑی پہنا کر دوسپاہی انٹروگیشن ہال میں لے گئے۔ ہال میں پہنچے تو مجھے ایک کرسی پر بٹھایا گیا۔ ہال میں دوآدمیوں کی آپس میں بات کرنے کی آواز آئی، جس کو میں ٹھیک سے سن نہ سکا، تاہم میرے متعلق ہی بات کررہے تھے۔ اور سامنے سے آواز آئی، جس نے میرا نام اور معمولی ذاتی تفصیلات پوچھیں، میں نےبتایا کہ میں صحافی ہوں، حیدرآباد میں ادارہ بند ہوگیا تو نوکری کی تلاش میں کراچی آیا ہوں، ااس نے کہا کہ یہ تو سب ٹھیک ہے۔ حکومت کوئی بیوقوف نہیں کہ کسی کو ویسے ہی بند کرے۔ میں نے کہا کہ کم ازکم میرے قصے میں ایسا ہی لگتا ہے۔

پھر وہ لیکچر دینے لگا۔ ہم سب بھائی ہیں۔ ہمیں ملک کے لئے کام کرنا چاہیئے۔ اور فرمائش کی کہ ملک کی سلمیت کے لئے ضروری ہے کہ میں ان کے ساتھ تعاون کروں۔ میں نے جواباً کہا کہ میا خیال ہے کہ میں پہلے بھی ملک کی خدمت ہی کررہا تھا۔ اس کے ساتھ یہ کہ نوکری کر

کے بچے پال رہا تھا۔ یہ بھی کہ میں ایک قیدی کی صورت میں ملک کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ انہوں نے روایتی انداز میں ڈرایا کہ بہت بڑا جرم کیا ہے، جس میں کچھ بھی سزا موت بھی سکتی ہے۔ میں نے کہا کہ سزا تو عدالت دے گی۔ جواب آیا کہ بحث مت کرو، انٹروگیٹر مجھے سمجھانے کے ساتھ ڈرا دھمکا بھی رہا تھا۔ اس نے کہا کہ آپ کو سب کچھ بتانا ہوگا۔ میں نے کہا کہ عجیب بات ہے کہ ایک شخص جس کو میں نہ میں جانتا ہوں، نہ دیکھا کبھی، اوراب بھی اس کو دیکھ نہیں سکتا وہ مجھ سے تعاون اور ملکی سالمیت مانگ رہا ہے۔ اس نے کہا تو آپ مجھے دیکھنا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا کہ ان دیکھے اوران جانے شخص سے میں کوئی بھی بات کیوں کروں؟

اس نے سپاہی کو آواز دی کہ میری آنکھوں سے پٹی کھول دی جائے، انکھوں سے پٹی ہٹی تو دیکھا سامنے ایک دبلے وزن کا نظر کا چشمہ لگائے پینٹ اور شرٹ میں ملبوس کلین شیو ایک شخص کرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ چلو جناب اب آپ مجھے دیکھ سکتے ہیں۔اور بتائیں۔لگ رہا تھا کہ اس کو بہت جلدی تھی۔ بعد میں بتا چلا کہ ہر انٹروگیٹر کا یہی طریقہ واردات ہے۔لیکن بظاہر یہی کہتے رہیں گے کہ ہمارے پاس تائیم بہت ہے۔میں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ مجھ سے آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ اس کیس کے بارے میں۔۔۔ میں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کیس کیا ہے؟ اس میں کون کون گرفتار ہے؟ کیوں گرفتار ہے؟ اور مجھے کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟ یہ واقعی سچ بھی تھا، کیونکہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کیا کسی ہے؟ کون کون گرفتار ہے؟ وہ کہنے لگے کہ آپ کو سب معلوم ہے، بتانا نہیں چاہ رہے ہیں،

اس پر انہوں جھلا کر کہا کہ بتاؤ پر تمہاری گرفتاری کیوں ہوئی؟ میں نے کہ کہ جناب میرا بھی آپ سے یہی سوال ہے۔اس کو بات بنتی ہوئی نظر نہ آئی۔تو پھر پوچھا کہ گرفتاری کیسے ہوئی؟ میں نے کہا کہ یہ تو مجھ سے زیادہ آپ کو ایجنسی والے بہتر طور پر بتا سکتے ہیں۔اس کا کہنا تھا کہ نہیں ہم آپ سے سننا چاہتے ہیں۔میں نے بتایا کہ کمال وارثی سے جان پہچان ہے، وہ ٹریڈ یونین میں کام کرتا تھا، اور خبریں شایع کرانے کے لئے اخبار کے دفتر آتا تھا۔ان سے ملنے کے لئے پاکستان کوارٹرز گیا تھا، جہاں وہ رہتا تھا۔ مجھے چونکہ نوکری مل رہی تھی تو رہنے کے لئے ان کی مدد چاہ رہا

تھا۔اس نے پوچھا کہ آپ کو پتہ ہے کمال وارثی کا ی کام کرتا ہے؟ وہ ایک "ملک دشمن گروہ" کا رکن ہے۔ میں نے بتایا کہ میں اسکوٹرڈی یونین کے کارکن کے طور پر جانتا ہوں۔باقی کا مجھے نہیں معلوم۔پھر وہ پوچھنے لگا کہ پروفیسر جمال نقوی، شبیر شر، امرلال اور دیگر کا، میں اس کو پہلے بتا چکا تھا کہ جام ساقی میرے کزن ہیں۔ میں حیدرآباد میں ان کے مقدمے کی دیکھ بھال کر چکا ہوں۔ پروفیسر جمال نقوی سے کئی برس پہلے جام ساقی کے ساتھ حیدرآباد میں کوئی ملاقات ہوئی ہوگی۔ لیکن کوئی زیادہ جان پہچان نہیں۔شبیر شر کو زیادہ نہیں جانتا۔اس پر اس کو غصہ آ گیا اور کہنے لگا کہ اچھا ہم آپ کو ان سے جان پہچان کروائیں گے۔دو گھنٹے کیانٹروگیشن کیدوران معاملہ لمحہ بلمحہ تلخ ہوتا جارہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ آپ کو ایک دن دیتے ہیں آپ سوچ لیں، اور کل تیاری کر کے بتائیں۔پھر کہا کہ اسے لے جاؤ۔

واپس آنکھوں پر پٹی بنادھی گئی اور سپاہی تقریبا مجھے گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئے۔ سپاہیوں کا رویہ انٹروگیٹر کے سامنے سخت تھا۔لیکن جب باہر لے آئے تو رویہ نرم ہو گیا۔لیکن سب کے سب بات کرنے سے گریزاں تھے۔

انٹروگیشن کا پہلا سیشن تعارفی لگا۔ مجھے صرف ایک حد تک اندازہ ہوا کہ معاملہ کیا ہے۔ لیکن کوئی واضح شکل نہیں ابھر کر آئی۔

انٹروگیشن کے دوسرے دن اسی طرح سے پیش کیا گیا۔ لیکن سپاہیوں سے کہا گیا کہ فی الحال آنکھوں سے پٹی کھول دیں۔انٹروگیٹر پوچھنے لگا کہ پھر سوچ کر آئے؟ میں نے کہا کہ بہت سوچا،لیکن سمجھ میں نہیں آرہا کہ مجھ سے آپ لوگ کیا چاہ رہے ہیں۔اس نے کہا کہ ہم معلومات چاہتے ہیں کمیونسٹ پارٹی اور ان کے لوگوں کے بارے میں۔ میرا جواب تھا کہ ایسی معلومات میرے پاس نہیں۔اس نے پھر دھمکایا اور کہا کہ ایسے نہیں سدھریں گے۔ہمیں سختی کرنی پڑے گی۔ یہ کہہ کر اس نے ایک صحت منداور لمبے تڑنگے حوالدار ٹائپ کو بلایا اور حکم دیا کہ اس کو ٹھیک کرو، اس نے آتے ہیں تھپڑوں اور مکوں کی بارش کر دی۔اور مجھے کرسی سے نیچے گرا کر اوپر چڑھ کر بیٹھا اور مارنے لگا۔ مجھے نہیں معلوم یہ سلسلہ کتنی دیر چلا۔ پھر انٹروگیٹر نے کہا کہ اب بس کرو، انہیں موقعہ

دیتے ہیں۔اور کہنے لگا کہ اب اندازہ ہوگیا ہوگا کہ سختی بھی ہوسکتی۔یہ تو ایک تعارفی معاملہ تھا۔میں نے کہا کہ مجھے اندازہ تھا کہ سختی اور ٹارچر کریں گے؟ اس نے کہا کہ سیدھے ہاتوں سے نہیں تو گھی نکالنے کے لئے ٹیڑھی انگلیاں کرنی پڑیں گی، یہ ذہن میں رکھیں کہ جو انگلیاں ٹیڑھی ہونگی وہ تمہاری ہونگی۔

یہ سلسلہ ہر روز یا دوسرے دن تک چلتا رہا۔ مار پٹائی، اور پھر یہ کھکوارتر گارڈ والوں سے کہا کہ سگریت بند کردیں، اور سونے نہ دیا جائے۔اس مقصد کے لئے کہا گیا کہ رات بھر کھڑا رکھا جائے۔اس پر سکتی سے عمل کیا جانے لگا۔ایسا بھی ہوا کہ تھک جانے کے بعد میں بیٹھ جاتا تھا یا لیٹ جاتا تھا اور واپس کھڑا کردیا جاتا تھا۔کبھی کبھی کوئی ڈیوٹی پر ایسا ے گارڈ بھی آتے تھے کہ آدھی رات کے بعد کہتے تھے کہ کونے میں سو جاؤ۔ شاہی قلعہ لے جانے کی دھمکیاں دیتے رہے۔

انٹروگیشن کا مین رخ یہ تھا کہ کمیونسٹ پارٹی میں کون کون ہے؟ کہاں کہاں ہے؟ کیا کام کرتا ہے؟ اس دوران وہ ی بھی دعوا کرتا رہا کہ ہمیں سب پتہ ہے۔میں نے کہا کہ جب پتہ تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟ اور مجھے کیوں مار رہے ہیں۔انہوں نے کہا کہ "ہم آپ کی زبان سے سننا چاہتے ہیں۔

وہ یہ بھی پوچھ رہے تھے کہ پارٹی کے دوسرے حلقوں اور پارٹیوں میں کون کون سپورٹرز ہیں۔ کیمونسٹوں کی پیپلز پارتی کے ساتھ اچانک دوستی کیسے ہوگئ؟ اب پیپلز پارٹی کے ساتھ کون کون رابطے میں ہے؟ سیاسی جماعتوں میں میر غوث بخش بزنجو کے بارے میں زیادہ پوچھ رہے تھے۔ یہاں پر انقلاب کی کیا حکمت عملی ہے؟ افغانستان کی طرح یہاں کیسے انقلاب آئے گا؟ اس کے ذہن میں شاید پارٹی کا ہینڈبل چھینو پاکستان جیسے چھینا افغانستان تھا۔

پھر ایک ہفتہ ایسا آیا کہ اچانک انٹروگیٹشن بند ہوگیا۔اس کے بعد ایک روز اس ہال کے نزدیک ایک بڑے کمرے میں لے جایا گیا۔ جہاں چھ سات لوگ سول ڈریس مین بیٹھے تھے۔ شکلیوں سے فوجی افسر لگ رہے تھے۔انہوں نے طبیعت پوچھی، کوئی بیماری یا تکلیف تو نہیں؟ کھانے ٹھیک سے کھاتے ہو؟ سگریٹ ملتے ہیں۔آپ جو بھی کہنا چاہو، ہم سنیں گے۔میں نبیتیا کہ

یہ تکلیف کم ہے کہ میں بیوی بچوں سے دور ہوں؟ مجھے پتہ ہی نہین کہ مجھے کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟ مجھے سے وہ پوچھا اور کہلوانے کی کوشش کی جارہی جس کا نہ مجھے پتہ ہے نہ علم۔ خواہ مخواہ تشدد کیا جارہا۔ میں حیران تھا اچانک یہ ہمدردی کیوں ہورہی؟ کئی ہفتوں بعد جب جیل منتقل ہوا تو پتہ چلا کہ نذٰرعباسی شہید ہوگیا تھا، اس کے بعد یہ لوگ تحقیقات کرنے آئے تھے۔

اس دوران دومرتبہ ملٹری کورٹ میں ریمانڈ کے لئے لے جایا گیا۔ آنکھوں پر پٹیاں، پیچھے ہاتوح میں ہتھکڑی۔ اس موقعہ پر پتہ چلا کہ گاڑی میں پروفیسر جمال نقوی، کمال وارثی، شبیر شر، اوردیگر بھی ہیں۔

چندروز کے بعد پھر انٹروگیشن شروع ہوا، اور وہی تشدد تھا۔

ہفتے دس روز کے بعد اچانک انٹروگیشن رک گیا۔ ایک روز میں کورتر گارڈ کی کھولی میں بیٹھا تھا کہ اچانک انچارج ا'اور کہنے لگا کہ تیار ہو جاؤ، آپ کو لے جانا ہے۔ میں نے پوچھا کہاں؟ اس نے کہا یہ مجھے بھی نہیں معلوم، آرڈر ملا ہے۔ مجھے کیا تیار ہونا تھا، خیر تھوڑی دیر میں مارشل لا کے قیدیوی کے طور پر پروٹوکول کے ساتھ یعنی آنکھوں پر پٹیاں، پیچھے موڑ کر ہاتوح میں ہتھکڑیاں ڈال کر کوارٹر گارڈ سے نکال کر پیچھے جیپ میں بٹھایا گیا۔ بشمکل پندرہ منٹ کے بعد گاڑء کہین رکی۔ ماحول مین پردوں کی آوازیں آرہی تھی۔ پھر گاڑی سے اتار کر ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ کچھ دیر بعد آنکھوں سے پٹی کھولی گئی، سامنے ایک پولیس کا اے ایس آئی کھڑا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ سی آئی اے سینٹر تھا۔ دروازہ بند کر کے وہ ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد ایک بار پھر آنکھوں پر پٹیاں باندھی گئیں، پیچھے ہاتھ کر کے ہتھکڑی لگانے کے بجائے اب سامنے لگائی گئی۔ تب تو سمجھ مین نہیں آیا لیکن اب سمجھ میں آریا ہے کہ یہ سویلین کا پروٹوکول ہے۔ مجھے ایک کار میں پچھلی سیٹ پر درمیانمیں بٹھایا گیا۔ کار تقریبا آدھے گھنٹے تک سڑکوں پر چلتی رہی۔ پھر گاڑی ایک جگہ پر رکی۔ میرے آنکھوں کی پٹیان اتاردی گئیں میں نے دیکھا کہ یہ ڈسٹرکٹ کورٹ ہیبالکل ایک کونے کی طرف لے جایا گیا۔ اور ایک ایس ڈی ایم کی کورٹ کے انتظار گاہ میں بٹھایا گیا۔ تھوڑی دیر میں دیکھا کہ پروفیسر جمال نقوی کو بھی لایا گیا۔ اندازہ دس منٹ کے بعد

مجھے ایس ڈی ایم کی کورٹ میں پیش کیا گیا۔ میں نے اس کو کہا کہ یہ ہمیں پھر کہیں لے جائیں گے اور ہماری جان کو خطرہ ہے آپ ہمارا یہ بیان نوٹ کریں۔ ایس ڈی ایم نے کہا کہ آپ 164 کا بیان دینا چاہیں گے؟ میں نے کہا کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا؟ کس بات کا اقبال جرم؟ میں مسلسل بولے جارہا تھا۔ کل کو مارشل لا ہٹے گا، آپ کو جواب دیان پڑے گا۔ میری یہ " تقریر" چل رہی تھی کہ پولیس اے ایس آئی پروفیسر جمال نقوی کو بھی کمرہ عدالت میں لے آئے۔ اے ایس آئی نے کہا کہ عدالت آپ کو جیل کسٹڈی کر رہی ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے پتہ ہے کہ اس عدالت کی کیا حیثیت ہے۔ آپ کی مارشل لا ہائی کورٹ کے آحکامات کو نہیں مانتی۔۔ پروفیسر خاموش رہے۔ پھر ہمیں عدالت کے کمرے سے باہر ایک روانڈے ٹائپ میں بٹھایا گیا۔

کچھ دیر کے بعد ہمیں ایک گاڑی میں بٹھایا گیا۔ اور دوسری گاڑی پیچھے لگائی گئی۔ درمیان میں پولیس اے ایس آئی سے میں یہی بحث کرتا راہا کہ تم ہمیں جیل نہیں بھیج رہے ہو، کسی اور کے حوالے کر رہے ہو، وہ قسمیں کھاتا رہا۔ گھنٹے ڈیرھ کے بعد مجھے اور پروفیسر کو لانڈھی جیل پہنچایا گیا۔

ملزمان کے بیانات

کامریڈ جام ساقی

مجھے 10 دسمبر 1978 کو حیدرآباد میں گرفتار کیا گیا تھا اور ان ہی الزامات کے تحت حیدرآباد سندھ کی ایک خصوصی فوجی عدالت مجھے دس سال کی سزا سُنا چکی ہے۔ اگرچیکہ اس کے متعلق سندھ ہائی کورٹ نے حکم التوا بھی جاری کیا تھا اور یہ رائے دی تھی کہ مذکورہ مقدمہ زیادہ سے زیادہ سمری ملٹری کورٹ میں چلائے جانے اور فیصلہ سنائے جانے کے قابل ہے۔

(واضح رہے کہ اس وقت سمری ملٹری کورٹوں کو صرف ایک سال کی سزا دینے کا اختیار تھا) اس وقت کے الزامات اور موجودہ الزامات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس کے باوجود موجودہ حکومت نے مجھے اس مقدمے میں اس لئے ملوث کیا ہے تاکہ میری قوتِ ارادی کو کمزور کیا جاسکے اور مجھے عوام کی آزادی اور جمہوری حقوق کی جدوجہد اور اُن کے پرچار میں حصہ لینے سے روک سکے۔ اس کے باوجود کوئی بھی سرکاری گواہ مجھ پر کسی قسم کا کوئی بھی الزام ثابت نہیں کرسکا ہے۔ یہ مقدمہ بھی سابقہ مقدمے کی طرح سیاسی ہے اور مجھے علم ہے کہ فوجی عدالتیں اپنے حکام اعلیٰ کے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے سزائیں ہی دیتی ہیں۔ اس لئے ان کو کسی بھی طور پر عدلیہ سے کوئی مشابہت اور ہم آہنگی نہیں دی جاسکتی۔ ہماری مشکلات اور مسائل کے متعلق ہماری گزارشات کا جو حشر نشر ہوا وہ بھی آپ کی زبردستی اور آپ کے اعلیٰ حکام کی عداوت کا واضع ثبوت ہے۔

آپ کے خلاف ہمیں ذاتی طور پر کوئی شکوہ نہیں ہے۔ میں کمیونسٹ ہوں اور اپنی تمام شعوری زندگی تک میں اپنے عوام کے لئے لڑتا رہوں گا اور لڑتا رہا ہوں۔ آپ کو میرے خلاف فیصلہ دینے کی نہ طاقت ہے اور نہ ہی آپ کی کوئی جائز حیثیت ہے۔ میرے متعلق آخری فیصلہ

تاریخ کرے گی۔ یقیناً وہ لوگ جو اپنے ملک اور عوام سے فریب اور غداری کرتے ہیں انہیں تاریخ میں کوئی مقام نہیں ملا کرتا اور وہ لوگ جو عام انسانوں کے لئے اپنی زندگی وقف کرتے ہیں اور اپنی جان کا نذرانہ دیتے ہیں انہیں تاریخ کبھی بھی فراموش نہیں کرسکتی۔آپ میں سے ہر ایک کو تاریخ کی اس عدالت کے سامنے اپنے تمام اعمال اور سزاؤں کے لئے جوابدہ ہونا پڑے گا۔

میں آپ کو کیسے دیکھتا ہوں۔! اس کے متعلق تو میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ اپنی بات کہوں گا۔ میرے ملک کی کہانی خون اور آنسوؤں سے لکھی گئی ہے لیکن جن لوگوں نے اپنے ملک اور عوام سے دھوکہ کیا ہے، ان کی غداری کو بھی کبھی نہیں بخشا جائے گا۔ جمہوری اور محنت کش عوام کی قوت نے ان حاکموں کو اس قدر خوفزدہ کر رکھا ہے کہ ان مارشل لاء کے حکمرانوں نے مجھے اس مقدمہ میں ملوث کرنا ضروری سمجھا جو میری گرفتاری کے بیس ماہ اور کچھ دن بعد قائم کیا گیا تھا اور چونکہ یہ بھی ایک سیاسی مقدمہ ہے اس لئے مجھے اپنے سیاسی دفاع کے ساتھ ساتھ خود اپنا دفاع بھی کرنا پڑے گا۔ مجھے 10 دسمبر 1978 کو گرفتار کرنے کے بعد میرے ساتھ جو وحشیانہ برتاؤ کیا گیا اور جو اذیتیں دی گئی ہیں، میں دوبارہ ان کا ذکر نہیں کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ یہ عدالت میرا وہ بیان پڑھ چکی ہوگی جو میں نے اس مقدمے سے قبل حیدرآباد کی خصوصی فوجی عدالت میں دیا تھا لیکن مجھے دی گئی اِن اذیتوں کی کہانی وہیں پر ختم نہیں ہوجاتی۔ جیل میں بھی یہ حکمران ٹولہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا اور جیل حکام کو بار بار یہ تاکید کی گئی کہ جیل میں مجھے انتہائی قید تنہائی میں رکھا جائے حالانکہ ملک کی اعلیٰ عدالتیں قید تنہائی کو اذیت ناک اور غیر قانونی قرار دے چکی ہیں۔ مجھے ہمیشہ ''سی'' کلاس میں رکھا گیا ہے۔ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جو فوجی حکام ہونے کی اپنی حیثیت کی بنا پر فوری کاروائی کرنے والے کہلاتے ہیں، نے ابھی تک دو سال پرانے کاغذات پر بھی کوئی کاروائی نہیں کی اور ہوم سیکرٹری ویسے کسی بھی قیدی کو بی کلاس دینے سے گریزاں ہے، سو میرے معاملے میں تو کوئی کاروائی کرنے کے لئے قطعی طور پر تیار نہیں ہے ۔گذشتہ حکومتوں کے دور میں مجھے ''بی'' کلاس میں بھی رکھا گیا ہے لیکن اب مجھے بتایا گیا ہے کہ آجکل آمدن وغیرہ کے سرٹیفکیٹ کے بغیر کوئی وجہ قابل قبول نہیں ہے۔ گویا ہمارا ملک ایک محدود کمپنی ہے اور اس میں صرف انہی لوگوں کو کچھ حقوق مل سکتے ہیں جن کے پاس اس کے کافی شیئرز یعنی

حصص کے سرٹیفیکیٹ موجود ہوں۔ میں نے ایسا بھی ایک عدد سرٹیفیکٹ بھیجا ہے لیکن ''ہمارے بدنام مرغے'' کی وہی ایک ٹانگ ہے۔

ابتدائی گواہوں کے لئے مجھے حیدرآباد سنٹرل جیل سے لایا گیا اور میرے جیل پہنچنے کے کچھ دن بعد اسی جیل میں بیگم نصرت بھٹو کو بھی لاکر نظر بند کیا گیا۔ میں نے انہیں ایک خط لکھا اور جیل قواعد کے مطابق اُسے جیل کے وارڈن کو دیا تاکہ اگر جیل حکام کو کوئی اعتراض نہ ہو تو وہ خط بیگم صاحبہ کو دیا جاسکے بصورت دیگر اُسے واپس کیا جائے مگر کراچی جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے مذکورہ خط بیگم صاحبہ کو دینے یا مجھے واپس کرنے کے بجائے لے جاکر اپنی کسی بڑی توپ کے حوالے کردیا اور مجھے کوئی مقدمہ چلائے بغیر تیس دنوں کے لئے قید تنہائی میں ڈنڈا بیڑیاں لگا کر کھولی (کوٹھری) میں بند کرنے کی سزا سنادی گئی۔ ایک لمحے کے لئے ہی سہی، ذرا یہ تصور تو کیجئے کہ کہاں ایک سیاسی قیدی اور کہاں یہ ڈنڈا بیڑیاں! میری معلومات کے مطابق میں پہلا سیاسی قیدی ہوں جسے یہ ڈنڈا بیڑیاں لگائی گئیں اور مجھے یقین ہے کہ ان احکامات کے پسِ پردہ کوئی بڑی توپ ہوگی ورنہ سپرنٹنڈنٹ جیل کو ایسے احکامات جاری کرنے اور عمل درآمد کرنے سے پہلے سو بار سوچنا پڑتا۔ یہاں میں یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ پہلے جب میں خفیہ فوجی اذیت گاہوں میں اپنی زندگی اور موت سے برسرِ پیکار تھا، تب مجھے روزانہ چار ٹیکوں کے حساب سے تیس دنوں تک __DEPRASSIVE کرنے والے انجکشن لگائے گئے تھے اور یہ اس لئے کیا گیا تھا کہ میری قوت ارادی اور اعصاب کو کمزور کیا جاسکے۔ ان ایک سو بیس انجکشنوں کا میری صحت پر کتنا اثر پڑا ہے یا پڑے گا، اس کا فیصلہ تو کوئی ماہر ڈاکٹر ہی کرسکتا ہے۔ ایک ایسی حکومت جو اپنے مخالفین کے خلاف ایسی وحشیانہ کارروائی کرتی ہے وہ کسی طرح بھی مہذب نہیں ہوسکتی۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے اس پراسرار غازی کے کسی بہت ہی قریبی رفیقِ کار نے ایسا اشارہ دیا ہوگا ورنہ کوئی چھوٹا موٹا افسر کبھی بھی اپنے طور پر ایسی حرکت نہیں کرسکتا تھا۔ بہرحال یہ وحشیانہ برتاؤ اور دوسری ایسی غیر انسانی، غیر اخلاقی اور غیر قانونی کارروائیاں پاکستان کے عوام کے خلاف ان کے جارحانہ حملے کا حصہ ہیں۔ اب تو پھر امریکی سامراجیوں سے اپنا ناطہ جوڑا گیا ہے، جس سے ان کی زور زبردستی اور بڑھ گئی ہے اور یہی

وجہ ہے کہ عوام کے سامنے دہشت گردی، اذیتوں اور مقدمات کی ایک نئی لہر نظر آ رہی ہے اور اس خطے کی صورت حال نے بجا طور پر سامراجیوں کے ہوش وحواس خطا کر دیے ہیں۔ ایران میں سامراج دشمن جمہوری انقلاب کامیاب ہو چکا ہے۔ ایران کے بہادر عوام نے ظالم، جابر اور سنگدل شہنشاہ کو ٹھوکر مار کر نکال دیا ہے کیونکہ شاہ ایران اس علاقے میں امریکی سامراج کا ایک اہم چوکیدار تھا اور اس کے ذمہ تیل کی فراہمی اور اُس کے منافع کو حفاظت سے امریکہ پہنچانے کا کام تھا اس لئے کہ تیل کا منافع امریکی اقتصادیات کا اہم عنصر ہے۔ افغانستان میں قومی جمہوری انقلاب تیزی سے آگے بڑھنے لگا اور اُسے سوویت یونین اور عالمی امن کیمپ کے خلاف استعمال کرنے کی آخری امید بھی رائیگاں گئی، ہندوستان میں مرار جی ڈیسائی اور اُن کے ہمنواؤں کو عوام نے پھر مسترد کر دیا۔

ان صدمات نے سامراجیوں کے حوصلے پست کر دیئے اور انہیں بے چین کر دیا ہے۔ کاؤبوائے فلموں والا وحشی اور لڑاکا ریگن وائٹ ہاؤس میں اپنے دانت گاڑھ چکا تھا۔ امریکی سامراج کے ساتھ چین کی توسیع پسند حکومت بھی عوام دشمن سازش میں شریک ہو چکی ہے۔ چینی حکومت آجکل امن کے عالمی کیمپ، سوشلسٹ بلاک اور قومی آزادی کی تحریکوں کے خلاف عموماً اور افغانستان اور ہندوستان کے خلاف خصوصاً سازشیں کر رہی ہے اور اب یہاں ہمارے ملک میں پُراسرار وردی پوش جنرل ضیاء اور اُس کا ٹولہ جو اپنے ہی بوٹوں سے اپنے ہی بدنصیب ملک کے عوام کو کچلنے اور اپنا ہی ملک فتح کرنے کا انتہائی ماہر ہو چکا ہے کو یہ تبدیلیاں ڈراؤنے خواب کی طرح محسوس ہوئیں اور وہ بُری طرح دہشت زدہ ہو گئے۔ انہیں بخوبی علم ہے کہ ہمسایہ عوام کی ان کامیابیوں نے ہمارے عوام کی اُمنگیں جوان اور حوصلے بلند کر دیئے ہیں۔ مگر کوئی حکومت عوام سے جتنی بھی کٹی ہوئی ہوگی، اتنی ہی ظالم، وحشی، بے مصرف اور سامراج کی دستِ نگر ہوگی، لہٰذا ایک جانب سامراج کو اس علاقے کے لئے کسی نئے چوکیدار کی ضرورت تھی تو دوسری طرف اس پُراسرار غازی اور غاصب جنرل ضیاء کو کسی مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔ فریقین کی انہی ذاتی ضروریات نے اس نام نہاد ناطے کو جنم دیا ہے۔ عام اصطلاح میں اسی کو چور کا بھائی گرہ کٹ

کہا جاتا ہے۔ جنوب اور جنوبی مغربی ایشیا میں سامراج دشمن سیلاب کے آگے بند باندھنے کے لئے ہی واشنگٹن، اسلام آباد اور پیکنگ کا محوری اتحاد تیار کیا جارہا ہے۔ اور اب ہمارے اس پُراسرار غازی نے عجیب وغریب تقاریر جھاڑنا شروع کردیں کبھی کبھی تو وہ بہت ہی مضحکہ خیز تبصرے بھی کرنے لگا ہے۔ اس نے کھلم کھلا کہا کہ اگر امریکہ اس کا اور اس کے ٹولے کا رسہ گیر نہ بنا تو پھر ترکی سے لے کر ویت نام تک کوئی پٹھو امریکی سرکار نہ رہے گی۔ اسرائیل کا نام لینے سے اس نے قصداً جان چھڑائی کہ کہیں پاکستان کے باشعور عوام کے غیض وغضب کا شکار نہ ہونا پڑے۔ اس نے کہا کہ پاکستان عربوں کے تیل والے علاقے کا ایک عقبی دروازہ ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے اقتدار اعلیٰ اور قومی وقار کو مٹی میں ملانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے یہ بھی کہا کہ پاکستان نسبتاً ایک چھوٹا ملک ہونے کی وجہ سے امریکہ سے کسی بھی چیز کا مطالبہ نہیں کرسکتا اس کی بجائے امریکی توجہ کے لیے درخواست گزار ہی ہوسکتا ہے۔ اس کا یہ کہنا بجائے خود اس بات کا اقرار ہے کہ یہ نیا ناطہ باعزت یا مساویانہ نہیں!

اس پراسرار غازی نے چین کے اُکسانے پر پہلے ہی افغانستان کے خلاف سازشیں کر کے پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑائی تھی چنانچہ امریکہ نے اِس کے بعد ہی ہدایات اور معاوضہ دینا شروع کردیا۔ امریکہ کو تو اس علاقے میں ایسا مہرہ مل گیا اور اسے کیا چاہئے تھا، سواس نے اُسے اور بھی آگے بڑھانا شروع کردیا۔ 1959ع والے فوجی معاہدے کا منحوس مردہ پھر زندہ کیا گیا۔ یہ معاہدہ ملک کے پہلے مکمل مارشل لاء اور فوجی آمریت کی منحوس ترین باقیات میں سے ایک تھا۔ امریکی اسلحہ خانے سے میکارتھی ازم کا مذموم کمیونسٹ دشمن ہتھیار بھی درآمد کیا گیا۔ پُراسرار غازی جو پہلے اپنے آپ کو غیر جانبدار قرار دے رہا تھا، اس نے ترقی پسندوں اور دیگر محبّ وطن لوگوں پر الزامات کی بوچھاڑ کردی اور اُس کی بے جا تکرار شروع کر کے کھلم کھلا اپنے آپ کو رجعت پسند کہلوانے لگا۔

نئے ناطے کے جزوی معاوضے کے طور پر یہ شخص امریکہ کو اس کی جنوبی کمان کے لئے گوادر کا اڈہ دے چکا ہے۔ یہ کمان بنیادی طور پر تیل کی رسد جاری رکھنے کے لئے قائم کی گئی ہے

اور اُس کے ذمہ یہ فریضہ بھی ہے کہ اگر عرب امریکہ کی ناز برداریاں اٹھانے کے لئے تیار نہ ہوں تو وہ فوراً تیل کے کنوؤں پر قبضہ کر لے۔ ویسے بھی ہمارے اس غریب ملک کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور سینئر جنرل امریکہ کو اڈے فراہم کرنے میں کافی بدنام ہیں۔ مرحوم قیوم خاں پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ اکتوبر 1958ء میں ایک امریکی سفیر نے انہیں پاکستان کی صدارت پیش کی تھی اور یہ پیشکش صرف ایک شرط سے مشروط تھی کہ وہ پاکستان میں بڈابیر والے امریکی اڈے کی میعاد میں پانچ سال کی توسیع کر دیں، انہوں نے انکار کیا اور دوسرے دن سڑکوں پر ایوب خان کے ٹینک گشت کر رہے تھے اور ملک پر مارشل لاء مسلط ہو چکا تھا۔ پھر ایوب خان نے امریکہ کی خواہش کے مطابق اس اڈے کی معیاد میں پانچ سال کی بجائے دس سال کی توسیع کر دی! تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے لیکن اس بار اعلیٰ سطح پر واردہو رہی ہے۔ پہلے بڈابیر والا اڈہ صرف سوویت یونین کے خلاف سازش کا مرکز تھا لیکن گوادر کا موجودہ اڈہ ایران، افغانستان، سوویت یونین حتیٰ کہ مغرب نواز ممالک سمیت تمام عرب ممالک کے خلاف سازشوں کا مرکز ہے۔ اواکس طیارے سوویت یونین، ایران، افغانستان اور ہندوستان پر پرواز کے لئے پر تول رہے ہیں۔ ہمارا بدنصیب ملک مفاد پرستوں کے ایجنٹ افغان بھگوڑوں کو تربیت دینے اور انہیں امریکی اور چینی اسلحہ پہنچانے کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ اس معاملے کا مصر کے مرحوم صدر انور سادات ایک انٹرویو میں پہلے ہی ان کی پول کھول چکے ہیں۔

حال ہی میں دسمبر 1982 میں پاکستان نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں انسانی حقوق کی قرارداد کے خلاف امریکہ اور اسرائیل کے ساتھ ووٹ بھی کیا ہے اور ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ پاکستان نے کھلم کھلا غیر جانبدار اور اسلامی ممالک کی مخالفت میں امریکہ اور اسرائیل کی اس قدر طرفداری کی ہے۔ اس نام نہاد اسلامی حکومت کا یہی اصل روپ ہے۔ اب تو یہ راز بھی فاش ہو چکا ہے کہ 1970 کی دہائی کے وسط سے اسرائیل کا ایک جاسوسی ادارہ موساد بھی اسلام آباد میں کام کر رہا ہے۔ (روزنامہ اسٹار کراچی 16 دسمبر 1982) واضح رہے کہ یہ وہی وقت ہے کہ جب مئی کا آپریشن فیئر پلے شروع ہوا تھا۔

ان حقائق سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ پاکستان اب غیر جانبدار ملک نہیں رہا۔ بقول پُراسرار غازی کے ''اس دنیا میں صرف دو ہی ملک غیر جانبدار ہیں۔ ایک امریکہ اور دوسرا سوویت یونین۔!'' اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس بے چارے کو تو غیر جانبداری کے معنی بھی معلوم نہیں ہیں۔! لہٰذا جناب والا! موجودہ مقدمے میں میری شمولیت دراصل موجودہ حکومت کے امریکہ کے ساتھ نئے ناطے اور دست نگری کا ایک واضح ثبوت ہے اور اس قدیمی دشمنی اور سامراجی سازشوں کی کہانی 1953 سے شروع ہوتی ہے جب امریکی نواز افسروں کے ایک چھوٹے ٹولے نے موقع پرست اور اپنے حواری سیاست دانوں سے مل کر جی ایچ کیو (فوجی ہیڈکوارٹر) کی مدد سے خواجہ ناظم الدین کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا اور پھر ان کی برطرفی نے پاکستان میں سازشوں کے جال کی راہ ہموار کردی۔ امریکہ میں پاکستان کے ایک سفیر محمد علی بوگرہ کو وہاں سے درآمد کر کے پاکستان کا وزیراعظم مقرر کیا گیا اور ان عوام دشمن سازشوں میں جنرلوں کے ٹولے نے چونکہ اہم کردار ادا کیا تھا اس لئے انہوں نے اس اقتدار میں حصہ مانگا اور اس طرح ایوب خان کو وزیر دفاع مقرر کر دیا گیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک فوجی ہیڈکواٹر ملک کی پالیسیاں بنانے میں اہم کردار ادا کرتا رہا ہے اور اس ضمن میں ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ یہ فوجی افسر شاہی جو ہمیں انگریزوں سے ورثے میں ملی ہے بنیادی طور پر امن وامان قائم رکھنے کے لئے بنائی گئی تھی یعنی اس کا اہم فریضہ آزادی وطن کے لئے لڑنے والوں کو دبا کر رکھنا تھا۔ اس لئے اُسے ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت اور ریشہ دوانیوں کا چسکا پڑا ہوا تھا۔ اس نے نہ صرف انتظامیہ میں اپنے اثر ورسوخ میں اضافہ کیا بلکہ موقع غنیمت جان کر افسر شاہی سرمایہ بھی پیدا کیا اس نے زرعی زمینوں پر بھی قبضہ کیا، حتیٰ کہ بالآخر وہ ایک مفاد پرست ٹولہ بن گئے۔ اس مفاد پرست ٹولے نے امریکی سامراج کا سہارا لیا اور اس سے فوجی معاہدے کئے۔ پھر حکمران طبقات کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ لولی لنگڑی اسمبلی بھی ان کے عزائم کی راہ میں رکاوٹ ہے اس لئے انہوں نے اُسے بھی برطرف کر دیا۔ اس وقت کی اسمبلی کے اسپیکر مولوی تمیزالدین نے اس کارروائی کے خلاف ایک پٹیشن داخل کی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ منتخب اسمبلی کے ذریعے عوام ہی اقتدار اعلیٰ

کے مالک ہیں نہ کہ گورنر جنرل جو کہ اس وقت برطانوی حکومت سے نامزد کیا جاتا تھا، لیکن اس وقت کی اعلیٰ عدالت نے اس کارروائی کو جائز قرار دے دیا۔ حالانکہ سات سال بعد جسٹس منیر نے خود اعتراف کیا کہ انہوں نے یہ فیصلہ حکومت کے دباؤ اور دھمکی کے تحت سیاسی بنیاد پر کیا تھا۔

مسلم لیگ عوام میں اس قدر غیر مقبول ہو چکی تھی کہ جب مشرقی پاکستان میں انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ نے 310 نشستوں میں سے صرف نو نشستیں حاصل کیں لیکن مرکز میں اقتدار پر قابض ٹولے نے عوام کی رائے کو ماننے سے انکار کر دیا اور ان کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ درحقیقت سامراجی پٹھوؤں کی حکومت تمام جمہوری قوتوں کو کچلنے کا تہیہ کر چکی تھی اور اس نے اسی لئے کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان پر پابندی عائد کر دی، ترقی پسند ادیبوں کی انجمن، طلباء کی متعدد انجمنوں اور دیگر ترقی پسند تنظیموں پر بھی پابندیاں عائد کر دی گئیں اور ہزاروں سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کو قید کر دیا گیا۔ چونکہ کمیونسٹ پارٹی اپنے ملک کے مظلوم عوام کے حقوق کی اہم علمبردار ہوتی ہے اس لئے ہر عوام دشمن حکومت پہلا حملہ اسی پارٹی پر کرتی ہے اور عوام کے حقوق اور انصاف کی جدوجہد کی رہنما کمیونسٹ پارٹی پر حملہ کر کے اُسے کمزور کرنے سے پہلے کسی بھی حکومت کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اپنے ملک کے عوام پر حملہ کر سکے۔ وقت نے اس سچائی کو اور اُجاگر کیا ہے۔ فوجی ہیڈ کوارٹر کا سامراج نواز ٹولہ 1951 سے لے کر آج تک کبھی پنڈی سازش کیس کے نام پر تو کبھی کسی دوسرے بہانے سے ملک کے محبّ وطن اور جمہوری عناصر کو کچلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے بعد علاقے کی دوسری سامراج نواز حکومتوں اور امریکہ سے ایک فوجی معاہدہ بھی کیا گیا جس کی ایک شق یہ بھی تھی کہ ''اندرونی یا بیرونی حملے کی صورت میں وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے''۔

اب چونکہ عوام کے غیض وغضب سے بچنے کے لئے یہ امریکہ کا سہارا لے چکے تھے اس لئے نام نہاد مساوات کے لئے (پیرٹی) اور ون یونٹ مسلط کر کے مشرقی پاکستان کی نمائندگی گھٹا دی گئی اور اس طرح چھوٹے صوبوں کے عوام کو محکوم بنا دیا۔ حالانکہ ملک کا اقتدار اعلیٰ پہلے ہی امریکہ کے پاس گروی رکھ دیا گیا تھا اور اس حکمراں ٹولے میں فوجی ہیڈ کوارٹر کے چند سینئر جنرل بھی

شامل تھے پھر بھی اس حکومت میں چونکہ کچھ غیر فوجی حضرات بھی شامل تھے اس لئے انہیں عوام کے دباؤ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر یہ اعلان کرنا پڑا کہ فروری 1959 میں عام انتخابات کروائے جائیں گے لیکن انہیں جلد ہی احساس ہوگیا کہ عوام اُنہیں اور اُن کے آقا امریکہ کو مسترد کر دیں گے۔ انتخابات کے انعقاد سے صرف پانچ ماہ قبل اچانک ایوب خان اسٹیج پر نمودار ہوا اور ملک کا محافظ بن بیٹھا۔اس نے ملک میں مارشل لاء لگا کر تمام سیاسی جماعتوں، سیاستدانوں اور پریس پر پابندی لگا دی۔1954 میں جس چیتے نے خون کا ذائقہ چکھا تھا وہ اب مکمل طور پر آدم خور بن چکا تھا۔ چونکہ ایوب حکومت سابقہ نام نہاد سول حکومت سے بھی زیادہ عوام سے کٹی ہوئی تھی اس لئے اُسے امریکہ کے اور زیادہ سہارے کی ضرورت تھی لہذا اس نے پہلے سے موجود سیٹو، سینٹو اور بڈابیر دینے والے 1954 کے دوفریقی معاہدے کے علاوہ 1959 میں ایک اور دوفریقی معاہدہ بھی کیا۔ ایوب خان حکومت کا مارشل لاء تقریباً چار سال تک ملک میں رہا جس نے ملک میں بنیادی جمہوریت کا نظام رائج کیا جو کہ 1919 کی بلدیاتی حکومت کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔اس موقع پر یہ یاد رکھنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ یہ ایوب خان کا دورِ حکومت ہی تھا جب کثیر القومی کارپوریشن پھلی پھولی۔جس کے بعد اس نے ملک بھر کی دولت جونک کی طرح چوسنے میں دلال سرمایہ داروں کی مدد کی اور دلال سرمایہ داروں کے بدنامِ زمانہ بائیس خاندانوں نے ہر شعبہ معیشت میں اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔افسر شاہی سرمایہ پھول کر کُپا ہوگیا۔متعدد فوجی افسروں کو زمینیں دی گئیں تاکہ وہ ان مراعات کی بنا پر نہ صرف خاموش رہیں بلکہ خود بھی مفاد پرست ٹولے کا حصہ بن کر نہ صرف مارشل لاء لگانے بلکہ اپنے ہی ملک کے عوام پر گولیاں برسانے کے لئے ہر وقت تیار رہیں۔ یہاں یہ یاد دلانا بے محل نہیں ہوگا کہ جنرل ضیاء الحق نے بھی سندھ میں تین ہزار ایکڑ اراضی حاصل کی ہے جو سکھر ضلع کے گدّو بیراج کے علاقے میں ہے۔

آزادی اور خاص طور پر قائداعظم کے بعد مسلم لیگ اپنے منشور سے پھر گئی جس میں زرعی اصلاحات کے بلند بانگ دعوے کئے گئے تھے جس کے نتیجے میں مشرقی بنگال کے صوبائی انتخابات میں اس نے عبرت ناک شکست کھائی۔مسلم لیگ کے اپنے منشور کے عمل سے روگردانی

کی وجہ سے دوسری انتہائی رجعت پسند جماعتوں کے لئے راستہ صاف ہوگیا اور سیاسی جماعتوں کی سرگرمیوں پر مسلسل پابندی نے ملک میں ایسا ماحول پیدا کیا کہ جمیعت علمائے پاکستان جیسی مسلم لیگ سے بھی زیادہ رجعت پسند جماعتیں پیدا ہوگئیں۔ مسلم لیگ سرمایہ داروں کی ایسی جماعت تھی جو تمام مسلمانوں کی انتہائی خیرخواہ ہونے کی دعویدار بنتی تھی جب کہ جمیعت علمائے پاکستان جیسی کٹر رجعت پسند جماعتوں کا اسلام تو سیاسی بھی نہیں ہے کیونکہ یہ جاگیردارانہ اور قبائلی دور کے فرسودہ طبقات کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ مسلم لیگ بھی ترقی اور قومی خیرخواہی کی بجائے تنزل کی طرفدار ہے اور مسلم لیگ جو کبھی روشن خیال مسلمانوں کی جماعت تھی اور قائداعظم جس کے صدر تھے آج یہاں تک جا پہنچی ہے کہ اس کا صدر حکومت کے قریبی گٹھ جوڑ کا شریک ایک پیر ہے!

ایوب خان حکومت کا عوام نے عین اس وقت بیڑہ غرق کر دیا جب وہ اپنا دس سالہ جشن منا رہی تھی۔ عوام نے اس کے جبر اور اقتدار کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا اور گلی گلی اس خودساختہ صدر کے لئے ایوب کتّا ہائے ہائے کے نعرے لگانے لگے اور اس احتجاج کے بعد وہ گول میز کانفرنس بلانے پر مجبور ہوگیا لیکن جنرلوں کے اس ٹولے نے ایک بار پھر سازش کر کے اقتدار کی کُرسی پر قبضہ کر لیا اور نیا مارشل لاء لگا کر یحییٰ خاں کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا گیا۔ پھر اُس کے ساتھ ہی دوبارہ تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی اور اظہار رائے کی بندش عائد کر کے تمام آزادی سلب کر لی گئی لیکن بالآخر اس فوجی ٹولے کو بھی عوام کے شدید دباؤ کی وجہ سے بنیادی جمہوریتوں کے فرسودہ نظام کو ختم کر کے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات کا اعلان کرنا پڑا اور ون یونٹ کو توڑ کر مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں کو بحال کرنا پڑا اور یحییٰ خان نے اگرچہ انتخابات تو کروا دیے لیکن اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا۔ ایوب خان ملک کو پیچھے دھکیل کر 1919 تک لے آیا تھا۔ جب بلدیاتی ادارے ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں تھے لیکن صوبائی اور مرکزی حکومتیں انگریزوں کے قبضہ میں تھیں مگر یحییٰ خان اس سے کچھ آگے بڑھ کر 1935ء تک آنے کے لئے تیار تو ہوا اور عوام کے منتخب نمائندوں کو دوہرے نظام کی پیش کش کی جس کے مطابق اس وقت چند محکمے تو عوام کے منتخب نمائندوں کے سپرد ہونے

تھے لیکن اہم محکمے پھر بھی جنرلوں کے ٹولے اور اُن کے امریکی آقاؤں کے پاس رہنے تھے۔ عوام کے منتخب نمائندوں کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کے بعد یحییٰ خان نے پورے ملک پر حملہ تیز کر دیا اور خصوصاً مشرقی پاکستان میں قتل عام شروع کرا دیا۔ دراصل حقیقی مقابلہ تو پاکستان کے عوام اور اس فوجی ٹولے کے درمیان تھا جسے بعد میں سپریم کورٹ نے غاصب اور غیر منصف قرار دیا تھا۔ پارٹی کے فیصلے پر عمل کرتے ہوئے میں نے پاکستان کے پہلے سیاستدان ہونے کا اعزاز حاصل کیا تھا جس نے اس قتل عام کی مخالفت کی تھی۔ میں نے یہ قتل عام شروع ہونے کے دوسرے دن ہی یعنی 26 مارچ 1971 ہی کو ایک اپیل جاری کی تھی جس میں' میں نے کہا تھا کہ پاکستان کا مسئلہ سیاسی ہے اور یہ حل بھی سیاسی طور پر ہی ہوسکتا ہے۔ میں نے اپنی اس اپیل میں اس بات اور اپنے اس اعتماد کا اظہار بھی کیا تھا کہ بالآخر پاکستان کا محنت کش طبقہ اور جمہوری قوتیں یہ جنگ جیت لیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد میرے اس موقف کی بنا پر فوج کی بڑی توپیں میری جان کے درپے ہو گئیں حالانکہ اس معاملے میں تاریخ میرے اس موقف کو درست، موثر اور بروقت ثابت کر چکی تھی اور عوام نے یحییٰ خان اور اس کے ٹولے کو منہ توڑ جواب دیا تھا۔

اس وقت کی مذموم فوجی کاروائی میں یحییٰ ٹولے کی سخت شکست نے انہیں فی الحال پس پردہ اپنے بلوں میں جانے پر مجبور کر دیا تھا اگر چہ عارضی طور پر ہی سہی۔ جنرلوں کے ٹولے کے ہٹ جانے اور ملکی معاملات میں اپنی ٹانگ اڑانے سے جان چھوٹنے پر پاکستان کے عوام نے اپنے فطری راستے پر آگے بڑھنے میں پیش قدمی کی۔ یہ فطری راستہ امن اور ترقی کا تھا۔ شملہ معاہدہ جو دراصل لفظ بہ لفظ معاہدہ تاشقند جیسا ہی تھا، پر دستخط کئے گئے جس نے بھارت سے پُرامن اور دوستانہ تعلقات کی ایک نئی راہ کھول دی۔ واضح رہے کہ اس سے پہلے جنرلوں کا ٹولہ معاہدہ تاشقند کو ناکام بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ پاکستان نے سیٹو چھوڑ دیا تھا اور سینٹو اور 1959 والے دوفریقی معاہدے میں اپنی سرگرم شرکت ختم کر دی تھی۔ اس طرح ہمارا ملک غیر جانبدار ملکوں کی صفوں میں شامل ہو گیا تھا۔ ملک میں حقیقی نہیں تو لولی لنگڑی ہی زرعی اصلاحات کی گئیں اور پاکستانی بینک، بیمہ کمپنیاں اور اجارہ داروں کے کچھ کارخانے بھی قومی ملکیت میں لے

لئے گئے۔ صنعتوں میں قومی ملکیت کا تناسب بڑھا دیا گیا۔ تعلیمی اداروں کو قومی ملکیت میں لے کر میٹرک تک تعلیم مفت کر دی گئی اسٹیل ملز کی تعمیر تیزی سے مکمل ہونے لگی۔ مزدوروں کو کسی حد تک روزگار کی ضمانت اور دوسرے فوائد دیئے گئے۔ کسانوں کو بھی کس حد تک ان کے حقوق دیئے گئے مطلب یہ کہ سامراج کے اس اہم مہرے یعنی جنرلوں کے ٹولے کے کمزور ہو جانے سے ہمارے ملک میں خودمختاری کی ایک خوشبو آنے لگی اور جاگیرداری۔ سرمایہ داری کو کمزور کیا گیا لیکن سینئر جنرلوں کا ٹولہ اپنے زخم چاٹ رہا تھا اور مناسب موقع کی تاک میں تھا۔ ملک میں اقتدار غیر اجارہ دار سرمایہ داریا ابھرتے ہوئے نوازئیدہ سرمایہ دار کے ہاتھ میں آ گیا تھا جس نے سامراج سے نجات حاصل کرنے کا راستہ اختیار کیا اور کسی حد تک اندرونی اصلاحات بھی کیں لیکن نہ تو سامراج اور نہ ہی رجعتی جنرلوں کی اچھی طرح بیخ کنی کی گئی تھی اس لئے وہ کسی ایسے موقع کی تاک میں گھات لگائے بیٹھے تھے جب تمام عوام دشمن اور رجعت پسند ٹولوں کو ملا کر حکومت کو کمزور اور ناکام بنانا ممکن ہوگا۔ جنرل ضیاء مسلح افواج کے کمانڈر انچیف کے عہدے تک صرف اس لئے پہنچایا گیا کہ اس نے امریکہ کے اشارے پر اُردن میں فلسطینیوں کے خلاف فوجی کارروائی کی تھی۔ ضرورت سے زیادہ پراسرار ہونے کی وجہ سے یہ پُراسرار غازی ایک طرف تو قومی اتحاد کی پیٹھ ٹھونکتا رہا اور دوسری طرف ظاہراً منتخب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتا رہا۔ اُسے اپنے وعدوں، جھوٹی قسموں اور دوغلے پن کو چھپانے کے لئے اور بھی زیادہ اصلاحات کی ضرورت ہے۔ پروفیسر غفور اپنے ایک ایک بیان میں اقرار کر چکے ہیں کہ قومی اتحاد اس پُراسرار غازی کے ہاتھوں میں کھیل رہا تھا اور اُسے آگے لانے کی راہ ہموار کر رہا تھا۔

ایوب خان والے فوجی ٹولے پر تبصرہ کرتے ہوئے جسٹس کیانی مرحوم نے کہا تھا کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی وہ دستوں کی صورت میں آتی ہے۔ یہاں تو پوری فوج تھی۔ بمشکل اس ٹولے کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ لوگ جمہوریت کو قربان کرنے اور اپنی حقیقی آزادی کو بھینٹ چڑھانے کے لئے تیار نہیں ہیں مگر یحییٰ خان کرسی سے چپک گیا حالانکہ اس کے عوض اُسے آدھا ملک قربان کرنا پڑا۔ پھر ضیاء الحق نے قومی اتحاد کو اشارہ دیا کہ 1977ع کے انتخابی نتائج کو

ضائع کیا جائے جن میں اکثریت سے پاکستان پیپلز پارٹی کامیاب ہو چکی تھی۔قومی اتحاد کے رہنما یا تو پاگل تھے یا پالتو غنڈے جو یہ نہ سمجھ سکے کہ انگریزوں کا تربیت یافتہ جنرلوں کا ٹولہ کبھی بھی انتخابات نہیں کروائے گا اور اگر مجبور ہو کر انتخابات کو ٹال نہ سکا تب بھی اس کے نتائج کو تسلیم نہیں کرے گا۔

اپنے ہی ملک کے فاتح اس پراسرار غازی کو واشنگٹن والی ریگن گینگ اپنا مہرہ سمجھتی ہے اور ظاہر ہے کہ جو جرنیل اردن میں فلسطینیوں کا قتل عام کرنے کے لئے تیار ہوا اور اپنے ملک کے عوام کو کوڑوں ،اذیت گاہوں، بے جا پابندیوں اور پھانسی گھاٹوں کے تحفے دیتا ہو اس پر تو وہ اعتبار کریں گے کہ وہ امریکی سامراج سے نیا ناطہ جوڑتے ہوئے اپنے ملک کے مفادات پر سامراجی مفادات کو ترجیح دے گا اور اس پر تو وہ یہ بھی بھروسہ کر سکتے ہیں کہ یہ ان کے لئے اپنے ملک کی سلامتی اور قومی وقار کو بھی داؤ پر لگا دے گا۔!

محترم صدر اور ارکانِ عدالت: میں نے اور دوسرے جمہوریت پسندوں نے ہمیشہ ملک کے اقتدار اعلیٰ اور خودمختاری کے لئے جدوجہد کی ہے جب کہ ضیاء اور اس کے ٹولے نے ملک کا وقار اور ملک کو گروی رکھ دیا ہے۔16 اپریل 1981 کو امریکہ کی وزارتِ خارجہ کے ترجمان نے اعلان کیا کہ یہ درست ہے کہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان شادی کی بات چیت چل رہی ہے لیکن ابھی تو صرف منگنی ہوئی ہے! مسٹر آغا شاہی نے بھی اس تبصرے کی تصدیق کی تھی لیکن اب یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ اس رشتے میں دُلہن کا کردار کس کو ادا کرنا پڑے گا۔امریکہ کی حالیہ پیشکش بھی ایسی سیدھی سادی نہیں ہے جیسا کہ اُسے عوام کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔اس سلسلے میں متعدد وفود کی آمد و رفت ہوئی ہے اور اسی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہمارے سینئر جرنیلوں نے امریکہ کی تمام شرائط مان لی ہیں۔

اس بات کی خود ضیاء الحق نے بار بار تصدیق کی ہے کہ پاکستان فرنٹ لائن اسٹیٹ (اگلا مورچہ) ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ضیاء افواجِ پاکستان کو اس سامراجی فوج کا حصہ سمجھتا ہے جو ساری دنیا کے مظلوم عوام سے جنگ میں مصروف ہے جبکہ پاکستان کے عوام اپنی فوج کو اپنی

مادرِ وطن کے بہادر سپوتوں اور سچے جانثاروں کی فوج بنانا چاہتے ہیں۔ ضیاء اس علاقے میں سامراجیوں کا چوکیدار بننا چاہتا ہے جب کہ ہمارے عوام غیر جانبدار رہ کر آگے بڑھنے کے خواہشمند ہیں۔ وہ اسے اس قسم کی سازش جاری رکھنے کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے۔ اس حکومت نے مصطفٰے گوکل اور بیگم وقارالنساء نون کو اپنی کابینہ میں شامل کیا ہے۔ مصطفٰے گوکل کا سگا چچا اسرائیلی حکومت کا ایجنٹ تھا اور اُس کے لئے جاسوسی کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر اُسے عراق میں پھانسی دیدی گئی تھی اور جمال عبدالناصر مرحوم نے بھٹو شہید کو کہا تھا کہ وہ سی آئی اے کی بدنام ایجنٹ بیگم وقارالنساء نون عرف ''وکی'' سے خبردار رہیں جبکہ ضیاء نے اپنی کابینہ میں کم از کم دو جانے پہنچانے سی آئی اے ایجنٹ شامل کر کے خود ہی ثابت کر دیا ہے کہ وہ کس کا بندہ ہے۔

اس وقت پاکستان میں 252 غیر ملکی کمپنیاں کام کر رہی ہیں اور اُن میں سے اکثر امریکی ہیں۔ صرف ادویات کی کمپنیوں نے گذشتہ سال ساٹھ کروڑ ڈالر کا سرمایہ لگایا تھا، اب تک صرف سولہ سال میں تیس کروڑ روپے بطور منافع باہر بھیج چکی ہے۔ ہمارا ان کمپنیوں پر کنٹرول صرف اتنا ہے کہ جب گذشتہ سال یہ حکم جاری ہوا تھا کہ کمپنیاں اپنے چالیس فیصد حصص پاکستانیوں کو فروخت کریں تو ان میں سے صرف دو نے اس حکم کی تعمیل کی تھی۔ امریکی امدادی جماعت کے سربراہ مسٹر رچرڈ کرسلر نے کھلم کھلا ہماری مقدس دھرتی پر یہ اعلان بھی کیا کہ ضیاء حکومت رفتہ رفتہ قومی ملکیت میں لی گئی صنعتیں سرمایہ داروں کو واپس کر دیگی (روزنامہ امن، دیو پوائنٹ۔۲۴مئی) اسی سے یہ ظاہر ہے کہ حکومت ملک کے اقتدارِ اعلیٰ، خودمختاری اور قومی وقار کا کیسا خیال رکھ رہی ہے اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے سینئر جنرل درحقیقت کس کے نمائندہ ہیں اور کونسا طبقہ اقتصادی طور پر اپنے آقا امریکہ سے وابستہ ہے!

اب میں خارجہ پالیسی کی طرف آتا ہوں۔ خارجہ پالیسی ایک نازک موضوع ہے تجربہ کار سیاستدانوں یا کم از کم مہذب افراد کو ہی اس پر تبصرہ کرنا چاہیئے۔ ہوائی جہاز کے اغوا والے حادثے کے دنوں میں اسی پراسرار غازی نے افغانستان اور اس کی حکومت کیخلاف ایسی زبان استعمال کی کہ تمام بین الاقوامی آداب تک کو بھول گیا۔ اس کا لب ولہجہ دیہات کے ایک تھانیدار

سے کسی طرح بھی بہتر نہیں تھا۔ اگر چہ آغا شاہی بھی افغانستان کیخلاف بولا تھا مگر اس کا نقطہ نظر کچھ بھی ہو بہر حال اس بات کو ماننا پڑیگا کہ اس کا لہجہ مہذبانہ تھا۔ اس نے کم از کم بین الاقوامی آداب کا خیال رکھا تھا۔ ہم اپنے تمام پڑوسی ممالک سے پرامن تعلقات چاہتے ہیں لیکن یہ حکومت پرائے جھگڑے میں خواہ مخواہ ٹانگ اڑا رہی ہے۔ ہر بین الاقوامی اجلاس میں یہ امریکی ایجنٹوں کا کردار ادا کرتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس حکومت کا اور جیسا نقطہ نظر رکھنے والے افراد کی عقلمندی کا معیار بھی معمولی ہے۔ مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آ رہا ہے، جس دن افغان حکومت نے اپنے ہاں سود اور خواتین کی خرید و فروخت کو غیر قانونی قرار دیا تھا، اسی دن مرحوم مولانا مفتی محمود صاحب نے یہ بیان دیا کہ یہ پٹھانوں کی حکومت ہو ہی نہیں سکتی۔ شاید مرحوم کسی ایسے پٹھان کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے جو سود اور خواتین کی خرید و فروخت کو ناجائز سمجھتا ہو۔!

یہ حکومت افغانستان کی قومی جمہوری پارٹی کی حکومت پر الزام لگاتی ہے کہ وہ وہاں کے عوام کی منتخب حکومت نہیں ہے، حالانکہ یہ حکومت خود غاصب اور بن بلائی مہمان ہے اور یہ ایسا ہی ہے گویا کہ بھینس گائے پر الزام لگاتی ہے کہ ''تمہاری دم کالی ہے۔'' بدقسمتی سے انگریزوں نے ہمیں ورثے میں نہ صرف سینئر جنرل دیئے بلکہ ان کے فوجی تصور بھی ہمیں بھگتنے پڑ رہے ہیں۔ اس غاصب حکومت کے ترجمان بار بار یہ دہراتے رہتے ہیں کہ ''سوویت یونین کو گرم پانیوں تک پہنچنے کے لئے راستہ چاہیئے'' مگر یہ کہہ کر یہ حضرات حماقت کے تمام ریکارڈ توڑ رہے ہیں۔ یہ انیسویں صدی نہیں ہے۔ وہ دن گئے جب بھاپ پر چلنے والے جہاز ہوا کرتے تھے۔ اور زار کی حکومت سال کے نو مہینے اپنی بندرگاہیں استعمال نہیں کر سکتی تھی۔ اب تو یہ امریکی حکومت ہے جو کھلم کھلا یہ اعلان کرتی ہے کہ وہ کسی بھی وقت عربوں کے تیل کے کنوؤں پر جبری قبضہ کر سکتی ہے کیونکہ اسے چند اڈوں کی ضرورت ہے تاکہ مغرب کی طرف تیل کی سپلائی بلا روک ٹوک جاری رکھ سکے جو اس کی زندگی کے لئے بہت ضروری ہے۔ سوویت یونین دنیا کا تیل پیدا کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے اور وہ خود تیل کی برآمد بھی کرتا ہے۔ اس لئے گرم پانیوں تک پہنچنے والے اس نام نہاد پروپیگنڈے کا یورپ میں کوئی رواج نہیں ہے لیکن ہمارے جنرلوں کی پیٹھ تھپکی جاتی ہے کہ وہ یہی

فرسودہ اور بے سرا راگ الاپتے رہیں۔جس طرح ریگن نے امریکی کمپنیوں کو یہ اجازت دے رکھی ہے کہ وہ ترقی پذیر ممالک کو وہ دوائیاں بھی برآمد کر کے منافع کماتی رہیں جن کو خود ان کی اپنی وزارت صحت، انسانی صحت کے لئے نقصان دہ قرار دے کر ان پر پابندی عائد کر چکی ہے۔

مسٹر اے ٹی چودھری روزنامہ ڈان میں ایک کالم کے ذریعے ہمیں بتا چکے ہیں کہ شاہ محمد دوست وزیر خارجہ افغانستان اور ہمارے (سابقہ) وزیر خارجہ آغا شاہی، سب مذاکرات کرنے کے لئے تیار بیٹھے تھے مگر اس حکومت نے انہیں اس کی اجازت ہی نہیں دی۔ اگرچہ کبھی کبھار پراسرار غازی دکھاوے کے لئے یہ کہتا رہتا ہے کہ وہ افغانستان سے مذاکرات کے ذریعے مسائل کا پُرامن حل چاہتا ہے لیکن دراصل سامراجی دباؤ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر وہ اس کے الٹ راستہ اختیار کرتا ہے۔تقریباً دو سال قبل جب پاکستان سامراج سے نئے ناطے میں نہیں پھنسا تھا، اس وقت مسائل کے پرامن حل کے لئے افغانستان کی تجاویز کے متعلق اس کا رویہ کافی لچکدار تھا ۔افغان حکومت کی 25 اپریل 1981 کی تجاویز پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے جنرل ضیاء نے کہا تھا کہ اس میں کافی لچک ہے اور ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کی بنیاد پر دو طرفہ یا سہ طرفہ مذاکرات کے ذریعے اس مسئلے کو پرامن طور پر حل کیا جا سکتا ہے لیکن یہ صرف پراسرار غازی کے دکھاوے کے دانت تھے۔ظاہر ہے کہ سامراجیوں کو تو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی کیونکہ وہ افغانستان کے مسئلے کو سوویت یونین کے خلاف دباؤ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے فوراً مداخلت کی۔ مکہ والی اسلامی ممالک کی کانفرنس میں رجعت پسند مسلمان ممالک نے کابل حکومت سے مذاکرات کی تجویز کو اکثریت سے مسترد کر دیا اور جس دن مکہ والا اعلان نامہ منظور کیا گیا، اسی دن اس وقت کے فرانس کے صدر گیسکا ردیستان نے بھی ایک نئی تجویز کا اعلان کیا اور اس اعلان میں کہا گیا کہ افغانستان کا مسئلہ حل کرنے کے لئے فرانس، برطانیہ، امریکہ، سوویت یونین اور علاقے کے ایک یا دو ممالک کو آپس میں مذاکرات کرنے چاہئیں لیکن اس میں افغانستان کو نہیں شامل ہونا چاہئے! یعنی سامراجیوں اور مقامی رجعت پسندوں کی طرف سے پیدا کئے ہوئے اس مسئلہ کو دو طرفہ مذاکرات کے ذریعے حل کرنے کی

بجائے سامراجیوں اور ان کے پٹھوؤں کی تجویز کے مطابق اسے ایک بین الاقوامی مسئلہ بنایا جائے۔ سابق سوویت صدر کامریڈ بریژنیف نے خلیج کے علاقے میں امن کے لئے ایک پانچ نکاتی پروگرام پیش کیا تھا۔ نہ صرف ترقی پسند عرب ممالک بلکہ کویت نے بھی اس پروگرام کی تائید کی تھی کیونکہ اسے اپنا وقار امریکی مفادات سے زیادہ عزیز تھا لیکن ہمارے ملک کا حکمران ٹولہ اس پر اندھا، بہرا اور گونگا بنا رہا بلکہ اس کی بجائے یہ حکمران اسرائیل، سعودی عرب اور ترکی کے ساتھ مل کر امریکی فوجی منصوبہ بندی اور حاشیہ برادری کا حصہ بن رہے ہیں۔

اٹل بہاری واجپائی اور مرار جی ڈیسائی گواہی دے چکے ہیں کہ حفیظ اللہ امین نے انہیں کہا تھا کہ اگر وہ پاکستان پر مشرق کی طرف سے حملہ کریں تو وہ خود مغرب کی طرف سے حملہ کر دے گا تا کہ پاکستان کا قصہ ہی پاک ہو جائے اور یہ تو اب ایک کھلا راز ہے کہ امین سی آئی اے کا ایجنٹ تھا۔ دراصل اس کی مرضی یہ تھی کہ خطے میں ایسی صورت حال پیدا کر دے کہ امریکہ کو اپنی فوجیں یہاں اتارنے کا موقع مل جائے اور پھر وہ اس علاقے پر اپنا کنٹرول قائم کر سکے۔ یہ اس بات کا ایک واضح ثبوت ہے کہ امریکہ ہمارا کتنا خیر خواہ ہے۔ ہمارے پراسرار غازی نے افغانستان کے متعدد قاتلوں کو پناہ دی ہوئی ہے جنہوں نے بے شمار مولوی صاحبان کو محض اس لئے قتل کیا کہ وہ افغانستان کی ترقی پسند حکومت کے حامی تھے۔ ابھی حال ہی میں انہوں نے احمد شاہ مسعود کو اس وقت شہید کر دیا جب وہ اپنے رب کے حضور عبادت میں مصروف تھے (یعنی نماز کے دوران)۔ ہمارے سنسر شدہ اخبارات نے ایسے کارناموں کو بھی فخریہ طور پر اور حکومت کی ہدایت پر بڑھا چڑھا کر شائع کیا۔ افغانستان کی جمعیت علمائے اسلام نے افغانستان کے عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ افغانستان کی عوامی حکومت کی حمایت کریں جب کہ دوسری جانب افغان بھگوڑوں کا ایک رہنماء ایک پریس کانفرنس میں (منعقدہ مئی 1981) اقرار کر چکا ہے کہ ان کی جماعتیں بی بی سی اور وائس آف امریکہ کے سہارے پر جی رہی ہیں۔ ہماری موجودہ حکومت یہ دعویٰ کرتے نہیں تھکتی کہ اس کی خارجہ پالیسی بہت کامیاب ہے جس کے نتیجے میں ملک کی بین الاقوامی ساکھ میں بہت اضافہ ہوا ہے لیکن اس ساکھ کا عالم یہ ہے کہ عالمی عدالت انصاف کے لئے پاکستان کے امیدوار

جسٹس انوارالحق کو سلامتی کونسل میں صرف ایک ووٹ ملا تھا۔

اب یہ تو ہر کوئی جانتا ہے کہ یہ سوویت یونین ہی ہے جو قیام پاکستان کے وقت سے ہی فولاد کے کارخانے کی پیشکش کرتا رہا ہے، اَب یہ اور بات ہے کہ ہم نے اس کی پیشکش کو ستر کی دہائی میں جا کر قبول کیا۔ اگرچہ کچھ عرصہ پہلے سوویت سفیر یہ پیشکش بھی کر چکے ہیں کہ سوویت یونین بجلی پیدا کرنے والے جنریٹر، ٹریکٹر کا کارخانہ اور بعض دوسری صنعتیں بھی پاکستان کو لگا کر دینے کے لئے تیار ہے لیکن ہماری حکومت اس پیشکش پر بھی ہونٹ سی کر بیٹھی ہے۔

سوویت یونین ہر ترقی پذیر ملک کو فولاد کے کارخانے وغیرہ لگا کر دینے کی پیشکش اس لئے کرتا رہا ہے کہ صنعتی ترقی کے بعد یہ ممالک سامراجی شکنجے سے آزاد ہوسکیں۔ دراصل یہ سوویت یونین کی سامراج دشمن جدوجہد کا ایک مثبت پہلو ہے مگر امریکہ ان ممالک میں فولاد کے کارخانے اور دوسری بنیادی صنعتیں لگانے کا مخالف ہے کیونکہ وہ تو صرف موت کا سوداگر ہے۔ ہمیں بخوبی علم ہے کہ دنیا بھر میں صرف پندرہ دن میں ہتھیاروں پر اتنا خرچ ہوتا ہے کہ اس سے ساری دنیا کی آبادی کو سال بھر کے لئے روٹی، کپڑے، مکان، علم اور علاج کی سہولتیں آسانی سے فراہم کی جاسکتی ہیں۔ ہم ایک چھوٹا اور ترقی پذیر ملک ہیں، اس لئے اسلحہ وغیرہ جیسی غیر پیداواری، تباہ کن اور انسان کش اشیاء پر بے تحاشا اخراجات برباد کرنے کی ہماری حیثیت ہی نہیں ہے جبکہ امریکی معیشت ایک جنگی معیشت ہے اور وہاں کی ساٹھ فیصد صنعت اسلحہ سازی سے متعلق ہے اس لئے امریکہ کی ہر حکومت اپنے ان صنعتکاروں کے مفادات کے لئے نت نئے گاہک پھنساتی رہتی ہے اور اس بار اس نے ہمارے بدنصیب ملک میں اپنے ایجنٹوں کو برغلا کر تیار کیا ہے۔ اس پراسرار غازی کی حکومت ایک سو پینتیس ارب روپے کے ہتھیار امریکہ سے حاصل کرنے والی ہے دوسری طرف چین نے بھی سامراج دشمن جدوجہد اور سوشلسٹ کیمپ کی اندھی نفرت میں آ کر ہمارے ملک میں ایک سو تیس ارب روپے کے ہتھیار لا کر جمع کر دیئے ہیں مگر ہر دوسرے دن یہ پراسرار غازی بذات خود یہ اعلان کر دیتا ہے کہ اسے ہندوستان کی زبوں حال پر رحم آتا ہے جبکہ خود ہمارے ہاں اسکولوں، اسپتالوں اور تھانوں کی عمارتیں اس حکومت کے کردار کی منہ بولتی علامت

کے طور پر کھڑی ہیں۔حکومت اگر مارشل لاء ایک سال پہلے بھی ختم کر دے تو ہم تین سو پینتیس کروڑ روپے بچا سکتے ہیں کیونکہ صرف مارشل لاء کا روزانہ خرچ ایک کروڑ روپے ہے اور اس کا چوتھائی حصہ بھی تھر کے علاقے کو کافی ترقی دے سکتا ہے، جہاں، انسان قحط کا شکار ہو کر بھوک سے مر رہے ہیں۔امریکہ سے کیئے گئے اسلحہ کے سودے کا دو فیصد (سولہواں حصہ) بھی تھر کے غریب اور افلاس کے مارے ہوئے لوگوں کو اور مظلوم و پسماندہ انسانوں کو بھوک سے مرنے سے بچا سکتا ہے۔اس لئے نہ صرف تھر بلکہ ملک بھر کے غریبوں اور محنت کشوں کا مفاد ملک میں سامراج دشمن جدوجہد سے وابستہ ہے۔

ایک فوجی افسر نے مجھے خفیہ فوجی اذیت گاہ میں قید کے دوران بتایا تھا کہ حکومت تھر کے علاقے میں ہماری مقبولیت سے قطعی طور پر باخبر ہے اور اسے سختی سے روکے گی۔مگر انہیں یہ بات سمجھنے میں ایک عرصہ چاہئے کہ اس مقصد کیلئے انہیں وہی سامراج دشمن اقدامات کرنے پڑیں گے جن کا ہم ان سے مطالبہ کرتے ہیں۔انہیں یہ سمجھنے میں بھی کافی وقت لگے گا کہ ہماری اس مقبولیت کی وجہ غربت کے خلاف ہماری انتھک جدوجہد اور حکومت کی ہمارے خلاف معاندانہ کارروائیاں ہیں اور یہ مجبوریاں ہی ہیں جو عظیم ہیرو اور عظیم تر آس پیدا کیا کرتی ہیں۔

یہ پاکستان کے عام لوگ ہی تھے جنہوں نے برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد کی تھی۔پراسرار غازی اور اس کے تمام سنئیر ساتھی اس وقت انگریزوں کے ساتھ تھے۔یہ انگریزوں کی فوج کے افسر تھے اور اس بات پر شرمندہ ہونے کی بجائے اب یہ پراسرار غازی الٹا گستاخ ہو گیا ہے۔اب سے ڈیڑھ سال پہلے جب یہ ترکی گیا تھا اور وہاں کے پراسرار غازی سے ملا تھا تو اس وقت اس نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ میں اس وقت تک ملک میں انتخابات نہیں کراؤں گا جب تک ملک کے لوگوں کے ہوش ٹھکانے نہیں آجاتے! دونوں فوجی ٹولوں میں کیسی یکسانیت ہے دونوں امریکی سامراج کے پٹھو ہیں اور دونوں نے اپنے منتخب وزرائے اعظم کو پھانسی دے کر شہید کیا ہے۔بہرحال اَب جبکہ یہ پاکستان کے عوام کے خلاف نفرت و حقارت کا اظہار کرنے میں بھی کوئی جھجک نہیں محسوس کرتا تو پھر کیوں نہ عوام اس کا منہ توڑ جواب دیں؟

پاکستان کے عوام نے گذشتہ سال اپنا یوم آزادی بڑی دھوم دھام سے منایا مگر پراسرار غازی نے یہ موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور فوراً دعویٰ کر دیا کہ ایسا کر کے دراصل لوگوں نے اس کی پالیسی کی تائید کی ہے حالانکہ وطن سے محبت کے اظہار کا مطلب ہی یہ ہے کہ عوام مادر وطن کو برباد کرنے والوں کے خلاف اپنی نامنظوری اور ناپسندیدگی کا اعلان کریں۔

موجودہ حکومت دنیا کے سامنے ہماری عوام کی ہمیشہ غلط تصویر پیش کرتی ہے۔ ایک بار پراسرار غازی نے یہ اعلان بھی کیا کہ چونکہ آغا شاہی لاہور اور کراچی کے دو اجلاسوں میں خطاب کرنے میں کامیاب ہوا ہے لہٰذا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عوام اس کی خارجہ پالیسی کو پسند کرتے ہیں! حالانکہ یہ مخصوص اور محدود اجلاس تھے اور ان میں ایک مخصوص نکتہ نظر والے تھوڑے سے لوگوں کو بلایا گیا تھا اس کے باوجود اگر یہی کسوٹی ہے تو میں بہت زیادہ اعتماد کے ساتھ یہ اعلان کرسکتا ہوں کہ میرا نقطہ نظر زیادہ اعتدال پسند و مقبول ہے کیونکہ 12 پریل 1979 کو جب مجھے لاہور ہائی کورٹ میں پیش کیا گیا تو اس وقت مذکورہ ہر دو اجلاسوں سے دوگنے لوگ نہ صرف وہاں موجود تھے بلکہ میرے حق میں پرجوش نعرے بھی لگا رہے تھے!

بہرحال اگر کوئی سنجیدگی سے یہ جاننا چاہتا ہے کہ اس ملک کے عوام کو کونسی خارجہ پالیسی پسند ہے تو میں اس کی واضح مثال دے سکتا ہوں۔ کعبتہ اللہ شریف والے حادثے کے دوران ہمارے عوام نے کھل کر اپنی امنگوں کا اظہار کیا ہے اور جیسے ہی یہ خبر پھیلی تو لوگ ملک کے کونے کونے میں سڑکوں پر نکل آئے اور یہاں امریکی سامراج کی پٹھو حکومت ہونے کے باوجود لوگوں نے امریکی سفارتخانے کو نذرِ آتش کر دیا۔ پراسرار غازی کہتا ہے کہ اس کا سوویت یونین کے خلاف جنگ کا کوئی ارادہ نہیں ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی وہ سچ بول رہا ہے تو پھر اسے یہ اتنے ہتھیاروں کی ضرورت کیوں ہے؟ یا تو یہ ہمارے اپنے ملک پر حملہ تیز کرنا چاہتا ہے یا پھر یہ کہ وہ اپنے جھوٹ کے ریکارڈ میں مزید اضافہ کرنے پر کمربستہ ہے۔ اور اب تو یہ واضح طور پر نظر آ رہا ہے کہ یہ پراسرار غازی ہمارے ملک کو افغانستان، ایران، بحر ہند اور خلیجی ممالک کے خلاف واشنگٹن اور پیکنگ کی سازشوں کا اڈہ بنانا چاہتا ہے اور ہماری فوج کو یہ سامراجیوں اور ان

کے چینی ساتھیوں کی کرائے کی فوج بنانا چاہتا ہے۔اسی لئے اسلحہ کی یہ ایسی بارش ہورہی ہے کہ گویا ہمارا پورا ملک فوجی کیمپ ہے۔شاہراہ ریشم کو کشادہ کرکے اسے عام آمدورفت کیلئے بند کردیا گیا ہے تاکہ یکسوئی سے چینی ہتھیار حاصل کئے جاسکیں۔دوسری طرف افغان بھگوڑوں کو تربیت دیکر اور اسلحہ سے لیس کرکے افغانستان کی طرف دھکیلا جارہا ہے۔گوادر میں امریکہ کو بحری اڈہ دے دیا گیا ہے۔جاسوسی والے اواکس طیارے مشرقی اور مغربی سرحدوں پر، پرواز کے لئے پر تول رہے ہیں، جس کے بعد یہ کہاوت درست ثابت ہورہی ہے کہ امریکہ آخری پاکستانی سپاہی تک افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جنگ جاری رکھے گا۔۔مگر متعلقہ حلقوں کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ پاکستان کے باشعور عوام اس سودے بازی میں فریق نہیں ہیں اور وہ اپنی آزادی کی حفاظت کے لئے کسی بھی وقت کوئی بھی کاروائی کرنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔

جناب والا۔ایک طرف تو ہمارے اقتصادی وسائل امریکی مقاصد کے لئے ضائع کئے جارہے ہیں تو دوسری جانب وطن عزیز کی آزادی کے پینتیس سال بعد بھی حکومت لوگوں کے لئے پانی کا بندوبست بھی نہیں کرسکی ہے۔حکومت یہاں پر بجلی،صنعت یا روڈ کے لئے اک ذرا سے پیسے بھی خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔تھر کے لوگ ملک بھر کے لوگوں سے زیادہ محرومیوں کا شکار ہیں۔وہاں اب تک نہ تو علاج معالجے کی کوئی سہولت میسر ہے اور نہ ہی حصول علم کی کوئی سہولت بلکہ گاؤں گاؤں میں اسکولوں میں جانور بندھے ہوئے ہیں۔

پراسرار غازی ریڈیو، ٹی وی، اخبارات اور جرائد سمیت نشرواشاعت کے تمام ذرائع کو اپنی اور دوسرے امریکی ایجنٹوں کی تشہیر کے لئے استعمال کررہا ہے لیکن اسے یہ بھی بخوبی معلوم ہوگا کہ عوام اسے اور اس کے امریکی آقاؤں کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔اس لئے اس نے ملک بھر میں سخت سنسر شپ عائد کردی ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اگر سنسر شپ ہٹادی گئی اور سچ کی کچھ سطریں بھی اخبارات ورسائل میں آنا شروع ہوگئیں تو اس کے غبارے سے ہوا نکل جائے گی بالکل جس طرح روشنی کی چھوٹی سی کرن کے سامنے آنے پر بھی مہیب اندھیرے کو ہٹنا پڑتا ہے۔ صرف کمزور اور احمق حکومتیں ہی اس خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہیں کہ وہ سچ کو چھپا کر دھوکہ دہی کو ہمیشہ

جاری رکھ سکتی ہیں اور جو جہالت کے اندھیرے کے سہارے کرسی پر قبضہ کرتے ہیں وہ ملک کے عوام کے صرف دشمن ہی ہو سکتے ہیں۔

آجکل ہمارے ملک میں پندرہ سے تیس ہزار سیاسی قیدی ہیں اور ان سب کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ اپنے وطن سے پیار کرتے ہیں۔ ایک انگریزی ''پرک'' کا مقولہ ہے کہ جتنا کسی ملک کے لوگ آزاد ہوں گے اتنا ہی وہ ملک بھی آزاد ہوگا۔ اس لئے ہمیں یہ معلوم ہے کہ اس گھٹن کی وجہ امریکہ کی ماتحتی ہے۔ موجودہ حکومت چادر اور چار دیواری کے تحفظ کے متعلق اپنے لمبے چوڑے دعوؤں کا پرچار کرتی ہے لیکن خواتین جو ہمارے ملک کی آبادی کا نصف حصہ ہیں، ان سے ان کا سلوک انتہائی امتیازی اور انتہائی غیر منصفانہ ہے۔ ملک کے کونے کونے میں بچوں کے پالنا گھر اور تعلیم بالغان کے مراکز کے بجائے یہ دیکھ کر دل کڑھتا ہے کہ اس ملک میں جگہ جگہ فوجی عدالتیں اور تھانے کھلے ہوئے ہیں۔ عورتوں کے لئے روزگار کے نئے مواقع فراہم کرنے کی بجائے یہ تو اس وقت موجود چند مواقع بھی ختم کر رہے ہیں۔ عورتوں کو بھی کوڑے مارے جا رہے ہیں۔ کھلاڑی خواتین کو کھیلوں کے ایشیائی مقابلوں میں شرکت نہیں کرنے دی گئی اور کچھ بڑی ٹوپیاں تو ہاتھ دھو کر عائلی قوانین کے پیچھے بھی پڑ گئی ہیں جو کہ خواتین اور دوسری ترقی پسند جماعتوں کی انتہائی سخت جدوجہد کے بعد بنائے گئے تھے۔ ہدایات جاری کی گئی ہیں کہ ٹیلی ویژن پر خواتین کے چہرے کم سے کم نظر آنے چاہیں۔ اس لئے صرف پراسرار غازی اور میاں طفیل کے چہرے دکھانے کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے شاید یہ خود ہی اپنے چہرے دیکھ کر خوش ہوتے ہوں گے ورنہ لوگ تو اب ان کے خوبصورت چہروں سے بیزار ہیں۔ دراصل یہ حکومت صرف سچ کی ہی نہیں بلکہ حسن و خوبصورتی کی بھی دشمن ہے! پہلے ہر حکمران طبقہ اپنے ہر مخالف پر کمیونسٹ ہونے کا الزام لگا کر اسے تنگ کرتا تھا لیکن اب ان کا توازن تبدیل ہو جانے کی وجہ سے حکومت یہ حقیقت چھپانے کی کوشش کر رہی ہے کہ میں کمیونسٹ ہوں اور اس کی بجائے حکومت ہم پر یہ الزام لگا رہی ہے کہ ہم مختلف صوبوں کے درمیان منافرت پھیلا رہے ہیں۔ دراصل پراسرار غازی اور اس کے رفقاء عقل کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہیں ورنہ یہ بات تو نہایت آسانی سے ان کی سمجھ میں آجاتی کہ ایک کمیونسٹ

جو دنیا بھر کے محنت کشوں۔ایک ہو جاؤ! کے نعرے کا علمبر دار ہوتا ہے وہ صوبائی منافرت نہیں پھیلا سکتا اور جیسا کہ میں پہلے ہی اپنے سپریم کورٹ کے بیان میں صوبائیت کے متعلق کہہ چکا ہوں کہ میں اس وقت سے محنت کش ہوں جب بابا آدم محنت کرتے تھے اور اماں حوا چرخہ کاٹتی تھی یعنی کہ روز اول سے۔! میں گذشتہ پانچ ہزار سال سے سندھی، پانچ سو سال سے مسلمان اور گذشتہ ۲۸ برس سے ایک پاکستانی ہوں، اب یہ بات میں عدالت پر چھوڑتا ہوں کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ میری وفاداری کس طرف ہے۔!

صدر محترم اور ممبر صاحبان! پاکستان کے عوام اور موجودہ حکمران ٹولہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔ہم زرعی اصلاحات کے لئے جدوجہد کررہے ہیں جبکہ یہ حکومت ملک کے صرف چند گنے چُنے جاگیرداروں کی طرفدار ہے اور اب تو یہ بات عالم آشکار ہے کہ محض زرعی اصلاحات کی وجہ سے ہی مشرقی پنجاب (بھارت) کی اتنی ہی اراضی مغربی پنجاب (پاکستان) کے مقابلے میں تین گنا زیادہ گندم پیدا کرتی ہے۔کوئی بھی ملک اپنی مکمل صلاحیت کیمطابق اس وقت تک زرعی اجناس پیدا نہیں کرسکتا جب تک کہ تمام زمین کسانوں میں تقسیم نہ کردی جائے۔ضیاء حکومت کے انتخابات نہ کرانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انتخابات کرادیئے گئے تو ہر سیاسی پارٹی کو زرعی اصلاحات کرانے کا وعدہ کرنا پڑے گا ورنہ اسے کوئی ووٹ نہ دیگا۔ ویسے بھی ہمارے ملک میں یہ وڈیرہ شاہی صرف فراڈ (جعلسازی) کے ذریعے ہی چل رہی ہے اور کوئی بھی وڈیرہ، چودھری یا خان علی الاعلان یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے پاس ایک سوا یکٹر (چار مربعے) سے زیادہ زمین ہے کیونکہ بھٹو حکومت کی زرعی اصلاحات کے مطابق ایک سوا یکٹر سے زیادہ تمام زمین پاکستان میں تقسیم ہوچکی ہے۔اب یہ علیحدہ بات ہے کہ پھر بھی ایسے بہت سے بڑے جاگیردار اب بھی موجود ہیں جن کے پاس جعلسازی اور ہیرا پھیری کے ذریعے محفوظ کر لی گئی کافی زمین موجود ہے۔ ویسے بھی ہمارے ہاں برصغیر میں انگریزوں کے دور سے پہلے یہ جاگیرداری کی لعنت تھی ہی نہیں اور ریکارڈ یہ ثابت کرتا ہے کہ 1857 کے بعد انگریزوں نے صرف ان کو ہی زمینیں دیں جنھوں نے اپنے بہادر عوام سے غداری کر کے، انگریزوں کی

طرفداری کر کے انہیں بچایا تھا۔اس امر سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ سیاسی، اخلاقی اور قانونی طور پر یہ وڈیرہ شاہی شکست کھا چکی تھی اور جہاں تک اس کے متعلق حکومت کے رویئے کا تعلق ہے اس پر مجھے مسلح افواج کے محکمہ جاسوسی کے ایک میجر سے اپنی ملاقات یاد آتی ہے! مجھے لاہور کے شاہی قلعہ سے واپس خفیہ فوجی اذیت گاہ میں لانے کے بعد ایک دن وہ میجر میری کھولی میں آیا اور کہنے لگا کہ اگر کوئی غیر قانونی حرکت میرے علم میں ہو تو بتاؤں تا کہ وہ اسے درست کر سکے۔ میں نے اسے ایک وڈیرے کے متعلق یہ بتایا کہ اس کے پاس غیر قانونی طور پر ضلع نوابشاہ میں ساٹھ ہزار ایکڑ زمین موجود ہے۔اس نے جواب دیا کہ ایسی باتوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے البتہ اگر کہیں کوئی ڈی سی آر ہو تو ہم فوراً کاروائی کریں گے۔ اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگوں کو تنگ کرنے کے لئے معمولی باتوں پر تو کمر بستہ ہوتے ہیں لیکن ایسا کوئی کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ جس سے ملک کے عوام کی اکثریت کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہو۔

ملک کے سرمایہ داروں سے خطاب کرتے ہوئے جنرل ضیاء نے اپنا بھانڈا خود ہی پھوڑ دیا۔اس نے اقرار کیا کہ مارشل لاء سرمایہ داروں اور عوام کا خون چوسنے والے دوسرے لوگوں کے منافع کی حفاظت کے لئے ہے اور جیسے ہی وہ اسے یقین دلائیں گے کہ ان کا سرمایہ مارشل لاء کے بغیر بھی محفوظ ہے اسی دن وہ انتخابات کا اعلان کریگا (20 اپریل 1982، جنگ کراچی)۔گویا کہ اس پراسرار غازی کے لئے سرمایہ دار محفوظ ہیں تو سب کچھ ٹھیک ہے اور اسلام اور مارشل لاء کا مشن مکمل ہو گیا۔! اور پھر ہر عمل کا نتیجہ مثبت ہے۔ نہ تو یہ اتنا معصوم ہے کہ جو کچھ بھی کہتا ہے وہ خود بھی نہیں سمجھتا اور نہ ہی گاموں سچار ہے کہ کچھ بھی چھپانا نامناسب سمجھتا ہو۔اس کے برعکس یہ تو ایک ایسا جھوٹا ہے کہ مثالی جھوٹے مرحوم قیصر خان لوند کا بھی استاد ہے۔ دراصل اس نے مذکورہ بالا بیان دے کر ہمارے زخموں پر نمک چھڑکا ہے تا کہ اپنے اور اپنے سینئر رفقاء کے اذیت پسندانہ جذبات کی تسکین کر سکے۔

موجودہ حکومت اتنی سنگدل ہے کہ یہ ہوائی جہاز کے اغوا جیسے قومی المیوں کو بھی کرسی سے اور زیادہ مضبوطی سے چپکے رہنے اور اپنے حقیقی مخالفین سے جان چھڑانے جیسے مکروہ مقاصد

کے لئے استعمال کرنے سے بھی باز نہیں آتی ۔ اس موقع پر بیگم نصرت بھٹو، مس بے نظیر بھٹو اور ہزاروں دوسرے ترقی پسند اور محبّ وطن افراد کو گرفتار کیا گیا۔ ہم پر بھی ملک چھوڑنے کے لئے دباؤ ڈالا گیا۔ یہاں تک کہ اس ملک سے باہر جانے کے مقابلے میں جیل کے اندر رہنے کے لئے بھی ہمیں جسمانی طور پر جدوجہد کرنا پڑی۔ یہ ہوائی جہازوں کے اغواء جیسے حادثات بھی دراصل اس حکومت کی عوام دشمن پالیسیوں کا ہی نتیجہ ہیں۔ آپ انسان کے جسم میں گولیاں بو کر گلاب کے پھول تو نہیں کاٹ سکتے؛ ویسے بھی دہشت پسندی کے انفرادی واقعات اس حکومت کو مزید فائدہ ہی پہنچاتے ہیں اور حکومت اپنی اصلاح کرنے کی بجائے ان واقعات کی آڑ لے کر عوام پر اور زیادہ عذاب اور ظلم وسفا کی نازل کرتی ہے۔ یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ اس مسئلے کے دو پہلو ہیں ۔ ایک یہ کہ انتقام لینے کی کوشش کرتے ہوئے یہ بہادر نوجوان بھول جاتے ہیں کہ فقط وہی بھٹو شہید کے وارث نہیں ہیں بلکہ ملک بھر کے مظلوم عوام بھی محنت کشوں کے اس رہنما کے وارث ہیں اور وہ کسی نہ کسی شکل میں مصروف جدوجہد ہیں۔ دوسرا پہلو ان بیانات سے نمایاں ہوتا ہے جن میں اس عمل کے لئے ان نوجوانوں پر صرف تنقید ہی کی جاتی ہے۔ یہ حضرات اس حکومت کی طرف سے ہونے والے تشدد کی طرف آنکھیں بند کر کے اس عمل کی ہی نشاندہی کرتے ہیں جو دراصل سرکاری مشینری کے تشدد کا ہی ردعمل ہوتا ہے۔ دراصل ہم میں سے ہر ایک کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ پہلے ہمیں اس حکومت کے تشدد، اقتدار پر غیر قانونی قبضے اور اسے طول دینے کے عمل کا خاتمہ کرنا پڑیگا اس کے بعد ہی ملک میں تشدد کی راہ کو روکا جاسکے گا۔ ایک غیر ملکی صحافی کو کچھ عرصہ قبل جواب دیتے ہوئے اس پراسرار غازی نے کہا تھا کہ وہ فوج کے کمانڈر انچیف کا عہدہ نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ یہی اس کے اقتدار کا اصل سرچشمہ ہے اس لئے یہ اپنی میعاد میں خود ہی اضافہ کرتا رہتا ہے اور اس بات کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ جنرل ضیاء کو اتنی بڑی فوج میں کسی ایک جنرل پر بھی اعتماد نہیں ہے اور اسے یہ اندیشہ ہے کہ اگر وہ کمانڈر انچیف کا عہدہ چھوڑ کر مکمل طور پر صرف ایک صدر بن کر رہ گیا تو کہیں کوئی آنے والا کمانڈر انچیف بھی اِسی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسکا تختہ نہ اُلٹ دے۔ اس معاملے کا دوسرا پہلو اور بھی زیادہ دلچسپ ہے اور یہ تو اصل میں اس آمر کا اقرار نامہ ہے کہ وہ

درحقیقت صرف ڈنڈے، گولی اور بندوق کا نمائندہ ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ پھر یہ اپنے چہرے پر ایک مُلا کا نقاب کیوں چڑھائے رکھتا ہے؟ اور ہر وقت یہ ظاہر کرنے کی کوشش کیوں کرتا ہے کہ وہ تو محض اسلام کی خدمت کے لئے کرسی سے چپکا ہوا ہے۔ ہم امام خمینی جیسے جرّی حضرات کے لئے تو جان سکتے ہیں کہ ان کی طاقت کا سرچشمہ عوام اور اسلام ہیں لیکن اس پراسرار غازی کا یہ دعویٰ تو کبھی قبول نہیں کیا جاسکتا۔ مذہب کے متعلق اس کا عقیدہ کیا ہے یہ تو خیر اس کا ذاتی معاملہ ہے لیکن مذہب کے نام پر جو حرکتیں یہ کرتا ہے وہ تو ہم سب کا معاملہ ہے لہٰذا اسے اپنی کمپنی کی مشہوری کے لئے اسلام کا مقدس نام استعمال کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دی جاسکتی۔ اس کی بجائے اسے کھلم کھلا یہ بات قبول کر لینی چاہیئے کہ اس نے محض بندوق کے ذریعے اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے اور جب تک اس کے دم میں دم ہے وہ یہ قبضہ ہر صورت میں برقرار رکھے گا۔ پھر جلد ہی وہ یہ دیکھ لے گا کہ ملک کے بہادر عوام اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔ پاکستان کے عوام نے اس سے بھی سینئر جنرلوں، ایوب خان اور یحییٰ خان سے نمٹ لیا تھا اور ان کا حشر خراب کر دیا تھا، پھر یہ تو ان کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ کھل کر براہ راست بات کرنے کی بجائے عوام سے چالبازی کرتا رہا ہے۔ اس نے بار بار انتخابات کروانے کا اعلان کیا حالانکہ انتخابات کروانے سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے اس ناٹک کو نامزدگی کے فارم بھرنے تک کھینچا کیونکہ اس کی مرضی تھی کہ یا تو سیاست دان ایسا حلف نامہ پر کریں جس میں ان کی طرف سے مارشل لاء کی منظوری دی گئی ہو یا پھر بائیکاٹ کر کے اسے انتخابات ملتوی کرنے کا بہانہ فراہم کر دیں۔ اس حکمران ٹولے نے ملک میں جداگانہ انتخابات کا نظام رائج کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ عوام کے منتخب نمائندوں کے بنائے ہوئے کسی بھی آئین میں ایسی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ مگر یہ بات اس کی عقل میں نہیں آتی کہ جداگانہ طریقہ انتخابات نے ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس لئے مادر وطن کا ہر عقلمند اور ایماندار سپوت اس جداگانہ انتخابات کو خطرناک سمجھتا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ یہ تو قائداعظم مرحوم کی اس سوچی سمجھی رائے کے بھی خلاف ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ آپ ہندو مسلمان یا عیسائی نہ رہیں گے بلکہ سیاسی طور پر صرف پاکستانی بن جائیں گے! (آئین ساز اسمبلی سے خطاب)

جناب والا۔! اس موقع پر مجھے قائداعظم مرحوم کا ریڈیو آسٹریلیا کو دیا ہوا انٹرویو یاد آ رہا ہے جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ میں آئین کی تشکیل کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ یہ پاکستان کے عوام کے منتخب نمائندے ہی تیار کریں گے لیکن یہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ ملائیت والا نہیں ہوگا اور پاکستان ملاؤں کا ملک نہیں بنے گا۔!''

ایک لمحے کے لئے غور فرمایئے کہ ملک کے محبوب اور منتخب رہنما اور بانی قوم نے بھی یہ مناسب نہیں سمجھا کہ خود ملک کا آئین بنا کر اسے عوام پر مسلط کریں بلکہ انہوں نے بھی اسے عوام کے منتخب نمائندوں کا ہی حق سمجھا لیکن ضیاء الحق جو اس وقت جا کر انگریز کی فوج میں بھرتی ہوا تھا اور اب ایک غاصب بن بیٹھا ہے، وہ عوام کے نمائندوں کے بنائے ہوئے آئین کو منسوخ یا معطل کرنے کی جسارت کرتا ہے اور اس میں ترمیم کرنے کے دعوے بھی کرتا ہے اور پاکستان کو ایک بدترین ملائیت کی طرف دھکیل رہا ہے۔ یہ قائداعظم مرحوم کی سوچ اور ان کے فکر ونظر کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہے۔ ہم بدقسمت ملک کے بدقسمت لوگوں کو یہ دن بھی دیکھنا تھا۔!! سندھی کی ایک کہاوت ہے کہ ''جو ماں سے زیادہ چاہے وہ ڈائن ہے'' اس لئے اگر یہ پراسرار غازی پاکستان کو اس کے بانی قائداعظم مرحوم سے بھی زیادہ چاہتا ہے تو جناب پھر اس کا خدا ہی حافظ ہے۔!

لیکن ہم قنوطی نہیں ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ یہاں ایسے سکندر بھی آئے ہیں جنہوں نے پورس جیسے بہادر راجاؤں پر اور ان کے ''ہاتھیوں'' پر بھی غلبہ حاصل کیا تھا لیکن ان کی یہ تمام فتوحات عارضی تھیں۔ جلد ہی اسے یہ سرزمین چھوڑنی پڑی اور اگر اس کے سپاہیوں میں کوئی اکا دکا بچا بھی تو وہ بھی ہماری اس عظیم دھرتی میں جذب ہو کر رہ گیا۔ ہم آج بھی یہیں ہیں اس لئے فخر سے کہتے ہیں کہ اس دور کے یہ بونے حاکم بھی زیادہ عرصہ نہیں چل سکتے آخر وہ کتنا عرصہ یہ گاڑی کھینچ سکتے ہیں۔؟ اس کا انحصار تو عوام کے اتحاد، تنظیم اور دیگر ممالک میں جاری سامراج دشمن جدوجہد کی کامیابیوں پر ہے۔

یہ حکمران ٹولہ رجعت پسندوں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ اس حکمران ٹولے اور اس کے حواریوں نے اپنے آپ کو اَب محبِّ وطن بھی کہنا شروع کیا ہے اور حکومت کے زیر تسلط

نشرو اشاعت کے اداروں کی نظر میں محبّ وطن جماعتیں اس وقت صرف وہ ہیں جو اس غاصب حکمران ٹولے کے آگے دم ہلا رہی ہیں۔ انہوں نے 1971 میں ملک توڑنے میں سینئر جنرلوں اور امریکہ کے دلالوں کی مدد کی تھی اور پھر 1977 میں منتخب حکومت کا تختہ اُلٹنے میں بھی ان کی مدد کی تھی۔ یہ کافی حیرت انگیز بات ہے کہ ان کی حب الوطنی صرف یہی ہے کہ یہ ملک کو امریکہ اور اس کے مقامی چوکیداروں کے قبضے میں دیتی رہیں۔ اس لئے آج ہر باشعور پاکستانی اور محبّ وطن شہری اس پراسرار غازی اور اس کی حاشیہ بردار جماعتوں کے متعلق بجا طور پر مشکوک ہے اور جہاں تک اس پراسرار غازی اور اس کے انتظامی قبیلے کے آباؤ اجداد کی حب الوطنی کا تعلق ہے تو ہم سب اس سے اچھی طرح واقف ہیں اور اسے ثابت کرنے کے لئے ہمارے پاس تین گواہ بھی موجود ہیں۔ ایک گواہ تو خان عبدالولی خان ہیں اور انہوں نے ''چٹان'' کو دیئے گئے اپنے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ ایوب خان نے انہیں کہا تھا کہ آؤ مشرقی پاکستان کو الگ کر کے ملک کو خوشحال بنائیں۔ ہمارے دوسرے گواہ چیف کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس منیر احمد مرحوم ہیں، انہوں نے اپنی کتاب ''جناح سے ضیاء تک'' میں لکھا کہ ''ایوب خان نے انہیں کہا تھا کہ بنگال کو پاکستان سے علیحدہ کرنے کا کوئی بندوبست کریں''۔ اور تیسرے گواہ خود ایک جنرل ہیں۔ جنرل اعظم خان نے اپنے ایک انٹرویو میں دعویٰ کیا ہے کہ میجر جنرل سکندر مرزا اپنے دورِ حکومت میں مغربی پاکستان کا ایک وسیع علاقہ ایران کے شہنشاہ کو تحفتاً دینے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس لئے جناب ایک بار پھر ایک جنرل ملک پر مسلط ہو گیا تو ہم بجا طور پر ملک کی سلامتی کے لئے فکرمند ہیں۔

صدر محترم، ممبر صاحبان! یہ پراسرار غازی اسلام کے متعلق بلند بانگ دعوے کر رہا ہے اور اس کی مرضی یہ ہے کہ ہم اس کو امیر المومنین مان لیں۔ حالانکہ اس کی حرکات اسلام کے بالکل برعکس ہیں۔ میں اس سلسلے میں کچھ مثالیں دینا چاہتا ہوں۔ تاریخ کے ہر طالب علم کو معلوم ہے کہ کوئی بدّو بھی کسی خلیفہ سے یہ پوچھ سکتا تھا کہ اس نے ایک پوری نئی قمیص کیسے بنوالی جبکہ تقسیم سے ملنے والا کپڑا اس مقصد کے لئے پورا نہ تھا اور حضرت عمر کو اس کی وضاحت دینی پڑی۔۔۔! ضیاء الحق بھی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر پاکستانی شہری کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہے لیکن اس کا

عمل اس دعوے کے بالکل برعکس ہے۔ دراصل اس نے احتساب کے تمام دروازے بند کر دیئے ہیں۔ اس نے پریس کا گلا گھونٹ دیا ہے اور اسمبلیاں توڑ دی ہیں جو ساری دنیا میں احتساب کے تسلیم شدہ ادارے ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ اس نے تو تمام سیاسی جماعتوں اور سیاسی سرگرمیوں پر سخت پابندی عائد کر دی ہے تاکہ کوئی بھی اس پر تنقید نہ کر سکے۔ دراصل عملی طور پر یہ اپنے آپ کو صرف ریگن اور اس کے ٹولے کے سامنے ہی جوابدہ سمجھتا ہے۔

قرآن شریف میں ارشاد ہے ''اے ایمان والو، وہ نہ کہو جو کرنے کا ارادہ نہ ہو۔ خدا کو یہ بات انتہائی ناپسند ہے!'' (سورۃ صف ۲-۳) لیکن اس پراسرار غازی کے قول و فعل میں زمین و آسمان کا تضاد ہے۔ اسلام اور ملک میں موجود قوانین حلف کی خلاف ورزی کرنا ناجائز قرار دیتے ہیں مگر اس نے اور اس کے ساتھیوں نے ایک منتخب حکومت کا تختہ اُلٹ دیا۔ اگر حلف نامے (بیعت) کی خلاف ورزی اتنی ہی آسان تھی تو تعجب ہے کہ کربلا کے المیے سے بچنے کے لئے حضرت امام حسین نے یہ ترکیب کیوں نہیں استعمال کی۔ اسلام اور ملکی قوانین دونوں اقربا پروری کی قطعی اجازت نہیں دیتے لیکن اس نے اپنا بھانجہ ملک خورشید ایس پی، (پولیس) کے طور پر ہم پر مسلط کیا ہے۔ وہ پہلے فوج میں میجر تھا۔ پھر اسے تنزلی دے کر کپتان بنایا گیا لیکن جب یہ اس حیثیت میں بھی فوج میں نہ چل سکا اور اپنے کردار کی وجہ سے یہ وہاں ناقابل برداشت ہو گیا تو اس لئے اسے ایس پی کا کماؤ عہدہ دے دیا گیا۔ یہ حالات سول ملازمتوں اور مسلح افواج کے درمیان خلیج حائل کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ حالات ذہین طلباء کو بھی سول ملازمتوں میں داخل ہونے کا یہ پچھلا دروازہ استعمال کرنے اور دوسرے ناجائز ذرائع اختیار کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات تو بہت آسان ہے کہ پہلے فوج میں بھرتی ہو جاؤ۔ پھر جب وہاں ناقابل برداشت ہو جاؤ تو کوئی سفارش حاصل کر لو۔

جناب والا۔! ہمارا ملک بہت چھوٹا ہے اور اسکے وسائل محدود ہیں۔ پچاس فیصد غیر پیداواری خرچہ ہماری استطاعت اور قوت برداشت سے باہر ہے چنانچہ اس طرح کی جنگی جنون کی پالیسی کے متعلق تو ہمیں سوچنا بھی نہیں چاہیئے، ہم پہلے ہی بدقسمتی سے اپنا آدھا ملک

کھو چکے ہیں۔ابھی تو ہمارے گذشتہ دو جنگوں کے زخم بھی ہرے ہیں۔امریکہ جیسا دولتمند ملک بھی اس طرح سے جنگ کی عیاشی کا متحمل نہیں ہوسکتا اور ابھی تک وہ ویت نام کی جنگ کے زخم چاٹ رہا ہے اس لئے اب امریکہ اس چکر میں ہے کہ حقیر معاوضے کے عوض ورغلا کر دوسروں کو اپنی طرف سے لڑوائے اور اپنے مخصوص مقاصد کی تکمیل کرتا رہے۔اس لئے نہ صرف ترقی بلکہ بنی نوع انسان کے لئے اور خود ملک کی سلامتی کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ اپنے پڑوسی ممالک سے اچھے تعلقات استوار کئے جائیں۔افغانستان،اور ہندوستان سے پرامن دوستانہ تعلقات براہ راست ہمارے اپنے ملک کی سالمیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔اس لئے ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے اور ہمارے بے وقوف حکمرانوں کو افغانستان کے خلاف زبان درازی اور اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت فوراً بند کرنی چاہیئے۔ان وجوہات کی بناپر اس حکومت کے خلاف ہماری جدوجہد کسی منحوس ملکی مسخرے کے خلاف عام قسم کی شکایت نہیں ہے بلکہ یہ اپنے ملک کے اقتداراعلیٰ،خودمختاری اور سلامتی کی جدوجہد ہے۔جیسا کہ محترمہ ڈولورس کہتی ہیں ''گھٹنوں کے بل نوآبادیاتی نظام کے خول سے نجات حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ امریکہ کی انتظامی اور اقتصادی بالادستی سے نجات حاصل کی جائے۔علاوہ ازیں ملک کی صنعتی ترقی کے لئے بھی لازمی ہوتا ہے کہ ہم زرعی اصلاحات کے ذریعے اندرونی مارکیٹ پیدا کریں اسے تقویت دیں اور حکومت کی نگرانی میں چھوٹے سرمایہ داروں کو کاروبار کی اجازت دیں اور ساتھ ساتھ بنیادی صنعت کو قومی تحویل میں لیتے ہوئے مزدوروں کو انتظامیہ میں شامل کر کے جمہوری طریقہ سے اس کا انتظام چلائیں۔صحت مند پاکستان کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے عوام کو صحت وتعلیم کی بنیادی سہولیات قومی خزانے سے مہیا کریں۔رشوت ستانی کے فوری خاتمے کے لئے ضروری ہے کہ ہم کم ازکم تنخواہ ایک تولہ سونے کے برابر کریں۔قومی یکجہتی کے لئے ہمیں چھوٹی قوموں کو لسانی اور ثقافتی حقوق دے کر مطمئن کرنا ہوگا۔بے تحاشہ فوجی بجٹ کو عوام کی بہتری کے کاموں کی طرف موڑنے کے لئے پڑوسی ممالک سے پرامن تعلقات قائم کرنے ہوں گے جس کے لئے دوطرفہ تعلقات کی بنیاد پر سوشلسٹ ممالک سے تجارت ناگزیر ہے لیکن ان تمام کاموں کے لئے ان محبّ وطنوں اور

ترقی پسندوں کا تقابل اس نام نہاد قومی حکومت سے بالکل نہ کیا جائے جس میں امریکی ایجنٹ، اجارہ دار سرمایہ دار بڑے زمیندار اور سینئر جنرل شامل تھے یا ہیں یا اب مختلف بہروپ بدل کر آئیں گے۔

محترم صدر اور ممبر صاحبان! ہماری عوام سیاسی طور پر باشعور ہے اس لئے امریکہ کبھی بھی عام حمایت کی امید نہیں کرسکتا کیونکہ یہاں امریکہ کے اہم مہرے سینئر جنرل ہی ہیں۔ جیسا کہ امریکہ کے نائب وزیر خارجہ نے ایک پریس کانفرنس میں علی الاعلان اقرار کیا ہے کہ ''پاکستانی فوج کے تمام سینئر جنرل ہمارے اپنے آدمی ہیں!'' ظاہر ہے کہ پریس کانفرنس کا یہ حصہ ہمارے اخبارات میں شائع نہیں ہونے دیا گیا۔ 1971 میں چونکہ یہ جنرل براہ راست ملک توڑنے کے ذمہ دار تھے اس لئے وہ اپنا قبضہ برقرار نہیں رکھ سکتے تھے۔ نئے پاکستان میں چونکہ منتخب حکومت برسر اقتدار آ چکی تھی اس لئے امریکہ سے تعلقات بھی سرد مہری کا شکار ہو گئے لیکن پھر جیسے ہی سینئر جنرل دوبارہ میدان میں آئے امریکہ سے ''نیا ناطہ'' جوڑا۔ آرڈیننس نے تو صرف پولیس کی رشوت کی کمائی میں مزید اضافہ کیا ہے کیونکہ یہ اب پولیس کی صوابدید پر ہے کہ وہ جس مقدمے کو اس کا جی چاہے حدود آرڈیننس کے تحت چالان کر دے جبکہ جرائم بڑھنے کی اصل وجوہات دوسری ہیں۔ ایک اہم وجہ تو معاشرے میں موجود گھٹن ہے اور پھر سیاسی سرگرمیوں اور پریس پر پابندی نے اس حبس کو بہت شدید کر دیا ہے اور خطرناک حد تک زیادہ بھی! اس حکومت نے جذبات کے فطری نکاس کے تمام راستے روک دیئے ہیں اس لئے اب وہ غیر فطری طور پر ابھر رہے ہیں۔ سیاسی سرگرمیاں اور اخبارات جرائم پر اخلاقی کنٹرول کی حیثیت و اہمیت رکھتے ہیں لیکن اس حکومت نے انہیں ختم کر دیا ہے۔

معاشرے میں مثالی کرداروں کی کمی پورے سماج پر عموماً اور نوجوانوں پر خصوصاً اثر انداز ہوتی ہے۔ جب اس ملک کے نوجوان یہ دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص صرف حلف وفاداری کی خلاف ورزی کر کے اپنے ڈنڈے کے بل پر صدارت اور اقتدار پر قبضہ کرسکتا ہے تو پھر انہیں بھی برائی کے دوسرے راستوں کی ترغیب ملتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی کسی ایک گاؤں کو لوٹتا

ہے تو ڈاکو کہلاتا ہے، کسی دوسرے ملک کو برباد کرتا ہے تو فاتح کہلاتا ہے لیکن اگر اپنے ہی ملک پر قبضہ کر کے اسے ویران کر دیتا ہے تو پھر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کہلاتا ہے۔ یہی وہ حالات ہیں جن کی وجہ سے ایک دن فیصل آباد کے کسی مولوی کو پانچ سالہ بچی کو اغوا کرتے ہوئے دیکھتے ہیں یا لاہور کی ستارہ مسجد کے پیش امام کو اپنی بارہ سالہ بچی سے زنا بالجبر کرتے دیکھتے ہیں (روزنامہ امن فروری 1982)۔ کسی دن خوب کھاتے پیتے گھرانے کے نوجوان اوران کے تعلیم یافتہ ساتھیوں کو بنک لوٹتے ہوئے دیکھتے ہیں تو کسی دن مجلس شوریٰ کے ایک رکن ارباب امیر حسن کو مسماۃ رحمت کو اغوا کرتے ہوئے اور مزاحمت کے جرم میں اس کے بھائی کو مارشل لاء کے تحت گرفتار کرواتے بھی دیکھتے ہیں! اب دیکھ لیجئے آپ کے چادر اور چاردیواری کی حفاظت کیا خوب ہو رہی ہے۔

جناب والا۔ کچھ وحشی اور لیٹرے ہمارے ملک، تہذیب اور تمدن کو تباہ کرنے کے درپے ہیں اور اسے تباہ کر رہے ہیں تو پھر ہم محض ایک خاموش تماشائی کیسے بنے بیٹھ سکتے ہیں۔

محترم! سرکاری وکیل نے مجھ پر الزام لگایا ہے کہ میں کمیونسٹ ہوں۔ جی ہاں میں کمیونسٹ ہوں اور مجھے اپنے کمیونسٹ ہونے اور کہلوانے پر فخر ہے۔ حکمران طبقات نے نہ صرف معاشرے کا ہر ادارہ غلط طور پر استعمال کیا ہے بلکہ اسلام کا نام بھی غلط طور پر استعمال کیا ہے۔ انہوں نے ادارے تباہ اور ملک برباد کر دیا ہے اور اب یہ آخری کارتوس یعنی افواج پاکستان کو بھی، اپنے لئے استعمال کر رہے ہیں حالانکہ یہ بات عالم آشکار ہے کہ یہ آخری کارتوس بھی 1971 میں ملک متحد نہیں رکھ سکا۔ اس لئے اب صرف ہم اور ہمارے محبّ وطن اور جمہوری اتحادی ملک کو امن وترقی اور خوشحالی کی راہ پر لے جا سکتے ہیں۔

آج پاکستان بنیادی سماجی تبدیلیوں کے لئے تیار ہے۔ ہمارا ملک 1971 میں بھی ایسی تبدیلیوں کے لئے تیار تھا لیکن ہمارے ایک سینئر جنرل اس وقت بھی رضا کارانہ طور پر، اقتدار اعلیٰ عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ملک کی تمام، اکثریتی جماعتیں سماجی تبدیلیوں کا وعدہ کر چکی تھیں۔ انہوں نے زرعی اصلاحات اور بنیادی صنعتوں کو قومیانے کے ساتھ ساتھ افسر شاہی سرمائے کی تخفیف اور امریکہ سے فوجی معاہدے ختم کرنے کے عوام سے

وعدے کئے تھے مگر ہمارے سینئر جنرلوں نے اس وقت رائے عامہ کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی بجائے ملک کو تقسیم کر کے اس پر ایک اور مارشل لاء مسلط کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر ہمارے ملک کے زیادہ باشعور اور بلند عزم حصے نے خود کو آزاد کروالیا۔ ملک کا تبدیلی کے لئے تیار ہونا ایک طرح سے اس بچے کی مانند ہے جو ماں کی کوکھ سے جنم کیلئے تیار ہوا اور اگر وقت پر ولادت نہ ہو تو ماں کی زندگی جو کہ اس صورت میں (ملک) اور بچے کی زندگی جو کہ اس صورت میں سماجی تبدیلی اور خوشحالی تھی دونوں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ بجائے اس کے کہ ہم سماجی تبدیلی لاتے جو کہ ملک کو بچا سکتی تھی ملک کو دو ٹکڑے کر دیا گیا مگر افسوس کہ ہم آج پھر وہی تجربہ دہرا رہے ہیں جس کے ہم کسی صورت بھی متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس وطن عزیز کے لئے جغرافیائی طور پر یہ ممکن ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کے الگ ہونے کے بعد بھی قائم رہ سکے لیکن اب جغرافیائی حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ اگر ملک کا کوئی ایک حصہ بھی الگ ہو گیا تو یہ ملک قائم نہیں رہ سکے گا۔

جہاں تک میرا اور میرے نظریہ کا تعلق ہے تو میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی مرکزی کمیٹی کا رکن ہوں اور اس حیثیت میں اپنے منتہائے مقصود یعنی سوشلزم کے قیام کے لئے جدوجہد کر رہا ہوں لیکن مجھے علم ہے کہ ہمارے اس سماج کے کئی ایسے طبقات ہیں جو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اگر یہ حالات جوں کے توں رہے اور جنرلوں نے اپنی روش نہ بدلی تو ہمارا غریب ملک پھر خطرے میں ہوگا۔ وہ یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ اس وقت ہمارے پورے ملک کو امریکی اڈے میں تبدیل کیا جا رہا ہے اور ہماری پوری معیشت کو بھی امریکہ کی مددگار یعنی ایک طفیلی معیشت بنایا جا رہا ہے جس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ ہماری قومی معیشت میں ترقی نہیں ہوگی بلکہ اقتصادی طور پر بھی ہم امریکی سامراج کے مستقل غلام بن کر رہ جائیں گے اور ہمارے پاس جو برائے نام صنعت موجود ہے اور جس سے ہم اپنے اخراجات پورا کر رہے ہیں وہ بھی ختم ہو جائے گی۔

اس معاشرے کے وہ پرت جن میں مزدور، کسان درمیانہ طبقہ، دانشوروں، ادیبوں، شاعروں اور چھوٹے زمینداروں، بیوپاریوں اور سرمایہ داروں کا وہ حصہ جو امریکہ سے جڑا ہوا نہیں ہے، ان سب کا تو بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے۔ ان کا نہ صرف ذریعہ معاش اور خوشحالی و تعلیم داؤ

پر لگے ہوئے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ پورا ملک ہی خطرے کی زد میں ہے اس لئے سماج کے تمام حصے بنیادی سماجی تبدیلی لانے کا انتہائی مصمم ارادہ کر چکے ہیں۔اس تبدیلی کے ذریعے وہ اپنے ملک کو اور زیادہ مضبوط اور خوشحال بنائیں گے۔ یہ بنیادی تبدیلی ہمارے ملک کے لئے آزاد قومی جمہوریت کا درجہ رکھتی ہے اگر چہ کچھ طبقات کے لئے تو یہی ان کی آخری منزل ہے لیکن سائنسی سوشلزم پر یقین رکھنے والوں کے لئے یہ کڑی دھوپ کے سفر میں ایک پڑاؤ ہے یا پھر ایک منزل کی تکمیل ہے اور یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے تمام ترقی پسندوں اور محبّ وطن لوگوں کا مضبوط اتحاد لازمی ہے اور سسکتے رہنے سے اپنے پیروں کے بل کھڑے ہو کر مرنا زیادہ بہتر ہے اور ہم لوگ جو بولتے اور جدوجہد کرتے ہیں ہمیں یہ معلوم ہے کہ ہمیں اپنے ہر لفظ کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، پھر بھی اپنے اس عمل کو ہم اس لئے جاری رکھتے ہیں کہ ہمارا اقتدار اعلیٰ اور ملک کی سلامتی خطرے میں ہیں۔

اس پراسرار غازی نے گذشتہ چار سال کے دوران ہر دوسرے دن یہ اعلان کیا ہے کہ آئندہ ماہ مجلس شوریٰ بنائی جائے گی۔ کتنے ہی عرصے تک تو اس کے اعلانات محض ہوائی قلعے بنے رہے کیونکہ پاکستان کی ساڑھے آٹھ کروڑ آبادی میں سے اس بچارے کو ڈھائی سو ایماندار آدمی بھی نہیں مل رہے تھے۔آخر بڑی دیر کے بعد بڑی مشکل سے کچھ الوگ اس کے ہاتھ لگے بھی تو ان میں سے کچھ نے حلف اٹھانے سے انکار کر دیا اور کچھ عوام کے دباؤ کی وجہ سے حکومت کی ان غلط پالیسیوں اور رویوں پر تنقید کرنے لگے، حالانکہ ان میں سے اکثر تو وہی ہیں، جنہیں یہی حکومت رشوت اور کئی دوسرے الزامات کے تحت نااہل قرار دے چکی ہے۔ سندھی میں اسی کو کہتے ہیں ''تھوک کر چاٹ لیا''۔

محتسب اعلیٰ کے تقرر کے معاملے میں بھی یہی صورتحال ہے۔ یہ گذشتہ دو سال کے عرصے سے اس کی سخت تلاش میں ہے مگر اسے کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا جسے یہ محتسب اعلیٰ کے طور پر مقرر کرتا۔ گویا یا تو ملک کا کوئی ایک ایماندار انسان بھی اس ٹولے سے تعاون کے لئے تیار نہیں ہے یا پھر اس اتنے بڑے ملک میں یہ صرف اپنے آپ کو ہی ایماندار سمجھتا ہے۔کبھی کبھار تو

موجودہ حکومت یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ ملک میں امن و امان قائم کرنے کے لئے ہی اس نے اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کیا تھا لیکن اس ضمن میں خود سرکاری اعداد و شمار بھی اس کے برعکس کہانی سناتے ہیں۔سندھ میں 1979 میں چوبیس ہزار جرائم ہوئے اور 1980 میں ستائیس ہزار جرائم ہوئے ۔صوبہ پنجاب میں 1979 میں نوے ہزار جرائم جبکہ 1980 میں ننانوے ہزار جرائم ہوئے۔ یعنی کہ جرائم میں ترقی کی یہ رفتار تیز تر ہے حالانکہ کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ حدود آرڈی ننس کے نفاذ کی وجہ سے جرائم بڑھ گئے ہیں لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ حدود آرڈیننس کا نہ مثبت اثر پڑا ہے اور نہ ہی کوئی منفی اثر ہوا ہے۔حدود جوڑا گیا اور اس کے اشاروں پر چلنے کو ایمان بنالیا گیا تا کہ پاکستان کو ایران اور افغانستان کے خلاف اڈے کے طور پر بہ آسانی استعمال کیا جا سکے اور وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو آزادی اور ترقی وخوشحالی کی راہ پر گامزن ہونے کی پاداش میں ہی ان جنرلوں نے پھانسی دی۔مگر امریکی سامراجی اور اس کے ایجنٹ پہلے بھی عوام کو دھوکہ دینے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے تو اب جبکہ عوام زرعی اور دوسری اصطلاحات کا تجربہ حاصل کر چکے ہیں اور سامراجیوں اور اس کے ایجنٹوں سے جان چھڑانے کے بعد چند سالوں تک فائدے اور بہتر مفادات حاصل کر چکے ہیں تو پھر سامراجی ایجنٹ چاہے اسلامی روپ اختیار کریں یا کوئی دوسرا بہروپ دھاریں، عوام اب کسی طور پر بھی انہیں قبول نہیں کریں گے۔اب تو چینی توسیع پسند بھی بے نقاب ہو چکے ہیں۔اس لئے یہ امریکہ نواز جنرل کبھی بھی انتخابات نہیں کروائیں گے اب چاہے وہ لاکھ قرآن اٹھائیں لیکن لوگ ان پر ہرگز اعتبار نہیں کریں گے۔آخر بار ہا آزمائے ہوؤں کو کیا آزمانا؟ اس مرحلے پر یہ نشاندہی کرنا بے محل نہ ہوگا کہ بھٹو شہید انتخابات جیت چکے تھے اور اس کے بعد ہی یہ سارا ڈرامہ شروع ہوا۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ عام طور پر ہر اس ترقی پذیر اور کمزور ملک میں جس کے امریکہ سے امدادی اور فوجی تعلقات ہیں یہی منحوس اور غیر یقینی صورتحال موجود ہے۔پاکستان اور ترکی تو اس کی واضح مثالیں ہیں اور ایسے ممالک میں صرف عوام ہی انتخابات کروا سکتے ہیں جیسا کہ اسلامی جمہوریہ ایران میں ہوا ہے۔سامراجیوں سے وراثت میں ملی ہوئی مسلح افسر شاہی عام حالات میں رضاکارانہ طور پر اقتدار نہیں چھوڑتی اس لئے یہاں عملی

طور پر سب سے پہلے عوام کی اپنی حکومت قائم کرنا ہوگی۔ اس کے بعد ہی انہیں انتخابات کروانے کے بعد قانون بنانا ہوگا۔ اس بنا پر کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان نے چار نکاتی پروگرام پیش کیا تھا اور اس نے ملک کے تمام محبِّ وطن افراد کو دعوت دی تھی کہ وہ متحد ہو کر عوام کا اقتدار اعلیٰ اور ملک کی بالادستی بحال کروائیں۔ ظاہر ہے بائیس بڑے سرمایہ دار خاندان اور تھوڑے سے جاگیردار نیز مٹھی بھر جرنیل اور ان کے گنے چنے ایجنٹ تو اس کی مخالفت ہی کریں گے لیکن ان کے مفروضوں سے بہت پہلے سماج کے وہ تمام طبقات جن کا مفاد خود مختار پر امن، خوشحال اور مشترکہ معیشت کا حامل، صرف لسانی اور ثقافتی حقوق دینے والے پاکستان سے ہے اٹھ کھڑے ہوں گے اور اپنی جدوجہد کے ذریعے تمام حقوق حاصل کرلیں گے۔

حکومت کو علم ہے کہ یہ پروگرام کس قدر بروقت اور کارآمد ہے اور یہی سبب ہے کہ ہم اس کی آنکھوں کا کانٹا بن گئے ہیں اور وہ ہم پر ہر وقت وحشت ناک وار کر رہی ہے کیونکہ حکومت کو مکمل طرح سے علم ہے کہ پریس اور عدلیہ کی آزادی کے حقیقی علمبردار صرف ملک کے محنت کش عوام ہیں اور ملک کے محنت کش عوام کے لئے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اگر عدلیہ کو تھوڑی سی بھی آزادی ہوتی قانون کی بالادستی ہوتی، اگر پریس پر پابندی نہ ہوتی اور ہمارا بدنصیب ملک امریکہ کے زیردست اور اس کی طفیلی ریاست کی حیثیت میں نہ ہوتا تو یہ پراسرار غازی ''نذیر عباسی'' کو فوجی کیمپ میں وحشیانہ اذیتیں دے کر شہید نہ کرسکتے تھے اور اس مقدمے میں شامل میرے دوسرے ساتھیوں اور دوستوں کی زندگیاں اس لئے نہیں بچ گئیں کہ وہ قصائی بعد میں کوئی انسان بن گئے تھے بلکہ ان کی زندگیاں صرف اس لئے بچ گئیں کہ تمام ترقی پسند اور محبِّ وطن لوگوں نے ملک بھر اور پوری دنیا میں بڑی مہم چلائی تھی۔ میں اپنے تمام ساتھیوں اور پاکستان کے عوام کی طرف سے ان سب کا شکر گزار ہوں اور انہیں یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کو جدید مواصلاتی ذرائع بھی اسقدر قریب نہیں لا سکتے اور نہ ہی اتنی ہم آہنگی پیدا کرسکے ہیں جس قدر کہ یکجہتی بھائی چارے اور اصولوں کے یہ جذبات دنیا کو قریب لاتے ہیں۔

اس پراسرار غازی نے اسلام کے لئے اپنی محبت کا زبردست ڈھنڈورہ پیٹا ہے اس کی

ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ کرسی اقتدار پر اپنے ناجائز قبضے کو جائز قرار دینا چاہتا ہے اور دوسری اہم وجہ یہ بھی ہے کہ وہ سپاہیوں کو یہ یقین دلانے کا آرزومند ہے کہ ملک پر مارشل لاء اسلام کی خدمت کے لئے مسلط کیا گیا ہے۔ وہ یہ چال چلنے پر مجبور ہوگیا ہے کیونکہ ہماری افواج کی اکثریت بھی اب اس کی بدنیتی کو سمجھنے لگی ہے۔ اسلام تو سماجی انصاف، عوام کی بھلائی اور قانون کی حکمرانی سکھاتا ہے مگر سامراج، اسلام اور دوسرے مذہب کو دورخے ملاؤں اور اپنے کرائے کے پٹھوؤں کے ذریعے جمہوریت، مساوات، خوشحالی اور ترقی کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کررہا ہے لیکن اب سامراج اور اس کے ایجنٹوں کی اس سازش کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ ایک اسلامی ملک مصر میں بنیاد پرست مسلمانوں نے بھی داغدار مساوات کی ایسی ہی سخت مخالفت کی ہے جیسی دیگر تمام محبّ وطن عوام نے کی۔ اسلام ایک طاقتور سامراج دشمن قوت ہے۔ اسلامی جمہوریہ ایران میں جہاں عراق سے جنگ بھی جاری ہے وہاں بھی انتخابات کا محض وعدہ ہی نہیں کیا جاتا بلکہ واقعی ان کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے۔ ایران کے عوام نے شہنشاہ کا دھڑن تختہ کردیا اور ساواک کو ختم کرکے عوام کا اقتدار اعلیٰ بحال کردیا ہے۔ افغانستان کی جمعیت علماء اسلام کارمل حکومت کی طرف سے اپنے عوام کی بھلائی کے لئے کی گئی تمام اصلاحات کی مکمل حمایت کررہی ہے مگر یہ پراسرار غازی کرسی پر قبضہ کرکے عوام کو کچلنے اور جمہوریت کے سورج کو ڈبودینے کی کوشش کرکے شاہ ایران اور سابق سعودی شاہ خالد جیسی مطلق العنان امریکہ نواز ڈکٹیٹر شپ قائم کرنا چاہتا ہے۔ ان حالات میں کوئی احمق یا منافق ہی اس بات پر اعتبار کریگا کہ وہ امریکی سامراجیوں، اجارہ دار سرمایہ داروں اور بڑے وڈیروں کی خدمت کی بجائے اسلام کے لئے جہاد میں مصروف ہے۔

ستمبر 1981 میں یونیسکو کی تاریخی کانفرنس کے موقع پر انسانی حقوق کا عالمی اسلامی اعلان نامہ جاری کیا گیا تھا۔ یہ پندرہویں صدی ہجری کے آغاز کا مبارک موقع بھی تھا۔ ان حقوق میں مذہبی آزادی، فکر، عقائد، تحریر و تقریر کی آزادی، انجمن سازی کی آزادی، مساوات کا حق، امن وانصاف، مقدمات کی منصفانہ سماعت، عدلیہ کی آزادی اور ایذا رسانی کے خلاف تحفظ کا حق شامل ہیں۔ انصاف کے حق میں کہا گیا ہے کہ ہر ایک کو نہ صرف یہ حق حاصل ہے (اور ہر ایک پر یہ فرض

بھی ہے) کہ وہ کسی بھی غیر قانونی حکم کو ماننے سے انکار کر دے چاہے وہ کسی نے بھی کیوں نہ دیا ہو۔

اسلامی فکر کے علما کے متفقہ طور پر تیار کردہ اس اعلان نامہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ مقدمہ میرے جیالے ساتھیوں اور دوستوں پر چلائے جانے کی بجائے خود غاصبوں پر چلانا چاہئے۔اذیت کے خلاف تحفظ کا حق کہتا ہے کہ کسی بھی انسان پر جسمانی یا ذہنی تشدد نہیں کیا جائے گا نہ توہین کی جائے گی، نہ دھمکی دی جائے گی یا زخمی کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے عزیزوں یا دوستوں پر کسی طرح کا تشدد کیا جائے گا اور نہ کسی سے کسی جرم کے ارتکاب کا جبراً یا خوف سے اقرار کروایا جائے گا یا کوئی ایسا اقدام کروانے پر مجبور کیا جائیگا جو ان کے مفادات کو مجروح کرے مگر اس نام نہاد اسلامی حکومت نے نہ صرف مجھ پر بارہا تشدد کیا ہے بلکہ پاکستان کے بیباک اور نڈر طالب علم رہنما نذیر عباسی کو انتہائی درندگی کے ساتھ شہید کر دیا۔

مندرجہ بالا اعلان نامہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عوام کو اپنا حاکم منتخب کرنے اور اسے ہٹانے کا بھی حق حاصل ہے (یعنی آزادانہ انتخابات کا حق) مگر یہ پراسرار غازی عوام کو یہ حق دینے کی بجائے ان کے ہوش ٹھکانے لانے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ پاکستان کے حکمران ٹولے کے پاس اسلام کا پیغام صرف سنسر شپ، کوڑے، ہاتھ کاٹنے کی اذیت ناک سزائیں اور پھانسیاں ہیں۔

ہمارے اپنے ملک کے وزیر خزانہ نے ایک کمیٹی مقرر کی تھی کہ وہ اسلامی اقتصادیات کی منصوبہ بندی کرے اور اس کمیٹی میں ملک کے چوٹی کے ماہرین اقتصادیات موجود تھے۔اس کی رپورٹ مئی 1980ع میں شائع کی گئی۔ یہ دستاویز ایک اہم اور غور وفکر سے تیار کی گئی دستاویز ہے جس میں ہمارے اقتصادی مسائل کے حل کے لئے کافی معقول حل تجویز کئے گئے ہیں۔اس رپورٹ کی بنیاد اس بات پر رکھی گئی ہے کہ اقتصادیات کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے اور فروغ دینے کا مقصد (سماجی عدم مساوات و ناانصافی) فقط اس وقت اسلامی اصولوں پر مبنی قرار دیا جاسکے گا جب وہ اَلعدل وَالاحسان کے خاتمے کے ذریعے اَلعدل و الاحسان یعنی انصاف اور برابری یعنی (غریبوں کی طرف زیادہ مائل) کا ایک حصول ہو۔اس رپورٹ میں بجا طور پر کہا گیا

ہے کہ موجودہ اقتصادی صورتحال میں شامل ان موجودہ مقاصد کے حصول کے ذریعے کی جاسکتی ہے(۱) سماجی انصاف (۲) عام تعلیم (۳) اقتصادی ترقی (۴) زیادہ سے زیادہ روزگار کے مواقع مہیا کرنا (۵) معیارزندگی کو بہتر بنانا۔

سماجی انصاف کا جائزہ لیتے ہوئے رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ معاشرے میں موجود دولت اور پیداواری قوت کی منصفانہ تقسیم کی جائے۔اس ضمن میں بعض تجاویز بھی رپورٹ میں دی گئی ہیں مثلاً زمین کسانوں میں تقسیم کرنا، زمین کی حد ملکیت فی خاندان مقرر کرنا، اجارہ دار سرمایہ داروں کی ملکیت کو مناسب حد میں لانا، صنعتوں میں اضافہ کرنے کی وکالت بھی کی گئی ہے۔تعلیم کو عام کر کے دولت کی تقسیم میں معاون ومددگار بنانا ہے۔اقتصادی ترقی اور روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لئے قومی تحویل میں لی گئی صنعتوں اور غربت کے خاتمے اور سماجی تحفظ کیلئے ایک ایسے پروگرام کی سفارش کی گئی ہے جس میں لوگوں کو مفت فنی پیشہ ورانہ تربیت دی جائے۔رپورٹ میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ طویل المیعاد منصوبہ بندی کے لئے پبلک سیکٹر کو حاوی رکھنا پڑے گا کیونکہ نجی سرمایہ کا نظام نہ تو سود کو ختم کرسکتا ہے اور نہ ہی غریبوں کی بنیادی ضروریات پوری کرسکتا ہے۔رپورٹ میں اس پر مزید کہا گیا ہے کہ یہ اس قدر نازک معاملہ ہے کہ ہم اس کو سرمایہ داری کی منڈیوں کے قوانین اور نجی سرمایہ کے بے درد ہاتھوں میں اس طرح نہیں چھوڑ سکتے مگر ضیاء حکومت نے بڑی خاموشی کے ساتھ اس رپورٹ کو مسترد کر دیا ہے کیونکہ یہ پراسرار غازی اسلام کو سامراجی اجارہ دار سرمایہ داروں اور بڑے بڑے جاگیرداروں کی خدمت کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے جب کہ اس رپورٹ کے مطابق بتایا گیا ہے کہ اسلام ایک ترقی اور سماجی انصاف کی قوت ہے مگر جنرل ضیاء کی حکومت کے اقتصادی مقاصد کے سرچشمے عالمی مالیاتی فنڈ اور ہارورڈ گروپ کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، جو ظاہر ہے کہ اسلام کے قطعی منافی ہیں۔

اس رپورٹ میں مزید صنعتوں کو بھی قومی تحویل میں لینے کی وکالت کی گئی ہے اور پبلک سیکٹر کی توسیع پر زور دیا گیا ہے مگر اس کے برعکس ضیاء حکومت قومی تحویل میں لی گئی صنعتیں سرمایہ داروں کے حوالے کررہی ہے۔اس رپورٹ میں دولت کے چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے کی

مذمت کی گئی ہے جبکہ ضیاء حکومت نہ صرف ملکی سرمایہ داروں اور دولت کے پجاریوں کو تیار کر رہی ہے بلکہ بین الاقوامی جونکوں (خون چوسنے والے سرمایہ داروں) کو بھی سرمایہ کاری کی دعوت عام دے رہی ہے۔ اس نے انہیں یقین دہانی کرائی ہے کہ وہ بلاخوف وخطر اپنی لوٹ کھسوٹ جاری رکھیں کیونکہ ملک میں انتخابات کا کوئی امکان نہیں ہے۔ رپورٹ میں اس بات پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے کہ تعلیم فوری طور پر عام کی جائے مگر ضیاء حکومت صرف ایسے نجی تعلیمی ادارے کھولنے کی اجازت دیتی ہے جو کہ صرف مٹھی بھر دولتمندوں کی خاص تعلیمی ضروریات پوری کریں اور اس طرح مساوی مواقع کی فراہمی کی عملی طور پر مخالفت کی جا رہی ہے۔ رپورٹ میں مشورہ دیا گیا ہے کہ دیہات اور شہروں کے پس ماندہ علاقوں کی خاص مدد کی جائے مگر حکومت شہروں اور دیہات کے درمیان معاشی فرق کو دن بدن بڑھا رہی ہے۔ رپورٹ میں سود کے بدلے نام نہاد منافع میں شرکت کی تجویز کی سخت مخالفت کی گئی ہے اور اسے غریبوں کی لوٹ کھسوٹ کی ایک شکل قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اس طرح سے یہ بنیادی اسلامی اصول ''العدل والاحسان'' کے خلاف ہے۔ جب کہ ضیاء حکومت نے مکمل طور پر وہی نظام رائج کر رکھا ہے جس کی اس رپورٹ میں اتنی شدومد سے مخالفت کی گئی ہے۔ رپورٹ میں زکوٰۃ کے بارے میں خبردار کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ سمجھنا بے وقوفی کی انتہا اور موجودہ مسائل سے قطعی بے خبری ہوگی کہ دولت پر صرف ڈھائی فیصد ٹیکس ضروریات کی تکمیل کریگا اور غریبوں کے مسائل حل کر دے گا یا غریب اور امیر کے درمیان بڑھتی ہوئی موجودہ معاشی خلیج کو ختم کر دے گا۔ دراصل یہ پراسرار غازی جہالت کی لگن میں یہ کہہ رہا ہے کہ زکوٰۃ غربت کا مسئلہ حل کر دے گی مگر درحقیقت یہ عمل معیشت کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا نہیں بلکہ ''ریگینیت'' کو ''ضیائی'' سانچے میں ڈھالنے کا ہے اور یہ امر واضح طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ پراسرار غازی ہر ایک کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہے کہ وہ اسلام کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا رہا ہے لیکن دراصل وہ سامراجیوں کے ساتھ اتنا بندھا ہوا ہے کہ وہ نہ تو ایران اور دوسرے ممالک کی سامراج دشمن اسلامی جدوجہد سے کوئی سبق سیکھتا ہے اور نہ ہی غدار ساداتؔ کے انجام سے کوئی عبرت حاصل کرتا ہے۔ نہ ہی حقوق انسانی کے اسلامی اعلامیہ پر اس کی آنکھ کھلی ہے اور نہ ہی وہ

ملک کے اعلیٰ ترین ماہرین اقتصادیات کی رپورٹ اور تحقیق کے مطابق ملکی معیشت کو اسلامی بنانے کے لئے تیار ہے۔

محترم صدر اور ممبران عدالت! اس سے انکار نہیں کہ میں نے اس حکومت کی مخالفت کی ہے لیکن میں نے یہ مخالفت اس لئے کی ہے کہ یہ ہمارے ملکی اور قومی مفاد کے لیے نہایت ضروری ہے اور اس حکومت نے ہمارے ملک کی معیشت کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس وقت عالمی مالیاتی فنڈ کے مشوروں پر چلنے والی جدید نو آبادیاتی معیشت اور فوجی اخراجات کی نوازشوں کی بنا پر اونٹ سے زیادہ اس کی دم بھاری ہوگئی ہے۔ ہم اس وقت ایک کھرب روپے کے مقروض ہیں اور اس پر ہمیں ہر سال دس ارب روپے صرف سود ہی ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ حکمران ٹولہ جو یہاں ہم سے اکڑ کر بات کرتا ہے وہ عالمی بنک اور عالمی مالیاتی فنڈ کے آگے قرضوں کی ادائیگی ملتوی کروانے کے لئے ہاتھ پاؤں جوڑ رہا ہے اور ناک رگڑ رہا ہے۔ اس حکمران فوجی ٹولے نے تو افراط زر کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ ہماری سکیورٹی پرنٹنگ پریس دن رات نوٹ چھاپنے میں مصروف ہے مگر اس کے باوجود بھی نوٹ کم پڑ رہے ہیں۔ اگرچہ ہمارے نوٹ لندن سے بھی چھپ کر آ رہے ہیں 1977 میں پاکستان میں سولہ ارب روپے کے نوٹ گردش میں تھے جبکہ آج ہمارے پاس بیالیس ارب روپے کے نوٹ گردش میں ہیں جن میں سے موجودہ مارشل لاء حکومت کے زمانے میں جاری کئے گئے نوٹ باسٹھ فیصد ہیں۔ مہنگائی اور افراط زر کا یہ ایک اہم سبب ہے۔ نو جنوری 1983 کو روزنامہ ڈان لکھتا ہے کہ ہمارے ملک کے تین کروڑ سے زائد افراد غربت کے معیار سے بھی نچلی سطح پر زندہ ہیں اور پانچ کروڑ افراد بڑی مشکل سے اپنی گزر اوقات کر پاتے ہیں اور دو سو میں سے ایک سو افراد بے روزگاری، خراب صحت، مجبوریوں اور پنشن کے بعد مفلسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ ہمارا مقدس وطن عزیز معاشرتی طبقات میں بٹا ہوا ہے اور اکثر اوقات ہر طبقہ اپنے مفاد کو بچانے کے لئے اپنے طبقے کی اپنی پارٹی بنائے ہوئے ہے۔ میرا تعلق کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سے ہے جو کہ ملک کے محنت کشوں، طلباء، دانشوروں، وطن عزیز کے دیگر

محبّ وطن لوگوں اور جمہوری قوتوں کے مفاد کے لئے لڑ رہی ہے لہذا میں کسی دوسرے کو بھی برداشت کر سکتا ہوں جو کسی اور طبقے کا نمائندہ ہو لیکن میں یہ بات واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ مجھے کسی بھی پارٹی کے بنانے یا اسکی سرگرمیوں پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میں یہ بات بالکل نہیں برداشت کر سکتا کہ جنرل ضیاء سمیت کوئی بھی فرد افواج پاکستان کو ایک سیاسی پارٹی بنائے جو کہ امریکی سامراج یا بائیس اجارہ دار سرمایہ داروں اور مٹھی بھر جاگیرداروں اور ان کے حواریوں کے لئے کام کریں۔ چاہے ہم پر کیسے ہی الزامات کیوں نہ لگائے جائیں، ہم نقصان دہ بات کی انتہائی سختی سے مذمت کرتے ہیں اور ہمیشہ مخالفت کرتے رہیں گے۔ کوئی چاہے کتنا ہی قابل انجینئر کیوں نہ ہو اس کو ہم یہ اجازت ہرگز نہیں دیں گے کہ وہ ہمیں یا ہمارے کسی عزیز و اقارب یا دوست احباب کو کوئی انجکشن لگائے۔ بالکل ایسے ہی ہم کسی جرنیل کو اجازت نہیں دیں گے کہ مادر وطن کو اپنی مرضی کے مطابق تباہ و برباد کرتا رہے اور اپنی من مانیوں کے ذریعے قوم کو پستی میں دھکیل ڈالے جبکہ ہمیں اس کے سابقہ انتظامی اباواجداد کا ملک توڑنے اور اپنے بھائیوں سے جدا ہونے کا تلخ تجربہ بھی حاصل ہے۔ اس کے علاوہ اب جبکہ ہمارا ملک چھوٹا سا ہے یا چھوٹا سا رہ گیا ہے اور سامراجی سازشیں بے شمار ہیں تو ہم اسوقت کسی جرنیل کو سیاست میں ٹانگ اڑانے کی اجازت نہیں دے سکتے اور ایسے میں جبکہ یہ وطن فروش، ننگِ ملت کرسی پر قبضہ جاری رکھنے کے لئے ہر روز نیا بہانہ تراشتے ہیں۔ انہوں نے ہوا میں اتنے بال اچھالے ہیں کہ اب خود بھی نہیں کھیل سکتے۔ اب بہت ہو چکا ہے۔ انہیں اب اپنا بوریا بستر گول کرنا چاہئے۔ اپنی ہوس اقتدار کی تسکین کے لئے انہوں نے ہمارے ملک کا تقریباً ہر ادارہ تباہ و برباد کر دیا ہے۔ حکومت کو قانونی قرار دینا اور بلا جواز طول دینا عدالتوں کا کام نہیں ہے۔ اقتدارِ اعلیٰ اور حکومت کو منظور یا نامنظور کرنے کا حق صرف اس ملک کے عوام کے لئے مخصوص ہے۔ اس حکومت نے شروع شروع میں یہ دھوکہ بھی دیا کہ وہ اعلیٰ عدالتوں کا احترام کرتی ہے لیکن اب ڈھول کا یہ پول بھی کھل چکا ہے۔ وہی سپریم کورٹ جو کل تک اس قابل سمجھی جا رہی تھی کہ وہ اس پوری حکومت کو جائز یا ناجائز قرار دے اب وہ ایک معمولی فوجی میجر کی عقل کو بھی نہیں للکار سکتی۔ اگر کوئی میجر فیصلہ دے یا حکم جاری کرے تو سپریم کورٹ کی ایک

مکمل بنچ بھی اس پر اعتراض نہیں کرسکتی۔ اور یہ بات اس حد تک جا پہنچی ہے کہ اس حکومت کے حامی کئی ججوں نے بھی نیا حلف اٹھانے سے انکار کر کے ملازمتیں چھوڑ دیں۔

حکومت نے مارشل لاء کا حکم نمبر 51 اور اسی قسم کے کئی دیگر احکامات بھی جاری کیئے ہیں اور ایسے احکات نے ان تمام ملازمتوں کو غیر یقینی بنا دیا ہے۔ چنانچہ ملازمتوں میں جتنی غیر یقینی بڑھتی ہے، اتنی ہی رشوت بھی بڑھتی ہے اور اگر ملازمت کی سلامتی کا دارومدار کسی من موجی حاکم کی مرضی پر منحصر ہے تو پھر ہر ایک یہی کوشش کرے گا کہ وہ خود اتنا مال و دولت سمیٹ لے جو برے وقتوں میں اس کے کام آسکے۔ علاوہ ازیں پریس پر پابندیوں کی بھرمار ہے اور اسمبلیاں توڑ دی گئی ہیں۔ اب ان پر نظر رکھنے اور احتساب کے لئے کوئی ادارہ موجود نہیں ہے لہٰذا آجکل رشوت خوری اور بدعنوانی اتنے زوروں پر ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلے کبھی نہ تھی اور یہ ایک امر مصدقہ ہے کہ جب بھی مارشل لاء روزمرہ کی زندگی کا حصہ بن جاتا ہے تو وہ ہر جمہوری ادارے کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ ہر افسر ایک چھوٹا سا چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن کا چیئرمین اخبارات کو یہ بیان جاری کرتا ہے کہ اس کی کارکردگی پر کوئی تنقید نہ کی جائے اور لانڈھی سنٹرل جیل کا سپرنٹنڈنٹ بھی اتنا بے درد بن جاتا ہے کہ وہ اس مقدمہ میں شامل میرے ساتھیوں کو قید تنہائی میں چھ ماہ تک دن رات مسلسل ایک ہی کوٹھری میں بند رکھتا ہے اگرچہ قانونی طور پر اسے یہ اختیار ہرگز حاصل نہیں ہے۔

اس کے علاوہ جب حکومت کا سربراہ (اور ملک کا بھی) ملتان کے مزدوروں کا قتلِ عام کرواتا ہے، منتخب وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کرواتا اور حمید بلوچ کو پھانسی پر لٹکا دیتا ہے اور نوجوانوں کے رہنما ''نذیر عباسی'' کو اذیتیں دے کر شہید کرواتا ہے تو اس کے بعد قتل ملک میں روزمرہ کے معمول بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کراچی کی سی آئی اے، غلام حسین، عطا محمد اور دوسروں کو اذیتیں دے کر قتل کرتی ہے۔ پتوکی پولیس محمد سرور کو اذیتیں دے کر ہلاک کر دیتی ہے۔ اور بوا اور صغریٰ کی عصمت لوٹ کر انہیں ننگا کر کے نچاتی ہے، سانگلہ ہل پولیس ماسٹر اصغر کو اذیتیں دے کر مار ڈالتی ہے۔ لاہور چھاؤنی کی پولیس کئی بے گناہ افراد کو اپنے ظلم و تشدد کا نشانہ

بنا کر مار دیتی ہے۔ دادو پولیس کالو برہمانی کو اذیتیں دے کر ہلاک کرتی ہے۔ جیکب آباد پولیس جمعہ پٹھان کو تادم مرگ زدوکوب کرتی ہے۔ بنوں جیل کے حکام اسلم خان کو اذیتیں دے کر قتل کرتے ہیں۔ کورنگی پولیس محمد داؤد کو بے پناہ تشدد کر کے ہلاک کر دیتی ہے۔ دوداپور پولیس اللہ ڈینو کو تشدد کر کے مار ڈالتی ہے چوہڑ کانہ منڈی لاہور پولیس مس شہناز اور فیضان کو تھانے میں بلا کر ننگا کر کے نچاتی ہے۔ سرحد پولیس سید کامران رضا کو اذیتیں دے کر قتل کر دیتی ہے۔ گوجرہ پولیس صحافی اشفاق حسین قریشی کو تشدد کے بعد ہلاک کر دیتی ہے۔ تلہار (سندھ) پولیس شاہ محمد قریشی کو اذیتیں دے کر قتل کرتی ہے۔ علاوہ ازیں کون جانے ایسے کتنے دوسرے واقعات رونما ہوئے جو محض سنسر شپ کی وجہ سے پریس میں شائع نہیں ہو سکے۔ ہمارے ملک کے تقریباً ہر باشندے کو ان پولیس مقابلوں کا علم ہے جو آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں اور ان میں بدنام ڈاکو مارے جاتے ہیں۔ درحقیقت یہ سنگدل فوجی حکومت ہمارے ملک اور فوج دونوں کو خود بدنام کر رہی ہے اور اپنی ان بدکرداریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے الزام ہم پر لگاتی ہے اور اس طرح یہ فوجی حکومت دراصل ہماری فوج کا بھی بیڑہ غرق کر رہی ہے۔ اس ضمن میں، میں تھوڑی سی مثالیں دیتا ہوں۔

(الف) اس حکومت نے فوج میں ادغام کی پالیسی شروع کی ہے۔ آزاد کشمیر رجمنٹ میں سے اکثر کشمیریوں کا تبادلہ کر کے دوسری رجمنٹوں میں بھیجا گیا ہے۔ نیز پنجاب رجمنٹ، سندھ رجمنٹ، فرنٹیئر رائفلز میں بھی یہی صورتحال پیدا کی گئی ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ مثال کے طور پر اگر کشمیری جمہوریت کی بحالی کے لئے سڑکوں پر نکل آئیں اور یہ ایک ایسی زبردست تحریک بن جائے کہ پولیس کے ذریعے اس پر کنٹرول نہ کیا جا سکے تو حکومت ان پر آزاد کشمیر رجمنٹ کے ذریعے گولی چلانے کی حیثیت کی حامل ہونا چاہتی ہے۔ چونکہ حکومت سمجھتی ہے کہ اگر آزاد کشمیر رجمنٹ میں کشمیریوں کی اکثریت ہوگی تو کہیں وہ اپنے ہی لوگوں پر گولی چلانے سے انکار نہ کر دیں، لیکن اپنی موجودہ نظر بندی کے دوران میں اپنے بہادر سپاہیوں کے ساتھ رہا ہوں اور پورے اعتماد کیساتھ یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ یہ فوجی چاہے کسی بھی صوبے سے تعلق رکھتے ہوں وہ اپنے عوام پر گولی نہیں چلائیں گے۔

(ب) فوجی کیمپوں میں نظر بندی کے دوران مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ انگریزوں کے دور سے لے کر اب تک یہ روایت برقرار ہے کہ سپاہیوں کو عام لوگوں سے گھلنے ملنے کی اجازت نہ دی جائے۔ شہروں میں بھی وہ خصوصی اجازت نامہ حاصل کرنے کے بعد ہی جاسکتے ہیں۔ اگرچہ انگریز سامراج یہاں سے چلا گیا ہے لیکن ابھی تک ہمارے ملک میں اس کے احکامات پر سختی سے عمل درآمد کیا جارہا ہے۔

(ج) فوج میں ملازمت کی صورتحال لازمی بھرتی سے کسی بھی صورت کم نہیں۔ اگر کوئی ایک مرتبہ فوج میں شامل ہوجاتا ہے تو پھر لازمی طور پر پندرہ سال پورے کرنے کے بعد نجات حاصل کرسکتا ہے۔

(د) فوج میں افسر بھرتی کرنے کے لئے انگریز سامراج کی ایک خاص پالیسی تھی کہ وہ افسر صرف اوپری طبقات سے بھرتی کرتے تھے جو عام طور پر ان کا وفادار ہوتا تھا یا پھر فوج میں موجود کسی افسر کے رشتہ دار کی سفارش کی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ بے ہودہ سامراجی پالیسی آج بھی برقرار ہے۔ میں ذاتی طور پر بعض ایسے افراد کو جانتا ہوں جنہیں افسر کے طور پر صرف اس لئے نہیں لیا گیا کہ وہ یا تو عام سپاہی تھے یا پھر سماج کے نچلے طبقات کی اولاد تھے۔

(ح) فوج میں ایک اور دستور بھی رائج ہے جسے مضمحل یا فٹیگ کہا جاتا ہے جس کے تحت سپاہیوں کو تمام وقت جسمانی مشقت میں مصروف رکھا جاتا ہے تاکہ انہیں اپنی زندگی کے بارے میں غور وخوص کرنے کی فرصت ہی نہ ملے کیونکہ حکومت یہ سمجھتی ہے کہ اگر سپاہیوں نے بھی سوچنا شروع کردیا تو وہ بار بار مارشل لاء نہیں لگا سکتی۔

(ر) فوج کو سیاست میں ملوث کرکے حکومت اپنے انٹیلی جنس کے شعبے کو بھی برباد کررہی ہے کیونکہ مارشل لاء کی وجہ سے فوجی انٹیلی جنس شعبے میں عموماً اور سرحدی علاقوں میں خصوصاً یہ افسر شاہی کیلئے خاص منافع بخش بن جاتی ہے جس کی وجہ سے کئی افسران کی آپس میں مختلف باتوں پر چپقلش ہے۔ آئی۔ ایس۔ آئی کے افسران کو تنگ کرنے کے لئے کسی دن ایف آئی یو والے کسی ایسے گاؤں پر قابو پالیتے ہیں جس کا تعلق آئی ایس آئی سے ہوتا ہے جس کے جواب میں

موقع ملنے پر آئی ایس آئی والے بھی ایسے لوگوں کو پکڑ لیتے ہیں جن کا تعلق ایف آئی یو سے ہوتا ہے۔

(ز) مجھے حیدر آباد کی خصوصی فوجی عدالت سے سرکاری طور پر دس سال کی سزا گیارہ اکتوبر 1981 کو سنائی گئی۔فوجی قوانین کیمطابق جب تک یہ فیصلہ ملزم کو سنایا نہیں جاتا اس وقت تک اسے راز سمجھا جاتا ہےاوراس کا علم صرف متعلقہ حکام کو ہی ہوتا ہےلیکن بی بی سی نے اس دس سال کی سزا کا اعلان مارچ 1981 میں ہی کر دیا تھا۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ واشنگٹن میں دیا گیا اوراس کے اسلام آباد پہنچنے سے پہلے ہی ''بی بی سی'' کو پتہ چل گیا۔اگر ملک کی اعلیٰ عدالتوں کو اختیار ہوتا تو یہ فیصلہ اس بنیاد پر ہی غیر قانونی قرار دیا جاتا کیونکہ متعلقہ لوگوں (عدالت کے اراکین ، مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر اور چیف مارشل لاء) کے علاوہ دوسرے غیر متعلقہ لوگوں کو بھی اس کا پتہ چل گیا تھا۔اس طرح سے یہ ایک سازش ثابت ہوئی۔

مجھے خفیہ اذیت گاہوں کے شریفانہ سلوک کا پہلے سے ہی اندازہ تھا اس لئے میں نے حیدر آباد کی خصوصی فوجی عدالت کے سامنے اپنے بیان میں یہ کہا تھا کہ اگر فوجی انٹیلی جنس کے شعبے کی سیاست میں مداخلت جاری رہی تو وہ ایک آدم خور بن جائے گا۔ یہ بیان میں نے 29 جون 1980 کو دیا تھا جبکہ نذیر عباسی شہید کو نو اگست 1980 کو فوجی کیمپ میں اذیتیں دے کر شہید کر دیا گیا۔ یہ بات اب پوری دنیا کو معلوم ہو چکی ہے اور یوں قاتلوں کے اس ٹولے نے ہماری فوج کو ذلیل وخوار کیا ہے۔اس لئے میں مطالبہ کرتا ہوں کہ نذیر عباسی شہید کے قاتلوں کو منصفانہ مقدمے کے لئے پاکستان کے عوام کے حوالے کیا جائے۔ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہم یہ مقدمہ سول عدالتوں میں ملک کے عام قوانین کے مطابق چلائیں گے اور ہم یہ بھی یقین دلاتے ہیں کہ ہم تارا مسیح جیسے چھوٹے ملزموں کو ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے بلکہ اصل مجرموں سے حساب کتاب کریں گے۔

جہاں تک اس مقدمہ کا تعلق ہے اس میں کوئی نئی چیز نہیں ہے،سامراج کی دلال ہر وہ حکومت جو بڑے سرمایہ داروں، بڑے بڑے زمینداروں اور سنیئر جرنیلوں سے گٹھ جوڑ کرتی ہے وہ

کمیونسٹوں اور دیگر محبّ وطن لوگوں کے خلاف اس قسم کے مقدمات ہمیشہ قائم کرتی ہے تا کہ وہ ان کے مکروہ عزائم کو ناکام نہ بنا سکیں۔ اس عدالت کے فیصلے کی تصدیق بھی انہی جرنیلوں کو کرنی ہے جو ہمارے اتنے ہی دشمن ہیں کہ انہوں نے 26 جنوری 1982 کو اخبارات کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اس مقدمہ کی خبریں شائع نہ کریں اور میرا نام تو کسی بھی صورت میں اخبار میں نہ آنے پائے۔

اس عدالت کو تشکیل کرنے والے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل عباسی اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء دونوں ہی ہمارے نوجوانوں کے رہنما نذیر عباسی شہید کے قتل کے مقدمے کی ''ایف آئی آر'' میں ملزم ہیں۔ اس کے علاوہ یکم اگست 1981 کے لیٹر نمبر N/11/80/11P.O/1 میں جنرل ضیا مجھے اور اس مقدمہ میں شامل میرے دیگر دوستوں کو مقدمہ چلانے سے قبل ہی مجرم قرار دے چکا ہے لہٰذا ہم کون سے انصاف کی توقع رکھ سکتے ہیں جب کہ اسے اس فیصلے کی تصدیق ہی کروانی ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ اس عدالت کے نام پر بڑے بڑے ٹوپلوں کے فیصلہ کے خلاف پاکستان کی سپریم کورٹ میں بھی کوئی اپیل نہیں کر سکتے لیکن خیر اس سے بھی بڑی عوامی عدالت میں ہمارے مادر وطن کے تمام محبّ وطن لوگ مشترکہ طور پر ہمارے منصف ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ دن دور نہیں جب وہ مادر وطن کو ان سامراجیوں اور اس کے دلالوں سے آزاد کروالیں گے۔

جناب والا۔ یہ عدالت ہم پر اتنی نامہربان رہی ہے کہ اس نے ہمارے گواہان صفائی کی فہرست کو کم کر کے صرف چند ایک افراد کو پیش ہونے کی ہی اجازت دی ہے۔ اگر چہ فوجی قوانین کے مطابق بھی اسے ایسا کوئی اختیار نہیں ہے۔ شاید اس عدالت نے اس لئے ایسا کیا ہے کہ اس پر ان بزدل ظالموں کا دباؤ ہے جنہوں نے اس عدالت کو لولے لنگڑے اختیارات ہی اس لئے دیئے ہیں کہ ہمارے بدنصیب ملک میں موجود مارشل جسٹس (فوجی انصاف) بھی ناپید کر دیا جائے۔ جناب من! یہ ایک سیاسی مقدمہ ہے۔ خود وکیل استغاثہ نے بھی ہمیں اخلاقی مجرم ٹھہرانے سے گریز کیا ہے۔ اگر ہمیں ملک کے تمام ممتاز صحافیوں، رائے عامہ کے رہنماؤں، مختلف مکاتب فکر کے سیاسی رہنماؤں اور زندگی کے ہر شعبے کے ماہرین کو طلب کرنے کی اجازت دی جاتی تو یہ بات

بڑی آسانی سے ثابت ہوسکتی تھی کہ نہ صرف ہم محبّ وطن ہیں بلکہ جس لٹریچر کوتخریبی کہا جارہا ہے وہ بھی وطن دوستی، امن، ترقی اور خوشحالی کا پرچار کرتا ہے۔

بہر حال، شاید جیسا کہ یہ مقدمہ اب اپنے اختتام کوپہنچ رہا ہے اور اس عدالت کو بالآخر کوئی ناخوشگوار فیصلہ سنانا ہے، اس لئے اس کے ایک فریق بن کرالگ کھڑے ہونے کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ جناب والا! میں آپ کو یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اگرچہ ملک کی اعلیٰ عدالتیں بھی دباؤ کے تحت فیصلے دیتی رہی ہیں لیکن پھر بھی انہیں حکومت کی تبدیلی کے بعد تلافی کا موقع مل جاتا ہے مگر فوجی عدالتوں کو یہ موقع بھی نہیں ملے گا۔ لہٰذا انہیں ایک ہی مرتبہ یہ فیصلہ بھی کرنا ہوگا کہ وہ تاریخ کی طرف ہیں یا بڑی ٹوپیوں کی چمچہ گیری کریں گے۔

جام ساقی

9اور10جنوری1983

پروفیسر جمال نقوی

''صدر اور اراکینِ خصوصی فوجی عدالت''

میں اپنے لیے مخصوص آ درش اور نظریات رکھتا ہوں۔ میرا تعلق تعلیمی شعبے سے ہے اور میں نے برسوں نوجوان طالب علموں کو انگریزی ادب کی تعلیم دی ہے۔ میں بریخت کے اس خیال سے بھرپور اتفاق کرتا ہوں کہ

''دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ ہم نیک رہے ہیں بلکہ ہمیں یقین ہونا چاہیئے کہ ہم ایک بہتر اور زیادہ خوبصورت دنیا دے کر جا رہے ہیں''

عوام کی سیاست: مجھے عوام کی سیاست میں حصّہ لینے کے جرم میں اس مقدمے کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ آپ اس مقدمے کی حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ میرے خلاف چارج شیٹ میں لگائے گئے تمام الزامات جھوٹے ثابت ہو چکے ہیں اور کچھ بھی ثابت نہیں کیا جا سکا یہاں تک کہ تمام شہادتیں مجھے بری الذمہ قرار دے رہی ہیں۔

استغاثہ کے نزدیک میرا جرم صرف یہ ہے کہ میں ان لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا پایا گیا ہوں جن کے معصوم دل ملک کے کروڑوں مظلوم لوگوں کی محبت سے بھرے ہوئے ہیں۔ آپ اسے سیاست کہہ سکتے ہیں لیکن کیا یہ سیاست نہیں ہے کہ لوگوں کو ان کے نظریات کی بنیاد پر گرفتار کر لیا جائے۔ اس عدالت میں مقدمہ سیاسی مقدمے کے ذیل میں پیش کیا گیا ہے اور یقیناً آپ کے حاکم اس مقدمے کا فیصلہ بھی سیاسی ضابطوں کے دائرے میں رہ کر سنائیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس مقدمے اور اِس عدالت کی نام نہاد قانونی حیثیت کا پول اس وقت ہی کھل گیا تھا

جب ہماری اس مشترکہ درخواست کو مسترد کردیا گیا تھا جس میں ہم نے نذیر عباسی شہید کے قاتلوں کے خلاف مقدمہ چلانے، اس عدالت کو کھلی عدالت قرار دینے اور اس مقدمے کی پنسل سے لکھی ہوئی کارروائی کے ضائع کردیئے جانے کے خطرے کی روک تھام کے لیے تمام شہادتوں کی تصدیق شدہ نقول کی فراہمی کا مطالبہ کیا تھا۔ ہماری درخواست کے مسترد کیے جانے سے یہ بات صاف طور پر سامنے آجاتی ہے کہ آپ کے افسران بالا اپنی سیاست کو ننگا ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔

ہم اور آپ تاریخ کے اس فیصلے سے آگاہ ہیں کہ وہ تمام لوگ جو ناانصافی اور تشدد کی سیاست کا ساتھ دیتے ہیں، وہ ظالموں اور جابروں کی صف میں شامل ہیں اور ہم بغیر کسی جرم کے ظلم کا شکار ہیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں اپنے ملک کے مظلوم اور ستم رسیدہ عوام کی سیاست کو کس طرح دیکھتا ہوں۔

عوام دشمن طبقات کی حکومت: جنرل ضیاءالحق نے خود اپنے ہی ملک کو اندھی طاقت کے بل بوتے پر فتح کر رکھا ہے۔ موجودہ حکومت کوئی ایسا اخلاقی جواز نہیں رکھتی کہ جس کی وجہ سے وہ عوام سے رضا کارانہ فرمان برداری کی توقع رکھ سکے۔ البتہ عوام کا اس اندھی طاقت کیخلاف اٹھ کھڑا ہونا ایک فطری عمل ہے۔ موجودہ مارشل لا کا بنیادی مقصد ملک میں سامراجی تسلط کو قائم کرنا اور عوام دشمن طبقات کے مورچوں کو مضبوط کرنا ہے۔

دراصل اب پاکستان کے مٹھی بھر جاگیرداروں اور گماشتہ سرمایہ داروں کے لئے ملک پر اپنا تسلط قائم رکھنا اس وقت تک ممکن نہیں رہا جب تک کہ اُن کی پشت پر امریکی سامراج اور کثیر القومی کمپنیوں کا مضبوط ہاتھ نہ ہو۔ ایسی صورتحال میں حکمران طبقات کا عوام سے خوف زدہ ہوجانا ایک قدرتی امر ہے۔

سماجی تبدیلی ناگزیر ہے: پاکستان سماجی تبدیلی کے دھانے پر کھڑا ہے۔ ملک ابتداء ہی سے جن حکمران طبقات کے تسلط میں رہا ہے ان کی غلط کاریاں اب خود انہیں تاریخ کی ردی کی ٹوکری میں ڈال دینے کو تیار ہیں۔ عوام کے خون میں لتھڑے ہوئے ان کے دانت اور پنجے انکی فریب کاریوں کا پردہ چاک کئے دیتے ہیں۔ محنت کشوں، جمہوریت پسندوں اور محبِّ وطن عوام کے ہاتھوں

شکست ان کا مقدر بن چکی ہے۔

کمیونسٹوں اور محبِّ وطن لوگوں کے خلاف قائم کیا جانے والا یہ مقدمہ ایک آخری حربہ ہے جس میں تشدد کے ہتھیار کے ذریعے موجودہ زوال پذیر حکومت 1954 کے ان کمیونسٹ دشمن واقعات کی یاد تازہ کرنا چاہتی ہے جو پاکستان کو پہلی مرتبہ امریکی سامراج کی غلامی میں دیئے جانے کے بعد رونما ہوئے تھے لیکن اب حالات 1954 سے بہت مختلف ہیں۔

سامراجی معاہدے: امریکہ 1950 کے عشرے کے آغاز سے دُنیا بھر میں سامراجی عزائم کی تکمیل کے لیے بین الاقوامی مسلح پولیس کا کردار اپنا چکا ہے۔ امریکہ پوری دنیا کو فوجی معاہدوں میں جکڑ کر نہ صرف قومی آزادی کی تحریکوں کو کچل دینا چاہتا ہے بلکہ وہ ان حربوں سے سوشلسٹ دنیا اور سوشلسٹ خیالات کے بڑھتے ہوئے دھارے کو بھی روکنے کی ناکام جستجو میں لگا ہوا ہے۔

پاکستان کے حکمران طبقات نے 1954 میں امریکی فوجی معاہدوں میں شامل ہو کر ملک کی سیاسی آزادی کا قلع قمع کر دیا اور پاکستان کو جدید نوآبادیاتی ریاست میں بدل کر استحصال کا شکار بنا دیا۔ جاگیرداری اور ماقبل جاگیرداری کی باقیات پر کھڑے ہوئے ڈھانچے کو مصنوعی طریقوں سے قائم رکھنے کے لیے ملکی معیشت مکمل طور پر سامراجی چنگل میں دے دی گئی جس کے نتیجے میں اقتصادی ترقی کی تمام راہیں مسدود ہو کر رہ گئیں۔ جمہوری آزادیوں پر قدغن لگا دی گئی۔ ملک کی تمام اقوام کو اُن کے قومی حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ تمام سماجی اداروں کی جائز حیثیت ختم کر کے انہیں سامراجی ایجنٹوں کے حوالے کر دیا گیا۔ پڑوسی ممالک سے تعلقات میں الجھاؤ پیدا کر دیئے گئے۔ ملک میں عام انتخابات کی کبھی نوبت نہیں آسکی۔ اس کے برعکس متواتر سامراج نواز فوجی جنرل مُسند اقتدار پر قابض ہوتے رہے۔

روزنامہ ڈان نے پاکستان کے ایک سابق گورنر جنرل کی موت پر کچھ اس طرح کے ماتمی کلمات لکھے: نیم پاگل گورنر جنرل۔ جس نے 1954 کی دستور ساز اسمبلی توڑنے کا اعلان اس طرح کیا کہ اس کے دائیں اور بائیں دونوں جانب فوجی جنرل ایستادہ تھے۔ الغرض ملک کا اقتدار اعلیٰ عوام کے ہاتھوں سے نکل کر سامراجی آقاؤں کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔

سوشلزم ایک فیصلہ کن قوت

دوسری جنگِ عظیم کے فوراً بعد عالمی طور پر طاقت کا توازن سوشلسٹ دنیا کے حق میں ہو چکا ہے اور سوشلزم دنیا میں ایک فیصلہ کن قوت کے طور پر ابھر چکا ہے۔

دنیا بھر میں عالمی امن، تخفیف اسلحہ اور ایٹمی ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کی تحریکیں تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ یورپ میں باہمی کشیدگی کے خاتمے کا عمل ایک اٹل حقیقت کا روپ دھار چکا ہے۔ امریکی سامراج ویت نام میں عبرتناک شکست سے دوچار ہو چکا ہے اور اب ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں بھی صورت حال واضح طور پر سامراج مخالف رُخ اختیار کر چکی ہے۔ تحریک آزادی فلسطین ثابت قدمی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ افریقہ میں بیداری کی لہر اٹھ چکی ہے۔ اوپیک ممالک تیل کا ہتھیار موثر طور پر عالمی سامراج کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ بیشتر نوآزاد ممالک میں قومی جمہوریتیں سوشلسٹ پذیری کا راستہ اختیار کر چکی ہیں۔ مصر کے انور سادات کے قتل کے ساتھ ہی کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ انڈیا میں اندرا گانگریس جنتا پارٹی کو شکست دے چکی ہے۔ ایران میں شہنشاہت کا خاتمہ ہو چکا ہے اور جمہوری انقلاب کامیاب ہو چکا ہے۔ افغانستان میں عوامی جمہوریت کا سورج طلوع ہو چکا ہے۔ چینی تنگ نظری اور عالمی سامراج کا اندرونِ خانہ گٹھ جوڑ بے نقاب ہو چکا ہے۔ اور ماؤازم زیادہ تر ملکوں میں ایک قوت بننے کی خواہش سمیت دم توڑ چکا ہے۔ روسی صدر لیونڈ برژنیف نے جنوبی ایشیاء اور بحر ہند کے مسائل کے پرامن حل کے لیے علاقائی ممالک اور متعلقہ عالمی طاقتوں کی جس مشترکہ کانفرنس کے انعقاد پر زور دیا تھا آج ایسی مشترکہ کانفرنس کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔

سامراج کی شکستیں: امریکی سامراج دنیا میں شکستوں سے دوچار ہورہا ہے۔ جس کا اظہار اس کی اندھادھند بدلتی ہوئی پالیسیوں اور بڑھتے ہوئے امریکی ایٹمی اسلحے کے انبار سے ہوتا ہے۔ یقیناً امریکی جنگی حکمت عملی اور ایٹمی اسلحہ دنیا کے لئے خطرناک تباہی کا پیش خیمہ بنے ہوئے ہیں لیکن امریکی جنگی حکمت عملی اور امریکی ایٹمی اسلحہ خود عالمی سامراج کی فطری کمزوری اور ان شدید تضادات کا پتہ دیتے ہیں جن میں سامراج گرفتار ہے۔ امریکی سامراج ڈیگوگارشیا کے فوجی

اڈوں کے ذریعے ایٹمی اسلحے کے پھیلاؤ کو وسیع تر کر رہا ہے جب کہ مزید ایسے اڈوں کی تلاش اس کا مطمع نظر بن چکا ہے۔ امریکی اواکس جاسوس طیارے اسرائیل اور سعودی عرب پہنچائے جا چکے ہیں اور ممکن ہے کہ پاکستان میں بھی یہ جاسوس طیارے فوجی خدمات انجام دے رہے ہوں۔ حال ہی میں امریکہ نے چین کے ساتھ بھی فوجی اشتراک کا آغاز کر دیا ہے۔ سریع الحرکت فوج کی تشکیل بھی جنوب مغربی ایشیاء میں امریکی سامراج کی جنگی حکمت عملی کا ایک حصہ ہے۔

امریکی سامراج باہمی کشیدگی کے خاتمے کی طرف لے جانے والے سالٹ معاہدے اور اس نوع کی ہر ایسی حکمت عملی سے جان چھڑانا چاہتا ہے جو دنیا کو زندگی کے لیے محفوظ تر مقام بنانے کا امکان رکھتی ہو۔ لیونڈ برژنیف نے اسی حوالے سے کہا ہے۔ ''اگر افغانستان کا مسئلہ نہ ہوتا تو سامراج اپنی کمیونسٹ دشمن کارروائیوں کے لئے کوئی اور افغانستان ایجاد کر لیتا۔''

ریگن انتظامیہ اپنی تمام تر کوششوں کے باجود صرف چار ممالک کو اس نئے فوجی اتحاد میں شامل کر سکی ہے جو جنگی حکمت عملی میں ہم آہنگی کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔ یہ ممالک ترکی، اسرائیل، سعودی عرب اور پاکستان ہیں۔

ضیاء ٹولے کے حکومت پر غاصبانہ قبضہ کے بنیادی مقاصد یہ ہیں کہ پاکستانی عوام کی واشگاف خواہش کے برعکس ملک کی غیر وابستہ حیثیت ختم کر دی جائے۔ ملک کو سامراجی جنگی حکمت عملی سے جوڑ کر مغربی ایشیاء کے مشرقی کنارے تک تیل کی پائپ لائنوں میں سامراجی مفادات کی چوکیداری کے فرائض سنبھال لئے جائیں۔ پاکستان کو ایک ایسی ریاست میں بدل دیا گیا ہے جس سے علاقے میں امن کیمپ کے بڑھتے ہوئے اثرات کو نہ صرف روکنے کا کام لیا جائے بلکہ سامراجیوں اور چینیوں کے لئے پاکستان کو ایک ایسا فوجی اڈہ بنا دیا جائے جہاں سے قومی جمہوریہ افغانستان کے خلاف مداخلت کی جنگ لڑی جا رہی ہے اور اس علاقے کی عوام دشمن قوتوں کے گٹھ جوڑ کا اڈہ بنا دیا جائے۔ شاہراہِ قراقرم 70ء سے چینی اسلحے کی مسلسل ترسیل کے باعث شہری آمدورفت کے لئے بند پڑی ہے۔

پاکستان کوسامراج کا اسلحہ خانہ بنانے کے لئے عوام کی آواز کوختم کرنا لازمی تھا لہٰذا اس فوجی ٹولے کوسامراج اور عوام دشمن طبقات کے مفادات میں جلاد کا کردار دیا گیا۔

پاکستان میں فوجی ٹولہ اس وقت برسراقتدار لایا گیا جب علاقے میں سامراجی مفادات شدید چوکیداری کے متقاضی تھے اور خود پاکستان میں مرحوم وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے دوبارہ عام انتخابات کے اعلان سے پیدا ہونے والے داخلی خلفشار کے سامراج مخالف رُخ کو روکنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ فوجی ٹولے نے اقتدار پر قبضہ جماتے ہی عبوری آئین اور فوجی حکمناموں کے ذریعے 1973 کے متفقہ آئین کی دھجیاں بکھیر دیں۔ ملک کوسنسرشپ کے ذریعے سیاہ ترین دور میں دھکیل دیا گیا اور اس ساری صورتحال کوسامراجی سرمایہ کاری اور نجی سرمایہ کاری کے فروغ کے لیے استعمال کیا گیا، جبکہ بیشتر قومیائی گئی صنعتوں کو دوبارہ نجی ملکیت میں دے دیا گیا۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ سابق شاہ اور ساواک کے خاتمے کے ساتھ ہی ایران جس فوجی ریاست کے کردار سے دستبردار ہوا تھا، اب اسی کردار کی ادائیگی کے لئے پاکستان کومتبادل ریاست میں بدل دیا گیا ہے۔

میں محبّ وطن ہوں: موجودہ حکومت پاکستان کوسامراجی آلہ کار بنا کر پڑوسی ممالک اور سوشلسٹ ممالک کے خلاف معاندانہ سرگرمیوں کے لئے استعمال کرنا چاہتی ہے لیکن اسے ان تمام وطن پرستوں کی شدید مزاحمت کا سامنا ہے جو ملک کی علاقائی سالمیت کے تحفظ کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میرا نام بھی ان وطن پرستوں میں شامل ہے۔

میں جمہوریت پسند ہوں

ضیاء حکومت ان تمام جمہوریت پسندوں کی شدید مخالفت سے دوچار ہے جو عوام کے اس اقتدار اعلیٰ کی سالمیت کے لئے لڑ رہے ہیں جس کوموجودہ حکومت نے سامراج کے ہاتھوں بیچ دیا ہے، جو سماج کو عوام دشمن طبقات سے پاک کرنا چاہتے ہیں اور عوام کی اکثریت کا جمہوری اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میرا نام جمہوریت پسندوں میں شامل ہے۔

میں سوشلسٹ ہوں

فوجی حکومت کمیونسٹوں اور محنت کش عوام کے ان نمائندوں کی شدید مزاحمت سے دوچار ہے جو اپنے اس آدرش پر گہرا یقین رکھتے ہیں کہ مزدور' کسان اور دیگر محنت کش طبقات ہی ملک کی تمام تر دولت کے خالق اور وارث ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مزدور، کسان اور محنت کش عوام ہی ملک کو اپنی مرضی اور اپنے نظریے کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

مجھے فخر ہے کہ میرا شمار محنت کش عوام کے نظریے کی فتح کے لئے جدوجہد کرنے والے کارکنوں میں کیا گیا ہے۔

کمیونسٹوں کا شاندار ماضی

یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ پاکستان کی آمر حکومت اپنے مخالفین پر کمیونسٹ ہونے یا کمیونسٹوں سے راہ ورسم رکھنے کا الزام لگاتی رہی ہے۔ کمیونسٹوں سے تعلق پر جان لیوا خوف ہی دراصل حکمرانوں کیجانب سے کمیونسٹوں کیلئے زبردست خراج تحسین ہے۔ ضیاء حکومت کمیونسٹوں کے شدید خطرے کی مسلسل چیخ و پکار کے ذریعے سامراج کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوششوں میں سابقہ تمام حکومتوں سے آگے نکل گئی ہے۔

کسان طبقہ: کمیونسٹ' محنت کش طبقات کا سب سے زیادہ باشعور، بااصول اور بے لوث حصہ ثابت ہوئے ہیں اور ہمیشہ اپنے عوام کی لڑائیوں میں اُن کے ساتھ رہے ہیں۔

سابق مشرقی پاکستان میں 1949 کی کسان بغاوت تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ یہ کسان بغاوت ''بھاگا کسان تحریک'' کے نام سے مشہور ہوئی جسکی رہنما لیلا مترا تھیں جنہیں نورالامین حکومت نے بعدازاں تشدد کے ذریعے معذور کردیا تھا۔ اسی طرح سندھ میں اٹھنے والی کسان تحریکیں بھی لوگوں کے ذہنوں میں زندہ ہیں۔ جن میں بٹائی کی تحریک' زرعی اصلاحات کی تحریک اور الاٹی باری تحریک نمایاں تحریکیں ہیں۔ جن کی رہنمائی کامریڈ حیدر بخش جتوئی 'سوبھو گیان چندانی' قاضی فیض احمد اور مولوی نذیر جتوئی جیسے بے لوث رہنما کررہے تھے۔ اسی طرح صوبہ سرحد میں چارسدہ اور دیگر علاقوں کی کسان تحریکیں ہوں یا بلوچستان کے کسانوں کی

شیشک کے خاتمے کی تحریک ہو یا پنجاب کے کسانوں کی بے شمار لڑائیاں ہوں یا حالیہ پٹ فیڈر کسان تحریک ہو ان تمام تحریکوں میں کمیونسٹ اور دوسرے طبقاتی شعور رکھنے والے کارکنوں نے ہر اول دستے کا کردار ادا کیا ہے۔

محنت کش طبقات: کمیونسٹ ملک بھر میں محنت کش طبقات کی لڑائیوں میں فطری طور پر شریک رہے ہیں۔ آج پاکستان میں ٹریڈ یونین تحریک کمیونسٹوں کی بے بہا محنت اور قربانیوں کی بدولت ہی مضبوط بنیادوں پر استوار نظر آتی ہے۔ محنت کش طبقے کی بہادرانہ جدوجہد کے واقعات میں مسلسل کئی دنوں تک بیان کرسکتا ہوں لیکن یہاں صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوگا کہ پاکستان کی تمام جیلیں ٹریڈ یونین کارکنوں سے بھی اتنی ہی واقف ہیں جتنا کہ وہ اس دھرتی کے ان لاکھوں سپوتوں سے واقف ہیں جنہیں ایک بہتر اور منصفانہ زندگی کی جدوجہد ہر سال پس زندان لے آتی ہے۔ یہ محنت کش طبقہ ہی ہے جس نے مرزا ابراہیم ڈاکٹر اعزاز نذیر منہاج برنا، مولا بخش خاصخیلی، جاوید شکور اور ایسے ہی ان گنت بے لوث اور دیانت دار رہنما پیدا کئے ہیں جنکی مثال کسی دوسرے سماجی طبقے میں تلاش نہیں کی جاسکتی۔

کمیونسٹ ہر اس سماج میں ہوں گے جہاں محرومیاں جدوجہد کی متقاضی ہوں گی۔ جس طرح زمین پودے کو جنم دیتی ہے ایسے ہی سماجی ناانصافی کمیونسٹ پیدا کرتی ہے۔ کسی بھی سماج میں چاہے طالب علموں کی تحریک ہو یا خواتین کی تحریک ہو یا ادیبوں کی تحریک ہو غرض یہ کہ کوئی بھی تحریک کمیونسٹوں کے بغیر تصور تک نہیں کی جاسکتی۔

یہ محض میری ذہنی اختراع نہیں ہے بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جسکی تصدیق کوئی بھی کرسکتا ہے۔ یہاں تک کہ میرے اس دعویٰ کی تصدیق موجودہ حکومت اور تمام سابقہ حکومتوں کے طرزِ عمل میں صاف طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔

عوامی حقوق کے نمائندے: کمیونسٹوں نے تمام سامراج مخالف لڑائیوں میں بنیادی طور پر سرگرم کردار ادا کیا ہے اور وہ عالمی امن کے قیام کی جدوجہد میں بھی غیر متزلزل مجاہد ثابت ہوئے ہیں۔ ان کے لئے بنیادی انسانی حقوق، قوموں کے حقوق اور شہری آزادیوں کے حصول کی جدوجہد پچھلی

ہوئی انسانیت کی جانب سے عائد شدہ ایک سماجی فریضہ ہے۔

کامریڈ حسن ناصر (جنہیں 1960 میں شہید کر دیا گیا) جب 1951ء میں جیل سے رہا ہوئے تو انہوں نے سب سے پہلے شہری آزادیوں کی انجمن کے ذریعے جیلوں میں قیدیوں کی حالت زار بہتر بنانے کی جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ کمیونسٹ اپنے آدرش کے سامنے کسی قربانی کو بڑی قربانی نہیں سمجھتے اور حسن ناصر نے اسی وجہ سے ایوب حکومت کیخلاف لڑتے ہوئے جان کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ میرے دوست اور نوجوان کمیونسٹ طالب علم رہنما نذیر عباسی بھی میرے ساتھ گرفتار ہوئے تھے جنہیں حکمرانوں نے بزدالانہ تشدد کے ذریعے شہید کر دیا۔ یہ دونوں عظیم انسان زندگی سے عشق کرتے تھے اور اسی لئے انہوں نے اپنی زندگی کو امر بنالیا۔۔۔انہیں جوانی سے پیار تھا اس لئے انہوں نے عوام کے ذہنوں میں ہمیشہ جوان رہنے کی راہ منتخب کی۔ اب انکی زندگی اور جوانی وقت کی لہروں میں درخشاں ہے۔ جہاں نہ اب وہ بوڑھے ہوں گے۔ ضیاء کا ہاتھ انہیں چھو سکے گا۔ وہ اب سورج کی طرح چمکتے ہیں جس کے وجود سے زندگی کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔

رہنمانہ کردار: کمیونسٹوں نے پاکستان میں رونما ہونے والی ہر مثبت تبدیلی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ 1954 میں اردو کے ساتھ ساتھ بنگالی زبان کو حکومتی سطح پر تسلیم کرانے کے لئے قائم کئے جانے والے ''جگتو محاذ'' کے قیام اور فعالیت میں کمیونسٹوں نے بھرپور کردار ادا کیا تھا۔ یہی محاذ بعد ازاں دوسری تمام قوموں کی زبانوں کے غصب شدہ حقوق کی بازیابی کے لئے نقش اول ثابت ہوا۔ ایسے لوگوں کے لئے صرف دعا ہی کی جاسکتی ہے جو اب بھی ایک قوم ایک زبان کے نعرے سے چپکے ہوئے ہیں۔ کمیونسٹ اصولی طور پر پاکستانی معاشرے کو کثیر القومی معاشرہ سمجھتے ہیں اسی لئے انہوں نے 1955 میں ون یونٹ کے نام پر قومی حقوق غصب کئے جانے کی شدید مزاحمت کی اور آج تک قومی اور دوسرے تمام جمہوری حقوق کی بحالی کی جدوجہد اور حمایت کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ون یونٹ مسلط کرنے والے آج تک قبروں میں بے چین ہوں گے اور اُن کے موجودہ جانشین اپنے ہونٹ چبا رہے ہیں۔

کمیونسٹوں نے 1965 میں ہندوستان کیخلاف لڑی جانے والی جنگ کی شدید مخالفت

کی اور اس بات پر زور دیتے رہے کہ پڑوسی ممالک سے پر امن مذاکرات کے ذریعے مشترکہ مسائل حل کئے جائیں۔ انہوں نے سیاسی طریقے سے انجام پانے والے ''اعلان نامہ تاشقند'' کی حمایت کی اور بعدازاں تاریخ نے شملہ سمجھوتے اور ایسے دیگر واقعات کے ذریعے ثابت کر دیا کہ کمیونسٹوں کا یہ ردِعمل ایک درست سوچ کا نتیجہ تھا۔ ایسے لوگ کافی تعداد میں ہوں گے جو اپنے اُن دنوں کو بھلانے کے شدید خواہش مند ہوں گے جن دنوں وہ 'بھارت کو کچل دو' کے نعرے لگاتے تھے اور معاہدہ تاشقند کی مخالفت کرتے تھے۔

کمیونسٹوں نے 66 - 67 میں ایوب حکومت کیخلاف عوامی جدوجہد کو ہم آہنگ کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

جب 1971 میں یحییٰ حکومت نے بنگال میں فوجی کاروائی کا آغاز کیا تو کمیونسٹوں نے سب سے پہلے اس کی مخالفت کی اور زور دیا کہ سیاسی مسئلے کو سیاسی طریقے سے حل کیا جائے۔ انہوں نے فوجی حکومت کیخلاف بنگلہ دیش کے جمہوری انقلاب کی جدوجہد کی بھرپور حمایت کی۔ اب بھی جو لوگ 'الشمس اور البدر' کی بدروحیں دوبارہ زندہ دیکھنے کے وہم میں مبتلا ہیں انہیں بنگلہ دیش کے عوام کی فتح کا منظر ذہن میں تازہ رکھنا چاہیئے۔ کمیونسٹ شملہ معاہدے کے مطابق ہندوستان سے خوشگوار تعلقات کے حامی ہیں اور وہ بھٹو حکومت کے ایسے ہر مثبت اقدام کی حمایت کرتے رہے ہیں۔

کمیونسٹوں نے 1977 میں پی این اے کے قیام کی کھلے الفاظ میں مذمت کی اور اسے ایک رجعت پسند تحریک قرار دیتے ہوئے خبردار کیا تھا کہ پی این اے کا مقصد جنرل ضیاء کے غاصبانہ قبضے کی راہ ہموار کرنا ہے۔ اب یہ ایک کھلا راز ہے کہ پی این اے کی نام نہاد تحریک کے پیچھے امریکی ڈالر اور سردار داؤد کے آدمی تھے۔

بھٹو کی میراث

بھٹو مرحوم نے پاکستان کو جس غیر جانبدار اور آزاد خارجہ پالیسی کی راہ دکھائی تھی کمیونسٹ اس راہ کے پر جوش محافظ ہیں۔ بھٹو مرحوم نے پاکستان کے مفادات کو علاقائی حقیقتوں کی

روشنی میں رکھ کر دیکھا۔ یہی وجہ تھی کہ وزیراعظم بھٹو نے عوامی خواہشات کے احترام میں یوم مئی کو تسلیم کیا۔ روٹی کپڑا اور مکان کے حق کو تسلیم کیا۔ اس کے علاوہ بھٹو حکومت نے ایسے اقدامات کا آغاز کیا جس کے ذریعے محنت کشوں کو روزگار کی ضمانت اور کسانوں کو زرعی سہولیات کی فراہمی میں مدد مل سکتی تھی۔ اسی دورحکومت میں دیہی اور شہری غریب آبادی کے رہائشی مسائل کے علاوہ دیہی اور شہری علاقوں کے مختلف حصوں میں ترقی کی غیر ہموار سطح کو ختم کرنے کی کوششوں کا آغاز کیا گیا۔ یہ بھٹو حکومت ہی تھی جس نے عورتوں کی بہبود اور تعلیم کو ریاستی ذمہ داری قرار دینے کی بات کی۔ اس کے علاوہ اس حکومت نے صنعتوں کو قومیانے کے عمل کے ذریعے ملکی معیشت میں ریاستی بالادستی کے لئے اقدامات کئے۔ جبکہ مختلف علاقوں میں قومی سوالات کو وسیع تر باہمی ہم آہنگی کے اصولوں کیمطابق حل کرنے کے عزم کا اظہار کیا گیا۔ کمیونسٹوں نے امریکی سامراج کو ہر محاذ پر للکار کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ اس قابل ہیں کہ انہیں بھٹو کی عظیم وراثت کو باقی رکھنے کا اہل سمجھا جائے۔ کمیونسٹوں نے افغانستان میں امریکی کھیل میں حصہ دار بننے سے انکار کر دیا ہے اور ملکی سالمیت اور وقار کے تحفظ کی خاطر پڑوسی ممالک سے پرخلوص تعلقات کی راہ اختیار کی ہے۔ مارشل لاء اور اس کے حواریوں کی شدید مخالفت کی ہے۔ عملی طور پر یہ نعرہ بلند کیا ہے کہ ''طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں'' اور اسی کی بدولت انہوں نے محنت کش طبقات، پیشہ ورانہ تنظیموں اور محبّ وطن سیاسی کارکنوں کے اتحاد کے ذریعے ملکی سالمیت کے دفاع کی ذمہ داری نبھار کھی ہے۔

قومیتوں کا سوال: پاکستان میں قومیتوں کے سوال کی موجودگی ان تمام تصورات کو باطل قرار دے چکی ہے جو غیر لچکدار تاریخی تضادات کی غلط تفہیم پر قائم کئے گئے ہیں۔ لہٰذا ایسے تصورات کے مطابق حکمت عملی وضع کرنے والے اپنی فضول کوششوں میں شرمندگی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ تمام مسلم لیگی حکومتیں حقائق سے مسلسل چشم پوشی کرتے ہوئے پاکستان کو ایک قوم پر مشتمل ریاست قرار دیتی رہی ہیں لیکن حقائق خواہشات سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ 1954 میں سابقہ مشرقی پاکستان کے عام رائے دہندگان نے پاکستان کے حکمران طبقات پر واضح کر دیا تھا کہ زبانوں کے حقوق ''ایک قوم ایک زبان'' کے بے ہودہ نعرے سے کہیں

زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ آخرکار 1973 میں حکمران طبقات کو صوبائی سطح پر ہر صوبے میں اردو کے ساتھ صوبائی زبان کے حق کو سرکاری سطح پر تسلیم کرنا پڑا۔ پاکستان میں صوبے عام طور پر قوموں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ صوبہ سندھ میں سندھی زبان اپنا یہ حق حاصل کر چکی ہے اور یقیناً باقی زبانیں بھی اپنا اپنا قومی تشخص حاصل کر لیں گی۔

مختلف قوموں کی حکمران اشرافیہ کے درمیان حصولِ اقتدار کی کش مکش پاکستان میں کسی بھی آئین کی تیاری میں سب سے بڑی رکاوٹ بن چکی ہے۔ پاکستان کے ابتدائی برسوں میں ہی لیاقت علی خان پنجاب اور مشرقی بنگال کی حکمران اشرافیہ کے مابین حصولِ اقتدار کے تنازعے میں مصالحت کرانے میں ناکام ہو گئے تھے لہٰذا انہوں نے آئین کی تیاری کے کام کو پس پشت ڈال کر 1949 کی قراردادِ مقاصد میں پناہ ڈھونڈ لی۔

جسٹس منیر نے 1953 کے قادیانی دشمن فسادات کی سرکاری تحقیقاتی رپورٹ میں قادیانی دشمن فسادات کو پنجاب اور مشرقی بنگال کی حکمران اشرافیہ کے مابین حصول اقتدار کا جھگڑا قرار دیا تھا۔ جسٹس منیر نے دوسرے الفاظ میں قادیانی مخالف تحریک کو ایک ایسا بچہ قرار دیا جسے امراء نے جنم دے کر دولتانہ کو گود دے دیا جس نے اس کے چہرے کے خونی نقش دیکھتے ہوئے اسے حضرت موسیٰؑ کی طرح دریائے سندھ کے راستے ناظم الدین کے پاس کراچی روانہ کر دیا۔ جب 1954 میں مشرقی بنگال میں جگتو محاذ کی کامیابی نے ہوا کا رُخ بدل دیا تو پنجاب اور مشرقی بنگال کے حکمران اشرافیہ کے درمیان حصول اقتدار کا تنازعہ مساوی لوٹ کھسوٹ کے اصول پر طے پا گیا۔ جس کے نتیجے میں مغربی پاکستان کو ون یونٹ قرار دے دیا گیا لیکن حکمران طبقات کی توقعات کے برعکس ون یونٹ سے مسائل سلجھنے کے بجائے اور الجھتے چلے گئے۔ مشرقی بنگال کی قومی اُمنگوں کے کچلے جانے کے سبب 1971 میں مشرقی پاکستان، پاکستان سے علیحدگی پر مجبور ہو گیا اور یوں پاکستان کی نام نہاد ایک قوم کا چھپن فیصد حصہ ایک الگ قوم اور قومی تشخص کے ساتھ وجود پذیر ہو گیا۔ 1970 میں جب یحییٰ خان عوامی دباؤ کے ہاتھوں ون یونٹ توڑنے پر مجبور ہو چکا تھا اس وقت بھی حکمران طبقات ''ایک قوم'' کے خیالی ھیولے کو قائم رکھنے کی فکر میں لگے

ہوئے تھے۔

پاکستان میں یکے بعد دیگر آئین بننے اور ٹوٹنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہر آئین میں ملک کی کثیر القومی خصوصیات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا جاتا رہا ہے۔ ملک کے حکمران طبقات اس حقیقت سے مسلسل انکاری ہیں کہ ملکی یک جہتی قوموں کے حقوق تسلیم کر لینے سے خطرے میں نہیں پڑ سکتی البتہ قومی حقوق سے مسلسل روگردانی ملکی بقاء کے لئے مسلسل خطرہ ضرور بنی ہوئی ہے۔

ہندوستان سے تعلقات: کمیونسٹوں اور ترقی پسندوں نے 1965 کی پاک بھارت جنگ کی مخالفت اس بنا پر کی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ جنگ دونوں ملکوں کے مفادات کیخلاف ہے۔ انہوں نے معاہدہ تاشقند کا خیر مقدم کیا اور زور دیتے رہے کہ اسی معاہدے کے دائرہ کار میں رہ کر دونوں ممالک باہمی دوستی کے فروغ کے لئے مشترکہ مساعی کریں۔ سوویت یونین نے دونوں حریف ممالک میں کسی ذاتی لالچ کے بغیر جس طریقے سے مصالحت کرائی تھی اس سے بین الاقوامی حکمت عملی میں ایک نئے اور روشن باب کا اضافہ ہوا تھا۔ اگرچہ پاکستان کے رجعت پسند حلقوں نے کمیونسٹوں اور ترقی پسندوں کو پاکستان دشمن اور غیر ملکی ایجنٹ قرار دے کر ایسی تمام کوششوں کی مخالفت کی تھی لیکن جب پاکستان نے 71 - 1970' میں رونما ہونے والے واقعات کے نتیجے میں شملہ سمجھوتے پر دستخط کئے تو اس وقت تاریخ نے معاہدہ تاشقند کی سچائی کو ثابت کر دیا۔

پاکستان کے حکمران طبقات نے صرف پچیس سال بعد ہی اپنے فائدے کی خاطر ملک کے حصے بخرے کر دیئے جس کے نتیجے میں تاریخ نے انہیں ہندوستان کے ساتھ اچھے ہمسائیگی کے تعلقات استوار کرنے کا سبق دیا۔ لیکن حکمران طبقات نے تاریخ کا یہ سبق کس حد تک یاد رکھا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ضیاء حکومت ایک بار پھر امریکی اسلحے کی پشت پناہی کے سہارے علاقے میں کشیدگی کو ہوا دے رہی ہے۔

افغانستان سے تعلقات: پاکستان اور افغانستان کے درمیان کبھی گہرے مراسم نہیں رہے ہیں لیکن پھر بھی اتنا ضرور ہے کہ کسی بھی افغان حکومت نے پاکستان کو مشکل وقت میں دیکھ کر ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ پاکستان کی ہندوستان کے ساتھ دو معرکہ آرائیاں ہمارے

سامنے ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان 1971 میں مشرقی بنگال کی خانہ جنگی سے بھی دوچار ہو چکا ہے لیکن ان تمام معاملات میں افغانستان نے کبھی مداخلت نہیں کی ہے کیونکہ ہر افغان حکومت کے امریکہ کی نسبت سوویت یونین سے روایتی گہرے دوستانہ تعلقات رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ 1973 میں سوویت یونین نے ہی افغان فوج کو پاکستان کے شمال مغربی علاقے میں داخل ہونے سے روک رکھا تھا۔ افغانستان کی داؤد حکومت نے پاکستان کے ساتھ پختون مسئلے کو مستقل تنازعہ بنائے رکھا جب کہ اسی دور حکومت میں پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان اور کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان نے ایک مشترکہ اعلان نامے کے ذریعے دونوں ممالک کی حکومتوں پر زور دیا تھا کہ وہ اپنے تعلقات اچھی ہمسائیگی، ملکی سالمیت کا احترام اور ایک دوسرے کے داخلی معاملات میں عدم مداخلت کے اصولوں پر استوار کریں۔

اپریل 1978 میں انقلاب ثور کے بعد ترہ کئی حکومت نے اپنی پوری توجہ داخلی استحکام اور سماجی اصلاحات کے کاموں پر مرکوز کر رکھی تھی لیکن بعد ازاں امین حکومت نے برسرِ اقتدار آتے ہی انقلاب کے معاملات کو تباہ کرنے کے لئے تنگ نظر قوم پرستی کے زیرِ اثر ''عظیم افغانستان'' کے خواب دیکھنا شروع کر دیئے۔ امین حکومت کے اس خواب نے جارحیت کے شعلے بھڑکا کر انقلابِ ثور کے ثمرات کو تباہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ کارمل حکومت وہ پہلی افغان حکومت ہے جس نے واضح اور مثبت موقف اختیار کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ ہم کسی بھی پڑوسی ملک کی علاقائی سالمیت کیخلاف نہیں ہیں۔ کارمل حکومت واضح طور پر کہہ چکی ہے کہ پاکستان کی پختون اور بلوچ قوموں کو اپنے داخلی مسائل اپنے ملک کے پسے ہوئے عوام اور محنت کش طبقات کی مشترکہ جدوجہد سے جوڑ کر حل کرنے چاہئیں۔ موجودہ مارشل لاء حکومت نے اس عدم مداخلت پر مبنی موقف کی بھرپور تائید و خیر مقدم کرنے کی بجائے افغانستان کیخلاف بڑھا ہوا مخاصمانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے۔

ضیاء حکومت کا مخاصمانہ رویّہ اس بات کا مظہر ہے کہ موجودہ حکومت ملک کی علاقائی سالمیت کے تحفظ کی بجائے سامراج کے دفاع کو اولیت دے رہی ہے لیکن کب تک۔ پاکستان کے اَن گنت کمیونسٹوں، وطن پرستوں اور ترقی پسندوں نے جو پالیسیاں پیش کیں اور جن پر انہیں

تشدد اور تہمت کا سامنا کرنا پڑا حکمران طبقات کو تاریخ کے دباؤ سے مجبور ہو کر ان ہی پالیسیوں کو بعد میں اپنانا پڑا۔ حکمران طبقات بے بس ہو چکے ہیں اور تاریخ کا سفر جاری ہے۔

امریکی سامراج کے دُشمن: کمیونسٹوں کا امریکی سامراج مخالف کردار ایک کھلی حقیقت ہے اسی لئے کمیونسٹ اور ان کے ساتھی اس مقدمہ میں ملوث ہیں جو اس فوجی عدالت کے سامنے پیش ہے۔ یہ عدالت جو عدالت کم اور فوجی زیادہ ہے لیکن سامراج جسے ریت کے پاؤں رکھنے والا قرار دیا ہے اب گردِ راہ بنتا جارہا ہے۔ عالمی سامراج کا احمق سرغنہ صدر ریگن تاریخ کے پہیے کو اُلٹا چلانے میں ناکام ہو چکا ہے اور اب اس اصول پر عمل پیرا ہے کہ امریکہ پاکستان سے محدود تعلقات کا خواہاں ہے۔

ہزیمت خوردہ امریکی سامراج پاکستان کو اس علاقے میں ابھرتے ہوئے نئے تاریخی تقاضوں کے خلاف خصوصی کردار ادا کرنے پر اکسائے ہوئے ہے۔ اس کا ناگزیر نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ اس صورتِ حال نے حکمران طبقات کی بے بسی میں مزید اضافہ کر کے انہیں مکمل طور پر سامراج کا محتاج بنا دیا ہے جبکہ ملکی معیشت تباہی کے کنارے پر پہنچ چکی ہے۔ ملک کو سامراجی چنگل سے آزاد کرائے بغیر سیاسی و معاشی زبوں حالی کا خاتمہ ناممکن ہو کر رہ گیا ہے۔ تاریخ سامراجی تسلط کے خلاف جدوجہد کو آخری راستہ قرار دے چکی ہے۔ آج عوام کا شعور اس دور سے بہت آگے نکل گیا ہے جب 1954 میں ملک کو سامراج کے خونی پنجوں میں دے دیا گیا تھا۔

حکومت کے 1978 کے فیصلے کے مطابق لالوکھیت کے ایک گرلز ہائی اسکول کو دوبارہ نجی ملکیت میں دے دیا گیا تھا لیکن طالبات، اساتذہ اور مقامی آبادی کی شدید مزاحمت کی وجہ سے آج تک اس سرکاری فیصلے پر عمل درآمد نہیں کرایا جاسکا۔

اس صورتِ حال سے اس حقیقت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ موجودہ حکومت عام انتخابات کے انعقاد سے صرف اس لئے خوفزدہ ہے کہ سامراج نواز پالیسیاں رد کر دی جائیں گی۔ ضیاء ٹولہ محسوس کر چکا ہے کہ عوام میں سامراجی خطرے کے پیشِ نظر ایک ایسا اتحاد پیدا ہو چکا ہے

جس کی مثال پاکستان کی سالمیت میں اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی ۔1954 میں سامراجی معاہدات کے نتیجے میں سب سے پہلے آل پاکستان اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (APSO) پر حملہ کیا گیا تھا اور اب سامراجی خطرے کے پیش نظر ملک کی چار صوبائی طلبہ تنظیموں کے انضمام کے نتیجے میں ملکی سطح پر ایک منظّم اور فعال تنظیم (ڈی۔ایس۔ایف) کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ یقیناً سامراج ایک بار پھر خطرے سے دوچار ہے۔اس بات کی ٹھوس علامات موجود ہیں کہ عوام کا بڑھتا ہوا سامراج دشمن رویہ کسی بھی موقع پر خود رَو احتجاجی مظاہروں کی شکل اختیار کرسکتا ہے اور اسکا ایک یقینی اشاریہ اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے، پشاور میں امریکی انفارمیشن سینٹر‘ لاہور‘ حیدر آباد‘ کوئٹہ اور کراچی میں امریکی قونصل خانوں پر مظاہرے تھے۔ سامراج مخالف انقلابی اُبھار کا اندازہ صرف اس واقعہ سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام آباد میں 27 ردسمبر 1981 کو جن افغان بھگوڑوں نے افغان انقلاب کے خلاف جلوس نکالا تھا وہ امریکی سفارت خانے کے سامنے مظاہرہ کرتے رہے۔

III پسماندہ معاشرہ اور ترقی یافتہ ریاست

بنگلہ دیش کی آزادی کے نتیجے میں جب پاکستان میں سامراجی گرفت کسی حدتک کمزور ہوئی تو بھٹو حکومت بڑی جاگیرداری اور بائیس خاندانوں پر مشتمل بڑی سرمایہ داری پر کسی قدر ضرب لگانے کے قابل ہوسکی۔اسی وجہ سے بھٹو دورِ حکومت میں پاکستان سامراجی حکمت عملی کا آلہ کار بننے کی بجائے ایک غیر جانبدار اور آزاد خارجہ پالیسی کی راہ پر گامزن ہوسکا اور اِن اقدامات کے بدولت ملک کسی بھی ناروا صورتِ حال سے دوچار ہونے سے بچا رہا۔امریکی سامراج کی وزیر اعظم بھٹو سے ناراضگی کی ایک بڑی وجہ ہی حکومت کی آزاد اور غیر جانبدار خارجہ پالیسی پر عمل پیرائی تھی۔1971 کی عبرتناک شکست سے سنبھلنے کے بعد پاکستان کے سامراجی اور اس کے کاسہ لیس ایک بار پھر امریکی مفادات کی نگہبانی کے فرائض ادا کرنے میں مصروف ہیں۔

بھٹو دورِ حکومت میں جنرل ضیاء الحق کی بحیثیت چیف آف آرمی اسٹاف تقرری بذاتِ خود سامراج کی فتح کا پیش خیمہ تھی۔ جنرل ضیاء الحق کا ماضی اردن میں فلسطینیوں کے خون سے

رنگا ہوا ہے اور ایسی ہی وفاداریوں کے عوض سامراج نے اسے پاکستان پر مسلط کر رکھا ہے۔
جنرل ضیاء کو اقتدار میں لانے کے لئے پی این اے کی نام نہاد تحریک کے ذریعے موجودہ فوجی جنتا اقتدار پر قابض ہوگئی۔ جنرل ضیاء نے اقتدار پر قبضہ جمانے کے فوراً بعد ملک کی ناوابستہ حکمت عملی کے کمزور عمل کو سامراجی اشارے پر مغرب کی سمت موڑ دیا۔ وزیر اعظم بھٹو کو پھانسی کے ذریعے قتل کر دیا اور آج پاکستان سامراجی جنگی حکمت عملی کے مبینہ اتحاد میں مکمل طور پر شامل ہو چکا ہے۔
سامراج اپنی فطری کمزوری سے پوری طرح آگاہ ہے لہٰذا وہ ہمیشہ اپنے دلالوں کے ذریعے دشمنوں پر حملہ آور ہوتا ہے جیسا کہ اکثر سننے میں آتا ہے۔ امریکہ افغانستان میں روسیوں کے خلاف اس وقت تک جنگ لڑے گا جب تک کہ پاکستان کا ایک بھی سپاہی موجود ہے۔

سامراج علاقائی ممالک کو ابتداء ہی میں افغان انقلاب کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کر چکا ہے۔ ہندوستان کے ذریعے علاقائی ممالک کو افغان انقلاب کے خلاف استعمال کرنے کی اور روسی امداد کی فراہمی روکنے کی سازشیں ناکام ہوگئیں تو سامراج نے اسلامی کانفرنس منعقدہ لاہور کو بھی ایسی ہی سازشوں کے لئے استعمال کیا۔ جبکہ طائف کانفرنس (مکّہ) کے ذریعے پاکستان کے مثبت رویے کو ختم کرا دیا گیا جو افغانستان کی جانب سے مذاکرات کی دعوت سے پیدا ہو رہا تھا۔ ضیاء حکومت امریکی اشاروں پر احمقوں کی طرح ناچ رہی ہے۔ موجودہ حکومت سوویت یونین کی جانب سے تھرمل بجلی گھر کی صورت میں پیش کردہ اہم اور بنیادی اقتصادی امداد مسترد کر چکی ہے۔ جبکہ یہی حکومت پاکستان کو امریکی سامراج کی چوکیداری میں بدل کر ملکی سالمیت تک داؤ پر لگا چکی ہے۔

''پاکستان میں اگر کوئی سیاسی جماعت روس سے بہتر تعلقات کے قیام کی حمایت کرتی ہے تو اس سلسلے میں آپ کا رویّہ کیا ہوگا؟''۔

ایشیاء ویک میگزین کے ایڈیٹر کے مندرجہ بالا سوال کا جواب دیتے ہوئے جنرل ضیاء نے کہا۔ ''ہم ان کا گلا کاٹ دیں گے۔''

روزنامہ نوائے وقت 4-12-1982

میرے نزدیک یہ انتہائی گھٹیا ردعمل ہے۔کوئی بھی محبّ وطن پاکستانی مخصوص علاقائی سیاسی حقیقتوں کی موجودگی میں ایسا غیر ذمہ دارانہ موقف اختیار نہیں کرسکتا۔

معاشی میدان: ضیاءحکومت معاشی میدان میں تمام اقتصادی ناہمواریوں کے خاتمے کا دعویٰ کرچکی ہے اوراس کے ساتھ ہی غریبوں کی فلاح و بہبود کے لئے لمبے چوڑے اعلانات بھی کیئے جاچکے ہیں تاہم اقتصادی ناہمواریوں کا خاتمہ دُور دُور تک نہیں نظر آتا۔البتہ سینتیس بڑی صنعتوں کو نجی تحویل میں لوٹا کر کروڑوں روپے کے سرمائے سے ہاتھ اٹھالیا گیا ہے جس کے نتیجے میں معیشت کے اونچے میناروں اور زمین پر دستیاب وسائل کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج دن بدن بڑھ رہی ہے۔بھٹوحکومت کے ساڑھے پانچ سالہ دور میں چھ بلین روپے کے نئے کاغذی نوٹوں کے اجراء سے جوافراطِ زر پیدا ہوگیا تھا اسے ضیاءحکومت نے اسی مدت میں ساڑھے بائیس بلین روپے کے مزید کاغذی نوٹ چھاپ کر آسمان تک پہنچا دیا ہے لہٰذا اشیاء کی قیمتوں کے پر پھیلتے چلے جارہے ہیں۔

جون 1978ع میں وزارت برائے قدرتی وسائل سے ڈاکٹر صادق کوصرف اس لئے ہٹا دیا گیا تھا کہ انہوں نے ڈھوڈک آئل فیلڈ کو بدستور قومی تحویل میں رکھنے پر اصرار کیا تھا لہٰذا انکی معطّلی کے بعد ڈھوڈک آئل فیلڈ عابدی۔عرب گروپ کے حوالے کردی گئی۔ضیاءحکومت کی اس ناپاک سودے بازی میں شمولیت کا راز جلد یا بدیر افشا ہوکر رہے گا۔اب بدین آئل فیلڈ کے سلسلے میں بھی ایسی ہی مشکوک سرگرمیاں دیکھنے میں آرہی ہیں۔موجودہ حکومت سے بعید نہیں ہے کہ وہ پاکستان اسٹیل ملز تک بین الاقوامی سودخوروں کے حوالے کردے کیونکہ قرضوں کے حصول کی خاطر ضیاءحکومت ایم آئی ایف کی تمام شرائط قبول کرکے پاکستان کی سالمیت کو داؤ پر لگا چکی ہے۔

اسلامی اقتصادی کمیٹی: موجودہ حکومت خود اپنی قائم کردہ اسلامی اقتصادی اصلاحات کمیٹی کی ان تمام سفارشات کو مسترد کرچکی ہے جن میں ایسے اصول وضع کیئے گئے ہیں جن کے ذریعے سماجی ناانصافی اور معاشی ناہمواری کے خاتمے میں مدد مل سکتی تھی۔اگرچہ حکومت نے خیالات ونظریات

پر اپنی اجارہ داری کو انتہائی حد تک مسلط کر رکھا ہے لیکن پھر بھی ایسی سفارشات کا سامنے آنا بہت کچھ بتا تا ہے۔ موجودہ حکومت نے ملکی معیشت کی نہ صرف اہم ترین صنعتوں کو نجی ملکیت میں دے دیا ہے بلکہ نجی سامراجی سرمائے کے کھل کھیلنے کے لئے تمام راہیں کھول دی گئی ہیں جبکہ جاگیرداروں پر عائد کئے جانے والے مجوزہ ٹیکس کے نفاذ کو ٹال دیا گیا ہے۔

حالیہ اسلامی رپورٹ کے مطابق بنکوں میں شراکتی منافع اسکیم نے امیری اور غریبی کی سنگین صورتحال کو خطرناک حد تک بے نقاب کر دیا ہے لیکن حکومت نے اس اسکیم کو نافذ کر دیا ہے۔

ڈاکٹر خالد سعید اپنی کتاب پالیٹکس اِن پاکستان کے صفحہ نمبر 181 میں تحریر کرتے ہیں۔ ''اگر پاکستان کے مختلف قوانین کو ان کے اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے اور ان کا آپس میں موازنہ کیا جائے تو معاملہ کچھ یوں نظر آتا ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کے قوانین، وہ قوانین جن کے تحت کسی صنعت کار کو اس کی صنعت قومیائے جانے کی صورت میں زر تلافی ادا کرنے کی ضمانت دی گئی ہے یا اگر چوری سے متعلق تعزیری قوانین کو پرکھا جائے تو ان کے بنیادی اصولوں سے یہ نتیجہ آسانی سے نکالا جاسکتا ہے کہ ان تمام قوانین کے پسِ پردہ بنیادی مقصد اسلام کے نام پر رجعت پسند خیالات کو فروغ دینا اور اس کے ساتھ موجودہ حکومت کی رجعت پسند پالیسیوں کی پردہ پوشی کرتا ہے۔''

ملک میں بے روزگاروں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ عوام روزگار، رہائش، محنت، تعلیم اور بڑھاپے میں سماجی تحفظ جیسے بنیادی حقوق سے محروم ہیں۔ سچ تو ہے کہ پاکستان میں کبھی بھی انسانی حقوق بحال نہیں کئے گئے اور نہ موجودہ حکومت کوئی ایسا ارادہ رکھتی ہے۔ اختلاف رائے رکھنے والوں کو کچل دینے کا جذبہ ایک ایسے ضمیر کا آئینہ دار ہے جو کبھی اپنے سامنے اور خدا کے سامنے سرخرو نہیں ہوسکتا۔

ظالمانہ نظامِ عدل: ضیاء حکومت دعویٰ کرتی ہے کہ اس نے انصاف کو سستا، موثر اور آسان بنایا ہے یقیناً سزاؤں کو انصاف جیسے خوبصورت نام میں بدل دیا گیا ہے اور اس میں شک نہیں ہے کہ فوجی عدالتیں سزائیں سنانے میں بہت تیزی سے کام لیتی ہیں۔ سزاؤں کا یہ سلسلہ سستا بھی بنا

دیا گیا ہے۔ کیونکہ فوجی عدالتوں میں وکیلوں کی موجودگی غیر ضروری قرار دے دی گئی ہے۔ انصاف کو موثر بنانے کے سلسلے میں تقریباً ایک سال سے ضیاء کابینہ ایک حکمت عملی اختیار کر چکی ہے جس کے مطابق رہا کئے جانے والے افراد کو دوبارہ گرفتار کر لیا جاتا ہے یا پھر ان کی رہائی سے قبل ہی ان پر دوسرے مقدمات چلا کر ان کی رہائی کا امکان ختم کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہزاروں افراد کو محض شبہ کے نتیجے میں گرفتار کر کے مسئلے کو مکمل طور پر حل کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک کو اُس آزاد دنیا کا ایک حصہ تصور کیا جاتا ہے جہاں شخصی آزادی کا تقدس بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے لیکن یہی شخصی آزادی یہاں ہر روز ریاست کے نام نہاد حق کے پردے میں کچل دی جاتی ہے۔ یہ شخصی حقوق جنہیں جسٹس کیانی نے فطری اور ناقابل شکست قرار دیا تھا آج غیر فطری طور پر چھین لئے گئے ہیں۔ ہم سوشلسٹ سماج کی طرف ایک انچ بھی نہیں بڑھ پائے بلکہ پاکستان امریکہ کی ایک جدید نوآبادی بن کر رہ گیا ہے اور اس کے نتیجے میں برطانوی سامراج کی ورثے میں چھوڑی ہوئی پولیس ریاست اب فوجی ریاست میں بدل چکی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب ایک عام آدمی کا معیار زندگی منجمد ہو کر رہ جائے تو یہ جمود پورے سماج کی ترقی پر اثر انداز ہو کر اسے بھی روک دیتا ہے لیکن اس پوری صورتحال میں ریاست یکطرفہ طور پر ترقی کرتی رہتی ہے۔

پولیس کی انتظامیہ میں تبدیلی

انتظامیہ نے فرد کے تمام شخصی حقوق چھین رکھے ہیں۔ استغاثہ قانونی اختیارات میں اس حد تک خود کفیل ہو چکا ہے کہ اب وہ قانون کے فوری اطلاق کے مختصر ترین راستے تلاش کرنے لگا ہے۔ میرے گھر والوں کو میری گرفتاری کا سات ماہ تک علم نہیں ہو سکا۔ جنرل ضیاء نے حال ہی میں ایسے کیسٹس کو بھی قانونی شہادت کا درجہ دے دیا ہے جو عام طور پر تشدد کے ذریعے ریکارڈ کئے جاتے ہیں۔ خوف زدہ خصوصی عدالتیں انتہائی سزا کی نسبت کم سزا سنانے کی صورت میں جواب دہی کے مرحلے سے گزرتی ہوں گی۔ استغاثہ نے اپنے بڑھتے ہوئے اختیارات کی بدولت جرائم کی تفتیش کے سلسلے میں ماہرین کو ہٹا کر ان کی جگہ سنگدل اور سُست افسر شاہی کو بٹھا دیا ہے جو تشدد

کے ذریعے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں چاہتے اور جنہیں سچ یا جھوٹ سے کوئی غرض نہیں ہے۔

خصوصاً ہمارے ملک کی پولیس کبھی بھی قانون پسند شہریوں کی مددگار یا دوست ثابت نہیں ہوئی ہے۔ اس کے برعکس پولیس کی خودمختار طاقت ہمیشہ عوام کو دہشت زدہ کرنے کے لئے استعمال کی گئی ہے اور یہ ہمیشہ عوام کی سخت دشمن ثابت ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں پولیس کو منتخب مقامی اداروں کو جواب دہ ہونا چاہئے اور یہی اس کے نام سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

پولیس شہر میں امن وامان بحال رکھنے والا مقامی ادارہ ہے۔ پولیس کا عملہ جس جگہ خدمات انجام دیتا ہے اسے اُسی آبادی سے بھرتی کیا جانا چاہئے۔ برطانوی دور کے برعکس پولیس اب صوبائی حکومتوں کے مکمل اختیار میں نہیں رہی ہے بلکہ مرکزی حکومت ہی اسے استعمال کرتی ہے اسی لئے پولیس کا مخصوص مقامی کردار ختم ہو چکا ہے۔

عدلیہ کی علیحدگی: تاریخ کے تمام بڑے قانون دان چاہے وہ حمورابی ہوں یا حضرت موسیٰ، حضرت محمد ﷺ ہوں یا سولومن، جٹینین ہوں یا مانیٹگو، نپولین ہوں یا آسٹن سب اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ عدلیہ کو انتظامیہ سے آزاد رکھنا چاہئے۔ موجودہ حکومت عدلیہ کی بحالی پر برابر زور دے رہی ہے لیکن اس بحالی کے پس پردہ بنیادی مقصد عدلیہ کی آزادی کو ختم کرنا ہے۔

پاکستان میں حکومت کی جانب سے عدلیہ کا پہلی بار غیر آئینی استعمال ایک مستند قانونی استحقاق حاصل کرنے کے لیے کیا گیا جس کے بعد عدلیہ کے حقوق سختی سے کچل کر اس کی آزادی اور اختیارات ختم کر دیئے گئے، جس کی وجہ سے پاکستان میں آج بھی مارشل لاء قانون سے بالاتر ہونے کے دعویٰ کے ساتھ موجود ہے۔

مجھے سولہ ماہ تک کسی الزام کے بغیر حراست میں رکھا گیا اور آج مجھے اس غیر قانونی عدالت میں جن الزامات کے تحت پیش کیا گیا ہے ان کے دفاعی کاغذات کی تیاری کے لئے صرف ایک ہفتے کی مہلت دی گئی تھی۔ یقیناً جنرل ضیاء کے نزدیک یہ کوئی بُری کارکردگی نہیں ہوگی کیونکہ انصاف اور اس کے طریقہ کار کے متعلق جنرل موصوف روزنامہ پاکستان ٹائمز مورخہ 28 مارچ

1978 میں یہ الفاظ کہہ چکے ہیں۔

''مزید چند ایک پھانسیاں ملک میں امن و امان کی صورتحال بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوں گی''۔

پاکستان میں قانون کی یہ حالت ہے کہ خفیہ فوجی پولیس (آئی ایس آئی) صرف ہوم سیکرٹری سندھ سے حکم نامہ لے کر کسی بھی مدعاعلیہ کو ان تمام مراعات سے محروم کرسکتی ہے جو اُسے کسی خصوصی فوجی عدالت سے ملی ہوں جبکہ دوسری جانب سپریم کورٹ آف پاکستان کا عدالتی دائرہ کار اس حد تک گھٹایا جاچکا ہے کہ اسے خصوصی فوجی عدالت کے کسی فیصلے کے خلاف سماعت کا حق بھی حاصل نہیں ہے۔

ہمیں ملٹری انٹیلی جنس نے گرفتار کیا اور طویل عرصے تک زیرِ تفتیش رکھنے کے بعد تفتیش پولیس کے حوالے کیا گیا۔ میرے اس بیان کی تصدیق پولیس افسر صفدر حسین بھٹی کے اس بیان سے کی جاسکتی ہے جو اس نے اس عدالت کے رُوبرو مورخہ 13 جون 1982 کو دیا تھا۔ صفدر حسین بھٹی کا تعلق پولیس کے تفتیش سیل نمبر 10 سے ہے۔

ملٹری انٹیلی جنس کی تفتیش کے اختتام پر جبکہ پولیس نے ابھی اپنی تحقیقات کا آغاز بھی نہیں کیا تھا, حکومت کی ایما پر ہماری گرفتاری کی خبریں دو اور تین ستمبر کو نہ صرف سرکاری اخبارات نے شہہ سرخیوں کے ساتھ شائع کی گئیں بلکہ ریڈیو اور ٹی وی نے بھی انہیں غیر معمولی طور پر نشر کیا گیا۔

خبروں میں ہمیں پاکستان اور نظریہ پاکستان کے خلاف غیر ملکی اشارے پر تخریبی سرگرمیوں کا مرتکب قرار دیا گیا۔ حالانکہ انتظامیہ نے ہمارے خلاف دائر کردہ مقدمے میں کسی بیرونی ہاتھ کا ذکر تک نہیں کیا، حتیٰ کہ میری تحویل سے یا کسی دوسرے مدعاعلیہ کی تحویل سے قابلِ اعتراض مواد کا ایک پرزہ تک برآمد نہیں کیا جاسکتا۔

ہماری گرفتاری سے متعلق مختلف بیانات پر مشتمل تین ابتدائی پولیس رپورٹیں تیار کی گئی تھیں۔ تاہم اُن تین فرضی رپورٹوں میں سے ایک بھی اس عدالت کے سامنے پیش نہیں کی گئی۔

ہماری گرفتاری کے بارے میں جن فرضی داستانوں کو اُچھالا گیا تھا اُن کی اصلیت کی پردہ پوشی کے لئے اخبارات پر عائد شدہ سنسر شپ کا سہارا لیا گیا۔

میں اُن چند صحافیوں کو خراجِ تحسین پیش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنھوں نے اس مقدمے سے متعلق کسی حد تک کم خبریں شائع کرنے کی جرات کا مظاہرہ کیا۔ مجھے یقین ہے کہ وقت ایک دن اس مجہول ڈرامے کے حقیقی بدمعاشوں کو چادر اور چار دیواری کے اُس مورچے سے باہر کھینچ لائے گا جسے مارشل لاء کی چھتری سے تیار کیا گیا ہے اور یقیناً وہ دن اِن کے محاسبے کا دن ہوگا۔

ضیاء حکومت اسلامی نظام کے دعوؤں کے باوجود یونیسکو کے انسانی حقوق سے متعلق اس اعلان نامے کو عملی طور پر نافذ کرنے سے معذور ہے جس میں اسلام کے عین مطابق غیر قانونی اور ظالم حکومت کی اطاعت سے انکار کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے اور جس میں ہر قسم کے تشدد کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔

سابق چیف جسٹس ایس اے رحمان نے اسلام کے نام پر قوانین جیسا کہ سنگسار کرنا کو زندگی کے تقاضوں کے خلاف قرار دیتے ہوئے اپنے تبصرے میں کہا تھا۔

''اگر آپ اسلامی جمہوریہ کے شوق میں موجودہ قوانین کو چھٹی صدی کے قوانین میں بدل کر تسکین حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو جان لینا چاہئے کہ آپ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے اور اب زندہ رہنا ایک بین الاقوامی کوشش ہے۔''

جسٹس حمید اللہ بیگ نے کہا تھا کہ خصوصاً تعزیزی قوانین کو عالمی قوانین سے مشروط ہونا چاہئے۔

سلطان فیروز بن تغلق 51-1325 نے عدلیہ کو انتظامیہ سے نہ صرف آزاد رکھا بلکہ اس نے اس سلسلے میں دباؤ اور تشدد کو غیر انسانی طریقہ قرار دیکر اکھاڑ پھینکا۔

سینٹ آگیسٹن کہتا ہے۔

''انصاف کو علیحدہ کر دو تو بادشاہتیں محض بڑے پیمانہ کی ڈاکہ زنی ہیں''۔

سرمائے کا تحفظ مارشل لاء کا مقصد

جنرل ضیاء مارشل لاء کی قصیدہ خوانی سے کبھی نہیں تھک سکتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مارشل لاء طاقت اور اندھی قوت کی حکمرانی کا نام ہے اور اس کی طاقت کا سرچشمہ اس کے ہتھیار ہیں۔ مارشل لاء کے ہتھیار لوگوں کو محکوم بنا سکتے ہیں لیکن عوام کے دلوں پر حکومت روحانی ہتھیاروں کی مدد سے کی جاسکتی ہے۔فوجی جنرل روحانی بالیدگی سے اتنے ہی عاری ہیں جتنا کہ صوفیا عسکری چالوں سے بے خبر ہوتے ہیں۔

جنرل ضیاء اپنے اقتدار کو طول دینے کی خاطر نت نئے عذر تراشنے میں مصروف ہے۔ ایک ایسے شخص کے لئے جو مذہب کے پردے میں رہ کر لوگوں کو دھوکہ دینا چاہتا ہے یہ بات زیادہ دیانتدارانہ ہوگی کہ وہ اس وقت تک سامراجی آقاؤں اور حکمران طبقات کی وفاداری کا کھل کر اعلان کرتا رہے جب تک کہ عوام اسے خود راستے سے نہ ہٹا دیں۔

جنرل ضیاء نے کراچی میں تاجروں کو یقین دہانی کراتے ہوئے کہا تھا۔''جب تک آپ کا سرمایہ خطرہ میں ہے تب تک ملک میں مارشل لاء برقرار رکھا جائے گا''۔

محکمہ دفاع مراعات یافتہ شعبہ نہیں ہے

میں اس وقت فوجی حکومتوں کے داغدار ماضی کی تفصیلات میں جا کر زخموں کو مزید ہرا کرنا نہیں چاہتا لیکن اس امر کی نشان دہی ضروری سمجھتا ہوں کہ محکمہ دفاع کسی بھی معاشرے میں دیگر تمام محکموں کی طرح سماجی خدمات انجام دینے والا ایک ادارہ ہے جسکی اہمیت حکومت کے کسی بھی دوسرے شعبے کے مقابلے میں نہ تو کم ہوسکتی ہے اور نہ زیادہ ہوسکتی ہے۔محکمہ دفاع کسی قسم کی برتری کا حق نہیں رکھتا کیونکہ سماج کی نظر میں ہر ادارہ اپنے مخصوص دائرہ کار کے اندر رہ کر ہی کوئی مقام حاصل کرسکتا ہے۔

تاہم اگر پاکستان کے عوام اپنے ہی ملازمین کی سرپرستی میں رہنے پر مجبور ہیں تو پھر

ہر باراس ذمہ داری کا بوجھ ملازمین کے ایک مخصوص گروہ کے کندھوں پر ہی کیوں آپڑتا ہے۔ میرے خیال میں محکمہ تعلیم، پولیس، افسرشاہی، صحت، ٹیکس، ریلوے یا کوئی بھی دوسرا محکمہ یہی کام زیادہ بڑے تنازعہ کے بغیر سرانجام دے سکتا ہے ممکن ہے محکمہ اوقاف یہی کام زیادہ خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتا ہو۔

اگرعوامی حاکمیت کی قائم مقامی کے انتخاب کا معیار مذہبی بنیادوں پر ممکن ہے تو اس سلسلے میں مشائخ کا گروہ اس منصب پر انتہائی سودمند ثابت ہوسکتا ہے اور اگر یہ معیار شجاعت و بہادری پر رکا ہوا ہے تو بھولو پہلوان اوران کے رفقاء پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے یقیناً وہ ریاست کے جہاز کو محفوظ پانیوں تک کھینچ لے جائیں گے۔مختصراً یہ کہ اگر ملک کے عوام ایسے بچے ہیں جنکی دیکھ بھال کے لئے ناگزیر طور پر ملازمین کے ایک گروہ کی ضرورت ہے تو اس دیکھ بھال کے کام کے لئے بھی حکومت کے تمام محکموں کے ملازمین کو باری باری موقع ملنا چاہیئے۔

سماجی سطح پر مذہبی اصلاحات

ضیاء حکومت ایسی لاتعداد سماجی اصلاحات کا دعویٰ کرتی ہے جن کے ذریعے لوگوں کو محض ایمانداری کا سبق پڑھایا جاچکا ہے جبکہ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اصلاحات ہمیشہ مثبت اور قابل تصدیق نتائج پر مبنی ہوتی ہیں۔ عام لوگوں کی دیانت داری کا معیار معاشرے میں راست بازی کی مجموعی صورتِ حال کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

میں چیلنج کرتا ہوں کہ حکومت اپنی نام نہاد سماجی اصلاحات کے موثر نتائج کے ثبوت اعدادوشمار کی صورت میں پیش کرے۔ چیف مارشل لاءایڈمنسٹریٹر کا یہ بیان ریکارڈ پر موجود ہے کہ رشوت اپنی آخری حد تک پہنچ چکی ہے۔

حکومت نے انتخابات کے لئے 17 نومبر 1978 کی تاریخ کا تعین اس خیال کے پیش نظر کیا تھا کہ ماہِ رمضان میں انتخابی سرگرمیاں عوامی جوش وجذبے کے اعتبار سے مدھم ہوں گی اور حکومت احترام رمضان کے نام پر اخلاقی دباؤ بھی بڑھانے کے قابل ہوسکے گی لیکن جب عام انتخابات ملتوی کردیئے گئے تو التواء سے متعلق کہیں کہیں سوالات بھی اٹھائے گئے۔تب سے کئی ماہ

رمضان گزر چکے ہیں لیکن ہم ابھی تک انتخابات سے بہت دُور کھڑے ہیں۔

ماہِ رمضان اور تقویٰ: میں چونکہ ماہِ رمضان میں گرفتار کیا گیا تھا اس لئے مجھے اس ماہِ مبارک کے حوالے سے تفتیشی افسران کو تقویٰ اور اصلاحِ نفس کی آخری منزل پر دیکھنے کا موقع ملا۔ ایک دن خود کو آلات تشدد کا نگران ظاہر کرنے والے ایک افسر نے مجھ سے انتہائی بدتمیزی سے کہا۔ ''میں یہاں تمہاری موجودگی میں تمہاری بیوی کی آبروریزی کر سکتا ہوں''۔

یقیناً وہ میری طرح گناہ گار نہیں تھا کیونکہ وہ روزے سے تھا اور جب اس نے یہ دھمکی دی تو وہ وقتِ عصر تھا۔ ایسا وقت جس کے بارے میں عام طور پر یقین ہے کہ روزہ اپنی روحانی تاثیر کی انتہا کو چھو چکا ہوتا ہے لہٰذا اس کی بات کا میں نے فوراً یقین کر لیا۔

خوفِ خُدا: مجھے بارہا یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ اگر میں نے حکومت سے تعاون نہ کیا تو خدا کا خوف مجھے مار ڈالے گا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کے پاس تشدد کے آلات کی کمی نہیں ہے لیکن پھر بھی معاملہ دھمکیوں اور جگائے رکھنے سے زیادہ آگے نہیں بڑھا اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ میرے نوجوان دوست نذیر عباسی نے انہیں خوفِ خدا میں مبتلا کر کے تشدد کے مزید استعمال سے روک دیا تھا لیکن نذیر عباسی نے اُنکے دلوں میں خوفِ خدا کسی طاقت کے سہارے پیدا نہیں کیا تھا بلکہ ان کے ہاتھوں میں دم توڑ کر انہیں خوفِ خدا میں مبتلا کر دیا تھا۔

موجودہ سماجی واقتصادی ڈھانچے کو قائم رکھنے کی کوششیں

ضیاء حکومت موجودہ حالات کو جوں کا توں قائم رکھنے کی کوششوں میں اس لکڑی کے گھوڑے کی مثال بن کر رہ گئی ہے جو ایک مقام پر رُکا ہوا کوئی قدم آگے بڑھائے بغیر حرکت کرتا رہتا ہے۔

پاکستان کا قیام عمل میں آئے پینتیس سال گزر چکے لیکن ملک کے حکمران طبقات آج بھی پاکستان کے وجود کو لاحق خطرات کی دُھائی دینے پر مجبور ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ آگے کی طرف دیکھنا نہیں چاہتے کیونکہ انہوں نے ملک کے مستقبل اور ترقی کے لئے کبھی کوئی کام ہی نہیں کیا ہے۔ ضیاء حکومت ملک میں سیاسی جماعتوں کے وجود کو مسلسل ہدفِ تنقید بنائے ہوئے ہے

جبکہ دوسری جانب ملک کی سب سے بڑی اور طاقتور جماعت پیپلز پارٹی کا وجود بھی اسے قبول نہیں ۔جس طرح عوامی لیگ کا وجود یحیٰ حکومت کو قبول نہیں تھا۔ سیاسی شعور کی کمی کے بارے میں متضاد دلائل کو بے شرمی سے دہرایا جاتا ہے تاکہ عوام کو اقتدار منتقل نہ کرنے کا بہانہ ملے۔

ایک موقع پر جنرل ضیاء نے جمہوریت سے اپنی بیزاری کا اعتراف ان الفاظ میں کیا تھا۔ ''جب مسلمان ایک خدا ایک رسول ﷺ اور ایک کتاب پر یقین رکھتے ہیں تو پھر انہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ایک ہی وقت میں دو سو حکمرانوں کی حاکمیت پر یقین رکھیں۔ آپ مسلمان ہیں لہٰذا آپ کا امیر بھی ایک ہی ہونا چاہیئے''۔(جنرل ضیاء میٹ دی پریس حکومت پاکستان صفحہ 54)

جنرل ایوب نے بنیادی جمہوریت کے نام پر جمہوریت کو دھوکہ دینے کی ناکام کوشش کی تھی جبکہ آج جنرل ضیاء اسلامی جمہوریت کے چوغے میں جمہوریت کو دھوکہ دینے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔

عوام کا اعتماد ہی کسی حکومت کا سرمایہ افتخار ہوتا ہے جو اسے اختیار اور اقتدار تک لے جاتا ہے جبکہ موجودہ فوجی حکومت اپنی برہنہ کارکردگی کے باعث ایک اندھے شخص کے سامنے بھی بے نقاب ہو چکی ہے اور کوئی بھی شخص موجودہ حکومت کی کسی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہے۔

زکوٰۃ قوانین کے ذریعے سولہویں صدی کے انگلستان کے ان قوانین کی یاد تازہ کر دی گئی ہے جو ملکہ ایلزبتھ کے عہد میں ''غریبوں کے قوانین'' کے نام سے نافذ کئے گئے تھے۔ زکوٰۃ قوانین اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ ملک میں غربت کو ختم کرنے کی بجائے وسیع پیمانے پر پھیلایا جا رہا ہے۔1979 میں افراطِ زر کی شرح تیس فیصد تھی جبکہ آج اس میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان میں افراطِ زر کی شرح صرف چار فیصد ہے بتیس فیصد مزدور بے روزگار ہیں جبکہ چونتیس فیصد کسان بے زمین ہیں۔ پاکستان دنیا کے چونتیس کم ترین آمدنی رکھنے والے ممالک کی فہرست میں چوبیسویں نمبر پر ہے اور اس کے برعکس دنیا بھر میں صرف دس ممالک ایسے ہیں جن کی فی کس قومی آمدنی پاکستان کے مقابلے میں کم ہے۔ البتہ ہمارا ملک اس اعتبار سے زیادہ ہی خود کفیل ہے کہ ہر شخص کے لئے گولیوں کی وافر مقدار حکومت کے پاس موجود

ہے۔ ملک میں بڑھتی ہوئی مہنگائی، وسیع تر بے روزگاری، کسانوں کی بے دخلیوں، قوموں کے بنیادی حقوق کی پامالی اور افغان انقلاب کے اثرات نے مجموعی طور پر عوام میں دھماکہ خیز بے چینی پیدا کر دی ہے۔

یقیناً موجودہ حکومت اس صورتِ حال کو اپنے لئے خطرناک محسوس کرتی ہے اور اسی لئے اب تک بیس ہزار سے زیادہ سیاسی کارکن گرفتار کئے جا چکے ہیں حالانکہ عوامی بے چینی نے ابھی تک مجموعی طور پر مورچہ بندی اختیار نہیں کی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جنرل ضیاء کے اقتصادی مشیر مسز تھیچر کی طرح پکے ریگن نواز واقع ہوئے ہیں اور وہ جلد ہی عوامی بے چینی کو فیصلہ کن لڑائی پر مجبور کر دیں گے۔

1982-83 کا بجٹ 1981-82 کے بجٹ کے مقابلے میں تعلیم کے شعبے میں آٹھ فیصد، کھیل اور ثقافت کے شعبے میں ستاون فیصد اور صحت کے شعبے میں چار فیصد کم کر دیا گیا ہے۔ جبکہ فلاح و بہبود اور دیہی ترقی اور ثقافت کے پانچوں شعبے کے لئے بجٹ کا کل چھ فیصد حصہ رکھا گیا ہے جبکہ اسی بجٹ میں ٹیکسوں کی مد میں عوام سے مزید چار اعشاریہ اڑسٹھ بلین روپیہ چھین لیا جائے گا۔ اور یہ اضافی رقم اٹھاون روپے فی کس کے اعتبار سے پڑے گی۔

فوج میں انگریزی زبان: ضیاء حکومت نے سرکاری طور پر اُردو زبان کو انگریزی زبان کی جگہ رائج کرنے کا اعادہ کر رکھا ہے۔ یہ امر واقعی قابل ستائش ہے لیکن ہمیں اس مقدمے کے دوران ایک میجر نے اطلاع دی کہ مقدمے کی سماعت اردو یا سندھی زبان میں نہیں ہوسکتی کیونکہ فوج میں انگریزی سرکاری زبان کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ جنرل ضیاء 1976 سے فوج کا سربراہ ہے اور اب بھی ہر سال خود کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے عہدے کے لئے مقرر کرتا رہتا ہے۔ اس پر غور کرنا چاہئے کہ آخر جنرل ضیاء فوج میں اُردو زبان کو مناسب کیوں نہیں سمجھتا جبکہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے وہ اُردو زبان کو سماجی زندگی کے تمام شعبوں میں رائج کرنے کی خواہش کا مسلسل اظہار کرتا رہا ہے۔ دراصل جو بات قوم کے لئے بہتر ہے وہ لامحالہ فوج کے لئے پسند نہیں کی جاسکتی کیونکہ قوم صرف اور صرف پاکستانی ہوسکتی ہے۔ جبکہ پاکستانی فوج کو

آزاد دُنیا کی وسیع دفاعی فوج کا حصہ بنا کر استعمال کیا جائے گا اور آزاد دنیا کے حصہ کے طور پر اس کی باگ ڈور انگریزی دان امریکی جنرلوں کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حکمران انگریزی زبان بولیں گے اور محکوم اپنی مقامی زبان کے استعمال کا حق رکھتے ہیں۔ مزارع اور ہاری کی انکساری اور فرماں برداری ہر دلعزیز خصوصیات ہوسکتی ہیں لیکن کسی وڈیرے یا فوجی جنرل کی پارسائی دراصل اس کی خود پسندی سے ابھرتی ہے۔

کرائے کے قاتلوں کے کردار

ہمارے ملک کو برطانوی نوآبادی سے امریکہ کی جدید نوآبادی میں بدل دیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم نے کڑھائی سے آگ میں چھلانگ لگادی ہے اور اب پاکستان امریکی سامراج کی ایک ذیلی ریاست بن کر رہ گیا ہے۔ پاکستانی فوج امریکی سامراج کا ذیلی ادارہ بن گئی ہے۔ ایوب نے امریکہ سے کہا تھا۔ ''ہم آپ کو افرادی قوت فراہم کریں گے آپ ہمیں جنگی ساز وسامان فراہم کریں''۔ (بحوالہ اسلامک ریویو جولائی اگست 1958 صفحہ بارہ)

جب ہماری حکومت کمپوچیا کے پول پاٹ کو حکومت سے لازوال محبت کا اظہار کرتی ہے تو ہمیں حیران نہیں ہونا چاہئے۔ کمپوچیا کی یہ حکومت نہ صرف تیس لاکھ لوگوں کو تہہ تیغ کر چکی ہے بلکہ ایک قومی لائبریری تک کو طویلے میں بدل ڈالا ہے۔ کمپوچیا کی حکومت سے پاکستانی حکمرانوں کی محبت ملک کے مستقبل کی راہوں کا خوب پتہ دیتی ہے۔ موجودہ حکومت کے دور میں عوام کے فلاح و بہبود کے کاموں کو مسلسل نظرانداز کیا جارہا ہے۔ عورتوں کو چادر اور چاردیواری کے نام پر دیوار کے پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔ فقط فوجی ساز وسامان کی خریداری پر بے انتہا دولت برباد کی جارہی ہے۔

1970 کے مقابلے میں فوجی اخراجات میں ساڑھے پانچ گنا اضافہ کیا جاچکا ہے جبکہ 1970 میں پاکستان آج کے مقابلے میں تقریباً دوگنا رقبہ رکھتا تھا۔

محکمہ پولیس کی جدید گاڑیاں اور قومی ٹرانسپورٹ کی تباہ حال بسیں ہر وقت سڑکوں پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ فریئر ہال پبلک لائبریری اور کے۔ ایم۔ سی اسپورٹس کمپلیکس بچوں اور طالب

علموں کے لئے بند کر دیئے گئے ہیں کیونکہ مارشل لاء نے ان دونوں جگہوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔

ہم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ہمارے معاشرے میں مارشل لاء اور اس نوع کی دوسری بیماریاں کیوں جڑ پکڑ لیتی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ملک کے حکمران طبقات اپنے اندرونی بحرانوں کے سبب اس قدر کمزور ہو چکے ہیں کہ اب عوام کو کچلے بغیر اقتدار پر قابض رہنا ان کے لئے ناممکن ہو گیا ہے۔ اسی لئے ملک کو کبھی پولیس ریاست بنا دیا جاتا ہے تو کبھی فوجی ریاست میں بدل دیا جاتا ہے۔ جبکہ اس پورے عمل کو قائم رکھنے کے لئے جاگیردار، گماشتہ سرمایہ دار اور نوکر شاہی سرمایہ دار اور سامراج پر تکیہ کیا جا رہا ہے جس کی قیمت ملک کو امریکی سامراج کی جنگی حکمت عملی کا آلہ کار بنا کر ادا کی جاتی ہے۔

قومی اقتدارِ اعلیٰ: ملک پر مسلط عوام دشمن طبقات مٹھی بھر لوگ ہیں اور سامراجی شکنجے سے آزادی حاصل ہوتے ہی ٹوٹ کر بکھر جائیں گے لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ سامراجی شکنجوں سے آزادی ہی قومی اقتدار اعلیٰ کو محفوظ کرنے کا ذریعہ ہے جسے جغرافیائی سیاسی صورتحال میں پاکستان کے قومی وجود کو برقرار رکھنے کی ضرورت سے ہم آہنگ کر کے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ہم ہندوستان، افغانستان، روس اور ایران سے دوستانہ ہمسائیگی کے تعلقات کی حمایت کرتے ہیں کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ایسی حکمت عملی پاکستان کے بہترین مفاد میں ہے۔ کمیونسٹ ہمیشہ محبّ وطن ہوتے ہیں کیونکہ وہ اپنے ملک کے ان محنت کش عوام کا حصہ ہوتے ہیں جو ملک کی تمام دولت اپنی محنت کے پسینے سے پیدا کرتے ہیں اور اس قومی دولت کی حفاظت اپنے لہو سے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس وقت دمشق جانے سے انکار کر دیا تھا جب حکومت ہمیں طیارے کے اغواء کنندگان کے مطالبے پر وہاں بھیجنا چاہتی تھی۔

آزاد قومی جمہوریت

ہماری جدوجہد کا مقصد ملک کو سامراجی تسلط سے آزاد کرانا ہے۔ ہم امریکہ اور چین کی ہر ایسی حکمت عملی کو مسترد کرتے ہیں جس کے ذریعے پاکستان کو فوجی اڈے کے طور پر پڑوسی ممالک کے خلاف جارحیت اور مداخلت کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہماری جدوجہد کا مقصد ملک

میں کسی خاص طبقے یا خاص نظریے کی حکومت کو قائم کرنا نہیں ہے۔ ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ سامراج کے طفیلی طبقات کے خاتمے کے بعد بھی ہمارا سماج بدستور کثیر الطبقات، کثیر النظریات اور کثیر الاقوامی رجحانات کا ترجمان ہوگا۔ ہم ملک میں ترقی پسند نظریات کے ساتھ ساتھ مذہبی رجحانات کی موجودگی کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ہم محبّ وطن تاجروں اور سرمایہ داروں کے طبقے کو بھی تسلیم کرتے ہیں جن کا ہنر اور سرمایہ ملک میں صنعتی ترقی کی رفتار میں ایک مثبت اور بار آور کردار ادا کرسکتا ہے۔

ہمارے ملک کی تقریباً پینسٹھ فیصد آبادی اپنا چھوٹا موٹا کاروبار کرنیوالے لوگوں پر مشتمل ہے۔ صنعتی پھیلاؤ کے ساتھ ان میں سے بیشتر لوگ محنت کش عوام کی صفوں میں شامل ہوجائیں گے اور یقیناً ان میں سے کچھ لوگ کاروباری لحاظ سے ترقی کی راہ پر چل نکلیں گے۔

سماج کے یہ تمام طبقات اور گروہ پاکستان کے جمہوریت پسند عوام کا ناقابلِ شکست حصہ ہیں اور ان کی متضاد سماجی مفادات کی حامل مشترکہ حکومت ہی قومی جمہوریت کہلائے گی۔ یہ اس حکومت کے مطابق جس میں محنت کش عوام ہی بالادست ہوں گے محبّ وطن، جمہوریت پسندوں اور محنت کشوں کا سامراج دشمن کردار ہی عوامی کردار کہلائے گا اور ہم اسی عوامی کردار کے حصول کی جدوجہد کو قومی جمہوریت کی جدوجہد کہتے ہیں۔

مکمل سیاسی آزادی: یقیناً عوامی حکمرانی کے بارے میں ابھی سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ مکمل سیاسی آزادی کا دور ہوتا ہے۔ ایسا دورِ حکومت جہاں لوگوں کو اپنے خیالات کے اظہار کی آزادی ہوتی ہے۔ لوگوں کو اپنی تنظیمیں بنانے کا موقع فراہم ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے سماجی شعور کی ارتقاء کے ذریعے سماجی معاملات کو خود اپنے طور پر طے کرنے کے قابل ہوسکیں۔

جاگیرداری کا خاتمہ: عوام کی حکمرانی جاگیرداری اور ماقبل جاگیردارانہ استحصال کی ہر شکل کو ختم کردے گی۔ ہمارے ملک کی وسیع تر آبادی کسانوں پر مشتمل ہے لہٰذا کسانوں کی نجات کے بغیر سماجی ترقی کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔ جاگیرداری کا خاتمہ نہ صرف زرعی پیداوار میں اضافے کے لئے بنیادی شرط ہے بلکہ ملکی منڈی کی وسعت، مشینی زراعت کے فروغ، ضلعی ضرورتوں کے لئے

افرادی قوت کی فراہمی، صنعتوں کے وسیع پھیلاؤ اور صنعت کی پیداواری قوت بڑھانے کے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ زمیندار اپنی اضافی دولت غیر ملکی موٹر کاروں، غیر ملکی دوروں اور دیگر آرائشی اشیاء پر ضائع کرتا ہے حتیٰ کہ وہ غسل خانے کا سامان تک بیرون ملک سے منگواتا ہے لیکن اگر ایک کسان ذریعہ پیداوار کا مالک بنے گا تو اس کی مقامی ضروریات اور آسائش کی اشیاء ملک میں صنعتی ترقی کی نئی راہیں کھولیں گی۔

نجی اور قومی شعبہ جات: پاکستان ایک غریب ملک ہے لہٰذا یہ نجی اور قومی سرمائے کے مابین جنگ کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ صنعتی ترقی کو تیز تر کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ دونوں شعبوں کے دستیاب سرمائے کو ایک مرکزی منصوبہ بندی کے ساتھ بامعنی استعمال میں لایا جائے۔ یقیناً فلاح و بہبود سے متعلقہ شعبے مثلاً صحت وغیرہ کو نجی سرمائے کے مفاد کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ قومی شعبے کے ماتحت کام کرنے والی بھاری اور بنیادی صنعتیں نجی شعبے کے سرمائے کے فروغ کے لئے بہت زیادہ کارآمد ثابت ہوسکتی ہیں اور جب کہ ملک کو صنعتی میدان کے پھیلاؤ کے لئے سرمائے کی فوری اور شدید ضرورت ہے۔ اسی طرح چھوٹی اور گھریلو صنعتیں ریاستی سرپرستی کی فوری متقاضی ہیں۔

تجارتی حصہ داری: ہم اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ صنعتی ترقی کے لئے غیر ملکی امداد کی ضرورت پڑے گی لیکن ہم ٹینکوں اور جنگی جہازوں کی مدد کے طلب گار نہیں ہیں۔ ہمیں ملک کی معاشی آزادی اور خودمختاری کے فروغ کے لئے غیر ملکی امداد کی بات کرنا چاہئے اور غیر ملکی امداد اس طرح کی ہونی چاہئے جس طرح کہ روس نے ہمیں اسٹیل مل کی شکل میں امداد بہم پہنچائی ہے۔ ہم اقتصادی لین دین میں سیاسی تحفظات اور غیر ملکی امداد کی خریداری کے خاتمے کی حمایت کرتے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی ضروریات کی اشیاء اُن ممالک سے خریدیں جو یہ اشیاء کم سے کم قیمت پر ہمیں مہیا کرسکیں اور اس سلسلے میں کسی ملک کے سماجی نظام کے مقابلے کو خاطر میں نہیں لانا چاہئے۔ دوسرے الفاظ میں ہمیں وہی کچھ خریدنا چاہئے جسکی ضرورت ہمارے ملک کو محسوس ہو اور ہمیں وہاں سے خریدنی چاہئے جہاں کم از کم قیمت پر مال مل سکے۔ ملکی پیداوار کو بیچتے وقت بھی ہمیں

بہتر قیمت کو مدِ نظر رکھ کر خریدار کو تلاش کرنا چاہیئے ۔ اگر ایسی ریاستیں جہاں محنت کش طبقہ برسر اقتدار ہے ہمارے لئے بہتر تجارتی حصہ دار ثابت ہوتی ہیں تو ہمیں ان سے تجارتی حصہ داری کو فروغ دینا چاہیئے۔

سامراجی توڑ پھوڑ: 1۔تعلیم: پاکستان میں سامراجی تسلط کی تخریب کاری تعلیمی شعبے میں صاف طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ ہمارے پیشہ وارانہ ادارے ایسے ماہرین کی تیاری میں مصروف ہیں جن کی ضرورت مغربی ممالک میں محسوس کی جاسکتی ہے۔اس میں سائنس اور انجینئر نگ کے شعبے سرِ فہرست ہیں۔ ملک کو ہنرمندوں کی شدید ضرورت ہے لیکن پیشہ وارانہ تعلیمی ادارے اس ضرورت کو پورا کرنے کے قابل ہی نہیں رکھے گئے ہیں۔ پاکستان بھر میں میڈیکل کالجوں میں سیٹوں کی تعداد کم کی جارہی ہے جبکہ آبادی اور ڈاکٹروں کے تناسب کے اعتبار سے پاکستان دنیا کے غریب ترین ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔عام تعلیمی شرح اپنے سابقہ تناسب سے آگے نہیں بڑھ سکی ہے، آزادی تقریر اور تخلیقی خیالات پر لاتعداد پابندیوں کے باعث سماجی صورتِ حال انتہائی افسوسناک رُخ اختیار کرچکی ہے۔ یہاں تک کہ پاکستان کے مسائل کے حوالے سے کوئی مستند کتاب تک سامنے نہیں آسکی ۔ لہٰذا ایسی کتابوں کے لئے ہندوستان برطانیہ، امریکہ اور روسی مصنفین کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔

2۔خواتین: ضیاء حکومت خواتین کی سماجی حیثیت کم کر کے انہیں قرون وسطیٰ میں دھکیل دینے کی کوششوں میں لگی ہوئی ہے۔جس کے نتیجے میں خواتین کی تمام تنظیموں نے ملک میں احتجاج کی ایک مستقل فضاء پیدا کردی ہے۔ان تنظیموں میں اپوا سے لے کر مسز طاہرہ مظہر علی خان اور ممتاز نورانی کی انجمن جمہوریت پسند خواتین تک سبھی شامل ہیں۔ ہم خواتین کو چادر اور چار دیواری کی غلامی سے رہا کرانے کی جدوجہد کے حمایتی ہیں تاکہ خواتین سماجی محنت کے دھارے میں شامل ہوسکیں۔ جیسا کہ مسٹر جناح نے 1944ء میں علیگڑھ یونیورسٹی میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ ’’یہ انسانیت کیخلاف جُرم ہے کہ ہماری خواتین گھر کی چار دیواری میں قیدیوں کی طرح بند

رہیں۔ تمہیں چاہئے کہ تم انہیں زندگی کے ہر شعبے میں ساتھی کی طرح اپنے ساتھ رکھو"۔

3۔روزگار: منصوبہ بندی سے معاشی ترقی سب کے لئے روزگار کا ذریعہ بنے گی۔ روزگار کا حق خوراک' لباس اور رہائش غرض تمام حقوق کی بنیادی شرط ہے۔ پاکستان میں لاکھوں افراد مکمل یا جزوی طور پر بے روزگار ہیں۔ پاکستان کو بجا طور پر غریب عوام کا امیر ملک کہا جا سکتا ہے۔ ملک کے بیشتر حصوں میں ذرائع روزگار ہی موجود نہیں ہیں جس کے نتیجے میں زیادہ تر لوگ اپنے بیوی بچوں سے سینکڑوں میل دور تلاش روزگار میں نکل آتے ہیں۔ کراچی ایسے لاکھوں افراد سے بھرا پڑا ہے جو اپنے عزیز و اقارب سے دور یہاں اپنی ناگفتہ زندگی کے دن کاٹنے کی جدوجہد کر رہے ہیں جب کہ زیادہ تر لوگ تلاش روزگار میں ہی پھرتے رہتے ہیں۔ بیوی بچوں اور دوستوں کے بغیر اکیلے رہنا خود دور سے آئے ہوئے محنت کشوں کے لئے اور اس شہر کے لئے بھی مسائل پیدا کر دیتا ہے۔ یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ ان میں سے اکثر اپنی غیر فطری زندگی کے سبب جنسی جنون کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سماجی زندگی میں مرد اور عورت کی علیحدگی کے حامی اس مصنوعی زندگی کے باعث پیدا ہونے والے منفی اثرات سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ کراچی اور دیگر بڑے شہروں میں تنہا زندگی گزارنے والے افراد میں جنسی کجروی کی کافی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ کوئی بھی شخص پیدائشی طور پر جنسی جنونی یا مجرم نہیں ہوتا۔ لہٰذا ایسے افراد کو خانگی زندگی کی فراہمی اور سماجی احساسِ تحفظ کی بدولت راہِ راست پر لایا جا سکتا ہے مگر کوڑے اور پھانسیاں کبھی کارگر علاج ثابت نہیں ہو سکتیں۔ ایسے افراد کو نفرت کی نہیں مدد اور ہمدردی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے ملک کے لاکھوں ہنرمند اور غیر ہنرمند محنت کش بیرونِ ملک میں اپنے خون پسینے سے کمائے ہوئے زرمبادلہ کے ذریعے ملکی خزانہ بھر رہے ہیں لیکن موجودہ حکومت ان کی خون پسینے کی کمائی ہوئی دولت ہتھیاروں کی خریداری پر ضائع کر رہی ہے جبکہ دوسری جانب افراطِ زر کے بڑھتے ہوئے زور نے عوام کو کنگال کر کے رکھ دیا ہے۔ خوش قسمتی سے اگر کوئی شخص روزگار تلاش کر لیتا ہے تو اسے افراطِ زر کی وجہ سے پیٹ بھر کھانا پھر بھی نصیب نہیں ہوتا۔ ملک کے مختلف علاقوں مثلاً کشمیر' سوات' دیر' جہلم اور میانوالی وغیرہ سے آئے ہوئے نوجوان اپنی بھرپور صحت کے ساتھ کراچی میں قدم رکھتے ہیں

لیکن کسی کپڑا مل میں سخت محنت کے ہاتھوں صرف دو سال کے اندر خون تھوکنے لگتے ہیں اور اپنی سابقہ صحت کے مقابلے میں فقط ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ ملک کے بالائی حصوں سے آئے ہوئے کسی بھی شخص کے چہرے پر کراچی کی تاریک اور حبس زدہ گلیوں کے نشانات دیکھ کر بتایا جاسکتا ہے کہ وہ یہاں کتنے دنوں سے رہ رہا ہے۔ دیہی علاقوں کے عوام ذریعہ معاش کی تلاش میں چھوٹے شہری مراکز سے ہوتے ہوئے بڑے شہروں مثلاً کراچی وغیرہ کا رُخ کرتے ہیں جہاں تلاش روزگار انہیں مغربی اشیا اور مشرق وسطیٰ کی ریاستوں میں پہنچا دیتی ہے۔

مارشل لاء کا خاتمہ: آزاد قومی جمہوریت کے حصول کے لئے مارشل لاء کو ختم کر کے عام انتخابات کے ذریعے منتخب حکومت کا قیام عمل میں لانا ہوگا۔ حکمران عوام کے مسائل حل کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہو چکے ہیں۔ پاکستان کے عوام سماجی تبدیلی کی شدید خواہش کے ساتھ میدان عمل میں اتر چکے ہیں۔ عوام کی اسی فیصد آبادی 1970 کے عام انتخابات میں سماجی تبدیلی کی خواہش کا اظہار اپنے حقِ رائے دہی کے ذریعے کر چکی ہے جبکہ 1977 میں بھی عوام نے اس کا اعادہ کیا تھا۔

موجودہ سماجی ڈھانچے کو جُوں کا توں باقی رکھنے والوں پر منحصر ہے کہ وہ سماجی تبدیلی کے بڑھتے ہوئے عمل کو اپنی خاص رفتار میں جاری رہنے دیتے ہیں یا روکاوٹیں کھڑی کر کے اسے انقلابی رخ اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ پاکستان کے عوام بوسیدہ سماج کو ایک نئے انداز میں مرتب کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہیں اور وہ اس حقیقت کو جان چکے ہیں کہ تاریخ کا وہ لمحہ آ پہنچا ہے کہ جب عوام اپنی محکومیت کو حاکمیت میں بدل دیں اور اس سے پہلے کہ تاریخ انہیں اپنا معمول بنالے وہ خود تاریخ کو بنانے والے بن جائیں۔ اس سے قبل کہ ریاستی ادارے اُن کو روندنے کا آغاز کریں وہ خود ریاستی اداروں پر قبضہ کر کے انہیں عوام دشمن قوتوں کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیں۔ بلاشبہ موجودہ سماجی ڈھانچہ مظلوم عوام کے لئے قطعی غیر منصفانہ نہج پر پہنچ چکا ہے۔ یقیناً عوام موجودہ سماجی ڈھانچے کو اپنے مفادات کے مطابق ازسرِ نو مرتب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ عوام کو درس گاہوں تک نہیں پہنچنے دیا جاتا لیکن وہ زندگی کے تجربات سے براہِ راست شعور حاصل کرتے ہیں۔ عوام اپنے رہنما اور نظریہ ساز اپنے اندر سے پیدا کرنے

کی صلاحیت رکھتے ہیں۔انہوں نے ہر بار اپنے دشمن طبقات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے اور ہر بار دشمن کی طاقت اور تعداد میں کمی پیدا کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام دشمن طبقات اب سامراجی سہارے کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔عوام کی جدوجہد ہمیشہ لوگوں کو زیادہ منظّم اور زیادہ طاقتور بناتی ہے جبکہ راستے کی رُکاوٹیں ان کے لئے جوہری قوت کا حکم رکھتی ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ مظلوم عوام سر اٹھا کر چلیں۔

ایک مٹکا پانی کے لئے میلوں چلنے والی عورتیں' اسکول جانے کی عمر میں کیچڑ میں لپٹے ہوئے بچے، بیگار میں جتے ہوئے محنت کش بوڑھے، بیمار، بے روزگار غرض تمام کچلے ہوئے لوگ ملک سے طفیلی طبقات، سامراج' افسر شاہی اور بدعنوانیوں کے سیاہ دور کو ختم کر کے ایک نئی زندگی مرتب کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ایک ایسی زندگی جو ولولے' تازگی اور رجائیت سے بھرپور ہوگی۔محنت کش عوام ملک کی تمام دولت کے خالق اور مالک ہیں۔مٹھی بھر طفیلی طبقات جو اپنے استعمال میں آنے والی خوراک' لباس' مکان غرض کوئی چیز بھی خود تیار نہیں کرتے، ان محنت کشوں پر حکمرانی کا کوئی جواز نہیں رکھتے جن کی پیدا کردہ اشیاء انہیں زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

پاکستان اپنے محبّ وطن بیٹوں اور بیٹیوں کا ہے۔ ملک کے محنت کش عوام جانتے ہیں کہ سماج کے کسی بھی کچلے ہوئے دھڑے کی جدوجہد اپنی داخلی معنوں میں تمام ستم رسیدہ طبقات کی جدوجہد ہوتی ہے۔ یقیناً عوام کی مشترکہ جدوجہد ناقابلِ شکست ہے۔اس بات کے لئے کسی تصدیق کی ضرورت نہیں ہے کہ عوام کی مشترکہ جدوجہد میں ملک کے تمام جمہوریت پسند' دانشور' محبّ وطن مذہبی حصے، نظریاتی اور مثبت طرزِ فکر رکھنے والے لوگ اُن کے ساتھ ہوں گے۔

۷۔روسی/افغانی نقطہ نظر: ہم پر غیر قانونی اور بغاوت پر اکسانے والا مواد چھاپنے، اپنے پاس رکھنے، فوج کے مختلف حصوں میں بے چینی پھیلانے اور نظریہ پاکستان کے خلاف کام کرنے کے الزامات عائد کئے گئے ہیں۔

تاہم استغاثہ نے مارشل لاء حکومت کی جانب سے ان شکایات کا بھی اظہار کیا تھا کہ ہم

روسی اور افغان نقطہ نظر کی حمایت کرتے ہیں اور غریب طبقات کے علاوہ نچلے درجے کے سرکاری ملازمین میں بے چینی پھیلاتے ہیں۔

استغاثہ کے ان الزامات کے ساتھ ہی بلی تھیلے سے باہر آ گئی ہے۔ دراصل ہماری گرفتاری کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم افغانستان کے مسئلہ پر چین، امریکہ اور پاکستان کی حکومتوں کے موقف کی مخالفت کرتے ہیں اور روسی/افغانی نقطہ نظر کی حمایت کرتے ہیں۔

فوجی حکومت اتنی قوت نہیں رکھتی کہ ان خاص الزامات کو چارج شیٹ میں جگہ دے سکے۔ لہٰذا اس مقصد کے لئے استغاثہ کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ ہم جس نقطہ نظر کی بات کرتے ہیں اسے فقط روسی اور افغان موقف نہیں کہا جا سکتا کیونکہ یہ موقف پوری دنیا کے انقلابیوں، محنت کشوں کے دوستوں، عالمی امن کے حامیوں اور تمام صلح پسند لوگوں کا مشترکہ موقف ہے جو پانچوں براعظم عبور کر چکا ہے۔ یورپ کے ہر دارالخلافہ میں لاکھوں لوگوں پر مشتمل امن جلوس اس نقطہ نظر کی حمایت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ایشیاء افریقہ اور لاطینی امریکہ کے عوام اسی موقف کے باعث ایک نئی قوت حاصل کر رہے ہیں۔ جبکہ امریکی عوام نے اسی نقطہ نظر کی بدولت صدر ریگن اور دیگر امریکی فوجی تاجروں کے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔ یہی وہ نقطہ نظر ہے جس نے سوویت یونین میں گذشتہ چند دہائیوں کے اندر تعلیم اور روزگار کی شرح سو فیصد تک پہنچا دی ہے اور آج ہمیں سوویت یونین میں آبادی کا ساٹھ فیصد سے زیادہ حصہ اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں لئے نظر آتا ہے۔ اسی نقطہ نظر کی بدولت کتابوں اور رسالوں کی وسیع اشاعت کے ساتھ ساتھ وسیع سائنسی اور تکنیکی ترقی ممکن ہوئی ہے۔ اسی نقطہ نظر کی بدولت امن وامان کی وہ مثالی صورت حال پیدا کرنا ممکن ہوئی ہے جس کے نتیجے میں ماسکو میں دس سال میں قتل کا فقط ایک واقعہ رونما ہوا ہے وہ بھی ایک پاکستانی کے ہاتھوں دوسرے پاکستانی کا قتل۔ یہی نقطہ نظر ہر جگہ مظلوموں اور استحصال زدہ لوگوں کی غلامی کی زنجیریں کاٹ رہا ہے۔ وہ دن لد گئے جب یہ نقطہ نظر یورپ کے نزدیک فقط ایک اندیشہ ہائے دور دراز کا معاملہ تھا۔ اب یہ نقطہ نظر دنیا بھر کے کروڑوں محنت کشوں کی لامحدود محنت کی توانائی کا روپ دھار چکا ہے جس نے فرد کے ہاتھوں فرد اور قوم کے ہاتھوں قوم کے استحصال پر مبنی سامراجی نظام

کی موت کا گجر بجادیا ہے۔

ضیاءٹولہ ایک ناخوشگوار حیرت میں مبتلا ہے، اگر وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ ہمارا یہ موقف ملک کے فقط چند ایک لوگوں کا موقف ہے۔نہیں! یہ نقطہ نظر ہر اس کسان کا خواب ہے جو اپنی زمین جاگیرداروں سے آزاد کرانا چاہتا ہے اور سود کی لعنت کا اسی طرح خاتمہ چاہتا ہے جیسا کہ افغان انقلاب کے بعد افغانستان میں کیا گیا ہے۔ یہ نقطہ نظر ہر اس محنت کش کے دل کی دھڑکن ہے جو ملک میں صنعتی ترقی چاہتا ہے اور اپنی پیدا کی ہوئی دولت کا خود مالک بننا چاہتا ہے۔ یہ نقطہ نظر ہر محبّ وطن شہری کا امن پسند نغمہ ہے جو پوری لگن کے ساتھ ملک کی خدمت کرنا چاہتا ہے اور ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنے کا خواہاں ہے۔ دراصل یہ نقطہ نظر پوری قوم کا نقطہ نظر ہے جو ملک سے سامراجی دلالوں اور ان کے پٹھوؤں کو بے دخل کر کے ترقی و کامرانی کی طرف بڑھنا چاہتی ہے۔ اگر موجودہ فوجی حکومت جمہوریت سے قبل اس نقطہ نظر کے خاتمے کی منتظر ہے تو یقیناً یہ ایک لاحاصل انتظار ہوگا کیونکہ اس انقلاب کا تیز دھارا پوری شدت کے ساتھ فوجی ٹولے کو ابدی نیند سلانے کے لئے آگے بڑھ رہا ہے۔

ہم وکیل سرکار کے ممنوں ہیں جنہوں نے حقیقت کا پردہ چاک کر کے بتادیا ہے کہ ضیاء حکومت اور ہمارے درمیان موجودہ تنازعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے دو عالمی نقطہ ہائے نگاہ کا تنازعہ ہے۔

ضیاء حکومت موت کے سوداگروں،استحصالی طبقات اور ظلم آمروں کے نقطہ نگاہ کی ترجمان ہے جبکہ ہم اپنے ملک کے عوام کے ساتھ ہیں اور امن جمہوریت اور ترقی کی حمایت کرتے ہیں۔

ضیاء حکومت جب ہمارے موقف اور عمل کو سامراجی مفادات کی عینک سے دیکھتی ہے تو اسے فطری طور پر یہ سب کچھ انتہائی خطرناک نظر آتا ہے۔ دراصل حکمران ہمیں قید رکھنے پر مجبور ہیں۔موجودہ صورتحال کی تبدیلی بتادے گی کہ کون منصف ہے اور کون مجرم ہے۔

کسی بھی پاکستانی کو حتیٰ کہ ضیاء حکومت کو بھی اپنے مخصوص نظریات رکھنے، فحش اور اخلاق سوز

مواد کے علاوہ اوران کا پرچار کرنے کے بنیادی انسانی حقوق سے محروم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ صرف عوام ہی خیالات کے ردوقبول کا اختیار رکھتے ہیں۔ خیالات کی فراہمی کسی حکومت کی ذمہ داری نہیں ہوسکتی اور نہ کوئی حکومت تشدد کے ذریعے سوچنے پر پابندی لگاسکتی ہے۔

جب حکومت تمام ذرائع ابلاغ کو قبضے میں لے کر انہیں ایک حقیر اور مختصر طبقے کے نظریات کی خیرات باٹنے پر لگار کھے تو عوام بھی یہ حق رکھتے ہیں کہ اپنے نظریات کی اشاعت کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کریں۔

ہمارے مقدمے کے حوالے سے عدالت کے سامنے جو مواد پیش کیا گیا ہے اس میں صرف اور صرف جمہوریت کی بحالی کا مطالبہ اور حمایت کی گئی ہے اور جمہوریت کی بحالی ایک ایسا مقصد ہے جس کے بارے میں مارشل لاء حکومت بھی زبانی جمع خرچ کی حد تک ہی سہی لیکن وعدے کرنے پر مجبور ہے۔ یہ مواد موجودہ مارشل لاء حکومت اور مارشل لاء کے نفاذ پر تنقید کا حامل ضرور ہے لیکن اس میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جسے ریاست کے خلاف قرار دیا جاسکتا ہے۔

جنرلوں کی مافیا: ہم پر فوج کے مختلف حصوں میں بے چینی پھیلانے کا الزام ازخود مضحکہ خیز نوعیت کا الزام ہے کیونکہ کسی بھی طبقاتی سماج میں حکومت ہمیشہ حکمران طبقات کی خدمات پر مامور ہوتی ہے اوران کے دشمن طبقات کو کچلنے کی سعی کرتی رہتی ہے۔

ضیاء کابینہ جاگیرداروں اور بڑے تاجروں پر مشتمل ہے جس میں پرنس محی الدین، ظفر اللہ جمالی، مصطفےٰ گوکل اور محمود ہارون وغیرہ شامل ہیں اور یہ کابینہ یقیناً محنت کش عوام کی نمائندگی نہیں کرتی۔

پاکستان کے عوام اس بات پر ناراضگی کا حق رکھتے ہیں کہ انکی مسلح افواج کو عوام دشمن طبقات کے اقتدار کی برقراری کے لئے بیساکھی کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔

یقیناً ایک عام فوجی کے لئے جو اپنی نوعیت میں محض ایک کسان ہے یہ جان لینا کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ اسے اپنے ہی عزیز رشتہ داروں کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے لہٰذا جو بے چینی افواج میں پھیل رہی ہے اسکی مکمل ذمہ داری فوجی اشرافیہ پر ہے جس نے

مسلسل مارشل لاء نافذ کرکے اور اس کا انتظام کرنے کے دوران خود کیلئے مافیا تنظیم کے ان داداگیروں کا کردار اپنا لیا ہے جو سڑکوں پر دہشت پھیلاتے اور غنڈہ ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ ہم جنرلوں کی اس مافیا کی مخالفت کرتے ہیں جس نے بزعم خود ملک کی سیاسی ذمہ داری سنبھال لی ہے اور فوج کو سیاسی جھگڑوں میں الجھا دیا ہے۔ مزید براں مسلح افواج کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، ایک حصہ سعودی عرب اور دیگر خلیجی ریاستوں میں تعینات کیا گیا ہے جہاں فوج کے حصے کو وسیع معاوضہ پر رکھا گیا ہے جس کے نتیجے میں فوج کے دیگر حصوں میں لالچ اور حرص کے جراثیم تیزی سے پھیل رہے ہیں۔

فوج کا دوسرا حصہ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں پر مشتمل ہے جو افسر شاہانہ ٹھاٹ اور رویے اپنائے ہوئے ہے۔ اس حصے نے بھی فوج میں حرص وگمان کو ہوا دے دی ہے۔ البتہ فوج کا تیسرا حصہ عام پیشہ وارانہ خدمات کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے لہٰذا تیسرے حصے میں خشک مزاجی اور اکتاہٹ پیدا ہوگئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فوجی اشرافیہ نے مسلح افواج کو کرائے کے سپاہیوں میں بدل کر، غیر پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں الجھا کر اور اپنے پسندیدہ کے فوجیوں کو مواقع اور مراعات دیکر آپس میں جھنجھلاہٹ اور بے چینی پھیلا رکھی ہے۔

افلاس زدہ سرکاری ملازمین: جہاں تک غریب طبقات اور نچلے درجے کے سرکاری ملازمین میں بے چینی پھیلانے کے الزام کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں ہم پشاور، حیدرآباد اور روہڑی کے مزدوروں اور ریلوے کارکنوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے فقط یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ مزدوروں، کسانوں اور تباہ حال سرکاری اور غیر سرکاری ملازمین مثلاً سپاہیوں، فوجیوں اور باقی تمام محنت کشوں کی ماہوار تنخواہیں کم از کم ایک تولہ سونے کی قیمت کے برابر مقرر کی جائیں کیونکہ صرف اسی طرح بڑھتی ہوئی افراطِ زر کی کاٹ کو کم کیا جاسکتا ہے اور کسی حد تک بہتر معیار زندگی کے قریب پہنچا جاسکتا ہے جبکہ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے تمام شعبہ ہائے زندگی میں ایماندار اور باصلاحیت کارکن پیدا کئے جاسکتے ہیں۔

طفیلی طبقات کے لئے بدعنوانیوں کا مسئلہ ایک غیر اہم بات ہوسکتی ہے کیونکہ ان کے تمام دولت ہی ناجائز ذرائع کی پیداوار ہوتی ہے لیکن محنت کش طبقات کے اخلاقی معیار کا برقرار رہنا ملکی معیشت کے لئے شہہ رگ کی طرح ضروری ہے۔

صرف اسی طرح ایک کسان اپنے مفاد کے پیشِ نظر بہتر شرائط کے ساتھ زمیندار کو اپنی خدمات فراہم کرسکتا ہے اور صرف یہی راستہ ہے جو ملک کو صنعتی اور تجارتی ترقی میں پیش قدمی کی راہ پر ڈال سکتا ہے۔

احتساب: جب مارشل لاء حکومت نے وزیراعظم کو معزول کر کے قتل کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے احتساب کو اسلام کی بنیادی شرط قرار دے کر متعارف کرایا اور یوں مجموعی طور پر احتساب کا ہتھیار وزیراعظم بھٹو کو قتل اور اپنے مخالفین کو دہشت زدہ کرنے کے لئے استعمال کیا۔ یہ بھی واضح بات ہے کہ اس احتساب کی انگلی ہمیشہ دوسروں پر اٹھائی جاتی ہے۔

راولپنڈی سازش کیس گذشتہ تین دھائیوں سے خفیہ عدالت کے کمرے میں بند پڑا ہے لیکن موجودہ حکومت نے بھی اس مقدمے کی کارروائی سے عوام کو آگاہ کرنا کبھی اپنے فرائض اور احتساب میں شامل نہیں سمجھا ہے۔

یہ مقدمہ پہلے فوجی غاصب جنرل ایوب خان کا تیار کردہ تھا۔ ہر چند کہ اس قانون کو ہی غیر آئینی قرار دیا جاچکا ہے جس کے تحت خصوصی عدالت قائم کی گئی جس نے راولپنڈی سازش کیس کا مقدمہ چلایا تھا جس میں ملوث ملزمان کو رہا کر دیا گیا تھا لیکن عوام ابھی تک مقدمے کی مکمل کارروائی سے بے خبر رکھے جارہے ہیں تاکہ عوام کو معلوم نہ ہو کہ ایوب خان نے کیا سوچ کر یہ سازش تیار کی تھی۔ اسی طرح یحییٰ حکومت کے بارے میں بھی کوئی بات تک نہیں کی جاتی۔ بنگلہ دیش وجود میں آچکا ہے لیکن ابھی تک سابقہ مشرقی پاکستان میں نسل کشی کی تحقیقات سے متعلق حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ منظر عام پر نہیں لائی گئی۔ احتساب کا مطلب ایک یہ بھی ہے کہ اقتدار پر قابض حکمرانوں کے خلاف عوامی پوچھ گچھ کا عمل، جس کا وقت ضرور آئے گا لیکن پاکستان کے حکمران طبقات نے احتساب کا مطلب غاصبوں کی شاہانہ قطار کے سامنے مظلوم عوام کا احتساب

سمجھ رکھا ہے۔

جنرل ضیاء کا کہنا ہے کہ وہ خود کو احتساب سے بالاتر نہیں سمجھتا اور ہر وقت اپنے آپ کو احتساب کے لئے تیار رکھتا ہے لیکن کس کے سامنے؟ سرکاری ملازمتوں کے قانون کے مطابق جنرل ضیاء کا سیاست میں حصہ لینا قابل گرفت عمل ہے جبکہ وہ اب بھی وردی میں ہے لیکن سرکاری ملازمتوں کے قانون کو کہاں تلاش کیا جائے؟

ایک احتساب رائے عامہ کے ذریعے سامنے آتا ہے لیکن جنرل ضیاء نے عام انتخابات پر پابندی لگا رکھی ہے جبکہ سیاسی جلسوں کے انعقاد کو روک کر سرِ عام سیاسی خیالات کا اظہار کرنا ناممکن بنا دیا ہے۔

جنرل ضیاء کے خلاف احتساب کا عمل خبروں کے ذریعے بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ صحافت کو سنسر شپ کے ذریعے مفلوج بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

اگر جنرل ضیاء کے احتساب کے لئے عدالتوں کی طرف دیکھا جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ جنرل ضیاء عدالتوں سے بالاتر ہو چکا ہے کیونکہ کسی عدالت کو اس کے اعمال کے خلاف سماعت اور فیصلے کا حق نہیں ہے۔ نذیر عباسی کے قتل کے سلسلے میں درج شدہ ایف آئی آر سرد خانے میں ڈال دی گئی ہے جبکہ نذیر عباسی کے قاتلوں کے زمرے میں ضیاء کا نام بھی شامل ہے جبکہ دوسری جانب نذیر عباسی کی بیوہ کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے گئے ہیں۔

یقیناً جنرل ضیاء کا احتساب خدا کے حضور ممکن ہے کیونکہ خوش قسمتی سے خدا کی ذات اس کے تشدد کے آلات کی حدود سے باہر ہے لیکن اسی طرح جن لوگوں کی موت کے پروانے پر ضیاء نے دستخط کئے ہیں ان کا احتساب بھی خدا کے سامنے ہی ہونا چاہئے۔

مسلح افواج کے مخصوص افسران مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں کی صورت میں ملک پر مسلط ہو جاتے ہیں اور اپنی ریشہ دوانیوں کے ذریعے مسلح افواج کے مجموعی کردار کو عوام کی نظروں میں مجروح کرتے ہیں۔

احتساب کی عوامی روایت: عوام احتساب کی ایک مختلف روایت رکھتے ہیں۔ عوامی احتساب مظلوم طبقات کی مشترکہ جدوجہد کے نتیجے میں ایک ایسی مسلح طاقت کو جنم دیتا ہے جس کی روایت ہمیں انقلاب فرانس کے وقت ظہور پذیر ہوتی ہوئی نظر آئی ہے جب (ریگن اور ضیاء کے پیشرؤں) یورپ کے بادشاہوں نے انقلاب فرانس کو کچلنے کے لئے ایک مقدس اتحاد کر لیا تھا لیکن فرانس کی عوام اوران کی مسلح طاقت نے آزادی، اخوت اور مساوات پر گہرے یقین کے ساتھ مشترکہ طور پر شاہ پسندوں کے رجعتی حملوں کو یورپ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پسپا کر دیا تھا۔ نپولین نے مسلح افواج کی عوام سے جڑی ہوئی طاقت پورے مرکز پر پھیلا دی تھی۔ عوامی احتساب کی یہی روایت روسی بالشویک انقلاب میں بھی اپنی طاقت کا مظاہرہ کر چکی ہے۔ روسی عوام کے سُرخ محافظوں نے ملک کو استحصالی طبقات سے نجات دلانے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا اور پھر سُرخ فوج میں شامل ہوکر چودہ سامراجی طاقتوں کو شکست سے دوچار کیا تھا۔ احتساب کی یہی روایت شاہ دشمن انقلاب کے بعد ایران میں بھی جڑ پکڑ چکی ہے۔ ایرانی مسلح افواج سامراج نواز پٹھوؤں سے پاک ہو چکی ہے اوراس کے علاوہ اس نے عراقی فوج کا بھرپور مقابلہ کر کے دنیا بھر کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔ ایران میں فوج اور عوام میں گہرا رشتہ پیدا ہو چکا ہے جسکی وجہ سے ایک قومی جنگ اور ملک میں قومی انتخابات ایک ساتھ دیکھنے میں آئے ہیں۔ دراصل احتساب کی یہی وہ شکل ہے جو بے چینی کے تمام آثار ختم کر دیتی ہے اور فوج کو ایک قابل بھروسہ ہتھیار بناتی ہے ورنہ دوسری صورت میں ایسے احتساب کی عدم موجودگی نوے ہزار فوجیوں کو اپنے ہی وطن میں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ احتساب ایران میں وقوع پذیر ہو چکا ہے اوراب اس کے پڑوس میں وقوع پذیر ہونے والا ہے۔ عظیم ایران کے عوام اور عظیم پاکستان کے عوام آپس میں دینی بھائی بھی ہیں۔

VI۔نظریہ پاکستان: یحییٰ خان کے غاصبانہ دورِ حکومت میں جمہوریت اور سماجی تبدیلی کے لئے جدوجہد کرنے والوں کے خلاف انتقامی کارروائیوں کا مقصد حاصل کرنے کے لئے نظریہ پاکستان کا فرضی ہیولا تراشا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظریات کا تعلق ملکوں سے نہیں بلکہ لوگوں اور گروہوں

سے ہوتا ہے۔ تحریکِ پاکستان کی تاریخ میں نظریہ پاکستان نام کی کی کسی شے کا ذکر تک موجود نہیں ہے۔ پاکستان کی عمارت کا سنگِ بنیاد قائد اعظم نے اپنی تاریخی اور مشہور تقریر مورخہ 11 اگست 1947 میں دستور ساز اسمبلی کے سامنے انتہائی واشگاف الفاظ میں سیکولر طرزِ فکر پر رکھا تھا۔ قائداعظم کی اس تقریر میں جمہوریت اور عوام کی فلاح و بہبود سے متعلق بنیادی خیالات موجود ہیں۔ آج موجودہ حکومت اسی سنگِ بنیاد کو پوری سنگینی کے ساتھ تباہ کر رہی ہے۔

قائداعظم کا سیکولر تصور حکومت

قائداعظم نے دستور ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''آپ اپنے مندروں اور مسجدوں میں جانے کے لئے مکمل طور پر آزاد ہیں۔ پاکستان میں ریاست کو اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ آپ کس فرقے یا کس عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم اس بنیادی اصول کے ساتھ آغاز کر رہے ہیں کہ آپ اس ریاست کے مساوی حقوق رکھنے والے شہری ہیں۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ وقت کیساتھ ساتھ ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے لیکن مذہب کے مفہوم میں نہیں بلکہ مذہب ہر شخص کا ذاتی عقیدہ ہوتا ہے بلکہ سیاسی مفہوم میں ریاست کے شہری کی حیثیت سے''۔

بابائے قوم کا پیش کردہ یہی تصور سیکولر جمہوریت ہے۔ یہ تصور تمام شہریوں کو مساوی قرار دیتا ہے اور مذہبی معاملات میں ریاستی مداخلت کی سخت ممانعت کرتا ہے۔ اگر نظریہ پاکستان کا مطلب یہی ہے تو ہم اس کی بھرپور حمایت کرتے ہیں اور اگر ایسا ہی ہے تو ضیاء حکومت ہی نظریہ پاکستان کے خلاف کام کر رہی ہے۔ ہم محبّ وطن علماء کو عوام کا حصہ سمجھتے ہوئے استحصالی طبقات کے تیار کردہ نام نہاد نظریاتی تصور کی مخالفت کرتے ہیں جبکہ قائداعظم کے پیش کردہ نظریہ پاکستان کو موجودہ حکمران پوری طرح سے کچلنے میں لگے ہوئے ہیں۔ حکمران طبقات کا تخلیق کردہ نظریاتی تصور ملک میں نظریات کی جنگ کو اسلحے کی جنگ میں بدل دینا چاہتا ہے۔ یہی نظریاتی تصور ہے جو تشدد اور جنگ کی توجہ کے لئے ''جسکی لاٹھی اسکی بھینس'' کے نظریے کو ہوا دے رہا ہے۔ جنرل یحییٰ کے نظریہ پاکستان نے ملک کو دو ٹکڑے کر دیا اور بنگلہ دیش کو وجود میں لانے کا سبب بن گیا تھا۔

ہمیں موجودہ حکمرانوں کے نظریہ پاکستان کے پسِ پردہ ملک کی سالمیت کے لئے چھپے ہوئے خطرات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

جنرل ضیاء کی قدامت پرستی: اگر نظریہ پاکستان ابہام پسندوں کے تعصّبات اور تصورات کے غیر واضح ملغوبے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے تو ہم اسے جنرل ضیاء اور رجعت پسندوں ملاؤں کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک یہ ''اسلامی'' جنرل برسرِاقتدار ہیں اسلام کو بدنام کرنے کی ان سے بہتر کوشش کوئی اور نہیں کرسکتا۔ جہاں تک رجعت پسندی کا تعلق ہے تو یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ متعصب ملاّ جدید رجحانات اور تصورات سے دور رہنا چاہتے ہیں لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یہی متعصب ملاّ جدید رجحانات کے نتیجے میں حاصل ہونے والے اثرات کے فوراً مالک بن بیٹھتے ہیں۔ متعصب ملاّ گھنٹوں لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعے شیطانی ایجادات اور نظریات کے خلاف تقریریں کرتے ہیں جبکہ انکی تبلیغ میں استعمال ہونے والا لاؤڈ اسپیکر بذات خود اسی شیطانی سائنس کی ایجاد ہے جس کے ذریعے وہ اپنی مخالفت دور دور تک پہنچاتا ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ متعصب ملاّ سامراجی مفادات کی تکمیل کے لئے ایسا نقطہ نظر اپناتا ہے جس کے نتیجے میں پس ماندہ ملکوں میں سامراجی مال کی کھپت کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور یہی ملاّ ان پس ماندہ ممالک میں بنیادی ٹیکنالوجی اور صنعت کی تنصیب کے راستے میں روکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں تاکہ چھوٹے ممالک سیاسی اور معاشی آزادی کی راہ اختیار نہ کرسکیں۔ ہمیں امریکہ مہلک اور جان لیوا ہتھیار بڑی فراخ دلی سے مہیا کرتا ہے جبکہ اسٹیل مل کے لئے ہمیں سوویت یونین جانا پڑتا ہے۔

غیر ملکی اسلام: اگر نظریہ پاکستان کو تمام غیر ملکی نظریات سے الگ کردیا جائے تو میرے خیال میں ہماری اپنی زمین پر پیدا ہونے والا نظریہ صرف بابا گرونانک کا نظریہ ہے کیونکہ اس انداز سے دیکھا جائے تو اسلام بھی ایک غیر ملکی زمین پر ظہور پذیر ہوا تھا اور اسکی پرورش بھی دیارِ غیر میں ہوئی ہے۔ اگر ہمارے باپ دادا بھی غیر ملکی نظریات سے اسی قدر بدظن ہوتے جس طرح موجودہ حکومت اپنے رویے میں بدظن ہے تو (خدانہ کرے) اب تک ہم لوگ بھی حلقہ اسلام سے الگ ہی ہوتے۔

وہ لوگ قابلِ تحسین ہیں جنہوں نے ابتداء ہی میں اسلام کی لامحدود سچائیوں کا ادراک حاصل کرلیا اور سمجھ لیا کہ خیالات جب پھیلتے ہیں تو پوری انسانیت کا مشترکہ سرمایہ بن جاتے ہیں۔

ہمارے پیشرو: ہمیں چاہئے کہ ہم گہرائی میں جا کر نظریہ پاکستان کی بنیادیں تلاش کریں۔ یقیناً پاکستان کا حقیقی کلچر موہن جودڑو کے حوالے سے تلاش کیا جاسکتا ہے لیکن موہن جودڑو کی تہذیب ایک ایسی تہذیب بتائی جاتی ہے کہ جو اس بات سے بے خبر تھی کہ کس طرح ایک ڈنڈے کے ذریعے اکثریت کی محنت کا پھل چھینا جاسکتا ہے۔ موہن جودڑو میں فوجی ٹولے کا ایسا کوئی استعمال نہیں تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ تہذیب فوجی طاقت سے ہی واقف نہیں تھی۔ اس کے بجائے یہ تہذیب ثقافتی مظاہر اور رقاصوں سے آگاہ تھی۔

فرضی ہیولا: ہم پر نظریہ پاکستان کے فرضی ہیولے کیخلاف کام کرنے کا الزام بذاتِ خود انتہائی احمقانہ ہے۔ پاکستان کے عوام نے کبھی بھی اس طرح کے نظریہ کی حمایت نہیں کی ہے۔ مارشل لاء حکومت خود بھی جانتی ہے کہ ایسے کسی نظریے کا کوئی وجود نہیں ہے۔ دراصل اس مبہم اور بے وجود نظریے کا مقصد حکمران طبقات کے وجود کو قائم رکھنا اور اُن کے مخالفین کو کچلنا ہے۔

میاں افتخار الدین مرحوم نے 1949 میں قرارداد مقاصد پر اسمبلی میں بحث کے دوران طاقت کے غلط استعمال پر متنبہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''کوئی بھی ایسا موقعہ آسکتا ہے جب کبھی ریاست یا کوئی برسراقتدار جماعت یہ کہہ کر کہ عوام اللہ تعالیٰ کی حدود سے باہر نکل چکے ہیں، عوام کا حکم ماننے سے انکار کردے'' (دستور ساز اسمبلی)

دہشت گرد ضیاء کے نقشِ قدم پر

اُن تمام لوگوں کی طرح جو بندوق کے ذریعے اقتدار قائم رکھتے ہیں پاکستان کے موجودہ حکمران بھی اپنے پٹھوؤں کو پیدا کر چکے ہیں جو اُن کے خلاف اُن ہی کے انداز میں دہشت گردی کے طوفان اٹھائے ہوئے ہیں۔ موجودہ حکمران اور اُن کے پٹھو عوامی طاقت کے منظّم ہونے

کے خوف سے عوام میں باہمی جھگڑے کھڑے کر کے انہیں کمزور کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ چونکہ جن حکمرانوں کو عوامی حمایت حاصل نہیں ہوتی وہ تقسیم کرو اور حکومت کرو کے فلسفے پر عمل کرتے ہیں۔

پاکستان کی علاقائی سیاسی صورتِ حال اپنے اندر گہرے اور خوفناک نتائج رکھتی ہے لہٰذا پاکستان اس بات کا متحمل نہیں ہوسکتا کہ اس کی تقدیر ایسے غیر ذمہ دار گروہ کے ہاتھ میں دے دی جائے جو عوام کے سامنے کسی قسم کی جواب دہی کے لئے تیار نہیں ہے۔ ہم ایک سابقہ مارشل لاء کے تجربے سے گزر چکے ہیں جس نے پاکستان کو اتحاد اور سالمیت کے دفاع کے نام پر دولخت کر دیا تھا۔ آج پاکستان کے عوام کی ترقی اور ملکی ترقی کے لئے سماج کے تمام حصوں اور ملک کے تمام حصوں کے درمیان گہری یگانگت اور اتحاد کی ضرورت ہے کیونکہ اکٹھے رہنا ہے اور الگ ہونا ختم ہو جانا ہے۔ ہندوستان ایک وسیع وعریض ملک ہے لیکن اس کے تمام علاقوں میں اور تمام حصوں میں اتحاد قائم رہنے کی وجہ سے اس کی ملکی سالمیت بھی قائم ہے۔

ہندوستان میں سماجی یگانگت کی بنیادی وجہ معاشی یکجہتی کے علاوہ سیاسی جماعتوں میں آزادانہ حرکت، ٹریڈ یونین، کسان تنظیموں اور دوسری تمام طبقاتی اور پیشہ وارانہ تنظیموں کی آزادانہ سرگرمیوں میں مضمر ہے۔ ہندوستان میں متواتر عام انتخابات اور دوسرے مظاہرے جمہوری عمل کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے اتحاد کو فوجی دھمکیوں اور کینہ پرور انتظامیہ اور انتقامی کاروائیوں کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

پاکستان عوام کا ہے: پاکستان میں بھی صرف محنت کش عوام ہی اپنے طبقاتی اتحاد اور طبقاتی جدوجہد کے ذریعے ملک کو سیاسی طور پر استحکام بخش سکتے ہیں۔ ملتان کے مزدوروں کی لڑائی ،صحافیوں کی بھوک ہڑتال' پٹ فیڈر کے کسانوں کی جدوجہد اور امریکی سفارتخانوں اور قونصل خانوں کے سامنے کئے جانے والے عوامی مظاہرے درحقیقت ملک کے تمام علاقوں اور محبّ وطن طبقات کی ہر سطح پر حمایت اور اتحاد کے آئینہ دار ہیں۔ تاہم ملکی سالمیت اور استحکام کے لئے ضروری ہے کہ مشترکہ جدوجہد کو جمہوری عمل کے ازسرِ نو آغاز' پڑوسی ممالک سے بہتر تعلقات اور عام

انتخابات کے مطالبات سے پوری طرح جوڑا جائے لیکن ضیاء حکومت کے لئے ایسی صورتحال یونانی ''ایھنیا'' کی طرح ثابت ہوگی جو اسے فالتو قرار دے کر بے دخل کر دے گی۔ یہ بات اپنی جگہ پر ہے کہ مارشل لاء حکومت کوئی لو ہے کا حلقہ نہیں ہے لیکن اسے عوام کی مشترکہ جدوجہد کے تانے بانے کے ذریعے ہی ختم کیا جاسکتا ہے اور ملکی استحکام کے لئے سیاسی اداروں کی تکمیل کی جاسکتی ہے۔

عوام کی تخلیقی قوت: ضیاء حکومت نے سیاسی جماعتوں اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا رکھی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ رجعت پسند سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کی کھلی اجازت ہے۔ رجعت پسند جماعتوں کو عوام سے رابطے، مجلس عاملہ کے اجلاس منعقد کرنے، اخباری بیانات جاری کرنے اور ہم خیال سیاسی جماعتوں سے میوزیکل چیئر جیسا کھیل کھیلنے کی مکمل اجازت ہے۔ یہاں تک کہ پیر پگارا کی خود کلامیوں کی تمام تر مضحکہ خیزی کو بھی انتہائی احتیاط سے شائع کیا جاتا ہے البتہ یہ پابندی جمہوریت پسند اور ترقی پسند سیاسی جماعتوں اور انکی سرگرمیوں کے خلاف پوری قوت سے استعمال کی جارہی ہے۔ سنسر شپ کا اطلاق بھی صرف محبّ وطن عوام سے متعلقہ خبروں پر کیا جاتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ بائیں بازو کی جمہوریت پسند اور محبّ وطن سیاست کو ختم نہیں کیا جاسکا۔ عوام اپنی خبروں اور نظریات کی اشاعت کے لئے متبادل طریقے استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں عوام سے متعلق بڑی تعداد میں شائع ہونے والے سرخ پرچم، ہلچل اور دوسرے سیاسی مواد کی مثالیں موجود ہیں اور یہی مواد ہمارے خلاف اس مقدمے میں شہادت کے طور پر حکومت کی جانب سے پیش کیا گیا ہے۔

ملک میں بحرانی کیفیت اتنی شدید تر ہو چکی ہے کہ ضیاء حکومت بھی اپنا متعصّبانہ طرز عمل چھپا نہیں سکی ہے یہاں تک کہ موجودہ حکومت اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین کو ہر جگہ اور مساوی طور پر نافذ کرنے کے قابل نہیں رہی ہے۔ موجودہ حکومت بحالی جمہوریت سے خوفزدہ رہنے کی وجہ سے خبروں کی اشاعت اور ترسیل کی آزادی ختم کر چکی ہے لیکن عوام نے موجودہ حکومت کے ہتھکنڈوں کو ناکام بنانے کے لئے اپنے طریقے ایجاد کر لئے ہیں۔ حکومت نے طاقت کا ہتھیار

استعمال کیا ہے لیکن عوام نے ثابت کر دکھایا ہے کہ طاقت ایک خاص عرصے کے بعد خود اپنا توڑ پیدا کر لیتی ہے۔ حکومت نے عوام کو اقتدار سے بیدخل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن نتیجہ خود حکومت کی بیدخلی اور علیحدگی کی صورت میں نکل چکا ہے۔ حکومت نے عوام کو بوسیدہ ماضی کے خوابوں پر قناعت کرنے کا سبق دیا ہے لیکن عوام ایک روشن مستقبل کے تصور پر نظریں جمانے پر بضد ہیں۔

چہروں کی تبدیلی بے کار ہے: حکومت اور رجعت پسند سیاسی جماعتیں ایک بار پھر چہروں کی تبدیلی کے ذریعے عوام کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہی ہیں۔ رجعت پسند سیاسی جماعتوں کا ایک مخصوص گروہ جمہوریت کے حامیوں کا بہروپ بھر کر عوام کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے تاکہ سماجی تبدیلی کو کچھ اور مدت کے لئے ٹالا جاسکے۔ حکمران طبقات عوام پر بھروسہ کرنے کی بجائے کسی نجات دہندہ کی ہذیانی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

عوام مارشل لاء اور اس کے حامیوں کی اس لائن کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں اور اس کے خلاف اس بات کی حمایت کرتے ہیں کہ وزیراعظم بھٹو، نذیر عباسی، حمید بلوچ، عنایت مسیح، گل شیر خان، لالہ اسد اور دیگر کئی ایک محبّ وطن اور جمہوریت پسندوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے والوں کو محبّ وطنوں کو پاکستان کے عوام کی راہ اپنانے کے جرم میں تشدد گاہوں میں پہنچانے والوں کو اپنے جرائم کا حساب دینا ہوگا۔ عوام کی راہ جمہوریت کی راہ ہے اور جمہوریت کا مطلب مزدوروں، کسانوں، عورتوں، طالب علموں، دانشوروں، محبّ وطن علماء اور محنت کش عوام کے دیگر حصوں کی حکومت کا قیام ہے۔ جمہوریت کا مطلب ابن الوقتوں اور مارشل لاء کے حلیفوں کے خاتمے کی جدوجہد ہے۔ دوسرے الفاظ میں عوام اب ضیاء ٹولے کے آلہ کار اور پاکستان قومی اتحاد کی 1977 کی نئی شکل سے فریب کھانے کو تیار نہیں ہیں۔ دراصل بحران ایک گانٹھ کی طرح ہوتا ہے اگر گانٹھ نہ کھلے تو اسے کاٹ دینا پڑتا ہے۔

پاکستان کے بحران کی گرہ کھولنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ آئین کے تحت انتخابات منعقد کرا کر اقتدار منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیا جائے اور یہ کام مستقبل کی پارلیمنٹ پر

چھوڑ دیا جائے کہ وہ قومی اور جمہوری حقوق کے اضافے کے ذریعے آئین کو زیادہ جامع بنائے اور عوام دشمن کالے قوانین کو نکال باہر کرے۔

فتح عوام کی ہوگی

اگر حکومت اس رائے کو تسلیم نہیں کرنا چاہتی تو پھر عوام اپنی جدوجہد کے ذریعے اس غیر آئینی حکومت کو ہٹا دیں گے۔ عوام لاقانونیت اور دہشت گردی کو ختم کر دیں گے جس کا ارتکاب قانون نافذ کرنے والے ادارے کر رہے ہیں۔ ملک میں حقیقی عوامی حکومت لائی جائے گی جو دوبارہ قومی وقار بحال کر کے آزاد سیاسی فضاء قائم کرے گی اور سامراج کے پٹھوؤں کا صفایا کرے گی اور اس طرح عام انتخابات کے ذریعے ایک سیاسی، آئینی اور جمہوری حکومت وجود میں لائی جائے گی جو کہ ملک کو ترقی اور فروغ کی شاہراہ پر لے جائے گی۔

حکمران طبقات کو معلوم ہونا چاہئے کہ سامراج انہیں خاتمے سے نہیں بچا سکتا۔ اس لئے کہ تاریخ اور دنیا بھر کے محنت کش عوام کے ساتھ ہیں۔

بدر جمال ابڑو

انصاف عبادت کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ کسی نتھو اور خیرو کو عدالت کی کرسی پر بٹھا دیجیئے میں اس کا احترام کروں گا۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ اس عدالت کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ نتھو اور خیرو ہیں۔ وہ اس منظّم قوت کے اراکین ہیں جسے اس بدحال اور شکستہ حال دھرتی کے عوام کے وقار اور آزادی کی حفاظت کی خاطر وجود دیا گیا۔ یہ ایک ناقابل وضاحت حقیقت ہے کہ اس کرسی پر بٹھائے ہوئے کسی بھی شخص میں انصاف اور ذمہ داری کا عجیب احساس سرایت کر جاتا ہے۔

بنیادی حقوق، بے حد بنیادی ہیں۔ وہ انسان کے فطری اور پیدائشی حقوق ہیں۔ بنیادی حقوق کا تصور امریکہ یا یورپ سے درآمد نہیں کیا گیا۔ انسان پیدا ہوا اور اسے بیان کی قوت حاصل ہے۔ بولنا اور خیالات کا پرچار کائناتی حق ہے جو پیدا ہوتے ہی حاصل ہوتا ہے۔ قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہے، کی حقیقت سقراط کی مہربانی نہیں اور علم کا قلم سے حاصل ہونا بھی حقیقت ہے۔ یہ کوئی جرم نہیں کہ ایسے آفاقی حق پر عمل کیا جائے جو انسان کو حاصل ہوا۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اگر میں شاعر، ادیب اور فنکار ہوں تو یہ میرے خون میں ہے۔ میرے والد کا شمار ملک کے اس حصّے میں چوٹی کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ میرے دادا علی خان ابڑو ایک غیر معمولی انسان، نامور تعلیم داں اور کئی کتابوں کے مصنف تھے اور عمر بھر مجاہد کی سی زندگی بسر کی۔ میں ایک ادبی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں مجبور ہوں اگر میں مصوری اور مجسموں کے ذریعے سماج میں موجود اذیت اور شکستہ حالی بیان کرتا ہوں اور مجسموں اور شاعری میں انسانی برابری کا پرچار کرتا ہوں۔ دولت سمیٹنے کی مذمت

صرف مارکس اور اینگلس نے ہی نہیں کی بلکہ یہ طاقتور الفاظ قرآن شریف سے آئے ہیں جو مذمت کرتے ہیں ارتکاز دولت کی اور جو اسے جمع کرتے اور گنتے ہیں۔ اگر چند ہاتھوں میں دولت کے ارتکاز کی مذمت کرنا جرم ہے تو پھر جایئے اور حضرات ابوذر غفاری کی نعش ان کی گمشدہ قبر سے کھود نکالیں اور ان کی گردن میں رسہ ڈال کر اس وقت لٹکائے رکھیئے جب تک ان کے بتائے ہوئے اصولوں کو موت نہیں آجاتی۔

میرے خیال میں زندگی، انسانی شکستہ حالی اور درد کے خلاف ایک لافانی جدوجہد ہے۔ میں ایسا ہی پرچار اپنے قلم، برش اور چھینی سے جاری رکھوں گا۔ یہ میرا پیدائشی حق ہے۔ آرٹسٹ اور شاعر ملک کا قیمتی سرمایا ہوتے ہیں۔ قلم کے ذریعہ سے علم کا پھیلاؤ کرنا ان کی آفاقی ذمہ داری ہے۔ دانشور کے قلم کی روشنائی شہید کے خون سے زیادہ مقدس ہوتی ہے۔ اس کی روایات، ثقافت اور سوچ کی طرف سے اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دولت کے چند ہاتھوں میں جمع ہونے اور اس کی گنتی اور بار بار گنتی کی مذمت کرے۔ اسے یہ ذمہ داری پوری کرنے سے روکنا قابل شرم جرم ہے۔ اسے اس میدان میں آزاد چھوڑ دینا مقدس اصول ہے اور یہ بات انسانیت اور پوری دنیا میں بسنے والے انسانوں کے حق میں ہے۔ قلم کے ذریعہ آزادی سے پرچار میں ترقی اور کامیابی کا راز پنہاں ہے۔ بجائے اس کے کہ میری ان کوششوں کو سراہا جاتا مجھے زنجیروں سے جکڑ لیا گیا اور غدار اور تخریب کار ہونے کا ٹھپہ لگا دیا ہے۔ یہ منافقت کی اعلیٰ ترین شکل ہے خاص طور پر ان کی طرف سے جو صبح اور شام اسلام کی روح کا ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں۔ کیا یہ اسلام ہے کہ کسی کو محض ایک ایسے سادہ کارڈ کی بنیاد پر سزا دی جائے جس میں ایک مجرم کو کوڑے لگتے ہوئے دکھایا گیا ہو۔ یہ تصویر ملک کے ہر اخبار میں نمایاں طور پر اور ہیرالڈ میگزین میں ٹائیٹل کے طور پر چھپ چکی ہے۔

جناب! شاعر ادیب اور فنکار فطرتاً اچھے لوگ، امن پسند اور قابل عزت شہری ہوتے ہیں۔ وہ آزادی میں امن کا جھنڈا اونچا رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو غدار اور تخریب کار کہنا بذات خود ایک تضاد ہے۔ وہ اپنے ملک اور لوگوں سے محبت کی وجہ سے مصوری کرتا اور گاتا ہے۔ ایسا نہیں ہو

سکتا میں پھر سے دہراتا ہوں، وہ اپنے لوگوں اور اور دھرتی کا غدار نہیں ہوسکتا۔

میں قلم ، برش اور چھینی کے ذریعے خدمت کی وجہ سے بہتر رویہ اور عزت کا مستحق تھا لیکن چند آگ بگولہ، نامعلوم اور سادہ کپڑوں میں ملبوس لوگ میرے دفتر میں طوفان کی طرح آئے۔ انہوں نے مجھے گرفتار نہیں درحقیقت اغوا کیا اور بدتمیزی سے پیش آئے۔ وہ مجھے ایک پرائیوٹ کار میں نامعلوم اور ویران جگہ کی طرف لے گئے۔ اسے قانون کی اصطلاح میں گرفتاری نہیں کہا جا سکتا۔ اگر یہ گرفتاری تھی تو میں حیران ہوں کہ مجھے میری گرفتاری کے اسباب کیوں نہیں بتائے گئے۔ چار سو سات دن کی اذیت ناک قید کے بعد مجھے بتایا گیا کہ مجھے تخریب کاری کے الزام کے تحت گرفتار کیا گیا ہے۔ اس وقت تک مجھے قید ہوئے دو سال سے زائد ہو چکے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کیا یہ ہے آپ کا اسلامی انصاف؟ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ سال بھی تخریب کاری کے زمرے میں جائے گا۔ میں کسی شکاری پرندے کے پچوں میں گھری فاقتہ کی مانند محسوس کر رہا ہوں اور مجھے میرے اپنے جسم پر اپنے ہی خون کے چھینٹے دکھا کر کہا جا رہا ہے کہ میں شکاری ہوں، جبکہ اصل شکاری کے خون سے تر پچوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے مجھے یہی کچھ حاصل ہوا ہے۔

امرتا پریتم کا خیال ہے کہ شاعر ققنسی پرندے کی طرح ہوتا ہے وہ پرندہ جو اپنے وجود سے موسیقی پیدا کرتا ہے حتیٰ کہ موسیقی سے آگ بھڑک اٹھتی ہے اور اس کا اپنا ہی وجود جل کر راکھ ہو جاتا ہے اور جب بارش ہوتی ہے تب اس راکھ سے دوبارہ جنم لیتا ہے جو پھر اپنے وجود سے موسیقی پیدا کرتا ہے اور پھر جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ شاعر بھی اسی طرح ہوتا ہے اور اپنے وجود کی بھینٹ دیتا ہے اور پھر ہر دور میں پیدا ہوتا رہتا ہے پھر سے اپنے وجود کی بھینٹ دینے کے لئے۔ یہ ایک تاریخی سچ ہے۔ شاعر کو پھانسی چڑھا دیجئے وہ پھر عیسٰی کی طرح واپس آ جائے گا اور زندہ رہے گا۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ تاریخ اسے اور مجھے بھی بے گناہ ثابت کرے گی۔ میں اپنے ضمیر کی عدالت میں کھڑا ہوں میرے ضمیر نے مجھے بری کر دیا ہے۔ آپ بھی ضمیر کی عدالت کو فیصلہ کرنے دیجئے۔ اس لئے کہ انصاف عبادت ہے۔

بحیثیت ایک فنکار میرا کام خیالات اور رنگوں سے حسن پیدا کرنا ہے۔ میرا وکیل ان

قانونی پیچیدگیوں کو سلجھائے گا جن کو میں نے بیان نہیں کیا۔ میں اپنا فرض پورا کر لیا ہے اب دوسروں کو ان کا فرض ادا کرنے دیجئے اور انہیں ''لو'' روشن کرنے دیجئے تا کہ ملک سے اندھیرا چھٹ جائے اور عوام کا شعور بلند ہو۔ آیئے کہ ہم اپنی چھوٹی سی ذمہ داری سادگی سے پوری کریں اور باقی وقت پر چھوڑ دیں۔ مجھے رابندر ناتھ ٹیگور کا وہ قول یاد آ رہا ہے جس میں ڈوبتا سورج حیران ہے کہ اس لئے بعد دنیا کا کیا ہوگا، اس کو کون روشن کرے گا اور تب ایک چھوٹی سی کٹیا میں ایک چھوٹا سا دیا ٹمٹما کر کہتا ہے ''میں اپنی پوری کوشش کروں گا''۔ آیئے کہ ہم سب مل کر روشنی کے لئے کوشش کریں اور ہر دل کو اس اندھیرے میں منور کر دیں جس نے ہمارے بدنصیب ملک کو گھیر لیا ہے ، جو درحقیقت ایک جنت ہے۔

اگر ان لوگوں کی نظر میں جو کہ یونیفارم میں ہیں فن کی کوئی معنی ہیں اور استاد کے وقار کی کوئی حیثیت ہے تو میں کچھ استاد جمع کرانا چاہوں گا۔

۔۔ٹیگور کے بعد مجھے اجازت دیجئے کہ میں خسرُو کا مسئلہ بیان کروں۔

خلق می گوید کہ خسرُو بت پرستی می کند

آر سا آر سا می کنم۔خلق مارا کار نیست

شاہد پھانسی پانے کا وہ مجھ سے پہلے حقدار ہے۔

سہیل سانگی

یہ ایک محض اتفاق تھا کہ میں روزگار کی تلاش میں کراچی آیا اور گرفتار ہو گیا۔ مجھے آج تک کوئی ایسی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ہے جس کے تحت میری گرفتاری ہوئی۔ شاید میرا زندگی کو پرکھنے کا زاویہ ان سے بہت مختلف تھا جنہوں نے مجھے گرفتار کیا، میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اسی زاویہ کی وضاحت کرنی چاہیے شاید یہاں پر اسی بات کی ضرورت ہے۔

دنیا ہر لمحے تبدیل ہو رہی ہے۔ دنیا کے رسم و رواج اپنی قدر تبدیل کر رہے ہیں۔ یہ تبدیلی کائنات کے ہر گوشے میں انسان کے رہن سہن، اس کے ماحول، خیالات اور خوابوں میں اُبھر رہی ہے۔ آج کی دنیا وہ نہیں رہی جو کہ غلامی کے دور میں تھی، جو کہ جاگیرداری نظام میں تھی۔ آج کی دنیا نوآبادیات کے حصول کے لئے دوسروں کی دھرتی پر قبضہ کر کے ان کا استحصال کرنے کی بھی نہیں رہی ہے، دنیا بہت آگے بڑھ چکی ہے آج جِنّوں، بھوتوں، پریوں اور شہزادوں کے کردار مر چکے ہیں اور عام آدمی کی نقل و حرکت اور اس کے مسائل ادیبوں کی تحریروں کا مرکز بن چکے ہیں۔ حکومتی نظام میں بادشاہتیں مٹی کے گھروندوں کی طرح مسمار ہو چکی ہیں اور وہ دن دور نہیں جب دنیا میں فقط چار بادشاہ تاش کے پتوں میں باقی بچے ہوئے ملیں گے۔ آج نوآبادیاتی نظام ختم ہو چکا ہے۔ آمروں کو ہر جگہ سے دھکیلا جا رہا ہے اور وہ بہاماز کے جزائر میں پناہ ڈھونڈنے پر مجبور ہیں، لوگ حکومت کے نظام میں روز بروز زیادہ شریک ہو رہے ہیں۔ آج کی دنیا امن، آزادی، خوشحالی اور جمہوریت کی دنیا ہے۔ یہ بیسویں صدی ہے اور بیسویں صدی عوام کی صدی ہے۔۔۔

انسان نے خود کو مجبوریوں کی بیڑیوں سے آزاد کرنے کے لئے ایک کٹھن اور لمبا سفر کیا ہے، وہ اپنی زندگی کو زیادہ آسان، بہتر اور پُرسکون بنانے کے لئے ازل سے جدوجہد کرتا آرہا ہے۔ انسان نے اس سفر کے آغاز میں پتھر کے دور میں نوکیلے پتھر سے شکار کر کے اور دشمن کو ڈنڈے کے استعمال سے دور رکھنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس سفر کو وہ آج بھی جاری رکھے ہوئے ہیں انسان کے استعمال کے آلات اور دشمن کی صورتوں میں تبدیلی ضرور آئی ہے لیکن انسان کی یہ جدوجہد آج بھی جاری ہے۔۔

کانٹوں بھری راہ پر چلتے ہوئے اس سفر میں انسان نے ایک وسیع علم، تجربہ اور شعور حاصل کیا۔ یہ تجربہ آلات بنانے اور ان کے استعمال سے لے کر باہمی رہن سہن کے طور طریقوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس سارے عمل میں وہ مختلف سماجی مراحل کی بھٹی سے پکتا ہوا گذرا تو اپنے استعمال میں آنے والی مختلف اشیاء کی تشکیل اور توڑ پھوڑ کے اس تجربے اور شعور کے بعد آج وہ اس فلسفہ پر پورے یقین کے ساتھ کھڑا ہے اور اس مقصد کے لئے ہر مورچے پر لڑائی لڑ رہا ہے کہ انسان کو تمام بیڑیوں سے آزاد ہونا چاہیے۔ اس کو اپنی پسند کا نظام قائم کرنے کا مکمل اختیار ملنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان جمہوریت کی بات کرتا ہے۔ انتخابات اور منتخب پارلیمنٹ پر زور دیتا ہے، انسانی فلاح و بہبود اور انسانی حقوق کی بات کرتا ہے۔ انسان کی بقا کے لئے کرۂ ارض کو جنگ کے آسیب سے بچانے کے لئے امن کی پری کے ساتھ عشق کر کے تحریک چلاتا ہے اور منصفانہ نظام اور سماجی مساوات کا مطالبہ کرتا ہے۔

میں سوچتا ہوں، یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ ہر آدمی سوچتا ہے۔ انسان کو جانور سے ممتاز کرنے کی خاصیت ہی اس کا ذہن ہے۔ انسان اپنے ماضی کے حاصل شدہ تجربات میں سوچتا ہے۔ یہ سوچنا ہی ہے جس نے انسان کو آج ترقی کی اس منزل پر پہنچایا ہے کہ وہ خلا سے خلاؤں کی طرف بڑھ رہا ہے، ان کو تسخیر کر رہا ہے۔ سوچ انسان کو اس کی مخالف خطرناک طاقتوں سے بچانے کے لئے راستے سمجھاتی ہے اور مدافعت اور بقاء کا ذریعہ بنتی ہے۔

انسان اپنی سوچ کو آلات، ہتھیاروں اور عمل میں تبدیل کر کے فطرت پر قابو پانے کی

جنگ لڑتا چلا آ رہا ہے لیکن جب اونچ نیچ کی طبقاتی تقسیم نہیں تھی تو یہ صرف فطرت پر قابو پانے پر ہی خرچ ہوتی تھی۔ سماج میں اس طبقاتی تقسیم کے بعد انسانی سوچ بھی طبقات میں بٹ گئی اور سوچیں بھی طبقاتی ہوگئیں جس کے بعد سوچ، فطرت کیخلاف جدوجہد کے برعکس مختلف ادوار میں مختلف طبقات کے مابین لڑائی پر خرچ ہونے لگی۔ دنیا کا ہر چھوٹا خواہ بڑا خیال اس طبقاتی جانبداری سے خالی نہیں ہے۔ ان میں سے ایک وہ سوچ رہی ہے جو کہ ابھرتی ہوئی نئی طاقتوں کی ہے جو کہ انسان کو ترقی اور مزید ترقی کی طرف لے جاتی ہے جبکہ دوسری وہ سوچ ہے جو اپنی مدت پوری کر چکی ہے اور اب انسان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے اور وہ ان نئے پیدا شدہ مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہو چکی ہے، وہ صورتحال کو جوں کا توں رکھنا چاہتی ہے لیکن تاریخ کا پہیہ ہمیشہ آگے کی طرف ہی گھومتا ہے۔

تمام نظریات، تاریخی قصے، جنگیں اور کہانیاں اور ادب اسی ایک محور کے گرد گھومتے ہیں۔ وہ سوچ کے دو بڑے دھاروں میں سے کسی ایک کی طرف دار ہیں اور دوسرے کے خلاف۔ موسیٰ سے لیکر مارکس تک میں نے یہی پڑھا ہے۔ پتھر کے دور کے انسان سے لیکر یونان کی غلامی کے دور کی جمہوریتوں میں، ہندوستان کے اشوکا کے دور میں اور آج بیسویں صدی میں بھی میں نے یہی کچھ دیکھا ہے۔ میں صحیح ہوں کیونکہ انسانی جدوجہد کا ایک ایک قدم، ہر ابھرتا ہوا اور نیا فلسفہ میری صداقت کے درست ہونے کے حق میں بولتا ہے۔ انسان کا صدیوں کا تجربہ میرے صحیح ہونے کی تصدیق ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی مجھے غلط سمجھتا ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میری کوئی غلطی نہیں ہے، لیکن اگر کوئی ضد کرتا ہے تو پھر وہ غلطی انسان کے اس علم اور تجربہ کی ہو سکتی ہے جو اس نے ہزاروں سال کی تکلیف دہ کاوشوں کے دوران حاصل کیا یا ان مقدس کتابوں کی ہے جو کہ ہر دور میں انسان کو صحیح راستے پر لانے کے لئے لکھی گئیں۔ میں انسان ہوں اس کے ساتھ صحافی بھی اور صحافی ہونے کے ساتھ انسانی تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم۔ میں ہر چیز کو اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھنے کا عادی ہوں، مجھے آج کئی ایسی چیزیں نظر آ رہی ہیں جو کہ کل نہیں تھیں اور جو کہ کل تھیں وہ اس سے پہلے روز نہیں تھیں لیکن جناب انسان کی حیثیت میں دس لاکھ سالوں

سے اپنے حقوق کا استحصال دیکھتا چلا آرہا ہوں، تاریخی پس منظر میں دیکھتے ہوئے مجھے اپنا وجود بقاء کی طرف جاتا ہوا نظر آرہا ہے۔ لیکن استحصال کی بدی کے آسیب کے خلاف انسان کے ذہن نے سماجی تشکیل کا نیا ہتھیار تیار کر دیا ہے۔ یہ ضرب کاری والا ہتھیار آسیب کی آنکھیں نکال چکا ہے، وہ مرنے والا ہے اور میں زندگی کی ضمانت پانے والا ہوں۔ انسانی تاریخ سے اخذ کئے گئے اعداد و شمار کی ترکیب سے جو جواب ملتا ہے وہ میں سب کے سامنے رکھتا ہوں لیکن اس جواب تلاش کرنے کے جرم میں مجھے بند کیا جاتا ہے، کیا اس سے زندگی کا کارواں اور سوچوں کا سلسلہ رک جاتا ہے؟ عقل کی ارتقا روکنے کے لئے ہر کتاب چاہے وہ قرآن مجید ہو یا داس کیپٹال کو کیوں نہیں ممنوعہ قرار دیا جاتا۔ یہ اسکول یہ درسگاہیں کیوں قائم ہیں؟ کیوں کُھلی رہنے دی جارہی ہیں جو کہ علم اور تجربہ کی بنیاد بنتی ہیں اور جہاں صدیوں کا حاصل شدہ تجربہ سکھایا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ کرنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ تاریخ کا پہیہ پیچھے کی طرف نہیں گھمایا جا سکتا۔ انسان کے علم اور تجربے کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ علم بوتل میں بند جنّ کی طرح باہر نکل چکا ہے لہٰذا اب کوششیں یہ کی جارہی ہیں کہ اس جنّ کو سست بنایا جا سکے یا اس کا رخ کسی اور طرف موڑا جا سکے۔ مطلب یہ کہ کسی بھی طرح انسانی علم اور تجربے کو مسخ کیا جائے تاکہ علم کی روشنی کم سے کم پھیلے، نئی سوچیں کم سے کم پیدا ہوں اور تبدیلیاں کم سے کم رونما ہوں۔

میں اس راہ کا مسافر ہوں جو انسان کی ترقی کی عظیم بلندیوں کی طرف جاتی ہے۔ راستے کا رخ اس منزل کی طرف ہے جس کا انسان ابد سے خواہش مند رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں آج خطرناک مجرموں کی طرح ہتھکڑیاں پہنے ہوئے کھڑا ہوں لیکن جناب سچ پر پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے، انسان کو سوچنے سے روکنا کسی کے بس میں نہیں ہے، آدمی کو سوچ سے بانجھ کرنا انسان کو بندر بنانے کی کوشش فضول ہے۔ آدمی زندہ ہے تو ضرور سوچے گا اور اگر مر گیا تو دوسرا آدمی سوچے گا۔ کسی کے جیل میں بند ہونے سے یا مر جانے سے یہ سلسلہ ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کائنات کا ابدی قانون ہے جو کہ صرف کائنات کے خاتمہ پر ہی ختم ہو سکتا ہے۔ چین کے ایک پُرانے اخبار کے دو سو ایڈیٹروں کو سزائے موت ملی لیکن ہر مرتبہ یہ اخبار نئے ایڈیٹروں کے تحت نکلتا رہا۔

میں صحافی ہوں۔صحافی اور ادیب دونوں ایک ہی قبیلے کے فرد ہیں۔دونوں علم، حسن اور سچائی کے متلاشی اور ان کو لوگوں تک پہنچانے والے اور لوگوں کی ترجمانی کرنے والے ہیں۔قلم کار ہمارے لئے خواب دیکھتا ہے، سپنے بنتا ہے، وہ ہمارے دکھوں اور خوشیوں کو الفاظ اور معنی پہناتا ہے۔وہ ہمیں اپنے آپ کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے اس طرح سے وہ نہ صرف زندگی گزارنے کے قابل بناتا ہے بلکہ سچائی اور خوبصورتی کو تلاش کر کے اس کی اصلاح بھی کرتا ہے۔صرف ایک ایسے ہی معاشرے میں تخلیق کار کو تخریب کار یا باغی کہا جاتا ہے جو حُسن اور سچائی کے خواب دیکھنے اور ان کے لئے جدوجہد کرنے سے خالی ہو اور یہ صلاحیت کھو چکا ہو۔ہم قلمکاروں کے دل عوام کے دلوں کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔

میں تھرپارکر کو کوہ مری نہیں کہتا وہاں پر سرسبز پہاڑوں کے بجائے ریت کے بڑے بڑے ٹیلے ہیں۔دریاؤں، ندیوں اور نالوں کے بجائے پانی کی خوفناک حد تک کمی ہے۔وہاں کے لوگ جھرنوں سے لطف اندوز ہونے کے بجائے آوارہ بادلوں کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور ایک ایک بوند کو امرت رس سمجھ کر محفوظ کرتے ہیں۔میں اپنے ملک کے لوگوں کی عظمت محسوس کر کے، ان کی فطرت سے جنگ کو قلم بند کرنا اپنا اہم ترین فریضہ سمجھتا ہوں' لیکن فطرت کی وحشت' قحط اور لاعلمی کو بیسویں صدی کے خلائی دور میں سراہا نہیں سکتا جناب۔۔۔

معروضیت صحافت کا بنیادی اصول ہے کیونکہ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ پیش کئے بغیر معاشرے کو سچائی کی طرف نہیں بڑھا سکتے' لیکن صحافی صرف کیمرہ نہیں ہے جو کہ کاغذی پھولوں کی تصویریں نکالنے کے لئے فوکس فٹ کئے جائیں اور بعد میں لوگوں کو اصلی ہونے کا دھوکہ دیا جائے۔صحافی کی آنکھ کیمرہ ضرور ہے لیکن اس کا دل انسانی ہے جس میں درد ہے احساس ہے۔اس کا ذہن ہے جو کہ سچ اور جھوٹ کا ہر لمحے حساب رکھتا ہے۔اس لئے صحافی کی کیمرہ (آنکھ) سسکتی ہوئی انسانیت کو ہی فوکس کرتی ہے۔

بھوک' بے روزگاری' جہالت اور بیماری میرے دل میں درد کی لہریں پیدا کر دیتی ہیں، میرا دل رو دیتا ہے اور میں تڑپ اٹھتا ہوں' ہر حساس آدمی کی طرح کیونکہ یہ درد اس سماج کا درد ہے

اور ہم جو رنگوں اور لفظوں سے تصویریں بناتے ہیں وہ خود بھی اسی سماج کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں، آنکھیں نکالنے اور منہ بنانے سے نہ یہ عکس مٹ سکے گا اور نہ ہی عکس بنانے کا عمل۔ کیونکہ یہ عکس سماج میں موجود ٹھوس حقیقت کا ہے۔ اندھیرے میں روشنی ہونے سے ضرور عکس بنیں گے۔ آنکھیں دکھانے سے یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی حساس فنکار یہ نکلی ہوئی آنکھیں اور بگڑا ہوا منہ بھی پینٹ کرلے اگر کوئی ان تصویروں سے اتنا ہی خوفزدہ ہے تو پھر اس عکس کو یعنی انسانی ادب، فن سوچ وفکر کو بہتر بنائے۔ اس میں تبدیلی فوری اور یقینی طور پر آنی چاہیے۔ اصل بُرائی اس نظام پر آنی چاہیئے۔۔

اصل بُرائی اس نظام میں ہے جس میں طبقاتی تقسیم ہے۔ جہالت اور اندھیرا ہے، بھوک اور بیروزگاری ہے۔ یہ کیسا عجیب نظام ہے جس میں دوا بیمار کے لئے نہیں بنتی' غلہ بھوکے کیلئے نہیں پیدا کیا جاتا' کپڑا ننگے کے لئے نہیں بنایا جاتا لیکن یہ سب کچھ صرف پیسہ جمع کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ تو جناب جب تک یہ اونچ نیچ (طبقاتی تفریق) بھوک اور بیروزگاری ہوگی تب تک یہ آواز اُٹھتی رہے گی، معاشرے کے ہر شعبے سے، کارخانے کی چمنیوں سے، ہتھوڑے اور درانتی سے۔ فنکار کے فن سے، صحافی کے قلم سے، شاعر کی کلا سے، سنگیت کار کے سُر سے، گویے کے ہونٹوں سے مطلب ہر جگہ سے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں پرانے اور حکمران نظریات کا ان لوگوں سے تحفظ کیا جاتا ہے جو سوالات پوچھتے ہیں اور مسائل پیش کرتے ہیں۔ یہ سوال جس طرح سے ادب میں ملتے ہیں اسی طرح فوری ادب یعنی صحافت میں بھی ملتے ہیں' ان سوالات کے جوابات ان لوگوں سے طلب کئے جاتے ہیں جو کہ اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

ممتاز امریکی ماہر اقتصادیات پال بران کتاب The political economy of growth میں لکھتے ہیں کہ سچ کا صرف اظہار ہی کافی نہیں ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کسی ایک مسئلے پر سچ کیا ہے۔ اس کا اظہار کیا جاتا ہے یا وہ کون سی وجویات ہیں جن کی وجہ سے ٹال مٹول کی جاتی ہے۔ حکمران ایسے سچ کی پشت پناہی کرتے ہیں اور اس کا اظہار بھی کرتے ہیں جو بے مقصد ہو۔ ایسا سچ اور اس کا اظہار صورتحال کو جوں کا توں (status QUO) رکھنے کے لئے نظریاتی

جواز فراہم کرتا ہے۔ اس کے برعکس با مقصد سچ وہ ہے جو آنے والے کل کی سماجی اور تاریخی وجوہات اور اس کے مختلف اجزاء کے مابین رابطہ تلاش کرتا ہے۔ ایسے سچ اور اس کے اظہار کو بے رحمی والے امتیاز اور سماجی بندھنوں سے ٹکر لینا پڑتا ہے۔ قلمکار کا کام مسائل کی شناخت اور ان کا تجزیہ ہوتا ہے تاکہ ایک معقول، انسان دوست اور بہتر نظام کے قیام کے لئے راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کیا جا سکے۔ اپنے اس عمل میں ایک دانشوران لوگوں کے نزدیک پریشان کرنے والا اور تکلیف دینے والا ہے جو ایک ہی صورتحال کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے سچ کے پرستاروں کو یا تو وتایو فقیر (شیخ چلی سے ملتا جلتا سندھ کا کردار) اور میٹا فزیکل کہہ کر نظر انداز کیا جاتا ہے یا ان کو باغی اور ناپسندیدہ شمار کیا جاتا ہے، ایسے حالات میں با مقصد سچ سے وابستگی اور بھی زیادہ ضروری ہو جاتی ہے۔

دانشور کی یہ ذمہ داری اور فریضہ ہے کہ وہ انسانی تاریخ کی سب سے اعلیٰ روایات یعنی انسانیت، عقل اور ترقی کو تباہ ہونے سے بچائے۔

بھٹائی نے کہا ہے۔ کاش میں اتنا دانش مند نہ ہوتا کیونکہ دانشمندوں کو ہی دکھ جھیلنے پڑتے ہیں۔ یہ دکھ وتایو فقیر کی طرح بھی تھے تو مخدوم بلاول شہید اور شاہ عنایت شہید کی طرح بھی۔ ہر دور میں ''روایتی سوچ'' پر سوالات کرنے والوں پر مظالم ڈھائے گئے ہیں، کبھی کسی کو جلاوطن کر کے تو کبھی جیل میں بند کر کے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ڈھلتی ہوئی شام اور اس کے سائے چاہے کتنے ہی بڑے اور خوفناک کیوں نہ ہوں ان کی زندگی چند لمحوں کی ہوتی ہے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ مجھے اس لئے پابند سلاسل کیا گیا ہے کہ میں سوچنا چھوڑ دوں، رنگ و خوشبو کی تمیز کھو بیٹھوں۔ ایسا کوئی بھی حساس اور باشعور آدمی نہیں کر سکتا۔ اور یہ سب کچھ میں بھی نہیں کر سکتا۔ قید خانے کی محدود اور گھٹی ہوئی دنیا میں جہاں محرومیاں بڑھ جاتی ہیں تو وہاں رنگ اور خوشبو کی طلب شدت اختیار کر جاتی ہے۔ شاید یہ اس لئے ہے کہ بقول پال بران کے میں انسانی تاریخ کی سب سے اعلیٰ روایات یعنی انسانیت، عقل اور ترقی کا وارث ہوں، نگہبان ہوں۔ میرا قلم حُسن کی تلاش میں سچائی کو اخذ کرنے اور انسانی ذات سے بھوک، بیروزگاری، جہالت اور بیماری

کے مشکل دن دور کرنے کے لئے کھردرے کاغذوں پر بھی چل سکتا ہے۔

سنسرشپ کے کئی طریقے ہوتے ہیں، ایک یہ کہ اخبارات کے بٹر پیپر پر قینچی چلائی جاتی ہے دوسرا وہ جو ''فزیکل سنسرشپ'' ہے۔ جس کے نتیجے میں آج میں اور کچھ دیگر صحافی جیلوں میں بند ہیں۔ شکر ہے کہ ہمارے یہاں ابھی تک لاطینی امریکہ کے بعض ممالک کی طرح بائیلا جیکل سنسرشپ کی نوبت نہیں آئی ہے جہاں ایک ملک میں تین سال کے مختصر عرصے میں ایک سو صحافی ''گم'' ہوگئے۔ یہ تمام قلمکار اس ''نئے پن'' کی تلاش میں اور اس ''نئے پن'' کو لوگوں تک پہنچانے کے جرم میں موت قبول کر بیٹھے۔ یہ ''نیا پن'' جو صحافی کے بے چین سوالوں، شاعر کے تخیل اور تحقیق میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ سوال پوچھنا تو تعلیم اور ترقی کی اصل روح ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی یہ سوال کر بیٹھے کہ ہم یہ ''نیا پن'' تو تلاش کرتے ہیں لیکن وہ لوگوں تک کیوں پہنچاتے ہیں۔! تو جناب میں علم کو امانت، سماجی میراث اور اثاثہ سمجھتا ہوں۔ یہ علم جو آج مجھ تک پہنچا ہے اس کو اور اس میں اضافے کرنے کے عمل میں کئی قیمتی زندگیوں کی قربانیاں شامل ہیں۔ اس لئے میں نے جو کچھ سیکھا ہے وہ مجھ پر قرض ہے جو لوٹا دیتا ہوں۔ میں شیخ ایاز کی بات سے متفق ہوں کہ ''اے انسان ذات! میں ابھی تک تمھارا مقروض ہوں، تمھاری اصل رقم تو دور کی بات ہے میں تو ابھی تک تمھارا سود بھی نہیں ادا کر پایا ہوں'' علم اور ارتقا کے تسلسل کی روشنی میں جو ایسا نہیں کرتا وہ بددیانت ہے اور میں بددیانت کہلوانا نہیں چاہتا تو جناب صحافت اسی ایمانداری کا نام ہے۔

ہم صحافی کوئی تفتیشی ادارے تو نہیں ہیں کہ ٹیبل اسٹوریز اور من گھڑت خبریں بنا ڈالیں۔ خبریں تو اس سماج میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ خبر وہ روشنی ہے جو جہالت کے اندھیرے کو دور کرتی ہے۔ صحافی خود، یہ واقعات رونما کرنے والا نہیں بلکہ بیان کرنے والا ہے اور ان کا پس منظر اور رجحان واضع کرکے بتانے والا ہے بغیر کسی ترمیم کے، بالکل ویسا ہی جیسے اس نے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اس طرح سے وہ سچ کو ریکارڈ کرتا ہے جو کہ آگے چل کر تاریخ بنتا ہے۔ جب روشنی (خبر) پر پابندی لگادی جاتی ہے تب وہاں افواہیں پروان چڑھتی ہیں۔ جب انسان کی

آنکھوں پر پٹیاں باندھی جاتی ہیں تب وہ یقین کر لیتا ہے کہ کوئی ایسی بات رونما ہو رہی ہے جو اس کے مفاد اور برداشت سے باہر ہے لیکن خبر کے اظہار اور خیالوں کے دھارے کو روکنے سے نقصان ہوتا ہے۔ وہ اس طرح سے کہ ذہنی بانجھ پن پیدا ہوتا ہے۔ سماج کا تمام توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے۔ کبھی کبھی ذہنی بھی۔

جناب! 1970ء کی دہائی میں ملائشیا کے جنگلات میں جاپانی فوج کا ایک سپاہی دیکھا گیا جس کو جنگ عظیم دوئم میں وہاں بھیجا گیا تھا۔ وہ جنگ ختم ہونے کے تیس سال بعد بھی لڑتا رہا اور جنگلوں میں چُھپا رہا۔ اس بچارے کو تیس سال کے طویل عرصے کے بعد بھی یہ خبر تک نہیں ہوئی کہ جنگ کب ختم ہو چکی ہے اور اس کے مادر وطن کی سرزمین کے دو شہر ناگاساکی اور ہیروشیما تباہ ہو چکے ہیں۔ جاپان ہتھیار ڈال چکا ہے۔ دنیا میں بے شمار تبدیلیاں اور انقلابات آ چکے ہیں، آپ اس کو پاگل پن کہیں یا ''بہادری'' لیکن نہیں میں اس کو کمیونیکیشن گیپ کہوں گا جو اچھے بھلے آدمی کو بھی پاگل بنا دیتا ہے۔

جناب! سچ بڑا مجرم ہے۔ سچ کہنے کی پاداش میں قید و بند کی مثالیں ہمارے برصغیر کا تازہ تاریخ میں بھی کم نہیں ہیں۔ آج میں کے ایم سی کمپلیکس میں ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوں ۔اسی شہر میں یہاں سے چند فرلانگ کے فاصلے پر تقریباً نصف صدی قبل برصغیر کا ممتاز صحافی مولانا محمد علی جوہر بھی خالق دینا ہال میں ملزم بن کر کھڑا تھا۔ ہمیں ایسے بے باک اور جری قلمکاروں پر فخر ہے جنہوں جبر و استبداد اور فریب کے آگے سر نہیں جھکایا۔ ہم پاکستانی اگر ان عظمتوں کے وارث ہیں تو پھر یہ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں کیوں ہیں۔ دنیا کے تمام عالموں کی یہ رائے ہے کہ سنسر شپ جرم چھپانے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ آپ ہمارے ملک کے اخبارات اٹھا کر دیکھیں ان میں چوریوں، ڈکیتیوں قتل اور اس طرح کے جرائم کی بہت خبریں ملیں گی۔ جب ان تمام جرائم کی خبریں چھپ رہی ہیں تو لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ آخر وہ کون سا جرم ہے جو چھپایا جا رہا ہے۔ اخبارات میں قتل، ڈکیتیوں کی خبروں کو ڈسپلے ملتا ہے۔ اس لاقانونیت کی وجہ وہ حالات ہیں وہ پالیسیاں ہیں۔ یہ جرم ان قوانین اور ضابطوں کا بھی ہے جس کے زیر اثر اخبارات میں مطلوبہ

خبروں اور تبصروں کی تعداد کم ہوگئی ہے۔ لوگوں کو تو اطلاعات اور معلومات کی پیاس بجھانے کیلئے لازماً کچھ نہ کچھ تو چاہیئے ہی اور جب یہ پیاس جرائم کی خبروں سے بجھائی جاتی ہے تو ایک طرف جرائم کا رجحان بڑھ جاتا ہے تو دوسری طرف لوگوں میں بے حسی اور لاتعلقی بڑھ جاتی ہے۔ اس وجہ سے لوگوں کو جرائم کی خبروں اور پیر پگارا کے مسخرہ پن کے ذریعے ایک ریلیف مہیا کیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہمارے معاشرے کے لئے زیادہ نقصان دہ ہے۔

میں کوئی سیاستدان تو نہیں ہوں لیکن جانور بھی نہیں ہوں بقول شیخ ایازؔ کے ''مجھے یوں نہ روندو کہ میں گھاس نہیں ہوں۔ گرچہ کمزور مگر بے جاں نہیں''

تو جناب میں انسان ہوں مجھے زندگی اور اس کے رنگوں اور تسلسل سے پیار ہے۔ مجھے میری بیوی، بچوں اور ان کے اردگرد رہنے والے دوسرے انسانوں سے پیار ہے، میں ان کو ایک اچھا مستقبل دینا چاہتا ہوں۔ دنیا کے ہر انسان کی طرح میں بھی چاہتا ہوں کہ میرے اور سب کے بچے وہ سب کچھ نہ جھیلیں جو میں نے بھگتا ہے۔ بس میری اتنی سی خواہش ہے۔ کیا میری اس خواہش میں کوئی تخریبی یا سازشی عمل ہے؟ کیا میری اس خواہش میں بھی کوئی سیاسی جرثومہ ہے۔ اگر یہ سب کچھ سازش اور تخریبی عمل ہے، سب کچھ سیاست ہے تو پھر سچ مُچ دنیا کا ہر آدمی سازشی ہے، ہر آدمی سیاست دان ہے۔

بھوک اور دکھ کے ابھرنے والے سوالات مجھے پریشان کر دیتے ہیں۔ مجھے بے چین کر دیتے ہیں اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ ان مسائل اور سوالات کی نوعیت انفرادی نہیں ہے کہ ان کا حل بھی انفرادی ہو۔ یہ خود سماج کے اجتماعی سوالات ہیں۔ ان کی نئے سرے سے تشکیل مشترکہ (اجتماعی) جدوجہد کی متقاضی ہے۔ ایسی بحرانی صورتحال میں کسی بھی شخص کے لئے صرف تین راستے ہوتے ہیں (۱) یا تو وہ حالات کے آگے گھٹنے ٹیک دے اور ان سے سمجھوتہ کر کے انسان ذات کی ترقی اور تسلسل سے انحراف کر کے پوری انسانیت کا مجرم بن جائے (۲) یا ذہنی طور پر توازن کھو بیٹھے (۳) یا وہ انقلابی بن جائے۔

میں روشنی اور خوشحالی کے خواب دیکھنے والا، تعمیر کے لئے جو بھی اینٹ رکھتا ہوں تو اس

کو تخریبی سرگرمی کیوں کہا جاتا ہے۔ اگر خواب دیکھنا وہ بھی خوشحالی کے، تخریبی عمل ہے تو دنیا کا سب سے بڑا تخلیق کار سب سے بڑا تخریب کار ہے۔ ہر انسان بھی تخریب کار ہے اور میں؟ میں تو ایک چھوٹی سی چیز ہوں ۔ فقط خوابوں کی تعبیر نکالنے والا۔ کہیں میں نے پڑھا تھا کہ جسٹس کیانی مرحوم کے پاس ایک مقدمہ آیا۔ انگریز کا دور تھا، ماتحت عدالت نے ایک نوجوان کو اس لئے سات سال قید بامشقت کی سزا سنائی تھی کہ اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ آزادی گھوڑے پر چڑھ کر آ رہی ہے۔ جسٹس کیانی نے ملزم کو بری کر دیا اور فیصلے میں لکھا کہ آزادی گھوڑے پر چڑھے یا بیل پر آئے یا پیدل آئے، خواب دیکھنا کسی بھی قانون میں جرم نہیں ہے۔

مجھے اس مقدمے میں کیسے اور کیونکر شامل کیا گیا ہے؟ کبھی کبھی میں اپنے بند سیل میں اس امر پر سوچتا ہوں ۔ پھر کتنے ہی سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔ کیا اس لئے کہ میں پڑھا لکھا ہوں؟ کیا اس لئے کہ میں صحافی ہوں؟ اس وقت یہ بھی خیال آتا ہے کہ شاید اس عدالت کے اراکین کے ذہن میں بھی یہ سوالات اٹھتے ہوں گے۔

میری تفتیش کار نے مجھ سے بعض بہت ہی دلچسپ قسم کے سوالات کئے۔ پوچھا کہ ''میں صحافی کیوں ہوں'' میں نے بتایا کہ صحافت کیا چیز ہوتی ہے اور اس کے کیا لوازمات ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اگر مجھ سے یہ پوچھ بیٹھتا کہ میں جام ساقی کا چچازاد بھائی کیوں ہوں تو اس کے اس سوال کا میرے پاس واقعی کوئی بھی جواب نہیں تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ جام ساقی کا چچازاد بھائی ہونا بھی جرم ہے کہ نہیں؟ لیکن اس کا اندازہ مجھے تفتیش اور اس مقدمے میں ملوث کرنے سے ہو رہا ہے۔

ہم صحافی اور ادیب نفرتوں اور زیادتیوں کی نشاندہی کرتے ہیں جو کہ انسان کو مکمل انسان بنانے کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ شاعر، ادیب اور صحافی صرف امن اور اہنسا کے پیغمبر ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ۔ سرکار خواہ مجھ پر کتنے اور کیسے ہی الزام کیوں نہ لگائے لیکن سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ میں سوچوں کی تضاد کے جرم میں بند ہوں، جھوٹ کی نگاہ میں اخلاقی قیدی اور سرکار کے پاس سیاسی قیدی لیکن مجھ سے پوچھو تو میں ضمیر کا قیدی ہوں۔

استغاثہ کا کہنا ہے کہ میں نے اگر کوئی جرم نہیں کیا ہے تو مدد ضرور کی ہوگی۔ ایک پرانی کہاوت ہے کہ 'تم اس لئے غلط ہو کیونکہ میں ایسا کہتا ہوں''۔ اس موقع پر مجھے ایک دلچسپ قصہ یاد آ رہا ہے۔ ایک شخص کو حکومت پکڑ کر پھانسی کے تختے پر لے آئی۔ اس بچارے نے منت سماجت کی کہ مجھے یہ تو بتایا جائے کہ میرا جرم کیا ہے؟ سرکار نے اس سے پوچھا کہ کیا سرکار کو یہ اختیار ہے کہ وہ تم کو پھانسی لگا دے'' اس غریب نے کہا ''ہاں اختیار تو ہے''۔ اس پر سرکار نے کہا کہ ''سرکار اسی بات کا تمام عمر انتظار کرتی رہے کہ تم کب جرم کرو اور تب جا کے تم کو پھانسی دی جائے'' تو جناب مجھ پر عائد کئے گئے الزامات ایسے ہیں جن کی حقیقت کو آج تک نہ میں سمجھ سکا ہوں نہ کوئی اور۔۔

کسی بھی استغاثہ کے گواہ نے میرے خلاف کچھ بھی نہیں کہا ہے سوائے اس بات کے کہ مجھے گرفتار کیا گیا' میری گرفتاری تو ایک حقیقت ہے۔ آج تقریباً ڈھائی سال ہو گئے ہیں کہ میں جیل میں ہوں۔ کیا جرم ثابت کرنے کے لئے گرفتاری ہی کافی ہے۔ استغاثہ کے گواہوں کے بیانات اس سے زیادہ میرے خلاف کچھ بھی نہیں بتاتے۔ اس مسئلے پر میرا وکیل تفصیلی بحث کرے گا لیکن میں بعض حقائق عدالت کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میرے خلاف استغاثہ کے جو گواہ بنائے گئے ہیں ان بچاروں نے مجھے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عدالت کے باہر والے کمرے میں چار مرتبہ شناخت کرانے کے باوجود وہ عدالت کے اندر مجھے نہیں پہچان سکے۔

مجھ سے جو سامان مبینہ طور پر برآمد دکھایا گیا ہے وہ نہ تو تخریبی ہے اور نہ ہی وہ چیزیں مجھے کسی طور پر اس مقدمے میں ملوث کرتی ہیں۔ میں ایک بات جانتا ہوں کہ ایسے مقدمات جو سوچوں اور نظریات کی بنیاد پر چلائے جاتے ہیں ان میں ملزموں کو عدالتیں تو شاید ہی آزاد کر سکتی ہیں لیکن تاریخ انہیں کبھی بھی نہیں بھولتی۔ فراز حقیقت کا اظہار کچھ اس طرح سے کرتا ہے۔

آج ہم دار کھینچے گئے جن باتوں پر
کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں

میں مطمئن ہوں کہ میں نے انسانیت کی اعلیٰ روایات پر دھبہ آنے نہیں دیا بلکہ میں نے ان کو برقرار رکھا اور اجاگر کیا۔ آدمی سب سے زیادہ مطمئن اپنے ضمیر اور آنے والی نسل کے

لئے چھوڑی ہوئی میراث پر ہوتا ہے۔ میرا ضمیر صاف ہے اور میں میری آنے والے نسل کے لئے اعلی روایات چھوڑ رہا ہوں۔

میں مطمئن ہوں کہ میں نے اپنی چھوٹی سی بچی زیب کو انسانیت، اس کی اعلیٰ اقدار، انسانی ہمدردی اور جرات کی جو کہانیاں سنائی تھیں اس پہ قائم ہوں۔ میں نے اپنی آنے والی نسل کے ساتھ منافقت نہیں کی ہے۔ غداری نہیں کی ہے۔ زندگی اور قید کوئی معنی نہیں رکھتے۔

میں مطمئن ہوں کہ آج میں تاریخ کے طلبا کیلئے زیادہ نہ سہی لیکن بہتر روایت کو ایک قدم آگے بڑھا رہا ہوں۔ ہمیں بہتری کی ہی توقع رکھنی چاہیے۔ وہ یہ کہ آیئے اور یہ دیکھیں کہ ہم سب میں سے کون کتنا وقت اور تاریخ کے تقاضوں پر پورا اترتا ہے۔

سہیل سانگی

کے ایم سی کمپلیکس کراچی

9۔جنوری 1983ء

الزامات

(1) مختلف طبقات اور مذہبی فرقوں کے درمیان نفرت پھیلانا MLR۔4

(2) عوام میں مسلح افواج کے خلاف منافرت پھیلانا۔ MLR ۔13

(3) نظریہ پاکستان اور ان مقاصد جن کے لئے مارشل لا لگایا گیا ہے کے خلاف کام کرنا۔MLR-18

(4)ان کاموں میں مدد دینا پشت پناہی کرنا۔MLR 36

(5)سازش اور بغاوت P.P.C 124-A Read with 149

احمد کمال وارثی

لکھتے رہے جنوں کی حکایت خونچکاں
ہر چند کہ ہاتھ ہمارے قلم ہوئے (غالب)

میں عدالت کی توجہ بنیادی حقائق کی طرف مبذول کرانا چاہوں گا جو کہ میری اور میرے ساتھیوں کی گرفتاری اور ایک ساتھی (نذیر عباسی) کی شہادت اور اس مقدمہ کے قائم کرنے کا موجب بنے۔

میری گرفتاری کے سولہ ماہ بعد آپ کی حکومت اس بات کی اہل ہوسکی ہے کہ وہ میرے اور میرے ساتھیوں کے خلاف یہ مقدمہ صرف اور صرف فوجی عدالت میں پیش کر سکے۔ اس موقع پر مجھے ملک کے ایک نامور قانون دان جسٹس کیانی کا ایک قول یاد آ رہا ہے کہ ''اگر کسی کے خلاف کوئی الزام نہ ہو تو اس کا فوجی عدالت میں چالان کر دو''۔

جناب والا! ہم کسی فوجی عدالت کو عدلیہ کا جز نہیں مانتے کیونکہ اس کے فیصلوں کو کسی بھی اعلیٰ عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل مارشل لاء عدالتیں انصاف کے تقاضوں کی تکمیل کا ذریعہ نہیں بلکہ مارشل لاء کو برقرار رکھنے کا ادارہ ہیں۔

جناب! کیا یہ حقیقت نہیں کہ جو مارشل لاء حکام مقدمہ بناتے ہیں. وہی ان مارشل لاء عدالتوں کی بھی تشکیل کرتے ہیں۔ جو ان مقدمات کی سماعت کرتی ہیں؟ اور کیا یہ حقیقت نہیں کہ منصف ہونے

کے دعویدار مارشل لأ عدالتوں کے سربراہ اور اراکین دراصل مقدمہ کی سماعت سے قبل ہی مقدمہ سے متعلق اپنی رائے بنا چکے ہوتے ہیں؟

دور کیوں جایئے، اسی عدالت کو لیجیئے جو ہمارے مقدمہ کی سماعت کر رہی ہے اور جس کی جانب داری کا اظہار ہمارے مقدمہ کی سماعت کے دوران جا بجا ہوا ہے۔ اپنے کمزور، بے تکے اور بے جوڑ واقعاتی و دستاویزی شواہد کی وجہ سے جب استغاثہ اس مقدمہ میں شامل میرے تمام ساتھیوں (جو کہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں) کے مابین کوئی تعلق ثابت نہ کر سکا تو گویا پھر یہ فریضہ عدالت نے اپنے سر لیا کہ وہ اس مقدمہ میں شامل افراد کے مابین کوئی نہ کوئی تعلق اور ربط ضرور تلاش کرے اور یوں استغاثہ کی خدمت کرے۔ اس مقصد کے لئے عدالت نے نہایت منصوبہ بندی سے مقدمہ کے پانچ اہم گواہان مجسٹریٹ سرور خاں، مجسٹریٹ محمد حنیف، انسپکٹر شفیع سومرو، انسپکٹر خلیل باجوہ اور ڈی ایس پی ممتاز برنی سے بالترتیب تین، دو، دس، آٹھ اور اکتالیس سوالات جس قسم اور جس انداز سے کئے جس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عدالت ہمارے ساتھیوں کے درمیان ربط اور تعلق ثابت کرنے پر تلی بیٹھی تھی اور گواہان کو اپنی پسند کے جوابات دینے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس مقصد کے لئے عدالت نے دو اہم گواہان انسپکٹر شفیع سومرو اور ڈی ایس پی ممتاز برنی سے پانچ ایسی دستاویزات بھی طلب کر لیں جن کا انہوں نے اپنی شہادت میں ذکر تک نہیں کیا تھا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے خلاف تفتیشی افسران نے اس مقدمہ کے سلسلہ میں چونکہ کوئی بھی مطلوبہ قانونی کارروائی مکمل نہیں کی تھی اسی لئے اس قانونی نقطہ نظر سے ہمارے خلاف یہ مقدمہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ ہمارے خلاف جن بے چارے پولیس والوں کو گواہ بنا کر پیش کیا گیا .انہوں نے نہ تو ہمیں گرفتار کیا تھا، نہ وہ گرفتاری اور خانہ تلاشی کے دوران موجود تھے اور نہ ہی کوئی تفتیش کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جھوٹے گواہ ہمیں شناخت کرنے میں قطعاً ناکام رہے حالانکہ عدالت میں کئی بار چوری چھپے ہماری شناخت کروائی گئی۔ ایس ایچ او صفدر بھٹی نے جو مقدمہ کے تیسرے مرحلہ کا تفتیشی افسر بتایا جاتا ہے، جرح کے دوران عدالت میں یہ بات تسلیم کی کہ تفتیش کا اختیار

دیتے وقت ملزمان، مبینہ برآمد شدہ سامان ولٹریچر اور اُس وقت کے کیس ڈائری ان کی تحویل میں دینے کے بجائے ملزمان کی گرفتاری اور مبینہ برآمد شدہ سامان اور لٹریچر کی برآمدگی کے محض مشیر نامہ ہی دیئے گئے تھے۔ صفدر بھٹی نے بڑی صداقت کے ساتھ عدالت میں یہ بات تسلیم کی کہ سمری آف ایوڈینس کے دوران اس نے ہم لوگوں کو پہلی بار دیکھا تھا اور یہ کہ اس وقت ایک سب انسپکٹر زبیر کی محض نشاندہی پر اس نے ہماری شناخت کی تھی۔

جناب والا. استغاثہ کے ایک اور اہم گواہ ڈی ایس پی ممتاز برنی نے جو مقدمہ کی تفتیش کے تیسرے مرحلہ کا تفتیشی افسر بتایا جاتا ہے عدالت کے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ ''میں یہ بات ریکارڈ دیکھ کر ہی بتا سکتا ہوں کہ ہمارے ملک میں کمیونزم کی تشہیر پر کوئی پابندی تو نہیں'' بے چارہ تفتیشی افسر! تفتیش تو کر لی اور کمیونزم کی تشہیر کے جرم پر مبنی چارج شیٹ بنا کر دستخط تو کر دیئے، لیکن یہ نہیں معلوم کیا کہ کمیونزم کی تشہیر پر پابندی ہے کہ نہیں؟ اسی بے چارے ڈی ایس پی کو نظریہ پاکستان کی وضاحت کرنے کے لئے ایک ایسی کتاب کا سہارا لینا پڑا جو ہمارے مقدمہ شروع ہونے کے بھی چار ماہ بعد شائع ہوئی ہے۔ (یہ بھی الگ بحث ہے کہ یہ کتاب کس حد تک قانونی لحاظ سے مستند ہے) نہ جانے ممتاز برنی اس مقدمے کی تفتیش اور چالان کی تیاری کے لئے ایسی کتنی ہی کتابوں سے استفادہ کر چکے ہیں جو ابھی شائع ہی نہیں ہوئیں۔ (اور کون جانے منصفوں کے ذہنوں میں بھی ایسی ہی کتنی غیر شائع شدہ کتابیں ٹھنسی ہوئی ہوں) ممتاز برنی نے پابندی سے متعلق سندھ کے ہوم سیکرٹری کا جو خط پیش کیا ہے وہ ہماری مبینہ کیس پراپرٹی میں شامل نہیں۔

یہ بات بھی کم مضحکہ خیز نہیں کہ ایک موقع پر کامریڈ جام ساقی کے ایک اعتراض کو عدالت درست مانتی ہے لیکن ایک دوسرے موقعہ پر ان کے ایسے ہی اعتراض کو مسترد کر دیتی ہے۔ (ملاحظہ کریں سرکاری گواہ برنی پر جرح کے سلسلہ میں کیا گیا سوال نمبر پندرہ بتاریخ 6 دسمبر اور 13 دسمبر 1982) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدالت کا رویہ استغاثہ کے حق میں محض جانبدار ہونے کی بنا پر متضاد ہے۔

مارشل لاء عدالتوں کے انصاف پرست ہونے کا ذکر کرتے ہوئے مجھے اس مقدمہ میں ملوث ایک دوست کی بات یاد آرہی ہے جسے تشدد گاہ میں پوچھ گچھ کے دوران تفتیش کرنے والے ایک فوجی افسر نے بتایا تھا کہ آپ لوگوں کی سزا کا تعین کوئی عدالت نہیں بلکہ صرف ہم (تفتیش کرنے والے افسران) کریں گے۔ انہوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ'' میاں یہ تارا مسیح کا دور ہے''۔ اگرچہ ہم نے اب تک قبل از مسیح اور بعد از مسیح کے ادوار کے بارے میں سُنا اور پڑھا ہے۔ تاہم تفتیش کرنے والے فوجی افسر نے موجودہ دور کو تارا مسیح کا دور کہہ کر کچھ غلط نہیں کہا۔ واقعی آپ کی حکومت کا دور تارا مسیح کا دور ہے۔ جب ہی تو آپ کی حکومت نے لوگوں کو پھانسیاں دینے میں نہ صرف پچھلی حکومتوں کے ریکارڈ توڑ دیئے بلکہ اتنا آگے بڑھ چکے ہیں کہ آئندہ کی کوئی حکومت بھی اس میدان میں شائد ہی آپ کی ہمسری کر سکے۔

جناب والا! استغاثہ کے گواہان کے مابین تضادات کا اندازہ سب انسپکٹر اسلم نور اس کی ٹیم اور مجسٹریٹ لغاری کی شہادتوں سے مزید واضح ہوجاتا ہے جنہوں نے یہ حقیقت تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے کہ پیپلز کالونی اور پاکستان کوارٹرز پر چھاپہ مارتے وقت فوجی افسران اور اُن کا عملہ بھی ساتھ تھا۔ جب کہ صفدر بھٹی ایس ایچ او (سرکاری گواہ) نے اپنی شہادت میں ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے یہ انکشاف کیا کہ اِن مقامات پر انٹر سروسز انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل کی ایک جماعت نے چھاپہ مارا تھا۔ ایسی مزید بیسیوں مثالیں ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ استغاثہ کے گواہان کی شہادتوں میں کتنے تضادات ہیں۔ یہ تضادات محض اس وجہ سے ہیں کہ ہم پر عائد شدہ تمام الزامات نہ صرف یکسر بے بنیاد اور من گھڑت ہیں بلکہ بدنیتی پر مبنی ہیں۔ یہ الزامات محض ہمارے خلاف نہیں بلکہ اس ملک کی تمام عوام کے خلاف گھناؤنی سازش کا حصہّ ہیں۔

جناب والا! اس مقدمہ میں کارفرما بنیادی سوال ملک کی ترقی اور خوشحالی کا ہے۔ میں اس ملک کی ترقی اور خوشحالی چاہتا ہوں جس کی راہ میں استحصالی طبقات کے مفادات حائل ہیں۔ میں اس ملک کی اکثریت یعنی محنت کش اور غریب عوام کی خوشحالی اور ترقی چاہتا ہوں جب کہ آپ کی حکومت کو مٹھی بھر جاگیرداروں اور اجارہ داروں کے مفادات عزیز ہیں۔ میں ساری دنیا کے

مزدوروں اور محنت کشوں کے اتحاد کا علمبردار ہوں جبکہ آپ کی حکومت استحصالی طبقات کے عالمی سرغنہ امریکی سامراج کا اڈہ بنا کر اسے غلامی میں دھکیل چکی ہے۔ میں دنیا بھر میں امن کا خواہاں ہوں جب کہ آپ کی حکومت جنگی جنون میں مبتلا ہے۔ دراصل آپ کی حکومت اور میرے درمیان سماج کے نشوونما کے سوال پر بنیادی تضاد ہے، جب ہی تو آپ کی حکومت اور میرے درمیان جنگ جاری ہے۔

جناب والا! آپ کی حکومت میری مخالف اس لئے ہے کہ میں محنت کش عوام کی سیاست کرتا ہوں۔ میں اس ملک کا محبّ وطن شہری ہوں۔ میں نہ صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس ملک کی ترقی ہو بلکہ اس کے لئے عملی طور پر کوشاں ہوں کہ یہاں کے محنت کش عوام کو مصائب سے چھٹکارا ملے اور حقیقی معنوں میں خوشحالی آئے۔ میری یہ کوشش اور سوچ نہ صرف آج کے نوجوانوں کی سوچ ہے بلکہ یہ اس ملک کے ساڑھے آٹھ کروڑ عوام کی امنگوں اور خواہشات کی ترجمان ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ملک کے مستقبل اور عوام کی خوشحالی کا راز ایک ایسے معاشرے میں مضمر ہے جہاں پر کسی طرح کا استحصال نہ ہو۔ تاریخ نے یہ بات طے کردی ہے کہ ایسا معاشرہ مزدور طبقہ اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر ہی تشکیل دے سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ میرے جیسے کئی نوجوان اور عوام کا وہ حصہ جو حقیقی جمہوریت چاہتا ہے اور استحصال سے چھٹکارا چاہتا ہے روز بروز محنت کشوں کی طرف کھنچا چلا آرہا ہے۔ میری ہر سوچ اور عمل عوام دوست ہے اور ترقی کی جانب آگے بڑھا ہوا ایک قدم ہے جو ملک میں خوشحالی اور سلامتی کی ضامن ہے۔

مجھ پر الزام ہے کہ میں تخریب کار ہوں۔

اس الزام کی مضحکہ خیزی اس سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ الزام اس ٹولے کی جانب سے لگایا جارہا ہے جس نے نصف سے زیادہ ملک کو اپنے اقتدار کی ہوس اور سامراجی خواہشات کی بھینٹ چڑھایا۔ میں ایک ایسے طبقے کا نمائندہ ہوں جو تخلیق کار اور محنت کش ہے اور محنت کا ادارہ کارخانہ یا مل ہوتا ہے جو پیداوار دیتا ہے۔

جناب کسی طبقے، آبادی یا گروہ کے مفادات کا تعین اس کی معاشی یا پیداواری سرگرمی

سے ہوتا ہے جس کے مطابق اس کا مزاج بنتا ہے۔ مزدور اور کسان دولت پیدا کرتے ہیں اور دوسرے تمام طبقات اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ یہ مزدور کی تخلیق اور پیداوار ہی ہے کہ جس کی بدولت ملکوں کی ترقی اور خوشحالی ہوتی ہے۔ آج آپ سوویت یونین، امریکہ اور جاپان کی جو ترقی دیکھ رہے ہیں وہ سب وہاں کے مزدوروں کی پیداواری اور تخلیقی صلاحیتوں کا نتیجہ ہے۔ کوئی بھی روپیہ، پیسہ، سرمایہ یا خام مال تب تک مٹی کا ڈھیر ہے جب تک انسانی محنت اسے جلا نہ بخشے۔

جناب! ہم ملک کی ترقی چاہتے ہیں جب کہ آپ کی حکومت ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ چونکہ آپ کی حکومت ترقی کی مخالف ہے اس لیے ایسی تمام قوتوں کی مخالف ہے جو ترقی چاہتی ہیں۔ غیر یقینی اور غیر مستحکم سیاسی حالات کی وجہ سے نجی سرمایہ کاری کی شرح صفر کے برابر ہوگئی ہے۔ نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی ملکی معیشت کو عالمی سامراجی حکمتِ عملی کے تابع کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے زرعی شعبے میں فرسودہ آلات پیداوار کے تسلسل کے ذریعہ جاگیرداروں کی گرفت کی مضبوطی اور خام مال و افرادی قوت کی بے دریغ برآمد جاری ہے۔ اسی حکمتِ عملی کے تحت ملک کی معاشی پالیسی ایسی بنائی گئی ہے جس میں صرف بڑے سرمایہ دار کا ہی گزر ہو سکتا ہے۔ نجی سرمایہ کاری کی کمی اور پبلک سیکٹر میں نئ صنعت کا اضافہ نہ ہونے، پبلک سیکٹر کو تقویت دینے کے بجائے سامراجی سرمایہ کار کو کُھلی چھوٹ دینے، قومیائی گئ صنعتوں کی واپسی اور پبلک سیکٹر میں رفتہ رفتہ ریٹائرڈ فوجی افسروں کو بطور سربراہ مقرر کرنے کی وجہ سے ملک کی معاشی ترقی رُک گئی ہے جس سے بے روزگاری سے تنگ آکر ہمارے مزدور بیرون ملک جاتے ہیں۔ 1979 تک صرف مشرق وسطےٰ میں یہ تعداد بارہ لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی جو ملک کی کل لیبر فورس کا بیس فیصد بنتی ہے۔ لیکن ابھی کچھ عرصہ سے مزدوروں کی بیرون ملک روانگی میں کمی آئی ہے جس کے نتیجہ میں بے روزگاری میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ پہلے اِن کی بیرون ملک آمدنی سے افراطِ زر میں اضافہ ہوتا تھا اب زرِمبادلہ کی کمی کی وجہ سے ادائیگیوں کے توازن میں مزید خسارہ ہو رہا ہے۔

ایک طرف بے روزگاری کا یہ عالم ہے اور دوسری طرف اشیائے صرف کی قیمتوں میں

روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔اس بات کا اعتراف خود اسٹیٹ بنک کی تازہ ترین سالانہ رپورٹ میں بھی کیا گیا ہے۔ایک سروے کے مطابق آٹے ،شکر اور گھی کی قیمتوں میں گزشتہ تین سال میں دُگنا اضافہ ہوا ہے۔جناب اگر یہ صنعتیں نجی ملکیت میں ہوتیں تو شاید کوئی اور جواز ہوتا لیکن پبلک سیکٹر میں ہونے کی وجہ سے اِس سے آپ کی حکومت کو بری الزمہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ضیاء ٹولہ کی عوام دشمن حکومت ہی ہے کہ جس نے قومیائی ہوئی صنعتوں کو سول اور فوجی نوکر شاہی کے حوالے کیا تا کہ عوام دشمن قوتیں مضبوط ہوسکیں۔اس طرح پبلک سیکٹر میں لگی ہوئی صنعتیں ابتری اور بدانتظامی کا شکار ہو گئیں۔جمہوری اداروں کی عدم موجودگی کی بناء پر آپ کی حکومت پبلک سیکٹر کو عوام کے مفاد میں لانے کے بجائے عوام کا خون چوسنے کے لئے استعمال کرتی ہے اور یوں مختلف ممنوعات کی قیمتیں ان کی پیداواری لاگت کے بجائے نفع خوری کی بنیاد پر طے ہورہی ہیں۔سیمنٹ ہی کی مثال لے لیجئے۔سیمنٹ کی ہر بوری پر حکومت ٹیکس کے بہانے چھبیس روپے فی بوری لے لیتی ہے ۔یہ سب کچھ آپ کی حکومت کی سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ ہے جس کا مقصد سامراجی معیشت کو گل کھلانے کا موقع فراہم کرنا اور پیداواری ذرائع پر قومی کنٹرول کے خلاف رائے عامہ کو گمراہ کرنا ہے۔

ہم مہنگائی کے خلاف ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ مزدوروں اور دیگر ملازمین کی تنخواہ کم از کم ایک تولہ سونے کے برابر کی جائے ،تا کہ رشوت کی لعنت ختم ہو سکے۔اشیائے صرف کی قیمتوں اور تنخواہوں میں جو تناسب ہے وہ بھی بہت خوفناک حقائق کو سامنے لاتا ہے۔قیمتیں بڑھ رہی ہیں اور تنخواہیں گھٹ رہی ہیں۔

فوجی جنتا کی حکومت نے ملکی سرمایہ کاری کے دروازے بند کرنے کے بعد اب امریکی سرمایہ کاری کو دعوت دی ہے کہ وہ معیشت میں سہارا دینے کے نام پر پاکستان میں سرمایہ لگا کر یہاں کے عوام کو لوٹیں۔اس سلسلے میں امریکی صنعت کاروں کا ایک وفد پچھلے سال پاکستان کا دورہ کر کے گیا ہے۔اس وفد کو ضیاء حکومت نے مختلف صنعتی شعبے پیش کئے اور ایک نیا بنک کھولنے کی اجازت بھی دی ہے۔امریکی سرمایہ کاروں کو پاکستان کی معاشی بدحالی پر اتنی ہمدردی کیوں ہورہی

ہے؟ کیا وہ ہمارے ہمدرد ہیں؟ دراصل بین الاقوامی کارپوریشنیں سامراجی مفادات کے تحت ترقی پزید ممالک (لاطینی امریکہ، افریقہ اور ایشیاء) میں اس لئے ڈیرہ ڈال رہی ہیں کہ ان ممالک میں اجرتیں کم ہیں۔ جبکہ وہاں خام مال نہایت ہی سستا ہے اور اس پر ستم یہ کہ انہیں من مانے منافع کے حصول کی اجازت دی جاتی ہے تاکہ پاکستان کو جتنا لوٹ سکیں لوٹ لیں۔ تاہم امریکہ اور دیگر سامراجی ممالک ترقی پزیر ممالک میں دوستی اور باہمی دلچسپی کے باوجود محض سطحی صنعتیں لگاتے ہیں۔ وہ بنیادی صنعتوں کی تکنیکی مہارت نہیں دیتے کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ ترقی پزیر ممالک خودکفیل ہوں اور عالمی سامراج کے معاشی و سماجی چنگل سے آزادی حاصل کرلیں، اس لئے اقتصادی آزادی اور ترقی کے حصول کے لئے سوشلسٹ ممالک سے تعلقات بہتر بنانا نہایت ضروری ہے۔

یہ سوویت یونین ہی ہے کہ جس نے پاکستان میں اسٹیل مل تعمیر کر کے دی جو کسی بھی ملک کی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی سوشلسٹ حکومت نے ہمارے ملک میں گدو تھرمل بجلی پاور اسٹیشن لگایا جو کہ کئی سو میگاواٹ بجلی روزانہ پیدا کرتا ہے اور حال ہی میں روس کی حکومت نے چھ سو ٹریکٹر مہیا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ سوویت یونین موجودہ حکومت کو اقتصادی شعبے میں زندگی کے مختلف شعبوں میں مدد کی پیش کش کر چکا ہے لیکن سامراجی بیساکھیوں پر قائم آپ کی حکومت اس پیش کش پر ٹال مٹول سے کام لے رہی ہے۔ ہمارے ملک میں روسی امداد سے قائم کردہ گیارہ ریڈیو اسٹیشنوں سے سوویت حکومت کے خلاف مسلسل پروپیگنڈہ جاری ہے جب کہ دوسری جانب سامراج اس علاقہ میں خوشحالی، جمہوریت اور ترقی کی تحریکوں کو روکنے کے لئے اسلحہ دیتا ہے اور ہمارے ملک کا استحصال کر رہا ہے۔ اسی لئے تو غاصب حکمراں اس سے تعلقات بڑھا رہا ہے۔ امریکہ کی کوشش یہ ہے کہ یہاں پر صرف اتنی ترقی ہو جس سے امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کے سرمایہ داروں کو محنت کی عالمی تقسیم کے تحت فائدہ پہنچے۔ جناب آپ کی حکومت کی یہ پالیسی سامراجیوں کے ہاتھوں ملک کو گروی رکھنے کی طرف ایک قدم ہے۔

جناب اس کے برعکس ہم یہ چاہتے ہیں کہ ملک میں زیادہ سے زیادہ صنعتیں قائم کی جائیں ۔ملکی معیشت کی بنیاد قرضوں کی معیشت اور سامراجی سرمایہ کے بجائے ملکی سرمایہ پر ڈالی جائے کیونکہ اس سے نہ صرف ہم سامراجی ملکوں کی طفیلی معیشت یعنی ان کو خام و نیم تیار شدہ مال سپلائی کرنے اور تیار مال خریدنے والی مارکیٹ بن جاتے ہیں بلکہ اس سے یہ بھی ہوتا ہے کہ غیر ملکی سرمایہ کا منافع ہر سال ملک سے باہر چلا جاتا ہے۔اس کے برعکس ملکی سرمایہ کا منافع بھی مزید سرمایہ کاری کیلئے ملک کے اندر مزید صنعتیں کھولنے پر صرف ہوگا۔اس لئے ہم غیر ملکی سرمائے کو قومیانے کا نعرہ دیتے ہیں اور اس غیر ملکی سرمایہ کو قومیانے اور ملکی سرمایہ کی ہمت افزائی کرنے پر معیشت پر کتنے صحت مندانہ اثرات پڑتے ہیں اس کا اندازہ آپ کو ہندوستان کی معیشت اور دیگر مسلم ممالک کی مثالوں میں مل جائے گا۔

ہم بنیادی اورا ہم صنعتوں کو قومیانے کے حق میں ہیں جبکہ آپ کی حکومت قومی ضرورت کے تحت قومیائی گئی صنعتیں واپس سرمایہ داروں کو دے رہی ہے اور اس طرح سے ان صنعتوں کا منافع اور پیداوار ملک کی ترقی اور لوگوں کی خوشحالی میں استعمال ہونے کے بجائے چند نجی سرمایہ داروں کی جیبیں بھرنے کے لئے استعمال ہورہے ہیں۔اس سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ آپ کی حکومت بڑے اور بیرونی سرمایہ داروں کے مفاد میں صنعتوں کو نجی ملکیت میں دے رہی ہے۔

جناب! ہمارے ملک میں شاید ہی کوئی ایسا شعبہ رہ گیا ہو جہاں فوجی جرنیل قابض نہ ہوں ۔صنعتی شعبے میں قبضہ کے لئے فوجی فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں آیا۔ٹرانسپورٹ پر اجارہ داری بنانے کے لئے نیشنل لاجسٹک سیل قائم کیا گیا۔انعام اور نیلام کے بہانے سے حاصل کی گئی بیشتر زمینوں پر تو فوجی جرنیل پہلے ہی سے قابض ہیں لیکن زرعی شعبہ پر اپنی اجارہ داری کو مزید بڑھانے کے لئے مختلف زراعتی، ڈیری، پولٹری فارم قائم کئے جارہے ہیں ۔تعلیمی اداروں پر فوجی افسران کے بچوں کے لئے نشستیں مخصوص کرکے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں فوجی افسران کی اجارہ داری قائم کردی گئی ہے اور یوں مستحق طلباء کی حق تلفی ہورہی ہے۔یہی حال سول ملازمتوں کا بھی ہے جہاں

(آن ڈیوٹی فوجی افسران کی) خدمت مستعار لینے اور (ریٹائرڈ فوجی افسران کی) خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے نام پر فوجی جرنیلوں کا قبضہ بڑھتا جا رہا ہے۔

30 اپریل 1982 کو آپ ہی کے وزیر اطلاعات ونشریات نے آپ کی کٹھ پتلی مجلس شوریٰ کو بتایا کہ بیرون ممالک میں تعینات پاکستان کے بیالیس سفیروں میں سے سترہ کا تعلق ہمارے ملک کی مسلح افواج سے ہے۔ ان سترہ سفیروں میں سے تین کا تعلق بحری و ہوائی فوج سے، جبکہ بقیہ چودہ کا تعلق برّی فوج سے ہے۔ یوں لگتا ہے کہ پاکستان کے فوجی جرنیل وحشیانہ طریقہ سے عوام کو تبدریج فتح کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی دشمن جرنیلوں اور عوام کے درمیان جنگ جاری ہے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ عوام کے مفادات کے علمبردار ہونے کی پاداش میں آج مجھے اور میرے ساتھیوں کو ملزم کی حیثیت سے عدالت کے اس کٹہرے میں لایا گیا ہے۔

جناب والا! ہمارے اور آپ کی حکومت کے درمیان عداوت کا ایک نکتہ جاگیرداری نظام بھی ہے۔ ہم ملک میں بڑے پیمانے پر زرعی اصلاحات چاہتے ہیں جبکہ ضیاء ٹولے کی پالیسی یہ ہے کہ جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کا تحفظ کیا جائے۔ دراصل انعام و نیلام کے ذریعہ زمینیں حاصل کر کے فوجی افسر شاہی نے زرعی شعبہ میں بھی اپنا مخصوص مفاد حاصل کر لیا ہے۔ یہی مفاد مسلح افواج کو جاگیرداروں اور زمینداروں کی طرف داری کرنے پر آمادہ کرتا ہے چنانچہ جاگیرداروں اور زمینداروں کے خلاف کسانوں اور محنت کشوں کے مطالبات کو بے دردی سے کچلا جا رہا ہے۔ کسانوں کی جدوجہد کو کچلنے اور ان پر مظالم کا سلسلہ صرف اسی فوجی حکومت میں نہیں، بلکہ اس سے قبل بھی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ سابقہ مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) میں نورالامین کی وزارت کے دور میں کسانوں کی ایک تحریک چلی، جس میں کسانوں مطالبہ تھا کہ انہیں بٹائی میں فصل کا تین چوتھائی حصہ دیا جائے۔ اس تحریک کو سنتھاگ تحریک کہتے ہیں۔ اس تحریک کو بے دردی سے کچلا گیا۔ اس تحریک کی خاتون رہنما لیلےٰ مترا کو گرفتار کر کے اسلام کی نام لیوا حکومت نے اس کے ساتھ انتہائی غیر انسانی غیر اخلاقی اور شرمناک سلوک کیا۔ لیلےٰ آج بھی زندہ ہیں لیکن بہیمانہ تشدد کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ اس کے علاوہ مائی بختاور جو کہ کسانوں کی ایک

خاتون رہنما ہیں انہیں بھی ضلع تھرپارکر کے ''نبی سر'' علاقہ میں گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔ کہنے کو تو ہمارے ملک میں جاگیرداری نظام اپنی کلاسیکی شکل میں موجود نہیں ہے لیکن بڑی بڑی زمینداریاں اب تک موجود ہیں جن کا طریقہ پیداوار نہایت قدیم اور فرسودہ ہے ۔ بڑی زمینداریوں کے خاتمے اور صنعتی ترقی کے مسائل ایک دوسرے سے مربوط ہیں کیونکہ صنعتی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ بڑے پیمانے پر زرعی اصلاحات نہ کی جائیں لیکن آپ کی حکومت اس مردہ اور فرسودہ نظام کو سر پر اٹھائے گھوم رہی ہے۔ اس کے برعکس ہم ہندوستان کی مثال دیکھیں جہاں پر بڑے پیمانے پر زرعی اصلاحات کی گئیں جس کے نتیجہ میں وہاں کی صنعتی ترقی اتنے عروج پر پہنچ گئی ہے کہ وہ جہاز تک بنانے لگا ہے۔ یہ بات معاشیات کا ایک عام طالب علم بھی جانتا ہے کہ کسی ملکی منڈی کے بغیر صنعتیں قائم نہیں کی جاسکتیں اور ملکی منڈی پیدا کرنے کے لئے لوگوں کی قوتِ خرید حقیقی معنوں میں بڑھانا بہت ضروری ہے۔ ہمارے ایک عام آدمی کے پاس جتنا زیادہ پیسہ ہوگا وہ اتنی ہی زیادہ اشیائے صرف خریدے گا جس سے پیداوار بڑھے گی اور مزید صنعتیں لگیں گی۔ لوگوں کو روزگار بھی ملے گا۔ اگر کسی زمیندار کے پاس دوسوا ایکڑ زمین ہے تو وہ اپنی آمدنی میں زیادہ سے زیادہ تنتیس ایکڑ آمدنی کے برابر بنیادی ضرورت کی چیزیں خریدے گا۔ جاگیردار اپنی جو چیزیں خریدتا ہے اس کا منافع بیرون ملک سرمایہ داروں کو ملتا ہے ۔ اس کے مقابلے میں بے زمین کسان اگر چھوٹا مالک بن جائے تو وہ اپنی آمدنی میں سے بنیادی ضرورت کی چیزیں خریدے گا۔ یوں کہہ لیجئے کہ وہ کپڑوں کے دو جوڑوں کے بجائے چار جوڑے خریدے گا۔ ہمارے عام آدمی کی ضرورت کی چیزیں ملک ہی کی بنی ہوئی ہوتی ہیں اور اس کی قوتِ خرید بڑھانے سے مارکیٹ کی پیداوار بڑھتی ہے۔ اس سلسلہ میں جناب مسعود بھگوان کھدّر پوش کے مضمون کا تراشہ پیش خدمت ہے۔ جو کہ ''روزنامہ جنگ'' ۲۸ نومبر ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔

ہم پر الزام ہے کہ ہم ملک کی سالمیت کے خلاف ہیں۔

جناب ہمیں یہ بے بنیاد الزام لگا کر اس لئے بند کیا گیا ہے تا کہ آپ کی حکومت اپنے وہ

مکروہ عزائم پورے کر سکے، جس کی راہ میں مزدور طبقہ اوران کے رہنمار کاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ جب بھی کسی نے حکمرانوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو اُسے فوراً ملک کے سالمیت کا دشمن قرار دے دیا جاتا ہے۔جس طرح کسی کے منہ سے نکلا ہوالفظ قانون نہیں ہوسکتا اسی طرح سے کسی کے ذاتی اور اقلیتی گروہ کے مفادات ملک کی سالمیت نہیں ہو سکتے ۔آپ کی حکومت سے ہمارا اختلاف پالیسیوں کا ہے ۔ میرے خیال میں یہ الزام لگانے والے سیاست کی ''س'' سے بھی واقف نہیں، کہ ان کو یہ پتہ چلے کہ حکومت اورریاست میں کیا فرق ہے۔اگر یہ الزام اُن کی جہالت کا ثبوت نہیں تو پھر یہ بات واضح ہے کہ کچھ اور مفادات ہیں جن کو ملکی سالمیت کا نام دیا جارہا ہے ۔میں مزدور طبقہ کا نمائندہ ہوں اس لئے جانتا ہوں کہ محنت کش طبقہ کے مفادات کیا ہیں۔

ملک کا بڑا ہونا محنت کش طبقہ کے مفاد میں اس لئے ہے کہ اس کی تیار کی گئی اشیاء کی مارکیٹ بڑی ہواور خوداس کے کام کرنے کے مواقع زیادہ ہوں تا کہ اس کو اپنی قوت اور محنت کا بہتر معاوضہ مل سکے ، پھر کیونکر وہ چاہے گا کہ ملک کے ٹکڑے ہوں اور اس کی پیداوار کی منڈی اور روزگار کے مواقع کم ہوں جس سے خود اُسے کم معاوضہ ملےاور بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑے۔

حکمران اوراستحصالی طبقے کو اپنا استحصال بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رکھنے کے لئے اگر ملک بھی توڑنا پڑے تو وہ اس سے گریز نہیں کرتا۔ بنگال کا المیہ آپ کے سامنے ہے۔کیا یہ بات اب بھی واضح نہیں ہوئی کہ ہمارا ملک کس طبقے اور کس کے مفاد میں توڑا گیا۔

جناب والا! یہ مزدور طبقہ ہی تھا جس نے ملک کی سالمیت کے نام پر ملک کو توڑنے کی مخالف کی اوراس کے خلاف بھرپور آواز اُٹھائی۔ ہمارے ملک کے حکمران یہاں کے عوام کو خوشحالی اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنا تو کجا ان کو بنیادی حقوق اور شہری آزادیوں تک سے محروم رکھتے ہیں۔ وہ کسی طور پر بھی عوام کو کوئی رعایت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہمارے ملک میں اس کے قیام سے لے کر اب تک تین مارشل لاء لگ چکے ہیں۔ یہ حکمران نہیں چاہتے کہ یہاں پر کوئی ایسی حکومت قائم ہو جس ملک کی معاشی و مالی پالیسیاں ایسی ہوں جو اس ملک کے اکثریتی عوام کے حق میں ہوں۔ مارشل لاءاوراس طرح کے کالے قوانین حکمران طبقے کے ہتھکنڈے ہیں جس سے وہ

عوام کو ان کی جدوجہد سے روکتے ہیں تاکہ کہیں عوام ان کے استحصالی نظام کا خاتمہ نہ کر دیں۔

جناب! ہم چاہتے ہیں کہ ملک میں بنیادی حقوق اور شہری آزادیاں ہوں تاکہ یہاں کے عوام پر حکمران طبقے کی طرف سے جو زیادتیاں اور مظالم ہو رہے ہیں اس کا سدباب ہو سکے۔ہم چاہتے ہیں کہ غیر مشروط طور پر انجمن سازی اور ہڑتال کا حق مزدوروں کو حاصل ہو تاکہ وہ اپنے لئے بہتر حالاتِ کار اور بہتر اجرت حاصل کر سکیں۔ ملک میں جب بھی مارشل لاء یا دوسرے کالے قوانین کا استعمال ہوا ہے تو اس کا سب سے زیادہ نقصان مزدور طبقہ کو پہنچا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ایوب خان کی مارشل لاء میں منگھو پیر کے مزدور اپنے حق کے لئے اُٹھے تو اس وقت کی فوجی حکومت نے ان نہتے مزدوروں کو گولیوں کا نشانہ بنایا تھا جس کے نتیجہ میں کئی مزدور شہید ہوئے۔ موجودہ حکومت کے زمانے میں ملتان کے مزدوروں پر فائرنگ کی گئی اور کئی مزدوروں کو شہید کیا گیا۔ پٹ فیڈر میں قبائلی سرداروں اور جاگیرداروں کی پشت پناہی کی گئی جس سے کئی کسانوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔سینکڑوں کی تعداد میں مزدور اور طالب علم رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا اور انہیں تشدّد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس دوران کے اہم ترین واقعات میں سے ایک ہمارے ساتھی عظیم محبّ وطن طالب علم و کمیونسٹ رہنما نذیر عباسی کا بہیمانہ قتل ہے جو کہ ہمارے ساتھ گرفتار ہوئے تھے۔ انہیں فوجی درندوں نے تشدد گاہ میں اذیتیں دے کر شہید کر دیا۔ اس کے علاوہ جتنے مزدور چھانٹی، تالہ بندی اور لے آف کے ذریعہ مارشل لاء کے زمانے میں نکالے گئے اتنے کبھی نہیں نکلے۔ یہ کوڑے اور لاٹھیاں کبھی کسی سرمایہ دار پر نہیں برسیں اور نہ ہی کبھی کسی سرمایہ دار کے خلاف کسی کالے قوانین کے تحت کارروائی کی۔ آج بھی کالے قوانین کی وجہ سے ٹریڈ یونین کو آزادانہ طور پر کام کرنے کا موقع نہیں دیا جا رہا ہے۔ پی آئی اے کی یونین پر مارشل لاء ریگولیشن کے تحت پابندی عائد ہے اور سینکڑوں ملازمین کو نوکری سے برطرف کیا گیا ہے۔

آپ کی حکومت کی مزدور دشمنی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے مزدوروں کے سُرخ جھنڈے کے استعمال پر پابندی لگا دی ہے۔ آپ کی حکومت امریکی سازشیں اور اسلحہ حاصل کرنے میں تو کوئی قباحت محسوس نہیں کرتی لیکن شکاگو کے شہید مزدوروں کی یادگار

سُرخ جھنڈے پر جو کہ جدوجہد اور زندگی کی علامت ہے اعتراض کرتی ہے۔ آپ کی حکومت میں صرف بلوچستان میں ایک درجن سے زائد مزدور یونینوں پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ آپ کی حکومت کی سرمایہ نوازی اس سے بھی عیاں ہے کہ آپ کی حکومت نے مارشل لاء ریگولیشن کے تحت آجروں کو یہ حق بھی دیا ہے کہ وہ مزدوروں کو ٹھیکے پر رکھ سکتے ہیں۔ اس پر ملک کی کئی صنعتوں میں عملدرآمد بھی شروع ہو چکا ہے۔ جناب! یہ قانون مزدوروں کے خلاف ایک کھلی سازش ہے تا کہ ان کو تمام قانونی واجبات اور حقوق سے محروم کیا جا سکے جو مستقل ملازم کا حق بنتے ہیں۔

جناب والا! آپ کی حکومت کے دور اقتدار کے ساڑھے پانچ سال کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی لیبر پالیسی کا اعلان نہیں کیا گیا۔ دو مرتبہ سہ فریقی لیبر کانفرنس بلائی گئی۔ اِن کانفرنسوں میں شریک مزدور نمائندوں نے لیبر پالیسی میں جو ابتدائی تجاویز دیں، آپ کی حکومت اِن کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ان سب چیزوں کی روشنی میں آپ ہی بتائیں کہ آپ کی حکومت جو کام کر رہی ہے وہ اس ملک اور اس ملک کے اکثریتی عوام کے خلاف سازشیں نہیں تو اور کیا ہے۔

میں آپ کی توجہ اپنے بدنصیب ملک کے مصائب و آلام کی طرف دلانا چاہتا ہوں، جس کی ذمہ داری بنیادی طور پر آپ کی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں دس لاکھ ایسے خاندان ہیں جن کے پاس زمین کا ایک ٹکڑا بھی نہیں جبکہ دوسری طرف تین ہزار خاندان کے پاس قابل کاشت زمین کا پچاس فیصد ہے۔ بائیس لاکھ خاندان کسان ہیں جو کہ بٹائی پر زمینداروں کے پاس کام کرتے ہیں۔ ان خاندانوں کی کل آبادی ایک کروڑ بتیس لاکھ سے بھی زیادہ بنتی ہے۔ ایک طرف فی کس سالانہ آمدنی بارہ ہزار سالانہ سے اوپر بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پچاس فیصد سے زیادہ قومی آمدنی صرف بیس فیصد لوگوں کے تصرف میں ہے۔ گزشتہ دس سالوں میں بیروزگاری کی شرح تیرہ فیصد رہی۔ اگرچہ لوگوں کو بیرون ملک بھیج کر اس شرح کو کسی حد تک کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ زرعی شعبے میں کم اُجرت والے مزدوروں کی تعداد بیس لاکھ ہے جبکہ گھروں کی سہولت بھی گنتی کے چند افراد کے پاس ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے۔

(1) ملک میں پچاس فیصد مکانات ایک کمرہ پر مشتمل ہیں جس میں اوسطاً چھ آدمی رہتے ہیں (2) تیس فیصد گھر دو کمروں والے ہیں۔ (3) گیارہ فیصد گھر تین کمروں پر مشتمل ہیں جبکہ آٹھ فیصد تین سے زائد کمروں والے ہیں۔ (4) آبادی کے دو تہائی سے زیادہ حصہ کے پاس بجلی نہیں ہے اور اس سائنسی دور میں بھی وہ تاریکی میں ڈوبا رہتا ہے جبکہ کراچی کے علاقہ دھوراجی میں ایک ممتاز صنعت کار کی کوٹھی میں صرف پچاس لاکھ کی بتیاں جگمگا رہی ہیں۔ (5) چھ فیصد کے پاس ایندھن کے لئے سوئی گیس ہے۔ (6) بائیس فیصد کے پاس فلیش سسٹم ہے (7) جبکہ ستائیس فیصد کے پاس رفع حاجت کی جگہ نہیں۔

گذشتہ پانچ سال کے عرصے میں تنخواہوں میں تقریباً گیارہ فیصد اضافہ ہوا ہے جبکہ مہنگائی میں دو سو فیصد کا اضافہ ہوا۔ غیر ملکی تجارت میں ہمارے ملک کو پانچ سال میں ایک سو سات ارب پچھتر کروڑ ستّر لاکھ روپے کا خسارہ ہوا جو کہ ہمارے سالانہ بجٹ کا تقر ڈیڑھ گنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ہر پانچ سال بعد اپنے قومی وسائل کا ڈیڑھ گنا ضائع کر رہے ہیں۔ طبی سہولیات کا یہ عالم ہے کہ سات ہزار افراد پر ایک ڈاکٹر ہے۔ یہ شرح ملک کے تمام کوالیفائڈ ڈاکٹروں کی کل تعداد ملا کر بنتی ہے۔ جبکہ اس میں وہ کئی ہزار ڈاکٹر بھی شامل ہیں جو کہ بیرون ملک کام کر رہے ہیں۔ ہر دس میں سے ایک پاکستانی بچّہ جنم لیتے ہی مر جاتا ہے۔ پاکستان کو تقریباً ایک ارب پچاس کروڑ ڈالر امداد ملتی ہے جس میں سے ایک ارب بیس کروڑ ڈالر ہم قرضوں کی ادائیگی کی صورت میں واپس کر دیتے ہیں اس طرح سے ہمارے پاس صرف بیس فیصد رقم بچتی ہے۔ پاکستان میں انجینئروں کی تعداد بہت کم ہے یعنی ایک لاکھ آدمی پر دس انجینئر ہیں جبکہ اقوامِ متحدہ کی سفارشات کے مطابق ایک لاکھ آبادی پر کم از کم ایک سو چالیس سائنسداں وانجینئر ہونے چاہئیں۔

غیر ملکی قرضوں کی مد میں آپ کی حکومت کے بیان کردہ اعداد وشمار کے مطابق ہمیں دو کھرب انتیس ارب ترسٹھ کروڑ روپے حاصل ہوئے جس سے ہر سال کی قسطوں کی ادائیگی کے بعد بھی ہمیں ایک کھرب انیس ارب پینتیس کروڑ روپے ادا کرنا ہے یہ اعداد وشمار دسمبر 1981

تک کے ہیں۔ان قرضوں پر ہم نے 78-1977 میں سینتیس کروڑ چالیس لاکھ ڈالر سود ادا کیا جو کہ 82-1981 میں بڑھ کر باہتر کروڑ اسی لاکھ ڈالر ہوگیا یعنی یہ صرف سود کی رقم کی مد میں چار سال کے عرصہ میں رقم دُگنی ہوگئی۔1977 سے 1981 تک ہماری ملکی پیداوار میں اضافہ سولہ عشاریہ چالیس فیصد ہوا جبکہ اس کے مقابلے میں قرضوں کی رقم میں اسی فیصد اضافہ ہوا۔

سرکاری اعداد وشمار کے مطابق پاکستان کو امداد دینے والے کنسورشیم نے پاکستان کو افغان پناہ گزین کے لئے تیئیس کروڑ ڈالر منظور کئے ہیں۔افغان مہاجرین کی محض غذائی ضرورت پر پچپن کروڑ ڈالر خرچ آتا ہے۔چنانچہ افغان مہاجرین پر ہمیں سالانہ تین ارب بیس کروڑ روپے اپنے وسائل سے خرچ کرنے پڑتے ہیں (جنگ 13 جون 82) 1981 کے سرکاری اعداد وشمار کے مطابق 1981 میں ارتکاب جرائم کی پونے دو لاکھ وارداتیں ہوئیں یہ تعداد 1980 کی نسبت سے تیرہ ہزار کے لگ بھگ زیادہ ہے۔(جنگ 20 جولائی 82) ہمارے ملک میں سڑکوں کی کم ازکم ضروریات کا صرف 20 فیصد سڑکیں ہیں۔ملک کے 83-1982 کے بجٹ میں دفاع کے لئے بائیس ارب نو کروڑ تیس لاکھ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔جبکہ 48-1947 میں دفاعی خرچ صرف ایک کروڑ چار لاکھ روپے اور 54-1953 میں پینسٹھ کروڑ تیس لاکھ روپے تھا۔

آپ کی حکومت نے مطلق العنان فوجی آمریت قائم کر رکھی ہے جبکہ ہم جمہوریت چاہتے ہیں۔ضیاء ٹولہ مسلسل سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگائے ہوئے ہے اور انتخابات کی بات سے مُکر گیا ہے۔حالانکہ اس نے ہماری مسلح افواج اور قوم سے جو وعدہ اقتدار سنبھالتے وقت کیا تھا وہ یہ نہیں تھا جس کی وہ اب بات کر رہا ہے۔بلکہ ضیاء الحق نے پانچ جولائی 1977 کو کہا تھا کہ ’’میرا واحد مقصد آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کرانا ہے جو اس اکتوبر میں ہوں گے۔میں یقین دلاتا ہوں کہ میں اس پروگرام سے انحراف نہیں کروں گا۔آئندہ تین ماہ کے دوران اپنی تمام صلاحیتیں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے طور پر کسی دوسری چیز پر صرف نہیں کروں گا‘‘۔

آئین سے غداری اور سول حکومت کی اطاعت کے حلف کو پامال کر کے اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کر لینے والے اس بے ضمیر جنرل نے آگے چل کر اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ

صریحاً جھوٹ بول رہا تھا اور قرآنی آیات کا محض اس لئے استعمال کر رہا تھا کہ لوگ اس کے جھوٹ کو سچ مان لیں۔ضیاء نے مسلح افواج کے جوانوں اور عوام دونوں سے غداری کی ہے۔ضیاء کی اس غداری سے ہمارا فوجی ادارہ تباہ ہو رہا ہے اور فوجیوں کو حقوق غصب کرنے، دھوکہ دہی اور وعدہ خلافی کا درس دیا جا رہا ہے۔

جناب! صرف اتنا ہی نہیں کہ آپ کی حکومت نے انتخابات کرانے سے انکار کر دیا ہے بلکہ سیاسی سرگرمیوں پر بندش اور مارشل لاء کو مسلسل جاری رکھ کر ملک میں شدید بحران پیدا کر دیا ہے۔پہلے تو سیاستدانوں کے احتساب کی مہم شروع کی گئی۔یہ تماشہ پہلی مرتبہ دیکھنے میں آیا کہ نوکر مالک کا احتساب کرے۔ضیاء ٹولہ سیاستدانوں کے خلاف تو الزام تراشیاں کر رہا ہے لیکن کیا کبھی اس نے اپنے گریبان میں بھی جھانک کر دیکھا ہے کہ کہیں وہ خود تو احتساب کے قابل نہیں؟ ضیاء نے حلف کو توڑ کر کیا اختیارات سے تجاوز نہیں کیا؟ لیکن اب وہ دن دور نہیں جب عوام غاصب ضیاء اور اس کے ٹولہ سے حساب لیں گے۔

ضیاالحق اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے اسلام کا سہارا لے رہا ہے اور کئی مرتبہ یہ بات سرِ عام کہہ چکا ہے کہ وہ تب تک نہیں جائے گا جب تک اسلام نافذ نہیں ہو جاتا۔مجھے اسلام کی پوری تاریخ میں ایسا حکمراں نظر نہیں آیا جس نے کبھی یہ کہا ہو۔گویا پاکستان کے ساڑھے آٹھ کروڑ عوام مسلمان نہیں رہے اور جیسے ضیاء کو خدائی فوجدار بنا دیا گیا ہو کہ جاؤ پاکستان کے عوام کو مسلمان بناؤ۔جنرل ضیاء کا یہ دعویٰ کہ وہ اسلامی نظام کا واحد ذمہ دار ہے، بذات خود غیر اسلامی ہے۔یہی دیکھئے کہ عوام نے اُسے اپنی سرحدوں کی حفاظت کا فرض سونپا تو وہ خود عوام پر فوج کشی کئے بیٹھا ہے۔عوام کے جذبات سے کھیل رہا ہے اور اس طرح عوام کے مفاد سے غداری کر رہا ہے۔دراصل امریکی سامراج کا مقرر کردہ یہ فوجدار بہروپیا بن کر خود کو خدائی فوجدار کہلا رہا ہے اور سامراجیوں کے مفادات کیلئے کام کر رہا ہے۔ہمیں کہا جا رہا ہے کہ مضاربہ اسلامی طریقہ ہے لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مضاربہ قرون وسطیٰ میں ایک تجارتی آرگنائزیشن کے طور پر پہلے بھی تھا اور عرب کے علاوہ دیگر کئی ملکوں میں بھی رائج تھا۔اس طرح سے مضاربہ اسلام سے پہلے کا ہے۔

دراصل ہمارے کئی مسائل کا علاج وقیانوسی طریقوں میں ڈھونڈ کر اسے اسلامی ہونے کا دعویٰ کر کے پیش کیا جارہا ہے۔ ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ ہمارے حکمرانوں کے نزدیک اسلام کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ اس کو مارشل لاء کے ظالمانہ قوانین، استحصالی نظام کے تحفظ اور اپنی کمپنی کی مشہوری کے طور پر استعمال کیا جائے۔

جناب والا! آپ کی حکومت ملک کو ایک ایسی ریاست میں تبدیل کر رہی ہے جس کا وجود نہ صرف اس جدید دور سے مطابقت نہیں رکھتا بلکہ اس میں خود ہماری عوام اور ملک کی بقاء کو بھی خطرہ لاحق ہے۔ ریاست کا یہ تصور صرف جماعت اسلامی کے نام نہاد سیاسی فلسفے میں ہی ملتا ہے جب کہ باقی تمام پارٹیوں کے پاس یہ فلسفہ سرے سے موجود ہی نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ تصور بانی پاکستان کے بنائے اصولوں کے صریحاً منافی ہے۔ بانی پاکستان نے 11 اگست 1947 کو دستور ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''آپ آزاد ہیں کہ آپ مندروں میں، مسجدوں یا عبادت کی کسی بھی جگہ جائیں آپ کسی بھی مذہب یا عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں اس سے ریاست کا کوئی تعلق نہیں''، لیکن ضیاء الحق کی ریاست کا تعلق ایک خاص فرقے سے بنتا ہے۔ جس کے تحت دیگر تمام فرقوں کو ریاست سے لاتعلق بنایا جارہا ہے۔ 21 مارچ 1948 کو ڈھاکہ میں تقریر کرتے ہوئے بانی پاکستان نے کہا تھا۔

''اس میں غلطی کی کوئی گنجائش نہیں کہ پاکستان مُلّاں ریاست یا اس جیسی کوئی شکل نہیں''

ضیاء الحق ملک کے سیاسی نظام کے لئے مختلف نسخے تجویز کرتا ہے۔ کسی زمانے میں اس نے متناسب نمائندگی کا نسخہ تجویز کیا تھا، جس کو عوام نے واضح طور پر مسترد کر دیا تھا لیکن شاید یہ نسخہ اب بھی زیر غور ہے، کیونکہ ابھی پچھلے دنوں جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد نے ملک کے بحران کے لئے جو شرائط پیش کی ہیں ان میں متناسب نمائندگی کا راگ الاپنے کا مقصد یہ ہے کہ عوام میں جڑیں اور طاقت نہ رکھنے والی پارٹیاں بھی اسمبلی تک اپنی رسائی حاصل کر لیں۔ اسی لئے تو متناسب نمائندگی کا طریقہ انتخاب ضیاء الحق کے لئے عین اسلامی اور بالغ رائے دہی غیر اسلامی

ہے۔

متناسب نمائندگی کا طریقہ ترکی اور سری لنکا کے علاوہ جرمنی اور کچھ یورپی ممالک میں بھی رائج رہا ہے۔ یورپی ممالک میں جہاں یہ طریقہ رائج ہے وہاں اُسے بتدریج تبدیل کیا جارہا ہے۔ شاید ترکی کی مثال کو سامنے رکھ کر جنرل ضیاء نے ''ہمارے سیاسی امراض'' کے لئے یہ نسخہ تجویز کیا ہے لیکن ترکی میں جو سیاسی اور معاشی عدم استحکام ہے وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ وہاں آئے دن مارشل لاء لگتے ہیں ۔عوامی ادارے تباہ ہیں جس سے معیشت تباہ ہوکر رہ گئی ہے ۔ دہشت گردی کا دور دورہ ہے، زرمبادلہ کا واحد ذریعہ ان مزدوروں کی آمدنی ہے جو بیرون ملک سے کما کر اپنے وطن کو بھیجتے ہیں، جہاں افراطِ زر کی شرح دنیا میں سب سے زیادہ ہے جہاں کے ایک وزیراعظم کو بھی ہمارے بدنصیب ملک کی طرح شہید کیا گیا اور جہاں فوج کو حکومت میں مداخلت کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ ہے ترکی کے معاشی وسیاسی استحکام کی حالت زار! جب بھی جنرل ضیاء اور میاں طفیل پاکستان میں فوج کے آئینی کردار اور متناسب نمائندگی کے طریقہ انتخاب کا راگ الاپتے ہیں تو ترکی کے خوفناک حالات ہی کا تصور سامنے آتا ہے۔ ترکی سے آپ کی حکومت کی اصل مماثلت یہی ہے کہ دونوں اپنے آپ کو امریکی سامراج کے ہاتھ فروخت کر چکے ہیں، دونوں افغانستان اور خلیج میں امریکی کھیل کھیلنے کے لئے بالکل تیار ہیں۔ (جیسا کہ محترم ارشاد احمد حقانی نے اپنے ایک مضمون میں اس کا ذکر کیا ہے اس کے لئے میں ''اخبار جنگ'' 25 دسمبر 1982 کے شمارے کا وہ حصہ پیش کرتا ہوں ۔ (عدالتی دستاویز ''ب'')۔ آج کل جنرل ضیاء مختلف ممالک دورے کرتا پھر رہا ہے اور صدر سوہارتو اور اسی قبیل کے سرے ڈکٹیٹروں سے طولِ اقتدار کے نسخے پوچھتا پھر رہا ہے۔

فوج کے آئینی کردار پر بحث کے دوران بنگلہ دیش کے حالات کا ذکر بے محل نہیں ہوگا۔ بنگلہ دیش میں بھی فوج نے وہاں کے منتخب وزیراعظم کو قتل کیا اور اقتدار پر قابض ہوگئی۔ پہلے بنگلہ دیش کے چیف آف اسٹاف جنرل ارشاد نے واضح طور پر یہ انتباہ دیا تھا کہ ''فوج کو حکومت میں حصّہ دو ورنہ انجام کے لئے تیار ہوجاؤ''۔اب وہ منتخب صدر کو معزول کر کے مسندِ اقتدار پر براجمان

ہے۔

گویا فوجی مفادات (امریکی مفادات) کے تحفظ اور پھیلاؤ کے لئے فوج کا اقتدار میں ہونا لازمی ہے۔ کیا یہ بات اسلامی اصولوں کے مطابق ہے؟ یا یہ کہ جمہوری دنیا میں کوئی ایسا مسلمہ دستور بھی ہے جس کی رو سے سول انتظامیہ اور آئینی کاروبار میں لازمی طور پر فوج کا بھی عمل دخل ہو؟

فوج کے خفیہ ادارے نے پوچھ گچھ کے دوران مجھ سے افغان انقلاب اور ایرانی انقلاب کے بارے میں ایسے سوالات کئے جس سے یہ عیاں ہوگیا کہ آپ کی حکومت اس علاقے میں امریکی چوکیدار کا کردار ادا کر رہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ایک ترقی پسند اور غیر جانبدار ملک کے طور پر حب الوطنی کا یہی تقاضہ ہے کہ جہاں کہیں مزدوروں اور کسانوں کی تحریک آگے بڑھے ،سامراج اور اس کے حواری پیچھے ہٹیں تو آپ کی حکومت کو خوشی ہونی چاہیے۔ آج افغانستان میں زرعی اصلاحات نافذ کر کے زمین کسانوں میں تقسیم کر دی گئی ہے۔ عورتوں کی خرید وفروخت پر پابندی لگادی گئی اور سودخوری بند کردی گئی ہے تو آپ کی حکومت کو تکلیف پہنچ رہی ہے اور اس کو یہ تمام چیزیں غیر اسلامی نظر آرہی ہے۔ گویا اس افغان انقلاب سے قبل ظاہر شاہ کی شاہی حکومت اور داؤد خاں کی آمریت عین اسلامی تھی کہ جس کے دور میں سود کا کاروبار عام تھا،عورتوں کی خرید فروخت پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی اور جاگیرداروں کو کھلی چھوٹ تھی کہ وہ کسانوں سے جس طرح کا سلوک کرنا چاہیں کریں۔ اسی طرح سعودی عرب میں شاہ خالد کی اور شاہ فہد کی حکومت انھیں شہنشاہیت نہیں بلکہ عین اسلامی حکومت نظر آتی ہے جب کہ ایران میں آیت اللہ خمینی کی قیادت میں سامراج دشمن جمہوری انقلاب آرہا تھا تو ضیاء ٹولہ اس کا ساتھ دینے کے بجائے اس کے خلاف مختلف سازشیں کرنے کا مرتکب ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ انقلابی ایران کے ساتھ ہمارے تعلقات بھی کشیدہ ہیں۔ اصل قصّہ یہ ہے کہ ایرانی انقلاب سامراج دشمن تھا۔ اس لئے وہ ضیاء ٹولہ کو اسلامی نظر نہیں آیا۔

جب کہ افغان بھگوڑوں کی حرکتیں سامراجی مفادات سے مطابقت رکھتی ہیں' اس لئے

ضیاءٹولے کو وہ عین اسلامی نظر آتی ہیں۔ ضیا ٹولہ ان افغان سودخوروں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی پشت پناہی کرر ہا ہے، جو افغان عوام کے عتاب سے بچنے کے لئے پاکستان بھاگ آئے ہیں۔ اب یہ ٹولہ اُنھیں ہتھیار دے کر نہ صرف افغانستان میں گڑ بڑ پھیلانے کی کوشش کرر ہا ہے. بلکہ بقول گورنر سرحد کے کہ ''صوبہء سرحد میں عوام کی آواز کو دبانے کے لئے بھی ان کی مدد جارہی ہے''۔ضیاء کا نام نہاد اسلام سامراجی مفادات کے تابع ہے۔ یہ اسلام محمد عربی کا نہیں، بلکہ پنٹا گان کا اسلام ہے۔

آپ کی حکومت افغانستان کے مسئلہ پر جو کچھ کررہی ہے وہ دراصل اس علاقہ میں سامراجیوں کی طرف سے دیئے گئے اس نئے کردار کا حصّہ ہے جس کے تحت علاقے میں کھینچاؤ کی صورت حال برقرار رکھنا ہے تا کہ امریکہ کو مشرق وسطیٰ میں سستا تیل حاصل کرنے کے لئے فوجیں اور ہتھیار رکھنے کا جواز مل سکے اور وقت آنے پر پاکستان امریکیوں کی مدد کر سکے، اس طرح پاکستان کی امریکی حکمتِ عملی میں شرکت کی وجہ سے اس خطے کی مجموعی صورتحال بدل چکی ہے۔ اب پاکستان کی سیاست اس کے حوالے کے بغیر نہیں دیکھی جاسکتی۔

شاہ ایران کے بعد خلیج کا علاقہ (جس کو کارٹر امریکی مفادات کے لیے اہم علاقہ قرار دے چکا تھا) قومی آزادی کی تحریکوں اور سامراج دشمن تحریکوں کی وجہ سے خطرے میں پڑ گیا تو امریکہ نے ضیاء الحق کے ذریعہ پاکستان کو خلیج کا نیا چوکیدار مقرر کر دیا۔ امریکہ کے نزدیک پاکستان کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ گئی ہے کہ وہ خلیج کے ساتھ ساتھ جنوبی اور مغربی ایشیا میں بھی امریکہ کے کام آرہا ہے۔ یوں پاکستان اس خطّے میں امریکی مفادات کا محور بنا ہوا ہے اسی لئے ایران، بھارت اور افغانستان' پاکستان سے بدگمان ہیں اور پاکستان کی سرگرمیوں کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان ہی وجوہات پر بھارت ضیاء الحق کی عدم جارحیت کی پیش کش کا مثبت جواب دینے سے قاصر ہے۔

جناب والا! حکمراں ٹولہ امریکی کھیل کھیلنے کو تیار ہو گیا ہے اور کروڑوں روپے کے ہتھیار حاصل کر کے، امریکی امداد لے کر اور سامراجی تصرف کے لئے اڈے دے کر مکمل طور پر

امریکی حکمتِ عملی میں چلا گیا ہے۔ یہ ٹولہ کئی سالوں کے تجربے اور نقصانات کے بعد اختیار کی گئی غیر جانبداری کی خارجہ پالیسی کو خیر باد کہہ کر ایک بار پھر بدنامِ زمانہ سامراجی بلاکوں کی طرف جا رہا ہے۔ جناب والا! ضیاء، راؤ فرمان علی اور سابق وزیر خارجہ آغا شاہی کئی مرتبہ اس بات کا اعادہ کر چکے ہیں کہ انہیں سوویت یونین کی ان یقین دہانیوں پر بھروسہ ہے کہ وہ جارحیت نہیں کرے گا۔ ''بھارت کو کچل ڈالو'' کے نعرے چھوڑ کر عدم جارحیت کے معاہدے کی پیشکش کی جا رہی ہے اور کہا جا رہا ہے کہ مائی باپ آپ کا اور ہمارا مقابلہ کیا؟ تو پھر سوال یہ ہے کہ ہتھیار کیوں لئے جا رہے ہیں؟ امریکہ کو ہماری سالمیت بحیثیت ایک مسلمان اور غیر جانبدار ملک کیسے پیاری ہو گئی، جس نے بقول آپ کے حکمرانوں کے کئی مرتبہ ہمیں دھوکہ دیا ہے۔ جو فلسطینی تحریکِ آزادی اور قومی آزادی کی دیگر تحریکوں کو دہشت پسند قرار دیتا ہے، ایران کے اسلامی انقلاب کا مخالف ہے اور آئے دن اس کے خلاف سازشیں کرتا رہتا ہے۔ عربوں کا کٹر دشمن ہے اور اسرائیل کی پشت پناہی کر رہا ہے ۔عرب کاز کو نقصان پہنچانے کے لئے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، قبلہ اوّل اسی کے ایما پر اسرائیل کے قبضہ میں ہے۔ وہ آج یکا یک ہمارا دوست کیسے ہو گیا؟ اس کے اور ہمارے مفادات ہم آہنگ کیسے ہو گئے؟

جناب والا! امریکی سامراج پوری دنیا میں قومی آزادی کی اور عوامی تحریکوں کو کچلنے اور اُن کے آگے بند باندھنے کی کوششیں کرتا ہے۔ اسی حکمت عملی کی خاطر امریکہ اور ناٹو نے نئی اسلحہ پالیسی مرتب کی ہے جس کے تحت مختلف براعظموں میں امریکی فوج رکھی جا رہی ہے۔ فوجی اڈے حاصل کئے جا رہے ہیں اور امریکہ کی ایجنٹ حکومتوں کو اسلّحہ سے لیس کیا جا رہا ہے تا کہ وہ انہیں اپنے خطّے کی قومی آزادی کی تحریکوں کو روکنے اور اپنے ملک کے عوام کے خلاف استعمال کر سکیں۔ پاکستان کو بھی نیٹو کے اسی فیصلہ کے تحت حاصل ہونے والے ہتھیار ہم پر یعنی اس ملک کے عوام پر استعمال ہو سکتے ہیں۔ پاکستان امریکہ کے مفادات کا مکمل مرکز ومحور بنا ہوا ہے۔ ہمارے ملک میں آج جو سیاسی ومعاشی صورتِ حال پائی جاتی ہے وہ دراصل امریکی مفادات کا مکمل مرکز ومحور بننے ہی کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے پاکستان کے عوام کے خلاف دباؤ بے حد زیادہ ہے چنانچہ ہم ایرانی اور

افغان عوام سے یکجہتی کا جتنا زیادہ اظہار کریں گے ہمارے ملک کی جمہوری تحریک اتنی ہی مضبوط ہوگی۔ اس مقصد کے لئے ہمیں دو اتحاد کرنے پڑیں گے ایک ملک کے مظلوم طبقات کا اتحاد اور دوسرا اس خطے کی سامراج دشمن قوتوں سے اتحاد۔

ملک میں بڑھتے ہوئے سامراجی اثرات ومفادات کی وجہ سے سیاسی واقتصادی بحران شدید ہوگیا ہے جبکہ اور حکمراں عوام سے کٹے ہوئے ہیں۔ موجودہ حکمراں اپنے وجود کا ضامن سامراج کی بالادستی اور ملک میں سامراج کے وجود کو سمجھتے ہیں، وہ اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہیں ۔ سیاسی استحکام کا فقدان ہے اس وجہ سے سیاسی پارٹیاں مضبوط اتحاد نہیں کر پارہی ہیں۔ دوسری جانب ایک لمبے عرصے سے شہری آزادیاں اور سیاسی عمل میں تعطل کی وجہ سے اور آپ کی حکومت کی طرف سے عوام کی آواز کو دبانے کی وجہ سے عوام کے مختلف پرتوں کو ملک گیر بنیادوں پر متحد کرنا مشکل ہوگیا ہے۔

اس صورت حال کی روشنی میں سماج کے مختلف سامراج دشمن گروہوں، تنظیموں اور کچلے ہوئے طبقات کا اتحاد ہی موثر بن سکتا ہے۔ ایم۔آر۔ڈی اپنے پروگرام میں سامراج دشمنی کے بنیادی نقطے کو نظر انداز کرنے کی بناء پر تحریک نہیں بن سکی ہے اور اس کی اپیل محدود ہوکر رہ گئی ہے۔ دراصل عوام کے اقتدار اعلیٰ کی بحالی کے لئے خود جمہوری تحریک میں عوامی طبقات کی بالادستی ضرور ہوگئی ہے۔

ہم پر الزام ہے کہ ہم نے نظریہ پاکستان کی مخالفت کی ہے۔ آخر نظریہ پاکستان سے آپ کی مراد کیا ہے؟ اس کی وضاحت حکومت کے کسی قانون میں موجود نہیں کیونکہ سیاسی فلسفے کی تاریخ میں کسی ملک یا زمین کے خطّ کے ساتھ نہ تو کوئی نظریہ قائم ہے اور نہ ہی اس سے پہچانا جاتا ہے۔ میرے خیال میں بالکل اُسی طرح جس طرح سورج کی کرنوں کا یا بچے کی مسکراہٹ کا کوئی دیس نہیں ہوتا۔ اگر نظریہ کسی زمین ہی سے بندھا رہتا تو عرب میں نازل ہونے والا اسلام یہاں تک نہیں پہنچتا اور ہم اس خطّ میں جنم لینے والے نظریہ کے لحاظ سے اب تک سکھ ہی رہتے۔

ملک کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نظریہ پاکستان کی اصطلاح

پہلی مرتبہ ایوب خان کے زمانے میں کسی بل پر بحث کے دوران جماعت اسلامی کے ایک رکن نے استعمال کی تھی۔ بعد میں یحییٰ خان نے اسے کسی حد تک لیگل فریم ورک آرڈر میں جگہ دی اور اب ضیاءالحق اس کا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے۔اس سے صرف ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ فوجی آمر اپنے اقتدار اور مفادات کے لئے ایک ایسی جذباتی اورمبہم گھڑ رہا ہے جس کا حقیقی معنوں میں تحریک پاکستان سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔کسی ملک کا اگر نظریہ ہوسکتا ہے تو وہ وہاں کے اکثریتی عوام کا نظریہ ہی ہوسکتا ہے۔ پاکستان کا نظریہ پاکستان کے محنت کشوں کا نظریہ ہوگا جن کی ملک میں اکثریت ہے اور جن کا مفاد ملک کے مفاد سے ہی مطابقت رکھتا ہے اور جو ملک کی ترقی اور خوشحالی چاہتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس ملک کا نظریہ جمہوریت اور سامراج دشمنی ہے۔ میں نہ صرف اس نظریہ پر قائم ہوں بلکہ اس کے لئے اپنی جان کی بازی بھی لگانے کے لئے تیار ہوں۔

جناب یہ الزام مجھ پر مارشل لاء ریگولیشن 18 کے تحت لگایا گیا ہے۔ یہ وہی ضابطہ ہے جس میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جو کوئی مارشل لاء کے مقاصد کی مخالفت کریگا۔۔۔اب تو آپ کی حکومت میں نو ماہ وزیر رہنے والے جنرل ضیاء کے کٹر حامی پروفیسر غفور نے بھی کھلم کھلا یہ کہا ہے کہ ''مارشل لاء کے مقاصد ذاتی اقتدار کو طول دینے کے علاوہ کچھ نہیں۔'' (جنگ 28 دسمبر 1982) ویسے ہم تو اس ریگولیشن کو بنیادی طور پر صرف اپنے مخالفین کو قید کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ بہرحال میری گذارش ہے کہ آپ اپنی حکومت یا وکیل استغاثہ کو کہہ کہ یہ وضاحت کرادیں کہ مارشل لاء کے مقاصد کیا ہیں؟ اب یہ ابہام بہت ہوگیا۔ بعض عقل کے اندھے حکام جو سوشلزم کو نظریہ پاکستان کے خلاف گردانتے ہیں اور قائداعظم کے اسلامی سوشلزم کے اعلان کو چھپاتے ہیں وہ دراصل مسلمانوں کے افکار کی نظریاتی ارتقاء سے بالکل بےخبر ہیں۔ وہ سلسلہ جو اوائل اسلام کے حضرت ابوذر غفاریؓ کی تشریح سے شروع ہوا شاہ ولی اللہ علیہ رحمتہ اور مولانا عبیداللہ سندھی سے ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے۔ سوشلزم دراصل انسانی فکر کی اس ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ علامہ اقبال اور ڈاکٹر علی شریعتی بھی اس سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ میں اس کے ثبوت میں ایک جریدے ویو پوائنٹ کے 23 اپریل 1982 کے شمارے کے صفحہ 10 اور 11 پر شائع شدہ شورش عرفانی کا مضمون اور روزنامہ ''امن''

18 نومبر 1882 کو شائع ہونے والا ناصر منصور صاحب کا مضمون پیش کرتا ہوں موجودہ حکمراں جو آج کل اپنے نظریہ ضرورت کو بھی اسلام سے ثابت کرنے کی بھونڈی کوشش کر کے اسلام کو بدنام کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔اس کے جواب میں جناب فاروق قریشی کا مضمون جو روزنامہ ''جنگ'' 25 دسمبر 1982 کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔اُسے بھی آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں (ضمیمہ۔ح)

ہم پر یہ الزام ہے کہ ہم نے پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس کی خلاف ورزی کی ہے۔ جناب میں صحافی ہوں اور ایک ایماندار صحافی کے طور پر جوزف پالٹرز کے اس قول سے متفق ہوں کہ:

''ہمیشہ مراعات یافتہ طبقات کی مخالفت کرو اور غریبوں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آؤ، عوام کی بہبود کے لئے اپنے آپ کو وقف کرو اور بُرائی پر حملہ کرنے سے نہ ڈرو''

جناب جیسے شاہ بھٹائی کا دُکھ ان کا ذاتی دکھ نہیں تھا۔اقبال کا درد ان کا ذاتی درد نہیں تھا اور جسٹس کیانی کا طنز ان کا ذاتی طنز نہیں تھا بلکہ پورے عوام کی طرف سے تھا۔ مقبول جرمن شاعر گوئٹے کے بقول ''میری تخلیقات دراصل اجتماعی تخلیق ہیں گو کہ ان پر نام صرف گوئٹے کا ہے۔''

اس طرح میں نے جو کچھ کہا ہے وہ دراصل اس دور کی ترجمانی کی ہے، گو کہ حکام شعور کو گرفتار کرنے میں نہ کبھی کامیاب ہوئے ہیں اور نہ کبھی ہوں گے۔ ہمارے ملک میں یوں تو ہر دوَرِ حکومت میں ذرائع ابلاغ پر مکمل کنٹرول رکھا ہے۔ دو سال سے بھی زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے کہ ملک کے ذرائع ابلاغ پر باقاعدہ سنسر شپ نافذ ہے۔اخبارات اور ریڈیو کا یہ حال ہے کہ کوئی سیاسی خبر پڑھنے اور سننے میں نہیں آتی ۔اگر اتفاق سے کوئی چیز چھپ بھی جائے تو وہ سامراج نواز سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے نمائندہ سیاستدانوں ہی کی شائع ہیں۔ ہمارے قومی اخبارات کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ وہ کراچی یا لاہور سے نہیں بلکہ لندن یا واشنگٹن سے نکلتے ہیں۔غیر ملکی خبریں بھی ایسی کہ لیڈی ڈائنا کی شادی اور اس کے بچے کی پیدائش کے لمحہ بہ لمحہ کی خبروں سے ہمارے ملک کے عوام کو آگاہ کیا جاتا ہے اور اس کے بعد بھی اگر جگہ بچ جائے تو اُسے پڑوسی ممالک کو گالیاں دینے اور اُن سے تعلقات خراب کرنیوالے مضامین سے سیاہ کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے لیکن محنت کشوں کے اور ملکی مسائل کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان حالات میں اگر مزدور طبقہ اپنے محدود وسائل

سے کوئی اخبار یا ہینڈ بل نکال کر لوگوں کو اپنے مسائل سے آگاہ کرنا چاہے تو حکمران اُسے قطعاً برداشت نہیں کرتے ۔ وہ اتنی سختیاں اور ایسے حربے استعمال کرتے ہیں کہ محنت کش طبقات اپنی بات عوام تک نہ پہنچا سکیں ۔ یہ تو آپ کے علم میں ہوگا کہ لاہور سے شائع ہونے والے روزنامہ امروز او رہفت روزہ ''لیل ونہار'' کو حکومت نے اس لئے اپنے قبضہ میں لے لیا تھا کہ ان میں محنت کشوں کے حالات ، مسائل اور جدوجہد سے متعلق خبریں چھپ جایا کرتی تھیں ۔ اسی طرح سے کوئٹہ سے شائع ہونے والا ہفت روزہ سنگت بھی محنت کشوں کی امنگوں کا ترجمان تھا۔ میں بھی اس میں کام کرتا تھا لیکن اس وقت کی حکومت نے اسکی اشاعت میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالیں ۔اس کے ایڈیٹر اور اسٹاف کے دوسرے لوگوں کے وارنٹ گرفتاری جاری کئے گئے اور پبلشر کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی ، ہم پر تشدد کیا گیا اس طرح سے یہ اخبار اپنی اشاعت جاری نہ رکھ سکا اور بند ہو گیا۔ خیر بقول فیض کہ

متاعِ لوح وقلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے

جناب صحافت وہ پارلیمان ہے جس کا اجلاس مسلسل جاری رہتا ہے اور جن قوموں کی پارلیمان کے اجلاس جاری رہتے ہیں وہ کسی بھی میدان میں نہیں ہارتیں۔ دوسری جنگِ عظیم میں برطانیہ کے جنگ جیتنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس کی اسمبلی کا اجلاس مسلسل جاری رہا۔ ہٹلر یہ جنگ اس لئے ہار گیا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو واحد خدائی فوجدار سمجھ لیا تھا۔

مجھ پر وہ حکومت قابلِ اعتراض مواد کی اشاعت کا الزام لگا رہی ہے جو خود صحیح اور حقیقی خبروں سے ڈرتی ہے ۔ آخر پریس پر یہ سنسر شپ کیوں ہے؟ ذہنی نشو ونما معاشرہ کی سماجی وثقافتی ترقی کو تیز کرنے اور انتخابات کی فضا کو سازگار بنانے کے لئے اخبارات اور پریس کی آزادی کو دبانے کے لئے نہ صرف سنسر شپ لگا رکھا ہے بلکہ اس مقصد کے لئے اس نے اپنے دورِ حکومت میں سینکڑوں صحافیوں کو بیروزگار کیا۔ انہیں جیلوں میں ٹھونسا، ان کی پیٹھ پر کوڑے لگائے اور پھر جو لوگ اس گھٹن کے خلاف کام کرتے ہیں ان پر پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس کا مقدمہ قائم کیا جاتا

ہے۔ پہلے ضیاء ٹولہ خود اس قانون کا احترام کرنا سیکھے اور اُسے عوام کی خواہشات کے مطابق بنائے، پھر یہ الزامات لگائے ورنہ تب تک یہ الزامات بدنیتی پر مبنی ہیں اور جو الزامات بدنیتی کے تحت لگائے جاتے ہیں ان کا حقائق سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔

ضیاء ٹولے نے اقتدار غصب کرنے کا جو نام نہاد قانونی جواز سپریم کورٹ آف پاکستان سے حاصل کیا تھا وہ بھی اب ختم ہو گیا ہے۔ سپریم کورٹ نے بیگم نصرت بھٹو کیس میں کہا تھا کہ (چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر) اپنی تمام قوت ایسے حالات پیدا کرنے میں صرف کرے گا کہ ملک میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات ہو سکیں اور ملک میں آئین کے مطابق جمہوریت بحال ہو سکے۔''

جناب کون حکومت کرے اور کون نہ کرے، یہ طے کرنا آپ کا نہیں عوام کا کام ہے۔ حکومت اور عدالتیں عوام کے لئے بنتی ہیں۔ عوام حکومتوں اور عدالتوں کے لئے نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود سپریم کورٹ نے ضیاء ٹولے کو ''محدود مدّت'' کے لئے مشروط طور پر حکومت کرنے کا اختیار دیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ضیاء ٹولہ بار بار انتخابات ملتوی کر کے مکمل طور پر ننگا ہو چکا ہے لہذا مجھ پر قانونی حکومت کی مخالفت کا الزام سرے سے ہی غلط ہے۔

ہم پر الزام ہے کہ ہم نے مختلف طبقات کے درمیان نفرت پھیلائی۔ یہ الزام سراسر جھوٹا ہے کیونکہ ہم طبقاتی نفرت نہیں بلکہ طبقاتی شعور بڑھاتے ہیں اور طبقاتی کشمکش کو تیز کرتے ہیں کیونکہ ہماری نظر میں ''سماجی امن'' اور انسانی ترقی کا یہی قابل عمل راستہ ہے مگر اس کے برعکس طبقاتی نفرت موجودہ حکمران پھیلاتے ہیں۔ یہ استحصالی طبقات کی پشت پناہی کر کے، سرمایہ داروں، جاگیرداروں، وڈیروں اور سرداروں کو محنت کشوں، کسانوں اور دوسرے مظلوم عوام پر جبر استبداد جاری رکھنے کی شہ اور طاقت دیتے ہیں، اس طرح انہوں نے مظلوموں کے ہاتھ باندھ دیئے ہیں۔ اُن کی زبانیں بند کر دی ہیں اور ظالموں کے ہاتھوں میں کوڑے دیئے ہیں۔ یہ تاریخ کے بڑھتے ہوئے دھارے کو بیڑیاں ڈال رہے ہیں تاکہ معاشرہ گل سڑ جائے۔ اس لئے مجرم ہم نہیں تم ہی ہو۔ ہم محنت کش لوگ تو ایسے نصب العین کے لئے جدوجہد کرتے ہیں جس میں طبقات

ہی ختم ہو جائیں تو طبقاتی منافرت کا وجود بھی نہ ہوگا۔

ہم پر مذہبی نفرت پھیلانے کا الزام بھی جھوٹا ہے۔ چونکہ ہم مذہبی آہنگی، فرقہ وارانہ بھائی چارے اور عدل و انصاف پر مبنی مساوات کا نظام قائم کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں اس لیے ہم ریاستی امور میں مذہبی اور فرقہ ورانہ مداخلت کے خلاف ہیں اور سیکولر جمہوریت کے حامی ہیں۔ (پاکستان کے بانی بھی ایسی ہی سیکولر جمہوریت کے داعی تھے) مگر یہ موجودہ حکمران ہیں جو مختلف فرقوں، طبقوں اور مذہب کے خلاف نفرت پھیلاتے ہیں اور عوام کی توجہ ان کے اصل مسائل سے ہٹانے اور انہیں کمزور کرنے کے لئے مختلف فرقوں، طبقوں بلکہ قوموں کو بھی آپس میں لڑاتے رہے ہیں۔ ان کے فرنگی آقا بھی یہی کرتے تھے۔ انہوں نے مذہب میں تفریق کی بناء پر کروڑوں لوگوں کو تیسرے درجہ کا شہری بنا کر رکھ دیا ہے۔ انہوں نے شیعہ سنّی، احمدی سنی، ہندو مسلم، وہابی اور بریلوی کے نام پر فسادات کروائے اور کروا رہے ہیں۔ اس لئے مجرم خود ہیں ہم نہیں۔

ہم پر مسلح افواج کے خلاف نفرت پھیلانے کا بھی الزام ہے۔

ہم پاکستانی فوج کے خلاف نہیں بلکہ اس فوج کے چند مفاد پرست اور اہل ہوس جرنیلوں کی آمریت کی خلاف ہیں۔ یہ آپ کے حکمراں ہی ہیں کہ جنہوں نے پاکستانی افواج کو بھاڑے کا ٹٹو بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہ فوج کو محض بھیڑ بکریاں بنانے کا جرم ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ انہوں نے پاکستانی افواج کو وحشی درندوں کا روپ دے کر بنگلہ دیش اور ساری دنیا میں بدنام کر دیا ہے۔ انہوں نے بلوچستان کے نہتے عوام پر فوج کشی کر کے اور ملک بھر میں مارشل لاء نافذ کر کے فوج کو بدنام کیا ہے اور فوج کو اپنے ہی ملک کو فتح کرنے اور ملک کے نہتے مظلوم عوام پر جبر و تشدد کرنے کا حکم دے کر ذلیل و خوار کیا ہے۔ وہ اپنے رجعت پسند اور سامراج کی دلال نوکر شاہی اور رجعتی ملّاؤں کی شہ پر ملک کے سیاسی، سماجی و معاشی امور پر فوجی کنٹرول قائم کر کے ملک کو تباہی و بربادی کے گڑھے میں دھکیل رہے ہیں اور اس طرح سے پاکستان افوج کو رسوائے زمانہ کیا ہے۔ انہوں نے ایک مخصوص جرنیل ٹولے کو اقتدار کو طول دینے کے لئے فوج کو اندھا دُھند استعمال کیا ہے اور عوام کی نگاہوں میں گرا کر عوام دشمن بنا دیا۔ انہوں نے اسرائیل کی شہ پر اور امریکہ کی پشت

پناہی پر1970 میں اردن جا کر فلسطینی مجاہدین کا قتل عام کیا۔ اومان اور سعودی عرب وغیرہ میں پاکستان کے بے روزگار نوجوانوں اور پاکستان کے سپوتوں کو کرائے کی فوج بنا کر بھیجا اور تمام آزادی پسند دنیا اور عالمِ اسلام میں رُسوا کیا اور ایک عرصہ سے افغانستان کے عوامی انقلاب اور حکومت کے خلاف بھی پاکستان کے فوجی جوانوں کو استعمال کر رہے ہیں۔ انہوں نے پاکستانی افواج کو عالمی سامراج کا چوکیدار بنا دیا ہے اور اس طرح ملک کی آزادی اور سلامتی تک کو خطرے میں ڈال دیا ہے، اس لئے ہم فوج کو ایک مخصوص ہوس پرست جرنیلی ٹولے کے جبر سے آزاد کر کے صحیح معنوں میں ایک جمہوری محبّ وطن فوج بنانے کے حق میں ہیں۔ ہم فوج کو اس کا جائز مقام یعنی ملک کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے متعین کرنا چاہتے ہیں۔ فوج کو بدنام انہوں نے کیا ہے۔ مجرم ہم نہیں وہ ہیں۔

ہم پر الزام ہے کہ ہم قانون کے تحت قائم کی گئی حکومت کے خلاف بغاوت کے مرتکب ہوئے

قانون کے تحت قائم کی گئی حکومت کی بات بھی خوب ہے۔ آپ کی حکومت نے تو ہر قانون کو روند ڈالا ہے۔ پھر یہ کس منہ سے قانون کا نام لیتی ہے؟ آپ کی حکومت نے ملک کے آئین کو اور اس آئین کے تحت عوام کی منتخب حکومت کو بالجبر توڑا، اسمبلیاں توڑیں، تمام جمہوری ادارے اور تمام اخلاقی، مذہبی وسماجی قوانین کو نفرت سے اپنی شیطانی طاقت کے بل پر ٹھوکر ماری۔ اب یہ قانون کے تحت کہاں سے ہوگئی؟

بھٹو شہید نے فوجی جرنیلوں کے بہت ہاتھ باندھے تھے اور اپنی جانب سے کمال کر دکھایا تھا۔ جب انہوں نے فوج کو آئین کے تحفظ کی قسم دلائی اور آئین میں آئین توڑنے والوں کا پھانسی دیئے جانے کی سزا رکھی (لیکن اس نے عوام کو اور محنت کشوں کو منظّم نہیں ہونے دیا اور نہ ہی جمہوریت کو مستحکم ہونے دیا) مگر شیطان صفت ریاکار کے ہاتھ کون باندھ سکتا ہے؟ اور یہ موجودہ حکمران قانون کو کھا جانے والے ہی نہیں اس کے قاتل بھی ہیں۔ قانون کے قاتل، آئین بنانے والوں کے قاتل جبکہ ہم اس ملک میں قانون کی حکمرانی چاہتے ہیں اور قانون بنانے والے عوامی اداروں کی بحال اور نشو ونما کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس لئے مجرم ہم نہیں موجودہ حکمران اور سینئر جرنیلوں کا ٹولہ ہے!

اگر غاصب فوجی ٹولے، سامراج اور سامراج کی حمایتی حکومت کے خلاف عوام کو جدوجہد پر آمادہ کرنا بغاوت ہے، تو پھر یہ الزام درست ہے۔ تو پھر ہم اس ملک کے ننانوے فیصد عوام باغی ہیں اور ایسی عوام دشمن حکومت کے خلاف بغاوت کرنا ہی درحقیقت حُب الوطنی ہے۔ سامراج کی گماشتہ اور عوام دشمن وغیر جمہوری حکومت کو اُلٹنے اور اس کی جگہ محبّ وطن عوامی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد ہمارا مقصدِ حیات ہے۔ ہم اس بغاوت کے مرتکب ضرور ہوئے ہیں اور آئندہ بھی یہ ''جرم'' کرتے رہیں گے۔

اس ملک کے تمام جمہوریت پسند عناصر موجودہ غاصب فوجی حکومت کو اُلٹنا چاہتے ہیں اور عوام طبقاتی منافرت ختم کرنا، مختلف فرقوں، مذاہب اور قوموں کے درمیان نفرت کے تمام اسباب کو ختم کرنا اور مسلح افواج کو اپنی غیر پیشہ ورنہ عوام دشمن سرگرمیوں سے آزاد کرکے، یوں انہیں اپنے ہی عوام کے خلاف صف آرائی سے ہٹا کر مزید بدنامی اور رسوائی سے بچانا چاہتے ہیں۔ اس طرح سے ہمارے خلاف عائد کی گئی فردِ جرم محض ہمارے خلاف نہیں بلکہ درحقیقت تمام محبّ وطن عوام کے خلاف ہے۔

آپ کی حکومت کی جانب سے عوام کے خلاف عائد کردہ اس فرد جرم کا فیصلہ آپ کی اس بند کمرے کی مارشل لاء عدالت میں نہیں بلکہ ہماری دھرتی کی شاہراہوں پر ہوگا۔ ہمارے عوام کی عدالت میں ہوگا۔ آپ کی حکومت کو ہتھیاروں پر یقین ہے جب کہ ہمیں عوام پر اعتماد ہے۔

ایران کے سامراج دشمن انقلاب کو یاد رکھو۔ عوام ناقابل تسخیر ہوتے ہیں۔ آپ کی حکومت امریکی سامراج کی ایجنٹ ہے اور یوں عوام کی غدار ہے۔ ہم عظیم محبّ وطن ہیں کیونکہ ہم غریب مظلوم اور محنت کش عوام کے نمائندے ہیں۔ ہم تاریخ کے ہر دور میں مزدوروں اور کسانوں، طلباء اور صحافیوں، اساتذہ اور وکلاء، دانشوروں اور خواتین کے حقوق کے لئے لڑتے رہے ہیں اور لڑتے رہیں گے۔ سامراجی ایجنٹوں، عوام کے غداروں، موجودہ حکمرانوں کو بالآخر ایک نہ ایک دن تاریخ کے کباڑ خانے میں دفن ہونا ہی پڑے گا۔

شبیر شر

جناب صدر اور اراکین عدالت

یہ 29 جولائی 1980 کا دن تھا جب میں نے اپنے آپ کو پہلی مرتبہ اتنا اہم سمجھا، اتنا اہم کہ میں خود حیران رہ گیا تھا۔ اس قدر شاندار استقبال کسی عام آدمی کا نہیں ہوسکتا تھا۔ کامریڈ جام ساقی سچ کہتا ہے کہ ہم اتنے ہی اہم ہیں جتنا حکومت ہمیں سمجھتی ہے۔

مجھے یہ تو پتہ نہیں کہ گرفتاریوں اور آزادیوں کا آپس میں کتنا گہرا رشتہ ہے لیکن 26 جولائی کیوبا کا یوم آزادی ہے اور میں 29 جولائی کو گرفتار کیا گیا۔ وہاں کیوبا کے عوام ابھی آزادی کا جشن منا کر اپنی تھکن دور نہیں کر پائے ہوں گے کہ یہاں مجھے گرفتار کرلیا گیا۔ وہ واقعی خوش نصیب ہیں لیکن میں سوچتا رہا کہ بہرحال دونوں ملکوں میں کتنا بڑا تضاد ہے۔ ایک جگہ سرخ پرچم بلندی پر اور آزاد فضاؤں میں لہرا رہے تھے اور دوسری طرف ''سرخ پرچم'' کو گرفتار کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور مجھ پر اسے لہرانے کی فرد جرم عائد کرکے قید کرلیا گیا۔ پس جناب! میں بہت اہم قیدی ہوں اس لئے نہیں کہ میرا نام کیا ہے اور نہ اس لئے کہ میں ملک کے کس حصے میں پلا بڑھا ہوں بلکہ اس لئے کہ بین الاقوامی فکر کا حامل سرخ پرچم میری پہچان کا معیار مقرر ہوا ہے اور شاید اس لئے بھی کہ کہیں میری آزادی ملک کو بھی آزاد نہ کرالے۔ میں آپ کو ایک راز کی بات بتانا چاہتا ہوں مجھے کوئی ایسی خوش فہمی نہیں تھی کہ میں اکیلے وہ سب کچھ کر جاؤں گا لیکن اگر حکومت اس طرح سمجھتی تھی تو پھر ٹھیک ہی سمجھتی ہوگی۔

شاید میں ملک کا اہم ترین آدمی ہوں یا کسی اہم ترین کارواں کے ساتھ سفر کررہا ہوں یا کوئی اہم سوچ مجھ پر اپنے رنگ کے عکس چھوڑ گئی ہوگی، یا پھر رنگوں کا بادشاہ سرخ رنگ، اپنا عکس

ڈال گیا ہوگا بہر حال میری اہمیت کا کوئی تو سبب ضرور ہوگا۔ بھلا اتنے بڑے بڑے سرکاری دماغ بھولے تو نہیں ہوں گے!

جب مجھ پر گوریلا کاروائی ہوئی تب حکومت نے دیکھا کہ میں نے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے، پسینے میں شرابور تھا اور تلاشی کے بعد میرے پاس سے صرف ساڑھے تین سو روپے برآمد ہوئے تھے، پھر بھی وہ مجھ سے خوف زدہ تھے۔ یہ بہر حال ایک اچھی علامت ہے کہ حکومت مفلس آدمی سے ڈرنے لگی ہے لیکن شاید وہ اِس حقیقت سے آگاہ نہیں تھے کہ میں ایک دولت مند یا شاید ملک کے چند امیر ترین لوگوں میں سے ایک ہوں۔ میں کسی غیر ملکی امداد کی بات نہیں کر رہا، میں اس دولت کا ذکر کر رہا ہوں جو میرے پاس میرے دل کی صورت میں موجود ہے، میرا دل جو ساری دنیا کے غریبوں کیلئے دھڑکتا ہے۔ میرا دل وہ تجوری ہے جو دنیا کے سارے احساسات کو اپنے اندر سمو سکتا ہے آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ جب کسی کا دل دنیا کے تمام محنت کشوں کے ساتھ ایک ہی سُر اور تال میں دھڑکنے لگتا ہے تو اس وقت خوف مر جاتا ہے اور بڑی بڑی عوام دشمن توپیں اس طرح تھر تھر کانپنے لگتی ہیں جیسے آج کی حکومت مجھ سے اور میرے ساتھیوں سے کانپ رہی ہے۔

تو جناب! میں آج کا اہم ترین شخص ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ فوجی افسر نے مجھے بازو سے پکڑتے ہوئے کہا تھا ''بہت خوب'' ایسا ہی جملہ ہم کرکٹ کے میدان میں چھکا لگتے وقت سنتے ہیں، یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے کشمیر کا کوئی مورچہ سر کر لیا ہو۔ جہاں تک میرا خیال ہے، اس موقع پر اس کو شرمندہ ہونا چاہیئے تھا، آخر اس نے کسی جنرل اروڑا یا رما نک شا کو تو نہیں پکڑا تھا، مجھے پکڑنا کونسی فخر کی بات تھی؟ ایک تو میں عام شہریوں کی طرح پر امن اور خالی ہاتھ تھا دوسرا میں سماج کا کوئی ناسور نہیں بلکہ ایک سماج سدھار تھا۔ میرے خیال میں سماج کی اصلاح کرنے والوں کو اس طرح باندھنا اور انہیں جانوروں کی طرح گرم سلاخوں سے داغنا سماج کے ناسُوروں ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ لیکن شاید اس سارے چکر میں اُن کا کوئی قصور نہیں۔ وہ اپنے پرانے غصے عوام پر نکالنا چاہتے ہیں اور اپنی جنگی قیدی بننے والی خفت

مٹانے کیلئے پاکستانی عوام کو پکڑ کر اور انہیں جنگی قیدی سمجھ کر اپنا دل خوش کر رہے ہیں۔

لیکن جناب! اگر ایک لاکھ فوجی ہتھیاروں سے مسلح ہونے کے باوجود ہتھیار ڈال کر آتے ہیں تو اس میں شبیر شر کا کیا قصور ہے؟

جناب! پھر اس نے اپنے ماتحت کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا ''تم بڑے ذہین ہو'' میرے خیال میں وہ مڈل پاس بھی نہیں ہوگا لیکن اگر ہوگا بھی تو جناب! ذہین آدمی کی آنکھیں تو علم کی روشنی میں ہمیشہ آگے کی راہوں کو تلاش کرتی ہیں اور آگے بڑھنے والوں کو مزید آگے بڑھنے میں مدد کرتی ہیں۔ وہ تو روکنے والوں میں سے تھا۔ ایسے آدمی کو دل پڑھا لکھا جاہل کہنے پر بھی آمادہ نہیں ہوتا۔ پھر بھی میں اُن کا احسان مند ہوں کہ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ میں بہت اہم آدمی ہوں۔

پھر اُس نے مجھے کہا ''ڈرامہ ختم ہوگیا'' اس کا اشارہ شاید عوام کی تحریک کی جانب تھا۔ لیکن جناب! ڈرامے اور کہانی کے پلاٹوں اور ٹیکنیک کے بارے میں، میں اُن سے زیادہ معلومات رکھتا ہوں، اس لئے کہ یہ فنکاروں اور اداکاروں کا کام ہے۔ اس کا کردار ختم ہوگیا ہوگا لیکن شیکسپیئر کی بے عزتی کرنے کا حق، میں اس کو نہیں دے سکتا تھا۔ جس نے کہا تھا کہ ''دنیا ایک اسٹیج ہے جہاں ہر فرد اپنا اپنا کردار ادا کر کے چلا جاتا ہے'' تو جناب! میں نے اس کو بتایا کہ ''ڈرامہ ختم نہیں ہوا''، لیکن اُس ذہین آدمی نے اعتبار ہی نہیں کیا۔ پھر اس نے مجھے ایک عجیب خبر سنائی، اس نے مجھے بتایا کہ میں بہت دنوں سے روپوش تھا۔ اس کی یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی۔ میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ اگر مجھے روپوش ہونا ہوتا تو میرے وطن کا کوئی بھی گھر مجھے موت کے فرشتے سے بھی چھپا لیتا۔ آخر میں اتنا بیکار آدمی تو نہیں تھا یا میں ملک پر اچانک قبضہ کرنے والا مارشل لاء کا کوئی گینگ لیڈر تھا جو آدمیوں سے چھپتا پھر رہا ہوتا۔ میں نے اس افسر کو بتایا تھا ''آپ بہت دیر سے آئے ہیں، طبقاتی شعور پھیل چکا ہے اور اس کی ایک ادنیٰ سی مثال میں خود ہوں'' وہ اس پر بھی ضد کرتا رہا کہ میں ہی ملک کی اعلیٰ ترین مثال ہوں۔ بہر حال خوشی کی بات ہے کہ اس کو طبقاتی شعور کی اہمیت کے بارے میں کچھ معلومات تھیں اگرچہ کم ہی سہی شاید یہی سبب تھا کہ اس نے مجھے بتایا کہ میں ملک کا اہم ترین آدمی ہوں۔

میں نے اس کو یہ بھی بتایا تھا کہ مجھے پہلے سے ہی سن گن تھی کہ وہ آئیں گے۔ میں نے کہا تھا ''تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آ گیا'' اس نے حیران ہوکر پوچھا تھا۔ ''کیسے؟'' شاید اس نے سمجھا کہ مجھے سرکاری رازوں کی خبر ہوچکی ہے۔ اس نے حیران ہوکر پوچھا تھا کہ اس کے باوجود ہم اُن کا انتظار کیوں کر رہے تھے۔ سچ یہ ہے کہ اُس وقت مجھے اپنی ہنسی روکنی مشکل ہوگئی تھی۔ میں نے ہنسی روک کر اُسے بتایا ''محترم! ہر قصے میں جادوگر چڑیل اور کانا دیو تو ہوتے ہی ہیں''۔ اس پر اس نے کہا تھا کہ وہ میرا دماغ درست کر دے گا، میرا جواب تھا ''میں نہ صرف سرخ سوچ کا پرچارک ہوں بلکہ اگر موقع ملا تو آئندہ بھی بنا رہوں گا'' لیکن وہ بگڑ گیا غصے کے مارے اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی، لفظوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا پھر بھی اُس نے کہا ''تم بڑے خطرناک آدمی ہو'' میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ ''شاید تمہاری نظر میں ہر شریف آدمی خطرناک ہوتا ہے''۔ پھر میری آنکھوں پر کالی پٹیاں باندھ دی گئیں اور میں نے شکر ادا کیا کہ اب میں شیطان کا چہرہ نہیں دیکھوں گا۔

لانڈھی جیل میں قیدی بچے خطرناک قیدی کیلئے۔ ''ڈانڈرس'' قیدی کا محاورہ استعمال کرتے ہیں۔ ان کے معصوم ذہنوں میں وہ لوگ ڈانڈرس ہوتے ہیں جن کی قامت پہلوانوں جیسی ہو، بڑی بڑی اور تاؤ دی ہوئی مونچھیں ہوں اور وہ کم سے کم دس پندرہ خون کر چکا ہو۔ جب وہ اپنی زندگیاں ''خطرے'' میں ڈال کر ڈرتے ڈرتے مجھے دیکھنے آئے تو بڑے مایوس ہوئے اور حیران بھی، کیونکہ میں نے نہ خون کئے تھے اور نہ بھولو پہلوان جتنا وزن رکھتا تھا اور نہ ہی میں نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دے رکھا تھا۔ نہ ہی میری آواز میں شیروں جیسی گرج تھی۔ نہ میں نے اُن سے چرس مانگی اور نہ ہی کٹ لیکن وہ یقین کرنے پر مجبور تھے کہ میں بڑا ڈنڈارس قیدی ہوں کیونکہ جیل انتظامیہ یوں کہہ کر اُن کو ہم سے دور رکھ رہی ہے۔ حکومت ہمیشہ حقائق کو عوام سے چھپا کر جھوٹ بولتی ہے اور اپنی رائے مسلط کرتی آئی ہے۔ بچے تو معصوم ہیں لیکن اس ملک کے عوام کو بھی یہی بتایا جاتا ہے کہ سیاسی لوگ ملک دشمن اور نہایت ڈانڈرس ہیں تو جناب! میں بڑا ڈانڈرس قیدی ہوں۔

پاکستان کے قانون کے مطابق قتل کے مجرم کی دو سال کے اندر ضمانت ہوجاتی ہے،

لیکن سیاسی مقدمے کے قیدیوں کیلئے یہ بات ناممکن ہےتو جناب! ایک طرف تو سیاسی قیدیوں کو سب ڈانڈرس سمجھتے ہیں دوسری طرف سرکاری حکمناموں میں آتا ہے کہ ان پر سختی کا مطلب ہے سات مہینے کال کوٹھڑی۔ اِس کو کہتے ہیں ''بیٹا باپ سے بھی گورا'' سندھی کہاوت ہے کہ ''اونٹنی مارے دس تو اس کا بچہ مارے تیرہ'' افسر شاہی کے پینتس سال کی کارکردگی کی بہترین مثال۔ ہمارے ملک میں اور بھی بڑی نرالی باتیں ہوتی ہیں۔(ویسے تو ہر بات نرالی ہے) مثلاً جب امریکہ سے ہماری حکومت کی یاری کڑھائی پر جلیبی کی طرح پکتی ہےتو ہمارے جنرلوں کیلئے امریکہ سے ہتھیار آتے ہیں اور پھر شیر شاہ کے لشکر مسکین آدمیوں کے لئے زمین تنگ کردیتے ہیں۔ میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ جب امریکی بیڑہ کراچی کے سمندر پر پہنچتا ہےتو عوام کے اہم نمائندوں کوگرفتار کرکے اُن کواذیتیں دی جاتی ہیں۔1952ء میں بھی ایسا ہی ہوا تھا، امریکی بیڑہ پہنچتے ہی کامریڈ حیدر بخش جتوئی، سوبھوگیانچندانی، امام علی نازش، پروفیسر جمال نقوی اور دوسرے رہنماؤں کوگرفتار کیا گیا تھا تو جب جولائی1980 میں امریکی ساتواں بیڑہ کراچی کے سمندر میں پہنچا تو مجھے بڑی تشویش ہوئی کہ دیکھیں اب کونسے مجاہد پکڑے جاتے ہیں؟ کیا دیکھتا ہوں کہ میں خود ہی حراست میں ہوں۔ وہی جولائی کا مہینہ اور وہی سرخ پرچم کے خلاف کاروائی! واقعی میں بڑا ڈانڈرس ہوں۔

جناب! شبیر نام کے کتنے ہی نوجوان ملک میں ہوں گے۔ ریڈیو اور ٹی وی کے فنکاروں کی ملک میں کمی نہیں ہے، لیکن پھر بھی مکنی ہاتھ نے گرفتاری کے پھولوں کا ہار میری ہی گردن میں ڈالا ہے۔تو میں جو اس وقت تک بوکھلایا ہوا تھا، سمجھتا ہوں کہ اتنی بڑی اہمیت کا سبب یہی ہے کہ میں بھی اس قافلے کا مسافر ہوں جس میں ساری دنیا کے مظلوم لوگ ہر جگہ شامل ہورہے ہیں۔ کامریڈ کاسترو بھی اس قافلے کے رہنماؤں میں سے ایک ہیں۔ ہمارے دیہات میں کچھ بوڑھے پیار سے اُسے کامریڈ بلوچ کہہ کر بلاتے ہیں۔ ہمارے فوجی جنرلوں کی آقا امریکی حکومت بھی کامریڈ ''بلوچ'' سے ڈر کر اُس کو دنیا کا ڈانڈرس ترین آدمی کہتی ہے۔اس بدصورت حال میں حکومت کو مجھ جیسے لوگ نہایت ہی ڈانڈرس لگتے ہیں۔ مجھے گرفتار کرتے وقت اتنی تعداد میں سپاہی

اور فوجی کمانڈوز تھے کہ یہ بڑی فوجی کاروائی لگ رہی تھی۔ ہماری فوج کو گھروں پر حملہ کرنے کیلئے خاص ٹریننگ ملی ہوئی ہے اس لئے وہ ہمیشہ ''آپریشن فیئر پلے'' کرتے ہیں۔ پھر ایک دوسرے کو شاباسی دے کر مٹھائیاں تقسیم کرتے ہیں۔ مجھے عدالت میں پتا چلا کہ مجھ پر فوج کے خلاف نفرت پھیلانے کا الزام ہے۔

جناب! اگر میری گرفتاری سے شہروں میں فوجیوں کے خلاف محبت کے پھول کھلنے کے بجائے نفرت کی چنگاریاں بھڑک اٹھی ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میرے خیال میں یہ مقدمہ ان پر چلنا چاہئے جنہوں نے مجھے شہریوں کی مرضی کے خلاف گرفتار کر کے فوجی سپاہیوں کے خلاف نفرت پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ آخر شہریوں کی بھی کوئی رائے ہے، حکومت کو اس کی قدر کرنی چاہئے۔

جناب! پھر فوجی چھاونیاں تھیں، بند اندھیری کھولیاں اور میرا جسم ہاتھوں اور پیروں سمیت زنجیروں سے بندھا ہوا۔ کبھی الٹا لٹکاتے تھے کبھی سیدھا اور کبھی مارتے پیٹتے تھے نہ سگریٹ نہ پانی اور روٹی اُس وقت تک نہیں ملتی تھی جب تک ڈاکٹر چیک نہ کرے چاہے دن کی جگہ رات ہو جائے۔ اُنہوں نے میرا بہت اچھا ''خیر مقدم'' کیا۔ میں اُن کے احسانات کبھی نہیں بھلاؤں گا۔ انہوں نے اپنی اسلام پسندی کا اظہار بے جگری سے تشدد کر کے کیا، سپاہیوں کو صرف مار پیٹ کی اجازت تھی بولنے کی نہیں اس لئے کہ کہیں وہ بھی مجھ سے نہ مل جائیں۔ بات یہاں ختم نہیں ہوئی مجھے حیرت اُس وقت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ ہر دو گھنٹے کے بعد اُن کی ڈیوٹی تبدیل ہو جاتی۔ جناب! حضرت عیسیٰ کو فقط صرف تین دن صلیب پر لٹکایا گیا تھا لیکن میں اور میرے ساتھی پورے آٹھ مہینے تک بے انتہا جسمانی اور ذہنی اذیتوں کی صلیب پر لٹکے ہوئے تھے، ہوسکتا ہے کہ اُس کا دو میں سے کوئی ایک سبب ہو یا تو ہم حضرت عیسیٰ سے بھی زیادہ اہم آدمی ہیں یا اُس سے بہت زیادہ (اُوپر والے حساب کے مطابق اسی گنا زیادہ) ڈانڈرس انسان ہیں یا ہمارے دشمن اِسی گنا زیادہ کمینے ہیں۔

میں اپنے اور اپنے ساتھیوں پر ہونے والے تشدد کی تفصیل دہرا کر نہیں چاہتا کہ آپ کا

جی متلا جائے، مجھے ڈر ہے کہ آپ وحشت میں کہیں قے نہ کرنے لگیں۔ میں آپ کے سامنے صرف ایک بات دہرانا چاہتا ہوں کہ وہ 8اگست1980ء کی ایک صبح تھی جب کامریڈ نذیر عباسی شہید کو بھیڑیوں کے گھیرے سے نکالا گیا۔ زنجیر بکف جوان رعنا کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی گئی، اُس کا پروقار وجود زنجیروں سے چھن چھن کرتے ہوئے جانے کہاں چلا گیا۔

جناب! پھر مجھے بتایا گیا کہ اُس سے محنت کشوں کیلئے جینے کے جرم میں انتقام لیا گیا ہے۔ پھر پتہ چلا کہ جب اُس کا بے جان جسم دفن کیا گیا تو اُس وقت اس کے جسم کو کاٹنے کے نشانات تھے اور سینے میں دل نہیں تھا۔ ان بھیڑیوں نے کامریڈ کا دل نکال لیا تھا اور اُسے اپنے وحشی دانتوں سے چبایا تھا! آپ کو پتہ نہیں کہ ان کمینوں نے اُس گلاب جیسے دل کو لوہے کے پنجوں سے اور دانتوں سے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے جس میں محبت کا سورج چمکتا تھا، ہمت کے پہاڑ ایستادہ تھے، جس میں جوش کے بے انت طوفان اُٹھتے تھے، یہ دل کروڑوں انسانوں کے لئے دھڑکتا تھا اور ان گنت دل اس کے ساتھ ساتھ دھڑکتے تھے۔ اتنا پیارا انسان اور اس پر تہمت لگائی گئی کہ ''وہ ملک کا خوفناک ترین انسان تھا''۔ شرم! شرم!

جناب! موت سے لے کر بار بار موت اور ہر گھڑی، ہر پل چلا چلا کر موت کی دھمکیاں یا اُن سے بچنے کیلئے ساتھیوں سے غداری! میرے لئے یہی دو راستے چھوڑے گئے لیکن میں نے خودکشی کی بجائے شہادت کا راستہ سوچا۔ شاید ایسے ہی وقت کے لئے شاعروں کے سرتاج شاہ عبدالطیف بھٹائی نے کہا ہے۔

دوسرے قیدی آرام سے ہیں لیکن ہم قید میں بھی چپ نہیں ہیں، ہمارے جسم پر اپنے لوگوں سے وعدے کی تلوار لٹک رہی ہے۔

مجھے زندہ موت کی دعوت دینے کیلئے اسلام آباد اور لاہور سے لے کر سارے ملک کے بدترین دماغ میرے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ میرے پاس کوئی بہت اہم اطلاعات ہیں جو اُنہوں نے معلوم کرنا چاہیں۔ لیکن جناب! میرے پاس تو کچھ تھا ہی نہیں لیکن سوچنے کی بات یہ ہے اگر میرے پاس ایسی کوئی خاص اطلاعات ہوتیں بھی تو بھی میں انہیں کیسے

دیتا؟ میرے خیال میں ایک تو وہ پاکستان میں امریکی جاسوس تھے اور دوسرے جناب! میں بڑا ڈانڈرس شخص ہوں کوئی لیموں نہیں جس سے رس نچوڑ لیا جاتا۔ جناب! اخباروں میں جب کوئی خبر چھپتی ہے تو اسے اہمیت کے مطابق جگہ ملتی ہے۔ لیکن ہمارے ملک پر امریکی ڈالروں سے گوشت پر پلتے ہوئے آدم خور بھیڑیوں کا راج ہے۔ انہوں نے شہریوں کو بے حساب مسائل کے جال میں لپیٹ لیا ہے یا پنجروں میں قید کر لیا ہے اور ہر مرتبہ ان کی شہہ رگ کاٹ کر، خون پی کر پھر خون پینے کیلئے دوبارہ ٹانکے لگا دیتے ہیں۔ میرا اشارہ ملک میں بار بار مارشل لاء لگانے کی طرف ہے۔ پتہ نہیں کیوں آج مجھے سائنس فکشن پر مبنی فلم ''بندروں کا سیارہ'' یاد آ رہی ہے، جس میں انسان کو ''حیوان'' سمجھا جاتا ہے اور بندر کو اشرف المخلوقات۔ لیکن ہمارا ملک تو جیسے بھیڑیوں کا سیارہ ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان بھیڑیوں کا خیال ہے کہ میں اُن سے بھی زیادہ ڈانڈرس جانور ہوں۔

مجھے سمری آف ایویڈنس کیلئے ایک فوجی افسر کے سامنے آٹھ ماہ تک دن رات مسلسل چوبیس گھنٹے کھولی میں بند رکھنے کے بعد لایا گیا تھا اور اس دوران وکیل تو دور کی بات ہے مجھے اپنے رشتہ داروں تک سے ملنے نہیں دیا گیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے ان حق تلفیوں کے خلاف سول کورٹ میں فریاد داخل کرنے کا موقعہ ملے گا اور اگر وہ موقع نہ ملا تو دفاع کا موقع ضرور ملے گا لیکن جناب! یہاں بھی فوجی کاروائی ہوئی، وہ بھی جیل کے کمپاؤنڈ میں، ایک بند کمرے میں، بغیر وکیل کے اور کاروائی نوٹ کرنے کی اجازت کے بغیر۔ کمال یہ ہے کہ مدعی بھی فوجی، پکڑنے والے بھی فوجی، تشدد اور تفتیش کرنے والے بھی فوجی اور مقدمہ چلانے والے بھی وہی ٹوپیوں والے۔ وہ صرف ایک غلطی کر گئے کہ جوابدہی کے معاملے میں ان سے ناانصافی ہو گئی۔ اس کو کہتے ہیں کہ کرے کوئی بھرے کوئی۔ ایسے شاندار انصاف کی مثال دنیا میں کہیں اور شاید ہی مل سکے۔ بیچاری ہائی کورٹ آنکھیں پھاڑ کر دیکھتی رہ گئی اور بیچارے جسٹس رنگروٹ میجر کے سامنے بالکل بے بس یتیم ہو کر رہ گئے۔ خوف کے مارے وہ کچھ پوچھ بھی نہ سکے۔

لیکن جناب! ایف 16 اور ایٹمی ہتھیاروں سے لیس یہ حکومت اگر خائف ہوئی ہے تو

بس میرے جیسے ایک بیروزگار، بے اختیار شخص سے اور کیوں نہ ہوتی آخر میں بھی تو بہت ڈانڈرس شخص ہوں۔ پہلے تو مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں کتنا ڈانڈرس ہوں۔ پھر میں نے ڈانڈرس کامریڈ جام ساقی کو کیس میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ بھی تشدد برداشت کر کے ڈانڈرس ہو گیا ہے اور پھر دوسرے ساتھیوں کو دیکھا، اُسی راستے سے سفر کر کے آنے والے اور ڈانڈرس بنتے ہوئے لوگوں کو اور اب مجھے تو یہ مقدمہ ڈانڈرس قیدیوں کا تاریخی مقدمہ لگ رہا ہے۔

کورٹ کے صدر اور اراکین! ایک ڈانڈرس آدمی کو قید میں ڈالے رکھنے کے بعد سرکاری سطح پر جو دوسری سازشیں کی گئیں اُن میں سے ایک سازش ہمیں جلاوطن کرنے کی بھی تھی۔ مارچ 1981 میں ایک منصوبہ بنایا گیا کہ کسی طرح مجھے اور میرے ساتھیوں کو زبردستی ہاتھ پاؤں باندھ کر ہائی جیکروں کے مطالبے کے بہانے ملک سے باہر نکال دیا جائے۔ میرے اور میرے ساتھیوں کے صاف انکار پر حکومت کے اہلکاروں نے زبردستی ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ کر اور ہمیں اندھا کر کے تصویریں بنائیں۔ ہماری بھرپور مزاحمت نے ان کا کیمرہ توڑ ڈالا تھا، ظاہر ہے کہ قید خانے میں ہم اس سے زیادہ کیا کر سکتے تھے، ویسے بھی ہم ذہنی جنگ لڑنے کے حامی ہیں، لیکن اگر دوسرے جھگڑا کرنا چاہتے ہوں تو پھر دو ہاتھ ہر ایک کے پاس ہوتے ہیں۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ بی۔بی۔سی سے بھی بہت کچھ نشر کیا جاتا تھا کہ کمیونسٹوں نے جیل میں پھڈا ڈالا ہے۔ پھر ہماری ڈرپوک حکومت نے ہم سے تحریری طور پر پوچھا تھا کہ کیا ہم کابل یا دمشق جانے کیلئے تیار ہیں؟ تب جناب! ہم نے انہیں جواب دیا کہ پہلے تو ہمیں جیل سے رہا کرو اور پھر بات کرو۔ دوسرے محبِّ وطن پاکستانیوں کو زبردستی جلاوطن کرنے کی بجائے کچھ فوجی جنرلوں کو گرفتار کر کے اور باندھ کر باہر بھیج دو تا کہ سب لوگوں کی جان چھوٹے لیکن حکومت نے دونوں مطالبے نہیں مانے، خاص طور پر دوسرا۔ جناب! وہ کچھ جنرلوں کے مفاد میں ساری قوم کو جلاوطن کر سکتے ہیں لیکن کچھ گندی مچھلیوں (جنرلوں) کو قوم اور ملک کی بقا کیلئے جلاوطن اور قربان نہیں کر سکتے۔ جناب! یہ بھی جہاز کے پاکستانی یرغمالیوں کی خوش قسمتی تھی کہ جہاز میں تین امریکی اسمگلر موجود تھے۔ اگر وہ نہ ہوتے تو حکومت پاکستان جہاز کے تمام مسافروں کو بھی مروانے کیلئے بڑی خوشی سے تیار تھی۔ وہ

صرف یہ اعلان کرتی کہ ملک کے وقار کیلئے ضروری ہے کہ ڈیڑھ سو مسافر تو کیا، ملک کے آٹھ کروڑ انسان بھی ایک دھماکے سے اڑائے جاسکتے ہیں، لیکن حکومت کی اس بدنصیبی کو کیا کیجئے کہ آقاؤں کے تین افراد بھی اس جال میں پھنس گئے تھے۔ ایک طرف وہ ہائی جیکروں کے مطالبے کی آڑ میں ہمیں جلاوطن کرنے کے درپے تھی تو دوسری جانب جب میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ لبنان میں فلسطینی بھائیوں کی عملی جدوجہد میں شرکت کیلئے بیروت بھیجے جانے کا مطالبہ کیا تو حکومت نے یہ کہہ کر ہمارا مطالبہ رد کیا کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔

جناب! ہم نے زندہ بچ کر آجانے کی صورت میں واپس آکر مقدمہ لڑنے کا وعدہ کیا تھا، اس سے زیادہ بہتر ضمانت کوئی نہیں ہوسکتی تھی، لیکن حکومت کا وہی انکار برقرار رہا۔ حکومت خود اپنی جوابدہی کیلئے تیار نہیں تو اُسے دوسرے پر کیسے یقین آسکتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں اسرائیل کی طرف سے لڑنے کی پیشکش کر دیتا تو حکومت نہ صرف مجھے وہاں بھیجتی بلکہ مقدمہ بھی ختم کر دیتی۔ فلسطین سے جنرل ضیاء کو پرانا بغض ہے اور فلسطینی سرزمین پر ضیا کی چلائی ہوئی گولیوں کے نشان اب بھی اُن فلسطینیوں کے جسموں پر تازہ ہیں جو ستمبر 1970 والے اُس کے آپریشن فیئر میں زندہ بچے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ نہ صرف جنرل ضیا بلکہ اُس کے رفقا کار بھی فلسطین کی فتح نہیں چاہتے اور شاید اسی لئے وہ پاکستان سے فوج اور رضا کار بھیجنے کیلئے تیار نہیں ہو رہے تھے اور پھر مجھ جیسے آدمی؟ نہیں! نہیں!

جناب میں بڑا ڈانڈر شخص ہوں اور اسرائیلی آقاؤں کے خلاف بہت خطرناک ثابت ہوتا۔ میں حکومت کا شکر گزار بھی ہوں کہ اُس نے ہمیں مختلف حالات اور تجربات سے گزار کر اپنے آپ کو پرکھنے کا موقع دیا۔ جب ہمیں پہلی مرتبہ لانڈھی جیل سے سینٹرل جیل منتقل کیا گیا تب مجھے بہت حیرت انگیز اور خوشگوار احساس ہوا۔ میں نے دیکھا کہ دوسرے سیاسی کارکن ہمیں خود سے بہتر کارکن سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ہماری سیاست اور حکومت کے تشدد کو برداشت کرنے والے امتحان کو قدر اور رشک کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ حکومت نے مجھے ہی آئینہ بنا کر دوسرے سیاسی کارکنوں کو اپنا عکس دکھایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنا عکس دیکھ کر اپنے آپ کو زیادہ بہتر بنانے کی

کوشش کریں گے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم کسی نہ سر کیئے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے والے پہلے فرد جیسے ہیں، جو پہاڑوں کی خالی جگہوں اور سوراخوں میں کیلیں گاڑتا ہے اور کنڈا ڈال کر پیر جمانے کی جگہ بناتا ہے، پیچھے آنے والوں کیلیئے راستہ بناتا جاتا ہے۔ ہم نے بڑی ڈانڈرس چوٹی سر کرنے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ آدم خوروں کو نابود کرنے کا یہ ہی راستہ ہے۔

جناب صدر اور کورٹ کے ممبر صاحبان!

پھر حکومت نے دیکھا کہ سینٹرل جیل کراچی کے دوسرے سیاسی کارکن پہاڑ کی چوٹی سر کرنے کیلیئے ہمارے بنائے ہوئے راستے اختیار کرنے کیلیئے بے چین ہو گئے۔ تب ہمیں سینٹرل جیل کراچی بدر کر کے دوبارہ لانڈھی جیل بھیجا گیا۔ کیوں؟ آخر جیل میں دوسرے بھی تو بڑے نام والے سیاستدان موجود تھے۔ شاید فقط اس لئے کہ دوسرے سیاسی کارکن اپنے آپ کو بہتر بنانے لگے تھے۔ حکومت نے یقیناً ان کی سوچوں کو پرکھ لیا ہوگا کہ اُن کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے۔

تو جناب! میں ڈانڈرس پہاڑ کی چوٹی کو سر کرنے والے قافلے کا ڈانڈرس مسافر ہوں۔ پھر مقدمہ شروع ہوا، سرکار نے مجھے اپنی مرضی کا وکیل صفائی نہیں کرنے دیا، اس کے باوجود کہ اُس قانون کے ماہر کا تعلق فوج سے تھا۔ فوجی وکیل پر میں نے اعتبار کیا لیکن سرکار نے نہیں۔ نہ صرف وکیل پر مجھے تو سارے فوجی سپاہیوں پر اعتبار ہے کیونکہ وہ بھی مجھ جیسے ہیں اور میرے ہی ملک کے کسانوں، مزدوروں کے بچے ہیں۔

لیکن جناب! جنرلوں کو تو امریکہ کے ہتھیار بنانے والے کارخانوں نے تیار کیا ہے میں اُن پر اعتبار ہرگز نہیں کر سکتا۔ آپ خود ہی دیکھیں! ہمارے کیس کے ایک نوجوان کامریڈ نذیر عباسی شہید کے دو قاتل جنرلوں میں سے ایک جنرل ضیا نے تو ہمارے کیس کی تفتیش شروع ہونے سے پہلے ہی ہدایات جاری کر دیں تھیں کہ ہمیں سخت سزائیں دی جائیں یعنی عدالت کی تشکیل سے پہلے ہی سزا تجویز ہو چکی ہے اور دوسرے قاتل جنرل ایس۔ ایم عباسی نے ہمارے خلاف یہ خصوصی فوجی عدالت بنائی ہے۔ دوسری طرف اُن کے ہی حکم سے ذرائع ابلاغ پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ ایک آدھ مرتبہ جب اخبارات میں خبر شائع ہوئی تو اخبارات کے ٹیلیفون بجنے لگے۔ شور وہنگامہ

برپا ہو گیا۔ جیسے سرکاری راز فاش کر دیئے گئے ہوں۔ ایک مرتبہ اُس ہی عدالت کے باہر فوٹو گرافر پہنچ گیا تو اس کو بھی تفتیش کیلئے روکا گیا اور پھر لمبے عرصے تک اخبار پر پابندی عائد کر دی گئی۔ آخر سرکار اپنے ہی ہتھیاروں سے اتنا کیوں ڈرتی ہے؟ شاید اس لئے کہ اس نے اس سے پہلے جو بھی ہتھیار عوام کے خلاف اٹھایا ہے اُس نے اُن کی ہی جڑیں اُکھاڑی ہیں۔ مثال کے طور بلدیاتی اداروں میں عوام دوست نمائندوں کا جیتنا اور غیر نمائندہ مجلس شوریٰ میں انتخابات کے مطالبے، اعلیٰ عدالتوں سے ججوں کے استعفے اور اخبارات میں تنقید یہ سب کچھ کوئی اتفاقی حادثات تو نہیں، جناب! یہ سب کچھ عوام کی نفرت، جوش اور شکست نہ کھانے والے ردِعمل کا اظہار ہے۔ یہ بالآخر ہونا ہے کہ وہ اپنے خلاف ہر اٹھنے والے ہتھیار کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ شاید اسی ڈر سے حکومت راستوں پر گولیوں کے ہتھیاروں سے ہچکچا رہی ہے کہ شاید۔۔۔ خیر مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ سرکار یہ غلطی ضرور کرے گی۔ پھر چاہے خود اُن کا ہی دھڑن تختہ ہو جائے۔ یہ اُن کی مجبوری ہے اور تاریخ کا مقررہ کردہ ایک قدم بھی ہے۔

جناب! میں یہ سب کچھ اس لئے نہیں بتا رہا ہوں کہ میں کتنا ڈانڈرس آدمی ہوں لیکن اس لئے کہ حالات بہت ڈانڈرس ہو گئے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ لوگ ہمارے بارے میں خبریں سننے کے پیاسے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حکمران نہ صرف لوگوں کی قوت سے بلکہ اُن کے خیالات سے بھی ڈرے ہوئے ہیں اور وہ ہماری طرف سرخ سلام اس لئے بھیجتے ہیں کہ ہم ساری دنیا کے محنت کشوں کی طرح خود اُن کے بھی ترجمان ہیں تو میں ڈانڈرس ہوں یا نہیں لیکن خود عوام بہت ڈانڈرس ہیں۔ لیکن اگر واقعی میں ڈانڈرس ہوں تو مجھے عوام کی عدالت میں آخری فیصلے کیلئے کیوں نہیں بھیجا جاتا؟ شاید اس لئے کہ ڈانڈرس عوام اپنا اعتماد مجھ پر دکھا چکی ہے۔

کورٹ کے صدر اور ممبر صاحبان!

انہوں نے مجھے اعتماد کا قرب دیکر بڑا مان دیا ہے۔ میں تو ایک معمولی انسان ہوں۔ کچھ زیادہ جانتا بھی نہیں، نہ کوئی اتنی صلاحیتیں ہیں لیکن جن ساتھیوں کے ساتھ ہوں وہ عظیم ہیں۔ اُن کی طرف سے اور عوام کی طرف سے بھی بے انتہا خلوص اور سچائی کی تسبیح میں ملا ہوا قرب اور

پہچھتی ہی ہم کو ڈانڈرس بناتی ہے۔شاید آپ کو یہ جستجو ہو کہ میں ان پتھریلے رستوں پر کیوں چلنے لگا ہوں؟

تو جناب! بات کچھ یوں ہوئی کہ سکھر کے ایک فوجی افسر نے بابا سائیں اور کنبے کے سارے مکینوں کو بلا کر ڈرایا اور دھمکیاں دی تھیں، میرے گھر کی عورتوں کے بے عزتی کی تھی جس کی وجہ سے میرے اندر انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ اسی دوران میری ملاقات انقلابی رہنما کامریڈ جام ساقی سے ہوئی میں نے اُن کو انتقام لینے والی اپنی خواہش بتائی اور اُس فوجی افسر کا نام بتایا جس سے میں بدلہ لینے کیلئے بے چین تھا مگر کامریڈ نے مجھے سمجھایا کہ اس معاشرے میں اُس جیسے نجانے کتنے ہیں تم کس کس سے انتقام لوگے؟ اس نے نذیر عباسی کی شادی کے فوراً بعد گرفتاری کا بھی ذکر کیا جس کے نتیجہ میں اُس کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔اُس وقت مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ کامریڈ جام ساقی لوگوں سے بدلہ لینے کے بجائے معاشرے کو بدلنے کی ضرورت کی بات کررہے ہیں اور اس بات کا مجھ پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ انہی الفاظ کا نتیجہ ہے کہ آج میں ایک خونی قاتل کے بجائے ذمہ دار سیاسی کارکن ہوں لیکن اس کو کیا کہیئے کہ حکومت مجھے انہی اسباب کی وجہ سے ڈانڈرس سمجھنے لگی ہے۔

شبیر شر

کے ایم سی کمپلیکس کراچی

یکم جنوری 1983

امر لال

ا۔آج 8 جنوری ہے اور میں اس عظیم دن کے تعلق سے فخر محسوس کر رہا ہوں کہ آج کے دن اس عدالت میں اپنا بیان ریکارڈ کروا رہا ہوں۔ 8 جنوری جو پاکستان کی طلبہ تحریک کا تاریخی اور یادگار دن ہے۔ 8 جنوری نہ صرف جنوری 1953 کی طلبہ تحریک کے شہیدوں کا دن ہے بلکہ ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن (پاکستان) کا جنم دن بھی ہے۔اس موقع پر میں جنوری تحریک کے شہیدوں کو سرخ سلام پیش کرتا ہوں جنہوں نے اپنی جان کا نذرانہ دے کر پاکستان کی طلبہ تحریک کو نئی زندگی بخشی۔ میں سرخ سلام پیش کرتا ہوں ڈی ایس ایف کے بانی شہید نذیر عباسی کو جس کی انقلابی روح نے موت کو گلے لگا لیا لیکن سامراجی ایجنٹوں اور طلبہ اور عوام دشمنوں کے مذموم عزائم کے آگے جھکنا گوارا نہ کیا۔

2۔نذیر عباسی کو سامراجی ایجنٹوں اور عوام وطلبہ دشمنوں نے یہ سوچ کر شہید کر دیا کہ اس طرح نذیر عباسی کی سوچ اور اسکی تحریک رک جائیگی لیکن ایسا نہیں ہوا نذیر عباسی کی جدوجہد آج بھی جاری ہے۔اسکی تحریک آج بھی آگے بڑھ رہی ہے اور اس کے خیالات کی روشنی آج پہلے سے زیادہ منّور ہے۔نذیر عباسی کا لہو آج اسکی فکر، اسکی جدوجہد اور تحریک کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔

3۔ ہماری تحریک کوئی فانی جسم نہیں ہے جسکا سر الگ کر دیا جائے تو وہ مر جائے گی۔ نہیں۔ ہماری تحریک ایک زندہ نظام ہے جو آگے بڑھتی رہتی ہے اور خود کو ضرب دیتی رہتی ہے۔ جو اپنے زخموں کو خود بھرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور مسلسل اپنی شکل تبدیل کرتی رہتی ہے۔

4۔ ہماری تحریک کے رہنما لکڑی کی تراشی ہوئی مورتیاں نہیں ہیں جو دھاگوں کی

حرکت پر ناچتی ہیں۔ ہماری تحریک کے رہنما زندہ شجر ہیں جو شاخیں نکالتے ہیں اور پھل دیتے ہیں اور جن کی جڑیں عوام میں ہیں جتنے پھل توڑے جائیں اتنے ہی زیادہ پھل آئیں گے۔

5۔ جس کی جڑیں عوام میں ہوں، اس سے زیادہ زرخیز زمین کوئی اور نہیں اور جس کو انقلاب کی گرمی مل جائے اس کے پھلوں کا شمار ناممکن ہے۔

جب بیج پودے کی شکل اختیار کر لے اور زندگی کی نبض چلنے لگے تو کوئی طاقت اس عمل کو الٹ نہیں سکتی۔

6۔ اگر کوئی رہنما یہ سمجھتا ہے کہ اس کے حکم دینے سے ترقی کا عمل رک جائے گا تو وہ احمق ہے تحریک کا قافلہ اسے شاہراہ سے ہٹا کر آگے بڑھ جائے گا۔ بہت سے رہنما تحریکوں کو روکنا چاہتے ہیں اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو غداری کرتے ہیں لیکن تحریکیں نہیں رکتیں اور بہت سے رہنما جدوجہد میں مر جاتے ہیں اور عوام کے ذہنوں میں ہیرو بن جاتے ہیں۔

7۔ ہم نہ رائیگاں جیتے ہیں نہ رائیگاں موت مرتے ہیں۔ ہم جانے والوں کی جگہ پُر کرتے ہیں اور تحریک کے آگے بڑھنے کے عمل میں خود کو ضم کر رہے ہیں۔

8۔ پاکستان کے نوجوانوں کے عظیم ہیرو نذیر عباسی شہید نے جو الفاظ سامراجی قاتلوں کے سامنے کہے تھے میں انہیں دہراتا ہوں۔

میں پاکستان کا نوجوان ہوں
میری زندگی ایک گیت ہے
میری موت جدوجہد کی پکار ہے

9۔ تمام دنیا کے لوگ امن، آزادی، خوشحالی اور بھائی چارگی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں کیونکہ تاریخ نے اس جدوجہد کو ناگزیر بنا دیا ہے۔ سینکڑوں ہزاروں نوجوانوں نے اس جدوجہد میں اپنی جانیں دی ہیں اور تشدد اور ہزیمت کے آگے جھکنے سے انکار کیا ہے میں ان کا حصہ بننے کو ترجیح دیتا ہوں اور آج ان کی صف میں کھڑا ہوں۔

10۔ ایک عرصے تک غیر انسانی سلوک، تشدد، مار پیٹ اور دباؤ برداشت کرتے رہنے

کے بعد مجھے آج اس عدالت میں پیش کیا گیا ہے کہ میں اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کا جواب دوں۔الزام یہ ہے کہ میں غاصب فوجی جنتا کیخلاف پروپیگنڈہ کرتا ہوں جس نے عوام کے منتخب نمائندوں کا تختہ الٹ کر اقتدار پر غیر قانونی قبضہ کرلیا۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ میں عوام، عوام کی حکومت اور عوام کے اقتدار اعلیٰ پر یقین رکھتا ہوں۔ میں واضع طور پر کہتا ہوں کہ موجودہ حکومت نے امریکی سامراج اور استحصالی طبقات کی شہ پر عوام کے اقتدار اعلیٰ پر غاصبانہ قبضہ کیا ہے اسی لئے موجودہ حکومت کے مخالفین کو پاکستان مخالف قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی انہیں تخریبی سرگرمیوں کا ملزم گردانا جاسکتا ہے۔ میں اسے اپنی عزت سمجھتا ہوں کہ میں عوام کے کیمپ میں ہوں اور عوام دشمن طاقتوں کی مخالفت کرتا ہوں بہ حیثیت شہری اور طالب علم یہ میرا پیدائشی حق ہے۔ ہر طبقاتی سماج میں دو طاقتیں ہوتی ہیں ایک حکمراں طبقہ اور دوسرے استحصال کا شکار عوام۔ اپنے طبقاتی مفادات کی وجہ سے دنوں ایک دوسرے کے باغی ہوتے ہیں، ہمارے معاشرہ میں بھی ایسا ہی ہے۔ یہ عوام کی جنگ ہے عوام دشمن طاقتوں کیخلاف، اس لئے یہ ایک سیاسی جنگ ہے۔ سیاسی جنگوں کا فیصلہ سڑکوں پر ہوتا ہے فوجی عدالتوں میں نہیں اور ہمیشہ اس کا فیصلہ عوام کے حق میں اور عوام دشمنوں کیخلاف ہوتا ہے۔ تمام سیاسی تحریکیں اسکا ثبوت ہیں۔ یہ مقدمہ بھی سیاسی ہے لہذا میں پھر اعلان کرتا ہوں کہ میں عوام کے ساتھ ہوں۔ عوام کے دوستوں کو اپنا دوست سمجھتا ہوں اور عوام دشمنوں کو اپنا دشمن۔ مجھے افسوس ہوتا ہے ان لوگوں پر جو تشدد اور استحصال کے آلہ کار بن گئے ہیں اور جلد ہی اپنا سب کچھ کھودیں گے۔

11۔ مارشل لاء حکومت یہ تاثر دینے کی کوشش کررہی ہے کہ میں نے دفعہ ڈبلیو پی بی ۱۶۴ کے تحت اپنے مبینہ جرم کا اعتراف کرلیا ہے۔ وہ اس سے زیادہ جھوٹ بھی بول سکتے ہیں لیکن نہیں، اس عدالت کے علم میں لانے کیلئے اور اپنی طلبہ برادری اور عوام کے سامنے واشگاف الفاظ میں کہتا ہوں کہ یہ ایک اور جھوٹا الزام ہے۔ عوام کی جدوجہد میں شرکت جرم نہیں ہے اور اس کے علاوہ میرا کوئی جرم نہیں ہے نہ میں نے تسلیم کیا ہے۔ مجرم تو سامراج کے ایجنٹ ہیں جو عوام دشمن کیمپ میں ہیں۔

12۔ یہ برطانوی ورثہ ہے کہ محبّ وطن لوگوں پر سازش، اشتعال انگیزی اور تخریب کاری کے الزامات لگائے جائیں۔ ہمارے حکمرانوں نے اس ذلیل ورثے کو سینے سے لگا رکھا۔ سوویت یونین کے انقلاب کے دوران ہندوستان سے کچھ نوجوان، انقلابی فکر و عمل کی تلاش میں روس گئے تھے۔ یہ جب واپس آئے تو برطانوی حکومت نے ان پر متعدد سازش کیس بنائے جس میں تاشقند سازش کیس، پشاور سازش کیس اور میرٹھ سازش کیس بہت مشہور ہیں۔ یہ نوجوان آزادی کی جنگ کے سپاہی تھے جیسے آج ہم ہیں جو امریکی سامراج کے نیم نوآبادیاتی نظام کیخلاف اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ شوکت عثمانی، فیروزالدین منصور، بھگت سنگھ، ہیموں کالانی آزادی کی جنگ کے اولین صف کے سپاہی تھے۔ پاکستان بننے کے بعد اس روایت کو لیلیٰ متیرا۔ نواب نوروز خاں اور ان کے بیٹوں نے جاری رکھا۔ جانبازی کی روایت کا یہ تسلسل حسن ناصر ،نذیر عباسی ،حمید بلوچ اور دوسرے شہیدوں سے آملتا ہے جنہیں مارشل لاء حکومت کے ظلم و جبر کا اور مارشل لاء کی حمایتی نازی تنظیم جماعت اسلامی کی غنڈہ گردی کا شکار ہونا پڑا۔ انقلابی جدوجہد کی آخری کڑیوں پر لالہ اسد، انیس چودھری، عنایت مسیح، سعید خان، شوکت چیمہ اور قدیر عابد کا نام لکھا ہے۔ عظیم لوگ وہ ہی ہیں جو تاریخ کے صفوں پر ان مٹ نقوش ثبت کر جاتے ہیں۔

13۔ ان سب لوگوں کا جرم یہ تھا کہ برطانوی سامراج سے آزادی کے بعد وہ امریکی سامراج کے غلبے کیخلاف عوام کے اقتدار اعلیٰ کی جنگ لڑ رہے تھے۔ آج عوام دشمن فوجی جنتا ،اپنے پیش روؤں کی طرح، طلبہ سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ سیاست میں حصہ نہ لیں۔ یہ فوجی جنتا چاہتی ہے کہ نوجوانوں نے جس نیم نوآبادیاتی غلامی میں آنکھ کھولی ہے اس کا تختہ نہ الٹ سکیں اور نہ ہی خوشحالی کی بنیادوں پر نئے پاکستان کی تعمیر کر سکیں، طلبہ نوجوان نسل کا وہ خوش قسمت حصہ ہیں جو تعلیم سے مسلح ہیں۔ یہ ان کا تاریخی فرض ہے کہ آئندہ نسل کو ایک بہتر دنیا سپرد کریں لیکن حکومت کو ہر نسل کی ترقی کا یہ عمل پسند نہیں۔ اگر موجودہ حکومت لوگوں کو ہمیشہ کے لئے انکے حقوق سے محروم کرنے کی طاقت رکھتی تو وہ یہ بھی کر گذرتی۔

14۔ فوجی جنتا نہ صرف طلبہ کو بلکہ سماج کے دوسرے طبقات کو بھی سیاست سے دور رکھنا

چاہتی ہے۔ یہ اسکی واضح پالیسی ہے۔طلبہ سیاست میں حصہ نہ لیں کیونکہ وہ طالب علم ہیں۔مزدور طبقہ سیاست نہ کرے کیونکہ وہ مزدور ہے۔ کسان اس لئے سیاست نہ کریں کہ وہ کسان ہیں۔ خواتین سیاست نہ کریں کیونکہ وہ خواتین ہیں۔ پولیس اور فوج کے سپاہی۔ سرکاری ملازمین کوئی بھی سیاست نہ کرے۔فوجی جنتا آٹھ کروڑ عوام کے لئے سیاست کو شجر ممنوعہ قرار دیتی ہے۔ سیاست صرف فوجی جنرلوں، تجارتی سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور سامراجی ایجنٹوں کا وطیرہ ہے ۔سیاست کا مقصد عوام کے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے اسی لئے عوام دشمن فوجی جنتا ،عوام کی سیاست سے نفرت کرتی ہے تاکہ ملک سامراجی غلبہ اور غلامی کا شکار رہے۔

15۔طلبہ اس قوم کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں جو زیادہ ذمہ دار ہیں کیونکہ انہیں جن تعلیمی اداروں میں تعلیم ملی ہے جو عوام کے خون پسینہ کی کمائی پر چلتے ہیں، انہیں یہ تعلیم اس لئے نہیں ملتی ہے کہ وہ عیاشی کی زندگی گذاریں اور اعلیٰ عہدے حاصل کر کے افسر شاہی کا حصہ بن جائیں۔سماج طلبہ کی تعلیم کی مشقت اس لئے برداشت کرتا ہے کہ وہ سماج کی خدمت کریں اور عوام کے حقوق کیلئے جدوجہد کریں۔ مجھے فخر ہے کہ میرے ملک کے طلبہ میں ذمہ داریوں کا بھرپور احساس موجود ہے اور یہ کہ میرا شمار بھی ان ذمہ دار طلباء میں ہوتا ہے۔

16۔تاریخ اور معروضی حالات ،عوام کی جدوجہد کی سمت اور مقاصد کو ترقی کی جانب رکھتے ہیں۔حقائق کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔اگر ہم اپنے ملک کے بے پناہ مسائل کو حل کرنے میں سنجیدہ ہیں تو حقائق کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مسائل کو حل کرنے کی جانب پہلا مارشل لاء کا خاتمہ اور عوام کے اقتدار اعلیٰ کی بحالی ہے۔ مارشل لاء عوام کے مفادات کیخلاف مسلط ہے۔ نہ اس کا کوئی اخلاقی جواز ہے نہ مادی بنیاد، اس کے باوجود بھی اس کے مسلط رہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اپنی غذا اور اسلحہ سامراج سے حاصل کرتی ہے جس کی یہ نمائندہ ہے۔اس کی جڑیں 1954 کے امریکی سامراج سے کئے ہوئے معاہدوں میں ہیں۔اسی دن سے عوام کے حقوق کو کچلنے کی روایت پڑی یہاں تک کہ امریکی سامراج اور اس کے حواریوں کے مفاد میں ملک کو دو ٹکڑے کر دیا گیا۔

17۔ بھٹو حکومت پہلی پاکستانی حکومت تھی جس نے سامراج کے جال سے نکلنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں بھٹو کو قتل کر دیا گیا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے بڑی صنعتوں اور بنکوں کو جو ملک میں اجارہ داری کی بنیاد تھیں، قومی ملکیت میں لیا۔ ملکی معیشت کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لئے اسٹیل ملز قائم کی۔ میٹرک تک تعلیم مفت کر دی۔ دیہی آبادی کی اکثریت کے مفاد میں زرعی اصلاحات کیں۔ چونکہ یہ تمام اصلاحات سامراج سے چھٹکارے کے لئے کافی نہیں تھیں اس لئے ہم مطالبہ کر رہے تھے کہ سامراج اور اس کے حواریوں کا غلبہ ختم کیا جائے۔ بھٹو کو مارنے میں سامراج کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ بھٹو نے محنت کش عوام کو اپنی تنظیمیں مضبوط کرنے کا موقع نہیں دیا جس کے نتیجہ میں بھٹو کا محنت کش عوام سے اتحاد باقی نہیں رہا اور محنت کش عوام بھٹو کے حق میں اپنی طاقت استعمال نہیں کر سکے۔

18۔ یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ فوجی جنتا کی حکومت سامراج کی مدد کے سہارے زندہ ہے جو اسے اپنے عوام کو کچلنے کیلئے جدید ترین ہتھیار فراہم کرتا ہے لیکن یہ بھی اتنی ہی ناقابل تردید بات ہے کہ اس فوجی آمریت کو پاکستان کے دلیر عوام کے ہاتھوں شکست ہوگی اور کوئی طاقت اسے بچا نہیں سکے گی۔ یہ بیسویں صدی ہے اور لینن نے اسے انقلابات کی صدی قرار دیا ہے۔ یہ عوام کے ابھار، استحصال کے خاتمہ کی صدی ہے۔ یہ امن عالم اور سوشلزم کی صدی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب سامراج، جو ابھی تک طاقتور دکھائی دیتا ہے، گلوٹین پر کھڑا نظر آئے گا۔ سامراجی طاقتیں دن بدن کمزور ہو رہی ہیں۔ ایرانی انقلاب، شاہ ایران کی جلاوطنی، ساوک کا خاتمہ اسکی واضح مثالیں ہیں۔

19۔ گذشتہ چند برسوں میں اہم اور مثبت تبدیلیاں آئی ہیں جن سے اس علاقہ میں سامراجی گرفت کمزور ہوئی ہے۔ ایران کا سامراج مخالف جمہوری انقلاب مضبوط ہو رہا ہے۔ ثور انقلاب۔ افغانستان کا قومی جمہوری انقلاب، سوشلسٹ کیمپ کی مدد سے طاقتور ہو رہا ہے۔ ان دو انقلابات اور ہندوستان کی غیر جانبداری کی پالیسی نے سامراج کے لئے اس علاقہ کے دروازے بند کر دیئے ہیں حالانکہ چینی توسیع پسندوں نے سامراج کی کھلی مدد کی ہے لیکن یہ مدد بھی

سامراج کی جڑیں اکھڑنے سے نہیں بچا سکتی ۔ انتہائی جدوجہد کے بعد سامراج اس علاقہ سے صرف چار ملکوں، ترکی ، پاکستان، اسرائیل اور سعودی عرب کو نئے سامراجی دفاعی معاہدہ میں شامل کرسکا ہے۔ ڈیگو گارشیا کا سامراجی اڈہ خطرہ میں ہے کیونکہ مارشیس کے ترقی پسندوں نے اس بنیاد پر اپنے ملک کا الیکشن جیتا ہے کہ وہ برطانیہ اور امریکہ سے اپنے علاقہ واپس لیں گے اور اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان کے عوام اپنے حقوق واپس نہیں لیں گے تو وہ اندھے کنویں میں رہتا ہے۔ عوام کا سیلاب سامراج کے بنائے ہوئے بند کو توڑ کر روز بروز آگے بڑھ رہا ہے۔

20۔ پاکستان بننے کے بعد اس کی تاریخی ضروریات کو نظر انداز کیا گیا اور پورے ملک پر اردو مسلط کر دی گئی۔ قومیتوں کی زبانوں کو دبایا گیا جس کے نتیجے میں بے اطمینانی پھیلی ۔ اس وقت طلباء نے اس پالیسی کے خلاف شاندار مظاہرے کئے۔ حکومت نے زبان کے مسئلے کو سمجھنے کے بجائے ،نفرت پھیلانے کے لئے استعمال کیا۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر بچے کو اپنی مادری زبان میں تعلیم پانے کا حق ہے اس کے بغیر ملک سے جہالت دور نہیں ہوسکتی ۔ ہم طالب علموں نے اس کے لئے آواز اٹھائی ۔1952 میں بنگال میں ہم نے اس کے لئے جدوجہد کی ،قربانیاں دیں اور حکومت سے بنگالی زبان کی حیثیت تسلیم کرالی ۔ سندھی زبان کا حق بڑی حد تک 1973 میں تسلیم کرایا گیا۔ لیکن بلوچی، پشتو اور پنجابی کو قومی زبان بنانے کی جدوجہد جاری ہے اور فتح تک جاری رہے گی۔

21۔ 8 جنوری 1953 طلبہ تحریک میں ایک سنگِ میل تھا۔ کراچی کے طلبہ نے ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے پرچم تلے اس تحریک کا آغاز کیا تھا جس میں عام تعلیم ،فیسوں میں کمی ، روزگار کی ضمانت اور دوسرے مطالبات پر جدوجہد کی گئی۔ حکومت نے اسکو طاقت سے کچلنا چاہا اور متعدد طالب علموں نے اپنی جانیں تحریک کی نذر کیں ۔ بالآخر ناظم الدین حکومت کو طلبا کے آگے جھکنا پڑا۔ یہ طلباء کی اہم سیاسی فتح تھی ۔ اس وقت طلبہ کو یہ احساس ہوا کہ ان کے مسائل کے حل کے لئے پورے ملک کی طلبہ تنظیموں کا اتحاد ناگزیر ہے لہذا 1954 میں پورے ملک کے ترقی پسند طلبا کے کنونشن میں آل پاکستان اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (APSO) کا قیام عمل میں

آیا۔ اسی دوران جگتو فرنٹ نے بنگال کی مسلم لیگی حکومت کو عبرتناک شکست دی۔ سندھ کے کسانوں نے کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی رہنمائی میں اپنے حقوق کی جنگ لڑی اور سندھ اسمبلی کو (Tenency Act) پاس کرنا پڑا۔ حکمران طبقات عوام کی ان پے در پے کامیابیوں سے خوفزدہ ہو گئے اور عوام کو کچلنے کے لئے امریکی سامراج کے دفاعی معاہدوں کا طوق گلے میں ڈال لیا۔ امریکی سامراج کی شہ پر پاکستان کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگی اور تمام ترقی پسند تنظیموں کو جن میں طلبہ تنظیمیں، کسان تنظیمیں، مزدور تنظیمیں، خواتین کی انجمنیں، دانشوروں کے ادبی فورم سب پر پابندی لگا دی گئی۔ ون یونٹ کے نام پر ملک کو قومیتوں کا جیل خانہ بنا دیا گیا۔

22۔ ان سب کے باوجود طلبہ نے این ایس ایف کی رہنمائی میں قومی جمہوری حقوق کیلئے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ 1958 میں طلبہ نے مارشل لاء کیخلاف مزاحمت میں اہم کردار ادا کیا اس وقت بھی ان پر سازش، بغاوت، تخریبی سرگرمیوں، فوج کیخلاف نفرت پھیلانے اور عوام میں طبقاتی نفرت پھیلانے کے الزامات لگائے گئے تھے، آج بھی یہی الزامات لگائے جا رہے ہیں صرف اس فرق کیساتھ کہ آج امن کی تحریک زیادہ منظّم اور مضبوط ہے اور عوام کا شعور آگے بڑھا ہوا ہے۔ اس وقت سینکڑوں، ہزاروں لوگوں کو جیلوں میں بند کیا گیا تھا۔ تعلیم کا حق چھینا جا رہا تھا۔ مزدور طبقہ کے عظیم رہنما حسن ناصر کو لاہور کے قلعہ میں شہید کر دیا گیا تھا۔ اس وقت بھی طلبہ نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔

23۔ کامریڈ حسن ناصر کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ غربت، جہالت اور بیروزگاری کے خاتمے کیلئے جدوجہد کر رہا تھا۔ اگر یہ جرم ہے تو میں اعلان کرتا ہوں کہ ہم نے ہر دور اور ہر زمانے میں اس جرم کا ارتکاب کیا اور اس وقت تک کرتے رہیں گے جب تک کہ امن، آزادی، خوشحالی اور عوامی حکومت کے حصول تک فتح نہیں ہو جاتی۔

24۔ 1960 میں چین نے سوشلسٹ کیمپ سے علیحدگی اختیار کر کے جارحانہ قوم پرستی کا راستہ اختیار کر لیا۔ سوویت مخالف نعروں کیساتھ چین نے عالمی سامراج سے دوستی استوار کی ادھر پاکستان نے سامراج کی شہ پر ہندوستان دشمنی کا راستہ اختیار کیا۔ پاکستان کے ترقی

پسند گروپ بھی گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔اسی دوران این ایس ایف میں کچھ چین نواز طلبہ نے جبلپور کے ہندو مسلم فساد کے خلاف مظاہرہ کیا اور مذہبی فرقہ بندی کی رو میں بہہ گئے۔نتیجتاً این ایس ایف بھی دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔

25۔این ایس ایف کے اس چین نواز طلبہ گروپ نے ہمیشہ طلباء تحریک کو نقصان پہنچایا۔انہوں نے نذیر عباسی شہید ایکشن کمیٹی کی تحریک کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی،افغانستان کے قومی جمہوری انقلاب کے خلاف کھڑے ہوئے اور ہر مرتبہ طلبہ اتحاد کی مخالفت کی کیونکہ وہ اس بات سے ڈرتے تھے کہ طلباء کا اتحاد عوام کی تحریک کا راستہ نہ بن جائے جو انقلاب کی راہ ہموار کر دے،اس لئے یہ گروپ ہمیشہ عوام دشمن کردار ادا کرتے رہے۔

26۔طلبہ عوام کا ہراول دستہ ہیں اور ہمیشہ عوام کی جمہوری امنگوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔یہ ہمیشہ جدوجہد میں رہتے ہیں۔1967ء میں سندھ کے نوجوان سڑکوں پر نکل آئے جن کے مطالبات یہ تھے کہ ون یونٹ ختم کیا جائے۔صوبائی خودمختاری دیجائے۔بالغ رائے دہی کی بنیاد پر الیکشن کرائے جائیں۔قومی جمہوری حقوق بحال کئے جائیں۔کرایوں میں پچاس فیصد کمی کی جائے اور مادری زبان میں مفت لازمی تعلیم دیجائے۔

ایوبی آمریت نے ان کو غدار اور پاکستان دشمن کہا اور طاقت سے کچلنے کی کوشش کی۔ اس وقت نوجوانوں کے ساتھ عام تعلیم یافتہ اور محبّ وطن طاقتوں نے مل کر طلبہ،کسان،مزدور رابطہ کمیٹی کے پلیٹ فارم سے جدوجہد کی۔فیلڈ مارشل ایوب خان بھاگ کھڑا ہوا اور جاتے جاتے اقتدار ایک اور جنرل کو دے گیا۔اس جدوجہد نے پہلی مرتبہ ملک کی تمام جمہوری اور باشعور طاقتوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کر دیا جس کو شروع کرنے کا اعزاز طلباء کو حاصل تھا۔کیا اس عدالت کے خیال میں ایوب خان کی آمریت کا عوام کی تحریک کے ذریعہ تختہ الٹنا جرم تھا؟اگر نہیں، تو آج میرا جرم کیا ہے؟ایوب کی آمریت ختم کرنے اور ون یونٹ توڑنے کیلئے چاروں صوبوں کی طلبہ یونینیں سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن،بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن،پختون اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور پنجاب یونین آف اسٹوڈنٹس ایک پلیٹ فارم پر پاکستان فیڈرل یونین آف

اسٹوڈنٹس (PFUS) کے پرچم تلے جمع ہوگئیں۔عوام کے دباؤ نے حکومت کومجبور کردیا کہ ون یونٹ ختم کیا جائے اور ایک فرد ایک ووٹ کا اصول بحال کیا جائے۔

27۔ جنرل یحییٰ نے عام انتخابات منعقد کرائے جن میں بنگال سے شیخ مجیب نے چھ نکات یعنی سوشلزم اور سیکولرزم کی بنیاد پر اور سندھ اور پنجاب سے پیپلز پارٹی نے سوشلزم کے نعرہ پر اکثریت حاصل کی۔ بلوچستان اور سرحد میں نیشنل عوامی پارٹی نے قومی جمہوری انقلاب کے ذریعے سوشلزم لانے کی بنیاد پر اکثریت حاصل کی ۔ پورے ملک کے عوام نے اس طرح جمہوریت ،سوشلزم اور سیکولرزم کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ ہماری تاریخ یہ ہے کہ برسراقتدار طبقے نے کبھی بھی انتخابات کے نتائج کو تسلیم نہیں کیا،اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔شیخ مجیب کوغدار قرار دے کر گرفتار کرلیا گیا اور بنگال میں فوجی آپریشن شروع کر دیا گیا جس میں تقریباً تیس لاکھ بنگالیوں کا قتل عام کیا گیا۔اس وقت کامریڈ جام ساقی نے جوسندھ این ایس ایف کے بانی صدر تھے (یہ اب ڈی ایس ایف میں ضم ہوچکی ہے) کہا کہ بنگال فوجی مسئلہ نہیں بلکہ ایک سیاسی مسئلہ ہے۔ اسے سیاسی طور پر حل کیا جانا چاہئے۔ یہ پہلی آواز تھی جو فوجی ایکشن کیخلاف مغربی پاکستان سے اٹھی۔میں حکمرانوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیاان تلخ حقائق سے انہوں نے کوئی سبق حاصل کیا؟

28۔طلبا نے پہلے منتخب وزیراعظم بھٹو کے دور میں بھی اپنا کردارادا کیا،ہم نے حکومت کے تمام مثبت اقدامات کوخوش آمدید کہا اور تمام سامراج نواز رجعت پسند تنظیموں اور محاذوں کیخلاف مزاحمت کی۔ہم اس وقت بھی سرگرم تھے اور ہمارا نعرہ تھا کہ ’’چہرے نہیں سماج کو بدلو‘‘

29۔ میں یہ واضح طور پر بتانا چاہتا ہوں کہ اس وقت صرف ہم نے یعنی پی ایف یو ایس نے سامراجی ایجنٹ پاکستان قومی اتحاد کی مخالفت کی تھی اور تاریخ نے ہمارے فیصلے کی توثیق کی ہے۔ پاکستان قومی اتحاد کی پشت پر ضیاءٹولہ تھا جس نے سازش سے عوام کا اقتداراعلیٰ غصب کیا اور مارشل لاء نافذ کیا۔ مارشل لاءعوام کے خلاف اعلان جنگ ہے اسی لئے میں اور میرے دوست عوام کے سپاہیوں کی حیثیت سے آج پابجولاں کھڑے ہیں۔ میں پُرزور طریقے سے واضح کردوں کہ مجھے اپنی ذات کی نمائندگی کرنے پر نہیں پکڑا گیا بلکہ پورے ملک کے نوجوانوں اور عوام

کی نمائندگی کا ملزم گردانا گیا ہے اور مجھے فخر ہے کہ میں نے سیاہ تہہ خانوں میں قید کاٹی ہے۔

30۔ بھٹو حکومت کے خاتمے کے بعد جب ضیاء ٹولہ امریکی سامراج کے ایجنٹ کی حیثیت سے اقتدار میں آیا تو طلبہ نے اسی وقت آنے والے خطرہ کو بھانپ لیا تھا اسی لئے طلباء کی چاروں صوبائی تنظیموں نے متحد ہو کر ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی تاکہ سامراجی خطرے کیخلاف لڑا جائے۔

31۔ پاکستانی طلبا اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ وہ انسانیت اور طلبہ کی عالمی برادری کا حصہ ہیں اور پوری دنیا کے انسانوں کا اس وقت سب سے بڑا مسئلہ امن ہے، امن نہیں ہوگا تو زندگی بھی نہیں ہوگی۔ طلبہ اور نوجوانوں کو اس مسئلے سے علیحدہ نہیں رکھا جاسکتا اس لئے تمام دنیا خصوصاً یورپ اور امریکہ کے طالبعلم امن کی تحریک میں آگے ہیں، ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن، امن آزادی اور خوشحالی کی تحریک میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ انٹرنیشنل یونین آف اسٹوڈنٹس کے ساتھ شانے سے شانہ ملا کر اور ورلڈ فیڈریشن آف ڈیموکریٹک یوتھ کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر، قدم سے قدم ملا کر ہم بین الاقوامی طلبہ تنظیم اور نوجوانوں کی تحریک کا حصہ ہیں۔

32۔ ملکی خوشحالی کا انحصار معاشی خوشحالی پر ہوتا ہے۔ سیاسی مفادات و تضادات کے پیچھے ہمیشہ سماج میں طبقات کے معاشی مفادات ہوتے ہیں۔ ہماری موجودہ معاشی صورتحال کی بنیاد استحصال پر ہے اور مارشل لاء حکومت اسے قائم رکھنا چاہتی ہے جبکہ عوام اس استحصال کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ جنرل ضیاء نے کراچی کے سرمایہ داروں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا ''مارشل لاء اس وقت تک قائم رہے گا جب تک سرمایہ کو تحفظ درکار ہے۔'' کسانوں اور مزدوروں کے حقوق اس مارشل لاء نے اس حد تک غصب کئے ہیں کہ محنت کشوں کا ایک تہائی حصہ مکمل بیروزگار ہے اور اگر جزوی روزگار کے اعداد و شمار بھی شامل کر لئے جائیں تو یہ تعداد نصف تک جا پہنچتی ہے۔ مہنگائی تنخواہوں سے 35 فیصد زیادہ ہے افراطِ زر کی شرح 30 فیصد ہے۔ عوام کی قوت خرید روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ پنجاب سب سے زیادہ خوشحال صوبہ سمجھا جاتا ہے لیکن وہاں بھی لوگوں کو پروٹین کی مقدار غذا میں 59 فیصد سے زیادہ نہیں ملتی۔ جنرل ضیاء نے اپنی بجٹ تقریر میں یہ کہا کہ

ہمارے ملک میں بنگال 1941 جیسے قحط کے حالات نہیں ہیں لیکن وہ ''تھر'' کے صحرا کو بھول گئے جہاں ہمیشہ قحط رہتا ہے۔ وہ یہ بھی بھول گئے کہ ہماری بیشتر آبادی کو اقوام متحدہ کے سفارش کردہ کم سے کم معیار کی غذائیت سے بھی کم غذائیت ملتی ہے۔ حکومت زخموں پر نمک چھڑکتی ہے جب یہ الزام لگاتی ہے کہ لوگ محنت نہیں کرتے۔ وہ بھول جاتی ہے کہ حکمران طبقے کی عیاشیوں میں جو دولت صرف ہوتی ہے وہ انہی مزدوروں اور کسانوں کی محنت سے پیدا ہوتی ہے۔

33۔ اس حکومت کا سب سے گندہ کارنامہ یہ ہے کہ اس نے عوام دشمن حکمران طبقات کو نئی زندگی دی ہے۔ اس کے لئے بجٹ کا 85 فیصد حصہ فوج اور افسر شاہی پر خرچ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے وسائل کا ایک تہائی حصہ سامراجی قرضوں کے سود میں چلا جاتا ہے۔ یہ قرضے بڑھتے جاتے ہیں اور ہماری معیشت کو مزید تباہی کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ ہماری معاشی پالیسیوں کا تعین عالمی بینک اور آئی ایم ایف کرتے ہیں جو امریکی صدر کی پالیسیوں کے تابع ہیں اور جن کا زور معیشتِ صارف اور پرائیویٹ سیکٹر پر رہتا ہے۔ یہ حکومت چونکہ عالمی سرمایہ داری اور بین الاقوامی کارپوریشنز کے مفادات کی نگران ہے اس لئے اسے قطعی یہ فکر نہیں ہے کہ عالمی سامراجی پالیسیاں ہمارے ملک کو اور تیسری دنیا کے ممالک کو کس طرح تباہ کر رہی ہیں۔

34۔ بھٹو حکومت نے کچھ زرعی اصلاحات کیں۔ کچھ زمین کسانوں میں تقسیم کی گئی، زمیندار کو بیج اور کھاد فراہم کرنے کا پابند کیا گیا، ساڑھے دس لاکھ کسانوں کو اپنے مکان بنانے کے لئے چھوٹے چھوٹے پلاٹ دیئے گئے۔ لیبر اصلاحات سے روزگار کا کچھ تحفظ ہوا۔ بڑی اجارہ داریاں کمزور ہوئیں جس سے چھوٹے سرمایہ کو آگے بڑھنے کا موقع ملا، عورتوں کو کچھ حقوق ملے اور میٹرک تک تعلیم مفت کی گئی۔ انہی وجوہات کی بنا پر بھٹو حکومت اور پیپلز پارٹی کی جڑیں عوام میں پھیل گئیں۔ موجودہ حکومت نے 64 مرتبہ ایسے اقدامات کئے جس سے عوام میں پیپلز پارٹی کی مقبولیت ختم ہو جائے لیکن ہر بار اسے ناکامی ہوئی۔ فوجی جنتا نے موجودہ بجٹ میں تعلیم، ویلفیئر اور دیہی امداد کے پروگراموں میں بڑی حد تک کٹوتی کی ہے۔ تعلیم پر بجٹ کا اعشاریہ چالیس فیصد خرچ ہو رہا ہے جبکہ UENSCO کی سفارش کم سے کم چار فیصد کی ہے۔ تعلیم کے برخلاف،

فوج پولیس اور تشدد کے دوسرے ذرائع پر بجٹ کے اخراجات میں بڑا اضافہ کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مارشل لاء حکومت عوام کی خوشحالی و ترقی نہیں بلکہ عوام کو کچلنا اور دبائے رکھنا چاہتی ہے۔ عوام کا کوئی بھی حصہ اس صورتحال سے خوش نہیں ہے اور یقین رکھتا ہے کہ جب تک عوام دشمن طبقات سے آزادی حاصل نہیں ہوگی ملک میں ترقی اور خوشحالی کے راستے بند رہیں گے۔

35۔ ظاہر ہے کہ جو حکومت عوام کے شعور سے خوفزدہ ہو اور انہیں کچلنے میں زیادہ سرگرم ہے وہ عوام کی تعلیم اور بھلائی کے بارے میں کیا سوچ سکتی ہے۔ ہمارے ملک میں پانچ ہزار سائنسداں ہیں جبکہ ہندوستان میں یہ تعداد ہم سے بیس گنا زیادہ ہے ہمارے یہاں سات ہزار لوگوں پر ایک ڈاکٹر ہے جبکہ مغربی ممالک میں سات ہزار انسانوں پر چودہ ڈاکٹر ہیں یعنی ہمیں چودہ گنا ڈاکٹر مطلوب ہیں۔ حکومت نے ڈاکٹروں کی تعداد بڑھانے کے بجائے میڈیکل کالجوں میں سیٹیں کم کردیں تاکہ جن ڈاکٹروں کو ہاؤس جاب نہیں ملتا وہ نئے ہسپتالوں کا اور پرانے ہسپتالوں میں توسیع کا مطالبہ نہ کریں لیکن جب حکومت کو سیٹیں کم کرنے میں ناکامی ہوئی تو اس نے ہاؤس جاب کی شرط ہی ختم کردی جس سے ڈاکٹروں کی طبی مہارت کم ہوگئی۔ حکومت اربوں روپے ایف 16 خریدنے پر خرچ کرسکتی ہے لیکن اس سے کہیں کم رقم ڈاکٹروں، انجینئروں اور ٹیکنیشنز کی تعلیم پر خرچ نہیں کرسکتی۔

36۔ تعلیم کی طرف فوجی جنتا کا رویہ ظالمانہ ہے، نئے یونیورسٹی آرڈیننس کے ذریعہ اس نے وائس چانسلر کو آمرانہ اختیارات دے دیئے ہیں کہ وہ کسی بھی طالبعلم کے خلاف کسی بھی وقت کوئی بھی اقدام اٹھا سکتا ہے۔ تعلیمی اداروں میں برائے نام اضافہ ہوا ہے لیکن تعلیم کا معیار بد سے بدتر ہوگیا ہے۔ تعلیم کے وفاقی سیکرٹری نے کوئٹہ ورکشاپ میں تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ پورے ملک میں ریاضی کا صرف ایک پروفیسر ہے اور کراچی یونیورسٹی کے Ph.D اساتذہ کی ستر فیصد تعداد حکومت کی اجازت سے بیرونی ممالک میں ملازمتیں کررہی ہے۔ اس طرح حکومت ایک پتھر سے کئی چڑیاں مارنے کا حربہ آزما رہی ہے۔ ایک طرف تو ملک میں اساتذہ کی قلت کے ذریعہ معیار تعلیم گرانا تو دوسری جانب ان اساتذہ کی تنخواہیں بچانا اور ان اساتذہ کے ذریعہ

زرمبادلہ کمانا۔

37۔ تعلیم کے بارے میں اس حکومت کا رویہ اس سے ظاہر ہے کہ نوجوانوں میں تعلیم کی شرح صرف بیس فیصد ہے اور اس میں سے بھی بارہ فیصد سیکنڈری جماعتوں اور صرف دو فیصد یونیورسٹی تک پہنچتے ہیں۔ اس شرح میں مدتوں سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ 1975 سے اب تک تعلیمی اور ریسرچ کتابوں کی اشاعت سال بہ سال کم رہی ہے۔ حکومت یہ چاہتی ہے کہ تعلیم کی حد صرف قرآن پاک تک رکھی جائے اور ہر شخص حافظ قرآن ہو اور بس۔ تمام لائبریریوں اور تعلیمی اداروں کو جلا دیا جائے۔ یہ فطری بات ہے کہ کوئی شخص اس حکومت سے یہ توقع نہیں کرسکتا کہ وہ عورتوں کو ان کے حقوق خصوصاً تعلیمی حقوق دیگی کیونکہ یہ حکومت عورتوں کو ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر یا کھلاڑی ہونے کے قابل ہی نہیں سمجھتی بلکہ عورتوں کو چادر اور چاردیواری کے نام پر گھروں میں بند کرنا چاہتی ہے تاکہ ملک کی نصف سے زائد آبادی کو دوسرے درجے کا شہری بنائے رکھے اور ملک کو پسماندہ رکھ سکے۔

38۔ یہ توقع کرنا کہ فوجی جنتا عوام کے جمہوری حقوق ازخود دیگی احمقوں کی جنت میں رہنا ہے۔ 5 جولائی 1977 سے جب سے ضیائی ٹولہ اقتدار میں آیا ہے یہ مسلسل عوام کے حقوق غصب کررہا ہے۔ اس نے عدلیہ کو بے بس کردیا، تحریر و تقریر و اجتماع کی آزادی کا نام و نشان نہ چھوڑا۔ پریس کو پابند کردیا۔ یہی سلوک طلباء کے حقوق کیساتھ کیا۔ نہ صرف طلباء، مزدور اور دوسرے محبّ وطن طبقات کے حقوق غصب کیئے گئے بلکہ مختلف قومیتوں کے حقوق پر بھی منظّم ڈاکہ زنی کی گئی۔

39۔ پاکستان مختلف قومیتوں کا وطن ہے اگر کوئی شخص شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپا کر اس کے برخلاف سمجھے تو اس سے قومیتیں ختم نہیں ہوجائیں گی۔ فوجی جنتا نے قومیتوں کے حقوق کو کچلا ہے۔ قومیتوں کے حقوق بھی مختلف طبقات کے حقوق کی طرح جمہوری تحریک کا حصہ ہیں۔

40۔ یہ فوجی جنتا سامراج کی پروردہ اور اس کے اشاروں پر ناچتی ہے اور سامراج کبھی بھی پاکستان کے عوام کے مفادات کی پرواہ نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ فوجی جنتا پاکستان کی

سرزمین کو سامراج اور چین کے ماؤ ٹولے کی بھرپور اعانت سے، افغان انقلاب کیخلاف استعمال کر رہی ہے۔ افغانستان کا قومی جمہوری انقلاب تاریخی عمل کا حصہ ہے جو وقت کیساتھ مضبوط ہو رہا ہے اور اسے کمزور کرنے کی ہر سازش ناکام ہو رہی ہے۔ ثور انقلاب افغان عوام کی امنگوں کا ترجمان ہے جن کے لئے پندرہ لاکھ ایکڑ زمین زمینداروں سے لیکر کسانوں میں تقسیم کی گئی، تمام سود کا خاتمہ کر دیا گیا اور پچھلا سود معاف کر دیا گیا جبکہ سود کے کاروبار کی سزا موت مقرر کی گئی۔ افغان خواتین، طلبہ، مزدور اور کسان تعلیمی اداروں میں اضافے اور صنعتی ترقی پر مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ افغان انقلاب کی اصلاحات اور ترقی نے اس علاقے میں جو مثبت اثر ڈالا ہے اس سے سامراج خوفزدہ ہے جس نے افغانستان میں، پاکستان کی فوجی جنتا، جماعت اسلامی، جاگیرداروں کے نمائندے ظاہر شاہ اور افغانستان سے بھاگے ہوئے سود خوروں کی مدد سے، مداخلت شروع کی ہوئی ہے۔ پاکستان کی حکومت نے خطرہ اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر متعدد بار افغان مسئلے کا پرامن حل تلاش کرنے کا اعلان کیا لیکن ہر مرتبہ سامراجی بلیک میلنگ اور دھمکیوں کی وجہ سے پیچھے ہٹ گیا۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جنیوا مذاکرات افغان عوام کی فتح تک جاری رہیں گے۔

41۔ پاکستانی عوام کا مفاد یہ ہے کہ فوجی جنرل افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کریں۔ اس حکومت کا رویہ حفیظ اللہ امین کے ساتھ نیم دوستانہ تھا حالانکہ اس نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ بلوچستان اور صوبہ سرحد کو افغانستان میں شامل کر کے عظیم تر افغانستان بنائے گا۔ موجودہ افغان حکومت کیساتھ اس کا رویہ دشمنی پر مبنی ہے حالانکہ ببرک کارمل حکومت نے واضح اعلان کیا ہے کہ وہ سرحدوں میں کوئی تبدیلی نہیں چاہتی اور بلوچ پٹھان سمیت دوسری قومیتوں کو اپنے مسائل پاکستان کی حدود کے اندر رہ کر حل کرنا چاہئیں۔ ببرک کارمل کے اس اعلان کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ حکومت دوستانہ رویہ اختیار کرتی لیکن ہوا یہ کہ فوجی جنتا افغانستان سے دشمنی اور ملک کی سالمیت سے کھیل رہی ہے اور ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی طرف جا رہی ہے جیسا کہ یحییٰ خان نے 1970 میں کیا۔ چونکہ فوجی جنتا، ایران، افغانستان اور پاکستان کیخلاف سامراجی

سازشوں میں مصروف ہے اس لئے تینوں ملکوں کے عوام کی جدوجہد ایک ہوگئی ہے۔ ان تینوں ہمسایہ ملکوں کے عوام متحد ہو کر سامراج سے آزادی حاصل کرینگے۔

42۔ موجودہ حکومت خود کو اسلامی کہتی ہے لیکن لوگوں کے شدید مطالبے کے باوجود بھی فلسطینیوں کے جہاد آزادی میں مدد کرنے اور امریکی ایجنٹ اسرائیل سے لڑنے کے لئے فوج کا کوئی دستہ نہیں بھیجا اور اس مطالبہ پر حکومت نے کان بند کر لئے۔ پاکستان کے عوام فلسطینیوں کے شانہ بشانہ لڑنے کے لئے تیار تھے لیکن حکومت نے ایک آدمی کو بھی اجازت نہیں دی۔ میں نے اور میرے دوستوں کمال وارثی شبیر شر، امداد چانڈیو، شیر محمد منگریو، محمد خان سولنگی اور ان ہزاروں لوگوں نے جو قید میں ہیں، یہ اپیل کی کہ ہمیں فلسطینی بھائیوں کی مدد کیلئے جانے دیا جائے اور اگر ہم شہید نہ ہوئے تو واپس آ کر اپنے مقدمے میں پیش ہوں گے لیکن حکومت نے نہ صرف یہ اپیل مسترد کر دی بلکہ جو لوگ فلسطینی بھائیوں کی ہمدردی میں جلوس اور مظاہرہ کر رہے تھے انہیں گرفتار کیا گیا اور ان پر تشدد کیا گیا۔ کچھ عرصہ پہلے جب فلسطینی طلباً کی انجمن GUPS اور سندھ NSF (جواب DSF ہے) نے ایرانی اور فلسطینی انقلاب کے بارے میں سندھ یونیورسٹی میں فلم دکھانا چاہی تو فوجی جنتا نے اس پر پابندی لگا دی۔ میں ان اسرائیلی اور امریکی طلباء کو سلام کرتا ہوں جنہوں نے فلسطینی عوام کیساتھ یکجہتی کا اظہار کیا۔

43۔ ضیاء ٹولے کی پالیسیاں عوام کیخلاف اور ملکی سالمیت کے لئے خطرناک ہیں۔ اس صورتحال میں طلباء خاموش تماشائی نہیں رہ سکتے اور ضیاء ٹولے کو ملک کی سالمیت خطرہ میں ڈالنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ موجودہ حکومت یحیٰی خان کی طرح نظریاتی سرحدوں کا راگ الاپ رہی ہے تاکہ اپنے ملک دشمن اور عوام دشمن جرائم کو چھپا سکے لیکن ہمارے ملک کے طلباء ذہین اور ذمہ دار ہیں اور وہ سامراجی سازشیں اور فوجی ٹولے کے عزائم کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔

44۔ ہم اور تم اسی معاشرے میں رہتے ہیں۔ تم معاشرے میں اصلاحات کرنے کی ڈینگیں مارتے ہو، ہم بھی معاشرے میں تبدیلیاں لانے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں، تم خود کو محبّ وطن کہتے ہو ہم بھی خود کو محبّ وطن کہتے ہیں۔ پھر ہم میں اور تم میں فرق کیا ہے؟ فرق یہ ہے کہ

ہم عوام کا شعور بلند کرنے کی جدوجہد کررہے ہیں اور تم عوام کے شعور کو مسخ کرنے اور اسکی ترقی روکنے میں لگے ہو، ہم طبقاتی شعور پیدا کرتے ہیں اور تم طبقاتی نفرت۔ تم نے ہمیشہ انتخابات کے نتائج سے انکار کیا ہم نے ہمیشہ عوام کے اقتدار اعلیٰ کی جدوجہد کی ہے۔ تمہارے پاس مارشل لاء نافذ کرنے کا بہت تجربہ ہے اور ہمارے پاس مارشل لاء کی مخالفت کرنے کا۔ تمہیں ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا تجربہ ہے اور ہمیں اسکی سالمیت کے لئے لڑنے کا۔ تم مسلح تباہی پھیلانے والے لوگ ہو اور ہم نئے سماج کے پیامبر۔ ہم جدوجہد کررہے ہیں نہ صرف اپنے ملک کو بلکہ دنیا کو آزاد کرانے کی۔ تمام نوجوانوں اور طالب علموں کے حق کے لئے۔ ہم محبّ وطن ہیں کیونکہ صرف جمہوریت پسند اور ترقی پسند ہی محبّ وطن کہلائے جاسکتے ہیں۔ تمہاری منطق تو حیرت انگیز ہے۔ تم آئین سے غداری کرتے ہو اور فوجی بغاوتوں کے ذریعہ اقتدار میں آتے ہو اور ہم پر بغاوت کا الزام لگاتے ہو! یہ مقدمہ صرف میرے یا میرے دوستوں کے خلاف نہیں بلکہ پاکستان کے تمام محبّ وطن عوام کیخلاف ہے۔ تم جانتے ہو کہ عوام تمہارے خلاف ہیں۔ تم جانتے ہو کہ ہم عوام کی آواز ہیں۔ تم نے خود کو جنگی جنون میں مبتلا کررکھا ہے جبکہ ہم ملک کی یکجہتی کے لئے لڑرہے ہیں۔ تم قوم کو سامراج کی شہ پر علاقائی جھگڑوں میں الجھاتے ہو جبکہ ہم سامراج سے آزادی کی جنگ لڑرہے ہیں۔ آج تم گدھوں کی طرح تباہی اور موت کی نشانی ہو جبکہ ہم نوجوان زندگی اور مستقبل کا نشان ہیں۔ ہم ہوچی منہ کے وارث ہیں اور تم ہٹلر، شاہ ایران، ریگن اور پنوشے کے، ہم سقراط کی سچ کی روایت اپنا فرض جانتے ہیں خواہ زہر کا پیالہ ہی ہمارا مقدر ہو۔ تم بندوق کی نالی اور عوام کی امنگوں کے قتل عام میں یقین رکھتے ہو جبکہ ہم عوام کی طاقت پر یقین رکھتے ہو۔ آج رائے عامہ فیصلہ کن طاقت ہے، فلسطینی مجاہدین کے لئے تمہاری حمایت کھوکھلے الفاظ پر مشتمل ہے جبکہ ہم عملی یکجہتی کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم دنیا بھر اور اس خطے کی قومی آزادی کی تحریکوں کی حمایت کرتے ہیں جبکہ تم امریکی سامراج کے حاشیہ بردار ہو جو قومی آزادی کی تحریکوں کا دشمن اور اُن کے خلاف سازشوں کا سرغنہ ہے۔ تم جنگی جنون کو ہوا دیتے ہو ہم امن چاہتے ہیں تم ہمارے خون پسینے کی کمائی امریکی اسلحہ خرید کرنے پر صرف کرتے ہو جو ہمارے ہی خلاف استعمال ہوتا ہے جبکہ ہم اپنی

معیشت کو مثبت پروگراموں مثلاً اسٹیل ملز، گدو تھرمل وغیرہ سے خود کفیل بنانا چاہتے ہیں۔

45۔ طالب علم برادری کے مسائل تعلیم شروع ہونے کے ساتھ ہی شروع ہوجاتے ہیں۔ ملک کے اسی فیصد اسکول جانے کی عمر کے بچے تعلیم کے حق سے محروم ہیں۔ ان کا وقت گندی نالیوں میں گذرتا ہے جبکہ میرے ملک کو ہزاروں سائنسدان، انجینئر ٹیکنیشن درکار ہیں۔ ہمارے عوام کی فی کس آمدنی مغربی ممالک کی فی کس آمدنی کا چالیسواں حصہ ہے اور یہ فرق روز بروز بڑھ رہا ہے۔ پرائمری اسکولوں کی تعداد کم ہورہی ہے۔ بیشتر اسکولوں میں اساتذہ نہیں ہیں اور ہوں بھی کیسے جب ان کی تنخواہیں چپراسیوں سے بھی کم ہیں۔ اگر کسی افسر کا تبادلہ ہوتا ہے تو حکومت انہیں ہر سہولت فراہم کرتی ہے لیکن کسی استاد کا تبادلہ ہوتا ہے تو اسے مکان کی سہولت بھی نہیں ملتی۔ بیشتر اسکولوں میں بیٹھنے کو چٹائی بھی میسر نہیں ہے۔ پھر تعلیم بھی طبقاتی بنیادوں پر ہے، بڑے لوگوں کے بچوں کے لئے پبلک اور پائلٹ اسکول ہیں جہاں بھاری فیسیں لی جاتی ہیں۔

46۔ تعلیم ہمارے ملک میں بہت مہنگی ہے۔ فیسیں بہت زیادہ ہیں، ہر سال اسی کالج میں دوبارہ داخلہ لینا ہوتا ہے۔ ضیاء ٹولے نے تو پرائمری اسکولوں میں بھی فیس لینا شروع کردی ہے۔ کتابیں کمیاب بھی ہیں اور مہنگی بھی۔ ہر سال کورس تبدیل ہوجاتا ہے، دیہی طلباء کے لئے شہروں میں ہوسٹل کمیاب ہیں۔ تعلیم مہنگی ہونے کی وجہ سے بیشتر طلباء تعلیم کیساتھ ساتھ پارٹ ٹائم یا فل ٹائم جاب کرنے پر مجبور ہیں۔ اس وجہ سے ہم مستقل سستی تعلیم کے لئے جدوجہد کررہے ہیں۔

47۔ ہمارا تعلیمی نظام غیر سائنسی اور فرسودہ ہے۔ تعلیمی ماحول از حد خراب ہے۔ حکومت اساتذہ پر تعلیمی معیار خراب کرنے کا الزام لگاتی ہے جبکہ اسکی ذمہ دار وہ خود ہے۔ نصابی تعلیم طلباء کی ذہنی ترقی کے لئے کارآمد نہیں ہے۔ جدید سائنسی تعلیم نہ صرف کم ہے بلکہ ضیاء ٹولہ اسے اور بھی کم کررہا ہے، حکومت کا سارا زور مذہبی تعلیم پر ہے تاکہ ہمارا نوجوان دوسرے ممالک کے مقابلے میں احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔

48۔ دیہی علاقوں میں اسکولوں کی ضرورت کے مقابلے میں صرف دس فیصد اسکول ہیں ان میں سے بھی کچھ صرف کاغذ پر ہیں۔ چھوٹے شہروں اور دیہات کے اسکولوں میں کوئی

فرنیچر نہیں ہے۔ کہیں کہیں اسکول کے لئے عمارت بھی نہیں ہے۔ سائنسی آلات کا تو ذکر ہی کیا۔ دیہاتوں میں ہائی اسکول اور مڈل اسکول بالکل نہیں ہیں جس کی وجہ سے طلباء کو میلوں پیدل چل کر جانا پڑتا ہے، تحصیل کی سطح پر کوئی کالج نہیں ہے۔ لڑکیوں کے اسکول تو تحصیل میں بھی نہیں ہیں۔ تعلیمی اداروں کی کمی کی وجہ سے سیکڑوں بچے داخلوں سے محروم رہتے ہیں۔ دیہاتوں میں ناہموار معاشی ترقی اور محدود تعلیمی سہولتوں کی وجہ سے میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں میں کوٹہ سسٹم نافذ کیا گیا ہے۔ حکومت اس کوٹہ سسٹم کے مسئلہ پر بھی لوگوں میں نفرت کے بیج بوتی ہے کبھی کوٹہ سسٹم کی حمایت کر کے تو کبھی مخالفت کر کے۔ ہماری ضرورت یہ ہے کہ ہر طالبعلم کو جو میڈیکل یا انجینئرنگ وغیرہ میں داخلہ لینا چاہتا ہے، داخلہ ملنا چاہئے تاکہ طلباء اور عوام میں اس مسئلہ پر پھوٹ نہ پڑے۔ تمام نوجوانوں اور شہریوں کو ''تعلیم ہمارا حق ہے نہ کہ رعایت'' کے نعرہ کے تحت تعلیم ملنی چاہئیے اور یہ نعرہ تمام دنیا کے نوجوانوں اور طالب علموں کا نعرہ ہے جو انٹرنیشنل یونین آف اسٹوڈنٹس کے پرچم تلے جدوجہد کر رہے ہیں۔

49۔ حکومت تعلیمی اداروں کو بند کرنے کا ہر موقعہ تلاش کرتی ہے۔ امن عامہ کے نام پر طلباء کی سرگرمیوں پر پابندی لگاتی ہے۔ ہر ماہ طلباء سے ہوسٹل خالی کرائے جاتے ہیں۔ تعلیمی اداروں کو مارشل لاء دفاتر میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ سینکڑوں طلباء کو کالجوں سے ہر ہفتہ نکال دیا جاتا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں پولیس اسٹیشن اور فوجی کیمپ بنا لئے گئے ہیں۔ حکومت کو سمجھنا چاہئے کہ وہ کب تک یہ طریقہ استعمال کر سکتی ہے۔

50۔ تشدد اور وحشی ہتھکنڈوں کا استعمال خود اس بات کا ثبوت ہے کہ جمہوری قوتیں پہلے سے زیادہ طاقتور ہیں۔ یہ حربے کب تک چلیں گے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آج کا نوجوان ہی اس ملک کا مستقبل ہے، یہ ملک عوام سے ہے، لوگوں کے مسائل کا حل جمہوریت میں ہے اور جمہوریت کی بنیاد جمہوری تعلیم ہی ہے۔ صرف امن اور جمہوری تعلیم ہی ملکی سالمیت کی ضمانت ہیں۔ پاکستان غیر جانبدار ممالک کی تنظیم کا رکن ہے اور جس کے چیئرمین کے الفاظ ہیں ''اگر فوج عوام کی خدمت کرتی ہے تو تنخواہ اور سہولیات کی حقدار ہے اور اگر اس میں ناکام ہوتی ہے تو اس کی

بیرکس کوتعلیمی اداروں میں تبدیل کردینا چاہیئے۔‘‘

51۔ نہ صرف یہ کہ تعلیم جمہوری نہیں ہے بلکہ ہمارے تعلیمی ادارے بھی افسر شاہی، پولیس اور فوج کے کنٹرول میں ہیں۔ ہم جدوجہد کرتے رہے ہیں کہ تعلیمی اداروں کو آزاد اور خودمختار ہونا چاہیئے۔ یہ عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھ میں ہوں یا اساتذہ اور ماہرین تعلیم کے۔ یہ ایک جائز مطالبہ ہے کیونکہ تعلیمی ترقی، ماہرین تعلیم سے وابستہ ہے۔ تعلیم بندوق کی نال کے زور پر نہیں ہوتی۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ حکومت تمام ملک بالخصوص سندھ اور بلوچستان کے تعلیمی اداروں میں انتخابات کرا کر ذمہ داری یونینوں کو سونپ دے تاکہ طلبہ اپنے مسائل حل کرسکیں اور مستقبل کی جمہوری قیادت ابھر سکے۔

52۔ حکومت نے کھیل، بحث مباحثہ، مضمون نویسی کے مقابلے جیسی غیر نصابی سرگرمیاں فضول سمجھتے ہوئے نصاب سے خارج کردیں۔ بچوں کے کھیل کے میدانوں پر مارشل لاء کورٹس نے قبضہ کرلیا ہے اس طرح تعلیم کے بجائے جہالت پھیلائی جارہی ہے۔ ہم جہالت کے خلاف جہاد کررہے ہیں۔ نوجوانوں کے عالمی رہنما فیڈل کاسترو نے ہوانا میں تقریر کرتے ہوئے کہا ’’میں چاہتا ہوں کہ میں ہر نوجوان کو طالب علم کہہ کر پکاروں لیکن افسوس کہ نوجوانوں کی اکثریت علم کی روشنی سے محروم ہے‘‘۔ اس پر بھی حکومت ایسا تعلیمی سسٹم نافذ کررہی ہے جو ان کی معیشت کے لئے صرف فاضل پرزے پیدا کرسکے۔

53۔ اگر ہم جمہوری تعلیم حاصل ہونے کی رکاوٹوں کو نظر انداز کردیں تب بھی یہ بات واضح ہے کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہر طالب علم کو کسی نہ کسی شعبہ میں خدمات انجام دینی ہیں لہٰذا روزگار کی ضمانت ہر طالبعلم کا بنیادی حق ہے اور روزگار کی ضمانت کیلئے ہر طالب علم کی نظر سماجی نظام کی طرف اٹھتی ہے۔

54۔ فوجی جنتا علیٰحدہ خواتین یونیورسٹی کھولنے کی بات کرتی ہے جبکہ ماہرین تعلیم کا کہنا ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیمی علیحدگی سے متعدد سماجی مسائل پیدا ہوگئے ہیں۔ اسی وجہ سے تمام مہذب ممالک میں مخلوط تعلیم کا رواج ہے۔ مارشل لا حکومت مخلوط تعلیمی اداروں کیخلاف اسلام کے

نام پر پروپیگنڈہ کرتی ہے اورنوجوانوں پر فحاشی اور جنسی جرائم کے الزام لگاتی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جنسی جرائم کی اصل وجہ معاشی اور سماجی مسائل ہیں۔حکومت کو اصل حقائق کو جھوٹ کے پردے میں چھپانا ہوتا ہے۔جنسی جرائم کراچی سے لیکر دور دراز کے ان دیہاتوں میں رونما ہوتے ہیں، جہاں کوئی اسکول نہیں ہے اور دور دور تک مخلوط تعلیم کا رواج نہیں ہے۔ دراصل اس اسلامی مارشل لاء حکومت کے دور میں جنسی جرائم کی تعداد بہت بڑھی ہے اگر ہم ان جرائم کی تہہ میں جو نفسیات ہے اسے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ لڑکیوں اور لڑکوں میں دوری ہی ان کا بڑا سبب ہے۔ عام تعلیم اور مخلوط تعلیم ہی وہ حل ہے جوان جرائم کو کم کرسکتا ہے۔مخلوط تعلیم دونوں جنسوں کے افراد کو قریب لاتی ہے اورا یکدوسرے کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور دونوں کے درمیان خلا کو کم کرتی ہے جس سے وہ ایک دوسرے کے لئے عجیب اوراجنبی نہیں رہتے۔ پھر یہ کہ مخلوط تعلیم ایک دوستانہ مقابلے کی فضا پیدا کرتی ہے جو تعلیمی معیار کو بڑھانے میں مدد دیتی ہے۔اس ضمن میں ایک مثال کافی ہوگی۔شیریں سومرو مخلوط تعلیمی کالج کی نہیں بلکہ گرلز میڈیکل کالج کی طالبہ تھی میجر کفایت اللہ جس نے اس پر مجرمانہ حملہ کیا اس وقت ملک کی نظریاتی سرحدوں کا دفاع کررہا تھا وہ بھی کسی مخلوط تعلیمی ادارہ کا پڑھا ہوا نہیں تھا۔لہذا یہ کہنا لغو ہے کہ مخلوط تعلیمی اداروں پر جنسی جرائم کی ذمہ داری آتی ہے، اس کے ذمہ دار معاشی اور سماجی نظام ہیں اور سائنسی تعلیمی پالیسی اور سماجی ڈھانچے کی تبدیلی ہی اس کا حل ہے۔

55۔طلبہ برادری اپنے اس تاریخی کردار سے واقف ہے جوان مسائل کے حل کرنے میں اسے دوسرے طبقات کے ساتھ مل کر ادا کرنا ہے۔انہیں معلوم ہے کہ حکمران طبقے ان کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کریں گے۔حکومت اتنی خوفزدہ ہے طلباء سے کہ ان کی آواز دبانے کے لئے وہ تعلیمی اداروں کو بند کررہی ہے۔وہ ہر طلباء تحریک کو کسی بھی صورت میں کچلنے کی کوشش کرتی ہے لیکن حکومت یہ نہیں جانتی کہ جب طلبہ کو تعلیمی اداروں سے پولیس کے ذریعہ نکالا جاتا ہے تو وہ ٹریڈ یونین میں پناہ لیتے ہیں، کیونکہ طلباء جانتے ہیں کہ مزدور طبقہ ہی سماج کی تبدیلی کے لئے مستقل مزاجی سے لڑتا ہے۔اس طرح طلباء کی سیاست مزدور طبقہ کی سیاست میں شامل ہوجاتی

ہےاور دونوں انقلابی طبقے متحد ہو جاتے ہیں۔مزدور طبقہ طلباء کی تعلیم سے فائدہ اٹھاتا ہےاور طلباء مزدور طبقے کی مستقل مزاج طاقت سے۔ دوسری طرف وہ طلباء جو نکالے جانے پر دیہاتوں میں چلے جاتے ہیں، کسانوں میں جدوجہد کا شعور پھیلانے کا سبب بنتے ہیں۔ یہ رشتہ جتنا گہرا ہوتا ہے جمہوری تحریک کا دھارا اتنا ہی مضبوط ہوتا ہے۔

56۔ دنیا بھر کے طالب علموں میں اپنی تاریخ خود بنانے کا رجحان غالب ہے اور پاکستان کے طالب علم بھی کوئی استثنا نہیں ہیں۔ پیٹرس لومبا کے الفاظ میں ''ہر گریجویٹ اپنے ملک کی اسمبلی کا رکن ہے''۔ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی قومی آزادی کی تحریکوں میں طلباء نے اہم کردار ادا کیا ہے۔طلباء نے ایوب اور یحیٰی کی آمریت کو ختم کرنے میں بھی بڑا حصہ لیا ہے۔

57۔ سامراجی غلبہ اور نیم نوآبادیاتی استحصال ہمارے ملک میں طلباء کے مسائل کو شدید بنا رہے ہیں۔ پورا ملک فاقہ کشی، بیروزگاری، جہالت، کسانوں کی بیدخلی اور مزدوروں کی چھانٹی کا شکار ہو رہا ہے، زندگی کی ہی ضمانت نہیں رہی تو روزگار کی کیا ضمانت۔تحریر و تقریر، ذرائع ابلاغ، سیکھنے سکھانے کی آزادیاں مجروح ہیں۔ یہ فضا طلباء اور ان کے والدین کے لئے گھٹن پیدا کر رہی ہے۔ کیا اس صورتحال میں طلباء اور نوجوان خاموش بیٹھ سکتے ہیں۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ موجودہ مارشل لاء حکومت اور حکمران طبقات ان مسائل کو حل نہیں کر سکتے۔ ان مسائل کو کمرشل بنیادوں پر حل نہیں کیا جا سکتا۔عوام کا شعور بڑھنا ان کیلئے موت ہےاور وہ خود اپنی موت کے پروانے پر دستخط نہیں کر سکتے۔ ان مسائل کی صرف مزدور طبقہ کی حکومت جو سائنسی اور نظریاتی بنیادوں پر قائم ہو، حل کر سکتی ہے۔ ہم اسی کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں اور اس کے لئے جیلیں کاٹنا، ٹارچر کیمپوں سے گذرنا اور موت کو گلے لگانا کھیل سمجھتے ہیں۔ طلباء اور نوجوان، قومی جمہوری معاشی، تہذیبی اور طبقاتی حقوق کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ میں یہ واضح کر دوں کہ سندھ کے نوجوانوں میں حقوق کے مسئلے پر تین رجحانات ہیں۔ ایک رجحان یہ ہے کہ صرف سندھی مزدور اور سندھی کسانوں کو ہی منظّم کیا جانا چاہیئے سندھ کی آزادی کے لئے۔ کیونکہ پنجابی اور پٹھان ان کے دشمن ہیں، یہ دونوں رجحان جاگیردارانہ قوم پرستی اور درمیانہ طبقے کی قوم پرستی کے نمائندے ہیں

اسی لئے رجعت پسند سیاست کا حصہ ہیں اور بورژوازی کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ تیسرا رجحان، انقلابی رہنما کامریڈ جام ساقی کے الفاظ میں یہ ہے ”ذات پات، رنگ، نسل، زبان یا قوم کی سامراجی غلبے سے آزادی کی جدوجہد، مزدور طبقے کی حکومت ان مسائل کا واحد حل ہے اور قومیتوں کے مسائل جمہوری تحریک کا حصہ ہوں۔ قومی آزادی اور علیحدگی دو علیحدہ اور متضاد رجحانات ہیں، قومی آزادی کی تحریک، سامراج سے آزادی کی جدوجہد ہے اور اندرونی طور پر استحصالی طبقات سے آزادی کی جدوجہد ہے جبکہ علیحدگی کا نتیجہ سرحدوں کی تبدیلی میں اور سماجی نظام کو برقرار رکھنے کی صورت میں نکلتا ہے۔ ہمیں کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ہمارا ملک سامراج کے معاشی استحصال کا شکار ہے اور اس کے ایجنٹ حکمران طبقے نے قومی جبر قائم کیا ہے تاکہ تیزی سے بڑھتی ہوئی مزدور تحریک کو، قوموں کو تقسیم کرنے اور لڑانے کی پالیسی سے روکا جائے۔ اگر ہم پورے ملک کے قومی جمہوری تحریک کے بہاؤ کو نظر میں رکھیں تو معلوم ہوگا کہ ون یونٹ ٹوٹنے کے بعد پنجاب کے طلباء اور نوجوان موقعہ پرستی کے بجائے جدوجہد کی طرف بڑھے ہیں۔ یہ رجحان روزانہ مضبوط تر ہو رہا ہے اور پنجاب کے طلبہ اور نوجوانوں کا جمہوری تحریک سے رشتہ بھی، نتیجتاً مارشل لاء کیخلاف مزاحمت بھی بڑھ رہی ہے۔ موجودہ بین الاقوامی اور علاقائی صورتحال نے بلوچستان کے طلباء اور نوجوانوں کی بیگانگی کو ختم کیا ہے اور ان میں بھی دوسری قومیتوں اور جمہوری طاقتوں سے مل کر جدوجہد کرنے کا رجحان بڑھا ہے۔ قوم پرستی کے جذبے کے بجائے بین الاقوامیت اور طبقاتی شعور میں اضافہ ہوا ہے اور ان میں انقلابی طاقتیں خود کو منظّم کر رہی ہیں۔ افغانستان کے ثور انقلاب نے بھی سرحد کے عوام، طلباء اور نوجوانوں میں انقلابی جدوجہد کے خیالات کو متاثر کن طریقہ سے پھیلایا ہے۔

58۔ عام طور پر علیحدگی پسندی کے بجائے انقلابی سوچ بڑھ رہی ہے اور انقلابی طاقتیں پہلے کی نسبت زیادہ موثر کردار ادا کر رہی ہیں۔ اسی وجہ سے حکمران طبقہ سوتے میں بھی چیخ اٹھتا ہے کہ سوشلزم درّہ خیبر کے دروازہ پر دستک دے رہا ہے۔

59۔ ہم جانتے ہیں کہ سامراج ہر وقت پرانے اور فرسودہ نظریات کا ریڈیو، ٹی وی،

پریس، فلم اور دوسرے ذرائع سے پروپیگنڈہ کرتا ہے تاکہ نوجوان فراریت کی طرف مائل ہوں اور انقلابی جدوجہد کی طرف نہ جائیں مثلاً منشیات کا رجحان جس سے زندگی سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور صلاحیتوں کو زنگ لگ جاتا ہے۔ منشیات ایک حربہ ہے۔ ذہنی ترقی کو جنسی کجرویوں کے ذریعہ تباہ کرنا بھی سامراج کا طلباء اور نوجوانوں کے خلاف ایک ہتھیار ہے۔ عورتوں کے تقریباً عریاں ماڈل، فحاشی اور عریانیت اور ہم جنس پرستی بھی اسی ذہنی کجروی کا نتیجہ ہے جو سامراجی پروپیگنڈہ کے زیر اثر پیدا ہوتی ہے۔ فحش لٹریچر ایک طرف نوجوانوں کو تباہ کرتا ہے تو دوسری جانب اس کی لاکھوں کی اشاعت سرمایہ داروں کی آمدنی کا ایک ذریعہ ہے۔ مزید یہ کہ ہمارے نوجوانوں کی توجہ ترقی پسند اور سائنسی لٹریچر کی طرف نہیں ہوتی۔ جاسوسی فلمیں اور لٹریچر بھی اسی کھیل کا حصہ ہیں جن سے لوگ قتل اور ڈاکے ڈالنا سیکھتے ہیں۔ مغربی ممالک میں تعلیم کا مرکزی مقصد انفرادیت پیدا کرتا ہے اور یہی زہر پاکستان میں بھی پھیلایا جا رہا ہے۔ انفرادیت، سماجی زندگی سے علیحدگی پیدا کرتی ہے۔ حکمران طبقے کے مفادات کو یہ انفرادیت پورا کرتی ہے کیونکہ اس سے فرد کی صلاحیتوں کے استحصال میں آسانی ہوتی ہے۔ تمام سائنسی ترقی، دنیا بھر کی اجتماعی جدوجہد کا نتیجہ ہے لیکن اجارہ دار اس کو صرف اپنے مفاد میں استعمال کرتا ہے۔ سامراج لوگوں کو ذات پات، رنگ، نسل، زبان اور مذہب کے خانوں میں تقسیم کرتا ہے تاکہ حکومت کرنے میں آسانی ہو۔ سامراج سیاسی عمل میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر عوام پوری طرح سیاسی عمل میں حصہ لیں تو یہ اسکی موت ہوگی۔ اسی لئے حکمران طبقات لوگوں کو دائیں اور بائیں بازو کی انتہا پسندی میں مبتلا رکھتے ہیں کیونکہ یہ دونوں رجحانات رجعت پسند سیاست کا حصہ ہیں۔ ہیروازم کے زیر اثر کچھ نوجوان بڑے بڑے دعویٰ کرتے ہیں لیکن پھر مایوس ہو کر عوام کو گالیاں دینے لگتے ہیں۔ شخصیت پرستی بھی اسی طرح کا مہلک عارضہ ہے۔ اسی طرح سے سامراجی پروپیگنڈہ مستقل جدوجہد کے بجائے مصالحت، موقعہ پرستی اور اصلاح پسندی پر زور دیتا ہے۔ سرمایہ دارانہ سماج چونکہ ایک طبقاتی سماج ہے اس لئے وہ نوجوانوں میں طبقاتی احساس کمتری پیدا کرتا ہے۔ صورتحال بہت گھمبیر ہوگئی ہے پھر بھی ہم دنیا بھر کے اور پاکستان کے طلباء اور نوجوان جدوجہد کر رہے ہیں اور فتح یقیناً ہماری

ہوگی۔

60۔ ہم طالب علم جانتے ہیں کہ حکمران طبقات اتنے تنہا ہیں کہ آبادی کا کوئی بھی محبّ وطن حصہ ان کی حمایت کے لئے تیار نہیں ہے۔ اسی لئے یہ عوام کا اقتدار اعلیٰ از خود واپس نہیں کرینگے۔ ہمیں مستقل مزاجی سے جدوجہد کر کے اقتدار اعلیٰ حاصل کرنا پڑے گا۔ اقتدار اعلیٰ سے ہماری مراد یہ ہے کہ ملک کا نظم ونسق عوام کے ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ اسی لئے ہم جانتے ہیں کہ سامراج کو نکالے بغیر جمہوریت کا تصور محال ہے۔ حکمراں طبقہ اتنا تنہا ہو چکا ہے کہ اب وہ پولیس اور دوسرے انتظامی اداروں پر بھی بھروسہ نہیں کرتا اور صرف فوج پر اعتماد کرتا ہے۔ وہ ہماری فوج کو ہمارے محافظ کے بجائے سامراجی کرایہ کی فوج بنا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے ملک کے سپاہی اس کردار کو کبھی پسند نہیں کرینگے۔ خواہ مارشل لاء اس کے لئے کتنی ہی مراعات کا اعلان کرے۔ حکومت عوام کی محنت کی کمائی سے روزانہ ایک کروڑ روپیہ مارشل لاء ڈیوٹی پر خرچ کر رہی ہے۔

61۔ آج نہ صرف طلباء بلکہ مزدور، کسان، خواتین، مصنف، دانشور، وکیل، صحافی اور اساتذہ بھی مارشل لاء کے جبر کا شکار ہیں۔ ایک ہی ظالم کے خلاف ان کا اتحاد بڑھ رہا ہے اور یہی اتحاد سامراج کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا۔

62۔ مجھے فخر ہے کہ میں ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا کارکن ہوں جو طلباء کی سب سے زیادہ ترقی پسند اور سب سے بڑی تنظیم ہے۔ مجھے فخر ہے کہ ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن طلباء کی عالمی تنظیم انٹرنیشنل یونین آف اسٹوڈنٹس اور نوجوانوں کی عالمی تنظیم ورلڈ فیڈریشن آف ڈیموکریٹک یوتھ کی رکن ہے جو امن، جمہوریت اور ترقی کی عالمی تحریک میں اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔ ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے ہی طلباء تحریک کا آغاز کیا تھا۔ پروفیسر جمال نقوی جو 1953 کی طلبہ تحریک کے رہنما تھے اسی تنظیم سے وابستہ تھے اور آج میرے ساتھ اس مقدمے میں ہیں۔ سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے بانی اور آج مزدوروں اور کسانوں کے رہنما جام ساقی بھی میرے ساتھ اس مقدمے میں ہیں۔ آپ اس ملک کے پس

منظر کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ مزدور طبقے کے بیشتر رہنما طالب علموں میں سے آئے ہیں۔ میں سلام کرتا ہوں ان تمام طالب علموں اور محنت کشوں کو جنہوں نے اپنی جانیں نذر کیں اور قربانیاں دیں۔ میں سلام کرتا ہوں میرے ساتھی اور میرے رہنما نذیر عباسی شہید کو جو آج ہمارے ساتھ اس لئے نہیں ہے کہ قصابوں نے انہیں قتل کر دیا۔ لیکن یاد رکھو ایک نذیر عباسی کا قتل ہزاروں نذیر عباسی پیدا کرتا ہے۔ ایک حمید بلوچ کی موت ہزاروں حمید بلوچ پیدا کرتی ہے۔ ہم اس ملک کے بہادر لوگوں کا حصہ ہیں اور اپنے ذاتی کیریئر کے بجائے اپنے تاریخی اور محبّ وطن کردار پر فخر کرتے ہیں۔

63۔ پاکستان کے نوجوانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے میں اس فوجی عدالت کو عدلیہ کا حصہ تسلیم نہیں کرتا بلکہ اسے استحصالی حکومت کا ایجنٹ سمجھتا ہوں۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ ملک اور عوام کے مفاد میں جو کچھ ہم نے کیا ہے ہم اس پر فخر کرتے ہیں اور یہی کرینگے۔ ہمارا مقصد پاکستان میں سیکولر جمہوری حکومت قائم کرنا ہے جس کی طاقت کا منبع عوام ہوں۔ ہم کسی کے آگے سر جھکانے کو تیار نہیں ہیں۔ ہم قسم کھاتے ہیں کہ ہم پاکستان کو عوام کا پاکستان بنائیں گے۔ ہم کسی سے خوفزدہ نہیں ہیں۔ خوفزدہ تو وہ لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ ہمیں روک سکیں گے۔ عوام کا جمہوری طاقتور دھارا ان سب کو بہالے جائیگا۔ جیسا افغانستان میں ہوا اور جیسا ساری دنیا میں ہوگا۔ شکست ان کا مقدر ہے اور ہماری فتح ناگزیر ہے۔

ایک ہی حل

انقلاب

انقلاب

گواہان کے بیانات

مس بے نظیر بھٹو کا ریاست بمخالف
جام ساقی اور دیگر مقدمے میں فوجی عدالت میں پیش ہونا

پس منظر: جام ساقی اور دیگر کے خلاف مقدمے میں خصوصی فوجی عدالت کے سامنے صفائی کے گواہ کے طور پر بے نظیر بھٹو کو پیش کیے جانے کے موقعہ پر کشمیر روڈ کے تمام داخلی راستوں پر پولیس کی بھاری نفری لگائی گئی تھی۔ پولیس نے نہ صرف گاڑیوں کی آمدرفت بند کی بلکہ کشمیر روڈ پر پیدل چلنے والے افراد کا بھی داخلہ ممنوع تھا۔

جام ساقی اور دیگر پر نظریۂ پاکستان کے خلاف کام کرنے، طبقاتی منافرت پھیلانے، مسلح افواج میں بداعتمادی پیدا کرنے، صوبائیت کو ہوا دینے اور بغاوت بھڑکانے سمیت انگنت الزامات کے تحت مقدمہ قائم کیا گیا تھا۔ انکے دفاع میں کئی سیاسی اور سماجی شخصیات کو بلایا گیا تا کہ انکے خلاف عائد الزامات کی صحت پر بحث ہو سکے۔

بے نظیر بھٹو کی پہلے دن عدالتی حاضری سے متعلق برطانوی روزنامہ ''گارجین'' کے ایک نامہ نگار نے اپنی رپورٹ میں تحریر کیا، ''پاکستان کی سب سے اہم سیاسی قیدی بے نظیر بھٹو، مارشل لا کے تسلسل پر ایک سخت اور جامع حملہ کر کے ڈرامائی انداز میں عوامی زندگی میں واپس لوٹ آئیں۔

''مس بھٹو، جو پچھلے دو سال سے زائد عرصے سے نظر بند ہیں، اپنی جبری سیاسی خاموشی توڑنے میں کامیاب رہیں کیونکہ انہیں کراچی کی ایک خصوصی فوجی عدالت میں صفائی کے گواہ کے

طور پر پیش ہونے کیلیئے طلب کیا گیا تھا۔

’’اس سے قبل کے کچھ گواہان، بشمول کالعدم جماعتوں کے مرکزی رہنما، کو کچھ ذرائع ابلاغ میں جگہ ملی لیکن مس بھٹو کی پیشی کے موقعہ پر غیر معمولی حفاظتی اقدامات نے ایک مرتبہ پھر واضع کر دیا کہ پاکستان کی فوجی جنتا انہیں خود کیلیئے سب سے بڑی للکار سمجھتی ہے۔‘‘

’’وہاں پہنچنے والے تمام اخباری نمائندوں کو راستہ روکے جانے اور اسپورٹس کمپلکس جہاں پر عدالت واقع ہے، کے تمام داخلی راستوں پر پولیس کے پہریداروں کا سامنا کرنا پڑا۔

’’مس بھٹو پرسکون اور صحتمند دکھائی دیں اور انکے برتاؤ سے واضع ہو رہا تھا کہ انکی اپنی خوش بیانی اور بذلہ سنجی برقرار ہیں۔‘‘

مس بھٹو نے انقلاب، نظریۂ پاکستان، مارشل لا اور مسلح افواج میں فرق پر بات کی اور انہوں نے اس امر پر زور دیا کہ اسلام میں مارشل لا کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ اسلام خدا کے حضور جھکنے کا نام ہے جبکہ مارشل لا کسی فوجی کمانڈر کے سامنے جھکنے کا نام ہے۔

(فوجی عدالت نے اُن سے انکا اور انکے والد کا نام دریافت کیا)

جواب: میرا نام بے نظیر بھٹو ہے اور میں پاکستان کے منتخب وزیر اعظم اور غریبوں کے ادنیٰ خادم شہید ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی ہوں۔ اس وقت میں سب جیل ضوابط کے تحت نظر بند ہوں۔

کراچی

26مارچ،1983

مس بے نظیر بھٹو، گواہ

عمر:29سال

70-71 کلفٹن (سب جیل) کراچی

ذات: غیر متعلقہ سوال

عدالتی سوال: جناب جام ساقی سے متعلق آپ کیا کہنا چاہیں گی؟

یہ پہلا موقعہ ہے کہ میں جناب جام ساقی سے بالمشافہ مل رہی ہوں، اگرچہ انکے متعلق میرا اولین تاثر 1978 میں اُس وقت قائم ہوا تھا جب مجھے اپنی پارٹی کے ایک رکن سے یہ پیغام موصول ہوا کہ جام ساقی نے اپنا دستِ تعاون پاکستان پیپلز پارٹی کی جانب بڑھایا ہے۔ اگرچہ ماضی میں وہ ہماری جماعت کے مخالف رہے ہیں، تاہم سمجھتے تھے کہ موجودہ جدوجہد رجعت پرست اور ترقی پسند قوتوں کے درمیان ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شہید ذوالفقار علی بھٹو کو قومی مفادات کو مقدم رکھنے اور بدقسمت اور استحصال زدہ لوگوں کی قسمت بدلنے والی اصلاحات متعارف کرانے کے جرم میں معتوب کیا جارہا ہے۔ میں نے سیاسی بنیادوں پر سوچنے اور ذاتی احساسات کو اعلیٰ آدرشوں پر ترجیح نہ دینے کی بنا پر جناب جام ساقی کو قابلِ احترام سمجھا۔ اُس وقت سے وہ اور میں، دونوں حراست میں رہے ہیں اور اب اس عدالت کی نوازش سے بالآخر آپس میں مل سکے ہیں۔

عدالتی سوال: فوجی عدالتوں کے متعلق آپ کیا کہنا چاہیں گی؟

بین الاقوامی قانون اور قومی قانون میں دو اصطلاحات ہیں جو موجودہ صورتحال کا مظہر ہیں، وہ الفاظ ہیں، 'Defacto' اور 'Dejure'۔ Dejure ایک قانونی حکم نامے سے متعلق ہے، یہ اُن اعمال اور ضوابط سے متعلق ہے جو کہ کسی قانونی دستاویز یا اختیاری کے ماخذ ہوں، جیسا

کہ برطانیہ کی صورت میں بادشاہ سے غیر تحریری صورت میں قانون ساز ادارے کے مشورے پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ تمام تر جیسا کہ دنیا کے اکثر ممالک میں ہوتا ہے، شہریوں اور معاشرے کے تعلقات سے متعلق ایک نمائندہ دستاویز سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہ دستاویز آئین کہلاتی ہے، dejure کے طور پر دیکھے جانے والی کسی قانونی اختیار والی اختیاری سے اخذ کردہ۔

آج پاکستان میں ہمارے ہاں آئینی / قانونی اختیار کی صورتحال نہیں ہے۔ ہمارے ہاں مارشل لا ہے، جو کہ فوجی رجمنٹ کا مظہر ہے، جو کہ فوجی رجمنٹ کے کمانڈر کے تحت ایک ضابطہ ہے اور جو کسی اتفاقِ رائے کے بجائے اُس طاقت کی دھمکی کے ذریعے نافذ ہوتا ہے جو کہ کمانڈر کو حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح ہم ایک عملی صورتحال میں ہیں۔ میں مارشل لا عدالتوں کو غیر قانونی سمجھتی ہوں نہ کہ آئینی / قانونی، تاہم عملی صورتحال یہ ہے کہ اس عدالت کو ایک فیصلہ سنانا ہے۔ آئینی / قانونی عدالتوں کی جانب سے اعلان کردہ کسی فیصلے کے تحت کوئی شخص قانونی طور پر مجرم ہوسکتا ہے، تاہم فوجی عدالتوں کی جانب سے سزا یافتہ ہونے کے باوجود وہ آئینی / قانونی معیارات سے بے قصور ہی ہوگا۔

عدالتی سوال: ایرانی انقلاب کے متعلق آپ کیا کہنا چاہیں گی؟

آیئے پہلے لفظ انقلاب کو واضع کریں، عدالتی مداخلت: ایرانی انقلاب... انقلاب کوئی ایسا امر نہیں جس پر ایران کی کوئی اجارہ داری ہو یا وہاں اسکی کوئی خصوصی حیثیت ہو۔ انقلاب ایک تاریخی تصور ہے اور انقلاب اُس وقت رونما ہوتے ہیں جب صورتحال کسی مخصوص علاقائی یونٹ میں، اس حد تک توڑ پھوڑ کا شکار ہو جائے کہ نہ صرف سیاسی اور معاشی صورتحال بلکہ صورتحال کو جوں کا توں برقرار رکھنے کے ذمہ دار ریاست کے تمام تر ادارے ابتری کا شکار ہو جائیں۔ اور عوام کے وسیع تر حلقوں میں سرایت کر جائے کہ وقت آ پہنچا ہے کہ انکے پاس کھونے کو کچھ باقی نہیں بچا ہے اور اگر انہوں نے ہمت کا مظاہرہ کیا اور اپنے جائز معاملات اپنے ہاتھوں میں لے لئے تو وہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ موجود نظام کے بدعنوان اور زوال پذیر اداروں کو تہس نہس کر کے انہیں اپنی مرضی کے مطابق ڈھال دیتے ہیں۔ انقلاب کا مطلب مکمل تبدیلی ہے، اسکا مطلب پرانے

میں سے کچھ برقرار رکھنا مقصود نہیں ہے، اور اسی وجہ سے کسی نئے نظام کے وضع ہونے سے قبل انتشار کا ایک دور آتا ہے، چونکہ اس نئے نظام کو وسیع تر عوامی تائید حاصل ہوتی ہے چناچہ اسکو وہ پذیرائی حاصل ہوجاتی ہے جو کہ پرانے کو میسر نہیں ہوتی۔ لوگ اُس وقت تک گولیوں کے سامنے سینہ سپر نہیں ہوتے جب تک انکے پیشِ نظر کوئی مقصد نہ ہو، اسی لئے تمام تر خدشات کے باوجود انقلاب آجاتا ہے۔ جب کسی نظام میں اپنے اندر پیدا شدہ امور کو حل کرنے کے ذرائع موجود ہوں لیکن مذکورہ نظام اپنے تضادات اور تنازعات حل کرنے سے قاصر ہو یا نہ کرنا چاہے تو ایسا نظام بالآخر ڈھیر ہوجاتا ہے۔ میں 'شہید بھٹو' کے سپریم کورٹ کو دیئے گئے اپنے جوابی استدلال کا حوالہ دینا چاہوں گی:

''انقلاب ایک دلکش لفظ ہے۔ انقلاب تاریخ کی قوس وقزح ہے۔ انقلاب کا مطلب ناانصافی اور ناہمواری کا خاتمہ ہے۔ اسکا مطلب استحصال کا خاتمہ، نوآبادیت کا خاتمہ ہے۔ انقلاب کا مطلب انسانوں کی آزادی اور عورتوں کی نجات ہے۔ انقلاب کا مطلب جموں اور کشمیر کے عوام کا حقِ خودارادیت ہے۔ اسکا مطلب جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کا خاتمہ ہے۔ اسکا مطلب فلسطین کا قیام ہے۔ اسکا مطلب تیسری دنیا کی مظلوم اقوام کیلئے انصاف پر مبنی ایک نیا معاشی نظام ہے۔ انقلاب کا خیر مقدم کیا جانا چاہیئے نہ کہ اس سے خوفزدہ ہوا جائے۔ تاہم اگر انقلاب کی محدود ترین معنی میں وضاحت کی جائے، تب بھی فوجی عدالت کو انقلاب کی مذمت کرنے یا مخالفت کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اس لفظ کے ایسے محدود اور تنگ استعمال میں، کسی جمہوری اور قانونی آئینی حکومت کو تو انقلاب کی پکار پر اعتراض ہوسکتا ہے لیکن یقیناً کسی فوجی جنتا کو نہیں۔ انقلاب ناہمواری اور استبداد کے خلاف وسیع تر عوام کا ایک واضح منشور ہے۔ یہ اُنکے نمائندوں کے قانون سے زیادہ بڑا اور معتبر قانون ہے۔ اُن نمائندوں کا متبادل، جنہوں نے انکے ساتھ دھوکہ کیا ہے، عوام انقلاب کے ذریعے براہ راست فیصلے کرتے ہیں نہ کہ پارلیمان کے ذریعے۔ انقلاب کا مطلب تبدیلی ہے اور تبدیلی لازوال ہے۔''

جناب جام ساقی عدالتی دستاویز M-4-A کا صفحہ نمبر 11 پڑھتے ہیں، وہ تبصرہ کرتی

ہیں:

(a) یہ شہنشاہیت مخالف اور عوام کی بہادری اور حقوق کیلئے انکی لڑائی سے متعلق عمومی نکات ہیں جبکہ تیسرا مضمون واضح کرتا ہے کہ پاکستان کی مارشل لاء جنتا اور اسکے سامراجی حمایتی فکرمند ہیں کہ یہ پاکستان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے گا۔ قدیم تہذیب کے زمانے سے ہر فرد کو اپنا نقطۂ نظر رکھنے کا حق حاصل ہے اور اُسے فقط اس بنیاد پر تادیب اور تعزیر کا نشانہ نہیں بنانا چاہیئے کہ حکمران قوت اس سے متفق نہیں ہے، اور وہ بھی بالخصوص اُس وقت جب حکمران ٹولے کو عوامی تائید حاصل نہ ہو۔ علاوہ ازیں، خود امریکی دانشوران اور ذرائع ابلاغ کے ماہرین نے شاہ کے زوال کے بعد اپنے ملک کے موقف اور جھکاؤ پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔

نظریۂ پاکستان

دو اقسام کی ریاستیں ہوتی ہیں، تاریخی اور نظریاتی، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ایک تیسری نوعیت کی ریاستیں بھی ہوتی ہیں، اگرچہ وہ نو آبادیات سے ٹوٹ کر وجود میں آئی ہوئی ہیں۔ عمومی طور پر تیسری قسم کو اُس براعظم سے منسلک کیا جاتا ہے جہاں قبائلی اثرات کا دور دورہ رہا ہے۔ تاریخی ریاستیں تاریخی عمل کے نتیجے میں وجود میں آتی ہیں۔ اسی لئے ہم یورپ کی زیادہ تر ریاستوں کے علاوہ ایشیا کی بھی زیادہ تر ریاستوں کو اس درجے میں رکھ سکتے ہیں۔ پاکستان نظریاتی ریاست کے زمرے میں ہے۔ نظریاتی ریاست کیا ہوتی ہے؟ آیئے اسکی ابتدا نظریئے کی توضیع سے کریں۔ نظریہ انسانی زندگی یا ثقافت سے متعلق خیالات / تصورات کا ایک مربوط مجموعہ ہے۔ نظریے کو جمود برقرار رکھنے، یا اصلاحی انداز میں کوئی تبدیلی لانے یا انقلابی تبدیلی لانے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ تینوں چیزیں مختلف ہیں، تاہم تاریخ میں نظریہ استعمال کیا گیا ہے کیونکہ تصورات عمل کا جواز پیش کرتے ہیں، کوئی واضع تصور تحریک اور جوش وخروش فراہم کرتا ہے۔ باہم ربط رکھنے والے تصورات کا مجموعہ نظریے کی تشکیل کرتا ہے۔

چونکہ پاکستان ایک تاریخی ریاست نہیں ہے اور اسکی جدوجہدِ آزادی کچھ مخصوص تصورات پر مبنی تھی چناچہ یہ ایک نظریاتی ریاست ہے۔ نظریۂ پاکستان کے تعین کیلئے ہمیں تحریکِ

پاکستان پر ایک نظر ڈالنی ہوگی۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نظریہ پاکستان غیر منقسم ہندستان میں مسلمانوں کے اس خوف پر مبنی تھا کہ وہ سیاسی اور معاشی حقوق حاصل نہیں کر سکیں گے کیونکہ انکے ساتھ مسلمان ہونے کی بنیاد پر امتیازی سلوک روا رکھا جائے گا۔1871 میں سر ولیم ہنٹر کی کتاب ہندستانی مسلمان میں صورتحال اس طرح بیان کی گئی ہے:

''ایک سو سال قبل، مسلمان تمام اہم ریاستی عہدوں پر چھائے ہوئے تھے۔ ہندو شکرگذاری کے ساتھ یہ صورت قبول کیے ہوئے ہیں کہ سابقہ فاتحین اب تخت سے گرائے جا چکے ہیں۔

محمڈن (مسلمان) کا تناسب 1.7 سے کم نہیں ہے، اسکے باوجود کلکتہ (دارالحکومت) میں کوئی سرکاری دفتر کم ہی نظر آتا ہے جہاں مسلمان قاصد، قلم و دوات بھرنے والے سے اعلیٰ کسی عہدے کی اُمید رکھتے ہوں۔''

برطانوی راج کے برقرار رہنے کے ساتھ ہندستانی مسلمانوں میں عدم تحفظ کا احساس بڑھتا گیا، انہوں نے محسوس کیا کہ وہ ہمیشہ دوسرے درجے کے شہری رہیں گے اور اس وجہ سے قومی وسائل میں اپنے جائز حصے سے محروم رہیں گے، یہی صورتحال انکے سیاسی اور معاشی حقوق کے ساتھ رہے گی۔ ایک طویل عرصے تک، ہندستانی مسلمانوں نے متحدہ ہندستان میں اپنے رہنے کی گنجائش پیدا کرنے کی تگ و دو کی، جہاں وہ غیر مسلم آبادی کے ساتھ، کسی خوف کے بغیر اپنے سیاسی اور معاشی برابری کے ساتھ رہ سکیں۔ یہی سبب ہے کہ انکے علیحدہ وطن کا مطالبہ 23 مارچ 1940 تک سامنے نہیں آیا۔ کئی ایک اہم 'ملاؤں' نے قائداعظم کو کافر اعظم اور پاکستان کو کافرستان جیسے توہین آمیز القاب سے نوازا۔ ملاؤں کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی وابستگی سیاسی اور معاشی حقوق کے ساتھ نہیں ہونی چاہئے، اسکے بجائے انہیں ان ملاؤں کی جانب رجوع کرنا چاہئے جو علیحدہ علیحدہ تشریحات کی وجہ سے اس نکتے پر کبھی متفق نہیں ہوئے کہ بہتر مسلمان کون ہے۔

تحریکِ آزادی کے وقت، ہندو اپنی روایات/عقیدے کے مطابق اپنی رسومات ادا

کر رہے تھے جبکہ مسلمان خدائی قانون کے تحت اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف تھے۔اس طرح مذہبی حوالے سے ہندو اپنے مندر جانے کیلیئے آزاد تھے جبکہ مسلمان اپنی مساجد جانے کیلیئے۔ مسلمان عید مناتے تو ہندو دیوالی۔اس طرح کے قانونی بندوبست کیے گئے تھے کہ ہندو اپنے پرسنل لا کے مطابق انصاف حاصل کر رہے تھے جبکہ مسلمان اپنے پرسنل لا کے تحت انصاف حاصل کر رہے تھے۔اس طرح مذہبی حوالے سے کسی کو بھی اپنے مذہبی عقائد پر عمل کرنے کی ممانعت نہیں تھی۔ چونکہ مذہبی فرائض کی ادائیگی کے حق کی کوئی پامالی نہیں ہو رہی تھی چناچہ جدوجہد مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی حقوق کیلیئے ہی تھی، جو غصب کیے گئے تھے۔قائداعظم ایک زمانے میں ہندو-مسلم اتحاد کے پیغمبر پکارے جاتے تھے۔ یہ لقب ظاہر کرتا ہے کہ مسلمان اپنے حقوق کے احترام کی صورت میں متحدہ ہندستان میں رہنے کیلیئے امکانات تلاش کرنے کیلیئے تیار تھے۔ بعدازاں جداگانہ انتخابات جیسے کچھ اقدامات غیر مسلموں کے ساتھ رہنے کیلیئے کچھ ضمانتیں حاصل کرنے کی کوشش تھے۔اہم موڑ 1935 کے انڈیا ایکٹ سے آیا، جس کے تحت صوبائی اسیمبلیوں کے انتخابات منعقد کرائے گئے۔کانگریسی صوبائی حکومت کی کوتاہ نظر پالیسیاں فیصلہ کن عنصر تھیں، جن کی بنا پر مسلمانوں نے قطعی طور پر طے کرلیا کہ غیر منقسم ہندستان میں وہ کبھی بھی اپنا جائز حق اور حصہ حاصل نہیں کرسکیں گے، چناچہ ہمیں منشورِ پاکستان کو ضرور مدنظر رکھنا چاہیئے اور مسلم لیگی رہنماؤں بالخصوص قائداعظم کی تقریروں کا بغور جائزہ لینا چاہیئے جس سے ہمیں معلوم ہوگا کہ پاکستان آزاد عدلیہ کے ساتھ اقتدار کا سرچشمہ عوام کو سمجھتے ہوئے ایک جمہوری ریاست ہونا تھا۔ ''قائداعظم کی تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ'' نامی کتاب کے صفحہ نمبر 463 پر انکی فروری 1948 کو امریکی عوام سے نشری تقریر کا حوالہ دینا چاہوں گی کہ:

''اسلام اور اسکے آدرشی تصورات۔۔۔۔۔''

چونکہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے اور اسکا نظریہ 1973 کے آئین میں شامل اور واضع کیا گیا ہے، جو کہ قرارداد مقاصد کو منبع قرار دیتا ہے۔

آئینِ پاکستان کی پہلی شق پاکستان کی جغرافیائی حدود سے متعلق ہے۔ان جغرافیائی

حدود کو تبدیل کرنے کا کام کرنے والا کوئی فرد آئین کے تحت کارروائی کا مستوجب ہوگا اور اُسے نظریہ پاکستان کے خلاف کام کرنے والا سمجھا جائے گا۔ دوسری شق ریاست کے مذہب سے متعلق ہے اور اعلان کرتی ہے کہ اسلام ریاست کا مذہب ہے۔ اسکی تشریح کرتے ہوئے کچھ قانونی ماہرین کا کہنا ہے کہ پاکستان کی علامت کے طور پر سربراہِ مملکت کو مسلمان ہی ہونا چاہیئے، تاہم اس شق کی ایک اور تشریح یہ ہے کہ شق 227 کے تحت، قرآن اور سنت کے منافی کوئی بھی قانون منسوخ کیا جائے گا، چناچہ جو بھی کسی اور قانون کو قرآن اور سنت سے بالاتر سمجھتا ہے اور اس معاملے کو برتنے کیلیئے متعلقہ عدالتوں کو اہمیت نہیں دیتا، قانون، اسلامی نظریے اور پاکستان کے قانون کے خلاف کام کر رہا ہوگا۔ اسی طرح مختلف شقیں استحصال کے خاتمے اور قانون کی نظر میں برابری، ریاست سے وفاداری، آئین اور قانون کی پاسداری سے متعلق ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ چونکہ جغرافیائی حدود اور مذہب سے متعلق اہم نکات واضع کر چکی ہوں چناچہ عدالت باقی امور پر میرا نقطۂ نظر سمجھ چکی ہوگی۔ کچھ حلقوں کا کہنا ہے کہ اسلام نظریۂ پاکستان ہے، تاہم تمام مسلمان سمجھتے ہیں کہ اسلام کسی ایک مخصوص علاقائی یونٹ تک محدود نہیں ہے، اسلام کی تشریح اللہ کے حضور اطاعت کرنا ہے جبکہ مسلمان کی تشریح ایسی اطاعت کرنے والا ہے۔ صہیونیوں کی دعویٰ ہے کہ فلسطین صہیون کا خطہ ہے، چناچہ انکے لئے صہیونیت ریاستی نظریہ ہے۔ ہم مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ نہ فقط پاکستان بلکہ پوری کائنات اللہ کی ہے، وہ اس دنیا کا خالق ہے اور اس لئے ہمارا ایمان ریاستی قوانین سے مشروط نہیں ہے۔

وہ اللہ کے قانون پر اعتقاد رکھتے ہیں اور چونکہ دنیا اللہ کی ہے اور مسلمان کہیں بھی ہو ایک مسلمان ہی ہوگا۔ اسلام میں ایک تعلق فرد اور اللہ کے درمیان ہے جبکہ دوسرا انسان کا انسان سے ہے۔ اسلام کے پانچ بنیادی ارا کین ہیں کلمہ، نماز، روزہ، حج اور زکوۃ۔ کوئی مسلمان ان پانچ ارا کین پر کہیں بھی عمل کر سکتا ہے چاہے وہ کفر کی ریاست میں ہی کیوں نہ رہ رہا ہو۔ علاوہ ازیں، ملکیت کی وراثت اور سچائی کے تعین جیسے دیگر اسلامی فرائض کی ادائیگی بھی کہیں پر بھی ہو سکتی ہے۔ کوئی مسلمان اپنی ملکیت سے متعلق شریعت کے مطابق وصیت کر سکتا ہے چاہے یہ ریاستی قانون

میں شامل نہیں بھی ہو، کیونکہ وہ اللہ کے قانون پر ایمان رکھتا ہے، اسی طرح کوئی مسلمان اپنے مذہب کی بنیاد پر شادی کرسکتا ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ مسلمان اسلام اور اللہ کے قانون پر ایمان رکھتا ہے، اللہ جو پوری کائنات کا ہے نہ کہ کسی ایک علاقائی خطے کا۔ اسلام میں دوسرا تعلق انسان کا انسان کے ساتھ ہے اور یہاں بھی یہ کسی ریاست کے تابع نہیں ہے۔ وہ کسی کو بھی خیرات دے سکتے ہیں، یتیموں اور ضرورتمندوں کی مدد کر سکتے ہیں، غیبت نہیں کر سکتے، دوسروں سے حسد نہیں کر سکتے، اپنے محسن کے ساتھ وفادار ہوں، اس ضمن میں ایک انسان کے دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلقات کے ضمن میں قرآن میں انگنت برتاؤ بیان کیے گئے ہیں۔ نظریے سے مراد ہے انسان اور ریاست کے درمیان تعلق۔ اسلام ہمیں انسان اور اللہ اور انسانوں کے آپس میں تعلقات کی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

قائداعظم نے 1948 کے دوران چٹاگانگ چیمبر آف کامرس میں اپنی تقریر میں اسلامی سوشلزم کی حمایت کی۔ وہ سرکاری شعبے کو اہمیت دینا چاہتے تھے۔ بعدازاں، پاکستان پیپلز پارٹی نے جس نے واضح کیا کہ 'اسلام ہمارا دین ہے، سوشلزم کیلئے جدوجہد کی اور اسکے اطلاق کیلئے عوامی تائید حاصل کی، انہی تصورات کو 1973 کے آئین میں شامل کیا گیا۔ صوبائی خودمختاری۔ اگر کوئی صوبائی خودمختاری، پارلیمانی جمہوریت، اسلامی سوشلزم کیلئے کام کر رہا ہے تو یہ 1973 کے آئین اور پاکستان کے بنیادی اصولوں کے تحت جرم نہیں ہے۔ اسلام اور سوشلزم میں تضاد ہونے کی بات کرنے والی سیاسی جماعتوں کو کبھی بھی پاکستان کے عوام کی تائید حاصل نہیں رہی اور یہ تاریخ غیر منقسم ہندستان سے چلی آ رہی ہے کیونکہ مسلم آبادی کو معلوم تھا کہ پاکستان کیلئے اصل جدوجہد اسلام اور کفر کے درمیان نہیں ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ پاکستان کی 90 فیصد عوام نہ صرف مسلمان ہے بلکہ مسلمان بھی وہ جو 200 برس کے برطانوی راج میں اپنے ایمان پر کوئی سمجھوتہ کئے بغیر، غیر مسلموں کے سامنے جُھکے بغیر رہتے تھے۔ لوگ اسلام کے آفاقی پیغام سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں آئے کیونکہ وہ معاشرے کے اُس سخت گیر برتاؤ سے تنگ تھے جہاں انسانوں کو انکے ذاتی عمل و کردار کے بجائے انکی نسل کی بنیاد پر شناخت کیا جاتا تھا۔ اس لئے یہ کہا

جا سکتا ہے کہ قائد کی چٹا گانگ تقریر اور پیپلز پارٹی کا منشور اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ پاکستان میں اصل جدوجہد سرمایہ دارانہ طبقے، جس کو انکے نمائندوں کی حمایت حاصل ہے اور مظلوم عوام جنہیں انکے نمائندوں کی حمایت حاصل ہے، کے درمیان ہے۔ یہ استحصال زدہ اور استحصال کرنے والوں کے درمیان جدوجہد ہے۔ یہ امیر طبقے اور غریب طبقے کے درمیان جدوجہد ہے، جس میں اسلام کی خاطر میں ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عدالتی دستاویز AAA کے آخری صفحے پر ایم آر ڈی کا اعلان نامہ میرے سامنے ہے اور میں اس پر پیپلز پارٹی کی بیگم نصرت بھٹو کے دستخط پہچان سکتی ہوں۔ اسلام میں مارشل لا کے تصور کو سمجھنے کیلئے اسلام اور مارشل لا کو سمجھنا ہوگا۔ مارشل لا کمانڈر کے سامنے جھکنا ہے جبکہ مسلمان فقط اللہ کی رضا کے سامنے جھکتا ہے۔ اگر میری یادداشت درست کام کر رہی ہے تو مارشل لا کی اصطلاح بزمز کے دنوں میں مفتوح علاقوں کو سلطنت فارس میں شامل کرنے کے طور پر وضع کی گئی تھی۔ جب بزمز نے اُس علاقے میں رائج قانون کو پس پشت ڈال کر اپنے اُس قانون کو لاگو کیا جو اسکی دھونس پر مبنی تھا اور بندوق کی نال کے زور پر نافذ کیا گیا۔ جنگِ عظیم دوئم کے دوران مارشل لا کو ہمیشہ قابض فوج سے تعبیر کیا جاتا رہا۔ قابض فوج کے کمانڈر کے الفاظ موجود قوانین پر بالا دست تھے۔

نوآبادیات کے تحت مفتوح لوگوں سے دوسرے درجے کے شہریوں جیسا برتاؤ کیا جاتا تھا، انہیں اپنی مرضی کی حکومت سے محروم رکھا جاتا، انہیں اپنی خواہشات اور اُمیدوں کے مطابق اپنی تقدیر سنوارنے کے حق سے محروم رکھا جاتا، وہ اپنی بہتری کیلئے مناسب معاشی نظام کے انتخاب سے محروم تھے۔ جنگِ عظیم دوئم کے نتیجے میں جب نوآبادیاتی قوتوں کو اپنی اکثر نوآبادیوں سے دستبردار ہونا پڑا تو آزاد ہونے والے ممالک کے عوام نے مختصر مدت کیلئے آزادی اور نجات کے دن گذارے۔ یہ وہ دور تھا جب ناصر اور نکورما جیسے رہنماؤں نے عوام کیلئے سماجی برابری اور انصاف کی فراہمی پر زور دیا۔ تاہم سابقہ نوآبادیاتی طاقتوں نے اپنی عوام کو خوشحال اور مطمئن رکھتے ہوئے نوآزاد ممالک میں ملٹری- ملاں گٹھ جوڑ کی پشت پناہی کرتے ہوئے وہاں کے عوام کو سماجی انصاف اور خوشحالی سے محروم رکھنے میں اپنا حصہ ڈالا۔ اس صورتحال کو سوویت یونین اور امریکہ کے

درمیان حریفانہ چپقلش نے مزید الجھا دیا۔ اس طرح کئی ایک نوآزاد ریاستوں پر فوجی انتظامیہ کا اقتدار قائم ہوا۔ تاہم اتفاقِ رائے کے بجائے طاقت کے بل بوتے پر قائم حکومتوں کو اسلام کے بنیادی اصولوں سے مطابقت کے طور پرنہیں دیکھا جاتا، جو اتفاقِ رائے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں مارشل لا ہمیشہ بندوق کے زور پر یا اسکی دھمکی کی بنیاد پر ہی نافذ ہوتی رہی ہے۔ اسلام میں اقتدار پر قبضے کا کوئی تصور نہیں ہے۔

مارشل لاء کا مقصد

مارشل لا کا جواز فراہم کرتے ہوئے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے اپنی 7 جولائی 1977 کی نشری تقریر میں کہا تھا کہ ''مجھے پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان قومی اتحاد کے درمیان بداعتمادی اور عدم اعتماد کی وجہ سے کسی معاہدے کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ جس کے باعث فوج نے پیش قدمی کرنے کا فیصلہ کیا، نتیجتاً جناب بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی ہے اور پورے ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا ہے۔'' اس طرح انکا عذر پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان قومی اتحاد کے رہنماؤں کے درمیان معاہدہ نہ ہونے کا تھا جو کہ رائے عامہ کے سامنے واضح ہو چکا تھا کہ انہوں نے 4 جولائی کی شب معاہدے پر دستخط کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی، اس لئے معاہدے پر دستخطوں کو روکنے کی کاروائی کیلئے 4 اور 5 جولائی 1977 کی درمیانی شب کو یہ اقدام اُٹھایا گیا۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی جانب سے دوسری وضاحت یہ کی گئی کہ عام انتخابات میں دھاندلی کی وجہ سے مارشل لاء نافذ کیا گیا، جبکہ حقیقی صورتحال یہ ہے کہ دھاندلی کے اس الزام کو پیپلز پارٹی کے چیئرمین نے اپنی کتاب اور سپریم کورٹ میں داخل کرائے گئے اپنے جوابی دعویٰ میں واضح طور پر مسترد کر دیا ہے۔ اس کتاب اور جوابی دعویٰ دونوں پر بعدازاں پابندی عائد کی گئی۔ بعدازاں، ساڑھے پانچ سال کے عرصے میں فقط ایک شخص پر مبینہ دھاندلی کے الزامات کے تحت کاروائی کا آغاز کیا گیا، تاہم سابق اٹارنی جنرل یحیٰ بختیار کو، جو حُسنِ اتفاق سے سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے سینئر دفاعی وکیل بھی تھے، ان الزامات سے بری کر دیا گیا اور اس طرح کسی ایک فرد پر بھی انتخابات میں دھاندلی کے الزام کے تحت کوئی کاروائی نہیں ہوئی۔ مارشل لاء کا تیسرا جواز پاکستان

کے افق پر منڈلاتی ہوئی خانہ جنگی کے طور پر پیش کیا گیا، تاہم ہنگامہ آرائی تو ترقی یافتہ اور ترقی پذیر دونوں ممالک میں ہوتی ہی رہتی ہے۔ کوئی ایک دو سال قبل برطانیہ میں شدید ہنگامے پھوٹ پڑے تاہم انہیں خانہ جنگی سے تعبیر نہیں کیا گیا۔ مارشل لاء کا چوتھا جواز یہ پیش کیا گیا کہ پیپلز پارٹی کی حکومت نے اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کیلئے ملک میں تصادم اور گڑبڑ پیدا کرنے کی سعی کی۔ کوئی بھی حکومت یا انتظامیہ تصادم اور گڑبڑ پیدا کرنا نہیں چاہتی کیونکہ ایسی صورتحال میں نظم ونسق ایک مشکل امر ہو جاتا ہے۔ اب جب مارشل لاء کو ساڑھے پانچ سال بیت چکے ہیں تصادم اور گڑبڑ کی جانب اہلِ اقتدار کے ردعمل واضح کرتے ہیں کہ یہ بھی کار آمد ہونے کے بجائے جذبات پر مبنی تھے اور ان کے ذریعے بھی نہ صرف حقیقی مقصد بلکہ پاکستان کی عوام کی جانب سے اپنی قسمت کے خود مالک بننے کی خواہش کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی گئی۔ مارشل لاء کا پانچواں جواز یہ پیش کیا گیا کہ پاکستان پیپلز پارٹی نے آئین کو نقصان پہنچایا اور آئین اور بالخصوص عدلیہ کی آزادی بحال کرنے کیلئے مارشل لاء ضروری تھا۔ اس ضمن میں اگر میری یاداشت درست کام کر رہی ہے تو چوتھی اور پانچویں ترمیم کو 1977 میں مارشل لاء ریگیولیشن کے ذریعے واپس لے لیا گیا۔ اس لئے سچائی ہر ایک کے سامنے ہے کہ کون عبوری آئینی حکم نامہ لا رہا ہے۔

مارشل لاء کے نفاذ کا چھٹا جواز احتساب کرنا بتایا گیا۔ یہ احتساب ان کے ذریعے ہونا تھا جو خود اس بات کیلئے قابلِ احتساب نہیں تھے کہ انکا مقصد احتساب کرنا تھا یا اپنی خواہشات کی تکمیل تھا۔ یہ اُس وقت بالکل واضح ہو کر سامنے آیا جب احتساب کے اصولوں کے تحت نا اہل قرار دیئے گئے 6 اراکین کو وفاقی کونسل کا رکن بننے پر رضا مندی ظاہر کرنے پر معصوم قرار دیا گیا۔ وفاقی کونسل، جس طرح کہ ہمیں بتایا گیا کہ انتہائی ایماندار افراد پر مشتمل ہے۔

چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی جانب سے دی گئی ساتویں وضاحت یہ تھی کہ وزیر اعظم انہیں چیف آف آرمی اسٹاف کے طور پر ہٹانے والے تھے۔ اگرچہ یہاں پر ہم نجی گفتگو کا ذکر نہیں کریں گے تاہم اس بات میں کوئی حقیقت نہیں کہ انہیں عہدے سے ہٹایا جا رہا تھا کیونکہ 2 یا 3 جولائی 1977 کو وہ قانونی وزیر اعظم کی حمایت کرنے کی قسمیں اُٹھاتے رہے ہیں۔

مارشل لاء کی آٹھویں وضاحت یہ دی جاتی ہے کہ مارشل لاء بڑے تجارتی اداروں /افراد کو ملک تاراج کرنے کی نئی لیز جاری کرتے ہوئے، معاشی استحکام کیلئے ضروری اور ناگزیر ہے، چنانچہ حکومتی شعبے میں زیادہ تر منصوبے پس پشت ڈال دیئے گئے ہیں اورالمناک صورتحال یہ ہے کہ بھوک اور بیروزگاری سے متاثرہ ہرآنکھ اشکبار رہے لیکن بڑے تجارتی ادارے /افراد مارشل لا حکام کی اس ضمن میں کوئی مدد کرنے سے ہچکچا رہے ہیں۔

مارشل لاء کے نویں سبب کے طور پر ہمیں بتایا جارہا ہے کہ افغان صورتحال کی وجہ سے مارشل لا ضروری اور ناگزیر ہو گیا ہے۔ میں اپنی تمام تر عقل وفہم کے ساتھ یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہمیں کیوں سزا دی جارہی ہے اور حقوق سے محروم رکھا جارہا ہے، صرف اس لئے کہ مارشل لا حکام انتہائی بے چین ہیں کہ ببرک کارمل اپنی عوام کو حقوق نہیں دے رہے ہیں، حقوق جو مارشل لاء کا ٹولہ افغانوں کیلئے تو مناسب سمجھتا ہے لیکن ہمارے لئے نہیں۔

لیکن اہم ترین اور بنیادی سوال یہی ہے کہ کیا مارشل لا کیلئے یہ اعلانیہ مقاصد ہی اسکے نفاذ کے اصل اسباب ہیں۔

(سماعت اگلے روز کیلئے ملتوی)

تاریخ 29-3-1983

موجودہ ٹولے کی جانب سے جاری کیا گیا عبوری آئینی حکم نامہ (PCO) آئین کے تحت غیر قانونی ہے۔ بنیادی حقوق 1973 کے آئین کا ایک ناگزیر حصہ ہیں۔ 1962 کا آئین بنیادی حقوق کو تسلیم نہیں کرتا تھا جبکہ یہی صورتحال پی سی او کی بھی ہے۔ 1973 کا آئین اعلیٰ عدلیہ کو حقوق کی خلاف ورزی پر نظر رکھنے کیلئے بااختیار بناتا ہے اور اعلیٰ عدلیہ جج کو آزادی اور زندگی سے متعلق سوالات اُٹھانے کی اجازت دیتی ہے کیونکہ آزادی اور زندگی کا تحفظ تمام مہذب معاشروں کا ناگزیر حصہ ہے۔ یہ آفاقی انسانی حقوق کا حصہ ہے۔ یہ ہر فرد کا پیدائشی حق ہے۔ پی سی او کے تحت جب فرد کی آزادی کو آمرانہ ادارے سے خطرات لاحق ہوں، جو کہ اپنی بقا کے تمام تر احکامات کیلئے ایک فرد کی جنبشِ قلم کی محتاج ہو، وہ پی سی او کے مطابق اپنی زندگی، اپنی آزادی، اپنی

ملکیت اور زندگی کی رعنائیوں یا اسکی کوشش کو متاثر کرنے والے احکامات کی نظر ثانی یا انکے جائزے کیلئے اعلیٰ عدلیہ سے رجوع نہیں کر سکتے۔ کئی اور اسباب/وجوہات بھی ہیں تاہم اپنی بات کے مدلل ہونے کیلئے ہمارا یہ نکتہ ہی کافی ہے۔

جائز ہونا: اس ٹولے کے پاس کوئی قانونی یا آئینی جواز یا حیثیت نہیں ہے۔ یہ ایک آئینی حکومت کے خلاف چیف آف آرمی اسٹاف کی ذاتی ہدایات کے تحت کی گئی کارروائی کے نتیجے میں وجود میں آئی حکومت ہے۔ آئینی حکومت جسکی بالادستی کیلئے بری، بحری اور ہوائی فوج کے سربراہان 28 اپریل 1977 کو حلف اٹھا چکے تھے۔ چونکہ کوئی بھی مارشل لا ٹولہ عوام دشمن مشینری ہوتا ہے اور چونکہ سیاست، جسکا بنیادی ماخذ رائے عامہ سے منسلک ہونا ہے چناچہ مارشل لا عوام اور معاشرے میں سیاسی رجحانات کے خلاف ہے۔ حالیہ مارشل لا نے کسی بھی عدالت سے کوئی قانونی منظوری حاصل نہیں کی ہے جو کہ آئین سے اپنی طاقت حاصل کرتی ہیں۔ یہ مدنظر رہے کہ جب چیف جسٹس یعقوب نے بیگم نصرت بھٹو کی پٹیشن عدالت میں سماعت کیلئے منظور کی تو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے انہیں فوری طور پر برطرف کر کے انوارالحق کو چیف جسٹس مقرر کر دیا اور تمام ججوں کو نیا حلف اُٹھانے کیلئے کہا گیا جس میں آئین سے وفاداری کو ہٹا کر مارشل لاء سے وفاداری کو بنیاد بنایا گیا تھا۔ بعدازاں مارشل لاء ضابطے کی تخلیق کردہ عدالت نے اس پٹیشن کی سماعت کی اور مارشل لاء کو نو ماہ کی ایک محدود توثیق فراہم کی۔ وہ کسی اوقات کار کے تعین سے کتراتے رہے تھے تاہم درخواست گذار کے اصرار پر استغاثہ کے وکیل شریف الدین پیرزادہ نے ضمانت دی کہ یہ مدت نو ماہ تک کی ہوگی۔ یہ محدود توثیق، جسکو کئی ایک لوگ آئینی نہیں سمجھتے، یہ بھی بالکل واضع کرتی ہے کہ مارشل لاء کے تمام تر اعمال اور کاروایاں عدالتی جائزے کیلئے پیش ہوں گی۔ قانونی حیثیت کو دوسرا جھٹکا اگست- ستمبر 1978 میں اُس وقت لگا جب صدر فضل الٰہی چودھری مستعفی ہو گئے اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے خود کو صدر مقرر کر دیا۔ آئین میں ایسے کسی اقدام کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تیسرے جھٹکے نے قانونی حیثیت کی اُمیدیں مکمل طور پر ختم کر دیں کیونکہ اُس نے پی سی او متعارف کرایا جو کہ 1973 کے آئین کی رسمی اور دکھاوے کی حیثیت کو بھی ختم کرنے کا باعث بنا، اگرچہ

بعدازاں ٹولے نے اس قسم کا دعویٰ کیا کہ اس کا لازمی نتیجہ 1973 کے آئین کی تنسیخ نہیں ہے۔ پی سی او جاری ہونے سے رسمی طور پر ایک نیا قانونی ضابطہ لاگو کرایا گیا جو کہ 1973 کے آئین کی رو سے غیر قانونی عمل ہے۔ پاکستان میں یا کسی اور ملک میں ماضی اور حال دونوں ادوار میں، اپنے قانونی اختیار کے علاوہ کوئی اقدام اُٹھانے والے کو غاصب کے علاوہ کچھ اور نہیں کہا جاتا رہا ہے۔ 1973 کے آئین کے مطابق طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں اور انکے نمائندے ملک کے نگہبان ہیں۔ چونکہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے بندوق کے زور پر رات کے اندھیرے میں ملک کے منتخب وزیراعظم، جو کہ عوام کے اقتدار اعلیٰ کے نگہبان تھے، کو برطرف کر کے اقتدار پر قبضہ کیا ہے، چناچہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے عوام کا اقتدار چھینا ہے اور چونکہ جو بھی ایسی چیز پر قبضہ کرتا ہے جو کہ اسکی نہ ہو، غاصب کہلاتا ہے۔ اس لئے حقیقی صورتحال یہ ہے کہ وہ غاصب ہے۔ علاوہ ازیں خود چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بارہا کہہ چکے ہیں کہ وہ منتخب نمائندے نہیں بلکہ ایک فوجی ہیں۔

فوج کے خلاف عمل: مارشل لاء اور مسلح افواج مکمل طور پر دو مختلف چیزیں ہیں۔ اپنی نوعیت، کردار اور مدت میں بالکل مختلف۔ مارشل لاء کو پہلے ہی واضع کر چکی ہوں۔ مارشل لاء ایک ایسا مضر اور دیمک کی طرح کھا جانے والا نظام ہے جو کہ تباہی لاتا ہے۔ مسلح افواج کوئی نظام نہیں بلکہ ایک ادارہ ہے جو کہ ملکی جغرافیائی سرحدوں کا تحفظ کرتا ہے اور حکومت کی ہدایات کے تحت سول اداروں کی مدد کیلئے آتا ہے۔ مارشل لاء حکومت کا تختہ اُلٹتی ہے۔ مارشل لاء قومی یکجہتی کو تباہ کرتی ہے اور ریاست کی جڑوں کو کھوکھلا کرتی ہے جبکہ مسلح افواج ریاست کی بنیادوں کی حفاظت کرتی ہیں۔ مارشل لاء لوگوں کو غلام بناتی ہے جبکہ مسلح افواج عوام کی تخلیق کردہ ہیں۔ مارشل لاء مسائل حل کرنے سے زیادہ مسائل کا باعث بنتا ہے۔ مختصراً یہ کہ مسلح افواج حلال اور قانونی ادارہ ہیں جبکہ مارشل لاء حرام نظام ہے۔ مسلح افواج ریاست کی محافظ ہیں جبکہ مارشل لاء عبوری اور ریاست پر قابض ہے۔ مسلح افواج عوام کی خواہشات کے مطابق اپنے فرائض سرانجام دیتی ہیں اور یہ کبھی بھی آئین کے تحت اُٹھائے گئے حلف سے انحراف نہیں کرتی جبکہ مارشل لاء میں فوجی کمانڈر اس حلف کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور باور کراتے ہیں کہ انکے زیر دست 'شریکِ سفر' ہیں۔ اپنی بات کو

واضع کرنے کیلئے میں اپنے حلف کی خلاف ورزی کرنے والے چیف آف آرمی اسٹاف کا حوالہ دیتی ہوں۔ 15 جولائی 1977 کے روزنامہ پاکستان ٹائمز کا حوالہ دیتی ہوں، ''حتمی فیصلہ میں نے کیا کیونکہ فوج ایک مطلق العنان ادارہ ہے نہ کہ جمہوری ادارہ..... حتمی فیصلہ ہمیشہ ایک ہی فرد لیتا رہا ہے۔'' یہ ثابت کرتا ہے کہ مارشل لاء ایک فرد کے عمل کا نتیجہ ہے جبکہ مسلح افواج پارلیمنٹ کی پیدائش ہیں، پارلیمنٹ پوری قوم کی نمائندہ ہے۔ مسلح افواج میں چیف آف آرمی اسٹاف کی معیاد مقرر ہوتی ہے اور اس میں توسیع قانونی اور متعلقہ پارلیمنٹ کے ذریعے ہوتی ہے۔ مارشل لاء کے تحت چیف آف آرمی اسٹاف اپنی معیاد میں افواج کے قواعد وضوابط اور آئین کے بجائے اپنی ذاتی خواہشات کے مطابق توسیع کر رہے ہیں۔ مارشل لاء جو خود غیر قانونی ہے سو اس پر اعتراضات کس طرح غیر قانونی ہو سکتے ہیں۔

مسلح افواج کے خلاف نفرت انگیزی: چیف آف آرمی اسٹاف کی جانب سے اُٹھائے گئے اقدامات انکے خلاف نفرت کا باعث بنیں گے۔ جو لوگ فوج کو مارشل لاء کی قوت کے طور پر استعمال کر رہے ہیں جو اِسے غلط طور پر استعمال کر رہے ہیں، اس طرح وہ ادارے کے بجائے اپنے لئے توہین کا باعث بن رہے ہیں اور اس طرح مارشل لاء کا ہر اہلکار اپنے اقدامات کے لحاظ سے اپنے لئے تعظیم یا توہین حاصل کر رہا ہے۔ میں لفظ محبِ وطن اور غدار کی کج بحثی میں نہیں پڑنا چاہتی۔ چونکہ میں آپکو ذاتی طور پر نہیں جانتی، اس لئے اپنی فہم وفراست کی بنیاد پر لفظ محبّ وطن کو واضع کروں گی کہ محبّ وطن وہ ہے جو جغرافیائی حدود کو تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کرتا، جو ریاست کو عوام کی امانت سمجھتا ہے، جو استحصال کے خلاف لڑتا ہے، جو قانون کی نظر میں برابری کا قائل ہو اور جو آئین کے سامنے سرنگوں ہو، میری کتاب میں وہ ہی محبّ وطن ہے۔ ہماری مختصر گفتگو میں جام ساقی نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے جو ان اصولوں سے متصادم ہو، اس لئے میں نہیں سمجھتی کہ وہ غدار ہیں۔ کسی بھی مقدمے میں، جو کسی سول عدالت میں ایسے ججوں کے ذریعے چلایا گیا ہو جنہوں نے آئین کی بالا دستی کا حلف لیا ہے، کیا گیا فیصلہ قانونی ہوتا ہے تاہم کسی فوجی عدالت کا فیصلہ قانونی حوالے سے ہمیشہ سول جائزہ کا متقاضی ہوتا ہے۔ کسی فوجی عدالت کی جانب سے، بالخصوص

سیاسی معاملے میں سزا یافتہ شخص خود کو اعزاز یافتہ سمجھتا ہے اگر چہ اسکے نتیجے میں اُسے مشکلات کے کئی سال جیل کی چار دیواری کے پیچھے گذارنے پڑتے ہیں، لیکن وہ اپنے لئے تاریخ میں ایک قابلِ عزت مقام حاصل کرتا ہے اور وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے بہترین سال ایک اعلیٰ آدرش اور انسان ذات کی آزادی کیلیئے صرف کئے اور کسی فوجی عدالت کی جانب سے سزائے موت پانے والا کوئی شخص تاریخ کی نظر میں بے گناہ اور معصوم سمجھا جائے گا۔ وہ جنت میں خیر مقدم کیا جانے والا شہید ہوگا۔ قرآن کہتا ہے کہ شہیدوں کو مردہ مت سمجھو کیونکہ وہ زندہ ہیں۔ شہید کی روح آسمانی روح ہے اور روشن ذروں میں سب سے زیادہ منور وجود ہے، جسکا لہو اپنے دستِ قاتل کی ہمیشہ گواہی دیتا رہے گا۔

عدالتی دستاویز (M-5 (s کا صفحہ نمبر 17 گواہ کو پڑھ کر سنایا گیا، جس پر اُنکا کہنا تھا کہ، یہ وزیر اعظم کو تحریر کیئے گئے ایک خط میں کمیونسٹ پارٹی کا نقطۂ نظر ہے، جس میں اس دعوے کی تصدیق کی گئی ہے کہ منتخب حکومت کا تختہ اُلٹنے کیلیئے رجعتی قوتوں کے درمیان ایک سازش تیار کی گئی ہے کیونکہ وہ محنت کشوں، کسانوں اور ذلتوں کے مارے لوگوں کے حقوق کی حامی ہے۔

1973 کے آئین کے مطابق اگر کوئی جماعت ملک کے نظریے کے خلاف کام کرتی ہے جو کہ آئین کی تمہید 1, 2, 3, 4 اور 5 میں بیان کیا گیا ہے تو ایسی جماعت کو سپریم کورٹ بھیجا جائے گا جو پیش کئے گئے شواہد کا جائزہ لیکر نتیجہ اخذ کرے گی کہ آیا مذکورہ جماعت پاکستان کے خلاف کام کر رہی ہے یا نہیں اور اس پر پابندی عائد کی جائے یا نہیں۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے تو کمیونسٹ پارٹی کا معاملہ سپریم کورٹ کو نہیں بھیجا گیا ہے چنانچہ وہ غیر قانونی نہیں ہے۔

مارچ 1978 کے آغاز میں جب سابق وزیر اعظم نے اپنی غیر قانونی نظر بندی کے خلاف ایک درخواست دائر کی تو انکا کہنا تھا کہ اپنے انصاف پسند اور غیر جانبدار ہونے کے تمام تر دعوؤں کے باوجود مارشل لاء انتظامیہ اقربا پروری سے کام لے رہی ہے اور اپنی بقا کیلیئے کبھی ایک فریق کی بانہوں میں جھول رہی ہے تو کبھی دوسرے کے گلے کی مالا بن رہی ہے۔ اس طرح اپنے نفاذ کے پہلے دن سے مارشل لا ٹولہ اقربا پروری میں مصروف ہے۔

سرخ پرچم (M-38) کے اداریے کے کچھ حصے گواہ کو پڑھ کر سنائے گئے، اس پر اُنکا تبصرہ تھا: کچھ لوگ ملک کے حوالے سے سوچتے ہیں جبکہ کچھ دیگر مشترکہ مفادات کے طور پر سوچتے ہیں۔ میرے نقطۂ نظر کے لحاظ سے ہر ملک اپنے قومی مفادات کا سوچتا ہے اور جب یہ مفادات کسی اور کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں تو اُس ملک کی حمایت کی جاتی ہے تاہم یہ مفادات، چاہے کوئی معاہدہ ہو یا نہیں، دوسرے کے ساتھ مطابقت نہ ہونے کی صورت میں کوئی بھی ملک ان کے تابع نہیں ہوگا۔ اگر 1971 کی مثال سامنے رکھی جائے تو، ہم ایک بڑی طاقت کے ساتھ مختلف معاہدوں کی صورت میں بندھے ہوئے تھے تاہم ضرورت کے وقت یہ معاہدے کاغذی محل ثابت ہوئے۔ ہنری کسینجر خود اعتراف کر چکا ہے کہ اگرچہ امریکہ پابند تھا لیکن امریکی وزارت خارجہ نے معاہدے کو عمل میں لانے سے روکنے کیلئے جواز تراش لئے۔ چنانچہ، کوئی معاہدہ ہے یا نہیں، آیا کیے گئے معاہدوں کی عملی صورت سے متعلق کوئی غیر رسمی ہم آہنگی ہے یا نہیں۔ یہ اُس وقت تک قابلِ عمل نہیں ہوں گے جب تک مشترکہ مفادات میں کوئی مطابقت یا ہم آہنگی نہ ہو، چنانچہ ہمیں دنیا کی تمام بڑی طاقتوں کے ساتھ بہتر اور گرمجوش تعلقات استوار کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور مشترکہ مفادات پر زور دیتے ہوئے فقط اپنے مفادات پر ہی قائم رہنے سے گریز کرنا چاہئے۔ عمومی طور پر کوئی کمزور رہنما کسی اور طاقتور ملک کے قومی مفادات کے تابع ہونے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اندرونی حمایت سے محرومی کی صورت میں اسکی بقا کا واحد ذریعہ بیرونی مدد ہی ہوسکتا ہے۔

طبقاتی منافرت ایک اظہار ہے، جو کہ انسانذات کی تاریخی پیش قدمی کا معترف ہوئے بغیر سطحی انداز میں استعمال کیا گیا ہے۔ ہمیں طبقاتی منافرت اور مظلوم انسانوں کے حقیقی حقوق کی حمایت کرنے میں فرق کرنا چاہئے۔

پاکستان ایک انتہائی غریب ملک ہے جس کے باشندے دنیا کے غریب ترین افراد میں شمار ہوتے ہیں جبکہ پاکستان کے امیر لوگ دنیا کے امیر ترین افراد میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ خدائی قانون نہیں ہے۔ یہ نظریۂ پاکستان نہیں ہے۔ یہ نابرابری کا اظہار ہے کہ انسانوں کے

بنائے ہوئے اختیارات اور مراعات نے استحصالی طبقات کو استحصال زدہ طبقات سے براہ راست متصادم کر دیا ہے۔ جب روپے کی قدر عدم استحکام کا شکار ہوگی اور افراطِ زر ہوگا اور قیمتیں آسمان کو چھونے لگیں گی تو شہریوں کے محدود وسائل پر مزید بوجھ پڑے گا۔ سو یہ کچھ بوئے جانے پر آپ کیا کاٹنے کی توقع کر سکتے ہیں۔ جب تیل، چکنائی و پیٹرولیم کی قیمتیں مصنوعی طور پر مقرر کی جائیں گی، تو پھر تیل کی پیداوار سے محروم ممالک کی معیشت اچانک تیزی یا مندی کا شکار رہے گی۔

طبقات eglitarian انسانوں کی برابری کی پالیسیوں سے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ کسی ایسے شخص کو جو مایوس اور افتادگانِ خاک کیلئے آواز اُٹھاتا ہے کو طبقاتی منافرت پیدا کرنے کا مرتکب قرار دیا جا سکتا ہے، طبقاتی منافرت تو وہ پیدا کرتا ہے جو امیروں کیلئے راہ ہموار کرتا ہے، زیادہ امیروں کو ٹیکس میں چھوٹ فراہم کرتا ہے، تخفیفِ زر کے نام پر ارزاں نرخوں پر سرکاری املاک دیتا ہے اور بائیس خاندانوں کو مزید تقویت دینے کی سعی کرتا ہے، غریب عوام کا پرسانِ حال نہیں بنتا، جو لوگوں سے انکی رائے دہی کا حق چھین لیتا ہے، جو تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کو سستی ٹرانسپورٹ فراہم نہیں کرتا، جو اپنی جمع پونجی اپنے بچوں کی تعلیم پر خرچ کرنے کے بعد بھی انہیں میرٹ پر اپنی حاصلات سے محروم کیے جانے کا اہتمام کرتا ہے۔ جب عوام کے منتخب رہنما کو فقط اس وجہ سے مقدمہ بازی کا شکار ہونا پڑتا ہے کہ اُس نے محروم لوگوں کی بہتری کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہو، جب قومی نجات دھندہ کو اس لئے معتوب کیا جائے کہ اس نے پانچ مرلہ منصوبہ متعارف کرایا ہو، کچی آبادیوں کو قانونی حیثیت دی ہو، زمینیں کسانوں میں تقسیم کی ہوں، مزدوروں کو تحفظ فراہم کیا ہو اور سپاہیوں اور جنرلوں کی وردیوں کو تعظیم بخشی ہو، بچوں کو تعلیم اور خواتین کو برابری دی ہو، تو اُس صورت میں معاشرے میں توازن بگڑتا ہے اور طبقاتی منافرت جنم لیتی ہے۔

اگر وفاق کو دلکش اور ناگزیر قوت بننا ہے تو اسکی تمام اکائیوں کے لوگوں کو ایسے وفاق میں شرکت کا ذریعہ بننا ہوگا۔ جب لوگ اور اکائیاں، یہ سمجھنے لگیں کہ وہ قومی ادارے جن کے ذریعے وہ اپنی خواہشات کا اظہار کر سکتے ہیں، اپنے مسائل کا حل حاصل کر سکتے ہیں کی جانب سے اجنبیت بھرا سلوک کیا جا رہا ہے تو پھر وہ موجودہ ڈھانچے سے غیر مطمئن ہوتے ہیں اور دیگر متبادل

تلاش کرنا شروع کرتے ہیں۔ چونکہ مارشل لاء یک۔پہلو انتظامی قوت ہوتی ہے، اس لئے وہ لاتعلقی کا باعث بنتی ہے اور اسکے ہوتے ہوئے عوام میں اپنی عدم شرکت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ جتنا طویل عرصہ آئین عمل پذیر نہیں ہوگا، غصے کی کیفیت میں اضافہ ہوتا رہے گا، کیونکہ مارشل لا عوام میں ناانصافی اور محرومی کے احساس میں اضافے کا باعث بنتی ہے، چناچہ آئین کی بحالی کیلئے جدوجہد کسی بھی طور پر مختلف صوبوں میں منافرت پیدا کرنا نہیں ہے۔ اسکے برعکس اتفاق رائے، برابری اور انصاف کی بنیاد پر وفاق کیلئے جدوجہد عین قابلِ ستائش عمل ہے۔ صوبوں کے عوام کی حقیقی شکایات کو پیش کرنا عدم اطمینان پیدا کرنے کے بجائے ایک باانصاف حل کیلئے راہ ہموار کرنا ہے۔

مجھے حقیقتاً سرکاری نقطۂ نظر کا علم نہیں ہے، ایک دن وہ کہتے ہیں کہ پاکستان بفر ریاست اور فرنٹ لائن ریاست ہے پھر اگلے روز ہی کہنے لگتے ہیں کہ نہیں ایسا نہیں ہے، پاکستان بفر ریاست نہیں ہے۔ ایک دن وہ ایک اہم سیاستدان کو کابل بھیجتے ہیں جنکا پرتپاک استقبال ہوتا ہے جو کہ اس نقطۂ نظر کو تقویت دیتا ہے کہ وہ ثالثی میں مصروف ہیں لیکن اگلے ہی روز وہ اس سیاستدان اور انکے ضعیف العمر والد کو نظر بند کردیتے ہیں، اس لئے یہ متعین کرنا کہ انکی پالیسی کیا ہے انتہائی مشکل امر ہے۔ تاہم میں پیپلز پارٹی کی رکن کے طور پر سمجھتی ہوں کہ سیاسی حل ہر صورت میں تلاش کیا جائے جو کہ پرامن تصفئے کی راہ ہموار کرے گا، کیونکہ ہمارے کئی لوگ بھی جلاوطنی میں گذار رہے ہیں اور انکے وطن کی فضاؤں میں واپس آنے کی بے چینی سے منتظر ہوتے ہوئے، ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں اپنے وطن سے دور زندگی گذارنے والے بھی یقیناً اپنے وطن واپس جانے کیلئے بیقرار ہوں گے اس لئے سیاسی حل انتہائی ضروری ہے۔ یہ ہر ایک مہذب فرد کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ فلسطینیوں کے درست مقصد کی حمایت کرے جنہیں اپنے گھروں سے بے دخل کیا گیا ہے، جنکی خواتین اور بچوں کو بمباری کا نشانہ بنایا گیا ہے، جنہیں تباہ و برباد اور بے رحمی سے ذبح کیا گیا ہے۔ برادر یاسر عرفات اور انکے جری ساتھیوں کی لازوال بہادری کے ساتھ جدوجہد یقیناً انسانی تاریخ میں بے مثال ہے۔ دیگر تمام مسلمانوں کی طرح میں بھی یاسر عرفات اور فلسطینیوں کو

سلام پیش کرتی ہوں۔

ملزم جام ساقی نے، Q-Q کے طور پر عدالت میں پیش کئے گئے اپنے بیان سے ماخوذ ایک سوال کرنا چاہا۔ عدالت نے گواہ کو اجازت نہیں دی۔ عدالتی دستاویز M-5 کے صفحہ نمبر 5 کا پہلا اور دوسرا پیرا گراف گواہ کو پڑھ کر سنائے گئے، جن پر اُنکا تبصرہ تھا کہ، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں ہر ملک کا اپنا قومی مفاد ہوتا ہے۔ ایک عالمی طاقت نے یہ بات واضع کردی ہے کہ اگر پاکستان نے اپنے نیوکلیائی پروگرام کو منسوخ یا ملتوی نہیں کیا تو اُسے عبرت کا نشان بنا دیا جائے گا۔ اگرچہ یہ پروگرام مکمل طور پر امن مقاصد کیلئے تھا۔ ہمیں پاکستان میں خود اپنے اندر جھانکنا چاہئے اور اپنے عمل کی خود ذمہ داری لینی چاہئے۔ کوئی بھی دوسرا ملک ہمارے قومی مفادات کی قیمت پر کس طرح اپنے قومی مفادات کی تکمیل کیلئے ہماری منتخب حکومت کے خلاف کھُلے عام یا چوری چھپے سازش کرسکتا ہے تاوقتیکہ ہم میں سے ہی کچھ لوگ اپنے ذاتی ترویج اور مفادات کیلئے قومی مفادات کا سودا کرنے کیلئے تیار نہ ہوں۔

M-5 (s) صفحہ نمبر 14، گواہ کو آخری پیرا گراف پڑھ کر سنایا گیا جس پر اُنکا جواب تھا کہ یہ کہنا درست ہوگا کہ دہشت کی کوئی بھی انتہا لوگوں کو انکے سماجی، سیاسی اور معاشی حقوق کے حصول کیلئے اپنی جائز جستجو سے نہیں روک سکتی۔ اگر مستحکم قیادت کو ختم کیا جائے گا تو مقصد کے حصول کیلئے دیگر لوگ سامنے آئیں گے لیکن قافلہ چلتا رہے گا۔ ضرورت کسی ایسے طور طریقے کو وضع کرنے کی ہے جس سے ملک کو مزید نقصان پہنچائے بغیر اقتدار کی منتقلی یقینی ہو۔ یہ موجودہ حکمرانوں کے منصوبوں کے بالکل برعکس ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ جنرل اُس وقت اقتدار منتقل کرے گا جب بلاواسطہ انتخابات ہوں، سیاسی جماعتوں کی رجسٹریشن ہو۔ انتخابات کے اداروں اور اُمیدواروں کے انتخابات نے اس تاثر کو جنم دیا ہے کہ مقصد اقتدار کی منتقلی کے بجائے موجودہ انتظامیہ کو ایک سویلین چہرہ دینا ہے تا کہ کچھ اعتماد کو بحال کیا جا سکے۔ جبکہ تمام سیاسی قیدیوں کی غیر مشروط آزادی، تمام مقدمات کی سول عدالتوں کو منتقلی، نااہلی سے متعلق ٹربیونلز کا خاتمہ، 1973 کے آئین کے تحت عدلیہ کے اختیارات کی بحالی، روزنامہ مساوات سے

پابندی ہٹانا اور اسکے ملازمین کو ازالے کی ادائیگی، موجودہ حکمران ٹولے کی جانب سے قائم کیے گئے تمام جھوٹے مقدمات کی واپسی، سیاسی سرگرمیوں کی بحالی اور صاف اور شفاف انتخابات کا تفصیلی اعلان جیسے اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔

میں متفق ہوں کہ اگرچہ پاکستان اقوام متحدہ کے اعلامیہ برائے انسانی حقوق پر دستخط کر چکا ہے لیکن اس وقت اسکے بنیادی اصولوں سے روگردانی کی جا رہی ہے، میں عدالتی دستاویز PR-2 کے تمام سیکشنز بالخصوص 18 اور 19 کا حوالہ دے رہی ہوں۔

میں نے ریڈکلف کالج میں تعلیم حاصل کی ہے جبکہ ہارورڈ یونیورسٹی سے ہمعصر حکومتوں میں ڈگری کی حامل ہوں۔ بعدازاں میں آکسفورڈ گئی جہاں سے سیاست اور فلسفے میں ڈگری لی۔ چونکہ میں محکمۂ خارجہ میں جانا چاہتی تھی اس لئے میرے والدین نے مجھے بین الاقوامی قانون میں ڈپلومہ حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔

بین الاقوامی سیاست اور بین الاقوامی معیشت پر اپنی تعلیم کے دوران میں نے ایک موسمِ گرما میں پاکستان کے دفترِ خارجہ کیلئے ایک تحقیقی مقالہ تیار کیا۔ ہارورڈ میں تدریس دینے والے نامور عالم پروفیسر حمودالرحمٰن تحریکِ آزادی پر میرے معلم تھے۔

استغاثہ نے کوئی جرح نہیں کی۔

عدالتی سوالات

سوال: کیا آپ بھٹو کو ذات سمجھتی ہیں؟

جواب: مجھے لفظ ذات کی تشریح کرنے دیجئے۔ ذات کا لفظ ہندو مذہب سے اخذ کیا گیا ہے۔ ہندومت میں لوگوں کو اُنکی ذات سے شناخت کیا جاتا ہے۔ ہندومت میں چار ذاتیں ہیں۔ کوئی پیدائشی برہمن (اعلیٰ ذات) ہوتا ہے تو کوئی پیدائشی حکمران (راجپوت) جبکہ تجارت پیشہ افراد ویش ذات سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ کچھ پیدائشی طور پر شودر ہوتے ہیں جو تمام ذاتوں سے نیچ سمجھے جاتے ہیں۔ میں خود کو مسلمان سمجھتی ہوں۔ ہندو مذہب کے مطابق مسلمان ناپاک ہیں۔ اسلام میں ذات کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہاں تمام مسلمانوں کے درمیان بھائی چارے اور برابری کی

بات ہے۔ ذات نہ صرف فرد بلکہ خود مذہب کی بھی توہین ہے۔ جہاں تک میرے بھٹو ہونے کا تعلق ہےتو بھٹومیرے نام کا حصہ ہے،نام جوکسی فردکوشناخت دیتا ہے۔

میں سمجھتی ہوں کہ میں بھٹوفقط نام سے ہی نہیں بلکہ شہید ذوالفقارعلی بھٹو کی پیروکار ہونے کی وجہ سے بھی ہوں۔ جوبھی شخص سچائی اورانصاف، تعظیم کیلئے اوراستحصال کے خلاف لڑتا ہےوہ بھٹو ہے۔ جواستحصالی قوتوں کےساتھ ہیں وہ بھٹونہیں ہیں، چاہےانکا نام بھٹوکیوں نہ ہو۔

میر غوث بخش بزنجو ولد میر صفر خان عمر 65 سال

(جرح کرنے کی سربراہی- جام ساقی)

میں اپنے طالبعلمی سے سیاست میں حصہ لے رہا ہوں تاہم میں نے اپنا عملی سیاسی آغاز1939 سے کیا۔ میں جام ساقی کو1968 سے جانتا ہوں۔ میں پاکستان نیشنل پارٹی کا صدر ہوں۔ میں1972 سے1973 کے دوران بلوچستان کا گورنر رہا ہوں۔

الزامات مسترد:

میں نے جام ساقی کو کبھی بھی تخریبی اور ریاست دشمن سرگرمیوں میں ملوث نہیں پایا۔ ملزم جام ساقی نے مختلف مواقع پر میرے ساتھ کام کیا ہے۔ میں نے انہیں ریاست کا وفادار اور ایک پرعزم سیاسی رہنما پایا۔ یہ پاکستان کی بدنصیب روایات ہیں کہ کسی ایک وقت کے حکمرانوں کو ذمہ دار تعبیر کیا جاتا ہے اور کوئی بھی ایسا سیاسی رہنما یا جماعت نہیں ہے جسکو کسی ایک یا دوسرے فریق نے غدار قرار نہیں دیا ہے۔ میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ موجودہ حکمرانوں کو بھی آنے والے دنوں میں غدار کہا جا سکتا ہے۔ میں ملزم جام ساقی پر مسلح افواج کے خلاف منافرت پھیلانے کے الزام سے اتفاق نہیں کرتا۔

نفرت کون پیدا کرتا ہے:

میں اسکا ذمہ دار اُن مہم جو جنرلوں کو سمجھتا ہوں جو مارشل لا مسلط کرتے ہیں اور اپنے ذاتی اقتدار کے حصول کیلیئے فوج کو پاکستان کی عوام کے خلاف لا کھڑا کرتے ہیں۔ یہ ان کے

استعداد سے زیادہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صوبوں کے درمیان نفرت پیدا کرنا حکمرانوں اور ملک میں مخصوص مفادات رکھنے والوں کا وطیرہ ہے، ان لوگوں نے اپنے فوائد کیلئے پاکستان کے ڈھانچے کو بگاڑ دیا ہے۔ پاکستان خودمختار اور وفاقی یونٹوں، پاکستان کے اندر آزاد ریاستوں پر مشتمل ایک وفاقی ریاست تھا۔ قائداعظم اور ان کے رفقا نے ریاست کا جو تصور دیا تھا اس میں وفاقی یونٹ تھے اور جہاں صوبوں کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ صوبے انتظامی یونٹس ہیں۔ پاکستان کے وفاقی یونٹ تاریخی یونٹس ہیں۔ ماسوائے کچھ کے تمام تر اختیارات وفاقی یونٹس کے پاس تھے۔ تاہم متعدد حکمرانوں نے اس انتہائی اہم اور بنیادی معاملے سے روگردانی کی ہے بلکہ ہر حکمران نے ون یونٹ بنانے کے تجربات کو نظر انداز کرتے ہوئے، ریاست کو وحدانی صورت دینے کی کوشش کی ہے، یہاں تک کہ وفاقی یونٹس کو میونسپلٹی کی حیثیت تک گرا دیا گیا ہے جبکہ مرکزی حکومت نے وفاقی یونٹس کے تمام تر چھوٹے اور بڑے امور پر اپنے ہاتھ صاف کیے ہیں۔ وفاقی یونٹس کو زیادہ تر وقت اختیارات سے محروم رکھا گیا ہے اور انہیں ون یونٹ کے دوران شریک اقتدار نہیں رکھا گیا جسکا نتیجہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں سامنے آیا۔ بارہا مارشل لا کے نفاذ، ون یونٹ کے تشکیل اور من پسند جماعتوں کے ذریعے کارِحکومت میں مشرقی پاکستان کے عوام کی شمولیت سے محرومی کو اس ضمن میں سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ مجھے اسکا یقین ہے کہ یہ وہ اسباب و عوامل تھے جو پاکستان کے مختلف صوبوں میں نفرت کا سبب بنے اور جام ساقی اور دیگر کو اسکا مرتکب ٹھرانا مناسب نہیں ہوگا۔

مارشل لا کی مخالفت:

میں سمجھتا ہوں کہ مارشل لا کی مخالفت کرنا پاکستان کے ہر شہری کا حق ہے جو کہ جمہوریت کی بحالی کا ہے۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ خود موجودہ حکمران جنرل ضیا بھی یہ کہنے سے اجتناب برتیں گے کہ مارشل لا ملک چلانے کے لئے ایک بہتر نظام ہے۔ موجودہ مارشل لا یہ کہتے ہوئے مسلط کیا گیا تھا کہ نوے دن کے اندر انتخابات منعقد کرائے جائیں گے۔ مارشل لا کو بیمار

فرد کے آپریشن کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے، بعدازاں بیمار فرد کو طبیب کے پاس لے جانا پڑے گا، جس کا مطلب ہے کہ عوام/لوگ ہی اصل حکمران ہیں۔ اگر آپریشن چھ سال کے طویل عرصے تک جاری رہتا ہے تو مریض کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوگا۔ مجھے جام ساقی کے خلاف بغاوت کے کسی مبینہ الزام کا علم نہیں ہے۔

نظریۂ پاکستان:

پاکستان ایک conscious being نہیں ہے، اس لئے زمین کے جغرافیائی حصوں کا کوئی نظریہ نہیں ہوسکتا۔ صرف انسانوں کو ہی خدا تعالیٰ نے نظریہ، افکار رکھنے کا اہل ہونے کی صلاحیت بخشی ہے۔ دوقومی نظریے کی بنیاد پر برصغیر کی تقسیم یہاں کے آئینی مسائل کا حل تھی۔ قائداعظم، مسلمانوں اور کانگریس کی جانب سے متحدہ ہندستان کیلئے کی گئی انتھک کوششوں کے باوجود بدقسمتی سے کسی حل تک پہنچنا ممکن نہیں ہوا اور ناگزیر حالات کی وجہ سے برصغیر کی تقسیم سامنے آئی۔ اس ضمن میں آخری کوشش کیبنٹ مشن کے ذریعے کی گئی جسکو مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے قبول کیا تاہم جواہر لعل نھرو کی وجہ سے بدقسمتی سے اس پر عمل درآمد نہیں ہوسکا۔

ایران اور افغان مسئلہ:

ایران اور افغانستان کے انقلابات نے پاکستان کو بالکل پڑوسی ہونے کی وجہ سے براہ راست متاثر کیا ہے۔ میں افغان معاملے کو انتہائی سنجیدگی سے دیکھتا ہوں۔ ہمیں ان دونوں معاملات پر غیر جانبدارانہ دانش کے ساتھ نظر ڈالنی چاہئے۔ ہمیں افغانستان میں آنے والی تبدیلیوں پر فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ انکا اندرونی معاملہ ہے۔ ہم قیامِ پاکستان سے ملک میں مختلف نظام آزماتے رہے ہیں لیکن افغانستان کی عوام اور حکمرانوں نے کبھی بھی ہمارے معاملات میں دخل اندازی نہیں کی ہے۔ یہاں تک کہ 1965 اور 1971 میں پاکستان کی بھارت کے ساتھ جنگوں کے دنوں میں بھی افغانستان کے حکمرانوں نے ہماری سرحدوں پر مداخلت یا گڑبڑ کرنے سے گریز کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسانی بنیادوں پر اور انسانی حقوق کے

نام پر افغان مہاجرین کو اپنے ہاں رکھ کر ہم نے ایک فاش غلطی کی ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کسی بھی ملک سے تعلق رکھنے والے مہاجرین واپس اپنے ملک نہیں جاتے اور یہ افغان مہاجرین ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ بن جائیں گے۔ یہ ناممکنات میں سے نہیں ہوگا کہ یہ افغان مہاجرین کابل کے بجائے اسلام آباد کی جانب اپنی بندوقیں تان لیں۔ خدا نہ کرے کہ ہم ایران کے معاملے میں بھی کوئی غلطی کر بیٹھیں، جو کہ پاکستان کی سلامتی اور خودمختاری کیلئے انتہائی خطرناک ہوگا۔

مواد پر پابندی:

پاکستان میں کمیونزم، سوشلزم یا کسی اور امور پر مواد رکھنے یا پڑھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں یہ سبجیکٹ ہمارے کالجز اور یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ ملک میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سمیت تمام سیاسی جماعتوں پر مکمل پابندی ہے۔ میں نے کمیونسٹ پارٹی پر پابندی کا کوئی حکم نامہ نہیں دیکھا۔ سیاسی سرگرمیوں اور جماعتوں پر مکمل پابندی کے باوجود سیاسی جماعتیں کسی نہ کسی صورت اپنی سرگرمیاں جاری رکھتی ہیں اور وہ یہ آج بھی کر رہی ہیں۔

نظریہ:

یحیٰ حکومت کے دور تک نظریۂ پاکستان جیسی کوئی اصطلاح زیرِ استعمال نہیں تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ جماعت اسلامی کی اختراع ہے اور انہوں نے ہی سب سے پہلے یہ استعمال کی۔ میرے لئے نظریۂ پاکستان وہ ہے جو قائداعظم نے اختیار کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ قائداعظم پاکستان کے موجودہ اور سابقہ حکمرانوں سے نسبتاً بہتر طور سمجھتے تھے اورنہوں نے ملک کو ایک لبرل جمہوری نظام دیا۔ پاکستان کا آئین یا کوئی اور قانون ملک میں مارشل لا کو ایک نظامِ حکومت کے طور پر نافذ کرنے کی اجازت نہیں دیتا تاہم منتخب جمہوری قانونی حکومت سویلین انتظامیہ کی مدد کیلئے فوج کو طلب کر سکتی ہے اور ایسی صورتحال میں مسلح افواج سول انتظامیہ کے احکامات کی پابند ہوں گی۔

استغاثہ کی جانب سے جرح:

میں ملزم جام ساقی کو 1973 کے بعد آج پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ مجھے جام ساقی پر عائد کیے جانے والے الزامات کا علم نہیں ہے اور میں اس کو ہمیشہ بے گناہ تصور کرتا رہا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ جام ساقی تخریبی سرگرمیوں میں ملوث ہو سکتے ہیں۔

گواہ کو سرخ پرچم M-4 کے صفحہ نمبر 3 پر اداریہ اول پڑھ کر سنایا گیا اور عدالت کو انکا جواب تھا کہ اس میں کوئی تخریبی بات نہیں ہے۔ اداریئے میں تو لفظ ''ریاست'' ہے ہی نہیں۔ یہ کہنا بالکل درست ہے کہ غاصب وہ فرد، گروہ اور فریق ہے جو نہ منتخب ہوتے ہیں اور نہ ہی عوام کی جانب سے بااختیار لیکن زبردستی اس پر قبضہ کرتے ہیں جو انکا حق نہیں ہوتا۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ M-4 اداریئے کا وہ آخری پیرا گراف جو مجھے پڑھ کر سنایا گیا ہے، میں کوئی تخریب نہیں ہے، اس میں کوئی نفرت انگیز بات نہیں ہے۔ پوسٹروں، اجتماعات کے انعقاد اور دیواروں پر چاکنگ کے ذریعے جام ساقی کی رہائی کی اپیل کی گئی ہے۔ اجتماعات کے انعقاد پر غیر قانونی اور غیر آئینی مارشل لا کے احکامات کے ذریعے مکمل پابندی عائد کی گئی ہے، اس لئے اس طرح کے احکامات بھی غیر قانونی ہیں۔

عبدالولی خان

عمر 66 برس

ذات پاکستانی، سکنہ ولی باغ چارسدہ

میں برطانوی نوآبادیات کے خلاف بھارت چھوڑو تحریک کے ذریعے 1942 میں سیاست میں داخل ہوا۔ میں جام ساقی کو 1968 سے جانتا ہوں جب میں نیشنل عوامی پارٹی کا صدر منتخب ہوا۔ میں نے جام ساقی کو نظریات پر پابند، باشعور سیاسی کارکن پایا، جو ہمہ وقت بنیادی انسانی حقوق کیلئے سرگرم رہا، ہم ایک طرح ساتھی ہیں۔

ایران: پاکستان کی جغرافیائی سیاسی صورتحال کے تناظر میں، میں محسوس کرتا ہوں کہ صورتحال اُس جانب بڑھ رہی ہے جہاں یہ ملک عالمی طاقتوں اور عالمی حکمت عملیوں کیلئے ایک چارے کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔

یقیناً ایرانی انقلاب امریکہ مخالف تھا، جس کا پس منظر برطانیہ کی روانگی کے بعد پیدا ہونے والے خلا کو امریکہ کی جانب سے پُر کرنے کا عمل ہے۔ شاہ ایران کو اس خلا کو پُر کرنے کیلئے پروان چڑھایا گیا تاکہ سامراجی مفادات کا تحفظ کیا جا سکے۔ مفاد گھاتک تھا، اس لئے شاہ ایران کی روانگی نے ایک مرتبہ پھر خلا پیدا کر دیا ہے۔ اس لئے یہ اُن تمام محبّ وطن لوگوں کی فطری تشویش کا باعث ہے جو پاکستان کو امریکی مفادات کی نگہبانی کرتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے اور پاکستان کے امریکی بلاک کے ساتھ نتھی ہونے کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔

موجودہ حکومت نے امریکہ کے ساتھ 1959 کا فوجی معاہدہ بحال کر دیا ہے، جس

نے ناگزیر طور پر ملک کے محبّ وطن اور ترقی پسند کارکنوں کو تشویش میں مبتلا کر دیا ہے جو اس عمل کو عالمی طاقتوں کی حکمت عملیوں کا شکار ہونے کے مترادف سمجھتے ہیں۔ یہ ماضی کے تجربات کی روشنی میں یقیناً باعث حیرانی ہے کہ یہ بھارت سے ہماری دو جنگوں کے دوران ملک کے کسی کام نہیں آیا اور اس کے باوجود مارشل لا انتظامیہ اسکو بحال کرنے پر تلی ہوئی ہے، جس کو ملک کی منتخب حکومت نے مسترد کر دیا تھا۔

بین الاقوامی صورتحال: جب حکومت خود کو بیرونی مفادات سے منسلک کرنے کا کوئی فیصلہ کرتی ہے تو اسکا فطری ردعمل حکومت کی ملکی پالیسیوں میں نظر آتا ہے اور سامراجی طاقتوں کے مفادات کے خلاف بلند ہونے والی ہر آواز کو دبا دیا جاتا ہے۔

مارشل لا: جب حالیہ مارشل لا نافذ کیا گیا تو میں حیدرآباد اسپیشل ٹربیونل کے تحت حیدرآباد جیل میں قید تھا۔ سابقہ حکومت کی جانب سے کرائے گئے عام انتخابات میں بڑے پیمانے پر دھاندلی کی گئی جس پر قوم نے اعتراض کیا۔ پاکستان قومی اتحاد نے چیف الیکشن کمشنر کی برطرفی اور سپریم کورٹ کی نگرانی میں ازسرِنو انتخابات کے مطالبات پر ایک عوامی تحریک شروع کی۔ اس میں انگنت پاکستانیوں نے اپنی جانیں گنوائیں جبکہ سینکڑوں کی تعداد میں جیلوں میں گئے۔ یہ اس عوامی تحریک کا نتیجہ تھا کہ فوج نے حکومت کو برطرف کیا اور نوے روز کے اندر انتخابات منعقد کرانے کا وعدہ کیا۔ انتخابات کے التوا کیلئے جو ابتدائی سبب بتایا گیا وہ یہ کہ موجودہ مارشل لا انتظامیہ سابقہ حکومت کا احتساب کرنا چاہتی تھی۔ وعدہ کئے گئے انتخابات تاحال نہیں ہو سکے ہیں۔ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ عام انتخابات اُس وقت ہی منعقد کرائے جائیں گے جب پاکستان کی عوام اُن کا سنجیدگی سے مطالبہ کرے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی حکومت کسی متفقہ مطالبے کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔ سرخ پرچم (ایم-4) کے صفحہ نمبر 6 پر انتہائی درست کہا گیا ہے، جس میں جام ساقی پر اس امر کے اظہار کا الزام لگایا گیا ہے کہ یہ حکومت انتخابات منعقد نہیں کرائے گی کیونکہ موجودہ حکومت نے کسی منتخب حکومت کا عمومی دورانیہ گذار لیا ہے، اس لئے اگر وہ اس دوران انتخابات منعقد نہیں کرا سکی ہے تو کچھ عناصر فطری طور پر یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ وہ اس سے اجتناب کریں گے۔

افغان معاملہ: افغان معاملے کے دو پہلو ہیں جن سے پاکستان کا تعلق ہے۔ایک سرحد پار کر کے آنے والے مہاجرین ہیں جنہیں تحفظ فراہم کرنا ہے۔دوسرا پہلو افغانوں کا اپنی حکومت کے خلاف جدوجہد کا ہے۔قوم سے اپنے خطاب کے دوران چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے پالیسی بیان کے طور پر واضع کیا تھا کہ حکومتِ پاکستان افغان عوام کی جانب سے اپنی حکومت منتخب کرنے اور اپنی مرضی کی طرزِ حکومت کے تعین کے حق حاصل ہونے تک اپنی تگ ودو جاری رکھے گی۔اس بیان کردہ پالیسی کے حوالے سے، میں محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان کی موجودہ حکومت خود کو ایک ایسی صورتحال میں ملوث کر رہی ہے جو کہ خود اسکے اپنے ریاستی مفادات کے خلاف ہے، کیونکہ اولین سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ حکومت خود اپنے ملک کے شہریوں کو اپنی پسند کی حکومت منتخب کرنے کا حق دے رہی ہے، دوئم یہ کہ یہ پڑوسی ملک کے بنیادی حقوق میں صریحاً مداخلت ہے۔

گواہ کو عدالتی دستاویز ایم 4 کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے گئے۔

میری معلومات کے مطابق افغانوں کو اسلحہ پاکستان کے ذریعے فراہم کیا جا تا رہا ہے۔ مرحوم انور سادات نے برسرِ عام اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ پاکستان کے ذریعے ہی اسلحہ فراہم کیا گیا۔ یہ پاکستان پر دو طرح سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اولاً یہ حکومت پاکستان کو ملوث کرتے ہوئے براہ راست پڑوسی ریاستوں سے تصادم کی صورتحال پیدا کرتا ہے۔دوئم یہ کہ عمومی معلومات یہی ہے کہ افغانوں کیلئے آنے والے اسلحے کا کوئی پچاس فیصد سرحد پار نہیں جاتا۔نتیجتاً پورا پاکستان بشمول افغان سرحدی علاقہ اور اس سے متصل قبائلی علاقہ اسلحے کے ڈھیر بن رہے ہیں، جہاں کوئی بھی میزائل لانچر، بارودی سرنگ سمیت اپنی مرضی کا اسلحہ حاصل کرسکتا ہے۔اس لئے یہ پاکستان کی سلامتی کیلئے خطرہ ہے کہ ہم ایک عالمی طاقت کو ناراض کر رہے ہیں جس نے یہ اعلان کیا ہوا ہے کہ اگر پاکستان نے یہ غیر اعلانیہ جنگ بند نہیں کی تو اسکو اسکے نتائج بھگتنے ہوں گے۔آنے والے دنوں میں یہ اسلحہ کسی بھی ایسی صورتحال میں استعمال ہوسکتا ہے جہاں مختلف سیاسی قوتیں اپنی بالادستی کیلئے کم وبیش خانہ جنگی کی صورتحال پیدا کرسکتی ہیں۔

مسلح افواج: میں محسوس کرتا ہوں کہ جام ساقی کے خلاف مسلح افواج کے خلاف نفرت پھیلانے کے

الزام سے اُنکا مطلب یہ ہے کہ مسلح افواج ملکی سیاست میں ملوث ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلح افواج اس ملک کا ایک قومی ادارہ ہیں جس پر اس ملک کا ہر شہری برابر کا دعویدار ہوسکتا ہے۔ جس وقت کسی مخصوص سیاسی نظریئے سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگ فوج کو ملکی سیاست میں ملوث کرتے ہیں تو فوج پاکستان کی ایک سیاسی جماعت کا روپ اختیار کر لیتی ہے اور جواباً اسکو اس سے متفق نہ ہونے والوں کی تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

میں اتفاق کرتا ہوں کہ مسلح افواج ریاست کی عوامی مرضی کے ذریعے کسی جمہوری عمل کے تحت حکومت میں نہیں آئی ہیں اور انہیں ملکی قانون یعنی کہ آئین کے تحت اسکا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے اور یہ کرتے ہوئے وہ اُن لوگوں کی مخالفت مول لیتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ مسلح افواج کو یہ اقدام نہیں اُٹھانا چاہیئے۔ یقیناً کسی فوجی کیمپ میں مقدمہ سازی یا جبر واستبداد یا تشدد کا کوئی عمل بداعتمادی پیدا کرے گا جو کہ اسکے ذمہ داران سے نفرت کا باعث بنے گا۔ یہ عین انسانی امر ہوگا اور اس لئے جام ساقی اور دیگر کی جانب سے مبینہ طور پر ایسے کسی عمل کو اس تناظر میں دیکھنا چاہیئے۔

نظریۂ پاکستان: میں یہ کہوں گا کہ اتفاق کی بات ہے کہ مجھ پر اور میرے حیدرآباد سازش کیس کے دیگر ملزمان ساتھیوں پر یہ اولین الزام تھا۔ میں نے عدالت سے استدعا کی تھی کہ وہ نظریۂ پاکستان کی وضاحت کرے۔ عدالت کے روبرو اپنی معروضات میں میں نے کہا تھا کہ یہ وہ الزام ہے جو حکومتیں اپنے سیاسی مخالفین پر عائد کرتی ہیں، لیکن اب جب استغاثہ مطالبہ کررہا ہے کہ مجھے پھانسی کی سزا دی جائے کیونکہ میں نظریہ پاکستان کا مخالف ہوں، سو میں نے وکیلِ صفائی سے اپنے کیے ہوئے جرم کی تشریح تلاش کرنے کی درخواست کی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ قانون کی کتابوں میں اس کی کوئی تشریح موجود نہیں ہے۔ میری مزید گذارش تھی کہ یہ اصطلاح اُس آئین میں بھی کہیں نہیں ہے جس پر ہم نے دستخط کیے تھے۔ اس لئے آپ کو اسکی وضاحت کرنا ہوگی تاہم عدالت اسکی وضاحت سے قاصر تھی، جس پر ہم نے عدالت سے استدعا کی کہ استغاثہ سے اسکی وضاحت حاصل کی جائے تو استغاثہ کا کہنا تھا کہ اسکی وضاحت کے اہل صرف شکایت کنندہ ہی ہیں۔ ہم نے عدالت سے درخواست کی کہ شکایت کنندہ کے حیدرآباد آنے تک مقدمے کی کاروائی معطل کی

جائے تاہم عدالت نے شکایت کنندہ کو عدالت کے روبرو پیش ہونے تک مقدمے کی کارروائی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ عدالت کو یہ جواب موصول ہونے میں کہ نظریۂ پاکستان سے مراد کیا ہے، کوئی ایک برس کا وقت لگ گیا۔ متعلقہ اہلکار کا کہنا تھا کہ نظریۂ پاکستان دوقومی نظریہ ہے، جس پر میں نے دریافت کیا کہ آیا اس کا مطلب پاکستان کے بجائے مسلمان اور غیر مسلم دو مختلف اقوام ہے، جس کا جواب اثبات میں آیا۔ میں نے عدالت سے اس موضوع پر تحریر کردہ کتاب فراہم کرنے کی استدعا کی، جس پر مجھے تبدیل شدہ شکایت کنندہ فراہم کیا گیا۔

قائداعظم نے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں واضع طور پر اعلان کیا تھا کہ اسکو ذہن نشین کرلیں کہ وقت گذرنے کے ساتھ، ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے۔

اس لئے میں نے شکایت کنندہ سے دریافت کیا کہ وہ اس صورتحال میں کیا کہیں گے جب یہ واضع اظہار بابائے قوم، آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر اور پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے صدر کی جانب سے ہے اور یہ بھی ریکارڈ کا حصہ ہے کہ یہ تقریر اس تحریر شدہ مسودے سے پڑھی گئی تھی۔

میرے خیال میں یہ اعلان سیکولرازم کے مفادات کی درست ترجمانی کرتا ہے اور اس لئے جو بھی جام ساقی پر نظریۂ پاکستان کی مخالفت کا الزام عائد کرتا ہے، اسکو اس عدالت کے روبرو اس الزام کو واضع کرنا ہوگا۔

ہمارے ملک میں حکومتیں ہمیشہ اپنے مخالفین کو، جو حکومتی پالیسیوں پر تنقید کرتے ہیں، ریاست دشمن قرار دیتی رہی ہیں، جس میں میرے خیال میں تمام ادارے یکجا رہے ہیں، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کو سنجیدگی سے دیکھا جائے کہ مذکورہ تنقید حکومتِ وقت پر ہے یا کہ ریاست پر۔ جہاں تک موجودہ حکومت پر غاصب ہونے کا الزام ہے تو سیاسی حوالے سے ہر وہ حکومت جو ریاست میں رہنے والی عوام کی حمایت کے بغیر اقتدار میں آئے گی، اسکو اسی درجے میں رکھا جائے گا کیونکہ اس نے غیر قانونی اور غیر آئینی طور پر اقتدار حاصل کیا ہوا ہوتا ہے۔ شاید سپریم کورٹ نے نظریۂ ضرورت کے تحت ایک محدود عرصے کیلئے اسکو تحفظ فراہم کیا تھا۔

میں اتفاق کرتا ہوں کہ مختلف سیاسی جماعتوں سے یکساں سلوک روا نہیں رکھا جاتا۔ کئی

ایک سیاسی جماعتیں، بالخصوص دائیں بازو سے تعلق رکھنے والی جو کہ مارشل لاضوابط کی صریحاً خلاف ورزی کرتے ہوئے کنونشن، کانفرنسیں اور اجلاس منعقد کر رہی ہیں، جبکہ دیگر جو حکومت کی اچھی نظروں میں نہیں ہیں کو ایسی سہولیات سے محروم رکھا جارہا ہے اور جبر کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔خود ہماری جماعت کے مرکزی کمیٹی کے اجلاس کی وجہ سے لاہور میں ہماری گرفتاریاں کی گئیں جبکہ ایک اور جماعت یعنی جماعت اسلامی کو افغان مہاجر کیمپوں تک رسائی فراہم کی گئی جہاں اسکے کارکنوں نے یہ کہہ کر ان مہاجرین کو مقامی سیاست میں ملوث کرنے کی کوشش کی کہ انکی جماعت پاکستان کی واحد جماعت ہے جو اسلام دوست ہے جبکہ دیگر تمام جماعتیں روسیوں کی دوست ہیں۔اس طرح وہ افغانستان میں جا کر جہاد کرنے کے بجائے یہاں مصروفِ عمل ہیں۔ یہ واضع امتیاز صرف سیاسی جماعتوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ شوریٰ اور وزاتوں کے نامزد مشیر اور وزرا اپنے اجتماعات میں لاؤڈ اسپیکروں کا استعمال کرتے رہتے ہیں جو کہ خود مارشل لاضوابط کی خلاف ورزی ہے۔

عدالتی دستاویز ایم-5 کے صفحہ 3 کے مندرجات گواہ کو پڑھ کر سنائے گئے تا کہ وہ اس پر اظہارِ خیال کرسکیں۔ یہ واضع ہے کہ اگر پاکستانی ریاست کو عالمی طاقتوں کی بین الاقوامی حکمت عملیوں میں فریق بننے کی جانب دھکیلا جائے گا اور جب ہم سامراجی طاقتوں کو پاکستان میں اپنی پالیسیاں آگے بڑھانے کا موقعہ فراہم کریں گے تو ترقی پسند عناصر جو یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستانی ریاست کی سلامتی کا انحصار اسکے غیر جانبدارانہ پالیسیوں کو اختیار کرنے میں ہے، کو جبر واستبداد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں ہے کہ آیا پاکستان میں کمیونسٹ مواد پر کوئی پابندی ہے یا نہیں لیکن حکومت کے خلاف لکھی ہوئی ہر تحریر پر پابندی ضرور ہے۔ پریس کی آزادی کو اتنا کچلا گیا ہے کہ یہ قومی ادارہ مکمل طور پر بے سدھ ہو چکا ہے۔ پاکستان کمیونسٹ ریاستوں کے ضمن میں یہ پالیسی اختیار کیے ہوئے ہے کہ ہم روس کے ساتھ تو غیر دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں جبکہ کمیونسٹ چین کے اپنے واحد بے لوث اور وفادار اتحادی ہونے کے دعویدار ہیں اور اسکے مصداق یہاں پر کمیونسٹ مواد پر پابندی ہے۔1950 کے عشرے میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان پر قانونی پابندی عائد کی گئی تھی جو کہ 1970 کے عشرے کے دوران ہٹالی گئی۔کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان

پر پابندی کا سبب اسکی جانب سے قیام پاکستان کیلئے ہندستان کی تقسیم کی حمایت کرنا تھا۔

کسی دوسری سیاسی جماعت کی پالیسیوں پر تنقید کرنا ہر ایک کا جمہوری حق ہے، اس لئے جام ساقی کی جانب سے جماعت اسلامی پر تنقید کو اسلام دشمن نہیں کہا جا سکتا۔

اپنی پالیسیوں کے مخالفین کو غدار اور بیرونی ایجنٹ قرار دینا ہر حکومت کا وطیرہ رہا ہے، انکی حکومت کے تمام مخالفین بھارتی ایجنٹ ہیں۔ بھارت کے ساتھ غیر دوستانہ تعلقات ہونے کی وجہ سے کسی کو بھارتی ایجنٹ کہنا آسان کام تھا، بعدازاں افغانستان کی صورتحال میں تبدیلی آنے اور بھارت کے ساتھ تعلقات بہتر ہونے کے بعد، اب سیاسی مخالفین افغانستان اور روس کے ایجنٹ کہے جاتے ہیں۔ مجھے اس پر کوئی حیرانگی نہیں ہوگی کہ مستقبل قریب میں سندھ اور بلوچستان کے لوگوں کو ایران کا ایجنٹ کہا جائے، جس کا عندیہ گذشتہ شیعہ - سنی فسادات میں مل چکا ہے جس دوران یہ الزام عائد کیا گیا کہ ایران قونصل خانہ براہ راست فسادات میں ملوث تھا۔

جہاں تک مارشل لا کی توثیق کا سوال ہے، تو1973 کے آئین میں مسلح افواج کا کردار واضع کر دیا گیا ہے۔ آئین کا آرٹیکل 6 انتہائی واضع کرتا ہے کہ فوج کی جانب سے اقتدار پر قابض ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور آئین کی معطّلی انتہائی بغاوت اور غداری کے زمرے میں آئے گی۔

جہاں تک مختلف صوبوں میں منافرت پھیلانے کے الزام کا تعلق ہے تو میں آپ کو دوبارہ قیامِ پاکستان کے بعد کے دور کی جانب لے جاؤں گا جب اس ملک کیلئے آئین ساز اسمبلی نے ایک آئینی مسودہ تیار کیا تو یکا یک حکمران جماعت پر یہ منکشف ہوا کہ پاکستان کے مشرقی حصے کی آبادی مغربی حصے کے تمام صوبوں کی آبادی سے زیادہ ہے، اس لئے اگر آئین جمہوری طرز پر بنایا گیا تو اقتدار مشرقی پاکستان کے حوالے ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے ون یونٹ کا تصور عملی طور پر لاگو کیا گیا۔ ہم ون یونٹ کے اس تجربے کے ساتھ اُس وقت تک رہتے رہے جب تک عوام الناس اس کے خلاف اُٹھ کھڑے نہیں ہوئے اور اُس وقت بھی ہم نے پاکستان کا اقتدار اکثریتی عوام کو سپرد کرنے کے بجائے ملک توڑنے کو ترجیح دی۔ اسی سے واضع ہوتا ہے کہ بین الصوبائی

تنازعات کواُبھارنے میں اُس وقت کی لیگی قیادت کا کردار تھا جس نے مغربی پاکستان کے انضمام کی دوہری تلوار استعمال کرتے ہوئے مغربی پاکستان کی صوبائی وزارتوں کوختم کردیا تاکہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کوانکے جمہوری حقوق سے محروم کیا جاسکے، اسی لئے ایماندارانہ طور پر باہمی اعتماد اور بھائی چارے کوملکی استحکام کیلئے ناگزیر سمجھنے والے صوبائی حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وفاق کا ہر صورت میں تحفظ کیا جانا چاہیئے ، یہ بالخصوص بنگلا دیش کے قیام کے بعدتو اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔ اس لئے یہ ہرمحبّ وطن پاکستانی کا فرض بنتا ہے کہ ماضی میں کی گئی غلطیاں نہیں دہرائی جائیں اور انہیں آئین اور انکے جمہوری حقوق میں حاصل ضمانتوں کی یقین دہانی کرائی جانی چاہیئے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ مضبوط مرکز کی مخالفت کرنے والے کسی جرم کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں بلکہ اسکے برعکس انکی جانب سے وفاق اور اسکی اکائیوں کے حقوق کے تحفظ کا مطالبہ ہی اصل محبّ الوطنی ہے۔

جہاں تک ایم 6 (ای) اور ایم 5 (ایچ) کے صفحہ 7 کا تعلق ہے جس میں مختلف سیاسی جماعتوں اور لوگوں کو جمہوری حقوق کی بحالی کیلئے متحد ہونے کی درخواست کی گئی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ کسی بھی مہذب معاشرے کا بنیادی حق ہے۔

جہاں تک محروم طبقات کے لوگوں کو اپنے حقوق کے حصول کیلئے کھڑے ہونے کیلئے بھڑکانے کے الزام کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہرمہذب معاشرے کا وراثتی حق ہے۔ وہ ریاست جوخودکواسلامی تعلیمات پرعمل پیرا سمجھتی ہے اس میں تو تمام شہریوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کا مطالبہ ایک مذہبی فریضہ ہوگا جو کہ مساوات محمدی کے عین مطابق ہے۔

اسلام میں مارشل لا کا کوئی تصور نہیں ہے اور اسلامی تاریخ میں کسی فوجی سربراہ کے ریاستی سربراہ ہونے کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

بحیرہ ہند میں امریکی بیڑے سے متعلق اداریہ نمبر 2 ایم 4 کے مضمون کے حوالے سے میں سمجھتا ہوں کہ یہ پاکستان کے اپنے مفاد میں ہے کہ عالمی طاقتوں کے تنازعات سے دور رہا جائے۔

آپ کی طرح میں بھی ایک محبّ وطن فرد ہوں۔

جرح نہیں کی گئی۔

نمبر PA/DSG-HD/83

حکومتِ پنجاب
محکمۂ داخلہ

تاریخ 8 فروری، 1983 لاہور

حکم نامہ

جیسا کہ گورنرِ پنجاب اس امر پر مطمئن ہیں کہ آپ محترم عبدالولی خان ولد محترم عبدالغفار خان، تعلق نیشنل عوامی پارٹی (کالعدم)، سکنہ مردان، شمالی مغربی سرحدی صوبہ سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہو جو کہ مارشل لاضوابط نمبر 13 اور 33 کے تحت ممنوع ہیں۔

اور مزید براں یہ کہ گورنر پنجاب اس امر پر مزید متفق ہیں کہ آپ، قبل ازیں بیان کیے گئے عبدالولی خاں تحریکِ بحالیٔ جمہوریت کے رہنماؤں / کارکنوں کو متحرک کرنے کی غرض سے پنجاب آنا چاہتے ہیں اور انکے ساتھ مل کر سیاسی پروگرام پر عمل درآمد کیلئے اجلاس کرنا چاہتے ہیں جو کہ مارشل لاضوابط نمبر 13، 33 اور 48 کے برخلاف ہے۔

اب، اس وجہ سے، مندرجہ بالا عوامل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، گورنر پنجاب مغربی پاکستان تحفظِ نقصِ امن آرڈیننس 1960 کے سیکشن 5 کی شق (الف) ذیلی سیکشن (ا) کے تحت حاصل اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے، حکم صادر کرتے ہیں کہ آپ، قبل ازیں بیان کیے گئے عبدالولی خان صوبۂ پنجاب کی کسی بھی اراضی میں تین ماہ تک داخل نہیں ہو سکتے۔

یہ حکم فوری طور پر نافذ العمل ہوگا

گورنرِ پنجاب کے احکامات سے

دستخط

ڈپٹی سیکریٹری (جنرل)

حکومتِ پنجاب محکمۂ داخلہ

خصوصی فوجی عدالت، کراچی کے روبرو

مقدمہ نمبر ....

ریاست بخلاف جام ساقی و دیگر

توہین عدالت ایکٹ کے تحت درخواست

درخواست گذار / صفائی کے گواہ کی جانب سے استدعا کی جاتی ہے کہ یہ معزز عدالت ذیل درج افراد کے خلاف توہینِ عدالت ایکٹ کے تحت کاروائی کرے۔ درخواست گذار کو اس معزز عدالت نے گواہی دینے کی غرض سے طلب کیا اور ذیل درج 8 فروری 1983 کے ایک حکم نامے کے ذریعے، جس کی نقل منسلک ہے، درخواست گذار کے ریلوے اور روڈ کے ذریعے اس معزز عدالت کے روبرو پیش ہونے میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔

1- لیفٹننٹ جنرل جیلانی، گورنر پنجاب، لاہور

2- ڈپٹی سیکریٹری (جنرل)، حکومتِ پنجاب، محکمۂ داخلہ، لاہور

(عبدالولی خان)

درخواست گذار / صفائی کے گواہ

کراچی

تاریخ 15-2-1983

معراج محمد خان

جام ساقی کی جانب سے ایگزیمنیشن انچیف

بتاریخ:21 فروری 1983

میں بی اے، ایل ایل بی ہوں۔ میں سابقہ آئینی منتخب حکومت میں وفاقی وزیر تھا۔ میں رواں مہینوں کیلئے ایم آر ڈی کنوینز اور قومی محاذِ آزادی کا صدر ہوں۔ زیادہ تر اکثریتی سیاسی جماعتیں ایم آر ڈی کا حصہ ہیں۔ میں اپنا موقف ٹھوس آئینی بنیادوں پر اختیار کرتا ہوں۔ میں جام ساقی کو 1958 سے جانتا ہوں۔ میں جام ساقی کو عظیم ترین محبّ وطن سمجھتا ہوں جو لوگوں کے حقوق اور جمہوریت کے مقاصد کیلئے کام کرتا رہا ہے۔ میں نے انہیں کبھی بھی مختلف طبقات میں منافرت پھیلانے اور ریاست دشمن سرگرمیوں میں ملوث نہیں پایا۔ وہ طلبہ، کسانوں اور مزدوروں کے حقوق کیلئے سرگرم کارکن رہے ہیں۔ حیدرآباد میں 1958 میں انکے ساتھ اپنے پہلے رابطے پر میں نے ان سے ہمارے ملک میں جمہوریت کی بحالی کے طریقوں سے متعلق دریافت کیا۔ جام ساقی کا کہنا تھا کہ جمہوریت کی بحالی کی تحریک اُس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک اسکو سامراج دشمن تحریک میں تبدیل نہیں کیا جاتا، جو کہ جاگیردار دشمن ہو اور وفاقی اکائیوں کے حقوق کا تحفظ کرے۔

نظریۂ پاکستان: مجھے یقین ہے کہ ملزم جام ساقی نے نظریۂ پاکستان کے خلاف کام نہیں کیا۔ جام ساقی نے نظریۂ پاکستان کی مبہم تشریح کی مخالفت کی ہے جو کہ مفاد پرست عناصر نے پھیلائی ہوئی ہے۔ جام ساقی نے کبھی بھی قیامِ پاکستان کے تصور کے خلاف کام نہیں کیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ

قائداعظم نے کبھی نظریۂ پاکستان کے تصور کو واضح کیا ہوگا۔1940 کی قرارداد میں قائداعظم کا کہنا تھا کہ یہ ملک خودمختیار ریاستوں کا وفاق ہوگا، جہاں مسلمان اپنے بنیادی حقوق بشمول ایک علیحدہ ریاست کے طور پر آزاد ہونے کا حق پائیں گے۔

صوبے اور طبقات: میں نے انہیں کبھی بھی مختلف صوبوں، فرقوں اور طبقات کے لوگوں کے درمیان منافرت پھیلاتے ہوئے نہیں دیکھا۔انہوں نے صوبائی خودمختاری کیلئے کام کیا ہے جو کہ جرم نہیں ہے، یہ ہر ایک فرد کا بنیادی حق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صوبائی خودمختاری کی عدم موجودگی پاکستان کیلئے نقصان دہ ہے جیسا کہ 1971 میں ثابت ہو چکا ہے۔ پاکستان کی اکثریتی آبادی غریب اور متوسط اور نچلے متوسط طبقات جن میں کسان اور مزدور شامل ہیں، سے تعلق رکھتی ہے اور انکے حقوق کیلئے جدوجہد کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ میں ایسے مظلوم لوگوں کیلئے جدوجہد کو قرآن و سنت کے عین مطابق سمجھتا ہوں، ایسی جدوجہد کو علامہ اقبال کے افکار کے مطابق سمجھتا ہوں۔

علامہ اقبال نے کہا تھا،

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشک فرومایا کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے میسر نہ ہو دہقاں کو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ کسی خصوصی یا سرسری فوجی عدالت میں مقدمہ چلائے جانے سے کسی فرد کے کردار یا صلاحیتوں پر کوئی فرق پڑتا ہے۔ میں سویلین مقدمات کیلئے فوجی عدالتوں کی قانونی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ درست ہے کہ قانونی و آئینی حکومت کی بحالی کے بعد عوام

فوجی عدالتوں میں مقدمات چلائے اورسزائیں پانے والے سیاسی رہنماؤں کی پذیرائی کرے گی۔

حکومت کی مخالفت: حکومت کی مخالفت کو ریاست کی مخالفت نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یہ ملک کی انتہائی بدقسمت روایت رہی ہے کہ ایک حکومت کی جانب سے محبّ وطن قرار دیئے جانے والے افراد دوسری حکومت میں غدار ٹھرائے جاتے ہیں۔ میں 18 فروری 1983 کے جمعہ ایڈیشن میں فیض احمد فیض کے انٹرویو کے مندرجات سے اتفاق کرتا ہوں۔ اس طرح کی آراچلی اور نکارا ہوا میں بھی پائی جاتی ہے۔

مواد پر پابندی: روس میں مذہب کی آزادی ہے۔ سوشلزم اور کمیونزم پر مواد مارکیٹ میں میسر ہے، اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہاں پر سوشلزم اور کمیونزم کے نظریات کے بانی کارل مارکس کو علامہ اقبال کے پیش کئے گئے خراج کو یہاں دہراتا ہوں:

''وہ کلیم بے تجلّی، وہ مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب''

سوشلزم ایک سماجی معاشی نظام ہے۔ میری نظر میں کمیونزم سوشلزم کی ایک بلند تر منزل ہے اور میں نے اس نظریئے میں پڑھا ہے کہ جب کوئی فرد اخلاقی طور پر اعلیٰ وارفع ہو جاتا ہے تو اسکو ریاستی اداروں کی ضرورت نہیں رہتی۔

مسلح افواج: میری نظر میں، جام ساقی نے مسلح افواج کے آئین میں متعین کردار کو کبھی زد نہیں پہنچائی اور نہ ہی اسکو اسکے لئے موردِ الزام ٹھرایا جاسکتا ہے۔ جام ساقی نے مسلح افواج اور اسکے چیف آف آرمی اسٹاف کے آئین کے خلاف کردار کی مخالفت کی ہے۔

مارشل لا کا مقصد: میرے خیال میں جام ساقی چیف آف آرمی اسٹاف کی پہلی نشری تقریر کی مخالفت نہیں کرتے کہ نوے روز کے اندر عام انتخابات کا انعقاد ہی اسکا واحد مقصد ہے اور اسکے کوئی سیاسی مقاصد نہیں ہیں۔ مارشل لا کو سپریم کورٹ نے ایک محدود عرصے کیلئے قانونی تحفظ فراہم کیا تھا، جس کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ جام ساقی بشمول میرے اس طویل ہوتی ہوئی مارشل لا کے

مخالف ہیں جو کہ غیر آئینی اور سپریم کورٹ کے فیصلے کے برخلاف ہے۔موجودہ حکومت غیر آئینی اور غیر قانونی ہے۔ چیف آف آرمی اسٹاف کی پہلی تقریر میں کیے گئے وعدوں سے انحراف کی بنا پر میں ملک میں برسرِ اقتدار ٹولے کو نمائندہ نہیں سمجھتا۔ یہ فوج کا بھی نمائندہ نہیں ہے۔موجودہ حکومت پر تنقید فوج پر تنقید نہیں ہے۔حکومت کے تمام اداروں بشمول فوج پر تنقید جمہوری حق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جنرل ضیا نے یہ صورتحال اقتدار پر غیر قانونی اور غیر آئینی قبضے کی وجہ سے خود اپنے لئے پیدا کی ہے،جس کی وجہ سے اسکو غاصب قرار دیا جا سکتا ہے۔2 جنوری 1983 کو روزنامہ جنگ میں ارشاد احمد حقانی کا شائع ہونے والا مضمون پیش کر رہا ہوں جس میں وہ کہتے ہیں کہ جنرل ضیا نے بیرونی دنیا کو اپنے ایک جواب میں کہا کہ 'اگر میں نہیں ہوا تو کوئی دوسرا فوجی جنرل اقتدار پر قبضہ کر لے گا'۔

ایرانی انقلاب (خارجہ پالیسی): 'میں عدالتی دستاویز ایم -4 (سرخ پرچم) کے صفحہ نمبر 11 پر ایرانی انقلاب کی تائید کرنے والے موقف سے بھی اتفاق کرتا ہوں۔ میں ایران کے اس انقلاب کے حق میں بولتا رہتا ہوں کیونکہ میں بادشاہت مخالف اور سامراج دشمن حکومت کا حمایتی ہوں۔ اتفاق کرتا ہوں کہ یہ ہر محبّ وطن کا فرض ہے کہ وہ ایرانی انقلاب کی حمایت کرے اور سامراج کے خلاف ایران کا دفاع کرنا ہر پاکستانی کا فرض ہے تا کہ اس کی یقین دہانی ہو سکے کہ پاکستان کو امریکی مفادات کیلئے استعمال نہ کیا جا سکے۔ خارجہ پالیسی پر لوگوں کی تنقید کو جرم نہیں سمجھا جانا چاہئے اور ایسے افراد کو روس اور افغانستان کا ایجنٹ قرار نہیں دیا جانا چاہئے۔ یہ درست ہے کہ قیامِ پاکستان سے حکومت کی مخالف سیاسی جماعتوں کو بھارت،سوویت یونین اور افغانستان کا ایجنٹ کہا جاتا رہا ہے جبکہ موجودہ مخالف جماعتوں کو ایران کا بھی ایجنٹ کہا جاتا ہے۔ یہ بدقسمتی ہے اور اسکو آئینی عدلیہ کی جانب سے ثابت کرنے تک درست نہیں سمجھنا چاہئے۔ پاکستان کو امریکہ کے ہاتھوں افغانستان کے خلاف استعمال نہ ہونے دینے کی بات کرنا محبّ وطن نقطہ نظر ہے اور اسکو افغان یا ایرانی موقف کے طور پر نہیں دیکھا جانا چاہئے۔

کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان پر کوئی قانونی پابندی نہیں ہے۔کسی بھی مواد یا نقطۂ نظر کو

تخریبی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ کفار مکہ کو بھی قرآن پاک رکھنے اور پڑھنے سے نہیں روکا گیا۔ اتفاق کرتا ہوں کہ جب بھی سامراجی طاقتوں کے ساتھ معاہدے کیے جاتے ہیں تو عمومی طور پر ترقی پسند قوتوں کے خلاف جبر و استبداد کا دور دورہ ہوتا ہے جس دوران کئی ایک تو اپنی جانیں تک قربان کر دیتے ہیں۔

عدالتی سوالات:

سوال 1: آپ کا پیشہ کیا ہے؟

جواب: میں بیمہ ایجنٹ ہوں۔

سوال 2: آپ قانون میں گریجویٹ اور سیاستدان ہیں، کیا آپ کسی دستور میں یا کسی عدالت کی جانب سے وضع کی گئی نظریۂ پاکستان کی تشریح کا حوالہ دے سکتے ہیں؟

جواب: نظریۂ پاکستان کی اصطلاح سب سے پہلے 1962 کے آئین میں استعمال کی گئی۔

سوال 3: کیا نظریۂ پاکستان کے حوالے سے کوئی سزا تجویز کی گئی ہے؟

جواب: مجھے یاد نہیں پڑتی۔

فتحیاب علی خان

ذات: نامعلوم

سکنہ D-106، کے ڈی اے اسکیم نمبر 1، کارساز روڈ، کراچی، فون نمبر 436907

میں 1964 سے ایک پیشہ ور وکیل ہوں۔ میں مزدور کسان پارٹی کا سربراہ ہوں، جو کہ تحریکِ بحالیٔ جمہوریت (MRD) کا حصہ ہے۔ میں ملزم جام ساقی کو 1963 سے جانتا ہوں۔ میں جام ساقی کا احترام کرتا ہوں، کیونکہ وہ ایک ایماندار، اپنے نظریات سے وابستہ شخص ہیں۔ میں انہیں محبِ وطن سمجھتا ہوں اور آج سے قبل میرے پاس یہ ماننے کیلئے کوئی گواہی نہیں تھی کہ انہوں نے ہمارے ملک کی توڑ پھوڑ کیلئے کوئی کام کیا ہے۔ انکا مزدور کسان پارٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جہاں تک نظریۂ پاکستان کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ نظریۓ کی اصطلاح ایک انتہائی مبہم اصطلاح ہے جسکی نہ تو کوئی عدالتی توجیح ہے اور نہ ہی یہ ہمارے قوانین میں واضع کردہ ہے اور یہ اصطلاح میرے خیال میں اُن لوگوں کی کم مائیگی کا مظہر ہے جنہوں نے اسکی اختراع کی ہے۔ نظریۓ کو کسی چھوٹی سی جغرافیائی حدود تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً، بھارتی نظریہ، چینی نظریہ، سوویت/ سعودی نظریہ نامی کسی چیز کا کوئی وجود نہیں ہے کیونکہ نظریات آفاقی ہوتے ہیں، چاہے وہ مذہبی ہوں یا معاشرے کے مسائل کا حل پیش کرنے والے فلسفیوں کی جانب سے پیش کردہ نظریات ہوں۔ اگر کوئی واضع نظریۂ پاکستان ہوتا تو مشرقی پاکستان کی باقی ماندہ پاکستان سے علیحدگی کے بعد نظریۂ بنگلادیش اور نظریۂ مغربی پاکستان سامنے آتے۔ برصغیر میں تحریک آزادی کے دوران کئی اہم مراحل آتے جن میں قیام پاکستان بھی شامل ہے جو کہ 1940 کی

قراردادِ لاہور میں یا دھلی میں 1946 کے دوران ہونے والے مسلم لیگ کے اراکین قانون ساز اسمبلی کے کنونشن میں درج ہیں۔ اگر پاکستان کی بنیاد کی اصطلاح کا کہیں کوئی ذکر ہے تو یہ دو قراردادیں ہماری تحریکِ آزادی کی تاریخ کا سنگِ میل ہیں۔ جام ساقی نے کوئی جرم کیا ہے یا نہیں اسکو 1940 اور 1946 کی قراردادوں کو مدِ نظر رکھے بغیر طے نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں پر میں دو قرادادیں پیش کر رہا ہوں، جن میں سے ایک آل انڈیا مسلم لیگ کے 27 ویں سالانہ اجلاس کے دوران لاہور میں 21 تا 23 مارچ 1940 کے دوران منظور ہوئی۔ جبکہ دوسری قائداعظم کی صدارت میں 1946 کے دوران دھلی میں منعقدہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اراکین قانون ساز اسمبلی کنونشن میں منظور ہوئی۔

یہاں اُنکے نقول پیش کر رہا ہوں.......

اور اس طرح میں نہیں سمجھتا کہ جام ساقی نے نظریۂ پاکستان کو کوئی زد پہنچائی ہے۔ انہیں جانتے ہوئے، کہتا ہوں کہ وہ ریاست کے تمام قابلِ عزت اداروں کا احترام کرتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ عمومی آئینی، جمہوری، وفاقی اداروں کا احترام کرتے ہیں، مسلح افواج ریاست اور آئین کی تخلیق کردہ ہیں۔ اس حوالے سے میں نہیں سمجھتا کہ انہوں نے لوگوں کے درمیان نفرت یا بے چینی پیدا کی ہے۔ تاہم گذشتہ ساڑھے پانچ برسوں کے دوران، مسلح افواج سے تعلق رکھنے والے کچھ معززین نے ملک کے 1973 کے آئین میں اپنے لیے واضع کردہ حدود کو پھلانگا ضرور ہے۔ جام ساقی نے ہوسکتا ہے کہ ان معززین اور اداروں کی جانب سے اپنی حدود پھلانگنے کو تنقید کا نشانہ بنایا ہو۔ تاہم، حقیقت یہ ہے کہ میری معلومات کے مطابق پورے ملک نے ان صاحبان کی اس کاروائی پر تنقید کی ہے، جن میں میں بھی شامل ہوں۔ 1973 کا آئین شق 245 میں کہتا ہے، 'مسلح افواج وفاقی حکومت کی ہدایات پر کسی بیرونی جارحیت یا خطرے کے خلاف پاکستان کا دفاع کریں گی اور جب انکو کہا جائے گا تو سویلین حکومت کی مدد کیلئے آئیں گی۔'

اسلامی جمہوریہ پاکستان کا آئین اپنے تیسرے شیڈول میں مسلح افواج کے افراد کا حلف شامل کرتا ہے، جو کہ کہتا ہے، میں انتہائی سنجیدگی سے حلف لیتا ہوں کہ میں پاکستان کے ساتھ

سچا اور وفادار ہوں گا، اور آئینِ پاکستان کو مقدم رکھوں گا جو کہ عوام الناس کی خواہشات کا ترجمان ہے، کہ میں خود کو کسی بھی طرح کی سیاسی سرگرمیوں میں ملوث نہیں کروں گا، اور میں بری، بحری اور فضائی افواج میں قانون کے تحت جس نوعیت کی ضرورت ہوئی ایمانداری اور وفاداری سے خدمت کروں گا۔

اس طرح آئین کی شق 6 کا حوالہ دوں گا:

''انتہائی غداری (1) کوئی شخص جو طاقت کے استعمال سے، یا طاقت کے اظہار سے، یا کسی اور غیر آئینی طریقے سے آئین کو منسوخ کرتا ہے یا منسوخ کرنے کی کوشش یا سازش کرتا ہے، یا ختم کرتا ہے یا ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے یا فقرہ (1) میں درج کاموں میں سے ایسے کسی فرد کی مدد کرتا ہے یا مدد کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ انتہائی غداری کا مرتکب ہوتا ہے۔'' (iii) پارلیمنٹ قانون کے ذریعے انتہائی غداری کے مرتکب ہونے والے فرد کی سزا کا تعین کرے گی۔''

پارلیامان نے 1973 میں انتہائی غداری کا ایکٹ منظور کرتے ہوئے اسکی سزا سزائے موت متعین کی۔ جب 5 جولائی 1977 کو ایک غیر معمولی گزیٹ حصہ اول کے ذریعے اعلان شائع کیا گیا تو میری جانب سے اوپر بیان کی گئی وضاحت کے تحت صرف جام ساقی ہی موجودہ حکمرانوں یا مارشل لا اختیاری کا مخالف نہیں ہے بلکہ پاکستان کی تمام عوام اس عمل کی مخالف ہے۔ انکی جانب سے جاری کیے گئے مارشل لا ریگیولیشنز اور مارشل لا آرڈرز نے مارشل لا کے خلاف نفرت پیدا کی ہے اور فوج کے خلاف نجات کے احساسات پیدا کیے ہیں۔

کمیونزم پر پابندی: پاکستان میں سوشلزم / کمیونزم سے متعلق لکھنے اور پڑھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ مارشل لا میں تمام سیاسی جماعتیں کالعدم ہیں۔ ملکی قانون کے تحت کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سمیت کسی بھی جماعت پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہ پاکستان کے ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ مظلوم لوگوں کیلئے کام کرے، ایسا کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ یہ وطیرہ رہا ہے کہ حکومت کے مخالفین کو اس یا اُس ملک کا حمایتی بتایا جاتا رہا ہے۔ میں تمام سیاسی جماعتوں اور سیاسی رہنماؤں کو محبِّ وطن سمجھتا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ انہوں نے پاکستان کے مختلف صوبوں کے درمیان نفرت پیدا کی

ہے کیونکہ کسی ایک صوبے کی بہتری کا مطالبہ درحقیقت تمام صوبوں کی بہتری کی بات ہے۔ پاکستان ایک وفاق ہےاور وفاقی اکائیوں کے حقوق ملک کے حقوق ہیں۔کسی وفاق میں، جہاں کئی ایک وفاقی اکائیاں ہوں، مارشل لاحکومت کا ون یونٹی طرز بھی زیادہ بدتر ہے۔ یہ ایک فرد کی آمریت ہے۔اپریل1978 تک موجودہ حکومت ماورائے آئین حکومت تھی اور چونکہ اس نے انتخابات کرانے کا اپنا وعدہ پورانہیں کیا،اس لئے یہ غیر آئینی اور غیر قانونی بن گئی۔اگر عام لوگوں کی آسانی کیلئے اردو میں ترجمہ کیا جائے تو اسکو ''غاصب'' ہی کہا جائے گا،جیسا کہ ایم 4 کے ادارہ 1- میں تحریر کیا گیا ہے۔میں یہاں روزنامہ امن کا تاریخ16 فروری1983 کا ایک تراشا پیش کر رہا ہوں جس کے مطابق غاصب بھی جوابدہ ہیں۔عدالت نے اسکا معائنہ کر کے گواہ کو واپس کردیا۔

۔کاروائی ملتوی۔

سید محمد شاہ امروٹی ولد سید نظام الدین شاہ

عمر تقریباً 70 برس، مذہب اسلام، امروٹ شریف، ضلع شکار پور سندھ

میں جمعیت العلمائے اسلام کا قائم مقام سیکریٹری اور ایم آر ڈی سندھ کا سیکریٹری جنرل ہوں۔ علاوہ ازیں میں درگاہ امروٹ شریف کا سجادہ نشین بھی ہوں۔

اسلام اور موجودہ حکمران

اسلام ہمیں برابری اور بھائی چارے کا درس دیتا ہے۔ اسلام کے مطابق ہر مسلمان سپاہی ہے اور اسلام میں پیشہ ورانہ فوج کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اسلام میں مارشل لا کا کوئی تصور نہیں ہے۔ زیادہ تر علمائے دین موجودہ حکمرانوں کو ''غیر شرعی'' تصور کرتے ہیں۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ زیادہ تر علما موجودہ حکومت کی جانب سے نافذ کردہ زکوۃ اور عشر کو اسلامی نہیں سمجھتے۔ پاکستان ایسی ریاست ہے جسکو خارجی ریاست کے طور پر دیکھا جاتا ہے جسکی وجہ سے پاکستان میں عشر لاگو نہیں کیا جاسکتا۔ عدالتی دستاویز M-4 کے صفحہ نمبر 17 پر تحریر کردہ ''زکواۃ کے نام پر ٹیکس''، جو مجھے پڑھ کر سنایا گیا، میں کچھ بھی غیر اسلامی نہیں ہے۔

اسلام اور جغرافیائی حدود

میں اتفاق کرتا ہوں کہ اسلام ایک آفاقی مذہب ہے اور اسکے ماننے والوں کو کسی ایک جغرافیائی علاقے میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ اسلام کو بطور مذہب کسی ایک علاقے یا دنیا کے کسی مخصوص حصے تک محدود نہیں کیا جاسکتا اور یہ کہ کسی کو بھی اس سے متعلق مکمل اتھارٹی نہیں ہونی چاہئے اور یہ کہ مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے والا اسلام اور مذہب کیلئے خطرہ ہے۔

نظریۂ پاکستان

میں پاکستان کے آئین کو نظریۂ پاکستان سمجھتا ہوں جسکو معطل کیا گیا ہے۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ

جس کسی نے بھی پاکستان کے آئین کو معطل کیا ہے اس نے نظریۂ پاکستان کو نقصان پہنچایا ہے۔ اسلام انسانوں کے بنیادی حقوق، عدلیہ کی آزادی اور قانون کی بالادستی کی تبلیغ کرتا ہے۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ مزدوروں کے بنیادی حقوق، کسانوں میں زمین کی تقسیم کیلئے مطالبات غیر اسلامی نہیں ہیں۔ سوشلزم زمین کسانوں میں تقسیم کرنے، بنیادی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے کی بات کرتا ہے جو کہ اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ میری نظر میں سوویت یونین کے مسلمانوں سے متعلق کوئی کتاب تحریر کرنا نہ جرم ہے نہ ہی غیر اسلامی عمل۔

اسلام صحتمند تنقید کی اجازت دیتا ہے۔ حکمرانوں اور حکومت پر تنقید کرنا جرم نہیں ہے۔ موجودہ حکومت نے امریکہ سے اپنی دوستی بحال کر کے اس سے مدد طلب کی ہے جو کہ لبنانی مسلمانوں کے خلاف اسرائیل کی مدد کرتا رہا ہے۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ موجودہ حکومت افغان مجاہدین کے مسائل حل کرنے کی ضمن میں اقدامات کرے جبکہ حکومتِ صوبہ سرحد کے گورنر نے سیاسی جماعتوں کے موقف سے اختلاف کیا ہے۔ انہوں نے مجاہدین کی جنگ کو پاکستان کیلئے جنگ قرار دیا ہے۔ سوشلزم ایک اقتصادی نظام ہے۔

جرح

یہ کہنا درست ہوگا کہ جنرل ضیاء کی حکومت کو غاصب کہنا درست ہے کیونکہ انہیں پاکستان کی عوام نے منتخب نہیں کیا ہے۔ مجھے جام ساقی کے خلاف الزامات کا علم نہیں ہے۔ موجودہ حکومت / حکمرانوں کے خلاف وال چاکنگ کر کے، پوسٹر لگا کر اور اجلاس منعقد کر کے پاکستان کے عوام کو خبردار کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ہلچل (M-5) کے صفحۂ اول پر بغاوت کا تاثر ملتا ہے۔

عدالتی سوال: کیا سوشلزم اور اسلام کے درمیان کوئی ٹکراؤ ہے؟

جواب: یہ دونوں اقتصادی نظام ہیں۔ اسلام ایک مذہب ہونے کے ساتھ ایک اقتصادی نظام بھی ہے جبکہ سوشلزم مذہبی تبلیغ نہیں کرتا۔

شیخ رفیق احمد ولد شیخ محمد یعقوب

عمر:60برس،ذات:مسلمان

ساکن:3-ایف،فرید کوٹ روڈ،لاہور

میرا اندراج 1948 میں ہائی کورٹ کے وکیل کے طور پر ہوا جبکہ میں گذشتہ تیس برس سے سپریم کورٹ کا وکیل ہوں۔میرا 1943 سے 1947 تک بانئ پاکستان قائداعظم کے ساتھ انتہائی قریبی تعلق رہا ہے۔میں پنجاب اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سیکریٹری اور آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی ورکنگ کمیٹی کا رکن تھا۔1947 میں پنجاب مسلم لیگ کی جانب سے شروع کی گئی سول نافرمانی کے دوران میں نے مسلم لیگ کے دیگر رہنماؤں اور کارکنوں کے ساتھ رضا کارانہ گرفتاری پیش کی۔میں نے مسلم لیگ امیدواروں کی انتخابی مہم کیلیئے پنجاب میں طلبہ کو منظّم کیا اور مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کی مرکزی ورکنگ کمیٹی کے اراکین خان لیاقت علی خان،مولانا حسرت موہانی،راجہ غضنفر علی خان،ابوالحسن اصفہانی اور دیگر کے ساتھ کام کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔اس وقت میں پاکستان پیپلز پارٹی پنجاب کا صدر ہوں۔میں پنجاب اسمبلی کا اسپیکر بھی رہا ہوں جبکہ منتخب آئینی حکومت میں صوبائی وزیر بھی رہا ہوں۔

کردار:

میں اور پنجاب کے لوگ عمومی طور پر جام ساقی کو انکے سیاسی نظریات اور پاکستان کی پس ماندہ عوام کیلیئے انکی خدمات کے باعث انتہائی عزت واحترام سے دیکھتے ہیں۔

نظریہ:

نظریۂ پاکستان آئینی یا قانونی اصطلاح نہیں ہے۔مختلف سیاسی جماعتیں اور رہنما اسکی مختلف تشریح کر سکتے ہیں۔ تاہم میں قائد کے موقف اور بیانات کو نظریۂ پاکستان کے تصور کی بنیاد سمجھتا ہوں۔ قائد کے مطابق پاکستان کو ایک وفاق ہونا تھا، مختلف صوبوں پر مشتمل وفاق، جس میں طرزِ حکومت جمہوری ہونی تھی جس نے غریب اور پس ماندہ محنت کش طبقات کی زندگیوں میں بہتری کو یقینی بنانا تھا جس کو قائداعظم نے اسلامی سوشلزم کا نام دیا۔1940 کی قراردادِ پاکستان اور کئی ایک بیانات، بالخصوص پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس کے موقعہ پر 11 اگست 1947 کو کی گئی تقریر، انتہائی اہم ہیں۔ میں عدالتی دستاویز' وائی وائی' میں دیئے گئے قائد کے تصورات سے متفق ہوں۔ میں پاکستان مسلم لیگ کے صدر اور ایم آر ڈی کے سیکریٹری جنرل خواجہ خیرالدین کے نظریۂ پاکستان سے متعلق موقف کی تائید کرتا ہوں۔ 19 فروری 1983 کو روزنامہ امن کا ایک تراشہ پیش کر رہا ہوں۔ عدالتی دستاویز......۔فوجی عدالت سمجھتی ہے کہ کسی سیاسی کارکن پر مقدمہ چلا کر اسکے کردار کو مسخ کیا جا سکتا ہے لیکن عملاً ایسا ہوتا نہیں ہے۔ ایم آر ڈی پنجاب نے پرزور انداز میں فوجی عدالتوں کے خاتمے اور سیاسی کارکنوں کے مقدمات کھلی عدالتوں میں چلانے کا مطالبہ کیا ہے۔

مسلح افواج: میں مارشل لا اور مسلح افواج میں فرق کرتا ہوں۔ میری نظر میں مسلح افواج ملک کا ایک ادارہ ہیں جبکہ مارشل لا ایک طرزِ حکومت ہے جس کو نہ صرف پاکستان کے لوگوں نے بلکہ خود چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے بھی اپنی تقریروں میں ناپسند کیا ہے۔ موجودہ طرزِ حکومت پر تنقید یا اسکی ناپسندیدگی کو ریاست یا مسلح افواج پر تنقید سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک بدقسمت روایت ہے کہ حکومتیں مخالف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں پر غداری کے الزامات عائد کرتی ہیں جو کہ اکثر واپس بھی لے لئے جاتے ہیں۔ اکثر و بیشتر غداری کے تحت مقدمات میں گرفتار ہونے والے رہنما حکومتی عہدوں کیلئے بھی نامزد کیے جاتے ہیں۔

صوبائی منافرت: جام ساقی کے خلاف مختلف طبقات، فرقوں اور صوبوں کے درمیاں منافرت پھیلانے کا عائد کیا گیا الزام مبہم ہے اور حقائق کے برعکس ہے۔ انکی جانب سے صوبائی خودمختاری اور پاکستان کی عوام کے حقوق کا مطالبہ، اگر کیا گیا ہے تو کسی بھی طور پر جرم نہیں ہے۔ یہ ہر شہری کا بنیادی حق ہے جو کہ 1973 کے آئین میں فراہم کیا گیا ہے۔صوبائی اور قومی سطح پر منتخب نمائندگان کی عدم موجودگی میں یہ مطالبہ اور زیادہ متعلقہ ہو جاتا ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی جانب سے نوے روز کے اندر انتخابات منعقد کرانے کے وعدے کی عدم تکمیل اور چھ برس کے اس عرصے نے مایوسی پھیلا کر سیاسی مستقبل کو غیر یقینی صورتحال کا شکار کردیا ہے۔کسی ملزم پر ایک جانب سوشلزم کیلئے کام کرنے کا الزام اور دوسری جانب ملک کے مختلف حصوں کے درمیان منافرت پھیلانے کا الزام خود اپنے اندر تضادات کا حامل ہے۔کوئی سوشلسٹ اپنا پیار کسی مخصوص علاقے کے غریب اور افتادگانِ خاک تک محدود نہیں رکھتا۔اس وقت موجودہ حالات ایسے ہیں کہ کچھ لوگوں کو پاکستان کے تمام صوبوں میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ مختلف صوبوں کے درمیان منافرت پھیلانے کا باعث بن رہا ہے، میں خود اس صورتحال کا شکار ہوں۔

سوشلزم پر پابندی: سوشلزم اور کمیونزم سے متعلق مواد رکھنے یا پڑھنے پر کسی قسم کی پابندی سے متعلق کوئی قانون یا حکم نامہ نافذ العمل نہیں ہے۔ اتفاق کرتا ہوں کہ سوشلزم اور کمیونزم کے مضامین یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے ہیں اور 1973 کے آئین کا آرٹیکل 3 سوشلزم کی تشریح کرتا ہے۔کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان پر کوئی قانونی پابندی نہیں ہے۔ یہ واضع ہے کہ حکومت کا مختلف سیاسی جماعتوں کی جانب مختلف رویہ ہے۔

موجودہ مارشل لا حکومت آئینی نہیں ہے: سپریم کورٹ آف پاکستان نے بیگم نصرت بھٹو کیس میں اس حکومت کو محدود مدت کیلئے قانونی جواز فراہم کیا تھا تا کہ وہ اس عرصے کے دوران اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کرے اور روزمرہ کے امور چلاتی رہے۔ مندرجہ بالا شرائط سے آگے لوگ اس حکومت کو غاصب سمجھتے ہیں۔ میں فروری 1983 کے لئے ایم آرڈی کنوینز کی

جانب سے جاری کردہ مضمون کے مندرجات سے اتفاق کرتا ہوں اور یہ امریکی اخبارات اور جرائد میں شائع ہونے والی معلومات پر مبنی ہے۔ وہ مضمون یہاں پر پیش کر رہا ہوں۔ عدالتی دستاویز'...........'

ایجنٹ: دیگر ممالک بشمول سوویت یونین، چین، ایران وغیرہ کے کاموں سے متاثر ہوکر انکا متعرف ہونا کوئی جرم نہیں ہے جبکہ ان ممالک کے لوگوں کی زندگیوں کے مختلف مثبت پہلوؤں اجاگر کرنا بھی کوئی جرم نہیں ہے۔ مفکرِ پاکستان، فلسفی اور شاعر علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں سوویت یونین کے نظام کی تعریف کی ہے۔ مولانا حسرت موہانی بھی سوویت یونین کے نظام کی تعریف کرتے ہوئے نہیں تھکتے تھے۔

ایران: میں ایران میں حالیہ انقلاب کو گذشتہ پانچ سو برس میں فرانسیسی انقلاب کے بعد انسان ذات کی سب سے بڑی فتح سمجھتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایرانی انقلاب کی حمایت کرنا ہر انسان کا جمہوری فرض ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حکومت ایرانی انقلاب اور مسلم دنیا کی رائے عامہ کو ایران سے متعلق امریکی پالیسیوں سے ناخوش سمجھتی ہے۔ میں اداریہ نمبر 2 (ایم-4) میں امریکی بیڑے سے متعلق خدشات سے اتفاق کرتا ہوں۔ امریکی حکومت شاہ ایران کی عوام دشمن پالیسیوں کی حمایتی تھی۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ جماعت اسلامی اور اس قبیل کے لوگوں کے علاوہ تمام سیاسی جماعتیں افغان مسئلے کا پرامن اور سیاسی حل چاہتی ہیں جو کہ موجودہ حکومت کا بھی موقف ہے۔ میں نے ایم-4 (صفحہ نمبر 24) دیکھا ہے اور اس بیان سے اتفاق کرتا ہوں کہ پاکستان کو افغانستان کے خلاف استعمال ہونے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ فلسطین کیلئے موجودہ حکومت، فلسطینیوں کی جدوجہد کی حمایت کرتی ہے اور پی ایل او کو فلسطینیوں کا نمائندہ تسلیم کرتی ہے، تاہم اسرائیل کی مذمت کے باوجود، وہ امریکہ پر تنقید سے اجتناب کرتی ہے جو کہ عرب اراضی پر اسرائیلی قبضے کا سب سے بڑا حمایتی ہے۔ فلسطین کے حق میں اور کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے خلاف مضامین تحریر کرنا ہر پاکستانی اور مسلمان کا فرض ہے۔ میں عدالتی دستاویز ایم-4 کے صفحہ نمبر 10 پر کیمپ ڈیوڈ سے متعلق مضمون سے اتفاق کرتا ہوں۔

مارشل لا کا مقصد: میری نظر میں موجودہ مارشل لا کا بنیادی مقصد شفاف اور غیر جانبدارانہ انتخابات کا انعقاد تھا جس کیلئے مختلف مارشل لا ضوابط جاری کیے گئے تھے۔ میں اپنا موقف پاکستان کی سلامتی، خوشحالی اور بہتری کیلئے اختیار کرتا ہوں، نہ کہ موجودہ حکومت کے کسی سرکاری اہلکار کیلئے۔

استغاثہ نے جرح نہیں کی۔

شیخ رفیق کی جانب سے حوالہ دیا گیا 1973 کے آئین کا آرٹیکل 3:

ریاست استحصال کی تمام اشکال کی خاتمے کی یقین دہانی کرے گی اور ہر ایک سے اسکی صلاحیتوں کے مطابق کام لینے اور کام کے مطابق معاوضہ دینے کے بنیادی اصول کو بتدریج زیرِ عمل لائے گی۔

حکومتِ سندھ

محکمۂ داخلہ

کراچی، تاریخ 7 فروری 1983

حکم نامہ

نمبر SOJ/82 (3)II- نقص امن ضابطہ 1960 کے سیکشن (a) (1)5 کے تحت تاریخ 16-12-1982 کو جاری کیے گئے حکم نامے SIJ/82 (3)II میں نرمی برتتے ہوئے اور مذکورہ حکم نامے کے اطلاق کے دوران حکومتِ سندھ جناب رفیق احمد شیخ ایڈووکیٹ کو 21 فروری تا 24 فروری کے عرصے کے دوران کراچی میں داخل ہونے، ٹھہرنے یا ہونے کی اجازت مرحمت کرتی ہے تاکہ وہ ریاست بخلاف جام ساقی اور دیگر کے مقدمے میں کراچی میں قائم خصوصی فوجی عدالت کے روبرو صفائی کے گواہ کے طور پر اپنا بیان دے سکیں۔

بحکم گورنر سندھ

دستخط

مظہر رفیع

سیکریٹری حکومتِ سندھ

محکمۂ داخلہ

تاریخ 7 فروری 1983

نمبر SOJ/82 (3) II

نقل برائے ملاحظہ

1- ایک نقل (بشمول دو اضافی نقول) سیکریٹری، حکومتِ پنجاب، محکمہٗ داخلہ لاہور کو ارسال کی جا رہی ہے۔ تکمیل کی گئی نقل براہ مہربانی ریکارڈ کیلئے اس محکمے کو ارسال کی جائے۔

2- میاں محمد امین، ڈی آئی جی پولیس، کراچی

3- ھیڈکوارٹر مارشل لا ایڈمنسٹریٹر، کراچی

دستخط

(اے ایم ضیا شاہ)

سیکشن آفیسر (جوڈیشل)

برائے سیکریٹری، حکومتِ سندھ

یوسف تالپور ولد نواب پیر بخش تالپور

سکنہ تالپور مینشن، گڈز نا کہ، حیدر آباد

مرکزی جرح: جام ساقی

میں سندھ یونیورسٹی سے ایم اے پاس ہوں۔ میں سابق رکن صوبائی اسمبلی بھی ہوں۔ میں جام ساقی کو 1967 سے جانتا ہوں، چونکہ وہ میرے ضلع تھر پارکر سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے میں انہیں طلبہ سیاست میں سرگرم ایک اچھے طالب علم رہنما کے طور پر جانتا ہوں۔ میں نے انہیں ہمیشہ عام معمول سے بڑھ کر پایا کیونکہ وہ واحد شخص ہیں جو طالب علم ہوتے ہوئے بھی غریب لوگوں کیلئے کام کرتے رہے ہیں۔ میں نے اپنی شناسائی کے روز اول سے ان میں ایسی کسی صفت کی عدم موجودگی نہیں دیکھی جو کسی اچھے محبِ وطن کا خاصہ ہو۔ میں نے جام ساقی کو صوبے میں اور بین الصوبائی نفرتیں پھیلانے کا مرتکب نہیں پایا۔ میں نے جام ساقی کو مسلح افواج کے خلاف افواہیں پھیلاتے ہوئے بھی نہیں پایا۔ میں نے انہیں کبھی بھی ریاست کے خلاف تخریبی کارروائیوں میں ملوث نہیں دیکھا۔

استغاثہ کی جانب سے جرح

میں نے اپنی عملی سیاست کا آغاز سندھ یونیورسٹی طلبہ یونین کے منتخب صدر کے طور پر کیا۔ میں جام ساقی سے آخری مرتبہ 1977 کے اواخر یا 1978 کی ابتدا میں حیدر آباد میں ملا تھا۔ میں نے اسلامی تاریخ میں ایم اے کیا ہے۔ مجھے جام ساقی پر عائد کیے گئے الزامات کا علم

ہے۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ جام ساقی محبِ وطن نہیں ہیں۔ جام ساقی ہوسکتا ہے کہ موجودہ حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں شامل ہوں لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ وہ پاکستان کے لوگوں کے درمیان نفرتیں پیدا کرنے میں کبھی بھی ملوث نہیں رہے ہیں۔

مجھے یاد نہیں کہ جام ساقی پر حیدرآباد میں مارشل لا حکام کی جانب سے کوئی مقدمہ چلایا گیا تھا یا نہیں۔ یہ بھی میرے علم میں نہیں ہے کہ انہیں حیدرآباد میں کسی مقدمے کے تحت مارشل لا حکام نے کوئی سزا سنائی ہے یا نہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ مارشل لا عدالت میں زیرِ مقدمہ کسی فرد کو دوسری یا تیسری مرتبہ عدالت میں طلب نہیں کیا جاسکتا۔ طالب علم رہنما کے طور پر 1967 کے دوران مجھے حکومت مخالف نعرے لگانے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ مجھے کئی ایک حکومت مخالف الزامات کے تحت عدالتی تحویل میں رکھا گیا۔ موجودہ حکومت کے دوران عام انتخابات کے ملتوی کیئے جانے کے اعلان کے فوراً بعد مجھے عدالتی تحویل (نظر بندی) میں لیا گیا۔ بلاشبہ میں بھی مارشل لا کا مخالف ہوں اور یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ چونکہ میں مارشل لا کا مخالف ہوں اس لئے ملزم جام ساقی کیلئے آیا ہوں، جو اس حکومت کے مخالف ہیں۔ میں نے عدالت کے روبرو حلف لیا ہے اور میں نے جو کچھ کہا ہے وہ جام ساقی سے متعلق میرا اپنا نقطۂ نظر ہے۔

عدالتی سوالات

سوال: اپنے بیان میں آپکا کہنا تھا کہ آپ چار مرتبہ عدالتی تحویل میں رہے ہیں، کیا آپکو کبھی کوئی سزا سنائی گئی؟

جواب: جی ہاں، یحیٰ حکومت کے دوران مجھے سمری ملٹری کورٹ نے دو مرتبہ سزا سنائی، پہلی مرتبہ ایک سال قید کی سزا پر مجھے تقریباً تین ماہ بعد رہا کیا گیا جبکہ دوسری سزا پر مجھے اس وقت کی حکومت نے چار ماہ کے بعد رہا کر دیا۔

بیگم طاہرہ مظہر علی خان (56 سال، کھیتر ن)

سکنہ:3-شاہ جمال، لاہور-12

میں آل پاکستان انجمن جمہوریت پسند خواتین کی جنرل سیکریٹری ہوں۔ میں1969 سے جام ساقی کو جانتی ہوں۔ میں نے ملزم جام ساقی کو ایک شاندار محبِ وطن اور مہذب فرد پایا ہے۔

خواتین کا کردار:

اتفاق کرتی ہوں کہ دنیا بھر میں خواتین کی کئی تنظیمیں ہیں اور انکی مرکزی تنظیم وومین انٹرنیشنل ڈیموکریٹک فیڈریشن ہے۔ 8 مارچ خواتین کے عالمی دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یہ دن پہلی جنگِ عظیم کے دوران جنگ کی مخالفت اور عالمی امن اور خواتین کے حقوق کیلیے جدوجہد کے طور پر منایا جانے لگا۔

جہیز کی حد پانچ ہزار تک محدود رکھنے کا قانون تو موجود ہے تاہم اس پر عمل درآمد نہیں ہوتا۔ اتفاق کرتی ہوں کہ خواتین کی تمام تنظیمیں پاکستان میں جہیز کے خلاف جدوجہد کر رہی ہیں۔ جہیز سے متعلق مضامین تحریر کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ رسالوں/جرائد پر مکمل سنسرشپ عائد ہے۔ عدالتی دستاویز ایم-4، سرخ پرچم کے صفحہ نمبر 16 پر امریکی خواتین سے متعلق ایک مضمون دیکھ رہی ہوں۔

17 دسمبر 1981 کے ہفت روزہ ویو پوائنٹ لاہور کا اور مغربی خواتین سے متعلق 28 جنوری 1983 کو روزنامہ ڈان میں شائع ہونے والا مضمون پیش کر رہی ہوں، عدالتی دستاویز-6- میں

نہیں سمجھتی کہ دنیا کے کسی بھی ملک میں خواتین کے حقوق سے متعلق کچھ لکھنا کوئی جرم ہے۔

کم اُجرت یافتہ محنت کش:

کم اُجرت پانے والے محنت کشوں اور انکی اُجرت کا تقابل کرنے سے متعلق لکھنا کوئی جرم نہیں ہے۔ یہاں پر صارفین سے متعلق مارچ 1982 کے دوران ایک ورکشاپ پر ایک رسالہ پیش کررہی ہوں۔ عدالت نے اسکا معائنہ کرکے گواہ کو واپس کردیا۔

مارشل لا:

مارشل لا سے میری مراد لوگوں پر تسلط، تمام تر تنقید کو کچلنا، ذرائع ابلاغ پر مکمل کنٹرول اور اپنے اقتدار کے دوام کیلیئے اپنے قانون بنانا ہے۔ عاصمہ جیلانی مقدمے میں اپنے فیصلے میں سپریم کورٹ کا کہنا تھا، اور میں اسکا حوالہ دیتی ہوں۔

’برطانیہ میں اس وقت مارشل لا نے مختلف تناظر حاصل کیے ہیں۔ اپنے بنیادی ماخذ میں یہ شاید اُن قوانین سے متعلقہ تھی جن کے ذریعے اندرونِ اور بیرونِ ملک افواج میں کسی نوعیت کا ضابطہ نافذ کرنا ہو۔ اس تناظر میں مارشل لا کی یہ قسم آج کل فوجی قانون کے طور پر جانی جاتی ہے اور دورِ امن میں مختلف دساتیر جیسا کہ آرمی ایکٹ، نیوی ایکٹ اور ایئر فورس ایکٹ کے تحت لاگو ہوتی ہے۔ یہ اپنے اختیارات سویلین قانون ساز ادارے کی جانب سے تفویض کردہ اختیارات سے حاصل کرتی ہے۔ بین الاقوامی قانون میں، مارشل لا سے مراد جنگی حالات میں کسی کمانڈر کو حاصل اختیارات ہیں۔ اس حوالے سے، جیسا کہ ایک مرتبہ ڈیوک آف وِلنگٹن نے ہاؤس آف لارڈز میں کہا تھا، کہ یہ ’فوج کی سربراہی کرنے والے جنرل کی منشا کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔‘ (پی ایل ڈی)

موجودہ حکومت کی قانونی حیثیت:

1973 کے آئین کی شق 6 کہتی ہے کہ، ’کسی آئینی حکومت کا تختہ اُلٹنا انتہائی بغاوت سمجھا جائے گا اور آئین کو معطل کرنے والے سزا کے مستوجب ہوں گے۔‘ سپریم کورٹ

کے فیصلے کے تحت مارشل لا کو فقط نوے روز کیلئے قانونی حیثیت دی گئی تھی، جس دوران عام انتخابات کا انعقاد ہونا اور اقتدار منتخب نمائندوں کے سپرد ہونا تھا۔ موجودہ حکومت غیر قانونی ہے اور سیاسی لوگوں کی گرفتاری بھی غیر قانونی ہے۔ میں موجودہ حکومت کیلئے غاصب کا لفظ جرم نہیں سمجھتی اور میں اُس وقت اپنی توہین سمجھتی ہوں جب موجودہ حکمران جنرل ضیا اپنے بیرونی دوروں کے دوران دنیا کے سامنے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ پاکستان کے ساڑھے آٹھ کروڑ لوگوں کے نمائندہ ہیں۔ پاکستان میں ' سپریم کورٹ ' بنی ہوئی فوجی عدالتوں کے علاوہ عدلیہ کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ موجودہ حکومت نے عبوری آئینی حکم نامے (پی سی او) کے تحت خود کو قانونی قرار دیا ہے جس پر جسٹس دراب پٹیل اور جسٹس فخر الدین جی ابراہیم نے شدید تنقید کی ہے۔ روزنامہ اسٹار مورخہ 23 جنوری 1983 اور روزنامہ ڈان مورخہ 17 جنوری 1983 کے تراشے پیش کر رہی ہوں۔ عدالتی دستاویز۔

ایگزبیٹ ایم 5 (d) میں نے دیکھی ہے جس میں شامل مضمون میں وکلا کی ہڑتال کا ساتھ دینے کی اپیل کی گئی ہے۔ اسی نوعیت کا مضمون ڈیلی نیوز مورخہ 31 جنوری 1983 کو شائع ہوا ہے اور جو عدالت کو پیش کیا جا رہا ہے۔ عدالتی دستاویز۔

میں جام ساقی سے آخری مرتبہ لاہور ہائی کورٹ میں ملی جہاں دو سو سے زائد افراد نے جام ساقی کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ جام ساقی پر پاکستان کے مختلف صوبوں کے درمیان نفرت پیدا کرنے کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے ہمیشہ پاکستان کے تمام صوبوں کے استحصال زدہ لوگوں کی ایکتا، اپنائیت اور نجات کیلئے کام کیا ہے۔

کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان پر پابندی:

کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان پر 1954 میں پابندی عائد کی گئی جو کہ 1973 میں ایک آئینی حکومت کے وجود میں آنے کے بعد اُٹھالی گئی۔ اس وقت دیگر تمام سیاسی جماعتوں کی طرح یہ بھی ممنوع ہے۔ 1973 کا آئین پاکستان کے قانونی حیثیت رکھنے والے نمائندگان نے تشکیل دیا۔ اس سے اتفاق کرتی ہوں کہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سمیت سیاسی جماعتوں پر

عائد پابندی پاکستان کی عوام کے منتخب نمائندگان کے اقتدار میں آتے ہی ختم ہوجائے گی۔ پاکستان میں جب بھی فوجی حکومت آتی ہے تو کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں پر مکمل پابندی عائد کردی جاتی ہے۔

ایران:

ایرانی انقلاب پر مضمون لکھنا کوئی جرم نہیں ہے اور موجودہ حکومت نہ جانے کیوں اس معاملے پر جبر کررہی ہے۔ اس طرح کے مضامین تحریر کرنے والے مصنفین لوگوں کے سامنے سامراجی مفادات کو ظاہر کرتے ہیں۔ کسی بھی ملک میں اسلحہ سب سے زیادہ طاقتور نہیں ہوتا۔ عوام ہی سب سے بڑی طاقت ہیں۔ میں عدالتی دستاویز ایم-4، صفحات 11 تا 15 (سرخ پرچم) سے متفق ہوں۔

بیگم نسیم شمیم اشرف ملک (کاکے زئی)

بنت: امام الدین قریشی، عمر: 49 سال

سکنہ: 7-بدر اسٹریٹ، فلیمنگ روڈ، لاہور

جام ساقی کی جانب سے ایگزامنیشن انچیف

میں 1974 تک نیشنل عوامی پارٹی کی نائب صدر تھی۔ میں انجمن جمہوریت پسند خواتین پنجاب کی صدر رہوں۔ اس وقت میں پاکستان نیشنل پارٹی کی مرکزی ایگزیکٹو کمیٹی کی رکن ہوں۔ میں ملزم جام ساقی کو 1968 سے جانتی ہوں۔ اُن سے تعارف کے دن سے میں نے انہیں کبھی بھی سماج دشمن یا ریاست دشمن سرگرمیوں میں ملوث نہیں پایا۔ میں انہیں اپنا بھائی سمجھتی رہی ہوں۔ میں نے جام ساقی کو پاکستان کے مختلف صوبوں میں مختلف طبقات کے درمیاں نفرت اور اشتعال پیدا کرتے ہوئے نہیں پایا۔ مجھے یقین ہے کہ ملزم جام ساقی نے ایسی کسی سرگرمی میں حصہ نہیں لیا ہوگا جو پاکستان کے مختلف صوبوں کے درمیان منافرت پیدا کرنے کا باعث بنے۔ ملزم جام ساقی نے کبھی بھی مسلح افواج کے خلاف بات نہیں کی ہے۔ وہ یقیناً اُس فوجی ٹولے کے خلاف ہیں جو مسلح افواج اور عوام کے درمیان اختلافات پیدا کرتا ہے اور جو فوج کو سیاست کیلئے استعمال کرتا ہے۔ جام ساقی نے ریاست کے خلاف کبھی غداری نہیں کی البتہ وہ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کیلئے ہمیشہ آواز اُٹھاتے رہے ہیں۔

جرح:

میں میٹرک پاس ہوں اور جہلم سے جی وی میں سند یافتہ ہوں۔ میں نے کئی مرتبہ مختلف اجلاسوں اور جلوسوں میں حصہ لیا ہے۔ مجھے موجودہ حکومت کے دوران 22 روز کیلئے جیل میں قید رکھا گیا جبکہ سابقہ حکومت کے دوران میں گھر پر نظر بند تھی۔ میں جام ساقی کے خلاف عائد کئے گئے الزامات سے آ گاہ ہوں۔ اپنی گرفتاری سے قبل وہ مجھے آخری مرتبہ لاہور میں ملے تھے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ جام ساقی موجودہ حکومت کا اسکے اقتدار میں آنے کی وجہ سے مخالف ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ جلوس وغیرہ منظّم کرنے پر مکمل پابندی ہے، تاہم اسکے باوجود جلوس نکالے جاتے ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ جام ساقی کبھی بغاوت/غداری کا مرتکب ہوا ہے۔

مجیب پیرزادو

عمر:38سال

4- گلیکسی II، کہکشاں،کلفٹن8،کراچی

جام ساقی کی جانب سے جرح

میں پیشے کے لحاظ سے سپریم کورٹ آف پاکستان کا وکیل ہوں۔67-1966 کے دوران سندھ یونیورسٹی انجنیئرنگ کالج جامشورو کی طلبہ یونین کا صدر منتخب ہوا۔ میں1977 میں سکھر سے سندھ اسمبلی کا رکن منتخب ہوا۔اس انتخاب کیلئے مجھے پیپلز پارٹی نے ٹکٹ دیا تھا۔ میں ملزم جام ساقی کو1967 سے جانتا ہوں جب وہ طالب علم تھے۔ وہ ایک اچھے اخلاقی کردار کے حامل ایک عام طالب علم تھے جو کہ طلبہ سیاست میں انتہائی سرگرم تھے۔

الزامات مسترد:

بیگم نصرت بھٹو مقدمے میں سپریم کورٹ کے فیصلے نے اس حکومت کو نوے روز کے اندر انتخابات کرانے کی غرض سے قانونی جواز فراہم کیا تھا جبکہ اس عرصے کے دوران آئین معطل رہنا تھا۔ چونکہ موجودہ حکومت انتخابات منعقد کرانے میں ناکام رہی ہے اس لئے آخری قانونی فراست کے تحت اسکو غاصب کہا جا سکتا ہے، جو کہ عاصمہ جیلانی مقدمے کی صورت میں واضع ہے۔

نظریہ:

پاکستان کے تاحال بننے والے کسی بھی آئین میں نظریۂ پاکستان کی تشریح نہیں کی گئی

ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ نظریۂ پاکستان کا نعرہ کسی مارشل لاحکومت نے دیا تھا۔ میرے اپنے ذاتی خیال میں برصغیر کے مسلمان اپنے لئے ایک علیحدہ وطن چاہتے تھے، جو کہ ہندستان کے مسلمان اکثریتی صوبوں پر مشتمل ہو۔

استغاثے کی جرح

مجھے جام ساقی پر عائد کیے جانے والے الزامات کا علم نہیں ہے۔ مجھے طالب علمی کے بعد جام ساقی کی سرگرمیوں کا کوئی علم نہیں ہے۔ اپنی طالب علمی کے دوران وہ سرگرم تھے اور ون یونٹ کے خاتمے کا مطالبہ کرنے والوں میں شامل تھے۔ یہی مطالبہ عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی سمیت تمام جماعتوں کا تھا۔ حکومت کے خلاف احتجاج کرنا جرم نہیں ہے، یہاں تک کہ ہم اپنے حقوق کیلئے اُنکے پاس جاتے ہیں اور مطالبات کرتے ہیں کیونکہ ہر چیز حکومت کے اختیار میں ہوتی ہے۔ قانون کی جانب سے واضع طور پر ممنوعہ قرار دیئے جانے کے علاوہ کسی بھی نوعیت کے مواد کی اشاعت اور تقسیم کوئی جرم نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آیا مارشل لاحکومت نے کسی مواد کی اشاعت پر پابندی عائد کی ہوئی ہے یا نہیں۔ مجھے ہر روز اخبارات میں مارشل لا پر تنقید کرتا ہوا مواد نظر آتا ہے یہاں تک کہ سیاسی جماعتیں اپنے اجلاس بھی منعقد کرتی رہتی ہیں۔ عدالتی دستاویز ایم-5 کی سرخی سے مجھ پر واضع نہیں ہو رہا ہے کہ یہ کس کو مخاطب کر رہی ہے۔ ایم-5 ہلچل کے آخری صفحے پر مجھے جنرل ضیا کا نام درج کیا ہوا نظر آ رہا ہے۔

20 فروری 1983

منہاج برنا برائے سہیل سانگی

میں اردو ادب میں ایم اے اور گذشتہ تیس برس سے صحافی ہوں۔ میں نے روزنامہ امروز، پاکستان ٹائمز اور دی مسلم کے ساتھ کام کیا ہے۔ ان دنوں میں لندن سے تعلق رکھنے والی ساؤتھ پبلیکیشنز سے وابستہ ہوں۔ میں نے مختلف موضوعات پر انگنت مضامین لکھے ہیں۔ میں نے تاحال کوئی کتاب نہیں لکھی ہے۔ میں پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس سے وابستہ اور دو مرتبہ جنرل سیکریٹری اور دو مرتبہ اسکا صدر رہا ہوں۔ اس وقت میں آل پاکستان نیوز پیپرز ایمپلائیز کنفیڈریشن (APNEC) کا چیئرمین ہوں۔ یہ دونوں یونینیں صحافیوں اور ذرائع ابلاغ کے کارکنوں کی یونین ہیں۔ ذرائع ابلاغ رائے عامہ کا ادارہ ہیں اور اسکو پارلیمان، انتظامیہ اور عدلیہ کے بعد ریاست کا چوتھا ستون سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ میں گذشتہ تیس برس سے ذرائع ابلاغ کے ساتھ وابستہ ہوں، اس لئے کئی اجلاسوں اور کاروائیوں کا احاطہ کر چکا ہوں۔ اس امر سے اتفاق کرتا ہوں کہ عملی طور پر تمام جماعتیں کچھ رکاوٹوں/پابندیوں کے ساتھ کام کر رہی ہیں کیونکہ انکو کالعدم قرار دیا جا چکا ہے۔ حکومت کا مختلف سیاسی جماعتوں کی جانب مختلف رویہ ہے۔ 1973 کے آئین میں مارشل لا کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نظر نہیں آتی جہاں کسی فوجی جنرل نے ملک کا انتظام چلانے کیلئے اقتدار سنبھالا ہو۔ اتفاق کرتا ہوں کہ موجودہ حکومت سے قبل ایک آئینی نمائندہ حکومت برسرِ اقتدار تھی۔ جہاں تک نظریۂ پاکستان کا تعلق ہے تو مجھے ایسی کوئی مثال نظر نہیں آتی جہاں نظریۂ پاکستان کی قانونی یا عدالتی طور پر تشریح کی گئی ہو۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ قائداعظم اور علامہ اقبال کے کہے ہوئے اور 1940 کی قراردادِ لاہور کے

مندرجات کوتصورِ پاکستان سمجھنا چاہئے۔ یہاں پر دسمبر 1982 کے ہفت روزہ ویو پوائنٹ لاہور میں شائع ہونے والا مضمون 'قائد کے تصورات' پیش کر رہا ہوں۔ عدالت نے اسکا جائزہ لیا اور عدالتی دستاویز 'وائی ائی' کے طور پر شامل کیا۔

نظریات کی ارتقا: سماجی علوم وقت گذرنے کے ساتھ اور لوگوں کی ضروریات کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ سوشلزم ایک اقتصادی نظام ہے۔ کئی ایک علما بشمول علامہ اقبال، حسرت موہانی، مولانا عبیداللہ سندھی اور یہاں تک کہ خود قائداعظم نے واضح کیا ہے کہ اسلام اور سوشلزم میں کوئی تضادنہیں ہے۔ اسلام دولت کے چند ہاتھوں میں ارتکاز کا مخالف ہے اور سوشلزم کا بھی دولت سے متعلق یہی موقف ہے۔

نظریہ اور ادب کے موضوع پر زینو کی جانب سے 18 فروری 1983 کے روزنامہ ڈان میں تحریر کیا گیا ایک مضمون پیش کر رہا ہوں۔ عدالتی دستاویز۔

پریس آرڈیننس: پریس اینڈ پبلیکیشن آرڈیننس کی مذمت کی گئی ہے اور لگ بھگ تمام سیاسی جماعتیں مارشل لا کے ساتھ عدم اتفاق کرتی ہیں اور کسی بھی اخبار کی اشاعت کیلئے حکومتی اجازت نامہ حاصل کرنے کوختم کرنے کی استدعا کرتی ہیں، جس کیلئے پرنٹنگ مشین اور اخبار کی اشاعت دونوں کیلئے حکومتی اجازت نامہ لینا پڑتا ہے۔ کسی کتاب کی اشاعت کیلئے ایسے کسی اجازت نامے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پریس اینڈ پبلیکیشن آرڈیننس میں شامل ایک شق کے تحت حکومت پر تنقید کرنا جرم ہے جو کہ غیر جمہوری ہے۔ حکومت کے خلاف مواد کی اشاعت کو جرم اور پریس یا ایڈیٹر یا ناشر کو ایسے مواد کی اشاعت پر مجرم قرار دینا غیر جمہوری ہے۔ سائیکلو اسٹائل مشین اور فوٹو اسٹیٹ مشین رکھنے کیلئے کسی اجازت نامے کی ضرورت نہیں ہوتی، اسی طرح سائیکلو اسٹائل پر کوئی مواد شائع کرنے یا کسی مخصوص کلب، جماعت یا تنظیم کے اراکین کیلئے کوئی مواد یا نیوز لیٹر شائع کرنے کیلئے بھی کسی اجازت نامے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

تبدیلی کیلئے جدوجہد: اتفاق کرتا ہوں کہ عوام کے منتخب نمائندے ضرورت کے تحت آئین میں ترامیم کرتے ہیں۔ کسی سیاسی نظام کیلئے پرچار یا جدوجہد کوئی جرم نہیں ہے۔ مختلف سیاسی جماعتیں

قائداعظم کے اقوال کی اپنے طور پر تشریح کرتی ہیں اور یہی کچھ حکومت بھی کرتی ہے۔ سیاسی اہداف و مقاصد پر مختلف آرا کوئی جرم نہیں ہے، جیسا کہ صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے کے معاملے پر ہم نے دیکھا۔

ایرانی انقلاب: میں صفحہ نمبر۔۔۔۔۔ پر ایرانی انقلاب سے متعلق رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔ پاکستان کی عوام نے اسکا خیر مقدم کیا تھا۔ صدر ضیا اور وزیرِ خارجہ یعقوب نے بار ہا کہا ہے کہ پاکستان کسی بھی ملک کو اڈے فراہم نہیں کرے گا۔ اس لئے جب کوئی کہتا ہے کہ پاکستان کو اپنے پڑوسی افغانستان کے خلاف ایک اڈے کے طور پر استعمال کیے جانے کی اجازت نہیں دینی چاہیے، تو یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ میں انقلابی جمہوری محاذ کے عدالتی دستاویز ایم-4 میں دیئے گئے موقف کی تائید کرتا ہوں۔ اتفاق کرتا ہوں کہ پاکستان کی زیادہ تر سیاسی جماعتیں ملک کو امریکی پلڑے میں ڈالنے کی مخالف ہیں۔ 18 جنوری 1983 کو روزنامہ امن میں شائع ہونے والے ریٹائرڈ جنرل ٹکا خان کا موقف پیش کر رہا ہوں، جس میں وہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان عالمی طاقتوں کی لڑائی سے خود کو دور رکھے۔ عدالت نے بیان کا جائزہ لیکر گواہ کو واپس کر دیا۔ سرخ پرچم کے صفحہ نمبر 3 پر بھی ایسے ہی موقف کا اعادہ کیا گیا ہے۔

تمام سیاسی جماعتیں مارشل لا کے خاتمے اور جمہوریت کی بحالی کا مطالبہ کر رہی ہیں کیونکہ وہ مارشل لا کو ملکی مفاد میں نہیں سمجھتیں۔ میں مارشل لا پر تنقید کو سوویت یا افغان موقف کی توثیق نہیں سمجھتا بلکہ اسکو ملک کے ہر محبِّ وطن شہری کا فرض سمجھتا ہوں۔ میں 20 جنوری 1983 کو روزنامہ امن میں ٹکا خان کے شائع ہونے والے موقف کی تائید کرتا ہوں۔ میں ملزم سہیل سانگی کو گذشتہ دس برس سے جانتا ہوں کیونکہ وہ پی ایف یو جے کے رکن رہے ہیں۔ سہیل سانگی ناپید، سچے اور ایماندار صحافیوں میں سے ایک ہیں۔ میں سہیل سانگی کو محبِّ وطن سمجھتا ہوں۔

جام ساقی کی جانب سے جرح: یہ درست ہے کہ ایک حکومت کی جانب سے غدار قرار دیئے جانے والے لوگ دوسری حکومت کی نظر میں محبِّ وطن بن جاتے ہیں، مثلاً مولوی عبدالحق ایک حکومت کی جانب سے غدار قرار دیئے گئے تو دوسری کی جانب سے محبِّ وطن۔ ارباب نیاز احمد راولپنڈی سازش کیس میں ملزم تھے جبکہ موجودہ حکومت میں وہ وزیر ہیں۔ مسلح افواج پر تنقید کو ملکی مفادات میں جرم کے طور پر نہیں دیکھا جانا چاہئے، درحقیقت بسا اوقات تنقید خود ادارے کی بہتری کے حق

میں ہوتی ہے۔ ملک کا کوئی بھی ادارہ تنقید سے بالاتر نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ پاکستان کو افغانستان کے خلاف اڈے کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت نہیں دینی چاہئے، کو افغانستان کا موقف قرار نہیں دیا جا سکتا۔

استغاثے کی جرح: ملزم سہیل سانگی نے میرے ساتھ کبھی کسی اخبار میں کام نہیں کیا یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ وہ محبّ وطن نہیں ہیں۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ رسائل / جرائد اور اخبارات میں عام طور پر اداریئے تحریر کیے جاتے ہیں۔ میں نے عدالتی دستاویز ایم-4 دیکھی ہے اور میری نظر میں یہ کتاب ہے نہ ہی رسالہ، بلکہ یہ ایک طرح کا مراسلہ ہے۔ ایم-4 جیسے مراسلہ جیسی اشاعت کیلئے اجازت نامہ حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس کی مخالفت کرنے والا صحافی ہوں۔ مجھے اس مقدمے میں نہ تو گرفتار کیا گیا اور نہ ہی جیل بھیجا گیا۔ میں سہیل سانگی پر عائد کیے گئے الزامات سے ناواقف ہوں، تاہم عمومی طور پر جانتا ہوں کہ انکے خلاف تخریبی مواد شائع اور تقسیم کرنے، مختلف طبقات میں منافرت پھیلانے اور نظریۂ پاکستان کے خلاف کام کرنے کے الزامات ہیں جو کہ درست نہیں ہیں۔ میں نے عدالتی دستاویز ایم-4 کا اداریہ نمبر ایک دیکھا ہے اور اس میں موجودہ حکمرانوں کیلئے استعمال کیے گئے لفظ 'غاصب' کو غیر درست قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہ عوام کے قانونی طور پر منتخب نمائندے نہیں ہیں۔ مارشل لا ضابطہ نمبر 4 گواہ کو پڑھ کر سنایا گیا، جس پر انکا جواب تھا کہ وہ کسی مارشل لا ضابطے کو قانونی اور آئینی نہیں سمجھتے اور نہ ہی مارشل لا حکومت کو قانونی اور آئینی سمجھتے ہیں۔ میں ایگزیبیٹ ایم-4 کے اداریئے کے آخری فقرے کو جرم نہیں سمجھتا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے غلط بیان دیا ہے۔ میں نے یہ بیان اپنے ضمیر کے مطابق دیا ہے۔

منہاج برنا کی جانب سے پیش کی جانے والی اشاعتیں:

1- ہفت روزہ ویو پوائنٹ، قائداعظم کا قول

2- روزنامہ ڈان، 'نظریہ اور ادب' مصنف زینو

3- روزنامہ امن، سابق چیف آف آرمی اسٹاف ٹکا خان کا بیان

شیخ علی محمد برائے سہیل سانگی

عمر:58سال

پتہ:5،صحافی کالونی،حیدرآباد

پیشے کے لحاظ سے میں ایک صحافی ہوں اور گذشتہ 37 برس سے اس پیشے کے ساتھ منسلک ہوں۔ میں نے اپنے کام کا آغاز روزنامہ ھلال پاکستان سے کیا، بعدازاں میں نے روزنامہ کارواں حیدرآباد، روزنامہ عبرت اور1969 میں روزنامہ ھلال پاکستان میں کام کیا۔ 1972 سے آج تک میں روزنامہ آفتاب حیدرآباد کے ایڈیٹر کی حیثیت میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہوں۔میں نے تحریکِ پاکستان میں حصہ لیااور مسلم لیگ کے ایک کارکن کے طور پر انگنت اجلاسوں اور جلوسوں میں شرکت کی۔ میں نے پاکستان کے سماجی، معاشی اور سیاسی پہلوؤں پر لاتعداد مضامین تحریر کیے ہیں۔ان دنوں میں سندھ کی صحافی برادری کی نمائندگی کرتے ہوئے مجلس شوریٰ کا رکن ہوں۔ میں سہیل سانگی کو گذشتہ کم از کم آٹھ سال سے صحافی کے طور پر جانتا ہوں۔ میں حیدرآباد پریس کلب کے علاوہ حیدرآباد یونین آف جرنلسٹس کا بھی بانی رکن رہا ہوں۔ملزم سہیل سانگی حیدرآباد پریس کلب کے علاوہ حیدرآباد یونین آف جرنلسٹس کے بھی سرگرم رکن رہے ہیں۔وہ حیدرآباد پریس کلب کے جنرل سیکریٹری بھی رہے ہیں۔ملزم سہیل سانگی پریس کلب کے ایک رکن کے طور پر میرے ساتھ انگنت مرتبہ ملتے رہے ہیں جبکہ اسکے علاوہ بھی ہم آپس میں کئی مرتبہ مل چکے ہیں۔ایک صحافی کے طور پر میں نے انکو وفادار، پرخلوص، محنتی اور پیشہ ورانہ طور پر اہل پایا ہے۔

ملزم سہیل سانگی روزنامہ سندھ نیوز حیدرآباد میں کام کرتے رہے ہیں اور جولائی 1980 میں اس اخبار کے عملے کی تعداد میں تخفیف کی گئی۔آخری مرتبہ میں ملزم سہیل سے کراچی پریس کلب میں جولائی 1980 میں ملا۔ انہوں نے مجھے کسی بھی اخبار میں کام دلانے کی درخواست کی اور اس ملاقات کے فوراً بعد، شاید وہ گرفتار ہوگئے اور ہماری دوبارہ ملاقات نہیں ہوسکی۔ میں سندھ کے زیادہ تر صحافیوں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں اوران سے رابطے میں رہا ہوں۔ اس لئے انکے کردار، اہلیت اور سماجی روابط پر تبصرہ کرسکتا ہوں۔میرے علم میں نہیں ہے کہ آیا سہیل سانگی کا کسی بھی سیاسی جماعت سے کوئی سیاسی تعلق ہے یا نہیں۔نہ ہی میں نے اُنہیں کبھی سیاست میں حصہ لیتے ہوئے دیکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ سہیل سانگی جام ساقی کے چچازاد بھائی ہیں اور انکی جام ساقی کے مقدمے کے سلسلے میں گرفتاری میرے لئے حیرانگی کی بات تھی کیونکہ وہ نہ تو سیاستدان تھے اور نہ ہی نمایاں صحافی جو کہ ایسی سرگرمیوں میں ملوث ہو۔میں نے محسوس کیا کہ انہیں فقط اس لئے گرفتار کیا گیا ہے کہ وہ جام ساقی کے چچازاد بھائی ہیں۔ میں نے انہیں محبّ وطن پاکستانی پایا۔ میں نے انہیں کبھی بھی ایسی سرگرمیوں میں ملوث نہیں دیکھا جن کے باعث مختلف صوبوں کے مختلف پرتوں اور طبقات میں کوئی منافرت یا مسلح افواج کے خلاف نفرت پیدا ہو۔

صحافی یونینوں اور تنظیموں نے سہیل سانگی کی آزادی کا مطالبہ کیا ہے۔میں ان ملزمان سے، ماسوائے جام ساقی کے، کسی سے کبھی نہیں ملا۔ملزم سہیل سانگی میری موجودگی میں کبھی بھی کسی ملزم سے نہیں ملا۔

میں نے سہیل سانگی سے متعلق کوئی پیشہ ورانہ شکایت، بشمول محکمۂ اطلاعات نہیں سُنی۔ اگراُن کے خلاف کوئی شکایت وغیرہ ہوتی تو مجھ سے مخفی نہیں ہوتی۔

میں انکو پاکستان کا ایک پرامن اور معصوم شہری سمجھتا ہوں اوران پر عائد تمام الزامات کو غلط سمجھتا ہوں۔

جام ساقی کی جانب سے جرح: اس وقت تمام سیاسی جماعتیں کالعدم ہیں اور کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان پر کوئی خصوصی پابندی نہیں ہے۔کسی حکومت پر تنقید کرنا یا اسکی مخالفت کرنا کوئی جرم نہیں

ہے۔ میں جام ساقی کو محبّ وطن سمجھتا ہوں۔ وہ طالب علموں کے رہنما تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ جام ساقی سیاسی قیدی ہے اور کسی بھی مجرمانہ اور/یا اخلاقی جرم میں ملوث نہیں ہے۔

استغاثہ کی جانب سے جرح: مجھے ابڑو خاندان کے ساتھ اُنسیت ہے اور میرے پاس بدر ابڑو کے دادا مرحوم علی خان ابڑو کی تحریر کردہ کئی کتب ہیں۔ مجھے سہیل سانگی پر عائد کیے گئے کچھ الزامات کا علم ہے۔ اپنے پیشہ ورانہ ایام کے دوران، میں نے روزنامہ آفتاب کے ایڈیٹر کے طور پر کبھی بھی کوئی علیحدہ ہفت روزہ یا ماہوار رسالہ شائع نہیں کیا۔ اداریہ ہوتا ہے تاہم یہ لازمی نہیں ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ سہیل سانگی پاکستان کا محبّ وطن شہری نہیں ہے۔ اگرچہ مارشل لا پر تنقید جرم ہے تاہم پاکستان کی عوام کے مفادات کے خلاف، حکومتی عمل اور پالیسیوں پر تنقید کرنا ہر ایک کا حق ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ سہیل سانگی ریاست دشمن سرگرمیوں میں ملوث رہے ہیں۔

عدالتی سوالات

سوال: سہیل سانگی نے آپ کے ساتھ کس اخبار میں کام کیا؟

جواب: انہوں نے کسی بھی اخبار میں میرے ساتھ کام نہیں کیا۔

سوال: کیا آپ سہیل سانگی کو ایک انقلابی صحافی کے طور پر دیکھتے ہیں یا نہیں؟

جواب: میں نے انہیں ایماندار اور محنتی صحافی پایا ہے۔

سوال: کیا حالیہ مارشل لا سے قبل، کیمونسٹ پارٹی آف پاکستان پر کوئی پابندی تھی؟

جواب: شاید کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان پر پابندی تھی۔

سوال: کیا کسی پارٹی پر پابندی عائد کرنے کیلئے 1973 کے آئین میں قانونی طریقۂ کار موجود ہے؟

جواب: جی ہاں۔

سوال: کیا کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان پر 1973 کے آئین کے تحت پابندی تھی؟

جواب: میں اس ضمن میں پُر اعتماد نہیں کہ اس پر 1973 کے آئین کے تحت پابندی عائد تھی، میں یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا۔

6 فروری 1983

افضل صدیقی

ملت مارکیٹ نزد شمع سینما، ڈرگ کالونی نمبر 2

میں گذشتہ 25 برس سے صحافی کے طور پر کام کر رہا ہوں۔

سائیکلو اسٹائل مشین اور ڈکلریشن:

سائیکلو اسٹائل مشین کیلئے انتظامیہ سے اجازت نامہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور سائیکلو اسٹائل مشینیں آسانی سے میسر ہوتی ہیں اور کوئی بھی انہیں خرید کر سکتا ہے۔ سائیکلو اسٹائل اشاعت کیلئے حکومت سے کوئی ڈکلریشن / اجازت نامہ درکار نہیں ہوتا۔ میں اس سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ کسی کتاب کی اشاعت کیلئے بھی اجازت حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ صرف اراکین میں تقسیم کی غرض سے پمفلٹ / کتاب کی اشاعت کیلئے بھی متعلقہ اختیاری سے کسی اجازت نامے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ گیس، پیٹرول اور دیگر اشیائے صرف کی قیمتوں میں کمی سے متعلق کئی سیاسی رہنماؤں اور طلبہ / مزدور رہنماؤں کی جانب سے مطالبہ کیا جاتا ہے اور مذکورہ بالا افراد کا نقطۂ نظر حکومت تک پہنچانے کی غرض سے یہ خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

انسانی حقوق:

میں نے عدالتی دستاویز آر آر-2، اقوام متحدہ کا اعلامیہ برائے انسانی حقوق دیکھا ہے اور اس کے مندرجات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں، جس پر پاکستان نے بھی اقوام متحدہ کے ایک رکن ملک کے طور پر اس پر دستخط کیے ہوئے ہیں۔ یہاں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ تمام ممالک ہر سال 10 دسمبر کو یومِ انسانی حقوق مناتے ہیں۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ موجودہ حکومت میں پاکستان کے لوگوں کو بنیادی حقوق حاصل نہیں ہیں اور 1973 کا آئین ایک طویل عرصے سے معطل ہے۔ یہ درست ہے کہ اخبارات نے اس حکومت کی جانب سے کوڑے لگائے جانے والے افراد کی

تصویریں شائع کی ہیں۔ پاکستان میں قوانین کو اسلامی قوانین کے ساتھ مطابقت میں لانے کا کوئی نظام موجود نہیں ہیں۔ 10 جنوری 1983 کے روزنامہ جنگ میں شائع ہونے والے زیڈ اے سلہری کے ایک مضمون میں کہا گیا ہے کہ صدر ضیاالحق نے کہا ہے کہ کوڑے مارنے کا نظام ہمیں برطانوی حکومت سے ورثے میں ملا ہے۔ پاکستان کی جغرافیائی اور سیاسی صورتحال پر بھی اپنا موقف دینا چاہوں گا۔ یہاں پر عدالتی دستاویز پیش کر رہا ہوں۔ دنیا کے مختلف ممالک میں ہونے والی ہڑتالوں سے متعلق خبریں شائع کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ عدالتی دستاویز ایم-4، سرخ پرچم کے صفحات 17 تا20 دیکھ رہا ہوں۔ یہ کولمبیا میں ہڑتال پر نقطۂ نظر ظاہر کر رہے ہیں۔ ڈیلی نیوز بتاریخ 19 جنوری 1983 کا تراشہ بھی پیش کر رہا ہوں، جس میں بھارت میں سب سے بڑی صنعتی ہڑتال کا ذکر ہے۔ عدالتی دستاویز-25 جنوری 1983 کو روزنامہ ڈان میں شائع ہونے والی خبر عندیہ دیتی ہے کہ ایف 16- کی ٹیکنالوجی کی منتقلی کے ضمن میں امریکہ پاکستان کو اسرائیل اور مصر جتنا قریب سمجھتا ہے۔

ایم-4 (صفحہ نمبر 17) پر ایک مضمون ہے، 'زکوۃ کے نام پر ٹیکس'۔ زکوۃ اُس نئے ٹیکس کو نام دیا گیا ہے جو موجودہ حکومت نے عائد کیا ہے۔ یہاں پر 18 جنوری 1983 کے روزنامہ جنگ کا ایک تراشہ پیش کر رہا ہوں، جس میں مولانا عبدالستار نیازی نے اسی طرح کے موقف کا اظہار کیا ہے۔ عدالتی دستاویز۔

دیگر سیاسی جماعتوں کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان بھی ممنوع ہے۔ کمیونسٹ مواد پر کوئی پابندی نہیں ہے، جو کہ مقامی مارکیٹ میں میسر ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک کو خیر سگالی کے پیغامات بھیجنا کوئی جرم نہیں ہے۔ 17 جنوری 1983 کو روزنامہ جنگ میں شائع ہونے والی اُس خبر کا تراشہ پیش کر رہا ہوں جس میں جماعت اسلامی کے نائب امیر مولانا جان محمد عباسی اعلان کرتے ہیں کہ وہ موجودہ حکومت کے اسلام کو نہ چاہتے ہیں اور نہ ہی قبول کرتے ہیں اور یہ اسلام کے نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ 30 جنوری 1983 کے روزنامہ جنگ میں محمود اعظم فاروقی کا بھی اسی نوعیت کا بیان شائع ہوا ہے۔ دونوں بیانات کے قومی اخبارات سے تراشے پیش

کرر ہا ہوں۔ عدالتی دستاویز

بانئ پاکستان قائداعظم نے نظریہ پاکستان کی تشریح کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی، اس لئے ہر سیاسی جماعت اسکی اپنے طور پر تشریح کر رہی ہے۔ میں نے عدالتی دستاویز ایم 5 (ای) دیکھی ہے، جس میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان نے عوام کو اقتدار حاصل کرنے کیلئے تیار رہنے کی اپیل کی ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل ایک منظّم ادارہ ہے جس نے ضمیر کے قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا ہے جبکہ 24 جنوری 1983 کے روزنامہ نوائے وقت میں بھی ضمیر کے قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ عدالتی دستاویز ایم-4 (صفحہ 6) دیکھی ہے جس میں ایک مضمون ہے کہ موجودہ حکومت آزادانہ اور منصفانہ انتخابات نہیں کرا سکتی، یہی بات 3 جنوری 1983 کو روزنامہ جنگ میں شائع ہونے والے یوسف ہارون کے بیان میں بھی کی گئی ہے۔

-جرح کیلئے سماعت اگلے روز تک ملتوی۔

(افضل صدیقی صاحب پیش نہیں ہوئے، 7 فروری 1983 کو دیگر گواہان کو برتا گیا۔ صدیقی صاحب کی جرح 9 فروری 1983 کو ہوئی)

9 فروری 1983

افضل صدیقی: استغاثہ کی جرح

میں نے جام ساقی کو پہلی مرتبہ اُس وقت دیکھا جب مجھے عدالت میں انکے حق میں گواہی دینے کیلیئے بلایا گیا۔ میں جام ساقی کے خلاف عائد کیے گئے الزامات سے آگاہ ہوں۔اگرچہ میں نے انہیں دیکھا پہلی مرتبہ ہے لیکن ایک صحافی ہونے کے ناطے انکی ماضی کی سرگرمیوں سے متعلق جانتا ہوں۔اگرچہ مجھے انکے تحریر کیے ہوئے کسی مضمون کا عنوان تو یاد نہیں لیکن سیاسی اُمور پر انکے تحریر کیے ہوئے کئی مضامین پڑھ چکا ہوں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ موجودہ مارشل لاحکومت میں کسی سائیکلو اسٹائل پمفلٹ/مواد کی اشاعت کیلیئے حکومتی اجازت نامہ ضروری ہے۔اس ضمن میں کوئی مارشل لا ضابطہ نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ موجودہ حکومت کے دوران حدود آرڈیننس کے ساتھ وفاقی شرعی عدالت بھی ہے۔ یہ درست ہے کہ حدود آرڈیننس کے تحت سزا کے طور پر کوڑے بھی مارے گئے ہیں۔ مارشل لا سے میری مراد مسلح افواج کی حکومت / قانون ہے۔ مارشل لا اُس ملک میں ایک آئینی حکومت کا تختہ اُلٹ کر لگایا گیا ہے جہاں فوجی عدالتوں،شرعی عدالت اور سول عدالتوں کی صورت میں سہ جہتی عدالتی نظام ہے۔ جب بھی ملک میں مارشل لا لگتا ہے تو کوئی دوسرا قانون نہیں چلتا تاہم موجودہ دور میں تین قوانین زیرِ عمل ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ میں سرخ پرچم کے صفحہ نمبر تین کے اداریہ (عدالتی دستاویز ایم-4) میں کی گئی بات سے اتفاق کرتا ہوں،جس میں جنرل ضیا کو سربراہِ مملکت کے طور پر غاصب قرار دیا گیا ہے، میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ موجودہ مارشل لاحکومت غاصب ہے۔ میں سندھی نہیں جانتا۔ فوجی عدالتوں کی جانب سے مجرمان کو کوڑوں کی دی جانے والی سزاؤں کی خبریں اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی پر سابقہ حکومت کے دوران پابندی عائد کی گئی۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ کمیونزم سے متعلق مواد پر کوئی پابندی ہے۔

ازسرِ نو جرح: 1973 کے آئین کے تحت کوئی سیاسی جماعت بنانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔1973 کے آئین میں واضع کیا گیا ہے کہ کسی سیاسی جماعت پر پابندی کیلئے سپریم کورٹ سے رجوع کیا جائے گا۔کمیونسٹ پارٹی کی خلاف سپریم کورٹ میں ایسا کوئی مقدمہ نہیں تھا۔

شیخ عزیز برائے سہیل سانگی

سکنہ: بی-63، حسین ڈی سلوا ٹاؤن، نارتھ ناظم آباد، کراچی

میں لندن یونیورسٹی سے منسلک تھامسن فاؤنڈیشن آف جرنلزم سے صحافت میں گریجویٹ ہوں۔ میں گذشتہ پچیس برس سے صحافی ہوں۔ میں نے تین طبعزاد کتابیں لکھی ہیں جبکہ دو کتابیں مرتب کی ہیں، جن میں سے ایک 'نقشِ لطیف' محکمۂ اطلاعات سندھ نے شائع کی ہے۔ میری ایک کتاب 'عملی صحافت' سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت میں پڑھائی جاتی ہے۔ میں نے ثقافت اور تاریخ پر 1500 سے زائد مضامین اور کتابوں پر تبصرے تحریر کیے ہیں۔ میں سندھی، اردو اور انگریزی زبانوں کا مصنف ہوں۔ میرے اردو میں تحریر کیے ہوئے مضامین روزنامہ جنگ، اخبارِ جہاں اور روزنامہ حریت میں شائع ہو چکے ہیں۔ میں روزنامہ عبرت، روزنامہ سندھ نیوز، روزنامہ سندھ آبزرور، روزنامہ جنگ اور روزنامہ حریت میں سب ایڈیٹر، نیوز ایڈیٹر اور میگزین ایڈیٹر کے طور پر کام کرتا رہا ہوں۔

میں سندھ یونیورسٹی میں صحافت کے مضمون کا وزیٹنگ پروفیسر تھا۔ ملزم سہیل سانگی نے میرے ساتھ اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر کام کیا ہے جب میں روزنامہ سندھ نیوز کا بانی ایڈیٹر تھا۔ یہاں پر سہیل سانگی کا شناختی کارڈ سیریل نمبر 46/77 بہ عہدہ چیف سب ایڈیٹر پیش کرر ہا ہوں، جس پر میرے دستخط موجود ہیں۔ سہیل سانگی نے ہمارے ساتھ کوئی ساڑھے چار سال تک کام کیا، جس کے بعد انہوں نے نوکری چھوڑ دی۔ میں ملزم سہیل سانگی کو 1976 سے جانتا ہوں جب انہوں نے ملازمت کیلئے درخواست دی تھی۔ ملازمت کے دن سے، میں نے سہیل سانگی کو کسی

بحث مباحثے یا سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میرے ادارے میں مختلف مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے افراد کام کر رہے تھے۔ اتفاق کرتا ہوں کہ وہ اچھے کردار کے حامل ہیں اور ایک اچھا لڑکا جو کبھی بھی سماج دشمن، ریاست دشمن سرگرمیوں میں ملوث نہیں رہا۔ وہ اچھے کردار کا حامل ہے۔

جرح:

وہ میرے ساتھ لگ بھگ بارہ گھنٹے کام کرتا تھا۔ میرے خیال میں اُس سے میں آخری مرتبہ جولائی 1980 میں ملا۔ مجھے اخبارات سے معلوم ہوا کہ سہیل سانگی کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس پر کیا الزامات عائد کیے گئے ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ سہیل سانگی موجودہ مارشل لا حکومت کے خلاف مواد تحریر، شائع اور تقسیم کر رہا تھا۔ اس طرح کا مواد اُن تمام اخبارات میں شائع ہوتا رہتا ہے جن میں میں نے کام کیا ہے۔ میں نے ملزم سہیل سانگی کو کسی سے ریاست دشمن سرگرمیوں سے متعلق بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا، یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کیونکہ وہ ملازم کے طور پر میرے ساتھ تھا۔

عدالتی سوال:

1- کیا آپ نے سہیل سانگی کو حکومت یا ریاست کے خلاف کوئی مضمون لکھتے ہوئے دیکھا؟

جواب: نہیں، میں نے اُسکو ایسا کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

غنی درس

میں نے سندھ یونیورسٹی سے ایم اے اسلامی تاریخ کیا ہوا ہے اور آجکل روزنامہ عبرت میں میگزین ایڈیٹر ہوں۔ میں سہیل سانگی کو1976 سے جانتا ہوں۔ میں حیدرآباد پریس کلب کا رکن ہوں۔ سہیل سانگی حیدرآباد یونین آف جرنلسٹ کے رکن جبکہ میں اسکا صدر تھا۔ سہیل سانگی میرے ساتھ پریس کلب میں شام کو ملتے رہے ہیں۔ سہیل سانگی1976 سے 1980 تک سب ایڈیٹر اور ایڈیشن انچارج رہے ہیں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں سہیل سانگی اچھے کردار کے حامل ہیں اور میں نے انہیں کبھی بھی سیاسی/ سماج دشمن/ ریاست دشمن سرگرمیوں میں ملوث نہیں پایا۔ وہ ایک معتبر صحافی تھے۔

جرح:

1976 سے قبل میرا سہیل سانگی سے کوئی میل جول نہیں تھا۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ اخبارات میں ملازمت کرنے والوں کو کچھ پیشہ ورانہ تجربہ ہوتا ہے۔ مجھے سہیل سانگی پر عائد الزامات کی قطعی تعداد تو یاد نہیں ہے، تاہم کچھ الزامات سے آگاہ ہوں جو اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ سہیل سانگی موجودہ مارشل لا کے خلاف افواہیں اور نفرت پھیلانے میں حصہ لیتا رہا ہے، نہ ہی میں نے اس ضمن میں کسی اور سے سُنا ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ سہیل سانگی پریس کلب کے اجلاسوں میں سیاست کو زیرِ بحث لاتا رہا ہے۔ اخبارات کے ذریعے سہیل سانگی کے خلاف عائد الزامات کا سُن کر مجھے تعجب ہوا تھا کیونکہ میں اُن کو ایک معزز

شخص اور ذمہ دار صحافی کے طور پر جانتا ہوں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ روزنامہ عبرت میں میرے تحت حصے میں سوشلزم اور کمیونزم سے متعلق مضامین شائع ہوتے ہیں۔ میں نے کبھی بھی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ میں موجودہ مارشل لا کے دوران کراچی سنٹرل جیل میں نظر بند رہا ہوں۔ یہ صحافیوں کے مطالبات پر ایک ملک گیر تحریک تھی جس دوران چار سے پانچ ہزار صحافی گرفتار ہوئے، بعد ازاں حکومت نے ہمارے خلاف الزامات واپس لئے اور میں آزاد ہوگیا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے ریاست دشمن سرگرمیوں میں حصہ لیا اور گرفتار ہوا۔ میں سہیل سانگی سے متعلق اپنا نقطۂ نظر انہیں صحافی کے طور پر ذاتی حیثیت میں جاننے کی بنیاد پر دے رہا ہوں۔

یکم مارچ 1983

محمود شام

ذات: راجپوت، ساکن: ای 262 بلاک 3، گلشن اقبال، کراچی

میں پیشے کے لحاظ سے گذشتہ 22 سال سے صحافت سے وابستہ ہوں۔ میں نے اپنے کام کی ابتدا نوائے وقت میگزین ایڈیٹر کے طور پر کی۔ میں 1967 کے دوران ہفت روزہ اخبارِ جہاں چلا گیا۔ میں 1970 میں روزنامہ مساوات لاہور کا کراچی کے لئے نمائندہ ہوا۔ 1972 میں دوبارہ اخبارِ جہاں کے ایڈیٹر کے طور پر بحال ہوا۔ جنوری 1976 میں، میں نے اپنا رسالہ ہفت روزہ 'معیار' متعارف کرایا۔ اس وقت میں ہفت روزہ معیار کے ناشر ایڈیٹر کے طور پر کام کر رہا ہوں۔

میں کئی ایک ایسے سیاستدانوں اور عالموں سے تعلق میں آیا ہوں جنہوں نے قیامِ پاکستان میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا ہے۔ صحافی کے طور پر میں کئی غیر ملکی دورے کر چکا ہوں، جیسا کہ سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ چین، سوویت یونین، بھارت، امریکہ وغیرہ کے دوروں پر۔ میں نے کئی کتابیں تحریریں کی ہیں، جن میں مختلف سیاستدانوں کے انٹرویوز پر مشتمل 'روبرو' بھی شامل ہے۔ میں سہیل سانگی کو گذشتہ آٹھ نو برس سے جانتا ہوں، وہ ہفت روزہ معیار کے حیدرآباد نمائندے کے طور پر کام کر چکے ہیں۔ پیشہ ورانہ طور پر میں نے سہیل سانگی کو ایک ایماندار، ذمہ دار اور قابلِ اعتماد فرد پایا ہے۔ مجھے انکی تحریروں میں کبھی بھی ریاست مخالف سرگرمیوں کا کوئی شائبہ نہیں ہوا اور نہ ہی میں نے انہیں ایسی سرگرمیوں میں ملوث پایا ہے۔ وہ پاکستان کے ایک محبّ وطن شہری تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ سہیل سانگی ملزم جام ساقی کے چچازاد بھائی ہیں، جوکہ بائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں۔

میں نے تحریک پاکستان پر کئی کتابیں پڑھی ہیں اور شیخ عبدالمجید سندھی، میاں ممتاز دولتانہ،

مولانا عبدالحمید بھاشانی، خان عبدالقیوم خان اور نورالامین جیسی سیاسی شخصیات کے نہ صرف انٹرویوز کیے ہیں بلکہ تحریک پاکستان سے متعلق انکی تقاریر بھی سُنی ہیں۔ میری جانکاری کے مطابق پاکستان اس لئے قائم کیا گیا کہ اس ریاست میں مسلمان اپنی اقتصادی آزادی اور برابری حاصل کرسکیں۔ میں بانئ پاکستان قائداعظم کے خیالات کو پاکستان کی تخلیق کیلیئے سب سے زیادہ درست اور قابلِ قدر سمجھتا ہوں۔

عدالت نے 'سماجی انصاف اور اسلامی سوشلزم' کے موضوع پر کتاب 'افکارِ قائداعظم' سے 26 مارچ 1948 کو قائداعظم کی چٹاگانگ میں کی گئی تقریر کے اقتباسات سُنے۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ پاکستان کا قیام 1940 اور1946 کی قراردادوں کی بنیاد پر ہوا، جن میں وفاقی اکائیوں کو آزاد ریاستیں ظاہر کیا گیا ہے۔

میں اپنی بات کو واضع کرنے کی غرض سے 22 مئی 1946 کے اخبارات میں قائداعظم کے شائع ہونے والے بیان کا حوالہ دینا چاہتا ہوں، جس میں انہوں نے کہا تھا، 'چھ صوبے یعنی پنجاب، سرحد، بلوچستان، سندھ، بنگال اور آسام ایک گروپ میں ہوں۔ یہ صوبے خارجہ امور، دفاع اور مواصلات کے علاوہ، جو کہ کسی بھی ملک کی دفاعی ضروریات کے لئے ناگزیر ہوتے ہیں، تمام دیگر امور کیلیئے ذمہ دار ہوں۔ 'بہ حوالہ کتاب' افکارِ قائداعظم' کے صفحہ نمبر 290 سے لیا گیا ہے۔

موجودہ وفاقی وزیرِ قانون شریف الدین پیرزادہ کی مرتب کی ہوئی کتاب 'پاکستان منزل بہ منزل' سے مولانا مودودی کے ایک قول کا حوالہ دیتا ہوں 'ایک وفاق بین الاقوام جو وفاق شدہ اقوام کی ایک ریاست ہوگا جہاں ہر قوم مقتدر ہوگی اور اپنی ثقافتی آزادی اور خودمختاری کی حامل ہوگی۔'

اتفاق کرتا ہوں کہ قائدِ اعظم نے اپنی کسی بھی تقریر میں یہ نہیں کہا کہ اس ملک میں مارشل لا نافذ کیا جائے گا۔ انہوں نے مسلح افواج کو ہمیشہ قوم کی خدمت کرنے کی تلقین کی اور حکومت چلانا سیاستدانوں کا ہی کام بتایا۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ قائداعظم نے ایک راسغ العقیدہ

مذہبی ریاست کی مخالفت کی۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ 1973 کا آئین مارشل لا کی اجازت نہیں دیتا۔

اسلام میں مستقل فوج کا کوئی تصور نہیں ہے۔ موجودہ حکومت اسلامی ہونے کی دعویدار ہے، اور اسلام میں اس کا کوئی تصور نہیں ہے۔ پروفیسر غفور احمد کا ایک بیان پیش کر رہا ہوں جس میں انہوں نے مارشل لا کی غیر اسلامی ہونے کی بنیاد پر مخالفت کی ہے۔ یہ 5 فروری 1983 کے روزنامہ امن میں شائع ہوا ہے۔ عدالت نے یہ بیان دیکھ کر گواہ کو واپس کر دیا۔ مارشل لا نافذ کرنے کا بنیادی مقصد نوے روز کے اندر عام انتخابات منعقد کرا کے اقتدار منتخب نمائندوں کے سپرد کرنا تھا۔ یہاں پر 28 فروری 1983 کو روزنامہ نوائے وقت میں شائع ہونے والے جنرل چشتی کے انٹرویو کا تراشہ پیش کر رہا ہوں (عدالتی دستاویز) جس میں انہوں نے موجودہ مارشل لا اور منتخب عوامی نمائندوں کو اقتدار کی منتقلی سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

میں اتفاق کرتا ہوں کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل ایک ایسی تنظیم ہے جو سیاسی قیدیوں، انکے خاندانوں اور ساتھیوں کو خطوط بھیجتی رہتی ہے۔ ایسے کسی خط کو وصول کرنے یا تشہیر کرنے کو میں جرم نہیں سمجھتا۔ تمام سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کی آزادی کا مطالبہ کرنا ہر پاکستانی شہری کا حق ہے اور ایسی تحریکیں اندرونِ اور بیرونِ ملک موجود ہیں۔ سیاسی جماعتوں کے اراکین دیواروں پر چاکنگ کرکے، پوسٹر لگا کر اور اجلاس منعقد کرکے سیاسی رہنماؤں کی آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ تحریک بحالیٔ جمہوریت نے 24 فروری 1983 کو 'سیاسی قیدیوں کا دن' منایا، جس دوران تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ جب بھی امریکی بحری بیڑہ کسی ملک کے ساحل پر آتا ہے تو اس ملک کے لوگ چوکنا ہو جاتے ہیں اور میں انکے آنے کو کسی ملک کی حکومت کی حمایت کے طور پر دیکھتا ہوں۔ ایسے امور پر کوئی موقف اختیار کرنے یا اس کے متعلق کچھ تحریر کرنے کو میں جرم نہیں سمجھتا۔

شاہ ایران کو امریکہ کا پولیس مین سمجھا جاتا تھا اور وہ سامراجی مفادات کا تحفظ کرتا تھا۔ شاہ ایران کے زوال کے بعد، خلا پیدا ہو گیا ہے جس کو کسی اور ایجنٹ کے ذریعے پُر کیا جانا ہے۔

پاکستان کی موجودہ حکومت کسی حدتک امریکی مفادات کی نگہبانی کررہی ہے۔امریکہ، ایران اور افغانستان کی موجودہ حکومتوں کا مخالف ہے۔میں اتفاق کرتا ہوں کہ پاکستان، ایران اور افغانستان کی عوام پاکستان کے موجودہ حکمرانوں کے ذریعے امریکی منصوبوں کو بھانپ رہی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ محبّ وطن پاکستانیوں کا نقطۂ نظر امریکہ مخالف ہونا چاہئے۔موجودہ حکومت امریکی سامراج مخالف لوگوں پر ایران، افغانستان اورسوویت یونین کے ایجنٹ ہونے کا الزام عائدکرتی ہے۔

مختلف سیاسی جماعتوں کا پاکستان کی خارجہ پالیسی پرمختلف نقطۂ نظر ہےاور یہ حکومت سےبھی مختلف ہوسکتا ہے۔جماعت اسلامی کے علاوہ، باقی تمام سیاسی جماعتیں پاکستان میں بسنے والے افغان مہاجرین کوخطرہ سمجھتی ہیں۔وہ پاکستان کیلئے ایک اقتصادی اورسماجی ذمہ داری ہوں گے۔افغان معاملے پر پاکستان کی موجودہ پالیسیاں مکمل طور پرغیر جانبدارتحریک کی رکنیت سے متصادم ہیں۔

میں انقلابی جمہوری محاذ (ایم-4بی عدالتی دستاویز) میں شائع ہونے والے مضمون سے اتفاق کرتا ہوں اوراس میں افغانستان سے متعلق بیانات کسی بھی طور پرغیر محبّ وطن نہیں ہیں۔میں افغانستان کے مسئلے پرمضمون تحریرکرنے کوجرم نہیں سمجھتا۔

سوشلزم اورکمیونزم پرکوئی قانونی پابندی نہیں ہے۔اتفاق کرتا ہوں کہ سوشلزم اور کمیونزم میں طبقات کا کوئی تصورنہیں ہےاورسوشلزم کمیونزم کا پہلا مرحلہ ہے۔میں صلاح الدین ناسک کی کتاب افکارِسیاست کے باب41،صفحہ433 پیرا تین سے اتفاق کرتا ہوں، جوسوشلزم کی تشریح کرتا ہےاور جوکہ 1973 کے آئین پاکستان کی شق 3 کے ساتھ مماثلت رکھتا ہے۔سوشلزم کا پرچار کرنا پاکستان اور اسلام کے مفاد میں اور1973 کے آئین پاکستان کے عین مطابق ہے۔

ملزم سہیل سانگی سے میری آخری ملاقات انکی گرفتاری سے دو روز قبل ہوئی تھی۔وہ اپنی ملازمت کیلئے سفارش کرانے میرے پاس آئے تھے۔

استغاثے کی جرح:

یہ کہنا درست ہوگا کہ روزناموں اور رسائل میں اداریئے تحریر کیے جاتے ہیں جبکہ کتابوں کے اداریوں کو پیش لفظ کہا جاتا ہے۔ میں ایم-4اے اور ایم-4بی کو رسالہ یا کتابچہ سمجھتا ہوں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ سہیل سانگی اچھے کردار کے حامل نہیں ہیں۔ میں نے اپنے بیان میں اپنے ضمیر کے مطابق اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ میں موجودہ مارشل لا کے دوران دو مرتبہ نظر بند رہا ہوں۔ ایک مرتبہ دو ماہ کیلئے اور دوسری مرتبہ پانچ دن کیلئے۔ میں سہیل سانگی کے خلاف الزامات سے پوری طرح آ گاہ ہوں۔

عدالتی سوالات:

سوال 1: آ پکی تعلیمی قابلیت کیا ہے؟

جواب: میں ایم اے فلسفہ ہوں۔

سوال 2: کیا آپ نے کبھی نظریۂ پاکستان کی تشریح پڑھی ہے؟

جواب: نہیں، میں نے ایسی کوئی تشریح نہیں پڑھی۔

اقبال جعفری

برائے احمد کمال وارثی

میں گریجویٹ ہوں۔ میں ذرائع ابلاغ کے کئی اداروں میں کام کرتا ہوں۔ میں ڈیلی نیوز کا رپورٹر، روزنامہ جنگ انٹرنیشنل، لندن کا ریزیڈنٹ نمائندہ، کراچی نمائندہ برائے یو پی آئی (افریقہ)، کراچی نمائندہ برائے ہفت روزہ ویو پوائنٹ لاہور، ڈینمارک ریڈیو کیلیئے پاکستان نمائندہ اور بی بی سی کو جزوقتی خبریں فراہم کرتا ہوں۔ میں نے صحافت کا آغاز پی پی آئی اور روزنامہ سن کے ایسوسی ایٹ ایڈیٹر کے طور پر کیا۔ میں صحافی ہوں اور ملک کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی حالات سے آگاہ ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ اگرچہ سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کی گئی ہے تاہم کچھ سیاسی جماعتوں کی سرگرمیاں تاحال جاری ہیں اور درحقیقت وہ دیگر سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ اپنی مرکزی کمیٹیوں کے اجلاس بھی منعقد کرتی ہیں۔ یہ سب کچھ ریکارڈ پر موجود ہے اور یہ روزانہ اخبارات میں شائع ہورہا ہے کہ سیاسی جماعتیں عام انتخابات کے انعقاد، مارشل لا کے خاتمے، 1973 کے آئین کی بحالی، شہری حقوق کی بحالی کا مطالبہ کررہی ہیں۔ یہ درست ہے کہ تمام سیاسی جماعتیں مارشل لا کی مخالفت اور فوری عام انتخابات کا مطالبہ کررہی ہیں۔ بیگم نصرت بھٹو بخالف ریاست مقدمے میں سپریم کورٹ نے موجودہ حکومت کو نوے روز کے اندر عام انتخابات منعقد کرانے کیلیئے اقتدار میں رہنے کی اجازت دی تھی۔ تمام سیاسی جماعتوں میں اتفاق رائے ہے کہ

مارشل لا عام انتخابات منعقد کرانے کیلئے نافذ کیا گیا تھا۔ مارشل لا کی مخالفت ریاست دشمن سرگرمی نہیں ہے۔ حکومت کی مخالفت کرنے اور ریاست سے غداری کرنے میں بہت فرق ہے۔ یہ درست ہے کہ غداری ریاست کے خلاف ہوتی ہے جبکہ حکومت پر تنقید ہوتی ہے۔ معاشرے کی خامیوں کو واضح کرنا صحافت کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ صحافت کا ایک بنیادی فریضہ حکومت کی کمزوریوں کو ظاہر کرنے کے ساتھ لوگوں کے مسائل کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ لوگ جمہوریت کی بحالی اور مارشل لا کا خاتمہ چاہتے ہیں جبکہ صدر ضیا اپنی ہر تقریر میں کہتے رہتے ہیں کہ مارشل لا جاری نہیں رہے گا اور یہ ملک کیلئے اچھی بات ہے۔ این بی سی (امریکہ) کے پروگرام میٹ دی پریس میں اپنے ایک انٹرویو کے دوران اُنکا کہنا تھا کہ وہ پاکستان کی نمائندگی کیلئے منتخب نہیں کیے گئے ہیں اور وہ دو برس کے اندر عام انتخابات کا انعقاد کریں گے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ مارشل لا پر تنقید فوج پر تنقید ہے، مثلاً مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے مارشل لا نافذ کیا اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن گئے اور اُس مارشل لا پر تنقید فوج پر تنقید نہیں تھی۔ عمومی طور پر بین الاقوامی ذرائع ابلاغ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کیلئے مسلسل لکھ رہے ہیں۔

میں یہاں پر 11 جنوری 1983 کے روزنامہ جنگ کا صفحہ اول اور آخر پیش کر رہا ہوں جو کہ عدالتی دستاویز کے طور پر شامل ہیں۔ میں نے 1982 کیلئے ایمنسٹی انٹرنیشنل کی پاکستان کے متعلق رپورٹ دیکھی ہے، جس میں ملزم کمال وارثی اور دیگر کو ضمیر کا قیدی قرار دیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملزمان انسانوں کے حقوق کیلئے کام کر رہے ہیں جو کہ بنیادی ضروریات، عزت واحترام اور برابری پر مبنی ہیں۔ 13 دسمبر 1982 کو روزنامہ امن میں 'اسلامی انسانی حقوق' کے عنوان سے شائع ہونے والے مضمون کا تراشہ پیش کر رہا ہوں۔ اقوام متحدہ کے اعلامیہ برائے انسانی حقوق سے متعلق ماہنامہ جفاکش کراچی کے نومبر-دسمبر 1981 کے شمارے کے صفحات 5 تا 8 بھی پیش کر رہا ہوں۔

میں کراچی پریس کلب میں منعقد ہونے والے اُس اجلاس میں موجود تھا، جس میں خطاب کرتے ہوئے جناب ولی خان کا کہنا تھا کہ اگر ملک میں فوری انتخابات کا انعقاد نہیں کیا گیا تو

ملک میں مسلح بغاوت ہوگی۔ انہوں نے جماعت اسلامی کا نام لیکر الزام عائد کیا تھا کہ جماعت افغان مجاہدین سے اسلحہ حاصل کر کے اپنے اراکین میں تقسیم کررہی ہے۔اپنی تقریر میں انہوں نے مارشل لا جاری رہنے کی صورت میں پاکستان کی انتہائی خطرناک تصویر پیش کی تھی۔انکا کہنا تھا کہ اگر جلد انتخابات منعقد کیے جاتے ہیں تو سیاستدان اس ملک اور فوجی ادارے کو بچا سکتے ہیں کیونکہ کسی سویلین رہنما نے کسی جنرل کو کبھی بھی پھانسی پر نہیں لٹکایا ہے۔ ولی خان کی تقریر سے متعلق روزنامہ امن میں تاریخ 6 جنوری 1982 کو شائع ہونے والی خبر کا تراشہ بھی پیش کرر ہا ہوں۔

ایک اور سیاسی جماعت جمعیت العلمائے اسلام اس نقطۂ نظر کی ہے کہ اسلام آباد اور کابل کے درمیان براہ راست مذاکرات ہونے چاہئیں۔6 جنوری 1983 کا روزنامہ امن پیش کرر ہا ہوں۔ جے یو آئی درخواستی گروپ کے بیان پرمبنی 6 جنوری 1983 کا روزنامہ امن کا بھی تراشہ پیش کر ہا ہوں۔خواجہ خیرالدین گروپ کے ملک قاسم اور قومی محاذ آزادی کے وائس چیئرمین پرویز صالح کے 20 دسمبر 1982 کو روزنامہ امن میں شائع ہونے والے بیانات کے تراشے بھی پیش کرر ہا ہوں۔ جناب ولی خان نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ جماعت اسلامی کو افغان مہاجر کیمپوں کا دورہ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے جبکہ دیگر جماعتوں کو اس سے محروم رکھا جاتا ہے۔ افغان مہاجرین کے رہنماؤں کو جماعت اسلامی کے طلبہ اور دیگر کارکنوں کے اجتماعات میں خطاب کرنے دیا جاتا ہے جو کہ افغانوں کے پاکستان کے سیاسی معاملات میں ملوث ہونے کے مترادف ہے۔ اُنکا مشورہ جماعت اسلامی کو اس طرح کی سرگرمیوں سے باز رکھنے کا تھا۔ یہاں پر 4 دسمبر 1982 کے روزنامہ امن کا تراشہ پیش کرر ہا ہوں۔عدالتی دستاویز۔

مجھے معلوم ہے کہ ولی خان کو موجودہ مارشل لا کے تحت پاکستان کی وزارت عظمیٰ کی پیشکش کی گئی تھی اور انہیں موجودہ حکومت کی جانب سے محبّ وطن قرار دیا گیا ہے۔

سرخ پرچم جنوری 1979 (ایم-4) صفحہ نمبر 11 پر شامل مندرجات اُسی نوعیت کے ہیں جیسا کہ 4 دسمبر 1982 اور 11 جنوری 1983 کو روزنامہ امن میں بیان کیے گئے ہیں۔ (عدالت نے تراشوں کا جائزہ لیا اور انہیں عدالتی دستاویز کے طور پر درج کیا)۔ جنرل ضیا نے

اپنے امریکی دورے کے بعد افغانستان، مشرق وسطیٰ اور ایران سے متعلق اپنے اسی نوعیت کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ روزنامہ امن کا 16 دسمبر 1982 کا تراشہ پیش کرر ہا ہوں۔ عدالت نے جائزہ لیا اور عدالتی دستاویز کے طور پر شامل کیا۔

نومبر 1982 میں روزنامہ جنگ میں وسیع تجربے کار اور جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے رکن رہنے والے اور مولانا مودودی کے ایک قریبی ساتھی ارشاد حقانی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ مارشل لا حکومت عام انتخابات منعقد کرانے میں مخلص نہیں ہے جبکہ وزیرِ داخلہ کا کہنا ہے کہ کوئی بھی ملک سیاست کے بغیر نہیں چل سکتا۔ روزنامہ جنگ کا 28 نومبر 1982 کا تراشہ پیش کرر ہا ہوں۔ عدالتی دستاویز

میں اُسی عدالتی دستاویز میں دسمبر 1982 کو روزنامہ جنگ کو سردار شیر باز مزاری کا دیا ہوا ایک انٹرویو بھی پیش کرر ہا ہوں۔

میں نے پاکستان کو قرضہ دینے کے حوالے سے عالمی بینک کی رپورٹ دی اکنامسٹ کے توسط سے دیکھی ہے، جس میں بینکوں کو قرضہ دینے کا اہل بنانے کی غرض سے محصولات کو کم از کم دو فیصد بڑھانے کی تجویز دی گئی ہے اور زکوۃ اس کا نتیجہ ہے۔ زکوۃ جمع کرنے کے عمل کو مولانا سراج احمد دینپوری نے ایک پریس کانفرنس میں 'احسن' اقدام قرار دیا ہے۔ 11 جنوری 1983 کے روزنامہ جنگ کا ایک تراشہ پیش کرر ہا ہوں۔ عدالتی دستاویز

سرخ پرچم عدالتی دستاویز ایم 4 کا صفحہ نمبر 17 دیکھ رہا ہوں، جو کہ عالمی بینک کا لگ بھگ ترجمہ ہے۔ میں 23 مئی 1982 کو روزنامہ امن میں شائع ہونے والے عبدالمجید خان کے مضمون سے اتفاق کرتا ہوں، جس میں کہا گیا ہے کہ افغانستان میں انقلاب کے بعد بے زمین کسانوں میں زمین تقسیم کی گئی، جس نے سامراجی طاقتوں اور افغانستان اور پاکستان میں انکے ایجنٹوں کو ناراض کردیا ہے۔ عدالتی دستاویز

جماعت اسلامی کے علاوہ باقی تمام سیاسی جماعتیں اس نقطۂ نظر کی ہیں کہ ہمیں ببرک کارمل حکومت کو تسلیم کر کے اسکے ساتھ براہ راست مذاکرات کرنے چاہئیں۔ میں یہاں پر 5

جنوری 1983 کو روزنامہ امن میں خان عبدالغفار خان کا شائع ہونے والا بیان پیش کر کر رہا ہوں۔ عدالتی دستاویز

میں سمجھتا ہوں کہ مطالعے کے انداز میں تبدیلی لانے، مختلف لوگوں سے ملنے اور مختلف نظریات کو سمجھنے سے عقل و شعور میں اضافہ ہوتا ہے۔ اپنی روزمرہ کی سماجی ضروریات کے پیش نظر ہمارے پاس سماجی علوم کے کئی شعبۂ جات ہیں، یہی وہ چیز ہے جس کی کسی مہذب معاشرے کو ضرورت ہوتی ہے۔ ہماری تمام تر یونیورسٹیوں میں مارکسزم کو علم سیاسیات کے ایک سبجیکٹ کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ یہ فلسفہ امریکہ سمیت دنیا بھر کے دانشوران کو اپنی جانب متوجہ کر رہا ہے۔ کئی ادارے ہیں جہاں مارکسزم پڑھایا جاتا ہے۔ کوئی بھی فلسفہ کبھی بھی کسی مخصوص خطے سے وابستہ نہیں ہوتا اور یہی درست اور آفاقی طور پر تسلیم شدہ امر ہے۔

میں اتفاق کرتا ہوں کہ صدر ضیا الحق نے گذشتہ ماہ چین کے اپنے دورے کے دوران کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے سیکریٹری جنرل سمیت دیگر پارٹی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں اور کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ کمیونسٹ ممالک چین اور سوویت یونین کے درمیان نقطۂ نظر کا اختلاف ہے۔ مختلف کمیونسٹ پارٹیاں اپنے ممالک کی معروضی صورتحال کے تحت کام کرتی ہیں اور ہوسکتا ہے کہ اسکے نتیجے میں اختلافات پیدا ہوئے ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کمیونزم نظریۂ پاکستان کے خلاف ہے، ویسے بھی تا حال نظریۂ پاکستان کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ جس طرح مختلف سیاسی جماعتیں نظریۂ پاکستان کی مختلف توضیحات کرتی ہیں، میں 1940 کی قراردادِ لاہور کو نظریۂ پاکستان سمجھتا ہوں۔

کمیونزم چونکہ ایک سماجی سائنس ہے اس لئے مذہب سے اُسکا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ قیامِ پاکستان سے مختلف رجحانات اور نقطۂ نظر رکھنے والی سیاسی جماعتیں اور حکومتیں معرض وجود میں آئی ہیں۔ یہ جماعتیں ملک کے تبدیل ہوتے ہوئے حالات کے پیش نظر اپنے موقف میں تبدیلی لاتی ہیں، جیسا کہ جماعت اسلامی پاکستان کی مخالفت اور بابائے قوم کو کافر اعظم کہنے والے موقف کو تبدیل کر کے ملک کی محافظ بن گئی ہے۔ جماعت اسلامی

اور جمعیت العلمائے پاکستان جیسی مذہبی جماعتیں اسلام سے متعلق ایک دوسرے سے قطعی مختلف مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتی ہیں اور ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتی ہیں۔ سویلین حکومت میں حزبِ مخالف کا ہونا ایک عام بات ہے۔ میں کئی ایک سیاستدانوں اور لاہور کے حسین نقی جیسے کئی صحافیوں کو جانتا ہوں جو پاکستان بننے کے بعد ہر حکومت میں جیل گئے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ سازش اور غداری جیسے سنگین مقدمات میں گرفتار کئے گئے افراد کو آنے والی حکومتوں نے رہا کر دیا ہے، جیسا کہ ولی خان اور اگرتلہ کیس میں شیخ مجیب الرحمان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ حکومتیں اپنی صوابدید پر شیرِ بنگال فضل حق جیسے لوگوں کو غدار یا محبّ وطن قرار دیتی ہیں۔

سائیکلو اسٹائل مشین یا فوٹو کاپی مشین رکھنے کیلئے کوئی اجازت نامہ درکار نہیں ہوتا۔ حکومت اشاعتی کاموں کیلئے پرنٹنگ پریس کی اجازت دینے کی تو اہل ہے تاہم سائیکلو اسٹائل مشین یا فوٹو کاپی مشین کیلئے ایسا کوئی اجازت نامہ درکار نہیں ہوتا۔ نظریۂ پاکستان سے میری مراد امن و آشتی کے ساتھ رہنا، تحریر وتقریر کی آزادی ہونا اور عزت واحترام کے ساتھ زندگی گذارنا ہے۔ یہ آفاقی سچائی ہے کہ حکومت، انتظامیہ، عدلیہ اور ذرائع ابلاغ ریاست کے ستون ہیں۔ یہ درست ہے کہ پاکستان میں طلبہ، مزدور اور وکلا موجودہ حکومت کی مختلف پالیسیوں کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔ مجھے یہی سکھایا گیا ہے کہ اسلام میں کسی مستقل فوج کا کوئی تصور نہیں ہے اور ہر مسلمان سپاہی ہے۔ ہر سیاسی جماعت کا موقف ہے کہ مارشل لا ختم ہو اور ملک میں عام انتخابات منعقد ہوں جو کہ ملک کے بہترین مفاد میں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پیپلز پارٹی کی وجہ سے موجودہ حکومت عام انتخابات منعقد کرانے سے ہچکچا رہی ہے کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ پیپلز پارٹی ان انتخابات میں کامیاب ہو جائے گی۔ پاکستان میں شراب نہ صرف سرکاری طور پر فروخت ہوتا ہے بلکہ کئی ایک ممالک کو برآمد کر کے حکومت اس سے محصولات کے ضمن میں انتہائی بڑی رقم بھی حاصل کرتی ہے۔

استغاثہ کی جانب سے جرح:

میں 1965 کے دوران صحافت میں آیا۔ کوئی بھی مجھے کامریڈ کہہ کر مخاطب نہیں کرتا۔ آج سے قبل ملزم کمال وارثی کے ساتھ میری کوئی شناسائی نہیں رہی ہے۔ مجھے انکے خلاف الزامات

کا پہلی مرتبہ اخبارات سے علم ہوا۔ سرخ پرچم کے یہ شمارے میں نے عدالت میں ہی دیکھے ہیں اور اس سے قبل کبھی نہیں دیکھے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ خبروں اور مضامین کے جو تراشے میں نے عدالت میں پیش کیے ہیں وہ پاکستان کے لوگوں میں نفرت نہیں پھیلاتے بلکہ وہ مختلف سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں کے موقف کا اظہار کرتے ہیں۔ اس وقت حکومت کی جانب سے ذرائع ابلاغ پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ حکومت کی جانب سے کوئی دباؤ نہ ہونے کی وجہ سے کسی بھی نوعیت کی خبر شائع ہوسکتی ہے۔ چونکہ میں اشاعتی شعبے کا ماہر نہیں ہوں اس لئے پرنٹنگ پریس اور سائیکلو اسٹائل کی اشاعت میں فرق نہیں کرسکتا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ سرخ پرچم (عدالتی دستاویز ایم-4) پرنٹنگ پریس میں شائع ہوا ہے یا سائیکلو اسٹائل پر۔ میں نہیں سمجھتا کہ پاکستان میں کمیونزم پر پابندی ہے۔ میں اردو پڑھ سکتا ہوں۔ میں نے سرخ پرچم جنوری 79 (ایم-4) کا صفحہ نمبر 3 پڑھا ہے اور نہیں سمجھتا کہ اس میں کوئی ایسی بات ہے جو لوگوں کو موجودہ حکومت کے خلاف اکساتی ہو۔ اخبارات پر مکمل سنسرشپ عائد تھی۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ صرف اراکین میں تقسیم کرنے کی غرض سے شائع کیے جانے والے خبرناموں کیلئے ڈکلیریشن حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جبکہ لوگوں میں تقسیم کیے جانے والے پمفلٹوں کی اشاعت کیلئے ڈکلیریشن کی شرط موجود ہے۔ میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کی 1982 سے متعلق رپورٹ سے اتفاق کرتا ہوں جو ان ملزمان کو ضمیر کا قیدی قرار دیتی ہے۔

جنوری 1983

بلوچ حاصل خان ولد میر غوث بخش

برائے امر لعل

عمر: 23 سال، اسلام۔نال ضلع خضدار

میں شعبۂ فلسفہ، بی اے (آنرس) کراچی یونیورسٹی کا طالب علم ہوں۔ میں کراچی یونیورسٹی کی یونائیٹڈ اسٹوڈنٹس موومنٹ کا چیئرمین ہوں، جس میں اسلامی جمعیت طلبہ کے علاوہ باقی تمام طلبہ تنظیمیں شامل ہیں۔ یہ درست ہے کہ موجودہ حکومت اور جماعت اسلامی جیسے انکے ایجنٹوں کی جانب سے طالب علم رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا ہے، تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور ہلاک تک کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں نذیر عباسی، شوکت چیمہ، قدیر عابد، حمید بلوچ کی ہلاکت اور چانڈکا میڈیکل کالج کے طالب علم اور ڈی ایس ایف کے رہنما گھنشام پرکاش کی گرفتاری کی مثال دی جا سکتی ہے۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ موجودہ حکومت کی مخالفت کرنے والے طلبہ کو گرفتار، تشدد کیا جاتا ہے اور سزائیں دی جاتی ہیں جیسا کہ حال ہی میں راولپنڈی اور ساہیوال میں کیا گیا ہے۔

طالب علم رہنما کے طور پر میں پاکستان کی سماجی اور اقتصادی صورتحال سے آگاہ ہوں۔ اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ سیاسی جماعتوں کی سرگرمیوں پر پابندی کے باوجود کچھ سیاسی جماعتیں کُلی یا جزوی سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور اخبارات میں انکی سرگرمیوں کی خبریں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ 30 اکتوبر 1982 کے روزنامہ امن کا تراشہ پیش کر رہا ہوں جس میں غوث بخش بزنجو اپنے بیان میں کہتے ہیں کہ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کیلئے تمام سیاسی جماعتوں کو متحد ہو کر کام کرنا پڑے گا۔ عدالت جائزہ لیتی ہے اور عدالتی دستاویز بناتی ہے۔

مجھے نظریۂ پاکستان کی وصف/ تشریح کا معلوم نہیں ہے۔ میرے خیال میں نظریۂ پاکستان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ چونکہ نظریۂ پاکستان کی کوئی ٹھوس تشریح نہیں ہے اس لئے میں نظریۂ

پاکستان کو 23 مارچ کی قرارداد کے طور پر دیکھتا ہوں۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ جمہوریت کی بحالی اور مارشل لا کا خاتمہ پاکستان کی عوام کی بنیادی ضرورت ہے۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ 1973 کے آئین کی بحالی اور پی سی او کی مخالفت لوگوں کے حق میں ہے، میں اتفاق کرتا ہوں کہ حکومت اور ریاست ایک نہیں ہیں۔ غداری ریاست سے ہوتی ہے نہ کہ حکومت سے، جس پر مخالفانہ تنقید ہوتی ہے۔

ایک طالب علم رہنما کے طور پر مجھے اس حکومت کے دوران طلبہ کو درپیش مختلف مشکلات بیان کرنے کا حق حاصل ہے۔ جب میں سیاسی رہنماؤں اور حکومتی اہلکاروں سے رابطہ کرتا ہوں تو متعلقہ اہلکاروں سے رابطہ کرنے اور انکے جوابات / ردِعمل حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا کرتا ہوں۔

یہ درست ہے کہ لوگ مارشل لا کے مخالف ہیں اور خود جنرل ضیا اپنے ایک بیان میں اسکا اعتراف کر چکا ہے۔ سیاسی رہنما طویل ہوتی ہوئی مارشل لا کے خلاف متحد ہونے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ نظریات میں تجربے اور وقت کے ساتھ نکھار آتا ہے۔ مارکسزم، سیاسیات، اقتصادیات اور تاریخ کے موضوعات یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ عدالت نے نصاب کا جائزہ لیکر واپس کر دیا۔

یہ درست ہے کہ سابقہ حکومت کے دوران بھی حکومت مخالف لوگوں، سیاسی رہنماؤں اور طالب علم رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا اور سزائیں دی گئیں۔ اتفاق کرتا ہوں کہ ایک حکومت کی جانب سے گرفتار کیے جانے والے رہنماؤں کو آنے والی حکومت رہا کر دیتی ہے چاہے اُن پر سنگین الزامات کیوں نہ ہوں۔ میں اپنے والد کی مثال دے سکتا ہوں جنہیں بھٹو حکومت نے ریاست دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے الزام میں گرفتار کیا اور انہیں موجودہ حکومت نے رہا کر دیا۔ اس ضمن میں اگرتلہ سازش کیس، راولپنڈی سازش کیس اور ایوب دورِ حکومت میں بھٹو کی نظر بندی کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ تمام ترقی پسند جماعتوں کو سیاسی شعور کی سزا دی جاتی ہے۔

میں نے سرخ پرچم، عدالتی دستاویز ایم-4 کا صفحہ نمبر 14 پڑھا ہے اور اس صفحہ پر اس عندیے کو محسوس کرتا ہوں کہ امریکہ کو پاکستان میں اپنے اڈے بنانے کے مواقع فراہم کیے گئے ہیں، جبکہ اس میں پاکستان کے مختلف طبقات میں نفرت پھیلانے، پاکستان، مسلح افواج اور مذہب کے خلاف نفرت پھیلانے پر مبنی مواد دیکھنے سے قاصر ہوں۔

استغاثہ کی جرح: میں سندھی نہیں سمجھتا، اور نہ ہی پڑھ سکتا ہوں۔ میں مادیت کے انداز سے فلسفہ پڑھتا ہوں۔ میں آئین پاکستان 1973 کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ 1973 کے آئین کے تناظر میں مجھ پر نظریۂ پاکستان واضع نہیں ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ 1940 کی قرارداد آئین پاکستان 1973 کی بنیاد ہے۔ سیاسیات، سماجی علوم، مارکسزم وغیرہ جیسے کئی موضوعات یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے ہیں کیونکہ یہ دنیا کے کئی ممالک میں موجود ہیں اور یہ طالب علم کے ادراک کو وسیع کرتے ہیں۔ میر غوث بخش بزنجو نو ماہ تک بلوچستان کے گورنر رہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ان نو ماہ میں طالب علم رہنماؤں کی جانب سے کوئی ریاست دشمن سرگرمی کی گئی ہو۔ میں اردو پڑھ سکتا ہوں۔ میں نے سرخ پرچم کے اداریہ نمبر 1 کا صفحہ نمبر 3، عدالتی دستاویز ایم-4 پڑھا ہے، اس میں غاصب جنرل ضیا اور اسکی حکومت بشمول وہ رجعت پسند جنرل جنہوں نے کامریڈ جام ساقی کو گرفتار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، کا ذکر ہے۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی زبان مختلف طبقات میں نفرت پھیلانے کا باعث نہیں بنتی۔

میری امر لال کے ساتھ کوئی قربت نہیں ہے۔ میں پہلی مرتبہ اُن سے مل رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ امر لال کے خلاف ریاست دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہونے کا الزام ہے۔ چونکہ میں امر لال سے آج پہلی مرتبہ ملا ہوں چنانچہ اسکی ماضی کی سرگرمیوں اور برتاؤ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

غازی صلاح الدین

برائے امر لال

سکنہ: گلستانِ قمر، نزد گول بلڈنگ، حیدرآباد

میں نے ایم اے کی تعلیم حاصل کی ہوئی ہے اور سندھ پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا صدر ہوں۔ میں اخبارات کا تفصیلی مطالعہ کرتا ہوں اور سماجی، اقتصادی اور سیاسی حالات سے بخوبی آگاہ ہوں۔ اگرچہ سیاسی جماعتیں کالعدم قرار دی گئی ہیں تاہم کچھ سیاسی جماعتوں کی خبریں اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ تقریباً تمام سیاسی جماعتیں اس نقطۂ نظر کی ہیں کہ عام انتخابات منعقد کرائے جائیں، سیاسی جماعتوں سے پابندی اُٹھائی جائے، مارشل لا ختم ہو اور اقتدار منتخب نمائندوں کے حوالے کیا جائے۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ تمام سیاسی جماعتیں مارشل لا کی مخالف ہیں۔ کئی طالب علم رہنما مارشل لا کے خلاف کام کرنے کی بنا پر گرفتار کیے جا چکے ہیں، میں بھی گرفتار کیا جا چکا ہوں۔ اخبارات سے یہ بھی عندیہ ملتا ہے کہ جلد مارشل لا ختم ہو جائے گا اور عام انتخابات منعقد کرائے جائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مارشل لا کے خلاف سرگرمیاں عوام کے حق میں ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تنقید اور غداری میں واضع فرق ہے۔ سوشلزم، کمیونزم، مارکسزم اور اسلام جیسے نظریات کسی مخصوص خطۂ اراضی کیلئے نہیں ہوتے۔ جب میں سیاسی رہنماؤں یا حکمرانوں یا اختیارات کے حامل افراد کے ساتھ رابطے میں آتا ہوں تو اُن کے ساتھ پاکستان کی عوام کی خوشحالی اور بہتر مستقبل سے متعلق بات چیت کرتا ہوں۔ ایک محبّ وطن طالب علم کے طور پر میں سمجھتا ہوں

کہ مارشل لا ملک کیلئے سود مند نہیں ہے، خود جنرل ضیا بھی اسی نقطۂ نظر کا حامل ہے۔ سرخ پرچم جنوری 1979 کا اداریہ نمبر 2، عدالتی دستاویز ایم-4 وہی موقف رکھتا ہے جو کہ روزنامہ جنگ، کراچی کے 25 اکتوبر 1979 میں شائع ہوا ہے۔ روزنامہ جنگ کا تراشہ عدالتی دستاویز کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔

سرخ پرچم کے صفحہ 10 اور 11 پر ایران سے متعلق مضمون میں لگ بھگ وہی باتیں شامل ہیں جو 26 اکتوبر اور 22 نومبر 1979 کی روزنامہ جنگ میں شائع ہوئی ہیں۔ دو اخبارات کے تراشے پیش کر رہا ہوں۔ یہ واضح ہے کہ مطالبات کی منظوری نہ ہونے کی صورت میں مزدور یونینوں کو ہڑتال پر جانے کا حق حاصل ہے۔ صفحہ نمبر 10، سرخ پرچم ایم-4 پر پاکستان سے متعلق مضمون میں وہی باتیں کی گئی ہیں جو 4 اگست 1982 کے روزنامہ جنگ کے اداریے میں کی گئی ہیں۔ اخبار کا تراشہ پیش کر رہا ہوں۔ بیگم نصرت بھٹو کا 22 جنوری 1983 کو روزنامہ امن میں شائع ہونے والا بیان پیش کر رہا ہوں۔ ایسا ہی موقف سرخ پرچم جنوری 1979 (عدالتی دستاویز ایم-4) میں دیا گیا ہے۔ سربراہ مملکت قومی ایام کے مواقع پر پیغامِ تہنیت بھیجتے ہیں۔

سرخ پرچم نومبر 1979 کے صفحہ 18 (عدالتی دستاویز ایم-5) پر جام ساقی کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا ہے، ایسا ہی مطالبہ 7 جنوری کے اخبارات میں کیا گیا ہے۔ جہیز اور اسکے مطالبے پر پابندی عائد ہے۔ عدالتی دستاویز ایم-4۔ میں نظریۂ پاکستان کو بابائے قوم قائداعظم کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں۔ حکومت کی جانب سے نظریۂ پاکستان کی کوئی ٹھوس تشریح نہیں کی گئی ہے۔ اتفاق کرتا ہوں کہ تحریکِ بحالیٔ جمہوریت (MRD) پاکستان میں موجود ہے اور اس متحدہ محاذ کی خبریں اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ میری موجودگی میں پڑھے گئے سرخ پرچم کے صفحہ نمبر 14 کے پہلے پیراگراف (ایم-5) کو میں بغاوت، تخریب اور ریاست دشمن مواد کے طور پر نہیں دیکھتا۔ جمہوریت کی بنیادی ضرورت کیلئے گرفتاریاں کی گئی ہیں اور سزائیں دی گئی ہیں۔

استغاثہ کی جرح

میں ذات کے حوالے سے سندھی ہوں، اور لکھ، پڑھ اور بول سکتا ہوں۔ ایل ایل بی

ہے۔ میں جمہوریت کے حق میں بولنے کی پاداش میں یونیورسٹی سے نکالا گیا ہوں۔ میں تین مرتبہ عدالتی تحویل/جیل میں رہا ہوں کہ مجھ پر بحالئ جمہوریت کے سرگرم کارکن ہونے کا الزام تھا۔ مجھے حیدرآباد کی سرسری سماعت کی فوجی عدالت نے ان جرائم سے متعلق کوئی چارج شیٹ جاری نہیں کی جس کے تحت مجھے نو ماہ قید اور پانچ ہزار روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ ہائی جیکنگ کے وقوعے کے بعد ہونے والی بڑے پیمانے پر گرفتاریوں کے دوران مجھے بھی پانچ ماہ کیلئے جیل میں نظر بند کیا گیا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میری آخری نظر بندی گذشتہ دو نظر بندیوں کی وجہ سے تھی۔ میں نے ملزم امر لال کو اس عدالت میں پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ ملزم کے خلاف الزامات سے مجھے آج ہی خود ملزم نے آگاہ کیا ہے۔ یہ واضح ہے کہ میں انکی ماضی کی سرگرمیوں سے لاعلم ہوں۔ یہ درست ہے کہ سرخ پرچم کا صفحہ نمبر 3 پر اداریہ (ایم-4) جنرل ضیا کو غاصب قرار دیتا ہے اور میں اس سے متفق ہوں۔ اگر حکمراں عوام کا منتخب کردہ ہے تو وہ درست حکمران ہے، بصورت دیگر جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، وہ ایک غاصب ہی ہوگا۔ صفحہ نمبر 4 پر اداریہ نمبر 1 کے آخری پیراگراف (عدالتی دستاویز ایم-4) میں وال چاکنگ، پمفلیٹ تقسیم کرنے، اجلاس منعقد کرنے، مختلف کمیٹیاں تشکیل دینے اور مظاہرے کرنے کے ذریعے کامریڈ جام ساقی کو رہا کرنے کا مطالبہ کرنے کی بات کی گئی ہے، جسکی میں مکمل حمایت کرتا ہوں۔ ہلچل ایم-5 گواہ کو دکھایا گیا تاکہ وہ یہ عدالت کے سامنے پڑھیں۔ گواہ کا کہنا تھا کہ صفحہ اول پر دیا گیا مواد حکومت مخالف ہے۔ عدالتی دستاویز ایم-4 کے صفحہ نمبر 6 پر اداریہ نمبر 2 کا آخری پیراگراف ریاست دشمن بیان کا عندیہ نہیں دیتا۔ سابقہ حکومتوں میں بھی حکومت مخالف سرگرمیوں میں ملوث طالب علموں کو گرفتار کرکے سزائیں دی جاتی تھیں تاہم ان کیلئے سول عدالتوں کے دروازے کھلے ہوتے تھے۔ یونیورسٹیوں میں سوشلزم، مارکسزم، کمیونزم اور اسلام جیسے موضوعات پڑھائے جاتے ہیں اور یہ ہر ایک کا حق ہے کہ وہ اپنے پسند کے نظریئے کو اپنے طریقے سے اختیار کرے۔ مجھے معلوم ہے کہ پاکستان میں کمیونزم پر پابندی عائد ہے، اسی طرح کمیونزم سے متعلق مواد پر بھی پابندی ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ آجکل ذرائع ابلاغ کو اشاعت کی آزادی حاصل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خبروں کی اشاعت کی آزادی پر پابندیاں ہیں۔

محمد خان مینگل ولد میراں محمد خان

عمر32سال

سکنہ: خضدار (گاؤں کھوری) قلات بلوچستان

میں ایم اے ہوں اوراس وقت کراچی یونیورسٹی میں سیاسات کے شعبے میں ایم فل کر رہا ہوں۔ میں بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کا چیئرمین تھا۔اتفاق کرتا ہوں کہ سیاسی جماعتوں پر پابندی کے باوجود، کچھ جماعتوں کی خبریں اخبارات میں شائع ہورہی ہیں۔اتفاق کرتا ہوں کہ سیاسی جماعتیں عام انتخابات کے انعقاد، مارشل لا کے خاتمے اورمنتخب اراکین کواقتدار کی منتقلی کا مطالبہ کررہی ہیں۔سیاسی جماعتوں کی جانب سے مخالفت خالصتاً مارشل لا مخالف ہے۔مختلف صوبوں کے طالب علموں کوانکی مارشل لا مخالف سرگرمیوں کی وجہ سے موجودہ مارشل لاحکومت کی جانب سے گرفتارکیا گیااورانہیں سزائیں بھی سنائی گئی ہیں۔اتفاق کرتا ہوں کہ مارشل لا کے خاتمے کا مطالبہ پاکستانی عوام کے مفاد میں ہے۔مخالفت اور غداری میں فرق ہے۔تنقید/مخالفت حکومت کے خلاف ہوتی ہے جبکہ غداری ریاست کے خلاف ہوتی ہے۔ میں نظریۂ پاکستان کو پاکستان کی عوام کے تصورات اورخواہشات کے طور پر دیکھتا ہوں۔میری نظر میں پاکستان کے عوام پچانوے فیصد آبادی پر مشتمل مزدور، کسان اورطلبہ ہیں۔ پاکستان کے عوام ہی نظریۂ پاکستان کا تحفظ کرسکتے ہیں نہ کہ مسلح افواج جیسا کہ 4 دسمبر1982 کو روزنامہ جنگ میں شائع ہونے والے ارشاداحمد حقانی کے مضمون میں کہا گیا ہے۔ پاکستان میں کمیونزم پرکوئی پابندی نہیں ہے اور

یہ تعلیمی اداروں کے کئی ایک کورسز میں پڑھایا جاتا ہے۔ یہ طالب علموں کو اپنی علمی آ گہی میں اضافہ کرنے کیلئے پڑھایا جاتا ہے۔ کمیونزم اور اسلام کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ سیاست میں حصہ لینا طلبہ کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ طلبہ نے تحریکِ پاکستان میں بھی سرگرم حصہ لیا۔ یہ درست ہے کہ جنرل ضیا نے 5 جولائی 1977 کو قوم سے اپنے خطاب میں اعلان کیا تھا کہ اس کا واحد مقصد آزادانہ اور شفاف انتخابات منعقد کرانا ہے۔

پاکستان کی سیاسی جماعتیں موجودہ افغان حکومت کو تسلیم کرنے کے حق میں ہیں۔ اتفاق کرتا ہوں کہ جنرل ضیا نے پاکستان کے منتخب حکمرانوں کا تختہ اُلٹ کر اقتدار پر قبضہ کیا۔ موجودہ حکومت جمہوری نہیں ہے۔

اولمپک کھیل ہر چار سال کے بعد منعقد ہوتے ہیں اور گذشتہ اولمپک کھیل 1981 میں ماسکو میں ہوئے تھے۔ ماسکو اولمپک کھیلوں سے متعلق کوئی اشتہار یا مواد شائع کرنا جرم نہیں ہے جیسا کہ 27 اکتوبر 1979 کے روزنامہ جنگ میں شائع ہوا۔ اتفاق کرتا ہوں کہ ہم کتابوں اور پمفلٹوں کے ذریعے مختلف طرزِ حکومتوں، ثقافتوں، سماجی زندگیوں اور مذاہب سے متعلق پڑھتے ہیں اور ہمارے ملک میں اس نوعیت کی انگنت کتابیں موجود ہیں۔ ایران اور سوویت یونین سمیت دنیا کے دیگر ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کی زندگیوں سے متعلق کوئی مواد لکھنا، شائع کرنا یا تقسیم کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ مارشل لا پاکستان قومی اتحاد کی وجہ سے مسلط کیا گیا اور پاکستان قومی اتحاد کے کچھ رہنما موجودہ مارشل لا حکومت میں وزیر ہیں۔ معیارِ زندگی کے بڑھتے ہوئے اخراجات کے خلاف لکھنا کوئی جرم نہیں ہے جیسا کہ سرخ پرچم (ایم-4) کے صفحہ نمبر 12 پر درج ہے۔ اتفاق کرتا ہوں کہ پاکستان کی عوام کیلئے کام کرنے والے اکثر رہنماؤں کو پاکستان کی مختلف حکومتوں نے بیرونی ایجنٹ قرار دیا ہے۔ اتفاق کرتا ہوں، کہ ماضی میں ایسے افراد کو بھارتی ایجنٹ کہا جاتا تھا اور اب انہیں افغانستان اور سوویت یونین کا ایجنٹ کہا جاتا ہے۔ اسکا سبب یہ ہے کہ امریکہ پاکستان پر بھارت کے ساتھ بہتر تعلقات اور افغانستان اور سوویت یونین کے ساتھ دشمنی کیلئے دباؤ ڈال رہا ہے۔

میں امر لال کو ایک عام طالب علم کے طور پر جانتا ہوں، مجھے ملزم امر لال کی سرگرمیوں سے متعلق کوئی علم نہیں ہے۔ انکے متعلق الزامات کا مجھے عدالت سے ہی معلوم ہوا ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ کمیونسٹ خدا پر ایمان نہیں رکھتے۔ اسلام ایک مذہب ہے جبکہ کمیونزم ایک سماجی سائنس۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ ایک موضوع کے طور پر کمیونزم تعلیمی اداروں میں طلبہ کی معلومات میں اضافے کیلیئے پڑھایا جاتا ہے نہ کہ اسکو اختیار کرنے کیلیئے۔

میں موجودہ حکومت کے دوران گرفتار کیا گیا اور مجھ پر حکومت مخالف تقریر کرنے کا الزام عائد کیا گیا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ذرائع ابلاغ کو آزادی حاصل ہے، میں سندھی نہیں پڑھ سکتا۔ غاصب کہنا درست لفظ نہیں ہے۔ موجودہ حکومت کے خلاف لکھنا اور عوامی سطح پر احتجاج کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ سابقہ حکومتوں کے دوران بھی اپنے مخالفین کو سزائیں دی گئیں اور تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ سائنس پڑھنے والے طلبہ سیاسی شعور سے عاری ہوتے ہیں۔ اپنے بیان میں میں نے کہا کہ پاکستان قومی اتحاد کی وجہ سے مارشل لا نافذ کیا گیا لیکن چونکہ مارشل لا انتظامیہ موجودہ حکومت چلا رہی ہیں اس لئے مخالفت مارشل لا انتظامیہ کی ہوگی نہ کہ پاکستان قومی اتحاد کی۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ پاکستان میں عام انتخابات منعقد کرانے کیلیئے حالات سازگار نہیں ہیں۔

ناہیدافضال (امر لال کا گواہ)

سکنہ: V-5/3 ناظم آباد، کراچی

امر لال سے پہلی بالمشافہ ملاقات تو کوئی ساڑھے تین سال قبل جیل میں ہوئی تھی لیکن انکے ایک طالب علم رہنما ہونے سے متعلق میں پہلے ہی سُن چکا تھا۔ ایک طالب علم رہنما کے طور پر میں آپکو (امر لعل) جانتا ہوں کہ آپ بطور طالب علم کے کئی مسائل پر جدوجہد میں سرگرم رہے ہیں۔ میں نے آپکو کبھی نظریۂ پاکستان کے خلاف کام کرتے ہوئے، مسلح افواج کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہوئے، افواہیں پھیلاتے ہوئے اور مختلف طبقات یا صوبوں کے درمیان منافرت اور بغاوت پھلاتے ہوئے نہیں پایا۔ مجھے ملزم امر لال کے خلاف الزامات کا اخبارات سے علم ہوا ہے کہ اُن پر ریاست دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہونے کا الزام ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ سیاست میں حصہ لینے والے طلبہ کو گرفتار کیا جاتا ہے، تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور یہاں تک کہ کچھ کو نذیر عباسی کی طرح ہلاک بھی کر دیا جاتا ہے۔ میں نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن پاکستان کا صدر رہا ہوں اور اس وقت تحریک استقلال کراچی کا سیکریٹری ہوں۔

استغاثہ کی جانب سے جرح: میں گذشتہ ایک برس سے وکالت کر رہا ہوں۔ میں موجودہ حکومت کے دوران عدالتی تحویل میں رہا ہوں۔ مجھے الزامات کے قطعی الفاظ تو یاد نہیں ہیں لیکن یہ یاد ہے کہ مجھے مارشل لا ضابطہ نمبر 77 اور مارشل لا ریگولیشن نمبر 13 اور 11 کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔ چار ماہ کی عدالتی تحویل کے بعد مجھے ضمانت پر رہا کیا گیا۔ جس دن جیل میں آیا اُن (امر لال) سے

بالمشافہ ملاقات ہوئی اس سے قبل میرے علم میں تھا کہ وہ طالب علم سیاست میں سرگرم ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ امر لال کے خلاف الزامات کیا ہیں جن کے تحت انکے خلاف اس عدالت میں مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ تخریب سے میری مراد ریاست کے خلاف کوئی سرگرمی یعنی مارشل لا کا نفاذ ہے۔ میں اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ امر لال اچھے کردار کے حامل ہیں۔ اگرچہ مجھ پر کئی الزامات عائد کیے گئے لیکن میں اپنے اچھے کردار اور صلاحیتوں سے متعلق پر اعتماد ہوں۔

یہ کہنا درست ہوگا کہ سابقہ حکومت سیاست میں حصہ لینے والے طلبہ کو گرفتار کرتی تھی، تشدد کا نشانہ بناتی تھی اور سزائیں بھی دیتی تھی تاہم موجودہ حکومت کی جانب سے دی جانے والی سزاؤں کی نوعیت اور پالیسیوں کو دیکھا جائے تو یہ اپنی پیشرو سے مختلف ہے۔ میرے خیال میں طالب علموں کو سیاست میں ضرور حصہ لینا چاہئے کیونکہ وہ سیاسی سرگرمیوں میں ذہنی طور پر زیادہ باشعور ہوتے ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ طلبہ سیاست میں اپنی گنجائش سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

9 فروری 1983

محمد حسن شفیع ولد فقیر محمد شفیع

عمر:53سال

سکنہ: تلک چاڑھی، حیدر آباد، سندھ

جام ساقی کی جانب سے اگزامینیشن انچیف:- میں گذشتہ 19 برس سے سندھ یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہوں اور اس وقت شعبۂ سیاسیات کا چیئر مین ہوں۔1968-69 کے دوران، ایک طالب علم کے طور پر وہ جماعت میں ایک با اخلاق ذہین طالب علم تھے۔علمِ سیاسیات میں ہم طالب علموں کو افلاطون سے لیکر کارل مارکس تک ہر فلسفی سے متعلق پڑھاتے ہیں۔طالب علموں کو مختلف فلسفیوں کے مختلف نظریات پڑھاتے ہیں تا کہ طالب علم ان نظریات سے متعلق جامع طور پر ادراک حاصل کرسکیں۔ہم اس بات پر زور نہیں دیتے کہ طالب علم کوئی مخصوص فلسفہ اختیار کریں۔ہم اپنے نصاب کے ایک حصے کے طور پر طالب علموں کو سوشلزم اور کمیونزم کے نظریات پڑھاتے ہیں۔میں اتفاق کرتا ہوں کہ یونیورسٹیوں میں سوشلزم اور کمیونزم کے نظریات پڑھائے جاتے ہیں اور ان دونوں نظریات کے مواد پر کوئی پابندی نہیں ہے، جو کہ مارکیٹ میں میسر ہوتا ہے۔ان دونوں نظریات میں مذہب کا کوئی تصور نہیں ہے۔کارل مارکس کے مطابق مذہب لوگوں کیلئے افیون ہے۔سوویت یونین اور چین کی حکومتوں میں سائنسی سوشلزم کی پیروی کی جارہی ہے جبکہ کمیونزم دنیا کے کسی بھی حصے میں لاگو نہیں ہے۔(کم از کم اس وقت تو نہیں ہے)۔

ریاستی مذہب کوئی نہیں ہوتا اور مذہب ایک نجی معاملہ ہے۔سوویت یونین اور چین جیسے سوشلسٹ ممالک سیکولر ریاستیں ہیں۔قائداعظم محمد علی جناح نے صدر کے طور پر اپنی پہلی تقریر میں کہا تھا کہ کسی بھی فرد کو رنگ، ذات، نسل اور مذہب کی بنیاد پر امتیاز کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا اور پاکستان کے شہری کے طور پر ہر ایک کو یکساں حقوق حاصل ہوں گے۔فلسفے اور نظریات آفاقی

ہوتے ہیں اور انکو علاقوں میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ حکومت اور ریاست میں فرق ہوتا ہے۔ حکومت ریاست کا ایک عنصر ہے جو کہ ریاست کی مرضی ومنشا پوری کرتی ہے۔ حکومتِ وقت پر تنقید کرنا ہر شہری کا پیدائشی حق ہے، تاہم ریاست پر تنقید کرنا جرم ہے۔ اس وقت حکومت نے میڈیکل سائنس اور آرٹس کے طلبہ کیلئے کئی ایسی کتب کی منظوری دی ہے جن میں نظریۂ پاکستان کی تشریح کی گئی ہے۔

ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر یہ پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ اسلام پاکستان کا بنیادی مذہب ہے اور اسلام ریاست کا مذہب ہے اور اس ضمن میں 1973 کے آئین کا حوالہ دیا جاتا ہے جس کو کچھ عرصے سے معطل کیا ہوا ہے۔ پاکستان میں مختلف مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے حکمران رہے ہیں اور تمام تر دستوروں میں اسلام کو ریاستی مذہب بتایا گیا ہے۔ نظریۂ پاکستان کے ضمن میں قیامِ پاکستان سے لیکر کسی حکومت نے کوئی واضع اور جامع تشریح نہیں کی ہے جبکہ اسلام کو ہمیشہ ریاست کے مذہب کے طور پر ہی لیا جاتا ہے۔ آئین کو کسی بھی ملک کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کی 42 مسلمان ریاستوں میں سے کسی کو بھی نظریۂ پاکستان سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اسلامی نظریات تو تمام اسلامی مما لک میں پائے جاتے ہیں لیکن نظریہ پاکستان جیسا کوئی نظریہ نہیں ملتا کہ کوئی نظریۂ سعودی عرب یا نظریۂ متحدہ عرب امارات ہو۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ سابقہ (آئینی) قانونی حکومت اسلام ہمارا مذہب ہے، سوشلزم ہماری معیشت ہے، جمہوریت ہماری سیاست ہے اور طاقت کا سرچشمہ عوام ہے، پر مبنی تھی۔

استغاثے کی جرح: ملزم جام ساقی 69-1968 کے دوران میرا طالب علم تھا اور میں نے اسکو آخری مرتبہ 1970 میں دیکھا تھا۔ میں اسکے خلاف الزامات کے متعلق صرف اخبارات سے آگاہ ہوا ہوں۔ اسکے طالب علم ہونے کے دوران میں نے عملی سیاست سے متعلق اُسکے ساتھ کبھی بات چیت نہیں کی۔ ایک اُستاد کے طور پر میں نے کبھی بھی جام ساقی کو انقلابی طالب علم نہیں پایا۔ اُن دنوں وہ نہ تو طالب علم رہنما تھا اور نہ ہی سندھ یونیورسٹی کا منتخب عہدیدار۔ وہ اچھا طالب علم تھا۔ ہم تعلیمی اقدار کا موضوع پڑھاتے ہیں اور ادراک کو وسعت دیتے ہیں۔ مجھے نہیں

معلوم کہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان پر کوئی پابندی ہے یا نہیں البتہ یونیورسٹیوں کے نصاب میں کمیونزم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

سوال نمبر 3: کیا آپ سندھی سمجھتے ہیں؟

جواب: جی ہاں۔ میں سندھی پڑھ اور سمجھ سکتا ہوں البتہ اس زبان کا ماہر نہیں ہوں۔

سوال نمبر 4 : سرخ پرچم ایم-4 کا اداریہ گواہ کو دکھایا گیا۔ کیا اس اداریئے کا آخری پیراگراف پاکستان کے لوگوں کو موجودہ حکومت کے خلاف بھڑکاتا ہے؟

کمیونسٹ مذہب پر یقین نہیں رکھتے اور انہیں ملحد سمجھا جاتا ہے۔ لوگوں کی جانب سے صحتمند اور تعمیری تنقید کا ہمیشہ خیر مقدم ہونا چاہئے، ریاست پر تنقید کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ میں ریاست پر تنقید کا تعین کرنے کی حیثیت میں نہیں ہوں۔ حکومتی سربراہ کو غاصب کہنا کوئی جرم نہیں ہے تاہم سربراہِ مملکت کو ایسا کہنا جرم بنتا ہے۔ موجودہ حکومت کو غاصب کہنے کو حکومت کے خلاف تنقید کے طور پر برتا جا سکتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ نظریۂ پاکستان کی 1973 کے آئین میں کوئی تشریح کی گئی ہے یا نہیں۔ آئین کا ابتدائیہ نظریۂ پاکستان ہے۔

مولانا حسرت موہانی ایک سوشلسٹ انقلابی اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ 1973 کے آئین میں شق 6 ہے جو واضع کرتی ہے کہ آئین کو معطل / منسوخ کرنے والا فرد انتہائی غداری کا مرتکب ہوگا۔ 1973 کے آئین کی کچھ شقیں عارضی طور پر معطل ہیں۔ ملک میں مارشل لا نافذ ہونے کے بعد کچھ مارشل لا احکامات جاری کیے گئے ہیں۔ اس ضمن میں پی سی او نافذ کیا گیا ہے۔

عدالتی سوالات:

سوال (1) : آپ موجودہ حکومت کے سربراہ کو کس طرح دیکھیں گے سربراہِ حکومت یا سربراہِ مملکت؟

جواب: موجودہ حکمران سربراہِ مملکت کے ساتھ سربراہِ حکومت بھی ہے۔

سوال (2): موجودہ حکومت کے سربراہ کو غاصب کہنا قانونی ہے یا غیر قانونی؟ (جیسا کہ عدالتی دستاویز ایم-4 کے سرخ پرچم کے ایک اداریئے میں کہا گیا ہے؟)

جواب: اگر یہ مواد حکومت کے خلاف ہے تو یہ کوئی جرم نہیں ہے، اگر یہ پاکستان کے خلاف ہے تو یہ جرم ہے۔اس کا تعین کرنا عدالت کی صوابدید ہے۔

نہیں، یہ موجودہ حکومت کے خلاف کوئی عندیہ نہیں دیتا تاہم یہ جام ساقی کی آزادی کیلئے چاکنگ کرنے، پوسٹر لگانے، پمفلیٹ تقسیم کرنے، کمیٹیاں تشکیل دینے اور عوامی اجلاس منعقد کرنے جیسی سرگرمیاں کرنے کیلئے پروپیگنڈا کرتا ہے۔

سوال (3): عدالتی دستاویز ایم-5 ہلچل گواہ کو دکھائی گئی۔کیا آپ عدالتی دستاویز ایم-5 میں شامل اداریئے اور سطور کو جنرلوں سے متعلق تعمیری یا صحتمند تنقید کے طور پر دیکھتے ہیں؟

جواب: اُس تناظر کو نہیں جانتا جس میں یہ تحریر کیا گیا ہے، یہ ایک صحتمند تعمیری زبان نہیں ہے۔

جام ساقی کی جانب سے عدالت کو تجویز کیے گئے سوالات

سوال (1): عدالتی دستاویز ایم-4 کے اداریئے میں موجود زبان جنرل ضیا کی حکومت کے خلاف ہے، نہ کہ ملک کے خلاف۔زبان ضیا حکومت کے خلاف ہے یا نہیں؟

سوال (2): عدالتی دستاویز ایم-5 ہلچل انقلابی جمہوری محاذ سے تعلق رکھنے والے شخص کی بات کرتی ہے اور اس میں کہیں بھی کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے ترجمان ہونے کا ذکر نہیں ہے۔ یہ درست ہے یا نہیں؟

جواب: عدالتی دستاویز ایم-5 دیکھنے اور پڑھنے کے بعد کہہ سکتا ہوں کہ یہ انقلابی جمہوری محاذ کے ترجمان سے متعلق ہے۔

سوال (3): کیا آپ اخبارات میں سیاسی قیدیوں کے مطالبات سے متعلق شائع ہونے والی اخباری خبروں سے آگاہ ہیں؟

جواب: جی ہاں۔

12 جنوری 1983

پروفیسر شمیم اختر گواہ برائے کمال وارثی

ولد محمد وسیع، عمر 52 سال، ذات فاروقی

سکنہ B-16 کیمپس ٹاؤن، کراچی یونیورسٹی۔

میں 1964 سے کراچی یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہوں اس سے قبل مرکزی ادارہ برائے تحقیق میں اسلامی محقق کے طور پر کام کر رہا تھا۔ یہ وزارتِ قانون کے تحت ایک وفاقی حکومتی ادارہ تھا۔ میں تقابلی قانون اور حکومتی امور میں ماسٹرس کی ڈگری رکھتا ہوں۔ میں ایک مصنف ہوں اور میں نے کئی ایک کتب اور تحقیقی مضامین تحریر کیے ہیں جن میں سے بیس شائع ہو چکے ہیں جبکہ مزید اکیس تا حال غیر اشاعت شدہ ہیں۔ میں نیشنل ڈفینس کالج اور نیول اسٹاف کالج کا ایک عمومی مہمان مقرر ہوں۔ یہ درست ہے کہ ہمارے ملک میں علمِ سیاسیات کے مضمون میں کمیونزم نصاب میں شامل ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ جنرل ضیا چین کے دورے پر گئے تھے تاہم اس امر سے ناواقف ہوں کہ آیا انکی ملاقات کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے سیکریٹری جنرل سے بھی ہوئی تھی یا نہیں۔ چونکہ میں بین الاقوامی تعلقات میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہوں چنانچہ موجودہ حالات پر مناسب معلومات رکھتا ہوں۔ چین اور سوویت یونین کے درمیان تعلقات کو تناؤ کے حامل کہا جا سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ایرانی انقلاب پر کئی ایک کتب شائع ہو چکی ہیں۔ سیاسی جماعتوں پر مکمل پابندی ہے تاہم نہ صرف مختلف سیاسی جماعتیں بلکہ دانشور بھی اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے رہے ہیں۔

ریاست اور حکومت میں فرق ہے اور حکومت ریاست کا ایک عنصر ہے۔ میں نے سرخ پرچم جنوری 1979 (ایم-9) کا اداریہ نمبر 2 پڑھا ہے۔ اس میں مجھے ایران پر تو تنقید نظر آتی ہے لیکن اس میں پاکستان پر تنقید دیکھنے سے قاصر ہوں بلکہ یہ تو پاکستان کے حق میں ہے۔ یہ پاکستان بالخصوص اس کے بلوچستان اور شمالی مغربی سرحدی صوبے میں امریکی مداخلت کا عندیہ دیتا ہے۔ اس میں

پاکستان کی خارجہ پالیسی اور امریکہ پر تنقید کا عندیہ ملتا ہے جبکہ یہ ایران کی سابقہ حکومت پر بھی تنقید کرتا ہے۔ یہ موجودہ حکومت کے خود آپکے بیان کردہ تشریحات کے مطابق حکمران طبقات پر بھی تنقید کرتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی حکومت پر تنقید کرنے والے فرد کو ریاست مخالف سمجھا جائے بلکہ ریاست پر تنقید کا تعین کرنا عدلیہ کا فریضہ ہے اور یہ میری صلاحیت اور تجزیے سے زیادہ کا معاملہ ہے۔

جرح: میں ان ملزمان کو پہلی مرتبہ اس عدالت میں دیکھ رہا ہوں، اس سے قبل میں انہیں نہیں جانتا تھا۔ مجھے احمد کمال وارثی پر عائد کیے گئے الزامات کا علم نہیں ہے۔ میں نے اس سے قبل سرخ پرچم نامی پمفلٹ کبھی بھی نہ دیکھا تھا اور نہ پڑھا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ اخبارات میں سرخ پرچم سے متعلق کوئی چیز شائع ہوئی ہو۔ علم سیاسیات میں علمی معلومات کیلئے دیگر نظریات کے ساتھ کمیونزم کو بھی پڑھایا جاتا ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ پاکستان میں کمیونسٹ سرگرمیاں ممنوع ہیں۔ سرخ پرچم کا اداریہ ایم-4 جو عدالت کی موجودگی میں میرے سامنے پڑھا گیا ہے وہ حکومت اور مسلح افواج کے رجعت پسند جرنیلوں کے خلاف غلط احساسات کا اظہار کرتا ہے۔

5 فروری 1983

عبداللہ جے میمن ولد جان محمد، عمر 44 سال

میں اسسٹنٹ کمشنر حیدرآباد تھا جب میمن سنگھ بنگلا دیش میں میری تعیناتی ہوئی۔ ترقی کے بعد مجھے اے ڈی سی باریسال تعینات کیا گیا۔ میں حکومتِ سندھ کے کئی ایک محکموں میں ڈپٹی سیکریٹری کے طور پر کام کر چکا ہوں۔ میری 1976 میں پاکستانی سفارتخانے میں کونسلر برائے خوراک کے طور پر واشنگٹن تعیناتی ہوئی۔ دسمبر 1979 سے میں کمشنر حیدرآباد ہوں۔ ملزم بدرابڑو کو میں 1966 سے جانتا ہوں جب وہ اسکول کا طالب علم تھا اور پہلے دن سے اُسکو تمیزدار پایا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ ایک ہونہار طالب علم کے طور پر چھ سال تک جی او آر سندھ باتھ آئی لینڈ کراچی کی اُسی عمارت میں رہا ہے جس میں میں رہا ہوں اور اس عرصے کے دوران تمام پڑوسی اُسکے متعرف رہے ہیں۔ میں نے اسکے متعلق کسی پڑوسی یا کسی اور سے کوئی نازیبا بات نہیں سنی، جو کہ میرے اور اسکے والد کے مشترکہ دوست ہیں۔

میں نے اسکی تحریر کی ہوئی کوئی چیز نہیں پڑھی تاہم اسکے ساتھ ہونے والی کئی ایک ملاقاتوں سے میں نے یہ اخذ کیا ہے کہ وہ انتہائی پڑھا لکھا شخص ہے۔

جرح: مجھے بدرابڑو کے خلاف لگائے گئے الزامات کا علم نہیں ہے۔ میں نے نہ تو بحث ومباحثے میں یا کسی اور صورتحال میں اسکو اپنے عمل میں انقلابی پایا ہے، اس لئے کہہ نہیں سکتا کہ وہ انقلابی ہے یا رجعت پسند۔ اس مقدمے میں گرفتاری کے بعد میں بدرابڑو سے نہیں ملا ہوں، تاہم مجھے اخبارات سے معلوم ہوا کہ اسکے خلاف ایک فوجی عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے۔ مجھے اس مقدمے سے قبل ملزم بدرابڑو کے خلاف کسی الزام کے تحت دائر کسی مقدمے کا کوئی علم نہیں ہے۔

عبدالقادر ابڑو (ڈپٹی کمشنر، نوابشاہ)

میں اسسٹنٹ کمشنر کراچی کے طور پر سندھ صوبائی سروس میں شامل ہوا۔ ایک سال وہاں رہنے کے بعد میرا تبادلہ اسسٹنٹ کمشنر ہالا کے طور پر ہوا۔ میں اسسٹنٹ کمشنر ہاربر کے طور پر دوبارہ کراچی آیا۔ اکتوبر 1977 میں میری ترقی ہوئی اور میں ڈپٹی کمشنر جیکب آباد تعینات ہوا۔ فروری 1979 میں ایڈیشنل کمشنر کے طور پر واپس کراچی آیا۔ اپریل 1981 سے میں ڈپٹی کمشنر نوابشاہ ہوں۔ میں بدر ابڑو کو گذشتہ بیس برس سے جانتا ہوں۔ میں بدر ابڑو کو انتہائی قربت سے جانتا ہوں کیونکہ اسکا والد میرا انتہائی قریبی دوست ہے اور میں انکے گھر پر اکثر جاتا رہا ہوں۔ میں نے اسکو ایک انتہائی اچھا لڑکا پایا، جس سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی۔ وہ انتہائی تمیز دار اور بااخلاق لڑکا ہے۔

جرح: میں اس عدالت کے سامنے مقدمے میں بدر ابڑو کے خلاف الزامات سے واقف نہیں ہوں۔ اسکی گرفتاری کے بعد میری اس سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ میں نے اس میں کوئی انقلابی بات نہیں پائی، کیونکہ ان امور پر اس سے کبھی بات چیت نہیں ہوئی۔ میں جب بھی انکے گھر گیا ہوں، اس نے انتہائی عزت و احترام کے ساتھ برتاؤ کیا ہے۔ میں اس مقدمے سے قبل اسکے خلاف کسی مقدمے سے لاعلم ہوں۔

آل مقبول رضوی

سکنہ 568 فیض محلّہ، خیر پور

جرح کنندہ شبیر شر

میں بی اے، ایل ایل بی ہوں اور خیر پور میں وکالت کرتا ہوں۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ یونیورسٹیوں میں کمیونزم سے متعلق پڑھایا جاتا ہے۔ عدالت کی تشفی کیلئے کراچی یونیورسٹی کا نصاب پیش کرتا ہوں۔ عدالت نے مذکورہ مواد کا معائنہ کر کے گواہ کو واپس کر دیا۔ ان میں صلاح الدین ناسک کی تحریر کردہ کتاب مشرق ومغرب کے افکار شامل ہے، جو کہ کمیونزم، اسکے فلسفے، سوشلزم کی ابتدا، کارل مارکس کے نظریات، چین کے سیاسی افکار جیسے موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ میں عدالتی دستاویز M-5 سے مماثلت دیکھتا ہوں۔

روزنامہ امن 4 جنوری 1983 کو شائع ہونے والے عدالتی دستاویز M-4 کے صفحہ 8 اور 9 پر افغانستان سے متعلق پیش کیے گئے نقطہ نظر سے مماثلت میں نقطہ نظر 20 جنوری 1983 کے روزنامہ امن میں شائع ہوا ہے۔ عدالت علمدار حیدر کی جانب سے دیئے گئے بیان کو ملاحظہ کرتی ہے۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ ملک میں ہڑتال کرانا کوئی جرم نہیں ہے۔

میں نے سرخ پرچم کا صفحہ نمبر 18، عدالتی دستاویز M-4 دیکھا ہے، جس پر جام ساقی کو آزاد کرنے کی اپیل کی گئی ہے، سیاسی رہنماؤں کی آزادی کا مطالبہ کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ میں نے عدالتی دستاویز M-4 کا صفحہ نمبر 13 دیکھا ہے جو کہ پاکستان کی عوام کی جانب سے ایک

جمہوری منتخب حکومت کا مطالبہ کرتا ہے۔ 17 جنوری 1983 کے روزنامہ امن میں جناب ولی خان نے بھی اسی طرح کا مطالبہ کیا ہے۔

میں نے ملزم شبیر شر کو کبھی بھی خیر پور میں شیعہ سُنی تفرقے میں حصہ لیتے ہوئے نہیں دیکھا، میں نے شبیر کو لسانی ہنگامہ آرائی میں بھی حصہ لیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میں نے انہیں مسلح افواج کے خلاف افواہیں پھیلانے، مختلف طبقات کے درمیان عدم اطمینان پیدا کرنے، تخریبی اور دیگر ریاست دشمن سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے ہوئے نہیں دیکھا۔

جرح

میں گذشتہ دو برسوں سے سول سائیڈ کے وکیل کے طور پر کام کر رہا ہوں۔ میں نے محکمہء سیٹلمنٹ سے مستعفی ہونے کے بعد پاکستان نیشنل پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ میں نے سرگرم سیاست میں حصہ نہیں لیا ہے۔ میں کبھی بھی عدالتی حراست میں نہیں رہا۔ مجھے شبیر شر کے خلاف عائد الزامات کا علم نہیں۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ مقدمے کی تفتیش کے بعد عائد کیے جانے والے الزامات پر مبنی چالان پیش کیا جاتا ہے۔ میری شبیر شر سے 1976 میں ملاقات ہوئی تھی اور اس لئے 1976 کے بعد انکی سرگرمیوں سے متعلق جاننے سے قاصر ہوں۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ جنرل ضیا غاصب ہے۔ میرے علم میں نہیں ہے کہ مارشل لا میں جلوس نکالنے پر کوئی پابندی ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ سرخ پرچم (m-4) کے اداریے سے بغاوت کی بو آتی ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ شبیر شر پر عائد کیے گئے الزامات درست ہیں۔ اگر کوئی موضوع نافذ اور زیرِ عمل نہیں لایا جاسکتا تو اسکی یونیورسٹی میں تدریس بیکار ہے۔

7 فروری 1983

ممتاز قاضی

میں 23 جنوری 1978 سے سنٹرل جیل کراچی کا سپرنٹنڈنٹ ہوں۔ ملزم جام ساقی کو 22 فروری 1981 کو میری تحویل میں دیا گیا۔ انہیں 7 مارچ 1981 کو حیدرآباد سینٹرل جیل منتقل کیا گیا۔ اتفاق کرتا ہوں کہ ملزم جام ساقی کی دو ہفتوں میں ایک مرتبہ ملاقات کرائی گئی، وہ بھی سی آئی ڈی کی موجودگی میں۔ جام ساقی کی خط و کتابت سنسر ہونی چاہیئے تھی تاہم مجھے یاد ہے کہ جام ساقی نے میری تحویل کے دوران نہ کوئی خط و کتابت کی اور نہ وصول کی۔ سنٹرل جیل میں تحویلی نظر بندی کو عدالتی تحویل کہا جاتا ہے، جبکہ میں عدلیہ کا حصہ نہیں ہوں۔ جیل مینوئل کے علاوہ بھی کئی ضوابط ہیں، جیسا کہ نظر بندی کے ضوابط مجریہ 1960، جس کے تحت قیدی کو سی آئی ڈی کی موجودگی میں ملاقات کی اجازت ہوتی ہے اور انکی خط و کتابت سنسر کی جاتی ہے۔

بالا ذکر ملزمان اُس وقت سنٹرل جیل کراچی منتقل کیے گئے جب ملزم جام ساقی کو حیدرآباد منتقل کیا جا چکا تھا۔ ملزم جام ساقی میری تحویل میں زیرِ سماعت مقدمے کا قیدی تھا۔ حکومت کو اگر ضروری محسوس ہو تو وہ کسی ملزم کی ملاقات کی اجازت اور اسکی خط و کتابت کی سنسرشپ کی ہدایت دے سکتی ہے۔ ملزم جام ساقی جرم نمبر 236/80 میں 13 MLR 77ml /o18/15/14u/s 80/70/ کے تحت زیرِ سماعت مقدمے کا قیدی تھا۔

22 فروری 1981 کو سنٹرل جیل کراچی میں اپنی آمد کے وقت جام ساقی کے خلاف سرکاری راز ایکٹ کے سیکشن پی اے اے 2 (ڈی) کی خلاف ورزی پر ایف آئی یو حیدرآباد کے سامنے، خصوصی فوجی عدالت حیدرآباد کے روبرو مارشل لا ضوابط نمبر 4، 5، 18 کے تحت اور ایس ڈی ایم سٹی حیدرآباد کے روبرو سیکشن (6) 17 کے تحت تین مقدمات تھے۔ میرے ریکارڈ کے مطابق انکے خلاف اسکے علاوہ کوئی اور مقدمہ نہیں تھا۔ ان کا نام ہائی جیکرز کی جانب

سے دیا گیا تھا اور میں نے اُن سے اسکی تعمیل کیلئے کہا تاہم انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ مجھے جام ساقی اور ایف آئی آر 236/80 کے تحت زیرِ مقدمہ ملزمان سے متعلق ایمنسٹی انٹرنیشنل سے کوئی خط موصول نہیں ہوا۔ مجھے کوئی مخصوص خط یاد نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اس مقدمے کے حوالے سے آئی جی پولیس کو کوئی خط تحریر کیا ہو، تاہم مجھے ایسی کوئی خط و کتابت یاد نہیں ہے، نہ ہی مختلف مقدمات کا کوئی ریکارڈ موجود ہے۔ میری تحویل کے دوران میں نے مندرجہ بالا تین مقدمات میں کوئی ریمانڈ حاصل نہیں کیا۔

استغاثہ

یہ درست ہے کہ خصوصی مقدمات میں زیرِ سماعت ملزمان سے ملاقات کیلئے دوستوں/رشتہ داروں کی فہرست ملزم فراہم کرتا ہے، جو کہ محکمۂ داخلہ کو ارسال کی جاتی ہے۔ میرے پاس ان افراد کی فہرست نہیں ہے جن سے ملاقات کیلئے جام ساقی نے اجازت مانگی تھی۔ انکی بہن انکی نظر بندی کے دوران دو مرتبہ ملاقات کر چکی ہیں۔

قمرالدین عباسی (ایس پی، سکھر جیل)

سیاسی قیدی کے میری تحویل میں منتقل ہونے کی اطلاع مجھے ایک دن پہلے ملتی ہے، جبکہ کچھ مواقع پر کچھ دن قبل، اس کا انحصار پولیس جتھے پر ہوتا ہے۔ مجھے قطعی طور پر تو یاد نہیں ہے کہ جام ساقی سے متعلق ایسی اطلاع کب ملی، شاید اسکے میری جیل پہنچنے سے دو یا تین روز پہلے۔ عدالت میں کھڑے پانچوں ملزمان میں سے کسی نے بھی جام ساقی سے ملاقات نہیں کی۔ ملزم جام ساقی کو 18 جون 1981 کو میری تحویل میں دیا گیا جبکہ انہیں 17 ستمبر 1981 کو لانڈھی جیل منتقل کیا گیا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ انہیں کس جیل سے میری تحویل میں دیا گیا تھا۔ انکی نظر بندی کے دوران انکے والد، والدہ اور چھوٹی بیٹی نے ان سے ملاقات کی، اسکے علاوہ کسی اور نے ملاقات نہیں کی۔ جام ساقی کی آنے اور جانے والی خط و کتابت کو ایس پی سی آئی ڈی کی جانب سے سنسر کیا جاتا تھا جبکہ ملاقات کے دوران سی آئی ڈی کا ایک نمائندہ موجود رہتا تھا۔ آپ کی فائل میں مجھے یہ ہدایات دی گئیں کہ جام ساقی کو دیگر قیدیوں سے علیحدہ رکھا جائے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ہائی کورٹ یا جیل انتظامیہ کی جانب سے قیدِ تنہائی کی سزا کو جیل میں کی گئی کسی خلاف ورزی/جرم کی سزا سمجھا جاتا ہے۔ کسی قیدی کو جیل کی کسی خلاف ورزی کے علاوہ عدالتی احکامات پر ہی قیدِ تنہائی میں رکھا جاسکتا ہے۔ جام ساقی نے میری تحویل میں ہونے کے دوران جیل میں کوئی خلاف ورزی نہیں کی۔ انہیں قیدِ تنہائی میں رکھنے سے متعلق کوئی عدالتی احکامات نہیں تھے۔ وہ قیدِ تنہائی میں نہیں تھے۔ مختلف درجات کے قیدیوں کو انکی درجہ بندی کے تحت علیحدہ کیا جاتا ہے، ایک ہی درجے کے قیدیوں کو ایک ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔ جام ساقی 'سی' درجے کا قیدی تھا اور اس درجے کے تقریباً چھ سوَ قیدی تھے۔ وہ ایک مشتبہ

قیدی تھا۔ ملزم جام ساقی (ii) (i) 13-15-18/80/78 MLO 77, 124-A کے West Pakistan Public Ordinance No.2 MLR 4, 13, 18 تحت حراست میں تھا۔ ہم اپنی تحویل میں موجود سیاسی قیدیوں کے بیانات اعلیٰ اختیاری کو بھیجتے ہیں۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ کون سا سیکشن سیاسی قیدی ہونے کا تعین کرتا ہے۔ میری تحویل میں پریس آرڈیننس کے تحت کوئی سیاسی قیدی نہیں تھا۔ یہ درست ہے کہ انہیں جب میری تحویل میں دیا گیا تو وہ مغربی پاکستان پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس کے الزام کے تحت تھے۔ سیاسی قیدیوں کی کوئی ٹھوس تشریح/وصف نہیں ہے۔ میں انہیں ریاست دشمن سمجھتا ہوں۔ میں حکومت مخالف اور ریاست مخالف میں تفریق نہیں کرسکتا۔ میں 16 اکتوبر 1980 سے سکھر جیل کا سپرنٹنڈنٹ ہوں۔

سلیم واحدی، ایس پی

ولد فقیر احمد واحدی، عمر 34 سال، ذات واحدی

سکنہ: ایس ایس پی، حیدرآباد

میں 4 اکتوبر 1980 سے ایس ایس پی حیدرآباد ہوں۔ ہوٹل انڈس حیدرآباد ضلع میں واقع ہے اور لطیف آباد پولیس اسٹیشن کے حدود میں شامل ہے۔ جامشورو حیدرآباد ضلع کی حدود میں نہیں آتا۔ اس لئے میں جامشورو پولیس اسٹیشن کی ایف آئی آر 72/80 کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرے پاس امرلال کے متعلق مطلوب ملزم کے طور پر کوئی معلومات/ریکارڈ نہیں ہے اور نہ ہی یہ ایک ایس پی کی جانب سے دوسرے ایس پی کو بتانا ضروری بھی ہے۔ عمومی طور پر، کسی گرفتاری پر متعلقہ تھانے کو گرفتار کرنے والے اہلکار مطلع کرتے ہیں تاہم یہ ہر مقدمے میں لازمی نہیں ہے۔ جہاں تک امرلال کی حیدرآباد میں گرفتاری کے اندراج کا تعلق ہے مجھے بتایا گیا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ انہیں کسی کے سپرد کیا گیا۔ میں روزانہ 400 سے 500 خطوط وصول کرتا ہوں اور اگر آپ سے متعلق خط ملا ہوگا تو اسکو بھی عمومی انداز میں برتا گیا ہوگا۔ خط نمبر P.B./5648-49 بتاریخ 3 جولائی 1982 پر عدالت کی جانب سے دستخط کیے گئے ہیں۔ اس خط میں یہ درج کیا گیا ہے کہ ایس ایچ او جامشورو نے اپنے خط نمبر JSH-/909 بتاریخ 24 جون 1982 کے ذریعے مطلع کیا ہے کہ ملزم امرلال کو میجر عبدالغفور اور اے ایس پی محمد اعظم نے ہوٹل انڈس حیدرآباد سے گرفتار کیا ہے اور پولیس اسٹیشن جامشورو کا ریکارڈ ملزم امرلال کی گرفتاری اور کسی املاک/چیز کی بازیابی سے متعلق خاموش ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تمہیں کیوں گرفتار کیا گیا اور کس مقدمے میں اور تمہیں کسی کے سپرد/حوالے کیا گیا۔

استغاثے کی جانب سے کوئی جرح نہیں کی گئی۔

قاسم علی خوجہ

عمر 57 سال

سکنہ: ایس پی لانڈھی جیل، کراچی

کسی بھی ادارے کے کسی بھی افسر/اہلکار نے مجھے شبیر شر کو علیحدہ رکھنے کی کوئی ہدایت نہیں دی۔ وصولی کلرک قیدیوں کی تحویل لیتا اور ریکارڈ رکھتا ہے۔ میں نے بدر جمال اور جام ساقی کو جیل میں اس کے ساتھ کوئی رابطہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

درست ریکارڈ رکھا گیا ہے۔ جیل میں موجود ریکارڈ کے مطابق ملزم شبیر شر کے ساتھ پہلی ملاقات کیلئے لیاقت علی کو 6 جولائی 1981 کو اجازت دی گئی۔ جب پی آئی اے کا جہاز اغوا کیا گیا تو اغوا کاروں نے شبیر شر کا نام بھی انکے حوالے کیے جانے والے قیدیوں میں شامل کیا تھا جس کیلئے متعلقہ اہلکاروں/اداروں نے اس کی تصویریں بھی لی ہیں۔ ان کو دیا جانے والا خط میرے ریکارڈ میں موجود نہیں ہے، اگر ان کے پاس وہ موجود ہے تو اسکی نقل عدالت میں پیش کر سکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ اسکے دفتری نقل پر ان کے دستخط لیے گئے تھے۔

مجھے خطوط کے قطعی مندرجات یاد نہیں ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ خطوط کے مندرجات میں یہ شامل تھا کہ 'کیا تم آزاد کیے جانے کی صورت میں افغانستان جانے کو تیار ہو؟' ملزم شبیر شر کو 28 اگست 1980 کو جیل لایا گیا، بعدازاں اُسے 19 اپریل 1981 کو سنٹرل جیل کراچی منتقل کیا گیا۔ اسکو دوبارہ 9 جون 1981 کو لانڈھی جیل منتقل کیا گیا۔ شبیر شر کے کسی بھی دوست

نے اس سے ملاقات کرنے کی کوشش نہیں کی / اجازت طلب نہیں کی۔

اتفاق کرتا ہوں کہ ملاقات کرنے کے خواہشمند افراد کی سفارش سیکریٹری داخلہ اور عدالت سے ہوتی ہے، جنکی محکمۂ داخلہ منظوری دیتا ہے اور یہ ملاقات اسپیشل برانچ کے اہلکاروں کی موجودگی میں ہوتی ہے۔

استغاثے کی جرح:

کسی ملزم کو جیل میں کہاں رکھنا ہے یہ جیل سپرنٹنڈنٹ کی صوابدید ہے۔ حکومت کو کسی قیدی کی ایک جیل سے دوسری جیل منتقلی کے احکامات جاری کرنے کا اختیار حاصل ہے اور یہ معمول کی کارروائی ہے۔

29 جنوری 1983

وزیر علی فقیر محمد

عمر 63 برس، ذات بلوچ

سکنہ: ایس ایچ او، ماتلی، ضلع بدین

اس وقت میں ایس ایچ او ماتلی پولیس اسٹیشن ہوں۔ میں 5 اکتوبر 1981 سے 23 اگست 1982 کے دوران ایس ایچ او جامشورو پولیس اسٹیشن ضلع دادو رہا ہوں۔ مجھے پولیس اسٹیشن کے مال خانے میں ہاتھ گھڑی اور نقد رقم کی تصدیق کیلئے عدالتی خط موصول ہوا۔ میں نے لیٹر نمبر JSH/1041 بتاریخ 14 اپریل 1982 کے ذریعے عدالت کو جواب ارسال کیا کہ ملزم امر لعل کو نہ تو اس پولیس اسٹیشن نے گرفتار کیا تھا اور نہ ہی برآمد شدہ گھڑی اور نقد 165 روپے میرے دستخط کے ساتھ جمع ہیں۔ میں نے اپنے ہیڈ محرر کو مال خانہ کو کھنگالنے اور ریکارڈ دیکھنے کیلئے کہا۔ اے ایس آئی غلام نبی شاید سائیٹ پولیس اسٹیشن کوٹری میں تعینات ہیں، تاہم میں اسکے متعلق اعتماد کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ جب میں نے جامشورو پولیس اسٹیشن کا انتظام سنبھالا تو اے ایس آئی غلام نبی میرے تھانے میں تعینات نہیں تھا۔ اسکا پہلے ہی کسی اور تھانے میں تبادلہ ہو چکا تھا۔ میں نے کبھی بھی اے ایس آئی غلام نبی سے ملزم امر لال کی گرفتاری کی نہ تصدیق کی اور نہ ہی اسکے متعلق دریافت کیا۔ امر لال کی گرفتاری سے متعلق روزنامچہ جامشورو پولیس اسٹیشن پر موجود نہیں ہے کیونکہ انکو جامشورو پولیس اسٹیشن کی جانب سے گرفتار نہیں کیا گیا تھا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ آیا ملزم امر لال کے ناظم آباد پولیس اسٹیشن منتقلی کا کوئی ریکارڈ موجود ہے یا نہیں۔ میں نے جامشورو کا مقدمہ نمبر 72/80 نہیں برتا۔ میں 70/82 کے دخلِ دفتر ہونے کے بارے میں نہیں جانتا۔ میں نے تو اپنی تعیناتی کے دوران اس مقدمے کے کاغذات کو برتا ہی نہیں ہے۔

استغاثے کی جرح:

میں نو ماہ تک جامشورو پولیس اسٹیشن کا ایس ایچ او تھا۔ایس ایچ او کے طور پر تمام مقدمات کا ریکارڈ رکھنا اور متعلقہ ایس پی کو ماہانہ رپورٹ پیش کرنا میری ذمہ داری ہے۔میں نے پرانا ریکارڈ اور تعطل میں پڑے ہوئے مقدمات کو نہیں جانچا۔عدالتی دستاویز BB میں مختیار کار اور فرسٹ کلاس مجسٹریٹ سے 23 ستمبر 1980 سے 27 ستمبر 1980 تک پانچ دنوں کے ریمانڈ کی درخواست کا ریکارڈ دیکھ رہا ہوں۔اس لیٹر کی نقل جامشورو پولیس اسٹیشن میں موجود نہیں ہے اور عدالتی دستاویز BB کے عدالتی ریکارڈ میں اس لیٹر کی اصل دیکھ کر میں مثبت طور پر سمجھتا ہوں کہ ملزم امرلال کو جامشورو پولیس اسٹیشن کے ذریعے گرفتار کیا گیا اور اُس وقت کے ایس ایچ او جامشورو نے ان کا ریمانڈ حاصل کیا۔

Re: یہ ریمانڈ آرڈر عدالتی دستاویز BB بحوالہ 72/80 سیکشن 435،342 مارشل لا ضوابط نمبر 10 کے تحت ہے۔مجھے ایف آئی آر عدالتی دستاویز CC میں ملزم امرلال کا نام درج شدہ نظر نہیں آرہا ہے۔

وکلاءصفائی کی بحث

خصوصی عدالت نمبر 5، کراچی کے روبرو

ریاست

بمخالف

کمال وارثی ودیگر

ملزمان کی جانب سے دلائل

1- ایس اے ودود،

بیرسٹر ایٹ لا

2- علی امجد

ایڈووکیٹ

دلائل کا خلاصہ

ملزمان کی جانب سے ذیل درج معروضات پیش کی جاتی ہیں:

1-تمام ملزمان کے خلاف جن الزامات کے تحت مقدمہ چلایا جارہا ہے وہ یہ ہیں:

(i) انکے پاس ریاست دشمن مواد بشمول ہلچل اور سرخ پرچم کے پرچے، برآمد ہوئے، جس کو مختلف طبقات اور مذہبی نظام کے درمیان دشمنی اور نفرت کے جذبات پھیلانے کا موجب سمجھا گیا ہے، کہ ایسے مواد کی اشاعت، تقسیم اور رکھنے کو مارشل صابطہ نمبر 4 کے تحت جرم قرار دیا گیا ہے۔

(ii) انکو مسلح افواج سے عدم اطمینان پھیلانے کیلئے منافرت پیدا کرنے کی غرض سے امتیاز پر مبنی سرگرمیوں میں شامل ہونے اور قابلِ اعتراض مواد رکھنے کا مرتکب پایا گیا، جو کہ مارشل لا ضابطہ نمبر 13 کے تحت جرم ہے۔

(iii) وہ قابلِ اعتراض مواد کے پھیلاؤ، اشاعت اور تقسیم کے ذریعے نظریہء پاکستان اور مارشل لا نافذ کرنے کے اسباب سے متصادم نقطہءنظر کی تشہیر کررہے تھے جو کہ مارشل لا ضابطہ نمبر 18 کے تحت جرم ہے۔

(iv) وہ قانون کے تحت قائم حکومت کے جانب عدم اطمینان پیدا کرنے اور منافرت پھیلانے والی سرگرمیوں میں ملوث ہونے اور ریاست دشمن مواد رکھنے کے مرتکب ہوئے ہیں جو سیکشن 124/A/149 پی پی سی کے تحت جرم ہے۔

(v) ملزمان نمبر 4، 5 اور 7 یعنی محمد سہیل سانگی ولد بدر اقبال، امر لال ولد ٹھا کر داس اور بدر جمال ابڑو پر مسلح افواج اور قانونی طور پر قائم حکومت کے خلاف عدم اطمینان پھیلانے اور مختلف طبقات کے ساتھ مذہبی نظام/ضوابط کے درمیان یا سیت اور منافرت پیدا کرنے میں شریک ملزمان کے ساتھ سازش کرنے کا الزام بھی ہے، جو کہ مارشل لا ضابطہ نمبر 36 کے تحت جرم ہے۔

2-ملزمان کی استدعا یہ ہے کہ انہیں اس مقدمے میں جھوٹ اور بدخواہی کی بنیاد پر ملوث کیا گیا ہے اور وہ کسی بھی مبینہ جرم کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں اور بری کیے جانے کے مستحق ہیں، جس

کی کئی ایک توضیحات ہیں، جن میں سے وسیع بنیادوں پر چند ایک ذیل میں پیش ہیں:

(a) سیکشن 124-A پی پی سی کے تحت مقدمے کی صورت میں مطلوبہ قانونی صوابدیدی اختیار کی عدم موجودگی۔

(b) کسی ثبوت کی عدم موجودگی کہ ماسوائے مبینہ ملزمان نمبر 1 اور 2 کے علاوہ کسی کے قبضے سے کوئی قابلِ اعتراض مواد برآمد نہیں ہوا۔

(c) کسی بھی ملزم کے حوالے سے کسی ثبوت کی عدم موجودگی کہ وہ کسی بھی نوعیت کی قابلِ اعتراض/ امتیاز پر مبنی سرگرمیوں میں ملوث تھے۔

(d) ملزمان کے درمیان کسی سازش اور/ یا کسی جرم کے ارتکاب میں مدد فراہم کرنے کے ضمن میں کسی ثبوت کی عدم موجودگی۔

3- ملزم نمبر 1 اور 2 جو کہ استغاثہ کے گواہان کے بیانات کے مطابق دراصل قابلِ اعتراض مواد رکھتے تھے کی جانب سے استدعا ہو گی کہ

(i) برآمدگیوں کو قانون کے مطابق ثابت نہیں کیا گیا ہے۔

(ii) حتیٰ کہ مبینہ قابلِ اعتراض مواد سے بھی مبینہ جرم کا تعین نہیں ہو سکا ہے۔

(iii) ملزمان کی جانب سے مبینہ قابلِ اعتراض مواد کی اشاعت اور تقسیم کے ضمن میں کوئی ثبوت سامنے نہیں لایا جا رہا ہے۔

4- دفاع کیلئے بنیادی گذارشات کرنے سے قبل، ملزمان کی جانب سے یہ گوش گذار کیا جاتا ہے کہ قانون اور ہر نوعیت کے فوجداری مقدمے کا ایک انتہائی بنیادی اور متبرک اصول یہ ہے کہ ملزمان کو کسی ایسے جرم کے نہ مقدمے کا سامنا کرنا ہو گا نہ ہی انہیں سزا دی جائے گی جس کا ان پر الزام عائد نہیں کیا گیا ہو۔ گذارش یہ ہے کہ مذکورہ اصول خصوصی فوجی عدالت کے سامنے مقدمات پر بھی لاگو ہوتا ہے۔

5- اس خصوصی فوجی عدالت کی توجہ قانون کی اس اصول کی جانب خصوصی طور پر اس لئے مبذول کرائی گئی ہے کیونکہ اس فاضل استغاثہ نے خلاف ورزی/ مراحم اور نظرانداز کرنے سعی کی

ہے، جنہوں نے اپنے ابتدائی تخاطب میں الزمات کے دائرے کو وسیع کرنے کو کوشش کرتے ہوئے مارشل لاضوابط نمبر 15، 48، 77 سیکشن 512، 153A پی پی سی اور مغربی پاکستان پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس 16/63 کے (1) ( ) (i) (1) 24 کوشامل کیا ہے۔

6-اس لئے یہ گوش گذار کیا جاتا ہے کہ عدالت ابتدائی طور پر ہی سرکاری استغاثہ کے بیان کے حتمی پیرا میں شامل الزمات ''کم آمدنی والے افراد، مسلح افواج اور پولیس کی تخریب، حکمرانوں اور محکوموں کے درمیان تفریق، چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر پر تنقید، کمیونسٹ نظریات کی ترویج، روسی اور افغان نقطہء نظر'' کو خارج کیا جائے۔

7- یہ بھی گوش گذار کیا گیا ہے کہ استغاثہ خصوصی فوجی عدالت کے روبرو بھی ملزمان کے خلاف الزامات ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے۔ قانونی اصول کہ کسی ملزم کو کسی مناسب شک سے بالاتر مرتکب/ مجرم ثابت کیے جانے تک معصوم/ بے گناہ سمجھا جائے گا، اس عدالتی کارروائی پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ اس لئے اس عدالت میں قابلِ اعتبار اور قانونی ثبوت کی فراہمی تک ملزمان کے خلاف کوئی قیاس قائم نہیں کیا جا سکتا۔

8- یہ بھی گوش گذار کیا گیا کہ حالیہ استغاثہ، جہاں تک سیکشن 124A پی پی سی کا تعلق ہے، قابلِ عمل نہیں ہے اور اس سیکشن کے تحت ملزمان کے خلاف الزامات، سیکشن 196 سی آر پی سی کی لازمی ضرورت کے عدم تکمیل کی بنیاد پر مکمل طور پر مسترد کیے جانے ہوں گے۔ سیکشن 124-A اور 153-A کے تحت کسی بھی ملزم کے خلاف عدالتی کارروائی کیلئے قانون کی ایک لازمی شرط مرکزی یا صوبائی حکومت کی جانب سے پیشگی اجازت ہے۔ ایسی کسی اجازت کی عدم موجودگی میں، اس سیکشن کے تحت کوئی بھی عدالتی کارروائی قانونی طور پر نہیں کی/ چلائی جا سکتی۔ حالیہ مقدمے میں، ایسی کوئی اجازت پیش یا ثابت نہیں کی گئی ہے اور درحقیقت استغاثہ کی جانب سے ایسی کوئی اجازت حاصل نہیں کی گئی ہے۔

9- سیکشن 196 کی شرائط کی عدم تکمیل اور عدم مطابقت انتہائی بنیاد تک جاتی ہے، اور سیکشن 124-A پی پی سی کی دفعات کے تحت عدالتی اختیار/ صوابدید، مقدمے اور سزا کو غیر قانونی بنا دیتی

ہے۔

10- پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس،1963 کی مبینہ انحرافی/خلاف ورزی سے متعلق یہ پہلے ہی گوش گذار کیا جا چکا ہے کہ یہ عائد کیے گئے الزمات کے زمرے میں نہیں آتا اور ملزمان کے خلاف اس آرڈیننس کے تحت کسی مبینہ جرم کے ارتکاب پر نہ مقدمہ چلایا جا سکتا ہے اور نہ ہی سزا دی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں، عدالت کی توجہ مذکورہ آرڈیننس کے سیکشن (2)57 کی جانب بھی مبذول کرائی گئی ہے۔ حکومت کی جانب سے اختیارات کے حامل کسی افسر کی جانب سے حکومت کو تحریری شکایت درج کرانے کے علاوہ پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس،1963 کے تحت کسی مبینہ جرم کو قابلِ مقدمہ نہیں بنایا جا سکتا۔ ایسی کوئی اجازت حاصل نہیں کی گئی ہے، اور نہ ہی استغاثہ نے اس آرڈیننس کے تحت کوئی اختیار نامہ پیش کیا ہے۔

11- یہ گوش گذار کیا گیا ہے کہ 29 جولائی1980 کو نارتھ ناظم آباد اور گارڈن پولیس اسٹیشن کی حدود میں واقع املاک سے مبینہ طور پر قابلِ جرم مواد تحویل میں لیا گیا ہے، جو کہ کسی بھی ملزم سے جوڑا نہیں جا سکتا۔

12- اس پر زور دیا جانا چاہئے کہ استغاثہ کی استدعا کے مطابق غلام شبیر شر اور احمد کمال وارثی، ملزم نمبر 1 اور 2 واحد دو افراد تھے جو وقوعے کی مبینہ جگہ سے مبینہ طور پر گرفتار کیے گئے۔ تو پھر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان ملزمان کا تحویل میں لے گئے مواد سے کوئی تعلق ہوگا۔ دیگر تمام ملزمان کا قابلِ جرم مواد سے اگر کوئی تعلق ہے تو وہ دونوں ملزمان کے نام نہاد/ اعترافی بیان پر مبنی ہے، جن کا ذیل درج پیراگراف میں جائزہ لیا گیا ہے۔

13- شبیر شر اور احمد کمال وارثی سے قابلِ جرم مواد کی برآمدگی کے ضمن میں گذارش ہے کہ یہ برآمدگی قانون کے مطابق ثابت نہیں کی گئی ہے اور تلاشی اور برآمدگی کے گواہان کی گواہی میں انتہائی تضادات پائے جاتے ہیں، اس لئے استغاثہ کے ثبوت کا یہ حصہ یکسر مسترد کیا جائے۔ چھاپے اور تلاشی کے حوالے سے یکسر غیر قانونی اور متضاد ثبوت کے عناصر کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔

14- اولاً، مبینہ شائع شدہ مواد یا پرنٹنگ مشین کی تحویل پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس 1963 کے سیکشن 34، 38 اور 39 کے مطابق ہونی چاہئے تھی، جسکی اس مقدمے میں پیروی نہیں کی گئی ہے۔ یہ شقیں، گذارش ہے کہ صرف تکنیکی نوعیت کی نہیں ہیں بلکہ لازمی ہیں اور انکی عدم تکمیل پوری کارروائی کو غیر مؤثر، غیر قانونی اور باطل بنا دیتی ہے۔ درحقیقت، ان شقوں کو اس لئے قانون کا حصہ بنایا گیا ہے تا کہ کسی ملزم کے خلاف غلط دستاویزات کی بنیاد پر کوئی کارروائی نہ ہو۔ چنانچہ، یہ عدالت لازماً جائزہ لے کہ یہ قابلِ جرم مواد آیا ملزمان احمد کمال وارثی اور شبیر شر سے ہی برآمد ہوا ہے یا نہیں۔

15- استغاثہ کے گواہان نے تسلیم کیا ہے کہ برآمد کیے گئے مبینہ قابلِ جرم مواد پر دستخط نہیں ہیں اور اس پر کوئی شناختی علامت نہیں ڈالی گئی تھی اور مزید براں یہ کہ ایک جگہ سے برآمد کیا گیا مبینہ طور پر قابلِ جرم مواد دوسری جگہ سے برآمد ہونے والے مواد کے ساتھ گڈمڈ ہو گیا ہے۔ یہ مواد بستر کی چادروں میں باندھا گیا اور ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہیڈکوارٹرس میں مارشل لا افسر کے سپرد کیا گیا تھا جو کہ سربمہر دستخط یا علامتی نشان کے بغیر تھا۔ استغاثہ کے گواہان کو علم نہیں ہے کہ اس دوران یہ مبینہ قابلِ جرم مواد کہاں رکھا گیا تھا۔ استغاثہ کے گواہان نے تسلیم کیا ہے کہ یہ خود ان کیلئے بھی کہنا مشکل ہو گا کہ پیش کیا جانے والا قابلِ جرم مواد وہی ہے جو چھاپہ مارے جانے والی جگہوں سے برآمد کیا گیا تھا۔

16- یہ گوش گذار کیا جاتا ہے کہ چھاپے اور قابلِ جرم مواد کی برآمدگی کے ضمن میں استغاثہ کے گواہ نمبر 2 منور خان، گواہ نمبر 3 رمضان لغاری اور گواہ نمبر 4 دولت خان کے بیانات ظاہر کرتے ہیں کہ اسکی تُز شناخت نہیں ہے کہ پیپلز کالونی سے کون گرفتار ہوا تھا کیونکہ امین جمالی اور رمضان لغاری (استغاثہ کا گواہ نمبر 3) دونوں ملزمان شبیر شر اور احمد کمال وارثی کو شناخت کرنے میں اپنی ناکامی کا اظہار کر چکے ہیں جبکہ دیگر بھی ان دونوں ملزمان کی شناخت نہیں کر سکے اور استغاثہ انکی شناخت کرانے میں ناکام رہا ہے۔

17- یہ گوش گذار کیا جاتا ہے کہ پیپلز کالونی جہاں چھاپہ مارا گیا اور دعویٰ کے مطابق قابلِ

جرم مواد برآمد کیا گیا، سے متعلق انداز، وقت اور جگہ مجسٹریٹ اور پولیس کانسٹیبلز اور اے ایس آئیز کے بیانات میں واضح تضادات کے باعث ثبوت میں انتہائی شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں، کیونکہ مجسٹریٹ کا کہنا ہے کہ گھر اندر سے بند تھا، پولیس پارٹی نے بلند آواز سے مکینوں کو دروازہ کھولنے کیلئے کہا اور بالآخر ایک پولیس کانسٹیبل نے دیوار پھلانگی، جبکہ پولیس پارٹی کی اراکین کا کہنا ہے کہ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ براہ رست اندر داخل ہو گئے۔ قطعی طور پر واضح ہے کہ وہ ایک ہی وقوع اور جگہ کا ذکر نہیں کر رہے ہیں اور انکے بیانات کو مدنظر نہیں رکھا جا سکتا۔

18- یہ گوش گزار کیا جاتا ہے کہ شبیر شر اور کمال وارثی کے علاوہ، کسی اور کو مبینہ طور پر برآمد کیے گئے قابلِ جرم مواد کے ساتھ کسی بھی لحاظ سے جوڑا نہیں گیا ہے۔

19- یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ جام ساقی کے خطوط اگیز بیٹ ایم-5ایل اور ایم 5ایم کی بنیاد پر جام ساقی کو ''سازش'' کا حصہ دکھایا گیا ہے۔ عدالت توجہ کر سکتی ہے کہ جام ساقی پر سازش یا اس میں معاونت کا الزام عائد نہیں کیا گیا ہے اور وہ 1978 سے جیل میں مقید ہیں۔

20- استغاثہ کی جانب سے یہ الزام بھی عائد کیا گیا ہے کہ دیگر تمام ملزمان کو احمد کمال وارثی اور شبیر شر کے اعترافی بیانات کی بنا پر شاملِ مقدمہ کیا گیا ہے۔ یہ گوش گذار کیا جاتا ہے کہ اعترافی بیانات کی ثبوت کے لحاظ سے اہمیت/ قدر صفر ہے۔ یہ، ذیل درج حالات وسکنات کی وجہ سے ہے:

(i) اعتراف حاصل کیا گیا ہے اور ملزمان کا کہنا ہے کہ یہ ان سے دھمکی، دھونس اور تشدد کے ذریعے حاصل کیا گیا ہے۔

(ii) ایسے قابلِ فہم شواہد موجود تھے کہ اعتراف کرنے والے ملزمان اعترافی بیانات پر دستخط کرنے سے قبل مارشل لا اختیاری کی گمنام تحویل میں تھے۔

(iii) ملزم غلام شبیر شر کو مسلسل جگایا گیا اور اسکو سونے کی اجازت نہیں دی گئی اور اسی طرح اسکو اعترافی بیان درج کرانے کیلئے لے جایا گیا۔

(iv) ملزمان کو اعترافی بیان درج کرنے والی مجسٹریٹ نے متنبہ نہیں کیا کہ یہ بیانات خود انکے خلاف بھی استعمال ہو سکتے ہیں اور مزید یقین دہانی کیلئے یہ بیانات کسی دھمکی دھونس کے بغیر

ملزمان کی آزادانہ مرضی سے درج کیے جا رہے ہیں۔ مجسٹریٹ محمد امین جمالی نے سرسری سماعت کی فوجی عدالت کے سامنے اپنی گواہی کے خلاصے میں ملزمان کو ایسے کسی انتباہ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

(v) ملزمان کے بیانات اُن زبانوں میں درج نہیں کیے گئے جن میں انہوں نے مبینہ طور پر یہ بیانات دیئے تھے۔ کمال وارثی کا بیان اردو میں تھا جبکہ شبر شر کا بیان سندھی میں تھا۔ دونوں بیانات انگریزی میں ریکارڈ کیے گئے ہیں۔

(vi) شبیر شر کے اعترافی بیان کے حصہ نمبر 2 اور 6 پر دستخط نہیں ہیں جو کہ استغاثہ کے نقطہء نظر کے لحاظ سے انتہائی اہم ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بعد ازاں شامل کیے گئے ہوں۔

(vii) اعتراف کرنے والے ملزمان کے بیانات پر عدالتی مہر نہیں ہے اور بیان کے آخر میں کوئی حوالہ/ حاشیہ نہیں ہے جو کہ سیکشن 164 (3) سی آر پی سی کے تحت قانون کی لازمی شرط ہے۔

(viii) اعترافی بیانات مقدمہ چلانے والی عدالت کو ارسال نہیں کیے گئے بلکہ سر بہ مُہر کیے بغیر سٹی کورٹس کے ریکارڈ کیپر کو ارسال کیے گئے۔

(ix) تسلیم شدہ حقیقت کے طور پر بیانات مجسٹریٹ نے کھلی عدالت میں درج نہیں کیے تھے۔

(x) ملزمان کو اعترافی بیان ریکارڈ کرانے کے بعد دوبارہ سب انسپکٹر زبیر کی حوالے کیا گیا، جو کہ صریحاً قانون کی خلاف ورزی ہے۔

(xi) اعترافی بیان، حیرت انگیز طور پر، ایک ایسے مجسٹریٹ نے درج کیا تھا، جس کی حدود میں نارتھ ناظم آباد نہیں آتا، جہاں سے مبینہ قابلِ جرم اشیا برآمد کی گئیں، کسی اور اراضی کے مجسٹریٹ کا تعین کارروائی سے متعلق شکوک وشبہات پیدا کرتا ہے۔

(xii) آخری تاہم انتہائی اہمیت کا حامل کہ شریک ملزم نذیر عباسی کی تحویل میں موت واقع ہوئی۔ یہ وہی عرصہ ہے جب اعتراف کرنے والے شریک ملزمان بھی اُسی تحویل میں تھے۔ استغاثہ کی جانب سے نذیر عباسی کی موت کے واقعات وقرائن کی وضاحت میں ناکامی اعتراف

کرنے والے شریک ملزمان کے اس دعویٰ کے مضبوط جواز پیدا کرتی ہے کہ انہیں قابلِ قبول بیان دینے کیلئے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

21- یہ بھی گوش گذار کیا گیا ہے کہ کسی شریک ملزم کا اعترافی بیان کسی وعدہ معاف گواہ کے بیان سے قطعی مختلف ہوتا ہے، یہ قانون کی نظر میں شریک ملزم/ملزمان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہوتا اور اسکو ملزم/ملزمان کے خلاف الزمات عائد کرنے کیلئے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ یہی سبب ہے کہ کسی وعدہ معاف گواہ کا بیان، چاہے کتنا ہی کمزور ہو، قابلِ سرزنش ہو، جرح کیلئے پیش کیا جا سکتا ہے جبکہ اعترافی بیان جرح کیلئے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ بیان کا مبینہ خالق عدالت کیلئے گواہوں کے کٹھرے میں ہے اور نہ ہی بیان کی درستگی کیلئے ملزم۔

ان حالات کے پیش نظر، کس طرح اعتراف کرنے والے شریک ملزم کے بیان کو الہامی سچ سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ کسی ملزم کو اس بیان کی بنیاد پر سزا دینے کی مترادف ہوگا جو نہ تو اسکی موجودگی میں درج ہوا اور نہ ہی اسکو اس پر جرح کرنے کا موقعہ میسر ہوا اور یہ قانون اور فطری انصاف کے تمام تر اصولوں کے خلاف ہوگا۔

22- موجودہ مقدمے میں، یہ نوٹ کیا جانا چاہیئے کہ اعترافی بیان نہ صرف غیر قانونی طور پر درج کر کے اور تشدد اور دھونس کی بنیاد پر حاصل کیا گیا، جب ایک اور شریک ملزم تشدد کی بنا پر مر چکا تھا یا مر رہا تھا، قانون کی نظر میں اعتراف نہیں ہے۔ یہ کسی غیر قانونی عمل کا اعتراف نہیں کرتا اور نہ ہی کسی غیر قانونی عمل میں ملزمان میں سے کسی اور کو ملوث کرنا ہے۔

23- ملزمان کی کوئی دوسری سرگرمی اس مقدمے میں زیرِ بحث نہیں ہے۔ درحقیقت ملزمان کی کسی بھی سرگرمی کو گواہی/ثبوت میں قابلِ اعتراض نہیں بتایا گیا ہے۔ نذیر عباسی، جنکی تشدد کی وجہ سے حراست میں موت واقع ہوئی، پر اس گھر جانے کا الزام تھا جہاں سے احمد کمال وارثی اور شبیر شر گرفتار ہوئے تھے۔ جمال نقوی اور سہیل سانگی پر بھی کوئی بڑا الزام ثبوتوں کے ساتھ عائد نہیں کیا جا سکا ہے۔ اس مقدمے میں استغاثہ کی انتہائی بے اصولی اس حقیقت سے عیاں ہے کہ بدر جمال ابڑو پر اس عدالت میں اس بات کے علاوہ دوسرا کوئی الزام عائد نہیں کیا جا سکا ہے کہ ملزمان میں سے

ایک شبیر شر اسکے ادارے کا ملازم تھا۔ کوئی برآمدگی نہیں کی گئی اور خود استغاثہ نے تسلیم کیا ہے کہ کوڑے لگائے جانے والی تصویر کو کسی صورت قابلِ جرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ایک اور ملزم امر لال انو کھے درجے میں آتا ہے جہاں استغاثہ نے اسکو سرخ پرچم اور ہلچل تقسیم کرنے سے منع کرنے والا بتایا ہے اور اسکے باوجود مجرم ٹھرایا گیا ہے۔

24- اس مرحلے پر یہ نوٹ کیا جانا چاہئے کہ یہ تفتیشی اہلکار ہی تھے جنہوں نے پہلی مرتبہ یہ انکشاف کیا کہ وہ جگہ جہاں سے احمد کمال وارثی اور شبیر شر کو گرفتار کیا گیا، کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا دفتر تھی۔ تاہم اس الزام کی تائید میں کوئی دوسرا زبانی یا دستاویزی ثبوت میسر نہیں ہے۔ ملزمان کے خلاف الزامات انکے کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان یا کسی اور جماعت کا رکن ہونے سے متعلق ایک لفظ بھی نہیں بولتے۔ اس حوالے سے بھی کوئی ثبوت ریکارڈ پر نہیں لایا گیا ہے کہ تمام سیاسی سرگرمیوں پر عائد عمومی پابندیوں کے علاوہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان پر کوئی خصوصی پابندی بھی ہے۔

25- یہ گوش گذار کیا جاتا ہے کہ ملزمان نمبر 4،5 اور 7، جو سازش کے ملزم ہیں، کسی دوسری مبینہ غیر قانونی سرگرمی میں کسی دوسرے ملزم کے ساتھ متعلقہ نہیں دکھائے گئے ہیں۔ ملزمان کے خلاف سازش کا الزام اس وقت تک عائد نہیں جا سکتا جب تک ان کے دیگر ملزمان کے ساتھ کسی غیر قانونی عمل کے ارتکاب پر اتفاق نہ ہو۔ اس نوعیت کی کوئی چیز ریکارڈ پر نہیں لائی گئی ہے۔ عدالت کی توجہ خصوصی طور پر اس جانب مبذول کرائی جاتی ہے کہ جام ساقی کا مبینہ خط نہ تو ثابت کیا گیا ہے کہ انکی دستی تحریر کا ہے، نہ ہی یہ ملزمان میں سے کسی کے نام ہے اور نہ ہی اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات ہے۔ اگرچہ اس پر عدم اتفاق کیا جا سکتا ہے ہے تاہم اگر خط جام ساقی کا ہی لکھا ہوا ہے تب بھی گواہ تسلیم کرتا ہے کہ اس خط میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کو جرم شمار کیا جائے۔

استغاثہ کا گواہ رمضان لغاری، ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ، کراچی چھاپہ مارنے والی ٹیم کا مجسٹریٹ	ملزم امر لال کے خلاف، اُس نے جو دستاویز برآمد کی وہ ایک مارک شیٹ تھی۔ باقی ملزمان کیلئے وہ کچھ نہیں کہتا۔ وہ کسی بھی ملزم کے خلاف کوئی بیان نہیں دیتا۔
استغاثہ کا گواہ، دولت خان پولیس کانسٹیبل چھاپہ مارنے والی ٹیم کا ایک رکن	ملزم کمال وارثی اور شبیر شر کے خلاف اسکی گواہی یہ ہے کہ وہ دونوں چھاپے کے وقت کوارٹر پر پائے گئے، باقی ملزمان کے خلاف اسکے پاس کچھ نہیں تھا۔
استغاثہ کا گواہ، زبیر احمد سب انسپکٹر، ناظم آباد	نذیر عباسی اور پروفیسر نقوی کے خلاف اُسکا کہنا تھا کہ 30 جولائی 1980 کو صبح ساڑھے نو بجے اُس نے کوارٹر نمبر سی 19 پیپلز کالونی سے نذیر عباسی کو گرفتار کیا، جس کے پندرہ منٹ بعد پروفیسر نقوی آیا جس کو بھی گرفتار کیا گیا۔ پروفیسر نقوی کے خلاف اس نے بتایا کہ اس کے قبضے سے ایک ڈائری اور ایک کتابچہ ملے۔ ملزم شبیر شر کے خلاف اُس کا کہنا تھا کہ اُس نے 28 اگست 1980 کو اعترافی بیان ریکارڈ کرانے کیلئے اس کو امین جمالی کے روبرو پیش کیا۔ 31 اگست 1980 کو وہ اعترافی بیان کیلئے ملزم کمال وارثی کو امین جمالی کے پاس لے گیا۔ دونوں ملزمان کو لانڈھی جیل منتقل کیا گیا۔ دیگر ملزمان کے خلاف اس گواہ کا کچھ کہنا نہیں ہے۔

استغاثہ کا گواہ، محمد اشرف مالی، مشیر	اسکو ملزم بدر ابڑو کے دفتر میں گرفتاری اور برآمدگی کا مشیر بنایا گیا۔ دیگر ملزمان کے خلاف وہ کچھ بھی نہیں بولا۔
استغاثہ کا گواہ، محمد سرور خان ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ، کراچی	اُس نے ڈی ایس پی برنی کے لائے ہوئے ملزم امر لال کا بیان ریکارڈ کیا۔ دیگر ملزمان کے خلاف اس گواہ نے کچھ بھی نہیں بولا۔
استغاثہ کا گواہ، شمس الدین دکاندار بدر بک اسٹال، حیدرآباد	اس نے بیان دیا کہ اگست 1980 کے مہینے میں کچھ پولیس اہلکاروں نے، جن کے نام معلوم نہیں، گھر نمبر 752 بابن شاہ کالونی پر چھاپا مارا اور دروازہ توڑ کر کتابیں برآمد کیں۔ وہ ملزمان کے خلاف کچھ نہیں کہتا۔
استغاثہ کا گواہ، شفیع سومرو ایس ایچ او جام شورو	ملزم امر لال کے خلاف اس نے بتایا کہ 23 ستمبر 1980 کو اے ایس آئی غلام نبی نے انڈس ہوٹل حیدرآباد سے اسکو گرفتار کیا۔ ملزم کو مختیار کار اور فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کوٹری کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُس نے پانچ دن کا ریمانڈ حاصل کیا۔ دو دن کے بعد ملزم کو کراچی منتقل کر دیا گیا۔ وہ دیگر ملزمان کے خلاف کچھ نہیں کہتا۔
استغاثہ کا گواہ، محمد حنیف ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ، حیدرآباد	وہ بتاتا ہے کہ 2 اگست 1980 کو اس نے انسپکٹر باجوہ کے ہمراہ بابن شاہ کالونی حیدرآباد کے گھر پر چھاپہ مارا، جس پر تالا لگا ہوا تھا اور پولیس نے تالا توڑ کر پمفلٹ، کتابیں، رسالے وغیرہ برآمد کیے۔ وہ کسی بھی ملزم کے خلاف کچھ نہیں کہتا۔

استغاثہ کا گواہ، محمود اخبار فروش	وہ ریگل بس اسٹاپ کے قریب شیخ محمود کے کتابوں کے اسٹال کی برآمدگی کا مشیر تھا۔ ماسکو اولمپکس اور روس میں مسلمان کتابوں کی کاپیاں برآمد ہوئیں جو پولیس اپنے ساتھ لے گئی۔ اُس نے کسی بھی ملزم کے خلاف کوئی بیان نہیں دیا۔
استغاثہ کا گواہ، برنی ڈی ایس پی	اسکو ایس پی لیاقت آباد ڈویژن نے ایف آئی آر نمبر 236/80 ناظم آباد کی تفتیش کرنے کی ہدایت کی۔ ملزم امر لال اور شبیر شر کے خلاف اس کا کہنا تھا کہ ملزم امر لال کو اعترافی بیان کیلئے ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ سرور کے روبرو پیش کیا گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ شبیر شر نے اپنے اعترافی بیان میں بتایا کہ بدر جمال ابڑو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا مالی معاونت کار ہے۔ ملزم جام ساقی کے خلاف اس گواہ نے بتایا کہ وہ سیکشن 161 سی آر پی کے تحت جام ساقی کا بیان ریکارڈ کرنے کیلئے مخدوم حیات کے ہمراہ حیدر آباد جیل گیا تھا۔ ملزم کمال وارثی اور پروفیسر نقوی کے متعلق اُس نے کہا کہ وہ پہلے سے گرفتار تھے۔ ملزم سہیل سانگی کا اس گواہ کو نام یاد نہیں رہا تاہم کہا کہ چار افراد یعنی کمال وارثی، پروفیسر نقوی، شبیر شر اور چوتھا جس کا نام اُسے معلوم نہیں، گرفتار کیے گئے تھے۔

استغاثہ کا گواہ، امین جمالی
ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ

انہوں نے کمال وارثی اور شبیر شر کے اعترافی بیان ریکارڈ کیے۔ یہ درست ہے کہ شبیر شر نے بتایا تھا کہ ہمیں زنجیروں اور ہتھکڑیوں سے باندھا گیا تا کہ سو نہیں سکیں۔ اُس نے آخری صفحے کے علاوہ اعترافی بیانات کے کسی صفحے پر دستخط نہیں کیے۔ اعترافی بیانات پر عدالتی مُہر نہیں ہے۔ اُس نے دونوں بیانات کے اختتامیے پر حاشیہ تحریر نہیں کیا۔ اعترافی بیانات سٹی کورٹس کے ریکارڈ کیپر کو ارسال کئے گئے۔ اس نے دریافت کیے جانے والا ایک بھی سوال تحریر نہیں کیا ہے۔ اس نے فارم پر یہ تحریر نہیں کیا ہے کہ وہ ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ فرسٹ کلاس مجسٹریٹ ہے۔ عدالت میں پیش کیے گئے کاغذات میں ریمانڈ وارنٹ نہیں تھا۔

اُس نے شبیر شر اور احمد کمال وارثی کے اعترافی بیانات ریکارڈ کیے۔

بدر ابڑو کے خلاف اُس نے کہا کہ ملزم نے پہلی مرتبہ اعترافی بیان ریکارڈ کرانے پر رضامندی ظاہر نہیں کی۔ اسکو دوسری مرتبہ بھی پیش کیا گیا تاہم اس مرتبہ بھی اس نے بیان دینے سے انکار کیا۔ اس لئے اسکو جیل کی تحویل میں ریمانڈ پر بھیجا گیا۔

مندرجہ بالا حقائق پر مبنی بحث سے یہ بات ثابت ہے کہ استغاثہ مذکورہ بالا ملزمان کے خلاف کوئی مقدمہ بنانے میں ناکام رہا ہے۔ اب میں مقدمے کے قانونی پہلوؤں کو زیر بحث لاؤں گا۔

ملزمان کے خلاف عائد کیے گئے الزامات غیر واضح/مبہم ہیں۔ تمام الزامات کی عمومی خواندگی جرم کی نوعیت کو واضح کرتی ہے۔

خصوصی فوجی عدالت نمبر 5، کراچی کے روبرو

فوجداری مقدمہ نمبر 236 سال 1980

ریاست

مخالف

جام ساقی و دیگر۔۔۔۔ملزمان

وکیل صفائی محمد یوسف لغاری کے افتتاحی دلائل

جناب اعلیٰ گذارش ہے:

مقدمے کے موافق اور نا موافق حوالے سے اپنے دلائل پیش کرنے یا معاملے پر اپنی عرضداشت پیش کرنے سے قبل، مقدمے کے حقائق آپکے گوش گذار کرنا چاہوں گا۔

استغاثہ کی جانب سے پیش کردہ حقائق مختصراً اس طرح ہیں کہ 29 جولائی 1980 کو ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہیڈ کوارٹرس کراچی نے پولیس اہلکاروں اور ایک مجسٹریٹ سے رجوع کیا، جنھوں نے پیپلز کالونی، ناظم آباد میں ایک گھر اور پاکستان کوارٹرس کے ایک کوارٹر پر چھاپہ مارا، شائع شدہ مواد اپنی تحویل میں لیا جس کو حکومت اور مارشل لا کے خلاف تخریبی سمجھا گیا ہے۔ اُسی دن، دو ملزمان غلام شبیر شر اور کمال احمد وارثی کو پیپلز کالونی سے گرفتار کیا گیا جبکہ دیگر کو مختلف تاریخوں پر مختلف جگہوں سے گرفتار کیا گیا۔ ایک طویل عرصے سے کسی کو بھی ملزمان کا کوئی اتہ پتہ نہیں تھا کہ انہیں کہاں رکھا گیا ہے اور ان پر کیا الزامات ہیں، یہاں تک کہ تفتیشی اہلکار اور دیگر پولیس اہلکار بھی لاعلم تھے کہ ملزمان کہاں پر ہیں۔ مختلف ایجنسیوں/ اداروں کی تفتیش کے مختلف مراحل کے بعد انہیں اس عدالت کے سامنے مارشل لا ضابطہ نمبر 4 اور سیکشن 124,13-ای، 149 پاکستان پینل کوڈ اور مارشل لا ضابطہ نمبر 36، 4 اور 5 کے تحت الزامات میں مقدمے کیلئے پیش کیا گیا ہے۔ تفتیش کے دوران استغاثہ نے ملزمان کے خلاف جو ثبوت حاصل کیے وہ ذیل درج ہیں:

1- مواد، یعنی برآمدگی

2- اعترافی بیانات

3- ملزمان کی وقوعے پر موجودگی

اپنے ثبوتوں کی تائید میں استغاثہ نے ذیل درج گواہان کی جرح کی:

1-استغاثہ کا گواہ امام بخش

2-استغاثہ کا گواہ اسلم نور

3-استغاثہ کا گواہ ای سی ایم لغاری

4-استغاثہ کا گواہ دولت خان

5-استغاثہ کا گواہ زبیر

6-استغاثہ کا گواہ شفیق مرزا

7-استغاثہ کا گواہ غلام محمد

8-استغاثہ کا گواہ ولایت

9-استغاثہ کا گواہ اے سی ایم جمالی

10-استغاثہ کا گواہ شیخ محمود

11-استغاثہ کا گواہ مخدوم حیات

12-استغاثہ کا گواہ صفدر بھٹی

13-استغاثہ کا گواہ ممتاز برنی

مقدمے کے قانونی پہلو کو زیرِ بحث لانے سے قبل، مقدمے کے حقائق پر مبنی پہلو کے حوالے سے عرض کرنا چاہوں گا۔

اولاً استغاثہ کا گواہ امام بخش اے سی آئی جس نے رپورٹ کو مقدمہ نمبر 236 سال 1980 کے طور پر درج کیا ہے صرف اتنا کہنا ہے کہ 29 جولائی 1980 کو ایک مجسٹریٹ کی سربراہی میں کچھ گھروں پر چھاپہ مارا اور تخریبی مواد اور سائیکلو اسٹائل اور ٹائپ کیا ہوا مواد برآمد کیا۔ غلام

شبیر شر اور احمد کمال وارثی کو حراست میں لیا گیا۔ یہ ایک ہدایت پر ختم ہوتا ہے کہ اُن کے خلاف مقدمہ درج کیا جائے۔ ایف آئی آر مزید انکشاف کرتی ہے کہ معاملے کی تحقیقات ڈائریکٹوریٹ آئی ایس آئی کرے گا۔ ایف آئی آر مزید ظاہر کرتی ہے کہ اس پر کسی کے بھی دستخط نہیں ہیں اور نہ ہی اندراج کرنے والے اہلکار نے الفاظ میں کوئی تبدیلی کی ہے اور نہ ہی کسی اور نے اس پر دستخط ثبت کیے ہیں۔ ایف آئی آر کا عمیق مشاہدہ مزید ظاہر کرے گا کہ نہ تو جرم کے تفصیل اور نہ ہی وقت یا جرم کی نوعیت کا کوئی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ امر باعث حیرت ہوگا کہ مبینہ طور پر برآمد ہونے والے مواد کا ایف آئی آر میں کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ مزید براہ، اس میں چھاپہ مارنے والی ٹیم یا کسی مجسٹریٹ کے نام درج نہیں ہیں۔ نہ ہی یہ ملزمان کی تحویل اور انکی حراست یعنی کہ انکے مقامِ حراست کے متعلق کچھ نہیں بتائی۔ اس مضحکہ خیز ایف آئی آر پر یہ مقدمہ درج کیا گیا ہے۔

ایف آئی آر درج کرنے والا اہلکار امام بخش یہ ظاہر نہیں کرتا کہ ایف آئی آر لا پتہ ہے۔ اس کے یا تفتیشی اہلکار کی جانب سے ایف آئی آر کی گمشدگی سے متعلق کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ وہ یہ عدالت میں پیش نہیں کر سکے ہیں اور نہ ہی یہ پولیس یا کسی سرکاری ادارے کے پاس ہے۔

اس من گھڑت داستان اور نا قابلِ فہم اور نا قابلِ ادائیگی ناٹک کی تائید میں استغاثہ نے ذیل سے جرح کی ہے:

امام بخش استغاثہ کا گواہ نمبر 1، رمضان چھاپہ مارنے والا مجسٹریٹ استغاثہ کا گواہ نمبر 2، پولیس کانسٹیبل فیاض استغاثہ کا گواہ نمبر 3، پولیس کانسٹیبل دولت خان استغاثہ کا گواہ نمبر 4، اور مخدوم حیات استغاثہ کا گواہ نمبر 5۔

میں ہر گواہ کے بیان کے تفصیل میں نہیں جانا چاہوں گا۔ اس ضمن میں، میں انکے بیانات کے صرف ٹھوس حصوں کی نشاندہی کروں گا جو میرے دلائل سے متعلقہ ہوں گے۔ مجسٹریٹ جن کی گواہی پر استغاثہ کے مقدمہ کا زیادہ تر انحصار ہے کہتا ہے، (ا) کہ دروازہ کھلا ہوا نہیں تھا بلکہ چھاپہ مارنے والی ٹیم کا ایک رکن دیوار پھلانگ کر گیا اور دروازہ کھولا، جبکہ چھاپہ مارنے والی ٹیم کے اراکین فیاض اور دولت بتاتے ہیں کہ دروازہ مقفل تھا، جس کو دھکیل کر کھولا گیا اور چھاپا مارنے والی

ٹیم گھر کے اندر داخل ہوئی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑیگا اگر اس تضاد کو مدِ نظر نہیں رکھا گیا، تاہم آزاد گواہ اور چھاپہ مارنے والی ٹیم کا نگران مزید کہتے ہیں کہ وہ ملزمان کی شناخت سے اس حد تک قاصر ہے کہ بتا سکے کہ مقدمے کا سامنا کرنے والے سات ملزمات میں سے وقوع سے کن دو کو گرفتار کیا گیا تھا اور نہ ہی وہ ملزمان کے نام بتا پا رہا ہے۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ اس نے نہ کوئی وارنٹ جاری کیا، نہ ملزمان کی گرفتاری کے احکامات جاری کیے، اور نہ ہی ایف آئی آر درج کرنے کا کوئی حکم دیا۔ وہ اس سے بھی لاعلم ہے کہ ملزمان اور برآمد شدہ اشیا کہاں لے جائے گئے اور تفتیشی ادارے نے برآمد شدہ اشیا کس انداز میں رکھی تھیں۔

یہ بھی قابلِ ستائش ہوگا، اگر میں چھاپہ مارنے والی ٹیم کے رکن اور استغاثہ کے گواہ اسلم نور خان سب انسپیکٹر کے بیان کا بھی ذکر کر دوں، جو اس عدالت کے سامنے اپنے بیان میں تسلیم کرتا ہے کہ اُس نے جرم اور چھاپے سے متعلق حقائق رپورٹ کرنے یا اُس پولیس اسٹیشن میں جس کی حدود میں یہ وقوعہ پیش آیا تھا، رپورٹ درج کرنے کیلئے چند قدم چلنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ وہ اتنا سادہ لوح تھا کہ اُس نے کیس ڈائری یا پولیس اسٹیشن میں کوئی اندراج نہیں کیا۔ اُس نے کسی فوجی یا سول عدالت سے ملزمان کا ریمانڈ حاصل نہیں کیا۔ اسکا عمل ظاہر کرتا ہے کہ وہ ڈاکوؤں کے کسی گروہ کا رکن تھا جو کچھ لوگوں کو اغوا کرتا ہے اور اپنے صاحب کے سپرد کر دیتا ہے۔ وہ اس سے بھی لاعلم ہے کہ برآمد شدہ اشیا اور ملزمان کو کہاں رکھا گیا۔ مزید براں یہ کہ بیچارہ برآمد شدہ اشیا کی شناخت کرنے سے بھی قاصر ہے۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ کچھ دیگر اشیا برآمد شدہ اشیا میں گڈمڈ ہو گئی ہیں تاہم وہ لاعلم ہے کہ ان اشیا میں اضافہ کس نے کیا ہے۔ استغاثہ کی گواہی/ ثبوت کو وزن دینے کیلئے آیا ہوا شخص اشیا کی عدم موجودگی سے متعلق کچھ نہیں جانتا، جیسا کہ مثلاً مشیر نامے میں فاؤنٹین قلم کے بارے میں پوچھا گیا تو چپ سادھ کر بڑبڑانے لگا کہ قلم برآمد تو ہوا تھا لیکن مشیر نامے میں شامل نہیں کیا گیا۔ تجربہ کار پولیس اہلکار اثبات میں گردن ہلا کر تسلیم کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ ''جی ہاں کہ اشیا کی برآمدگی کے بعد وہ پہلی مرتبہ (جس دن عدالت میں اس پر جرح کی گئی) عدالت میں یہ برآمد شدہ اشیا دیکھ رہا ہے۔'' وہ کہتا ہے اس نے سادہ کپڑوں میں چھاپہ مارا

لیکن بدقسمتی سے مجسٹریٹ اس کی تائید نہیں کرتا اور مختلف موقف دیتا ہے کہ چھاپہ مارنے والی ٹیم وردی میں تھی اور ایک فوجی جیپ میں گئی تھی۔ بہ الفاظ دیگر انکے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ اُن میں سے ایک چھاپہ مارنے کے لئے گھر پر آیا جہاں سے ایک اور ملزم کے کچھ دفتری دستاویزات برآمد ہوئے۔ پولیس نے ان کو مشکوک سمجھا اور اس عدالت میں چالان کر دیا۔

جناب! میں ہر ملزم کے لیے علیحدہ اپنی معروضات پیش کرنا چاہوں گا کیونکہ موجودہ مقدمے میں سیکشن 149 پی پی سی لاگو کیا گیا ہے اور عدالت میں جرح کے لئے گواہان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ملزم مختلف مواقع اور اوقات پر اپنے ذاتی عمل سے اپنی ذاتی ذمہ داری کا حامل رہا ہے۔ مندرجہ بالا مفروضہ سمجھنے کیلئے ملزمان کو تین درجات میں تقسیم کرنا ضروری ہوگا۔

پہلا درجہ اُن ملزمان کا ہے جن سے مبینہ طور پر تخریبی مواد برآمد ہوا ہے۔ دوسرا درجہ اُن ملزمان کا ہے جن پر مذکورہ بالا ملزمان سے تعلق رکھنے کا الزام عائد کیا گیا ہے، یعنی انہوں نے جرم میں شراکت کی ہے۔ تیسرا درجہ ان ملزمان کا / ان معصوم لوگوں کا ہے، جو ان گھروں پر گئے اور حراست میں لیکر اس عدالت کے سامنے ملزم کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں۔ ملزم احمد کمال وارثی اور غلام شبیر شر پہلے درجے میں آتے ہیں، جبکہ ملزم جام ساقی اور امر لال دوسرے درجے اور ملزم بدر ابڑو اور سہیل سانگی تیسرے درجے میں شامل ہیں۔ اگر ملزمان پر علیحدہ علیحدہ مقدمہ چلایا جاتا تو میرے دلائل دینے کی نوبت ہی نہیں آتی کیونکہ تیسرے درجے میں شامل ملزمان بدر ابڑو اور سہیل سانگی سے متعلق استغاثہ کے گواہان نے کچھ بھی نہیں بتایا ہے اور نہ ہی انکے قبضے سے کوئی قابل گرفت قانون مواد برآمد ہوا ہے۔ انکے خلاف استغاثہ کا مقدمہ یہ ہے کہ ملزم سہیل سانگی کو پاکستان کوارٹرس سے حراست میں لیا گیا جہاں وہ اپنے خاندان اور بچوں کی کفالت کیلئے روزگار کی تلاش میں حیدرآباد سے آ کر اپنے دوستوں سے ملنے گیا تھا۔ لیکن حکومت جس کے ذمے پاکستان کے ہر شہری کو گذر بسر کی فراہمی یقینی بنانے کی زمہ داری ہے، نے اسکو غیر معینہ مدت تک جیل میں خوراک فراہم کرنے کی صورت میں اپنا فرض پورا کرنے کو ترجیح دی۔ بیچارے شاعر اور سنگ تراش بدر ابڑو کو اس وجہ سے گرفتار کیا گیا کہ اسکی ٹریولنگ ایجنسی کے چیک بکس اور فارم جیسی دستاویزات

اس گھر سے برآمد ہوئیں۔ میٹروپولیٹن شہری استغاثہ کے آداب جس کو انتہائی محنتی اور بے لوث اہلکار میسر ہیں، نے بیچارے ملزمان کے خلاف مندرجہ بالا ثبوت سمیٹے اور کسی جرم کے بغیر انہیں فوج اور پولیس کی تشدد گاہوں میں اذیتوں کا سامان کرنا پڑا اور چودہ ماہ کے بدترین تشدد اور تفتیش کے بعد انہیں عدالت کے روبرو پیش کیا گیا۔ یہ امر انکی بے گناہی ثابت کرنے کیلئے کافی ہے کہ ایک بھی سرکاری گواہ نے ان ملزمان کے خلاف ایک بھی بات نہیں کی ہے۔ جہاں تک ملزمان جام ساقی اور امر لال سے متعلق ثبوت یہ ہے کہ ملزم امر لال بھی ایجنسیوں کا ایک متاثرہ فرد ہے اور اس مقدمے کو بھگت رہا ہے، جامشورو پولیس نے انڈس ہوٹل حیدرآباد سے گرفتار کیا اور دستاویز جس کو تخریبی مواد بتایا گیا ہے اور جس نے پاکستان کے عوام کے مختلف حصوں اور فوجی اہلکاروں کے درمیان منافرت پیدا کی ہے، درحقیقت بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن حیدرآباد کی جانب سے جاری کردہ مارک شیٹ ہے۔ اب یہ عدالت پر منحصر ہے کہ وہ اس دستاویز کو سزا کیلئے کافی سمجھتی ہے کہ نہیں۔ اگر عدالت کا جواب اثبات میں ہے تو میں یہ عرض کروں گا کہ پاکستان کے تمام طلبہ کو عدالت میں ملزم قرار دیا جائے اور ملک کو ایسے شرپسندوں سے محفوظ رکھنے کیلئے مناسب اقدامات کیے جائیں۔ ملزم کے بالخصوص اس نکتے نے مجھے مجبور کیا ہے کہ میں تمام ملزمان کیلئے دلائل دوں۔ چوتھا ملزم جام ساقی اس جرم کے ارتکاب کے وقت سنٹرل جیل حیدرآباد میں مقید تھا۔ استغاثہ کا ان کے خلاف مقدمہ یہ ہے کہ ملزمان کے ٹولے کے سربراہ کے طور پر، وہ جیل سے ہدایات جاری کر رہے تھے، جس وجہ سے انہیں اس مقدمے میں ملزم بنایا گیا ہے۔ استغاثہ نے اس انکشاف کیلئے شبیر شر، کمال وارثی اور امر لال کے اعترافی بیانات پر انحصار رکھا ہے کہ انکو جام ساقی کی مدد اور مالی معاونت حاصل تھی۔ اس کے جواب میں یہ گذارش کرنا چاہوں گا کہ پولیس اور استغاثہ پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کے وجود، اسکے اراکین، اس کے دفاتر وغیرہ دکھانے میں ناکام رہے ہیں۔ جب وہ بنیادی تنظیم جس کے متعلق کیا جا رہا ہے کہ وہ مارشل لاحکومت، ملک، اسکے اسلامی نظریے اور نظریہ پاکستان کے خلاف کام کر رہی ہے لیکن استغاثہ اسکے خلاف کوئی ثبوت فراہم نہیں کر سکا ہے تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس تنظیم سے مبینہ طور پر وابستہ افراد نظریہ پاکستان، اسلام مارشل لاحکومت کے خلاف کام کر رہے ہیں اور ملک کے عوام الناس کے مختلف پرتوں کے درمیان نفرت

پیدا کر رہے ہیں۔ میں یہ بھی گذارش کرنا چاہوں گا کہ اگر یہ ثابت بھی ہو جاتا ہے کہ ملزمان کمیونسٹ پارٹی کے اراکین ہیں تب بھی یہ استغاثہ کا ذمہ تھا کہ وہ ثابت کرے کہ یہ جماعت مندرجہ بالا نظریات کے خلاف کام کر رہی ہے۔ اس کیلئے پارٹی کا منشور، اسکے کام کاج کے طور طریقے، دفاتر کا محل وقوع، پارٹی کی مالی معاونت کرنے والے افراد کے تفاصیل ریکارڈ پر لانے چاہیے تھے جس کے ذریعے عدالت کسی نتیجے پر پہنچے کہ آیا یہ جماعت ملک اور ریاست کے نظریۓ اور مذہب کے خلاف کام کر رہی ہے یا نہیں اور کیا اسکے اراکین پر مقدمہ چلنا چاہیئے یا نہیں۔ لیکن موجودہ مقدمے میں اس ضمن میں کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیا گیا ہے، یہاں تک کہ استغاثہ اس بات کا بھی کوئی ثبوت حاصل نہیں کر سکا ہے کہ ملزمان کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے اراکین ہیں۔ اب سوال یہ سامنے آئے گا کہ ملزمان کو عدالت میں کیوں گھسیٹا گیا ہے، انہیں تشدد اور تذلیل کا نشانہ کیوں بنایا گیا ہے، انہیں جیلوں میں کیوں رکھا گیا ہے۔ میں عرض کروں گا کہ موجودہ حکومت جو دائیں بازو کی ایک مذہبی حکومت ہونے دعویدار ہے اور دائیں بازو کی مدد کی طلبگار ہے تاہم یہ اس صورت میں ہی حاصل کر سکتی ہے جب وہ یہ ثابت کرے کہ وہ کمیونسٹوں اور بائیں بازو والوں کی مخالف ہے۔ اس لئے دائیں بازو کا نقطۂ نظر رکھنے والے افراد کی پشت پناہی حاصل کرنے کی غرض سے جنرل اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے اہلکاروں کو بائیں بازو کے نظریات رکھنے والے افراد کو حراست میں لیکر عدالتوں میں پیش کرنے کی ہدایات جاری کیں، چونکہ موجودہ حکومت منتخب نمائندوں پر مشتمل نہیں ہے اس لئے وہ ولی خان، شیر باز مزاری، خیر بخش مری، بیگم نصرت بھٹو یا فیض احمد فیض جیسے بڑے رہنماؤں کو حراست میں لینے سے خوفزدہ ہے۔ اس لئے حکومت نے معصوم افراد/ موجودہ ملزمان کو گرفتار کر کے ناٹک رچایا اور مشتہر کیا کہ کمیونسٹوں پر مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ جناب والیٰ! میں حکومت پاکستان کے مرکزی محکمہ داخلہ کی جانب سے سیکریٹری محکمہ داخلہ حکومت سندھ کو ارسال کیے گئے ایک خط کا حوالہ دوں گا، جس میں یہ کہا گیا ہے کہ صدرِ پاکستان کی خواہش ہے کہ جام ساقی، امر لال اور دیگر ملزمان کے مقدمے کا فیصلہ جلد از جلد کیا جائے اور انہیں سزا سنائی جائے۔ یہ خط ریکارڈ پر موجود ہے۔

اپنی اس گذارش کو مزید واضح کرنے کیلئے میں ملزمان کے خلاف ہر گواہ کے بیانات کی جدول پیش

کرنا چاہوں گا، جو واضح کرے گی کہ انہوں نے ملزمان کے خلاف کیا بولا ہے اور انکی گواہی کی قدر/ وقعت کیا ہے۔

گواہان کے نام	کس ملزم کے خلاف گواہی	فراہم کردہ ثبوت
استغاثہ کا گواہ امام بخش سب انسپیکٹر ، اُن دنوں اسٹنٹ سب انسپیکٹر نارتھ ناظم آباد، پولیس اسٹیشن کراچی، 30 جولائی 1980 کو ایف آئی آر درج کی۔ شکایت کنندہ کے دستخط کے بغیر ایف آئی آر کی صرف فوٹو کاپی	ملزم جام ساقی کے خلاف	کچھ نہیں
	ملزم سہیل سانگی کے خلاف	کچھ نہیں
	ملزم پروفیسر نقوی کے خلاف	کچھ نہیں
	ملزمان شبیر شر اور کمال وارثی کے خلاف	کچھ نہیں
	ملزمان امر لال اور بدر ابڑو کے خلاف	کچھ نہیں
استغاثہ کا گواہ شفیق احمد ہیڈ کانسٹیبل 30 جولائی 1980 کو نمبر سی-19 پاکستان کوارٹرس پر ڈیوٹی کے دوران ساڑھے نو بجے نذیر عباسی اور سوا دس بجے پروفیسر نقوی کو گرفتار کیا۔	کسی ملزم کے خلاف کچھ نہیں بولا	
استغاثہ کا گواہ غلام محمد اسسٹنٹ سب انسپیکٹر 31 جولائی 1980 کو اس نے ملزم سہیل سانگی کو گرفتار کیا	ملزم سہیل سانگی کے خلاف اُس نے کہا کہ اس نے 31 جولائی 1980 کو اسکو گرفتار کیا تاہم سہیل سانگی کی عدم موجودگی پر گواہ نے امر لال کی بطور سہیل سانگی نشاندھی کی۔ باقی ملزمان کے خلاف اس گواہ کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔	

استغاثہ کا گواہ شیخ محمود
بدر نیوز ایجنسی، ریگل چوک، صدر، کراچی کا مالک

ملزم کمال وارثی کے خلاف، اس گواہ کا کہنا ہے کہ جنوری 1980 میں اسکو سوویت یونین میں مسلمان کی کاپیاں فروخت کیلئے دی گئیں تاہم اُس نے ملزم کو رقم کی ادائیگی نہیں کی۔ ملزم پلٹ کر نہیں آیا۔ سات آٹھ ماہ بعد سب انسپیکٹر دکان پر آیا اور کتابوں کا پوچھنے لگا۔

دیگر ملزمان کے خلاف گواہ نے کچھ نہیں کہا۔

استغاثہ کا گواہ مخدوم حیات
سب انسپیکٹر منگھوپیر

ملزم بدر ابڑو کے خلاف، اُس نے کہا کہ اس نے بدر ابڑو کو ڈی ایس پی برنی اور مشیر ملک محمد اشرف اور چھاپہ مارنے والی ٹیم کے ہمراہ 4 نومبر 1980 کو گرفتار کیا۔ اگرچہ گواہ کا یہ نکتہ متنازعہ ہے لیکن دلائل کی غرض سے گواہ کو درست مان لیا جائے، تب بھی یہ ثبوت کوئی جرم نہیں بنتا۔

دیگر ملزمان کے خلاف وہ کچھ نہیں کہتا۔

استغاثہ کا گواہ صفدر علی خان
ایس ایچ او نارتھ ناظم آباد

ملزمان کمال وارثی اور شبیر شر کے خلاف، اس نے ایس پی لیاقت آباد کے ذریعے ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریشن ہیڈ کوارٹرس سے حکم نامہ وصول کیا کہ انکے خلاف مقدمہ درج کیا جائے۔

دیگر ملزمان کے خلاف وہ کچھ نہیں کہتا۔

استغاثہ کا گواہ اسلم نور

سب انسپیکٹر آرٹلری میدان، کراچی
ای سی ایم محمد رمضان لغاری کی موجودگی میں
چھاپہ مارنے والی پولیس ٹیم کا سربراہ

ملزم کمال وارثی کے خلاف اُس نے کہا کہ اُس نے ملزم کو پیپلز کالونی ناظم آباد میں سائیکلو اسٹائل مشین، کاغذات اور پمفلٹس کے ساتھ پایا۔ دونوں کو گرفتار کر کے ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریشن ہیڈ کوارٹرس کے سپرد کیا گیا۔
ملزم جام ساقی کے خلاف اسکی گواہی یہ ہے کہ اس ملزم کا شبیر شر کو تحریر کیا گیا خط ملا تاہم گواہ یہ خط جام ساقی کی جانب سے تحریر کے جانے کو ثابت کرنے میں ناکام رہا۔

سیکشن 149 پاکستان پینل کوڈ کے اطلاق کیلئے ذیل درج عناصر کا ہونا ضروری ہے:

(۱) غیر قانونی اجتماع یعنی پانچ سے زائد افراد کا اکٹھا ہونا

(۲) مشترکہ مقصد

دونوں عناصر کی عدم موجودگی میں ملزمان پر سیکشن 149 پاکستان پینل کوڈ کے الزامات کے تحت مقدمہ نہیں چلایا جاسکتا۔ موجودہ مقدمے میں ملزمان پر سیکشن 149 کے تحت غیر قانونی طور پر الزمات عائد کیے گئے ہیں، کیونکہ جائے وقوعہ سے صرف دو لوگ گرفتار ہوئے ہیں۔ دوئم یہ کہ وہاں کوئی غیر قانونی اجتماع نہیں تھا۔ جب الزام ہی غیر قانونی ہے تو ملزمان کو سزا نہیں دی جاسکتی اور پورا مقدمہ غیر مؤثر ہو جاتا ہے۔ مزید براں یہ کہ اسی معمول کی کارروائی کو بنیادی شرط یعنی عمل کا تسلسل، جو بنیادی طور پر وقت کے تسلسل یا امکان سے متعلق ہے، بہ الفاظ دیگر، حقائق کا سلسلہ اس طرح سے ایک دوسرے سے جُڑا ہو کہ وہ ایک ہی الزام کی صورت اختیار کر لے، پھر عمل کا تسلسل یا وقت کی حیثیت عمل کے تسلسل کو جوڑنے میں ایک بنیادی اہمیت کے حامل ہیں تا کہ اسکو معمولات کی کارروائی بنایا جا سکے اور میری گذارش یہ ہوگی کہ دونوں عناصر یعنی مشترکہ عمل اور وقت کے

تسلسل کا متعین ہونا یہاں پر ناپید ہیں۔

آ پکی توجہ ذیل درج قانون کی جانب مبذول کرانا چاہوں گا:

ای آئی آر 1946 سندہ صفحہ 23 (24) پی ایل ڈی سپریم کورٹ صفحہ 129،

پی ایل ڈی 1958 سپریم کورٹ صفحہ 131

الزامات کا دوسرا حصہ سیکشن 124 ای پاکستان پینل کوڈ کے تحت ہے۔ الزام پر بحث کرنے سے قبل، میں آسانی کیلئے مذکورہ سیکشن پیش کرنا چاہوں گا:

''سیکشن 124 پاکستان پینل کوڈ۔ کوئی بھی الفاظ سے، چاہے بولے گئے ہوں یا تحریری ہوں، کوئی علامت ہوں، کسی ظاہری انداز سے ہوں یا اسکے برعکس ہوں، قانونی طور پر قائم مرکزی یا صوبائی حکومت کی جانب عدم اطمینان پیدا کرنے یا اسکی کوشش کرنے کی غرض سے نفرت یا توہین پیدا کرتا ہے یا اسکی کوشش کرتا ہے، کو عمر قید یا اس سے کم دورانیے کی سزا جس کے ساتھ جرمانہ بھی ہوگا یا تین سال تک کی قید بشمول جرمانہ کی سزا کا مستوجب ہوگا۔''

موجودہ چارج شیٹ میں دونوں سیکشنز استعمال کیے گئے ہیں جبکہ اس حوالے سے مقاصد اور جرائم مختلف ہیں۔ سیکشن 149 پاکستان پینل کوڈ کسی غیر قانونی اجتماع کے اراکین کے کسی جرم کی معاونت کیلئے استعمال ہوتا ہے جبکہ 124 اے پاکستان پینل کوڈ مکمل طور پر علیحدہ ہے اور یہ بغاوت کے جرم سے متعلق ہے۔ قانون کہتا ہے کہ الزام اور جرم علیحدہ ہوں۔ عمومی ادراک بھی قانون کی اس توضیع کو تسلیم کرے گا۔ سیکشن 124 اے پاکستان پینل کوڈ براہِ راست سازش کرنے والے سازشیوں پر لگنا چاہئے تھا جبکہ دیگر پر سازشیوں کا معاون ہونے کے طور پر 149 پاکستان پینل کوڈ کے تحت الزام عائد کیا جانا چاہئے تھا۔ قانون کی توضیع کو اپنے خیال سے واضح کرنے کی غرض سے عائد کیے گئے الزامات اور پاکستان پینل کوڈ میں شامل کیے گئے سیکشن کو پیش کر رہا ہوں:

الزام

میں (مجسٹریٹ وغیرہ کا نام اور عہدہ) تم (ملزم کا نام) پر ذیل کے مطابق الزام عائد کرتا ہوں: کہ تم نے بتاریخ۔۔۔۔ سال۔۔۔ یا اس کے قریب بمقام۔۔۔۔ قانون کے تحت قائم

حکومت کے خلاف نفرت یا توہین پیدا کرتے ہوئے الفاظ سے (اگر کوئی اور طریقہ استعمال ہوا ہے تو واضح کیجئے) بغاوت کا جرم کیا ہے اور اس طرح پاکستان پینل کوڈ کے سیکشن 124 اے کے تحت سزا کے مستوجب جرم کے مرتکب ہوئے ہو جو کہ سیشن (۔۔۔۔۔) کورٹ میں مقدمہ چلانے جائے کا مستوجب ہے۔

الزام

میں (مجسٹریٹ وغیرہ کا نام) آپ (ملزم کا نام) پر ذیل کے مطابق الزام عائد کرتا ہوں:

کہ آپ۔۔۔۔ بتاریخ۔۔۔۔سال یا اسکے قریب ایک غیر قانونی اجتماع کے رکن تھے/ میں شامل تھے، جس کا عمومی مقصد۔۔۔۔ (مقصد واضح کریں)۔۔۔ اور آپ کے اس غیر قانونی اجتماع میں شامل ہونے کے دوران مذکورہ غیر قانونی اجتماع کے ایک اور رکن نے۔۔۔۔(عمل /سرگرمی واضع کریں) کا ارتکاب کیا جو کہ۔۔۔۔سیکشن۔۔۔۔ کے تحت سزا کا مستوجب ہے، جو کہ اس غیر قانونی اجتماع کا عمومی مقصد تھا (جس کے متعلق مذکورہ غیر قانونی اجتماع کے اراکین کو علم تھا کہ اجتماع کے عمومی مقاصد کے حصول کیلئے اس عمل کے کیے جانے کا امکان ہے) اور اس طرح آپ سیکشن 149 پاکستان پینل کوڈ اور میرے دائرہ اختیار (یا سیشن یا ہائی کورٹ کے دائرہ اختیار) میں قابلِ گرفت قانون جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔

اور یہاں میں مذکورہ عدالت کو آپ پر مذکورہ الزام کے تحت مقدمہ چلانے کی ہدایت کرتا ہوں۔ مذکورہ بالا الزامات کے مطالعے کی روشنی میں حالیہ مقدمے کے الزامات کی نوعیت ان سے متضاد ہے۔ اس لیے یہ معزز عدالت متعلقہ الزامات کی عدم موجودگی میں ملزمان پر مقدمہ چلانے یا انہیں سزا دینے کی اہل نہیں ہے۔ مزید براں، استغاثہ نے سیکشن 124 اے کے تحت کارروائی کیلئے مطلوبہ شرائط بھی پوری نہیں کی ہیں۔

مطلوبہ شرائط یہ ہیں: پہلی شرط ہے (1) کہ کوئی شکایت ہونی چاہئے حالیہ مقدمے میں ایسی کوئی شکایت موجود نہیں ہے جو کہ سیکشن 124 اے پاکستان پینل کوڈ کے تحت درج کرائی گئی ہو۔ ایف آئی آر کو اگر شکایت سمجھا جائے تو یہ اس مقصد کو پورا نہیں کرے گی کیونکہ بغاوت کی اس

شکایت پر مرکزی یا صوبائی حکومت کی جانب سے اختیارات کے حامل کسی اہلکار کے دستخط ضروری ہیں، ایسے اختیارات کے حامل کی عدم موجودگی میں مرکز یا صوبے کا سیکریٹری داخلہ ہی شکایت پر دستخط کرنے کا اہل ہے۔ یہاں ایف آئی آر پر ان دونوں اہلکاروں کے دستخط ہیں نہ ہی حکومت کی جانب سے اختیارات کے حامل کسی اور اہلکار کے۔ اس ایف آئی آر پر تو میجر طفیل کے بھی دستخط نہیں ہیں جو کہ حالیہ مقدمے کا شکایت کنندہ ہے۔

(1) اپنی مندرجہ بالا گذارش کی تائید میں، میں پاکستان کرمنل لا جرنل 1969 صفحہ 73 اور 68 سپریم کورٹ ایم آر صفحہ 318 پر انحصار کر رہا ہوں۔ (2) دوسری شرط حکومت سے منظوری ہے جس کے خلاف یہ جرم سرزد ہوا ہے۔ حالیہ مقدمے میں کسی مرکزی یا صوبائی حکومت نے مقدمے کی اجازت نہیں دی ہے اور یہ سیکشن 196 سی آر پی سی کی خلاف ورزی ہے جو کہ سیکشن 124 اے کے تحت چلنے والے کسی بھی مقدمے کیلئے لازمی ہے۔ میں 1976 پاکستان کرمنل لا جرنل 188 پی ایل ڈی 1969، صفحہ 40، پاکستان کرمنل لا جرنل 1969، صفحہ 121 اور 122 پر انحصار کر رہا ہوں۔

(3) تیسری شرط الفاظ یا مخصوص مضمون کا حوالہ ہے جس کی بنیاد پر سیکشن 124 اے پاکستان پینل کوڈ کو عمل میں لانا پڑا ہو۔ یہ سیکشن 124 اے کو لاگو کرنے کیلئے بنیادی شرط ہے، حالیہ مقدمے میں کسی بھی مضمون یا پمفلیٹ کے مندرجات کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ ان تینوں شرائط کی عدم موجودگی میں، عدالت سیکشن 124 اے پاکستان پینل کوڈ کے تحت ملزمان پر مقدمہ چلانے کی اہل نہیں ہے، یہاں تک کہ اس نکتے پر جرح کے دوران بھی گواہان اس ضمن میں کوئی ثبوت/ حوالہ دینے میں ناکام رہے ہیں جو کہ ملزمان کو سزا کا مستوجب بنا سکیں۔ اس ضمن میں ایک گواہ نے کچھ غیر ربط فقرے پڑھ کر الزامات کی توثیق کرنی چاہی کہ یہ حکومت مخالف ہے۔ تاہم اس استفسار پر کہ آیا اُس نے یہ پورا مضمون پڑھا ہے تو جواب انکار میں آیا اور ڈھٹائی سے کہنے لگا کہ اس نے پورا مضمون نہیں پڑھا ہے اور نہ ہی پمفلیٹ میں ذکر کیے گئے مضمون کے تفصیل دے سکتا ہے۔ مذکورہ گواہ کے بیان کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کیونکہ یہی کچھ لوگوں کے ذہنوں میں ٹھونسا گیا ہے۔

کوئی سزا سنائے جانے سے قبل ان مضامین کا غور سے جائزہ لینا ہوگا۔ جو بھی ان مضامین کا مفہوم ہے اور ان کا اثر کیونکر ہوا ہے، اس کے بغیر کوئی سزا نہیں دی جا سکتی، جیسا کہ کئی ایک معزز عدالتیں کر چکی ہیں۔ ذیل پر انحصار کیا جاتا ہے:

اے آئی آر 1931 لاہور 12=238 لاہور 42=345 کرمنل لا جرنل 997

(ایف بی) + اے آئی آر 1930 آل: 52=401 آل 31:775 کرمنل لا جرنل 840

(ایف بی)، اے آئی آر 1927 کلکتہ 28=698 کرمنل لا جرنل 723 (ڈی بی)

اعترافات

استغاثہ ملزمان امر لال، غلام شبیر اور احمد کمال وارثی کے اعترافات پر انحصار کر سکتا ہے۔ ضروری سمجھتا ہوں کہ مندرجہ بالا نکتے پر اپنی گذارشات پیش کروں۔

ملزم غلام شبیر شر کا اعترافی بیان 28 اگست 1980 کو ریکارڈ کیا گیا، اسکی گرفتاری کے ایک ماہ بعد جبکہ ملزم احمد کمال وارثی کا اعترافی بیان 31 اگست 1980 کو ریکارڈ کیا گیا، اسکی گرفتاری کے ایک ماہ اور دو دن کے بعد۔

اعترافی بیان سی آر پی سی کے سیکشن 164 کے تحت ریکارڈ کیا جاتا ہے اور اس کا ذیلی سیکشن (3)164 اس کے ریکارڈ کرنے کا طریقہ واضح کرتا ہے۔ سیکشن کہتا ہے کہ بیان لازمی طور پر سی آر پی سی سیکشن 364 کی شرائط کے تحت ریکارڈ کیا جانا چاہیئے جو بیان کی ریکارڈنگ کے شرائط واضع کرتا ہے۔ سیکشن 364 کی شرائط ذیل درج طور ہیں:

1- سوالات اور جوابات مکمل طور پر درج کیے جائیں گے۔

2- کیا جانے والا ہر سوال مکمل طور پر درج کیا جائے گا۔

3- کہ یہ اُس زبان میں ریکارڈ/ درج کیا جائے گا جس زبان میں ملزم نے اعتراف کیا ہو۔

4- یہ اس (ملزم) کو دکھایا جائے گا۔

5- اگر اعتراف انگیزی میں ریکارڈ کیا گیا ہوگا تو یہ اسکو ترجمہ/ واضح کر کے سنایا جائے گا۔

6-ملزم کواپنے جوابات میں اضافے یا وضاحت کرنے کی آزادی ہوگی۔

7- مجسٹریٹ اپنے ہاتھ سے سرٹیفکیٹ جاری کرے گا۔

8-کہ اگر اعتراف اسکی دستی تحریر میں درج / ریکارڈ نہیں ہوا ہے تو وہ ایک دستاویز / میمورنڈم میں بیان ریکارڈ نہ کرسکنے کی وجوہات بیان کرے گا۔

سیکشن (3) 164 مزید شرط عائد کرتا ہے کہ مجسٹریٹ اپنی شناخت ظاہر کرنے کا پابند ہے اور اسکو یقین دہانی کرنی ہوگی کہ اعتراف رضا کارانہ طور پر کیا جارہا ہے یا نہیں۔ اسکو وہ وجوہات بھی درج کرنا ہوں گی کہ وہ کیونکر سمجھتا ہے کہ اعتراف رضا کارانہ ہے، کیوں کہ اعتراف خود کرنے والے کے خلاف بھی استعمال ہوسکتا ہے۔ اسی لئے اعلیٰ عدلتوں نے متعین کیا ہے کہ اعتراف ریکارڈ کرنے سے قبل مجسٹریٹ مدنظر رکھے کہ ملزم کو کن حالات میں اسکے سامنے پیش کیا گیا ہے اور وہ کون سے حالات ہیں جن کی وجہ سے ملزم یہ بیان رے رہا ہے۔

زیرنظر مقدمے میں بیان ریکارڈ کرنے والے مجسٹریٹ نے ان شرائط کو مدِ نظر نہیں رکھا۔ اس ضمن میں بیان ریکارڈ کرنے والے مجسٹریٹ کی جانب سے دیئے گئے جوابات اس نکتے کے تصفیئے میں مدگار ثابت ہوسکتے ہیں۔

ایگزامینیشن انچیف کے دفتر میں وہ کہتے ہیں کہ میں ملزم کو شناخت کرنے سے قاصر ہوں کیونکہ یہ ایک پرانا معاملہ ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عدالت کس طرح متعین کرے گی کہ یہ وہی ملزم تھے جو اعترافی بیان کیلئے انکے سامنے پیش کیے گئے تھے۔ کیا عدالت کسی ثبوت کے بغیر اپنے طور پر متعین کرے گی کہ یہی وہ لوگ تھے جو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیے گئے تھے۔ فوجداری مقدمات کی طویل تاریخ میں کسی عدالت نے یہ نہیں کیا ہے۔ عدالتیں اپنے سامنے پیش کیے گئے ثبوتوں کی روشنی میں انصاف فراہم کرنے کیلئے ہوتی ہیں نہ کہ قیاس کی بنیاد پر۔ اس طرح زیرِ نظر مقدمے میں ملزمان کو عدالت میں پیش کیے جانے سے متعلق کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ دوسرا سوال جو اس معزز عدالت کی توجہ کے لائق ہے وہ یہ کہ کن حالات میں اعتراف ریکارڈ ہوا۔ ملزم کو آرمی سروس کو رکوارٹر جنرل کینٹ اسٹیشن سے مجسٹریٹ کے پاس لایا گیا۔ (ملاحظہ کیجئے

مجسٹریٹ کا علی امجد ایڈووکیٹ کی جرح کے دوران جواب)۔انہیں 29 جولائی 1980 کو گرفتار کیا گیا یعنی اعتراف کیلئے پیش کیے جانے سے ایک ماہ قبل۔اس ضمن میں انتہائی اہم بات یہ ہے کہ ملزمان کسی عدالت کے قانونی ریمانڈ کے بغیر تحویل میں تھے اور معزز مجسٹریٹ نے ریمانڈ لیٹر کا دریافت ہی نہیں کیا۔خود مجسٹریٹ بھی وہ لیٹر پیش نہیں کر سکا جو اعتراف ریکارڈ کرنے کیلئے اسکو تحریر کیا گیا تھا۔پھر یہ تمام اعترافات ایک ہی مجسٹریٹ نے ریکارڈ کیے۔ یہ وہ ماحول اور حالات تھے جن میں یہ اعترافات ریکارڈ کیے گئے۔

اب یہ دیکھنا عدالت کا فریضہ ہوگا کہ یہ اعترافات رضا کارانہ ہیں یا نہیں۔حالات و ماحول کیا تھے جن میں یہ اعترافات کیے گئے۔اعلیٰ عدالتوں نے متعین کیا ہے کہ یہ دیکھنا عدالت کا کام ہے کہ اعترافات کے رضا کارانہ ہونے کا تعین کرنے سے قبل اُن حالات کا جائزہ لے جن میں ملزم کو تفتیش کے دوران رکھا گیا ہو۔

حالات یہ رہے ہیں:

(a) ملزمان کو ایک ماہ کے بعد پیش کیا گیا۔

(b) کوئی ریمانڈ نہیں لیا گیا تھا۔

(c) اُن پر تشدد کیا گیا۔

(d) کوئی تفتیشی اہلکار یا پولیس اہلکار یہ ذمہ داری لینے کیلئے میسر نہیں ہے کہ یہ پورا عرصہ ملزمان انکے پاس تھے۔

(e) کہ ایک ملزم نذیر عباسی کو قتل کر دیا گیا۔

(f) کیا ملزمان کو پولیس تحویل میں دیا گیا؟

مندرجہ بالا شرائط کی تائید میں، میں پی ایل ڈی 1978 پشاور صفحہ 38 پر انحصار کرتا ہوں۔

آیئے اب نظر ڈالتے ہیں کہ کیا اعتراف ریکارڈ کرنے سے قبل معزز مجسٹریٹ نے رسمی کارروائی مکمل کی تھی جو کہ اسکے لئے لازمی ہے، تو اسکا جواب نفی میں ملتا ہے اور اسکی وجوہات ذیل درج ہیں:

1-مجسٹریٹ نے شناخت ظاہر نہیں کی ہے، سی آر پی سی کے سیکشن (3)164 اور 364 کا حوالہ دیا جا سکتا ہے اور اس ضمن میں پاکستان کرمنل لا جرنل 1978 صفحہ 304، پاکستان کرمنل لا جرنل 1977 صفحہ 863 پر انحصار کیا جا سکتا ہے۔

2-اعترافات نہ تو ملزمان کی زبان میں ریکارڈ کیے گئے ہیں اور نہ ہی یہ انہیں سمجھ میں آنے والی زبان میں پڑھ کر سنائے گئے ہیں جیسا کہ مجسٹریٹ اپنے بیان میں خود بتا چکے ہیں۔

حوالہ جات سپریم کورٹ 1977 صفحہ 437 اور پی ایل ڈی 1978 پشاور صفحہ 116

3-اعترافات ایک مہینے کی تاخیر کے بعد ریکارڈ کیے گئے اور اس تاخیر کی تفتیشی یا کسی اور اہلکار نے کوئی وضاحت نہیں کی ہے۔ ایسی صورت میں سمجھا جائے گا کہ یہ رضا کارانہ نہیں ہیں جیسا کہ پی ای ڈی 1977 پشاور صفحہ 64 پر بتایا گیا ہے۔ دوئم یہ کہ ملزمان جتنا زیادہ عرصہ پولیس تحویل میں رہے گا اتنے ہی شکوک وشبہات زیادہ ہوں گے کہ اعتراف تناؤ اور غیر ضروری دباؤ کا نتیجہ ہے۔ ان ضمن میں انحصار پاکستان کرمنل لا جرنل 1978 صفحہ 579 پر کیا گیا ہے جو کہ پی ای ڈی 1977 کراچی صفحہ 760 میں بھی مقدم رکھا گیا ہے۔

اس تذکرے کا حوالہ دینا اہم ہوگا جس میں تیس/ بتیس روز کی تاخیر کے بعد اعتراف ریکارڈ کیا گیا اور معزز عدالت نے اسکو رضا کارانہ قرار نہیں دیا اور اس پر اعتبار/ انحصار نہیں کیا۔ انحصار پاکستان کرمنل لا جرنل 1975 صفحہ 440 پر کیا جا رہا ہے۔

4-موجودہ مقدمے میں زیرِ بحث اعترافات اُسی پولیس اہلکار کے سپرد کیے گئے۔ یہ بھی اس کا متقاضی ہے کہ اعترافات پر اعتماد نہ کیا جائے۔ میں پی ای ڈی 1960 کراچی صفحہ 674 پر انحصار کرتا ہوں۔

5-فاضل مجسٹریٹ جنہوں نے اعترافات ریکارڈ کیا، تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے ملزم احمد کمال وارثی کا بیان عدالتی اوقات کار کے بعد دوپہر ایک بجے ریکارڈ کیا۔ یہ طئے شدہ قانون ہے کہ عدالتی اوقات کار کے بعد ریکارڈ کیے گئے اعترافات پر اعتبار نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ فوجداری طریقہ کار کے متضاد ہے۔ پاکستان کرمنل لا جرنل 1975 صفحہ 1077 پر انحصار کیا جاتا ہے۔

۶-اعتراف ریکارڈ کرنے والے مجسٹریٹ کا میمورنڈم اور سرٹیفکیٹ ریکارڈ کرنا فرض ہوتا ہے لیکن فاضل مجسٹریٹ نے یہ کارروائی سرانجام نہیں دی۔

۷-آخر میں یہ کہ ملزم نے اعتراف سے دستبرداری کر دی ہے اور جہاں اعتراف کے ساتھ ایسا ہو جائے تو عدالت کو دیکھنا پڑتا ہے کہ سیکشن 304 اور 164 سی آر پی سی کی شرائط کی پیروی کی گئی ہے یا نہیں۔ کیا توثیق کرنے والے ثبوت موجود ہیں یا نہیں، زیرِ بحث مقدمے میں دونوں اجزا ناپید ہیں۔ ان اجزا کی عدم موجودگی میں اعترافات نا قابلِ سماعت ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں پاکستان کرمنل لا جرنل 1978 صفحہ 304 اور پاکستان کرمنل لا جرنل 1977 صفحہ 863 اور پاکستان کرمنل لا جرنل 1969 صفحہ 1124 پر انحصار کیا جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ شریک ملزم کے اعتراف کیلئے کسی شریک کار کے اعتراف سے متعلقہ ہونا لازمی ہے۔ اسکو انتہائی گہرائی سے دیکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ استغاثہ ان اعترافات کو شریک ملزمان کے خلاف استعمال کر رہا ہے۔

مثلاً، جانچ اہلکار جناب برنی کہتے ہیں کہ ملزمان کے اعترافات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جام ساقی کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی مدد کر رہا تھا اور اس نے سائیکلو اسٹائل مشین کی خریداری کیلئے دس ہزار روپے دیئے تھے لیکن اس کی تائید میں کسی بھی استغاثہ کے گواہ کے بیان سے کچھ نہیں ملتا اور نہ ہی اس اعتراف کی تائید میں کوئی دوسرا ثبوت پیش کیا گیا ہے کہ مثلاً جام ساقی نے یہ رقم کیسے، کب اور کہاں دی یا کس کے ذریعے دی۔ استغاثہ کے گواہان اور ثبوت اس ضمن میں خاموش ہیں۔

جانچ اہلکار یہ کہہ کر ایک انتہائی غریب اور معصوم شخص بدر جمال ابڑو کو ملوث کرتا ہے کہ ٹریول ایجنسی کا ریکارڈ پاکستان کوارٹرس سے برآمد ہوا اور شبیر شر نے تسلیم کیا ہے کہ وہ عارفہ انٹرنیشنل میں کام کر رہا تھا، اس لئے بدر جمال کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا رکن ہے اور جرح میں شریک ملزمان کا شریک کار رہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آیا اعتراف کے اس حصے کے ضمن میں استغاثہ کی جانب سے کوئی آزادانہ ثبوت حاصل اور پیش کیا گیا ہے تو اسکا جواب ہمیں نفی میں ملتا ہے، جیسا کہ جانچ اہلکار خود

تسلیم کرتا ہے کہ ملزم بدر جمال ابرو کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا رکن ہے اور وہ اسکی مالی معاونت کر رہا تھا۔

یہ ظاہر کرتا ہے کہ کسی شریک ملزم کے خلاف اعترافی بیان کو استعمال کرنے کیلئے مطلوب لازمی اجزا ناپید ہیں، اس لئے اسکو شریک ملزم کے خلاف استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

اس ضمن میں پی ایل ڈی 1978 سپریم کورٹ صفحہ 200 اور پی ایل ڈی 1978 کراچی صفحہ 637 پر انحصار کیا جاتا ہے، جن کے مطابق شریک ملزم کا اعتراف ایک انتہائی کمزور نوعیت کا ثبوت ہے جس کو شریک ملزم کے خلاف استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اس ضمن میں پی ایل ڈی 1978 لاہور صفحہ 523 بحوالہ مقدمہء ذوالفقار علی بھٹو پر انحصار کیا جاسکتا ہے۔

آخر میں، عدالت سے میری استدعا ہوگی کہ میری جرح کے دوران فاضل مجسٹریٹ کی جانب سے تسلیم کی گئی باتوں کا جائزہ لیا جائے۔ یہ تسلیم کی گئی باتیں ذیل طور ہیں:

(a) کہ میں نے غلام شبیر شر کے اعترافی بیان میں اپنا مکمل عہدہ درج نہیں کیا ہے۔

(b) کہ میں نے اعترافی بیان کے کسی بھی صفحے پر دستخط نہیں کیے ہیں۔

(c) کہ اعتراف پر عدالتی مہر لگی ہوئی نہیں ہے۔

(d) کہ وہ تسلیم کرتا ہے کہ سیکشن (3)164 سی آر پی سی کے تحت بیان ریکارڈ کرنے والے مجسٹریٹ کو میمورنڈم ریکارڈ کرنا ہوتا ہے جو کہ اس نے نہیں کیا۔

(e) سیکشن (2)164 سی آر پی سی کے تحت اعتراف مقدمہ چلانے والی عدالت کو ارسال کیا جاتا ہے لیکن فاصل مجسٹریٹ تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ عدالت کو ارسال نہیں کیا۔

(f) کہ میں نے فارم میں یہ ذکر نہیں کیا کہ میں اے سی ایم ہوں یا فرسٹ کلاس مجسٹریٹ (شناخت ظاہر نہیں کی گئی)

(g) مندرجہ بالا حقائق اور اسباب کی بنیاد پر اعترافی بیان پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔

برآمدگی

اشیا کی برآمدگی متنازعہ ہے اور ذیل درج وجوہات کی بنا پر نا قابلِ اعتبار ہے:

1- کہ برآمدشدہ اشیا کی کسی بھی گٹھڑی کو سر بہ مہر نہیں کیا گیا۔

2- کہ برآمدشدہ اشیا فوری طور پر فوجی حکام لے گئے۔

3- کہ گواہان یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ برآمدشدہ اشیا فوجی حکام کے پاس کس حالت میں رکھی گئی تھیں۔

4- کہ برآمدشدہ اشیا کسی مشیر نامے کی تحت فوجی حکام کو نہیں دی گئیں اور نہ ہی یہ پولیس نے کسی مشیر نامے کے تحت واپس حاصل کیں۔

5- کہ فوجی گواہان میں سے کسی نے بھی آکر یہ نہیں بتایا کہ پولیس کی جانب سے برآمدکردہ اشیا ہی مشیر نامے کے تحت ان کی تحویل میں تھیں اور وہی اشیا مشیر نامے کے تحت واپس کی گئیں۔

6- کہ اٹھارہ ماہ تک یہ اشیا کہاں پڑی تھیں؟ آیا یہ حفاظت سے رکھی گئی تھیں اور اس دوران کسی کی بھی ان اشیا تک رسائی نہیں ہوئی تھی؟

7- کہ ملزمان سے پاکستان کوارٹرس اور پیپلز کالونی سے برآمد ہونے والی اشیا اتنی مماثلت رکھتی ہیں کہ ان کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔

8- کہ ان اشیا میں اضافے اور تبدیلیاں کی گئی ہیں۔

9- کہ مشیر نامے کے مطابق صرف نمبر شمار کی ہوئی اشیا ہی ملزمان سے برآمد ہوئی ہیں جبکہ عدالت میں موجود اشیا مشیر نامے کے اندراج سے زائد ہیں۔

10- کہ ہلچل جیسے کچھ پمفلٹس کے کچھ صفحات گُم ہیں

11- کسی بھی خانگی فرد کو مشیر نہیں بنایا گیا، اگرچہ وہ موجود تھے۔

12- ملزمان کو آرمی کور، ایف آئی اے کیمپس جیسی مختلف جگہوں پر رکھنا۔

13- کچھ اشیا موجود نہیں ہیں، مثلاً اسٹینسل اور قلم وغیرہ اشیا میں نہیں ہیں۔

14- مندرجہ بالا نکتے پر جرح کیے گئے استغاثہ کے گواہان نے ایک دوسرے کی تائید نہیں کی، بلکہ انکے بیانات ایک دوسرے سے متضاد ہیں، اس لئے قبول نہیں کیے جاسکتے۔

15- تمام گواہان کے اپنے مفادات ہیں اور یہ پولیس اہلکار ہیں۔

16- یہ بھی استغاثہ کے گواہان کی جانب سے تسلیم کیا گیا ہے کہ کچھ پمفلٹ وغیرہ شامل کیے گئے ہیں اور اِس لئے کہا جاسکتا ہے کہ برآمدشدہ اشیا میں یہ اضافے کسی مخفی مقصد کے تحت کیے گئے ہیں۔

17- برآمدشدہ اشیا میں تبدیلی اور اضافے کیے گئے ہیں۔

18- دوئم یہ کہ کوئی بھی یہ بتانے اور سمجھانے سے قاصر تھا کہ یہ کہاں رکھی گئیں اور کس کی تحویل میں تھیں۔

19-سوئم یہ کہ برآمدشدہ اشیا سر بہ مہر نہیں کی گئیں۔

20- کہ برآمدشدہ اشیا کی شناخت نہیں کی گئی۔

21- کہ اس گھر کے مالک کو پیش نہیں کیا گیا ہے جو یہ کہتا کہ گھر ملزمان کے پاس تھا۔

22- آخر میں یہ کہ چھاپا مارنے والی پارٹی کی قیادت کرنے والا مجسٹریٹ ملزم کو شناخت نہیں کر پایا اور کہا کہ وہ جائے وقوعہ سے گرفتار کیے گئے ملزمان کو شناخت کرنے سے قاصر ہے۔

23- مندرجہ بالا صورتحال میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ملزمان کی تلاشی سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوا تھا اور دلائل کی وجوہات کی بنا پر کچھ دیر کیلئے یہ تسلیم بھی کیا جائے کہ ملزمان سے کچھ اشیا برآمد ہوئی تھیں تو اُس صورت میں بھی یہ تعین سے نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اُن سے کیا برآمد ہوا تھا۔

24- اس ضمن میں، میں عدالت کی توجہ مقدمے کے قانونی پہلو کی جانب مبذول کرانا چاہوں گا۔ یہ تلاشی سیکشن 165,103 اور 166 سی آر پی سی کے تحت لی گئی۔ سیکشن 165 کے تحت پولیس اسٹیشن کا انچارج پولیس اہلکار گھر کی تلاشی لیتا ہے جبکہ سیکشن 166 کے تحت کسی اور پولیس اسٹیشن کا انچارج پولیس اہلکار ایسی تلاشی لے سکتا ہے جیسا کہ اس مقدمے میں ہوا ہے۔ مذکورہ گھر پولیس اہلکار اور مجسٹریٹ کے حدود میں نہیں آتا۔ اسکا مطلب ہے کہ مذکورہ تلاشی سیکشن 166 سی آر پی سی کے تحت ہوئی ہے جبکہ اس سیکشن کی ذیل درج شرائط ہیں:

(1) اولاً، کسی اور پولیس اسٹیشن کا اہلکار متعلقہ پولیس اسٹیشن کے اہلکار کو اس تلاشی کے اسباب سے آگاہ کرے گا۔

(2) دوئم، ایسا پولیس اہلکار سیکشن 165 سی آر پی سی کے تحت کارروائی کرے گا۔

موجودہ مقدمے میں دونوں شرائط کو پورا نہیں کیا گیا ہے بلکہ دیگر شرائط لاگو کی گئی ہیں کیونکہ استغاثہ کا کہنا ہے کہ اگر ان شرائط کو پورا کیا جاتا تو شواہد کے ضائع ہونے کا احتمال تھا۔ ایسی صورت میں سکیشن کہتا ہے کہ ایسی صورتحال میں پولیس اسٹیشن کے انچارج کو نوٹس ارسال کیا جائے گا اور اسکو مشیر نامے کی ایک نقل بھی بھیجی جائے گی، جس کی ایک نقل قریب ترین مجسٹریٹ کو بھی بھیجی جائے گی اور اس سے جرم کے قابلِ گرفتِ قانون ہونے کی صورت میں کارروائی کرنے کو استدعا کے ساتھ گھر کے مالک کو مشیر نامے کی نقل دی جائے گی۔

چھاپہ مارنے والے پولیس اہلکاروں نے ان میں سے کوئی بھی شرط پوری نہیں کی ہے تاہم جب جرم کے سوالات کے دوران دریافت کیا گیا تو مذکورہ پولیس اہلکار کا کہنا تھا کہ متعلقہ پولیس اسٹیشن کو مطلع کرنا مجسٹریٹ کا فرض تھا نہ کہ اسکا۔ جب مذکورہ پولیس اہلکار سے یہ دریافت کیا گیا کہ آیا اس نے ایف آئی آر کی نقل کسی کو ارسال کرنے یا مجسٹریٹ سے ملزمان کی گرفتاری یا ریمانڈ دینے کیلئے کہا تو اُسکا جواب نفی میں تھا۔ اور جب مجسٹریٹ سے دریافت کیا گیا کہ آیا انہوں نے اسکے متعلق کسی اہل اختیاری کو آگاہ کیا تو انکا جواب نفی میں تھا۔ پولیس اہلکار ذمہ داری کا بوجھ مجسٹریٹ کے کندھوں پر ڈال رہا ہے جبکہ مجسٹریٹ یہ بوجھ پولیس پر ڈال رہا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ واضح اور ثابت ہوتا ہے کہ تلاشی قانون کے مطابق نہیں تھی اور اس دوران سی آر پی سی کے کسی بھی سیکشن کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا اور نہ ہی وہ ان لازمی قانونی شرائط کی عدم پیروی کا کوئی قابلِ ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔

جناب!

میں مودبانہ طور پر عرض کروں گا کہ کوئی بھی قانون سے بالاتر نہیں ہے، جس کے تحت جب یہ تلاشی ہی غیر قانونی ہے تو پھر اسکے نتیجے میں برآمد ہونے والی اشیا کی کیا اہمیت؟

اس ضمن میں پی ای ڈی 1973 کراچی صفحہ 157 اور 91 پر انحصار کیا جاتا ہے۔

اب ہم یہ جائزہ لیں گے کہ ان برآمدگیوں کا اثر/نتیجہ کیا ہے؟ آیا برآمد شدہ مواد تخریبی مواد کے

زمرے میں آتا ہے۔اس موضوع کوزیر بحث لانے کیلئے اس ثبوت کودوحصوں میں منقسم کریں گے:

(i) حالات وواقعات جن میں یہ برآمدگیاں کی گئیں اور برآمدشدہ اشیا کی نوعیت

(ii) آیا برآمدشدہ اشیا ملزمان کے قبضے سے برآمدہوئیں اور آیا یہ تخریبی ہیں یا نہیں؟

حالات وواقعات جن میں اشیا برآمد کی گئیں، (a) برآمدگی چھاپہ مارنے والی پارٹی نے پیپلز کالونی اور پاکستان کوارٹرس میں واقع دوگھروں سے کی۔ دونوں گھر ملزمان میں سے کسی کے نہیں تھے۔ پولیس نے گھروں کے مالکان کوتلاش کرنے کی زحمت گوارانہیں کی، جواس متعلق بتا سکتے تھے کہ برآمدگی کے وقت یہ گھر کس کے پاس تھے۔ پولیس کیلئے پاکستان کوارٹرس کے گھر کے اصل مالک کوتلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا کیونکہ یہ کوارٹرسرکاری ملازمین کوہی الاٹ ہوتے ہیں۔ یہ مذکورہ گھر کی سکونت سے متعلق ٹھوس ثبوت ہوتا۔(b) دوئم، برآمدشدہ اشیا کی نوعیت کوبھی دوحصوں میں تقسیم کیا گیا ہے،اشیا کا ایک حصہ مواد، رسائل اور کتابوں پر مشتمل ہے جوپیپلز کالونی سے برآمد ہوئے ہیں جبکہ دوسرا حصہ رجسٹروں، پاسپورٹوں اور چیک وغیرہ کا ہے، جو پاکستان کوارٹرس سے برآمد ہوئے۔ واضح طور پر اشیا کی دوسری نوعیت رجسٹر وغیرہ اس ادارے کے دستاویزات ہیں جولوگوں کے سفری معاملات طئے کرتی ہے اور جس کے مالک کوقانونی طور پر ٹریول ایجنسی چلانے کی اجازت حاصل تھی۔ برآمدگی کی پہلی نوعیت ملزمان کے خلاف تین حوالوں سے ثابت ہوسکتی ہے:

(i) کہ استغاثہ ثابت کرے کہ موادملزمان کے قبضے سے ہی برآمد ہوا تھا۔

(ii) کہ یہ تخریبی نوعیت کا ہے اوراس نے ایسی صورتحال پیدا کردی ہے جس میں ماشل لا ضوابط اور پینل کوڈ کا اطلاق ناگزیر بن گیا۔ حالیہ مقدمے میں استغاثہ ان بنیادوں پر یہ ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے کہ کسی بھی گواہ نے یہ بیان نہیں دیا ہے کہ یہ اشیا غلام شبیر شر اور احمد کمال وارثی سے ہی برآمد ہوئی ہیں۔ گواہان مذکورہ گھر کے مکینوں اور مالک کے متعلق چپ سادھے ہوئے ہیں۔

ملزمان جام ساقی، امرلال، سہیل سانگی، بدرابڑو کے قبضے سے کوئی قابلِ گرفت قانون مواد

برآمد نہیں ہوا ہے۔اب پاکستان پینل کوڈ کے سیکشن 34 اور 149 کے اطلاق کا سوال سامنے آتا ہے۔استغاثہ مندرجہ بالا ملزمان کے ارادوں اور عمل کے متعلق چپ سادھے ہوئے ہے۔استغاثہ کے کسی بھی گواہ نے برآمد شدہ مواد کے کسی فقرے، کسی سطر کو تخریبی مواد کے طور پر نہیں بتایا ہے۔وہ تو جرح کے دوران تخریبی مواد والے فقروں اور سطروں کی نشاندہی کرنے میں بھی ناکام رہے ہیں۔مزید براں، استغاثہ کسی ماہر کا جائزہ شامل کرنے میں بھی ناکام رہا ہے جو اس مواد کے تخریبی ہونے یا نہ ہونے پر کوئی مناسب رائے دے سکتے تھے۔

ملزمان کی جانب سے کسی جرم کے ارتکاب کا تعین کرنے کیلئے ذیل درج حقائق ہوں گے:

1-آیا ملزمان کی جانب سے اس نام نہاد قابلِ اعتراض مواد کو اپنے پاس رکھنے کی وجہ سے:

(i) ان پمفلٹس کے نتیجے میں مختلف صوبوں، ذاتوں، فرقوں یا مذاہب کے درمیان سلامتی یا نفرت کے احساسات پیدا ہوئے۔(ii) ملزمان کے قبضے سے حاصل ہونے والے نام نہاد قابلِ اعتراض دستاویزات کے براہ راست نتیجے میں عوام الناس میں بے چینی یا تناؤ پیدا ہوا۔اور (iii) ملزمان سے برآمد ہونے والا کوئی بھی نام نہاد، قابلِ اعتراض مواد پاکستان کی سلامتی یا نظریے کے خلاف ہے۔

2-یہ بھی طئے ہونا ہے کہ (i) آیا نام نہاد مواد ملزمان کی ذات سے برآمد ہوا تھا۔ (ii) کیا ملزمان سے برآمد ہونے والی اشیا وہی ہیں جس کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔(iii) آیا ملزمان سے برآمد ہونے والا مواد فقرے کے ذیلی فقرے (i)، (ii) اور (iii) کی معنی میں قابلِ اعتراض ہے۔

ان حقائق پر میرے دلائل ذیل درج ہوں گے:

(i) کوئی جرح ثابت کرنے کیلئے یہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ جرح کی تائید میں آزادانہ ثبوت ہو یا اس سے ہم آہنگ حالات ہوں۔تاہم حالیہ مقدمے/ معاملے میں کسی بھی گواہ نے نہیں کہا ہے کہ ملزمان سے برآمد ہونے والے نام نہاد مواد میں کوئی ایسا لفظ، فقرہ یا جملہ شامل ہے جو صوبوں، فرقوں یا مذاہب کے درمیان بدگمانیاں پیدا کرے گا یا عوام الناس میں مسلح افواج سے متعلق عدم اطمینان یا ناراضگی پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔علاوہ ازیں کسی بھی استغاثہ کے گواہ نے

ملزمان سے برآمد ہونے والے پمفلٹس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں بولا ہے کہ ان میں نظریہ پاکستان کے خلاف مواد شامل ہے۔

(ii) جرم ثابت کرنے کیلئے استغاثہ کو اپنی داستان کی تائید میں حالات جاتی / ٹھوس ثبوت لانے چاہیے تھے، جن کے ذریعے ہی یہ ظاہر ہوتا کہ اس نام نا دقابلِ اعتراض مواد کے براہ راست نتیجے کے طور پر مختلف صوبوں یا فرقوں کے افراد کے درمیان کتنے ہنگامے پھوٹ پڑے ہیں یا مسلح افواج کے خلاف عدم اطمینان کے کتنے واقعات سامنے آئے ہیں اور کراچی کے کسی پولیس اسٹیشن پر اسکے متعلق کتنے مقدمات دائر کیے گئے ہیں۔ لیکن اسکے برعکس جب استغاثہ کے گواہان اسلم نور اور دیگر سے میں نے دریافت کیا کہ سٹی پولیس اسٹیشن جہاں وہ اُن دنوں بطور ایس ایچ او تعینات تھا کی حدود میں کوئی ہنگامہ آرائی ہوئی ہے تو اسکا جواب نفی میں تھا۔ اسکا مطلب ہے کہ استغاثہ کی جانب سے گھڑی گئی داستان کا کوئی عملی اثر نہیں ہوا ہے۔ اس ضمن میں یہ واضع / نشاندھی کرنا چاہوں گا کہ مذکورہ پمفلٹس ماضی بعید سے متعلق ہیں اور کچھ پمفلٹس اخبارات، رسائل اور کتابوں سے ماخذ تھے جو قانونی طریقہء کار سے شائع ہوئے اور عام بازار میں میسر تھے، اس لئے انہیں انصاف کے کسی بھی تقاضے کے تحت قابل اعتراض قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس طرح یہ معاملہ بھی استغاثہ کی تائید میں نہیں جاتا۔

(iii) اگر کچھ دیر کیلئے ہم قیاس بھی کرلیں کہ مبینہ مواد ملزمان کے قبضے سے ہی برآمد ہوا تھا تب بھی یہ کسی بھی طور کوئی جرم نہیں بنتا۔

آخر میں، میں الزام کی دوسری نوعیت/قسم کی طرف آؤں گا جو کہتی ہے کہ ملزمان نے نظریہء پاکستان اور اسلام کے خلاف عمل کیا ہے۔ میں لفظ ''نظریۓ'' کی تزمعنی سامنے لانا چاہوں گا۔ ریڈرز ڈائجسٹ کی گریٹ انسائیکلو پیڈک ڈکشنری (0.434) کے مطابق اس لفظ کی معنی ہیں۔ ''کسی سیاسی یا معاشی نظرئے یا نظام کی بنیاد پر تصورات کا ادراکی قیاس، تصورات کا جھرمٹ، کسی طبقے یا فرد کی فہمی آرا کا انداز۔'' مزید تجزیے پر یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ نظریہء پاکستان غیر منقسم ہندستان میں ملک کے قیام سے قبل موجود تھا۔ مسلم لیگ اس سیاسی فکر کی تشہیر وترویج کا منبع تھی

تاہم قیام پاکستان کے بعد یہ نظریہ پاکستان جغرافیائی پاکستان کی صورت میں تکمیل کو پہنچ گیا۔ نظریے کا وجود ہو گیا اور اسکی جگہ پاکستان کی جغفرافیائی سرحدوں نے لے لی۔ اس لئے نظرئے کو اسکی لغوی معنی میں غلط استعمال قرار دیا جاسکتا ہے۔ تاہم، اس ضمن میں، میں سندھ ہائی کورٹ کے وکیل جناب یونعمت مولوی کی جانب سے تصور پاکستان پر ایک تنقیدی تجزیاتی اور حقیقت پسندانہ مطالعہ پر تحریر کی گئی کتاب ''نظریہء پاکستان'' کے باب اول کے ایک فقرہ/ پیراگراف کا حوالہ دینا چاہوں گا:

''شاید قیام پاکستان یا 1906 میں مسلم لیگ کے قیام سے لیکر ''نظریے'' یا 'اسلامی نظریے' کی اصطلاح جیسی کوئی متنازعہ بات سامنے نہیں آئی ہے۔ یہ بھی ہے کہ یہ اصطلاح، اپنے موجودہ تناظر میں، پاکستان کے حوالے سے، حال ہی میں اختراع کی گئی ہے۔ اپنے وجود یا مظہر سے بالاتر، اس نے اپنا جاری سیاسی ابہام ایوب خان کے ملکی سیاسی اسٹیج پر آنے کے بعد پایا ہے۔ اس حقیقت کی تردید بھی نہیں کی جاسکتی کہ یہ نعرہ پاکستان کے بائیس سالا واقعات سے پُر عرصے میں پہلی مرتبہ بلند کیا گیا ہے۔ شاید اس نعرے کو بلند کرنے والے اسکی اہمیت، ضرورت اور نتیجے سے آگاہ نہیں تھے یا انہیں اپنی جماعتی بنیادوں پر سیاسی طور پر خاموشی اختیار کرنے میں ہی مصلحت نظر آئی کہ آنے والے انتخابات میں سیاسی مقاصد کے حصول کیلئے عوام کے مذہبی جذبات سے کھیلنے کیلئے یہ ایک نادر نسخہ ہوگا۔ واضح طور پر ملک کی خودمختیاری، عظمت یا استحکام سے متعلق اثرات کا ادراک کیے بغیر اسکو بلند کرنے والوں نے اپنے سیاسی مفادات کیلئے اسکا بھرپور استعمال کیا۔''

''نہ قانونی نہ آئینی اصطلاح''

اسٹراوُڈ عدالتی لغت کے حوالے سے دیکھا جائے تو لفظ نظریے کا انگریزی لفظ "Ideology" اس میں موجود نہیں ہے، اگرچہ بیوقوف کیلئے استعمال کیا جانے والا انگریزی لفظ "Idiot" موجود ہے۔ اس لئے بلا کسی ابہام کے کہا جاسکتا ہے کہ ''نظریہ'' کی اصطلاح نہ قانونی ہے اور نہ ہی آئینی، ورنہ اپنے لحاظ سے ایک شاندار علمی کام کرنے والوں سے یہ لفظ چھوٹ نہیں جاتا جس پر دنیا بھر میں قانونی ماہرین، قانون دان، وکلا اور عدالتی اہلکار دن رات انحصار کرتے رہتے ہیں۔

تاہم اس اصطلاح کی حقیقی معنی اور اہمیت و ماخذ سے ہم آہنگ ہونے کیلئے بہرصورت ہمیں کسی لغت کو رجوع ضرور کرنا پڑے گا۔ آکسفورڈ کنسائیز ڈکشنری میں اس انگریزی اصطلاح کا ماخذ "IDEO" بتایا گیا ہے، جس کے معنی ہیں اس کے نام کے اظہار کے بغیر کسی چیز کے تصور کا علامتی کردار، جیسا کہ ادراکی، فہمی وغیرہ۔ ''لوجی'' تصورات/ آدرشوں کا علم۔

اس طرح آئیڈیالوجی/ نظرئے کی اصطلاح کی قابلِ فہم معنی ''تصورات/ آدرشوں کی سائنس'' ہے۔ جس کیلئے قریب ترین انگریزی اصطلاح "Theory" بنتی ہے، جس کی لغت میں معنی ہیں: ''قیاس انگیز، کسی چیز کی وضاحت کرنا، اپنی جانب متوجہ کرتے ارتقائی قیاسی نقطہءنظر، نظریہ کے ایٹم جیسے غیر معمولی اور نتیجہ انگیز سے بالاتر اصولوں پر مبنی (اکثریت خیزہ انگیز تصور کے خیالات کے مظہر کو استعمال کرتے ہوئے)

مندرجہ بالا سے یہ نظر آتا ہے کہ ''تھیوری'' کی اصطلاح کے سائنسی معنی صرف ''ایٹم کی تھیوری'' ''کششِ ثقل کی تھیوری'' اور ''ارتقا کی تھیوری'' سے ہی مطابقت رکھتے ہیں اور یہ اپنے شعبہءجات میں مشاہدے اور تجربات کے ایک سلسلے کے نتیجے میں وجود میں آتی ہیں۔ جب کچھ ایسے نتائج اور حقائق سامنے آتے ہیں جو متعلقہ تھیوری میں مشاہدہ نہیں کیے جا سکتے تو تھیوری میں کچھ مناسب تبدیلیاں کی جاتی ہیں یا پھر تھیوری کو مسترد/ متروک کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے ''تھیوری'' کی اصطلاح کو بظاہر صرف سائنسی حوالے سے ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اگر ہم ''تھیوری'' اصطلاح کے حقیقی تناظر کو نظر انداز کریں گے اور اسکو کسی ریاست پر نافذ کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ نہ صرف غلط اور نامناسب ہوگا بلکہ غیر منطقی بھی ہوگا اور بدترین قسم کا ابہام پیدا کرے گا۔ اسکا یہی مطلب ہوگا کہ اس کے داعی پاکستان کے ساتھ نہ سنجیدہ ہیں اور نہ ہی ایماندار کیونکہ وہ مجرمانہ مقاصد کے تحت ایک انتہائی آسان معاملے میں جان بوجھ کر پیچیدگی اور ابہام پیدا کر رہے ہیں۔ دنیا میں کہیں کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی ریاست کے ساتھ نظرئے کو نتھی کیا گیا ہو۔ کیا جاپان کا کوئی نظریہ ہے؟ جرمنی کا نظریہ کیا ہے؟ اسکی وجہ بالکل آسان ہے۔ ان ممالک کے لوگ اصطلاحات درست پیرائے میں استعمال کرتے ہیں اور چیزوں کو گجلک نہیں کرتے۔

اس اصطلاح کی اپنی توسیعی شکل میں الہامی مذاہب کے ساتھ بھی کوئی تعلق نہیں بنتا۔ مثلاً، خود اسلام صرف نظریہ نہیں ہے۔ ایک حوالے سے یہ اصطلاح پاکستان میں ''اسلام نواز سیاسی جماعتوں'' کی جانب سے غلط استعمال کی گئی ہے کیونکہ جیسے ہی نظریے کی اصطلاح کو اسلام پر لاگو کیا جائے گا، یہ اپنے الہامی حیثیت سے محروم ہو جائے گا اور انسانی تخلیق کردہ مذہب سمجھا جانے لگے گا، جیسا کہ غیر مسلم دعویٰ کرتے ہیں۔ ان حالات میں جب نظریے کی اصطلاح اسلام پر ہی لاگو نہیں ہوسکتی ہو تو یہ پاکستان پر کیسے لاگو ہوسکتی ہے۔ اس لئے میں کہنا چاہوں گا کہ پاکستان کے ضمن میں نظریے کو اصطلاح کا استعمال نہ صرف غیر مناسب، غلط استعمال ہے بلکہ کسی قانونی و آئینی فہم سے مبرا ہے، اس لئے اسکو خارج کر دیا جائے۔

تاہم، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حال ہی میں، بلکہ قیامِ پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ نظریے کی اصطلاح سیاسی حوالے سے استعمال کی گئی ہے۔ اس ضمن میں صدر پاکستان جنرل آغا محمد یحیٰ خان کی جانب سے لیگل فریم ورک آرڈر 1970 کی شق 20 اس اصطلاح کو سرکاری طور پر استعمال کرتی ہے، یہ شق ذیل صورت ہے:

آئین کے بنیادی اصول

20- آئین کو ذیل درج بنیادی اصولوں کے تحت تشکیل دیا جائے گا:

(1)------

(2) اسلامی نظریہ، جو کہ قیامِ پاکستان کی بنیاد ہے، کو تحفظ دیا جائے گا۔

(3)-----

لیگل فریم ورک آرڈر کی شق 20 کے فقرے (2) کو دیکھنا انتہائی ضروری ہے کہ ''اسلامی نظریہ'' کی اصطلاح کسی غیر مجاز انداز میں استعمال نہیں کی گئی ہے بلکہ یہ ''جو کہ قیامِ پاکستان کی بنیاد ہے'' کے الفاظ کا فراستی اور معقول استعمال کر کے سامنے لائی گئی ہے۔

مندرجہ بالا سے، دو قابلِ فہم اور نا قابلِ تردید نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں:

(a) کہ اسلامی نظریے کی اصطلاح نظریہء پاکستان کی اصطلاح کے ساتھ ہم معنی ہے۔

(b) کہ ''اسلامی نظریے'' کی اصطلاح یہاں پر نظریاتی حوالے سے استعمال نہیں کی گئی ہے جیسا کہ جماعت اسلامی کی قیادت میں پاکستان کو نام نہاد اسلام نواز سیاسی جماعتوں کی جانب سے غلط طور تشکیل یا غلط اظہار یئے میں کیا جاتا رہا ہے بلکہ خالصتاً سماجی، معاشی، اور سیاسی تناظر میں استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ آگے چل کر ثابت کیا جائے گا۔

جیسا کہ قبل ازیں گذارش کی جا چکی ہے کہ لفظ نظریے کے سائنسی معنی ہیں اور یہ اسی تناظر میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسکو مذہبی یا نظریاتی تناظر میں، جیسا کہ پاکستان کی نام نہاد اسلام نواز سیاسی جماعتیں کرتی ہیں، استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم، سائنسی یا لغوی تناظر سے ٹکراؤ میں، بعد ازاں، اس اصطلاح نے سیاسی اور سماجی معاشی تناظر بھی اختیار کر لیا ہے۔ اسی تناظر میں، صدر پاکستان نے لیگل فریم ورک آرڈر 1970 میں اس کا استعمال کیا ہے۔ اس وقت میں یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ اسلامی نظریے کے معنی کس طرح نظریہء پاکستان کے ہم پلہ ہیں، جو کہ اسکے سماجی، سیاسی و معاشی انداز سے متصادم ہے۔

''نظریہء پاکستان'' کے حوالے سے لفظ ''نظریہ'' اصطلاحاً تصور (Idea) سے ہم پلہ ہے، جس کی کنسائیز آکسفورڈ ڈکشنری کے تحت لغوی معنی ذیل درج بنتے ہیں:

''تصور۔ کسی اعلیٰ ترین عمومی خیال کو مخاطب کرنا، تصور سے جُڑا ہوا، تصور کے آدرش میں ہی وجود کا حامل''

لفظ ''تصور'' کی مندرجہ بالا معنی دو اجزا کا قبل ازیں قیاس کرتی ہیں (۱) تصوراتی قیاس، بنیاد، جس کے نتیجے میں تحریک اور وہاں تک رہنمائی کرنے والے حالات، (۲) ہدف مقصد، منزل اور اسکی حتمی صورت۔

اس لئے، ''نظریہء پاکستان'' اصطلاح کے دو بنیادی ذیلی حصے ہیں۔ اگر آسان الفاظ میں کہا جائے تو نظریہء پاکستان کی اصطلاح دو ذیلی اصطلاحوں (1) بنیاد/ ماخذ اور (2) مقصد پر مبنی ہے۔ اس لئے ہمارا ''نظریہء پاکستان'' کا مزید مطالعہ ''پاکستان کی بنیاد'' (یا تحریک پاکستان) اور مقاصد پاکستان پر مبنی ہوگا۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ واضح ہے کہ نظریہء پاکستان ماضی میں اہمیت کا حامل تھا جب چودہ اگست 1947 سے قبل تحریک پاکستان جاری تھی جو کہ مندرجہ بالا تشریح کے تحت بنیاد ہے اور اس بنیاد کا مقصد 14 اگست 1947 کو پاکستان کی صورت میں حاصل کر لیا گیا۔ اس طرح کسی بھی تناظر/حوالے سے نظریہء پاکستان کا تذکرہ ماضی کی تاریخ یا قبل از قیامِ پاکستان ہے۔ اس ضمن میں، میں قراردادِ پاکستان کا حوالہ دینا چاہوں گا جو کہ 8 اور 9 اپریل 1946 کو دھلی میں مرکزی اور صوبائی اسیمبلیوں سے تعلق رکھنے والے مسلم لیگی اراکین اسیمبلی کے کنونشن میں منظور کی گئی۔ نظریہء پاکستان کی ''بنیاد'' پر نظر ڈالنے کو غرض سے اس قرارداد کے ابتدائی کا حوالہ دینا چاہوں گا۔

''جہاں ہندستان کے اس وسیع برصغیر میں دس کروڑ مسلمان، اُس عقیدے کے پیروکار ہیں جو انکی زندگی کے ہر شعبہء جات (تعلیمی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی) کو منظّم کرتا ہے، جس کا بیانیہ صرف روحانی اظہار پر ہی محیط نہیں ہے اور جو ہندو دھرم کے مخصوص نوعیت کی رسومات و مظاہر کے متضاد کھڑا ہے، جو کہ ہزاروں سال سے ایک سخت گیر ذات پات کے نظام کو برقرار رکھتے ہوئے چھ کروڑ انسانوں کو شودروں کی حیثیت میں دھکیلنے کا باعث بنا ہے۔ اس (ہندو) برادری کی سماجی اور اقتصادی شعبۂ جات میں بالادست حیثیت نے مسلمانوں، مسیحیوں اور دیگر اقلیتوں کو سماجی اور اقتصادی طور پر تباہ کر دینے کے خطرات پیدا کر دیئے ہیں۔''

یہ تھی پاکستان کے مطالبے اور قیام کی بنیاد۔ قرارداد مزید کہتی ہے۔ ''ہندوؤں اور مسلمانوں کے مختلف تاریخی پس منظر، روایات اور ثقافت سماجی اور اقتصادی نظاموں نے مشترکہ اُمنگوں اور تصورات پر مبنی ایک واحد ہندستانی قوم کی ارتکاز کو ناممکن بنا دیا ہے۔ جہاں وہ صدیوں کے بعد بھی دو ایک دوسرے سے علیحدہ اقوام ہیں۔'' قرارداد کا یہ حصہ دوقومی نظریے سے متعلق ہے جس کے برعکس انڈین نیشنل کانگریس کا مختلف برادریوں کو اپنے اندر سمونے والا ایک ہندستانی قوم کا بیانیہ تھا۔ قرارداد کا ابتدائیہ مزید کہتا ہے، ''جہاں مسلمان اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ ہندستانی مسلمانوں کو ہندوؤں کی بالادستی سے محفوظ رکھنے اور انکی اپنی بنیاد پر اپنے طور پر ترقی کرنے کا مکمل موقعہ فراہم کرنے کیلئے شمالی مشرقی زون میں بنگال اور آسام، اور پنجاب، شمالی مغربی سرحدی صوبے،

سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک خود مختیار آزاد ریاست کا قیام ضروری بن جاتا ہے۔''

قرارداد کا یہ حصہ پاکستان کی بنیاد کا سراغ دیتا ہے۔ اس طرح یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ پاکستان کا بننا دو وجوہات کی بنا پر ناگزیر تھا۔ (i) ہندستان کے مسلمانوں کو ہندو بالادستی سے محفوظ رکھنا، اور (ii) انہیں اپنی بنیادوں کے مطابق زندگی گذارنے کیلئے مکمل وسعت فراہم کرنا۔ اب میں 3 جون منصوبے کے ضمن میں آل انڈیا مسلم لیگ کی جانب سے 9 جون 1947 کو منظور کی گئی قرارداد کا آخری حصہ پیش کرنا چاہوں گا۔ واضح رہے کہ یہ منصوبہ 14 اگست 1947 کو قیامِ پاکستان کی بنیاد اور ڈھانچہ تھا۔ ''آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل اس موقف کی حامل ہے کہ ہندستان کو دو حصوں پاکستان اور ہندستان میں تقسیم کرنے میں ہی حل پنہاں ہے۔'' اس طرح ہم نے نظریہء پاکستان کے مقاصد 14 اگست 1947 کو ایک خود مختیار ریاست پاکستان کی صورت میں حاصل کر لیئے۔

اب میں پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے پہلے صدر منتخب ہونے پر 11 اگست 1947 کو بابائے قوم قائداعظم کی تقریر کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ اپنے صدارتی خطبے میں انکا کہنا تھا، ''تاہم سوال یہ ہے کہ آیا یہ ممکن یا عملی طور پر کرنا ممکن تھا جو کچھ حاصل کیا گیا۔ تقسیم کو ہونا ہی تھا۔'' اور ''حقیقی تجربے سے ہی ثابت کیا جائے گا کہ یہی ہندستان کے آئینی مسئلے کا حل تھا۔''

(iii) اب، سوچتا ہوں کہ ہم اسکو کس طرح برقرار رکھیں کہ آپ کے سامنے ہمارا تصور رہے اور آپ دیکھیں گے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ہندو بطور ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان بطور مسلمان نہیں رہیں گے، مذہبی حوالے سے نہیں کیونکہ یہ ہر فرد کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ ریاست کے شہری کے بطور سیاسی حوالے سے۔

(iv) پاکستان کو مناسب طور پر آئینی حکومت کے تحت چلایا جانا چاہیئے، نہ کہ مفاد پرست یا غدار ٹولے کے ذریعے یا کسی ہجوم کے تحت اور حکومت پاکستان مرتکبین کے خلاف سخت اقدامات کرنے جارہی ہے اور اُن کے ساتھ آہنی ہاتھوں اور بے رحمی سے نپٹا جائے گا۔

(v) ہم اسلامی بھائی چارہ کے رکن ہیں، جس میں حقوق، تنظیم اور خود احترامی میں سب برابر ہیں۔ نتیجتاً، آپ پر فرائض کا ایک خاص اور عمیق فریضہ عائد ہوتا ہے۔ پاکستان راسغ العقیدہ یا اس

نوعیت کی کوئی چیز نہیں ہے۔

(vi) اسلام اور اس کا آدرش ہمیں انسانوں کے درمیان برابری، انصاف اور منصفی سکھاتا ہے۔ہم ان شاندار روایات کے امین ہیں اور مستقبل میں انکی پیروی کیلئے اپنی ذمہ داری اور فرائض کی ادائیگی کیلئے کوشاں ہیں۔میرے تحت، پاکستان ایک راسغ العقیدہ ریاست نہیں ہوگا جس پر الہامی فریضے سے ماموراافرادراج کریں۔ہمارے ہاں ہندوؤں، مسیحیوں اور پارسیوں کی صورت میں بہت غیر مسلم ہیں لیکن وہ سب پاکستانی ہیں۔انہیں بھی دیگر شہریوں جیسے ہی حقوق اور مراعات حاصل ہوں گی اور وہ بھی پاکستان کے امور میں اپنا جائز حصہ ڈالیں گے۔

قائد کی تقریر کے مندرجہ بالا حوالہ جات سے، یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انکا پاکستان کا تصور ایک سکیولر ریاست کا تھا نہ کہ راسغ العقیدہ ریاست کا۔اسی طرح ان کا ماننا تھا کہ پاکستان کے ہر شہری کو یکساں حقوق حاصل ہوں گے اور وہ سماجی، سیاسی یا اقتصادی حالاتِ زندگی اپنی مرضی سے متعین کرنے کیلئے آزاد ہونگے۔مندرجہ بالا وضاحت اور ''نظریے'' کے تجزیے اور قائداعظم کی تقریر کے حوالے سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آیا پاکستان جغرافیائی سرحدوں پر مشتمل ہے یا تصوراتی / آدرشی سرحدوں پر۔

اب میں اُن نام نہاد پمفلٹوں پر آتا ہوں جنکو ملزمان کے قبضے سے برآمد کرنے سے منسوب کیا گیا ہے۔اگرچہ استغاثہ کے گواہان کے بیانات میں انکی تحویل، تعداد اور صفحات کی تعداد سے متعلق کئی ایک تضادات اور متنازعہ بیانات ہیں جو کہ انتہائی متضاد آرا قائم کر رہے ہیں اور جن پر قبل ازیں دلائل کے متعلقہ مرحلے پر بحث کی جا چکی ہے، تاہم میں ہر مصنف کی تحریروں کے انداز و بیان کو واضح کرنا چاہوں گا۔عام طور پر ہر ترقی پسند مصنف اپنے خیالات کا اظہار علامتی انداز میں کرتا ہے جس کے لئے ادبی سوجھ بوجھ ضروری ہے۔

اب جہاں تک برآمد کیے گئے پمفلٹوں کا تعلق ہے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ پمفلٹ کس نے تحریر کیے ہیں اور آیا یہ بڑی تعداد میں ملزمان سے برآمد ہوئے ہیں تاکہ یہ سمجھا جا سکے کہ لوگوں میں تقسیم کیے جانے تھے۔اگر کراچی میں لوگوں میں تقسیم کیے گئے ہیں تو اس سلسلے میں کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا

ہے جو استغاثہ کی بات کی تصدیق کرے۔ علاوہ ازیں، ان پمفلٹس کے مندرجات کو پاکستان میں رائج کسی بھی قانون کے تحت ریاست مخالف قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس ملک نے کئی ایک عجیب و غریب تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ 1958 میں پہلی آئین ساز اسمبلی برخاست کر کے مارشل لا نافذ کیا گیا۔ جس کے بعد بنیادی جمہوریتوں کا نظام متعارف کرایا گیا۔ دوبارہ 1969 میں ایوب خان کا آئین منسوخ کر دیا گیا اور مارشل لا نافذ کیا گیا۔ 1971 میں، ملک کا ایک حصہ علیحدہ ہو گیا اور ذوالفقار علی بھٹو کی سربراہی میں سویلین حکومت قائم کی گئی۔ 1977 میں اس سویلین حکومت کا تختہ اُلٹ کر ایک مرتبہ پھر مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔

ملزم ایک سیاسی کارکن اور سوشلسٹ جماعت کے رکن کی حیثیت میں اُن تمام حکومتوں کا نقاد رہا ہے جو عام آدمی کے مفادات کے برعکس سرگرم عمل رہی ہیں۔ اسی طرح ان تمام پمفلٹس میں یہی نقطہء نظر علامتی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ پاکستان کی جغرافیائی حدود میں حکومت کی تبدیلی کی بات کی گئی ہے، تاہم ان میں اس کا رتی بھر عندیہ بھی نہیں ملتا کہ بیرونی قوتیں آئیں اور ملک کی بھاگ دوڑ سنبھالیں۔ ان پمفلٹس میں عوام کی حاکمیت اعلیٰ کی بات کرتے ہوئے حکومت کو بہتر انداز میں چلانے کی ذیل درج تجاویز دی گئی ہیں:

(1) ملک کے عوام کی اکثریت کسانوں اور مزدوروں پر مشتمل ہے۔ مندرجہ بالا دونوں طبقات کی آبادی مجموعی ملکی آبادی کے پچانوے فیصد سے زائد ہے۔ یہ دونوں طبقات ملکی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں، جس کو موجودہ حکمران بھی کئی مرتبہ تسلیم کر چکے ہیں۔ اس لئے اکثریت کی حکومت جمہوریت کی اولین اور بنیادی شرط ہے اور اگر یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ملک کو ترقی، خوشحالی اور استحکام کی راہ پر گامزن کرنے کیلئے ان دو طبقات کی حکومت قائم کی جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

اس موضوع یعنی نظریہء پاکستان اور نظریہء اسلام پر مدعا علیان نے سیاستدانوں، تعلیمی ماہرین، مفکرین وغیرہ جیسے ہر شعبہء زندگی سے تعلق رکھنے والے گواہان سے جرح کی ہے۔

سیاستدانوں میں ذیل درج سے جرح کی گئی ہے:

مس بے نظیر بھٹو

جناب ولی خان

جناب میر غوث بخش بزنجو

مولانا شاہ محمد امروٹی

جناب شیخ رفیق احمد

جناب معراج محمد خان

اور دیگر

صحافیوں میں سے ذیل درج پیش ہوئے ہیں:

شیخ علی محمد۔ رکن مجلس شوریٰ

عبدالغنی درس۔ ایڈیٹر روزنامہ عبرت

منہاج برنا

اور دیگر

علما اور مفکرین میں سے دفاع کے لئے ذیل درج پیش ہوئے ہیں:

بیگم طاہرہ مظہر علی خان و دیگر

تعلیمی ماہرین میں سے ذیل درج پیش ہوئے ہیں:

جناب حسن شیخ، علم سیاسیات کی فیکلٹی کے سربراہ، سندھ یونیورسٹی و دیگر

مندرجہ بالا تمام گواہان دفاع نے پاکستان اور اسلام کے نظریات کے حوالے سے استغاثہ کے موقف سے اختلاف کیا ہے، جب کہ انہوں نے ملزمان کے نقطۂ نظر کی تائید کی ہے۔ استغاثہ نظریۂ پاکستان اور نظریۂ اسلام کی تشریح متعارف کرانے میں ناکام رہا ہے۔ انہیں صرف نظریۂ پاکستان اور نظریہء اسلام کہنا آتا ہے لیکن وہ ان کی اصل معنی سے لاعلم ہیں۔

اختتامیہ

میری جاری عرضداشت کا اخذ اور جوہر یہ ہے کہ ملزمان کے خلاف استغاثہ کی جانب سے

پیش کیے گئے تمام تر ثبوت کسی طور بھی قابل اطمینان نہیں ہیں۔ استغاثہ کی گواہی مشکوک ہے اور اسکا فائدہ لازماً ملزمان کو ہونا چاہیے۔ نافذ العمل قانون بھی ملزمان کو سزا دینے کی استغاثہ کی استدعا کی تائید نہیں کرتا۔ مجموعی طور پر ملزمان کے خلاف مقدمہ بنانے کے عمل میں اختیار کیا گیا طریقہء کار خود قانون کی خلاف ورزی ہے اور ملزمان کے خلاف استغاثہ کی جانب سے ریکارڈ پر ثبوتوں کے پیش نظر قانون استغاثہ کو فائدہ نہیں پہنچاتا بلکہ اس کے برعکس وہ ملزمان کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ ملزمان نے کوئی جرم نہیں کیا ہے کہ انہیں ان کے کھاتے میں ڈالے گئے جرائم پر کوئی سزا دی جائے۔ وہ اس ملک اور اس کے لوگوں کی جانب محبّ وطن، معصوم اور وفادار ہیں۔ ان کی حب الوطنی کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ اس لیے میں گذارش کروں گا کہ انصاف کے مفادات میں ملزمان کو باعزت طور پر بری کیا جائے۔

(دستخط)

محمد یوسف لغاری

وکیل صفائی

میونسپل مسافر خانہ، میر پور خاص

تھر پارکر، سندھ

بتاریخ

7 مئی 1983ء

مبینہ ملزم بدر جمال ابڑو کی جانب سے محمد شفیع محمدی کے اختتامی کلمات

معزز اراکینِ عدالت

صہیونیت اور جدید نو آبادیات کے ایک محافظ نے ایک مرتبہ ڈھٹائی اور بے شرمی سے دعویٰ کیا تھا کہ وہ ایک خودمختیار ملک کو بدترین مثال بنا دے گا۔

کسی آمرانہ حکومت میں افسر شاہی بالا دستی اختیار کر لیتی ہے اور آسانی کے ساتھ مطمئن کی، خریدی یا دھمکائی جا سکتی ہے۔ ٹالسٹائی کے الفاظ میں کسی افسر کا زندگی میں اہم کام وقفے وقفے سے بادشاہ کو اپنے وجود کا احساس دلاتے رہنا ہے۔ یہ کچھ کرنے کے تناؤ اور جوش میں، وہ ہمیشہ ''دھماکے'' کی تلاش میں رہتا ہے تا کہ ثابت کر سکے کہ وہ شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار ہے۔ ایسے ہی حالات میں، زیرِ غور مقدمے کا ناٹک رچایا گیا، اس انداز میں کہ اس نے مختصر مدت کیلئے ہی سہی ہر ایک کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔

مجھے بخوبی یاد ہے کہ ایک روشن صبح ہم نیند سے بیدار ہوئے تو انتہائی عجیب اخباری شہ سرخی ہمارے سامنے تھی کہ تخریب کاروں کا ایک ٹولہ پکڑا گیا ہے اور سائیکلو اسٹائل مشینیں وغیرہ برآمد کی گئی ہیں۔ اخبارات میں پاکستان کے شہریوں کو تصاویر بھی شائع ہوئی تھیں۔ آج وہ شہری، مارشل لاٹولے کی نظر میں تخریب کار لیکن میرے دیس کے غریبوں کے پیارے اپنے مقدمے کے آخری مرحلے سے گذر رہے ہیں۔ انکا ایک ساتھی نہ کبھی بوڑھا ہوگا اور نہ ہی بھلایا جا سکے گا کیونکہ اس نے کم عمری میں ہی اپنی زندگی کا دان دیا ہے۔ حکمران ٹولہ، جس کیلئے میں لفظ 'حکومت' استعمال نہیں کرتا، نے تیلی کا پہاڑ کھڑا کر دیا اور یہ دکھائی دیتا ہے کہ پہلے سے شائع شدہ مواد کا ایک ڈھیر بوریوں میں ڈال کر پیپلز کالونی کے طور پر شناخت ہونے والی ایک کچی آبادی والے علاقے کی ایک غیر آباد جھگی میں رکھ کر، پکڑ دھکڑ شروع کر دی گئی اور اس گھر کے سامنے سے گذرنے والے یا

اس کے دروازے پر دستک دینے والے ہر ایک شخص کو پکڑ کر تخریب کار اور غدار اعلان کیا گیا۔ اگر کوئی استغاثہ کے پیش کی گئی داستان پڑھے گا تو اپنے ہوش اڑا بیٹھے گا کہ اسکی کوئی ایک اینٹ دوسری سے نہیں ملتی اور سب کچھ ملبے کے ڈھیر کی طرح ہی ہے۔ یہ ہر نکتے میں واضح اور ٹھوس تضادات ثابت کرتے ہیں کہ یہ پورا ناٹک ایک ایسے ضرورت سے زیادہ پر جوش افسر کے زرخیز تصور کا شاخسانہ تھا جو اپنی ترقی چاہتا تھا یا خود کو شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار ثابت کرنا چاہتا تھا۔ میں نکتہ بہ نکتہ ایف آئی آر، برآمدگیوں، تفتیش کے تضادات کو واضح کروں گا، تاہم،

1- میں اپنے دلائل کا آغاز اس خصوصی فوجی عدالت کے تینوں اراکین کو مبارکباد دینے سے کروں گا، جو کہ اس تاریخی مقدمے کو تاریخی انداز میں چلا رہے ہیں۔ اس مقدمے نے پاکستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ یہ نیا باب نسل در نسل ایک راہنما ثابت ہوگا۔ ہم پاکستان کے اُن تمام معزز سیاسی رہنماؤں کے شکر گذار ہیں جو عدالت میں صفائی کے گواہ کے طور پر پیش ہوئے اور ہمارے موقف کی تائید کی۔ اس لئے مجھے اُمید ہے کہ اس عدالت کا فیصلہ بھی تاریخی ہوگا تا کہ تاریخ کو دہرانے سے بچا جا سکے۔ میں عدالت کو یقین دلاتا ہوں کہ ایک تاریخی فیصلہ یقیناً مارشل لا کے تو نہیں لیکن ''مسلح افواج'' کی توقیر میں اضافے کا باعث بنے گا۔

2- میرے لائق بھائی ایس اے ودود نے علی امجد کے تعاون سے تفصیلی دلائل دیئے ہیں اور میں انکے دلائل سے جن میں میرے مؤکل کا مقدمہ بھی شامل ہے، صفحہ نمبر 1 سے آخری صفحہ تک مکمل اتفاق کرتا ہوں۔ تاہم میں اپنے موکل کے دفاع میں اپنے ملک کی اعلیٰ عدالتوں کے کچھ فیصلوں کی مدد سے اپنی گذارشات کے حق میں چند سطروں کا اضافہ کرنا چاہوں گا۔ میں اپنے موکل بدر جمال ابڑو کے مقدمے تک ہی محدود رہوں گا، ماسوائے اسکے کہ جب مقدمے کے کچھ دیگر پہلوؤں کا ذکر کرنا ناگزیر نہ ہو جائے۔ استغاثہ نے الزامات کے وضاحت نہیں کی ہے جو اپنی نوعیت میں غیر واضح ہونے کے علاوہ سیاسی طور پر متنازعہ بھی ہیں۔ اس لئے بدقسمتی سے ہمیں ہی ان الزامات کی وضاحت کرنی ہوگی اور اپنے موکلان کا دفاع کرنے کیلئے دلائل دینے ہوں گے۔

تاہم اگر استغاثہ الزامات کی مختلف انداز میں معنی اور وضاحت پیش کرتا ہے تو پھر ہم اپنے دفاع میں اپنا موقف پیش کرنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ استغاثہ کا فرض تھا کہ وہ ''نظریہء پاکستان'' کی وضاحت کرتا اور اسکے بعد ملزمان سے دریافت کیا جاسکتا تھا کہ وہ ''جرم قبول کرتے ہیں'' یا ''نہیں کرتے''۔ استغاثہ نے ان ملزمان کو ایسے غیر واضح الزامات کا مرتکب قرار دیکر ایسا ابہام پیدا کردیا ہے جس کا بالخصوص نظریہء پاکستان کے حوالے سے نہ تو قانونی طور پر اور نہ ہی آئینی طور پر دفاع کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے میرا نہ صرف وکیل صفائی کے طور پر بلکہ پاکستان کے ایک شہری ہونے کے ناطے فرض بنتا ہے کہ ان چیزوں کی وضاحت کروں اور حقائق کو درست پیرائے میں سامنے لاؤں۔

تقریباً تمام تر الزامات اپنی نوعیت میں سیاسی ہیں اور یہ پاکستان کی تاریخ رہی ہے کہ اکثر سیاستدانوں کو ایسے ہی الزمات کے تحت مقدمات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ایسے مقدمات کا مقصد مخالفین کو ہراساں کرنا ہوتا ہے اگر وہ حکمران طبقات/ٹولے کیلئے باعث خطرہ بن جائیں۔ ایسے الزامات وہ ہڈی ہیں جس کو نگلا بھی نہیں جاسکتا اور تھوکا بھی نہیں جاسکتا۔

3- میرے موکل کے خلاف الزامات، جیسا کہ چارج شیٹ میں بتائے گئے ہیں مارشل لا ضابطہ نمبر 36 کے تحت ہیں یعنی مبینہ ملزمان احمد کمال وارثی، غلام شبیر شر، سید جمال الدین نقوی اور محمد جام ساقی کے ساتھ جرم کے ارتکاب میں شریک ہونا ہے۔ یہی الزام سہیل سانگی اور امر لال کے خلاف بھی ہے۔ یہ ایک مرکب الزام ہے اور مارشل لاضوابط نمبر 13,4 اور 18 کے علاوہ سیکشن 124 اے اور 149 پاکستان پینل کوڈ کے تحت الزامات کو شامل کرتا ہے۔ شریک جرم ہونے کا سوال اُس وقت ہی پیدا ہوتا ہے جب مرکزی ملزم/ملزمان کو بڑے جرم کا مرتکب ثابت کیا جاچکا ہو۔ جبکہ مرکزی ملزم/ ملزمان کے بے گناہ ثابت ہونے پر شراکتِ جرم خود بخود ختم ہوجاتی ہے۔ اس لئے بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ہمیں مکمل گواہی/ثبوتوں کو زیرِ بحث لانا ہوگا جو کہ ریکارڈ پر لائے گئے ہیں اور میرے فاضل بھائیوں نے انتہائی شاندار انداز میں تحریری دلائل کے اپنے بے مثل کام میں اپنا فریضہ بخوبی سرانجام دیا ہے۔

4- یہ تاریخی مقدمہ دیگر تمام فوجداری مقدمات کی طرح ایف آئی آر کے اندراج سے شروع ہوا۔ تاہم اس مقدمے کی ایف آئی آر اس نوعیت کی ہے کہ میں نے اپنے پورے کیریئر میں ایسی شاندار ایف آئی آر کبھی نہیں دیکھی۔ یہ ایف آئی آر ایک تجربکار سب انسپکٹر کی درج کرائی ہوئی ہے۔ شکایت کنندہ، جس سے اس عدالت نے کوئی جرح نہیں کی ہے، کوئی ناخواندہ شخص نہیں ہے بلکہ مسلح افواج کا ایک انتہائی پڑھا لکھا میجر ہے، اگرچہ وہ مارشل لا کیلئے کام کررہا ہے۔ نام نہاد چھاپہ مار پارٹی نہ صرف تجربہ کار پولیس اہلکاروں بلکہ ایک فاضل مجسٹریٹ پر مشتمل تھی۔ اگر یہ ایف آئی آر غلط یا نقائص کی حامل یا استغاثہ کے مقدمے کے برخلاف ثابت ہوتی ہے تو پھر استغاثہ کا تمام تر مقدمہ زمین بوس ہو جائے گا۔

5- اگر ہم سیکشن 154 کے تحت ایف آئی آر کی تشریع پڑھیں تو یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ عدالت میں پیش کی گئی کوئی بھی ایف آئی آر اس تشریع پر پوری نہیں اُترتی۔

یہ بھی قابلِ غور ہے کہ شکایت کنندہ کو جائے وقوعہ کے چشم دید گواہان کے نام بھی دینے ہوتے ہیں۔ اگر ایف آئی آر میں کسی چشم دید گواہ کا ذکر نہیں ہے اور گواہان کو بعدازاں سامنے لایا جاتا ہے، جیسا کہ اس ضمن میں کیا گیا ہے تو اسکو ہمیشہ استغاثہ کے خلاف شکوک وشبہات کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، بالخصوص جب اطلاع دہندگان چشم دید گواہان کی موجودگی سے آگاہ ہو اور انکے نام بھی جانتا ہو۔

1980 پاکستان کرمنل لا جرنل 403

6- یہ بھی متعین کیا گیا کہ ایف آئی آر کے شرائط کی تکمیل کیلئے اسکو ذیل درج امور پورے کرنے ہوں گے:

(i) یہ کسی جرم کے ارتکاب سے متعلق معلومات ہو۔

(ii) اگر یہ کسی پولیس اسٹیشن کے انچارج افسر کو زبانی طور پر فراہم کی گئی ہے تو یہ اسکی جانب سے یا اسکی ہدایت پر تحریری صورت میں لائی جائے گی۔

(iii) اسکی جانب سے تحریری شکل میں لانے کی صورت میں معلومات فراہم کرنے والے کو

پڑھ کر سنائی جائے گی۔

(iv) اس پر معلومات فراہم کرنے والے کے دستخط لیے جائیں گے۔

(v) اس کا اندراج ایک متعین کردہ فارم میں پولیس اسٹیشن کے انچارج افسر کے پاس موجود رجسٹر/ روزنامچے میں کیا جائے گا۔ یہ امر سیکشن 154 سی آر پی سے کے تحت ایف آر کی تشریح سے ماخذ ہے اور لاہور ہائی کورٹ کے 1965 پاکستان کرمنل لا جرنل 1597 میں رپورٹ کیے گئے فیصلے کی روشنی میں اختیار کیا گیا تھا۔

7- معلومات فراہم کرنے والے کی جرح تک، استغاثہ کو ایف آئی آر کے مندرجات ثابت کرنے ہوتے ہیں۔ شکایت کنندہ کی جرح تک سیکشن 224 سی آر پی کے تحت معلومات/ ثبوت کے زمرے میں نہیں لایا جا سکتا۔ اگر شکایت کنندہ کی جرح نہیں ہوتی تو پھر یہ استغاثہ کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ایف آئی آر کے مندرجات کو درست ثابت کرے۔ ہمارے معاملے میں ہم دو ایف آئی آر اور ایک خط ریکارڈ پر لائے ہیں۔ ان تینوں دستاویزات میں فرق ہے۔ اس لئے گواہی ایکٹ جس کا اس مقدمے پر بھی اطلاق ہوتا ہے کے سیکشن 67 کو لاگو کرنا پڑے گا۔ اس فقرے میں دیئے گئے تمام نکات کی مختلف فیصلوں جیسا کہ اے آئی آر 1953 راج 66، اے آئی آر 1941 بمبئی 146، اے آئی آر 1962 گجرات 322 سے توثیق ہوتی ہے۔ اس لئے ہمارے مقدمے/ معاملے میں سب سے پہلے میجر طفیل کی جرح ہونی چاہیئے چاہے انہوں نے یہ خط تحریر کیا ہے یا نہیں۔ اُن میں سے کسی کی بھی عدالت میں جرح نہیں ہوئی شاید وہ جانتے تھے کہ ایف آئی آر میں دوہری تحریر ہوئی ہے اور کوئی بھی اسکو بھگتنے کیلیئے تیار نہیں تھا۔ اس طرح ایف آئی آر کے طور بھی ثابت نہیں کی گئی ہے۔ اس ایف آئی آر کی ساکھ اس وقت اور زیادہ مجروح ہوتی ہے جب دوسری جگہ جہاں سے مبینہ مواد برآمد کیا گیا، کا کوئی ذکر نہیں کیا جاتا ہے۔

8- میجر طفیل کی جانب سے ارسال کیا گیا خط ایک طرح کا پیغام ہے۔ پیغام ٹیلی فون یا ٹیلی گرام کے ذریعے بھیجا جا سکتا ہے۔ ٹیلی گرام پر ہمیشہ ارسال کنندہ کے دستخط ہوتے ہیں۔ تاہم جب یہ اپنی منزل کو پہنچتا ہے تو اس پر ارسال کنندہ کا نام نہیں ہے۔ اگر ان پیغامات کو تحریری شکل دی

جائے تو یہ ایف آئی آر نہیں بنتے۔ ایسی صورت میں، اگر پولیس اہلکار، شکایت کنندہ کی جانب سے ایسی معلومات وصول ہونے کے بعد وقوعہ پر پہنچتا ہے اور اس کے ویسے ہی دستخط حاصل کرتا ہے تو اُس صورت میں ہی ایسی دستخط شدہ دستاویز کو ایف آئی آر سمجھا جا سکتا ہے۔ ایسا بہت سارے مقدمات جیسا کہ پاکستان لا جرنل 1979 سی آر سی 203 (ڈی بی) پی ایل ڈی 1960 لاہور 97، پی ایل ڈی 1952 لاہور 215، پی ایل ڈی 1962 ڈھاکا، (ڈی بی) میں اختیار کیا گیا ہے۔ تاہم میں حالیہ اختیاری کا بھی حوالہ دوں گا جو کہ پی ایل ڈی 1979 کراچی 513 ہے جس نے اے آئی آر 1938 لاہور، 787 اور پی ایل ڈی 1978 لاہور 677 پر انحصار ہے۔

ہمارے معاملے/ مقدمے میں ایسا کوئی طریقہء کار/ انداز اختیار نہیں کیا گیا ہے، اس لیے معلومات کے ان ٹکڑوں کو کسی طور بھی ایف آئی آر سمجھا نہیں جا سکتا۔

9- ایک اور اہم سوال عدالتیں ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھتی ہیں۔ اگر کوئی دستاویز ایف آئی آر سمجھتی جاتی ہے لیکن اس میں کسی چشم دید گواہ کا نام شامل نہیں ہوتا، تو جیسا کہ میں پہلے ہی حوالہ دے چکا ہوں تو ایسے گواہان کے بیانات کو مشکوک سمجھا جاتا ہے جبکہ ہماری سپریم کورٹ اس ضمن میں یہاں تک گئی ہے کہ اس نے ایسے گواہ کے بیان کو قابلِ غور ہی نہیں سمجھا۔ اسی نوعیت کے دو مقدمات پر مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے ججز نے بھی فیصلہ دیا جو کہ پی ایل ڈی 1962 (مغربی پاکستان) کراچی 500، 1972، پاکستان کرمنل لا جرنل 20 پی ایل ڈی 1969 سپریم کورٹ 26 اے آئی آر 1962 گجرات 214 میں رپورٹ ہوئے ہیں۔

10- یہ بھی متعین کیا گیا کہ جو شخص ایف آئی آر درج کراتا ہے یا جس نے معلومات دی ہو، وہ اس مقدمے سے متعلقہ چشم دید گواہ بھی ہو یا اس سے کسی طرح کا تعلق رکھتا ہو۔ دوسری کسی بھی صورت میں، ایف آئی آر کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھا جائے گا اگر وقت درست طور پر سامنے نہیں لایا گیا ہو جیسا کہ پی ایل ڈی 1920 لاہور 689 میں واضح کیا گیا ہے۔

11- ایف آئی آر کے پروفارم میں تاخیر کے اسباب واضح کرنے کیلئے ایک مخصوص کالم ہے۔ اگزیبٹ ایم اور ایکس جنہیں ایف آئی آرز بتایا گیا ہے، میں بھی یہ کالم شامل ہے۔ میجر طفیل

کے خط کو ا یگزیبٹ ایم اور ایکس کے ساتھ پڑھا جائے تو ایف آئی آر درج ہونے میں کم از کم چوبیس گھنٹے کی تاخیر ظاہر ہوتی ہے۔ اکثر و بیشتر مقدمات میں، ایسی کوئی تاخیر، جس کی وضاحت نہ کی جائے، ہمیشہ استغاثہ کے خلاف جاتی ہے۔ ایف آئی آر درج ہونے میں صرف ایک گھنٹے کی تاخیر کو بھی استغاثہ کی بات پر شک وشبہ کرنے کیلئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ اس ضمن میں کچھ مقدمات کا ذکر ذیل درج ہے:

-1974 پاکستان کرمنل لا جرنل 96

- پی ایل ڈی 1980 پشاور 25

-1980 پاکستان کرمنل لا جرنل 1239

-1980 پاکستان کرمنل لا جرنل 345

-1980 پاکستان کرمنل لا جرنل 1101

-1976 پاکستان کرمنل لا جرنل 17

مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں یہ خصوصی فوجی عدالت آسانی سے ادراک کرسکتی ہے کہ دونوں ایگزبیٹس ایم اور ایکس سیکشن 154 سی آر پی سی کے تحت ایف آئی آر کی تشریح پر پوری نہیں اُترتیں، کیونکہ ان پر نہ تو شکایت کنندہ کے دستخط ہیں اور نہ ہی یہ شکایت کنندہ کو پڑھ کر سنائی گئی ہیں۔ مندرجہ بالا قانونی حیثیت کے باوجود اگر انہیں ایف آئی آر سمجھا بھی جائے تب بھی انہیں غیر واضح کردہ تاخیر کی بنیاد پر قابلِ انحصار نہیں بنایا جاسکتا جبکہ اس میں ان گواہان کے نام بھی نہیں ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ وہ بوقت چھاپہ موجود تھے۔ علاوہ ازیں، یہ پاکستان کوارٹرس کا ذکر ہی نہیں کرتیں، جہاں پر چھاپہ مارنے کا بتایا جاتا ہے۔

12- اب میں تلاشی کی قانونی حیثیت پر آتا ہوں، اگر کسی تفتیشی اہلکار نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کی ہے۔ تمام تر تفاصِل کو درگذر کرتے ہوئے، میں صرف سندھ ہائی کورٹ اور پاکستان کی اعلیٰ عدلیہ کے کچھ فیصلوں کے تفصیل دینا چاہوں گا۔ پہلا مقدمہ موجودہ چیف جسٹس مسٹر عبدالحئی قریشی کے فیصلے پر مبنی پاکستان لا جرنل 1978 جی سی (کراچی) 611 ہے۔ اس مقدمے میں

خانپور پولیس اسٹیشن کے ایس ایچ او محمد یعقوب کو اطلاع ملی کہ درخواست گذر کے پاس غیر لائسنس یافتہ اسلحہ ہے۔ 6 دسمبر 1975 کو، مذکورہ پولیس اہلکار دو ہیڈ کانسٹیبلز اور چار کانسٹیبلز پر مشتمل ایک پولیس پارٹی کے ہمراہ یار ولوند پولیس چوکی پہنچا اور وہاں سے اس درخواست گذار کے گھر پر چھاپے کی غرض سے روانہ ہوا۔ درخواست گذار کے گھر کا محاصرہ کیا گیا اور تلاشی لی گئی۔ ایک 303 رائفل دو گولیوں سمیت ایک بکسے کے پیچھے سے درخواست گذر کی موجودگی میں برآمد کی گئی۔ ایس ایچ او محمد یعقوب نے مشیر نامہ تیار کیا اور ہیڈ کانسٹیبل قائم الدین اور ہیڈ کانسٹیبل فیض محمد نے مشیر کے طور پر اس پر دستخط کیے۔ درخواست گزار کو گرفتار کیا گیا اور اسکے خلاف ایک مقدمہ دائر کیا گیا۔

فاضل جج بڑی تعداد میں مقدمات بشمول اے آئی آر 1921 پٹنہ 508، اے آئی آر 1941 رنگون 333، اے آئی آر 1944 اودھ 321، پی ایل ڈی 1962 لاہور 58، پی ایل ڈی 1964 لاہور 386، پی ایل ڈی 1975 سپریم کورٹ 607، پاکستان لا جرنل 1975 سی آر سی 554 کو زیرِ بحث لائے اور انکے تجربات کو ذیل درج الفاظ کی صورت میں اپنے تجزیے کے طور پر پیش کیا:

''جب قانون ایک انتظام رکھتا ہے تو عدالتیں سرکاری اہلکاروں کو اس بنیاد پر عارضی اور منہ زور اختیارات کا حامل قرار نہیں دے سکتیں کہ پوری آبادی میں کوئی بھی مشیر بننے کو تیار نہیں تھا یا یہ کہ وہ اگر اسکے لئے تیار ہوجاتا تو اُسکو پولیس کے زیرِ اثر ہی سمجھا جاتا، پر مقدمے کی اپنی اہمیت/قدر ہوتی ہے۔ سیکشن 103 سی آر پی سی کسی معزز فرد کو طلب کرنے پر زور دیتا ہے اور بلاشبہ ہر آبادی میں معزز لوگ میسر ہوتے ہیں اور پولیس انکو آسانی سے منتخب کرسکتی ہے۔ اس نوعیت کا انتظام تفتیشی اہلکار کی جانب سے کسی جانبداری یا زیادتی کے خلاف ایک بند باندھنے کی غرض سے کیا گیا ہے اور ایسے انتظام کی خلاف ورزی کی اجازت دیتے ہوئے ہم امکانی غلط نتائج کے حامل ہوسکتے ہیں۔ اس امر کو ہلکے طور نہیں لیا جاسکتا۔ مندرجہ بالا سبب کی بنیاد پر، میں اس نقطہء نظر کا حامل ہوں کہ اس معاملے میں سیکشن 103 سی آر پی سی کی انتہائی خلاف ورزی کا نتیجہ انصاف کی ناکامی کی صورت میں نکلا ہے۔''

اب میرے موکل کے معاملے میں، چھاپا مارنے والی ٹیم کا ایک رکن کہتا ہے کہ وہ سادہ کپڑوں میں گئے تھے تا کہ کوئی انکا مقصد نہ سمجھ سکے۔ میرے موکل کا دفتر ایک مصروف ترین شاہراہ کی مصروف ترین عمارت میں ہے۔ یہ عالم آشکار بات ہے کہ وہاں سینکڑوں وکلا، تاجروں اور دیگر کے دفاتر ہیں لیکن اُن میں سے کسی کو بھی تلاشی کا مشیر نہیں بنایا گیا اس لئے دفتر سے برآمد کی جانے والی کوئی بھی چیز جو قابلِ اعتراض ہے، عدالت کی نظر میں بے معنی ہو جاتی ہے اور اس پر مندرجہ بالا فیصلے کی روشنی میں انحصار نہیں کیا جا سکتا۔

پی ایل ڈی 1975 سپریم کورٹ 607 میں رپورٹ ہونے والے ایک مقدمے میں سپریم کورٹ کے تین انتہائی نامور جج محمد یعقوب علی، انوار الحق اور محمد گل نے محمد خان بخالف دوست محمد اور سترہ دیگر کے مقدمے میں فیصلہ صادر کیا۔ یہ سترہ صفحات پر مشتمل ایک تفصیلی فیصلہ ہے اس لئے میں عدالت پر یہ بوجھ ڈالنا نہیں چاہوں گا تاہم تین جج کی جانب سے جو فیصلہ دیا گیا اس کا اہم نکتہ یہ تھا:

''۔۔۔جیسا کہ قبل ازیں واضح کیا گیا ہے، مقصد امکانی طور پر گمراہ کن بات اور نتیجے کے خلاف تحفظ ہے۔اس لئے عدالت اس شرط پر سختی سے عمل درآمد کی باضابطہ تکمیل پر زور دے گی اور اسکی عدم تکمیل کو شک کی نظر سے دیکھے گی تاوقتیکہ معزز گواہان کی موجودگی یقینی بنانے میں ناکامی یا انکی عدم جرح کی عدالت میں وضاحت نہیں کی جاتی۔''

میرے موکل کے معاملے میں تفتیشی اہلکار نے کچھ اہلکاروں یا کچھ افراد کے نام نہیں دیئے ہیں جن سے انہوں نے مندرجہ بالا مقصد کیلئے رابطہ کیا تھا۔

13-A۔ جسٹس محمد ظہور الحق کا فیصلہ کیا ہوا اور 1980 پاکستان کرمنل لا جرنل 407 میں رپورٹ ہونے والا کراچی کا ایک اور مقدمہ بھی ہے۔ مذکورہ جج ان دنوں وفاقی شرعی عدالت کے جج اور بطور چیف اسکاؤٹ جنرل ضیا کے انتہائی قریبی ہیں۔ مذکورہ بالا مقدمے میں ایک پولیس اہلکار سب انسپیکٹر محمد مراد نے ایک شخص علی گُل کو گرفتار کیا۔ پولیس کو ملزم کی گرفتاری کیلئے اس لئے روانہ کیا گیا تھا کہ وہ ایک اور فوجداری مقدمے نمبر 102/73 میں ملوث تھا۔ گرفتاری کے وقت

پولیس نے دو قابلِ استعمال گولیوں سمیت ایک بلا لائسنس دو نالی بندوق نمبر 24820 برآمد کی۔ استغاثہ کی جانب سے یہ دلیل پیش کیا گیا تھا کہ پولیس اہلکار کی گواہی بھی کسی اور فرد کی طرح ہی معتبر ہے اور کسی اور کی عدم موجودگی کی صورت میں اس پر انحصار کیا جائے۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ ایسا ہوسکتا ہے تاہم ایک مشکل درپیش ہے جو میں اس معاملے میں دیکھتا ہوں کہ پولیس کے مطابق کہ یہ رات کو کی جانے والی ناکہ بندی کا معاملہ تھا، مجھے نظر آتا ہے کہ پولیس کو پیشگی اطلاع تھی اسی لئے ایس ایچ او نے سب انسپکٹر محمد مرید کو درخواست گذار کی گرفتاری کی ہدایت کی، چونکہ پولیس نے مذکورہ پولیس اسٹیشن سے چل کر رات میں علی گل کی گرفتاری کی سعی کی تھی، اس لئے پولیس پر لازم تھا کہ وہ مقامی آبادی میں سے دو معززین کو مشیران کے طور پر اپنے ساتھ لے جاتی تاکہ وہ سیکشن 103 سی آر پی سی کے تحت تلاشی یا گرفتاری کے گواہ رہتے، تاہم وہ پیشگی اطلاع کے باوجود اس قانونی شرط کی تکمیل میں ناکام رہے۔ میں اس نقطہء نظر کا ہوں کہ برآمدگیاں قانون کی مطابقت میں نہیں ہیں کیونکہ انکو علاقے کے دو معززین نے مشاہدہ نہیں کیا ہے اور سیکشن 103 سی آر پی سی کے خلاف ورزی ہوئی ہے۔

ہمارے معاملے میں پولیس پارٹی کو پیشگی علم تھا کہ بدر جمال ابڑو کے دفتر کے ایک سابق ملازم غلام شبیر شر کے مقدمے کے سلسلے میں بدر جمال ابڑو کو گرفتار کیا جائے گا۔ وہ ماسوائے ملک اشرف کے جو یہ نہیں کہتے کہ کوئی کارڈ، جیسا کہ استغاثہ کا الزام ہے، برآمد ہوئے، پولیس اہلکاروں کے علاوہ کسی معزز شخص کو اپنے ہمراہ نہیں لے گئے۔ وہ پمفلٹ کی بات کرتا ہے، تاہم تفتیشی اہلکار ممتاز برنی کا کہنا ہے کہ وہ ایک ناخواندہ شخص ہے اور ہوسکتا ہے کہ اس نے کارڈ کو پمفلٹ سمجھا ہو۔ وہ کارڈ اور پمفلٹ میں فرق کو بخوبی سمجھتا ہے اس لئے تفتیشی اہلکار کا امکان مکمل طور پر غلط ہے۔

14- دوسرا مقدمہ فوجی عدالت سے متعلق ہے۔ یہ نعمت بخلاف سرسری سماعت کی فوجی عدالت کا مقدمہ ہے جس کا فیصلہ جناب دلاور محمود نے کیا اور پاکستان لا جرنل 1979 لاہور 171 میں رپورٹ ہوا ہے۔ اس مقدمے میں ملزم نعمت علی پر الزام تھا کہ اُس کے پاس 19 جنوری 1978 کو نعمت آرٹ پریس پر فحش مواد تھا۔ ایک اور شخص تاج محمد پر اسی جرم کے ارتکاب کا الزام

عائد کیا گیا کہ اُس کے پاس ''روشنائی'' نامی رسالے میں شائع شدہ قابلِ اعتراض اور تخریبی مواد تھا۔ اس پر ''رام لعل تیگڑہ'' کے طور پر بیان کیا گیا اسمگل شدہ فحش مواد رکھنے کا بھی الزام عائد کیا گیا تھا۔ ایک پولیس اہلکار سب انسپیکٹر سی آئی ڈی چودھری نذیر حسین کا بیان یہ تھا کہ نعمت علی کی نشاندہی پر رسالہ اسکے قبضے سے برآمد کیا گیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یہ اسکے علم میں نہیں تھا کہ آیا برآمدگی یا چھاپے کا مشاہدہ کرنے کیلئے لوگوں میں سے کسی کو رابطہ کیا گیا تھا یا نہیں، اگرچہ اس علاقے میں کئی ایک گھر تھے۔ فاضل جج کا کہنا تھا کہ ریکارڈ پر موجود کوئی بھی چیز یہ ظاہر نہیں کرتی کہ متعلقہ حد کی کسی عدالت سے پٹیشن کنندہ کی حدودِ ملکیت پر چھاپے یا تلاشی کیلئے کوئی وارنٹ حاصل کیا گیا تھا۔ نعمت علی کی پرنٹنگ پریس پر کئی مرتبہ چھاپہ مارا گیا تھا۔ اسی طرح تاج محمد کی دکان اور گھر پر کسی نوعیت کے تلاشی کے وارنٹ کے بغیر چھاپہ مارا گیا اور تلاشی لی گئی۔ سیکشن 96 اور 95 سی آر پی سی کی بھی صریحاً خلاف ورزی کی گئی۔ گواہان میں سے ایک کا کہنا تھا کہ کسی میجر عبدالحمید نے اقبال کو گرفتار کیا تھا۔ یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ فوجی اہلکار پٹیشن گذار محمد اقبال کو مقدمے کی تفتیش کیلئے حراست میں لینے کا اختیار نہیں رکھتا تھا۔ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ لگ بھگ تمام استغاثہ کے گواہان نے بیان دیا ہے کہ پٹیشن گذار کی ملکیت کے حامل علاقے کا کوئی بھی معزز شخص پٹیشن گذار سے ہونے والی مختلف برآمدگیوں یا تلاشی کے موقعہ پر موجود نہیں تھا۔ اس معاملے/ مقدمے میں سیکشن 103 سی آر پی سی کی شعوری خلاف ورزی کی گئی ہے۔ نام نہاد برآمدگیاں پٹیشن گذاروں کے خلاف استعمال نہیں کی جاسکتیں۔

میرے موکل کے معاملے/ مقدمے میں صورتحال مختلف نہیں ہے۔ ثبوت/ گواہی عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہے اور یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ استغاثہ کی جانب سے قوانین کی صریحاً خلاف ورزی کی گئی ہے اور ہمارے پولیس اہلکار قوانین توڑنے میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے اُس شخص کے بیٹے کو بھی نہیں بخشا جو ایک طویل عرصے سے عدلیہ میں خدمات سرانجام دے رہا ہے اور جس کا پورا خاندان قانون سے بخوبی واقف ہے۔ میرے مؤکل کے والد کوئی دامان حاصل کرنے میں اس لئے ناکام رہے کہ پولیس اہلکاروں نے پاکستان پینل کوڈ کے سیکشن 292 کے

بجائے مارشل لاضوابط کا آہنی ہتھوڑا استعمال کیا ہے۔

15- ایک اور اہم مقدمہ 1980 پاکستان کرمنل لا جرنل 832 میں رپورٹ ہوا ہے جس کا فیصلہ جسٹس دلاور محمود نے عطا الرحمان بخلاف سربراہ سرسری سماعت کی فوجی عدالت نمبر گجرات کے مقدمے میں دیا تھا۔ یہ مقدمہ فلیش مین ہوٹل راولپنڈی کے ایک کمرے سے کچھ قابلِ اعتراض کتابچے برآمد کرنے سے متعلق تھا۔ اس کمرے پر چھاپے کے وقت عطا الرحمان ٹھرا ہوا تھا۔ بعدازاں یہ بھی معلوم ہوا کہ کچھ دیگر افراد بھی وہاں مقیم تھے۔

برآمد ہونے والے کتابچے/ پمفلٹ زیر درج تھے:

''جنرل ضیا کی تقریر کا پوسٹ مارٹم''

''جنرل ضیا کی 25 جون 1978 کو کی گئی تقریر کا جواب''

استغاثہ نے ذیل درج نوعیت کے الزامات عائد کیے تھے:

''پٹیشن گذار نے مسلح افواج کیلیے عدم اطمینان پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس ضمن میں 5 اور 6 اگست 1978 کی درمیانی شب سوا ایک بجے فلیش مین ہوٹل راولپنڈی میں اسکے قبضے سے ایک کتابچہ'' جنرل ضیا کی تقریر کا پوسٹ مارٹم اور جنرل ضیا کی 25 جون 1978 کو کی گئی تقریر کا جواب'' برآمد ہوا۔ مذکورہ کتابچہ پاکستان کی مسلح افواج کے خلاف نفرت اور عدم اطمینان پیدا کرنے اور عوام الناس میں اشتعال پیدا کرنے کی ترغیب دینے والے مواد پر مبنی تھا۔ اس پر ایک ایسی سیاسی جماعت کے مقاصد کی تشہیر کرنے کا بھی الزام عائد کیا گیا جو مارشل لا نافذ کرنے کے مقاصد سے متصادم تھے اور وہ بلواسطہ یا بلاواسطہ ایسا مواد تقسیم کرنے کا مرتکب بنا جو کہ ایک سیاسی جماعت کے مقاصد کا حامل تھا۔

گواہان کی فہرست میں سید فدا حسین فرسٹ کلاس مجسٹریٹ، احمد خالد سب انسپیکٹر، امیر احمد سب انسپیکٹر، حق نواز کیانی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس اور عبدالعزیز انسپیکٹر کے نام بھی شامل تھے۔ یہ خصوصی فوجی عدالت آسانی کے ساتھ ان دونوں مقدمات میں مماثلت تلاش کر سکتی ہے، ماسوائے اسکے کہ رپورٹ ہونے والا مقدمہ سرسری سماعت کی فوجی عدالت میں چلایا گیا تھا

جبکہ یہ مقدمہ ایک خصوصی فوجی عدالت میں چلایا جا رہا ہے اگرچہ دونوں ہیں فوجی عدالتیں۔

ہائی کورٹ کے جج کہتے ہیں:

سید فدا حسین، مجسٹریٹ پولیس کے ہمراہ تھے جب پٹیشن گذار کو کمرہ نمبر 56 فلیش مین ہوٹل راولپنڈی سے گرفتار کیا گیا۔ انکی موجودگی میں مذکورہ ہوٹل کے کمرہ نمبر 56 اور 43 کی تلاشی لی گئی، ریکارڈ پر ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو عندیہ دے کہ کسی اختیاری کی جانب سے کوئی رسمی حکم جاری ہوا تھا یا پولیس یا مجسٹریٹ کی جانب سے کمرے کی تلاشی کیلئے کوئی وارنٹ حاصل کیا گیا تھا۔ ریکارڈ پر ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس سے عندیہ ملے کہ سیکشن 165 سی آر پی سی یا یہاں تک کہ سیکشن 103 سی آر پی سی کو پیشِ نظر رکھا گیا تھا۔ اس مقدمے کی ایف آئی آر بھی پریس اینڈ پبلیکیشن آرڈیننس 1963 کے سیکشن 153 اور 54 کا حوالہ دیتی ہے۔ پریس اینڈ پبلیکیشن آرڈیننس کے سیکشن 39 کی صورت میں ایک تیز/ واضح بندوبست ہے جو تلاشی کے وارنٹ سے متعلق ہے۔ یہ سیکشن ضلعی مجسٹریٹ کو کم از کم سب انسپکٹر کی سطح کے کسی پولیس اہلکار کو قابلِ اعتراض مواد رکھے جانے والی جگہ میں داخل ہونے اور تلاشی لینے کا وارنٹ جاری کرنے کا اختیار دیتا ہے۔ بلاشبہ سیکشن 39 کی بھی تکمیل نہیں گئی۔ کئی مقدمات میں یہ طئے کیا گیا ہے کہ جہاں سیکشن 165 سی آر پی سی میں فراہم کیے گئے تحفظ کو مقدم نہیں رکھا جائے گا تلاشی قانونی طور پر سقم مجولی سمجھی جائے گی۔ یہ طئے شدہ قانون ہے کہ جب قابلِ دسترس قانون کوئی چیز جب ایک سے زائد افراد کے قبضے/ ملکیت میں ہوگی، تو اس کی ذمہ داری کسی ایک فرد پر ڈالنا ممکن نہیں ہوگا۔ صرف یہ حقائق کہ کوئی فرد کسی ایسی جگہ کی نشاندہی کرتا ہے جہاں ایسی کوئی چیز چھپائی گئی ہو، اگر وہ مذکورہ جگہ اسکی اپنی نہیں ہے تو عدالت کے پاس اس نتیجے تک پہنچنے کا جواز نہیں ہوگا کہ جگہ کی نشاندہی کرنے والا شخص اسکا مالک سمجھا جائے گا نہ ہی چھپائی جانے والی جگہ کا صرف علم ہونا ہی اس نتیجے کا باعث ہوگا کہ کچھ معلومات رکھنے والا فرد اسکو چھپائے جانے والے عمل میں بھی شریک کار سمجھا جائے گا۔ اس نکتے سے متعلق کئی مقدمات کا حوالہ دیا جاسکتا ہے تمام فاضل جج نے مندرجہ ذیل مقدمات پر اکتفا کیا:

(i) اے آئی آر 1941 لاہور 471

(ii) اے آئی آر 26 لاہور 137

(iii) 1973 پاکستان کرمنل لا جرنل 1066

(iv) 1975 پاکستان کرمنل لا جرنل 1096

اس مقدمے میں تفتیشی اہلکار نے الزامات کے حوالے سے قابلِ اعتراض حصوں کے متعلق واضح طور پر نہیں بتایا۔ مزید براں یہ کہ اگر کسی چیز کو قابلِ اعتراض سمجھا جاتا ہے، تو تفتیشی اہلکار نے ثابت نہیں کیا کہ یہ بالخصوص مخصوص ملزم سے متعلقہ ہے۔ چونکہ استغاثہ نے تسلیم کیا ہے کہ مبینہ جگہ پر عام طور مختلف افراد آتے رہے ہیں، اگرچہ وہ کہہ رہے ہیں کہ پہلے دن دو افراد پائے گئے، بعد ازاں دوسرے دن دو مزید افراد گرفتار کیے گئے اور اُن میں سے ایک چالان کے مطابق دورانِ حراست ہلاک کر دیا گیا۔ میرے مؤکل کی صورتحال دیگر کے مقابلے میں زیادہ واضح ہے۔ اس لئے مجھے زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے اور عدالت کو برآمدگیوں کی قانونی صورت کا فیصلہ کرنے کا موقعہ ملنا چاہیئے۔ تاہم یہ اس عدالت کے سامنے واضح ہے کہ تمام الزمات مبینہ طور پر برآمد کیے گئے مواد پر مبنی ہیں اور جب برآمدگیوں کی قانونی حیثیت واضح طور پر قانون کی خلاف ورزی پر مبنی ہو تو ایسی برآمدگی بے معنی ہو جاتی ہے اور اس لئے کسی بھی بڑے ملزم کو ایسی برآمدگیوں کی بنیاد پر سزا نہیں دی جا سکتی یہاں تک کہ اگر یہ عدالت کی نظر میں قابلِ اعتراض بھی ہوں، اور اس وجہ سے جرم کے ارتکاب میں شراکت داری کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔

16- اسلام میں، شہریوں کی زندگی کو بت سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جبکہ پیغمبر کا کہنا ہے کہ ''جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔'' انسانی زندگیوں سے کھیلنے کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان میں ایسے افراد کیلئے خصوصی عدالتیں قائم ہیں اور سرکاری وکلا کو ''خصوصی استغاثہ'' کہا جاتا ہے اور ان عدالتوں کو ''ڈرگ کورٹ'' کا نام دیا گیا ہے۔ دو دیگر اراکین فضل الاہی اور عبدالحمید کے ساتھ جناب زیڈ اے چنا (چیئرمین) کی جانب سے فیصلہ کیا گیا اور 1980 پاکستان کرمنل لا جرنل 148 میں رپورٹ ہونے والا ایک مقدمہ ہے۔ خصوصی پولیس نے ایک دکان پر چھاپہ مارا اور ایسی ادویات برآمد کیں جن میں نقص تھا۔ دو مشیران عام لوگوں سے تعلق

رکھتے تھے اور وہ معززین میں سے تھے۔ اُن میں سے ایک کا گلیکسو لیبارٹریز سے تعلق تھا لیکن اُن میں سے کوئی بھی اُس علاقے کا نہیں تھا۔ عدالت کے تینوں اراکین نے واضح کیا کہ:

''سیکشن 103 سی آر پی سی متعین کرتا ہے کہ تلاشی لازماً علاقے کے معزز افراد کی موجودگی میں لی جائے۔ دونوں افراد معززین کے زمرے میں تو آ سکتے ہیں تاہم وہ یقینی طور پر علاقے سے تعلق رکھنے والے گواہان نہیں ہیں اور مزید براں یہ کہ وہ مفاد رکھنے کے حامل افراد ہیں۔ اس لئے اس گواہی کو انتہائی شک وشبے کی نظر سے دیکھنا ہوگا کیونکہ تلاشی سیکشن 103 سی آر پی سی کے ہی تحت کی گئی تھی۔

یہاں تک کہ ان دو مفادات کے حامل گواہان کی گواہی استغاثہ کے مقدمے کیلئے زیادہ سود مند نہیں ہے۔ جیسا کہ پہلے ہی واضح کیا گیا ہے، برآمدگیاں دکان کے پچھلے حصے سے کی گئیں جو کہ سامنے والے حصے سے الماریوں کے ذریعے علیحدہ کیا گیا ہے۔ دونوں مشیران نے تسلیم کیا ہے کہ وہ پچھلے حصے میں نہیں گئے تھے جہاں سے گولیاں مبینہ طور پر برآمد کی گئی تھیں۔ مزید یہ کہ استغاثہ کے گواہ ناصر جمال نے تسلیم کیا ہے کہ وہ دکان کے جس سامنے والے حصے میں کھڑے تھے، وہاں سے دکان کا پچھلا حصہ دیکھنا ناممکن تھا۔ ان حالات میں یہ حقیقتاً کہا نہیں جا سکتا کہ برآمدگیاں مشیران کی موجودگی میں ہوئیں۔ اس لئے ملزم کو شک کا فائدہ دیا گیا اور ملزم بری کر دیا گیا۔

ہمارے مقدمے میں انہوں نے مبینہ برآمدگیاں صدر کے علاقے میں واقع کتابوں کی ایک دکان سے کرنے کا دعویٰ کیا ہے اور اگر مشیران کی گواہی مفادات کی حامل نہیں ہے تو پھر کوئی تبصرہ نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اگر یہ قابلِ اعتراض تھیں تو یہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے اگر انکے پاس قابلِ اعتراض مواد تھا تو پھر گواہان کو پولیس نے آزاد کیوں کر دیا۔ خود تفتیشی اہلکار نے تسلیم کیا ہے کہ یہ نہ تو مبینہ ملزم بدر ابڑو سے برآمد ہوا اور نہ ہی اس کمرے سے جو اسکے زیرِ استعمال تھا۔ استغاثہ کا کہنا ہے کہ یہ چیزیں اس کمرے سے برآمد ہوئیں جو عملے کے زیرِ مصرف تھا۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ تلاشی کے ضمن میں مختلف ہائی کورٹس کے ججز کے درمیان اختلاف ہے۔ مثلاً، پنجاب کے یعنی لاہور ہائی کورٹ کے ججز سمجھتے ہیں کہ افراد لازمی طور پر مقامی علاقے سے

ہوں اور زور لفظ ''مقامی علاقے'' پر ہے جبکہ دوسری جانب، کراچی (سندھ) ہائی کورٹ کے ججز دو گروپوں میں منقسم ہیں۔ایک گروپ سمجھتا ہے کہ زور مقامی علاقے پر ہے جبکہ دوسرے کے خیال میں زور ''باعزت افراد'' پر ہے۔جیسا کہ اس عدالت کے اراکین کا تعلق بھی مختلف صوبوں سے ہے اس لئے میں اپنے دلائل کا اختتام دونوں نقطۂ نظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے کروں گا۔

ایک مقدمے (ممتاز احمد بخالف ریاست) 1974 پاکستان کرمنل لا جرنل 1937 میں رپورٹ شدہ میں فیصلہ دینے والے جسٹس مشتاق حسین (اب جبری طور پر ریٹائر) اور جسٹس اسلم ریاض حسین (اب سپریم کورٹ کے جج) لاہور ہائی کورٹ کے ججز کے طور پر قتل کے مقدمے کی سماعت کررہے تھے۔اس مقدمے میں ملزمان کو 18، 13 اور 10 برس کی تین لڑکیوں کو قتل کرنے کے جرم میں سزائے موت سنائی گئی تھی۔ ملتان کے ایڈیشنل سیشن جج نے ماورائے عدالت اعتراف، ترغیب اور برآمدگی وغیرہ کی بنیاد پر یہ سزا سنائی تھی۔ہائی کورٹ کے روبرو مقدمہ سزائے موت کی توثیق کیلئے پیش ہوا تھا۔جائے واردات سے ملزمان کے خون میں تر جوتے برآمد ہوئے تھے۔معزز جج صاحبان کا ذیل طور پر کہنا تھا:

''تلاشی لینے والے افسر پر یہ لازم ہے کہ وہ دو یا زائد مقامی معززین کو طلب کرے، جن کے علاقے میں تلاشی کی جگہ ہو، جس کو تلاشی کے ساتھ جوڑا اور گواہ بنایا جا سکے۔اگر کسی کو مقامی علاقے کے باہر سے بلایا جاتا ہے تو یہ اس تلاشی کو غیر موثر تو نہیں کرے گا لیکن اگر یہ گنجان آبادی والا علاقہ ہے تو یہ پوری کارروائی پر شکوک وشبہات کو جنم دے گا کیونکہ ایسی صورت میں تلاشی کے عمل کیلئے ذمہ دار پولیس اہلکار کی جانب سے گواہان کو اپنی تیار کردہ داستان پر مطمئن کرنے کی امکانات زیادہ ہوں گے۔'' دونوں فاضل ججز نے ایک پرانے مقدمے سردار علی بخالف ریاست پر انحصار کیا جس (پی ایل ڈی 1964 لاہور 386 میں رپورٹ شدہ) میں یہ فیصلہ دیا گیا کہ عدالتیں سیکشن 103 کی تکمیل کا لازماً مطالبہ کریں اور ہر وہ مقدمہ جس میں استغاثہ کی جانب سے اسکی مطمئن نہ کرنے کی حد تک پیروی کی جائے تو عدالتیں تلاشی کے چشم دید گواہان کے بیانات کو انتہائی شک کی نگاہ سے دیکھیں۔ایسے معاملات میں جہاں ایکسائیز یا پولیس اہلکار ایسے اشخاص کو گواہان کے طور پر اپنے

ساتھ لے جاتے ہیں جن کی عزت وتوقیر پر سوال ہوں یا جن کا کسی اور علاقے سے تعلق ہو، یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ایسے گواہان ایسی بات کی آسانی سے تائید کرلیں گے جوان کے سامنے پیش کی جائے گی۔اس طرح مندرجہ بالا مقدمے سے، یہ واضح ہے کہ ہائی کورٹ کے ججز کی جانب سے اولاً اہمیت لفظ ''علاقے'' اور بعدازاں ''معززین'' کو دی گئی ہے۔اس خصوصی فوجی عدالت کے روبرو ہمارے مقدمے میں استغاثہ کا بیان ہے کہ چار مقامات پر چھاپہ مارا گیا لیکن یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ علاقے سے تعلق رکھنے والے دوچشم دید گواہان کے شرط کو پورا نہیں کیا گیا اور ہر علاقے کا واحد گواہ بھی استغاثہ کی بات کی قطعی تائید نہیں کرتا۔یہ تلاشی کے ضمن میں تضادات اس امر کو ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں کہ ہر جگہ پر تلاشی کا عمل غیر قانونی تھا اور اس لئے اس پر انحصار نہیں کیا جاسکتا۔

میں مذکورہ بالا نکتے پر انگنت فیصلوں کا حوالہ دے سکتا ہوں تاہم آخر میں سندھ ہائی کورٹ کے ایک نامور اور انتہائی قابلِ احترام جج کے دیئے گئے فیصلے کا ذکر کروں گا۔مرحوم جج طفیل علی عبدالرحمان ایک وکیل کے طور پر سندھ ہائی کورٹ بار کے صدر بھی رہے۔وہ جج اور بعدازاں چیف جسٹس کے طور پر اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے۔وہ نہ صرف فوجداری قانون کے انتہائی قابل احترام وکیل تھے بلکہ جج اور چیف جسٹس کی حیثیت میں انتہائی زیرک جج سمجھے جاتے تھے۔ 1975 پاکستان کرمنل لا جرنل 565 میں رپورٹ ہونے والے ایک مقدمے میں انکا کہنا تھا کہ، ''اسکے باوجود کہ میں اتفاق کروں گا کہ تلاشی کے زمرے میں دیئے گئے بیان میں پولیس اہلکاروں پر انحصار نہیں کیا جانا چاہئے بلکہ آزادانہ گواہی پر زور دینا چاہئے، اس سیکشن کی حقیقی روح پر اس نوعیت کے مقدمات پر زور دیا جانا چاہیئے۔یہ کیسی حقیقت ہے کہ مشیر نامے پر دستخط کرنے والے گواہان اُس علاقے کے مکین نہیں ہیں۔مذکورہ سیکشن کے مقصد کے حوالے سے، میں سمجھتا ہوں کہ زور اس امر پر ہے کہ گواہان معززین ہوں بجائے اسکے کہ مذکورہ علاقے کے مکین ہوں۔زیرِ نظر مقدمے کی صورت میں، جہاں وقوعہ ایک انتہائی مصروف اور پر ہجوم علاقے میں پیش آیا، پر سینکڑوں افراد، چاہے وہ اُس علاقے کے نہ ہوں، موجود ہوں گے۔قانونی طور پر اگر میں مذکورہ سیکشن کی تشریح کروں تو یہ مذکورہ علاقے سے اس مقصد کے تحت پولیس اہلکار کی جانب سے طلب

کرنے کے بجائے لازماً اسکی موجودگی کی شرط عائد کرتا ہے، جس کی مذکورہ طور پر خلاف ورزی ہوگی اگر پولیس اہلکار برآمدگی/تحویل سے قبل ہی اسکو اپنے ساتھ ملاتا/رکھتا ہے۔ چشم دید گواہی کیلئے گواہان کا ہونا چاہئے، چاہے وہ اس علاقے کے حقیقی مکیں ہوں'' اس طرح فاضل جج سمجھتے ہیں کہ گواہ چاہے اُس علاقے کا ہو یا نہیں، لیکن اسکو وقوع پر موجود ہونا چاہئے اور اسکو تلاشی سے قبل حاصل نہ کیا گیا ہو۔ یہ خصوصی فوجی عدالت مکمل طور پر یہ جانتی ہے کہ ڈی ایس پی ممتاز برنی کے مطابق اس نے ایک شخص کا انتظام کیا او پھر تلاشی کیلئے روانہ ہوا۔

اس لئے کسی جگہ پر کسی شخص کی جانب سے لی گئی تلاشی ذیل درج وجوہات کی بنیاد پر اپنی قانونی قدر کھودیتی ہے:

1- پولیس کے علاوہ کسی اور آزاد فرد کو تلاشی کا مشیر نہیں بنایا گیا۔

2- اگر کوئی آزاد مشیر تھا تو اس نے تلاشی کی حمایت/تائید نہیں کی

3- تلاشی لینے سے قبل کسی بھی مجسٹریٹ سے تلاشی کے وارنٹ حاصل نہیں کیے گئے۔

4- علاقے سے تعلق رکھنے والے کسی فرد کو، چاہے وہ وہاں کا مکین ہو یا نہیں، مشیر نہیں بنایا گیا۔

5- یہ ثابت نہیں کیا گیا کہ وہ معزز لوگ تھے۔

اگر یہ عدالت سمجھتی بھی ہے کہ تلاشی قانونی تھی، یہ پھر بھی متعین کرنا ہوگا کہ اس کا اثر کیا ہوا/نتیجہ کیا نکلا، اگر مذکورہ جگہ تلاشی کے وقت مشیر کی موجودگی میں سر بہ مُہر نہیں کی گئی ہو؟

19- علاوہ ازیں، تفتیشی اہلکار، استغاثہ کے گواہان مخدوم حیات اور ملک اشرف کی باتوں میں ذیل درج تضادات یہ واضح کرتے ہیں کہ بدر جمال کے دفتر پر چھاپے اور مشکوک اشیا کی برآمدگی کی پوری داستان من گھڑت ہے:

(a) چیف تفتیشی اہلکار یعنی ڈی ایس پی ممتاز برنی استغاثہ کا گواہ نمبر 24 اپنے بیان میں بتاتا ہے کہ اُسکے ہمراہ ایس ایچ او مخدوم حیات، مشیر ملک اشرف اور ایک 'کانسٹیبل' تھے اور وہ 'ہیڈ کانسٹیبل' کا کوئی ذکر ہی نہیں کرتا۔

جبکہ استغاثہ کے گواہ نمبر 11، ایس ایچ او مخدوم حیات نے کہا تھا کہ ایک ہیڈ کانسٹیبل 'منشی' چھاپے کے وقت موجود تھا۔ اور اسی 'ہیڈ کانسٹیبل' نے بدر کے دفتر سے برآمد ہونے والی اشیا کی

فہرست تیار کی تھی۔

یہ ٹھوس تضاد ہے اور استغاثہ کے گواہ نمبر 24 ڈی ایس پی ممتاز برنی کے بیان سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس لئے دونوں پولیس اہلکاروں کی ساکھ اور کردار پر شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں۔

(b) استغاثہ کا گواہ نمبر 24 کہتا ہے کہ صرف بدر جمال ابڑو اپنے دفتر میں موجود تھا، اور باقی ماندہ دو کمروں میں بھی کوئی نہیں تھا۔

جبکہ استغاثہ کا گواہ نمبر 11 ایس ایچ او مخدوم حیات اور استغاثہ کا گواہ ملک اشرف گواہ نمبر 24 ممتاز برنی کی بات کی نفی کرتے ہیں۔ اُن دونوں نے خصوصی فوجی عدالت کے سامنے اپنے بیانات میں بتایا ہے کہ چھاپے کے وقت بدر جمال ابڑو کے ساتھ دو دیگر لوگ بھی اسکے دفتر میں موجود تھے۔

یہ چھاپہ مارنے والی ٹیم کے دو پولیس اہلکاروں کی گواہی/ بیان میں ایک حقیقی، ٹھوس اور بڑا تضاد ہے۔ واحد سویلین مشیر اور استغاثہ کا گواہ نمبر 22 بھی ڈی ایس پی کی نفی کرتا ہے۔

(c) ڈی ایس پی، استغاثہ کے گواہ نمبر 24 نے بتایا ہے کہ چھاپے کے وقت وہ وردی میں تھا۔ اُس نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ یہ کہنا درست ہوگا کہ بدر جمال ابرو کے دفتر سے کوئی مواد برآمد نہیں ہوا تھا جو کہ مختلف فرقوں یا مذاہب کے درمیان نفرت انگیزی پیدا کرنے کا باعث بن سکتا ہو۔ یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ بدر جمال ابڑو کے دفتر سے برآمد ہونے والا کوئی مواد پاکستان کی مسلح افواج یا پاکستان کے خلاف نفرت انگیزی پھیلانے کا باعث نہیں تھا۔

(d) دوسری جانب استغاثہ کے گواہ نمبر 11 ایس ایچ او مخدوم حیات نے اپنے بیان میں کہا کہ چھاپہ مارنے والی پولس پارٹی کے تمام اراکین سادہ کپڑوں میں تھے۔ انہوں نے وردی نہیں پہنی تھی، تا کہ کسی کو چھاپہ مارنے کا مقصد معلوم نہ ہو سکے۔

یہاں پر یہ واضح ہے کہ ڈی ایس پی اور ایس ایچ او میں سے کوئی ایک سچ نہیں بول رہا ہے یا پھر استغاثہ کی من گھڑت داستان گھڑنے کیلئے دونوں جھوٹ کا سہارا لے رہے ہیں۔

ڈی ایس پی استغاثہ کے گواہ نمبر 24 نے بتایا ہے کہ برآمدگی نامہ پر دو لوگوں ایس ایچ او مخدوم حیات اور ملک اشرف نے دستخط کیے تھے۔

جبکہ استغاثہ کا گواہ نمبر 22 ملک اشرف کہتا ہے کہ اس نے برآمدگی نامے پر دستخط کیے جبکہ

ایک اور مشیر نے اسکی موجودگی میں دستخط کیے۔ تاہم دوسرا مشیر ایک ''سویلین'' تھا۔

(e) استغاثہ کا گواہ نمبر 24 ممتاز برنی مزید کہتا ہے کہ بدر جمال ابڑو کو تحویل میں لی گئی اشیا سمیت براہ راست منگھو پیر پولیس اسٹیشن لے جایا گیا۔

جبکہ استغاثہ کے گواہ نمبر 22 ملک اشرف نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ بدر جمال ابڑو کو گرفتاری کے بعد نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن لایا گیا، اور اسکے بعد استغاثہ کا گواہ نمبر 22 پولیس اسٹیشن سے چلا گیا۔

(f) استغاثہ کے گواہ نمبر 22 ملک محمد اشرف نے 17 اگست 1982 کو خصوصی فوجی عدالت کے سامنے اپنے بیان میں کہا ہے کہ وہ (استغاثہ کا گواہ نمبر 22) اعوان انٹرنیشنل لمیٹڈ کا مالک ہے۔

جبکہ ڈی ایس پی برنی نے ایک عدالتی سوال کے جواب میں 6 دسمبر 1982 کو فاضل خصوصی فوجی عدالت کے روبرو بتایا کہ ملک محمد اشرف (استغاثہ کا گواہ نمبر 22) ایک ناخواندہ شخص ہے۔ یہ ریکارڈ پر طے شدہ امر ہے کہ استغاثہ کا گواہ نمبر 22 ملک محمد اشرف ایک ناخواندہ شخص ہے اور وہ کسی لمیٹڈ کمپنی کا مالک نہیں ہے۔ درحقیقت استغاثہ کا گواہ نمبر 22 پولیس کا ایک پیشہ وارانہ دیہاڑی باز گواہ ہے۔

(g) استغاثہ کے گواہ نمبر 24 ڈی ایس پی ممتاز برنی نے عدالت کے روبرو ایک عدالتی سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ سادہ کپڑوں میں چوتھا شخص اسکا (استغاثہ کا گواہ نمبر 24) کانسٹیبل تھا، جس نے ملک محمد اشرف کے ہمراہ، ایگزیبٹ میں شامل مشیر نامے پر دستخط کیے تھے۔

جبکہ استغاثہ کے گواہ نمبر 11 ایس ایچ او مخدوم حیات نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ ہمراہ جانے والے شخص ہیڈ کانسٹیبل تھا، اور وہ چھاپے کے دوران کسی کانسٹیبل کی موجودگی سے متعلق کچھ نہیں بتاتا۔ یہ ڈی ایس پی کے بیان سے بڑا اور ٹھوس اختلاف ہے۔

مزید براں یہ کہ ڈی ایس پی ممتاز برنی خود اپنے بیان کی نفی کرتا ہے جب وہ یہ بیان دیتا ہے کہ مشیر نامے پر ایس ایچ او استغاثہ کے گواہ نمبر 11 مخدوم حیات اور استغاثہ کے گواہ نمبر 22 ملک اشرف نے دستخط کیے تھے۔

(h) عدالتی سوالات کے جواب میں ڈی ایس پی ممتاز برنی نے کہا کہ وقوع پر کوئی اور مشیر بننے کیلئے موجود نہیں تھا یا تیار نہیں تھا اس لئے ایس ایچ او استغاثہ کے گواہ نمبر 11 نے دوسرے مشیر

ملک اشرف استغاثہ کے گواہ نمبر 22 کے ساتھ ایگزبیٹ پر مشیر کے طور پر دستخط کیے۔

یہ ڈی ایس پی ممتاز برنی کی باتوں میں بڑے تضاد کا اظہار ہے کہ ایک مرحلے پر وہ کہتا ہے کہ ایگزبیٹ کے مشیر نامے پر دستخط کرنے والے ملک اشرف اور اسکا کانسٹیبل تھے، جبکہ ایک اور مرحلے پر ڈی ایس پی ممتاز برنی کہتا ہے کہ مشیر نامے پر دستخط کرنے کیلئے اور کوئی میسر نہیں تھا اس لئے مشیر نامے پر ایس ایچ او استغاثہ کے گواہ نمبر 11 مخدوم حیات اور استغاثہ کے گواہ نمبر 22 ملک اشرف نے دستخط کیے۔

اس طرح ڈی ایس پی کے دو متضاد بیانات کی وجہ سے خود اسکا اپنا کردار مشکوک ہو جاتا ہے۔ ان حالات اور تسلیم شدہ تضادات کی صورت میں معزز عدالت ڈی ایس پی ممتاز برنی کی جانب سے بیانات/تفتیش اور گواہان/ثبوتوں پر انحصار نہیں کرسکتی۔

(i) ممتاز برنی ڈی ایس پی (استغاثہ کا گواہ نمبر 24) مقدمے کی کارروائی چلنے کے دوران معزز عدالت کے سامنے اُس کانسٹیبل کو پیش کرنے میں ناکام رہا ہے جس کے متعلق اس نے اپنا کانسٹیبل ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔

ڈی ایس پی ممتاز برنی استغاثہ کے گواہ نمبر 24 نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ بدرابڑو کے دفتر سے ایسا کوئی قابلِ اعتراض مواد برآمد نہیں کیا گیا جو کہ موجودہ مقدمے سے اس کا کسی طور کا تعلق ثابت کر سکے۔ بعدازاں وہ مزید کہتا ہے کہ اس (ڈی ایس پی) نے اپنے بیان میں بتایا تھا کہ بدرابڑو کے دفتر سے یا قبضے سے خاص طور پر ایسی کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی ہے جو کہ اُسکو (بدر جمال) حالیہ مقدمے میں مرکزی ملزم یا شریک کار بنا سکے۔

موجودہ ملزم (بدرابڑو) کے خلاف ممتاز برنی کا الزام کہ شبیر شر نے سیکشن 164 کے تحت اپنے اعترافی بیان میں بتایا تھا کہ بدرابڑو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی مالی معاونت کررہے تھے بھی غلط ثابت ہوتا ہے کیونکہ خود استغاثہ کا گواہ ممتاز برنی ڈی ایس پی اس عدالت کے سامنے تسلیم کر چکا ہے کہ شبیر شر کے بیان میں ایسا کوئی عندیہ نہیں ملتا۔ استغاثہ کے گواہ کی باتوں میں بڑا اور ٹھوس تضاد پایا جاتا ہے۔

یہ اور زیادہ واضح عندیہ ہے کہ استغاثہ نے پاکستان کے ایک معصوم شہری کو ایک من گھڑت اور جھوٹے مقدمے میں پھنسانے کی ہر ممکن کوشش کی تاہم مقدمے کی تمام تر کارروائی کے دوران

استغاثہ میرے مؤکل کے خلاف کوئی ثبوت پیش کرنے میں بری طرح ناکام رہا ہے۔

مزید براں، تفتیشی اہلکار یعنی ڈی ایس پی ممتاز بر نی استغاثہ کا گواہ نمبر 24 حقیقی حقائق کے سامنے ٹھہر نہیں پایا او جرح اور معزز عدالت کے سوالات کے دوران رضا کارانہ طور پر تسلیم کر گیا کہ اس (ڈی ایس پی) نے بدر ابڑو کے دفتر سے ایسا کوئی بھی مواد برآمد نہیں کیا ہے جو اسکو موجودہ مقدمے کا ملزم/شریک کار بنا سکے۔

20- میں نے سیکشن 103 سی آر پی سی اور برآمدگیوں کی زیرِ بحث لاتے ہوئے مختلف فقروں میں کچھ سیکشنز کا حوالہ دیا ہے۔ میرے فاضل بھائی یوسف لغاری کسی گھر/ دفتر پر چھاپہ مارنے کیلئے استغاثہ کی جانب سے اختیار کیے جانے والے طریقہ ءکار کے ساتھ عدالت میں موجود ملزمان کے نام نہاد اعترافی بیانات کی اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔ اگر اعترافی بیانات قانونی طور پر نقائص سے بھرے ہوئے ہیں تو عدالت سزا دینے کی غرض سے ان پر انحصار نہیں کر سکتی۔ استغاثہ کے گواہان جناب سرور خان اور جناب جمالی جو کہ دونوں مجسٹریٹ ہیں، سے میں نے جرح کی ہے اور انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ بیانات ان تمام قانونی شرائط کے تحت نہیں تھے جو ان پر انحصار کرنے کیلئے ضروری ہوتے ہیں۔ ان مجسٹریٹس کے بیانات ریکارڈ پر ہیں اور مجھے یہ پڑھ کر سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سیکشن 164 سی آر پی سی اور اسکے قانونی پہلوؤں پر مزید دلائل یوسف لغاری دیں گے، اس لئے میں زیادہ تفصیل میں جائے بغیر صرف کچھ نکات کی بات کروں گا۔

(1) تفتیشی گروپوں کے تین دائرے رہے ہیں۔ پہلا گروپ ایس ایچ او صفدر بھٹی کو تفتیش منتقل ہونے تک پردے کے پیچھے رہا۔ اسکے بعد صفدر بھٹی نے تفتیش شروع کی اور اِس تفتیش کے نتائج عدالت کے سامنے ہیں۔ صفدر بھٹی نے عدالت کو بتایا کہ اپنی تفتیش کے دوران اسکو ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس کے تحت ملزمان کو چارج شیٹ کے الزامات کا مرتکب قرار دیا جا سکے۔ اسکے بعد تفتیش اس مقدمے کے حتمی تفتیشی اہلکار کے سپرد کی گئی جس نے اس عدالت کو بتایا کہ اس نے تفتیش اس مرحلے سے شروع کی جہاں صفدر بھٹی نے ختم کی تھی۔ ایس ایچ او مخدوم حیات تفتیش میں تفتیشی اہلکار کی مدد کر رہا تھا اور اس گروپ کی تفتیش صرف مبینہ ملزم امر لال اور بدر جمال ابڑو تک محدود تھی۔ جہاں تک امر لال کے معاملے کا تعلق ہے تو وکیل صفائی کی سرور خان سے جرح

نے یہ واضح کر دیا کہ امرلال نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ اس لئے جرم میں شراکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم تفتیشی اہلکار نے یہ الزام عائد کیا کہ بدر جمال دیگر ملزمان کی مالی معاونت کر رہا تھا۔ میں اس نکتے کو پہلے ہی زیرِ بحث لا چکا ہوں تاہم میں ہماری اعلیٰ عدلیہ کے کچھ فیصلوں کی روشنی میں ہمدردانہ غور کی ذیل درج گذارش ہی کروں گا۔

21۔ ٹوہ بخلاف ریاست مقدمے میں، جس کا فیصلہ آغا علی حیدر اور آئی محمود جے جے نے دیا اور جو 1975 پاکستان کرمنل لا جرنل 440 میں رپورٹ ہوا، عدالت کے سامنے قتل کے مقدمے میں ملزم کے اعتراف کا سوال تھا۔ فاصل ججز نے طے کیا:

''اعتراف جناب اے ڈی انصاری ایس ڈی ایم دادو نے ریکارڈ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے درخواست گذار کو بتایا تھا کہ اگر وہ اعتراف نہیں بھی کرتا تب بھی اسکو پولیس تحویل میں ریمانڈ پر نہیں دیا جائے گا۔ سوال اعتراف کے دستاویز میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم، جناب انصاری نے جرح کے دوران تسلیم کیا کہ اعتراف کا فارم ظاہر کرتا ہے کہ درخواست گذار کو پولیس کی تحویل کے ریمانڈ میں رکھا گیا تاہم یہ غلطی سے ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا ہی ہوا ہو، اعتراف درخواست گذار کی گرفتاری کے تیسرے روز ریکارڈ کیا گیا۔ اس ضمن میں کئی مستند حوالے موجود ہیں کہ چوبیس گھنٹے سے زائد کی تاخیر کسی عدالتی اعتراف کیلئے مہلک ثابت ہوسکتی ہے۔ ایسی صورت میں اسکو مدِنظر رکھنے کے معاملے کو لازماً خارج الامکان قرار دیا جانا چاہیئے۔

22۔ انگنت فیصلوں میں ایسی نوعیت کا موقف اختیار کیا گیا ہے تاہم مسٹر زیڈ اے چنا اور مسٹر جی ایم شاہ جے جے کی جانب سے فیصلہ کردہ اور پاکستان لا جرنل 1978 کراچی 101 میں رپورٹ شدہ محمد نسیم آغا بخلاف ریاست کا مقدمہ زیادہ اہم ہے، کیونکہ اس میں فاضل ججز ''تاخیر کو کس طرح برداشت کیا/توثیق دی جاسکتی'' کے نکتے کو زیرِ بحث لائے ہیں۔ یہ مقدمہ اس حوالے سے بھی اہم تھا کہ ملزمان کے خلاف الزامات دھماکہ خیز مواد کی صورت میں تخریبی سرگرمیوں کے تھے۔ فاضل ججز کا کہنا تھا۔

''جیسا کہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ زیرِ نظر مقدمے میں درخواست گذار محمد نسیم آغا کا اعترافی بیان ریکارڈ کرنے میں گیارہ دن کی تاخیر برتی گئی اور ڈی ایس پی الطاف علی آغا کی جانب سے اس تاخیر کی بیان کردہ وجوہات ہماری نظر میں اطمینان بخش نہیں ہیں۔''

ہمارے موجودہ مقدمے میں مبینہ ملزمان احمد کمال وارثی اور غلام شبیر شر کے اعترافی بیانات کوئی ایک مہینے بعد ریکارڈ کیے گئے اور استغاثہ کی جانب سے اس تاخیر کی کوئی وجہ ریکارڈ پر نہیں لائی گئی ہے۔ ایسے حالات میں، مرکزی ملزمان کے خلاف الزامات کے ضمن میں انکے اعترافی بیانات پر انحصار نہیں کیا جاسکتا ہوا تو پھر شریک کار بننے کا تو سوال ہی نہیں اُٹھتا۔

23- چارج شیٹ میں عائد کیے گئے الزامات کی ضمن میں ذیل درج گذارشات ہیں:

(i) جہاں تک پہلے الزام کا تعلق ہے، تو یہ اُن لوگوں سے متعلق ہے جو شیعہ سُنی مسئلہ اُٹھاتے ہیں اور اس طرح مختلف طبقات یا مذہبی فرقوں میں مخالفت پیدا کرتے ہیں۔ کوئی بھی ملزم مذہب کی بنیاد پر فرقوں میں یقین نہیں رکھتا یا کم از کم کسی ملزم نے یہ نہیں کہا ہے کہ وہ ''شیعہ'' ہے یا ''سنی''۔ اس لئے یہ الزام اگر مبہم نہیں ہے تو مکمل طور پر بے بنیاد ہے۔

(ii) جہاں تک دوسرے الزام کا تعلق ہے، ہم (وکیلِ صفائی) ادارے کے طور پر مسلح افواج اور ایک نظام کے طور پر مارشل لا میں فرق کو واضح کر چکے ہیں۔ کسی بھی ملزم نے ادارے کے خلاف کچھ نہیں کیا ہے۔ جہاں تک میرے مؤکل کا تعلق ہے تو اس نے مسلح افواج یا مارشل لا سے متعلق کچھ نہیں کہا ہے۔ بہ احوال دیگر مارشل لا کو ''نظریہء ضرورت'' کے طور پر قبول کیا گیا تھا اور جسٹس محمد افضل چیمہ کی جانب سے قرآن پاک کی آیات پر انحصار کرتے ہوئے ضابطہ اختیار کیا گیا تھا، جس میں کہا گیا ہے کہ ضرورت کے تحت سوئر کا گوشت تک کھایا جاسکتا ہے۔ میں اس نکتے پر تفصیل میں نہیں جاؤں گا کیونکہ مسلمان فلسفی اس نکتے پر بہت زیادہ کچھ کہہ چکے ہیں اور اسکو ''حلال'' اور ''حرام'' کے دائروں میں لیا جاسکتا ہے۔ تاہم تفتیشی اہلکار ممتاز برنی نے ایک مرحلے پر کہا ہے کہ بدر جمال ابڑو کے دفتر سے برآمد ہونے والے مبینہ کارڈوں پر ''سرخ سورج'' بنا ہوا ہے جو کہ کمیونزم کی علامت ہے۔ اس نکتے پر وکیلِ صفائی کی جانب سے جرح میں دکھانے کیلئے کافی ہے کہ تفتیشی اہلکار سچ نہیں بول رہا تھا۔ تاہم میں ایک پاکستانی اخبار کا تراشا پیش کر رہا ہوں جو یہ بتاتا ہے کہ اُبھرتا ہوا سورج جاپان کی علامت ہے جو کہ ایک کمیونسٹ ملک نہیں ہے اور یہ علیحدہ بات ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا کمیونسٹ ملک نہیں ہے جس کی علامت سرخ سورج ہے۔

(iii) جہاں تک تیسرے الزام کا تعلق ہے تو ہر سیاستدان کا نظریہء پاکستان سے متعلق اپنا نقطہء نظر ہے اور اسی طرح میرے مؤکل کا بھی اپنا ایک نقطہء نظر ہے اور یہ میں خود انکے اپنے الفاظ

میں گوش گذار کرتا ہوں:

''چونکہ میں سیاستدان نہیں ہوں اس لئے خود کو سیاسی بحث و مباحثے میں نہیں اُلجھاؤں گا، جہاں تک نظریہء پاکستان کا تعلق ہے، تو میں اس پر دھاڑنے اور تگ و دو کرنے کا کام رہنماؤں پر چھوڑتا ہوں۔ میرے لئے نظریہء پاکستان صرف اچھا شہری بننا اور دوسروں کی مدد کرنا ہے۔ اگر تمام افراد ایمانداری سے اس نظریئے کے پابند ہو جائیں تو میرا یقین ہے کہ پاکستان جنت میں تبدیل ہو جائے گا۔''

(iv) جہاں تک سیکشن 124 اے کے تحت الزام کا تعلق ہے، میرے فاضل دوست اس پر تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں اور میں وہی دلائل اختیار کرتا ہوں۔ قانونی اور حقائق کی بنیاد پر مندرجہ بالا گذارشات کی روشنی میں، میں بصد احترام گوش گزار کرتا ہوں:

1- کہ مبینہ ملزم (بدر جمال) ایک تاجر ہے، جو کہ معزز عدالت کے ریکارڈ پر ہے اور جس نے تا حال اپنے معصومانہ گناہوں کیلئے تقریباً دو برس کا عرصہ جیل میں مقید ہو کر گذارا ہے۔

2- کہ مبینہ ملزم پر اس مقدمے میں کچھ ثابت کیے بغیر مقدمہ چلایا گیا ہے۔

3- کہ تفتیشی اہلکار ڈی ایس پی، استغاثہ کے گواہ نمبر 24 ممتاز برنی، ایس ایچ او استغاثہ کے گواہ نمبر 11 مخدوم حیات اور استغاثہ کے گواہ نمبر 22 ملک اشرف کے بیانات میں تضاد ہی کافی ہے کہ استغاثہ مبینہ ملزم کے خلاف الزامات ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے۔

4- کہ یہ کسی شک و شبے سے بالاتر ثابت ہو چکا ہے کہ مدعا علیہ کو جھوٹے/ بے بنیاد الزامات کے تحت مقدمے میں پھنسایا/ ملوث کیا گیا۔

5- استغاثہ کے گواہ نمبر 24 ڈی ایس پی ممتاز برنی جو کہ اس مقدمے کا تفتیشی اہلکار رہے، کے بیانات میں تضادات ہی یہ ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں کہ صرف شک کی بنیاد پر ایک معصوم/ بے گناہ شخص کو اس مقدمے میں ملوث کیا گیا اور فقط شک کی بنیاد پر کسی ملزم کو سزا دینے کی پاکستان کی اعلیٰ عدلیہ سے کوئی نذیر نہیں ملتی۔

کہ معزز عدالت اس حقیقت کی توضیح کرے گی کہ کوئی فرد اگر اپنے گھر پر کوئی جرم کرتا ہے، کوئی عمل کرتا ہے یا اس میں شریک ہوتا ہے تو یہ اسکے آجر کا جرم نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

کہ ایک ملزم شبیر شر عارفہ انٹرنیشنل ایجنسی (افرادی قوت سے متعلق) میں جز وقتی کلرک تھا

جس کے ذمے بھرتی کے فارم اور دیگر متعلقہ کاغذات کا اندراج کرنا تھا۔

شبیر شر سے ملنے والی عارفہ انٹرنیشنل کی فائلوں میں متعلقہ بھرتی فارم ہی تھے۔ تفتیشی افسر ڈی ایس پی ممتاز برنی نے معزز عدالت کے سامنے تسلیم کیا ہے کہ عارفہ انٹرنیشنل کی ان فائلوں سے کسی بھی نوعیت کا کوئی قابلِ اعتراض مواد نہیں ملا ہے اور ان فائلوں کے کاغذات میں صرف بھرتی کے فارم ہی تھے۔

کہ ڈی ایس پی ممتاز برنی استغاثہ کے گواہ نمبر 24 نے اس معزز عدالت کے سامنے 14 دسمبر 1982 کو جرح کے دوران اپنے بیان میں تسلیم کیا ہے کہ بدر جمال ابڑو کے دفتر پر چھاپے سے متعلق ایگزبیٹ یو (مشیر نامہ) عندیہ نہیں دیتا کہ کوئی تخریبی یا قابلِ اعتراض مواد برآمد کیا گیا تھا۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ ''یہ درست ہے کہ مشیر نامے میں یہ ذکر نہیں ہے کہ ایگزبیٹ جی جی میں دکھائے گئے چار کارڈ دفتر کے کس حصے یا جگہ سے پائے گئے تھے۔'' (اس طرح چار کارڈوں کی مبینہ ملزم سے برآمدگی ثابت نہیں ہوتی۔)

اُس نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ وہ اپنی پوری تفتیش کے دوران ایک بھی ایسا شخص ہاتھ نہیں کرسکا جو کہہ سکے کہ بدر جمال ابڑو کسی طرح سے نظریہء پاکستان سے متصادم کسی نقطہء نظر کی تشہیر میں ملوث رہا ہے۔ ڈی ایس پی ممتاز برنی نے مزید بیان دیا کہ ''بدر ابڑو کے خلاف ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے جو اس مقدمے میں اسکی (بدر ابڑو) معاونت/شرکت کو ثابت کر سکے۔''

کہ یہ اس معزز عدالت کے ریکارڈ پر ہے کہ چیف تفتیشی اہلکار نے بیان دیا ہے کہ موجودہ درخواست گذار کے دفتر سے کوئی بھی قابلِ اعتراض چیز برآمد نہیں کی گئی تھی، اس لئے، یہ کسی شک و شبہہ سے بالاتر ثابت ہوتا ہے کہ مبینہ ملزم کو ایک جھوٹے مقدمے میں ملوث کر کے دو سال سے زائد عرصہ جیل میں قید رکھا گیا ہے۔

میری آخری گذارش خصوصی فوجی عدالت کے دائرہ اختیار سے متعلق ہے، اگر ملکی قانون کے مطابق اس عدالت کو ملزمان کے خلاف مقدمہ چلانے کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے تو پھر قانون کی نظر میں تمام تر کارروائی غیر موثر/کالعدم ہو جاتی ہے۔

مارشل لا نافذ کرتے وقت اور بعد ازاں دیگر تقاریر میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے واضح کیا تھا کہ 1973 کا آئین ملک کا بالادست قانون ہے۔ اس حقیقت سے مارشل لا حکومت نے کبھی

انکار نہیں کیا، تاہم چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر آئین کے ساتھ صرف زبانی اور نظریاتی طور پر تو وفادار رہے لیکن عملاً نہیں۔ تاہم اس حقیقت کو مسلح افواج کا کوئی بھی رکن جھٹلا نہیں سکتا کہ وہ 1973 کے آئین کی شق 244 کے تحت حلف یافتہ نہیں ہے، جو کہتی ہے:

''میں .... بردباری سے حلف لیتا ہوں کہ میں پوری سچائی اور ایمانداری سے پاکستان وافادار رہوں گا اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کو مقدم رکھوں گا جو عوام الناس کی خواہشات کا آئینہ دار ہے، کہ میں، خود کو کسی بھی نوعیت کی سیاسی سرگرمیوں میں ملوث نہیں کروں گا اور میں پاکستان کی بری افواج (یا بحری یا فضائی) میں قانون کے مطابق اور تحت ایمانداری اور وفاداری سے پاکستان کی خدمت کروں گا۔''

مسٹر جسٹس مشتاق حسین نے پی ایل ڈی 1969 لاہور 786 میں رپورٹ ہونے والے میر حسن بمخالف ریاست کے مقدمے میں متعین کیا تھا:

''مارشل لا کو جس میں فوجی کمانڈر کی مرضی قانون ہوتی ہے کو ایک سے زائد مرتبہ لاقانونیت کی صورت سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ درست بھی ہے۔ کسی ایک شخص، چاہے وہ فوجی کمانڈر کیوں نہ ہو، کی منشا کو قانون قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مارشل لا کی یہ عمومی طور پر سمجھی جانے والی معنی اُس ملک پر بھی لاگو ہوسکتی ہے جس پر دشمن قوتوں نے قبضہ کیا ہو اور زیر تسلط کر لیا ہو۔ وہاں مارشل لا کمانڈر کی مرضی ومنشا تو قانون ہوسکتی ہے لیکن اس ملک میں مارشل لا کے نفاذ کو دشمن کی قوتوں کی جانب سے زیرِ تسلط سمجھا جائے گا۔ جواب واضح طور پر 'نہیں' میں ہوگا۔

ہائی کورٹ کے مندرجہ بالا فیصلے کی روشنی میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی احکامات قانون کی تشریح میں نہیں آتے۔ علاوہ ازیں، چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے احکامات کی پیروی قطعی اور غیر مشروط نہیں ہے بلکہ اس شرط سے منسلک ہے کہ حکمرانوں کی مرضی ومنشا اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہونے کی خلاف ورزی ہے۔ یہ نکتہ عاصمہ جیلانی کیس (پی ایل ڈی 1972 سپریم کورٹ صفحہ 139) اور بیگم نصرت بھٹو کیس (پی ایل ڈی 1977 سپریم کورٹ 657) میں تفصیل کے ساتھ زیرِ بحث لایا گیا تھا۔

موجودہ مارشل لا کو بیگم نصرت بھٹو کے مقدمے میں نظریہ ضرورت کے تحت تسلیم کیا گیا اور صفحہ 724 پر اسکا سوئر کے گوشت کے ساتھ تقابل کیا گیا۔ اس طور اسلام میں مارشل لا کی کوئی

گنجائش نہیں ہے اور ایسی صورت میں جنرل ضیا کی حکومت کی تابعداری کسی قانونی اختیار کے بغیر ہے کیونکہ وہ مطلق العنان ہونے کے دعویدار ہیں کیونکہ پہلے حکم نامے، جس کی آڑ میں دیگر احکامات جاری کیے گئے، فوجی عدالتیں قائم کی گئیں اور بعد ازاں اعلیٰ عدالتوں کے اختیارات سلب کیے گئے تاکہ کوئی بھی فوجی عدالتوں کی قانونی یا غیر قانونی ہیں کا جائزہ نہیں لے سکے، ہر صورت، یہ انصاف کے اسلامی اصولوں کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ تاہم یہ نکتہ اعلیٰ عدالتیں اُس وقت زیرِ بحث لائیں گی جب مارشل لا کا اختتام ہوگا۔ اگر اُس مارشل لا کو غیر مؤثر قرار دے دیا کوئی اسکو غیر اسلامی قرار دے دیا تو پھر فوجی عدالتوں کے دیئے گئے فیصلوں کی کیا حیثیت ہوگی؟ اس مارشل لا حکومت نے فوجی عدالتوں کے ذریعے کچھ لوگوں کی جان لے لی ہے جیسا کہ بلوچستان میں حمید بلوچ کے معاملے میں ہوا ہے۔ اس شخص کی زندگی واپس نہیں لائی جاسکتی۔ یہ مارشل لا حکومت ہمیشہ تو نہیں رہے گی۔ مارشل لا ضوابط اور احکامات یقیناً اختتام پذیر ہوں گے لیکن خدائی قانون اور احکامات ہمیشہ رہنے ہیں۔ اس لئے فوجی عدالتوں کے فیصلے مارشل لا حکومت کیلئے تو باعثِ مسرت ہو سکتے ہیں لیکن کبھی بھی مسلح افواج کی توقیر کا باعث نہیں ہو سکتے۔

چونکہ مارشل لا بنیادی طور پر اسلام کے خلاف ہے اس لئے مارشل لا عدالتوں کی توثیق، قانونی اور اسلامی نقطۂ نظر کے لحاظ سے مکمل طور پر مشکوک ہے۔ اس لئے اس عدالت کو ان سویلین افراد کے خلاف مقدمہ چلانے کا کوئی اختیار نہیں ہے کیونکہ وہ 1973 کے آئین کے تحت اُٹھائے گئے حلف کے پابند ہیں اور ان عدالتوں کا قیام آئینِ پاکستان کی خلاف ورزی ہے۔

مختصراً اور بصد احترام، میں مندرجہ بالا دلیل کی روشنی میں، گوش گذار کرتا ہوں کہ:

(i) کوئی بھی الزام مناسب طور پر واضح نہیں کیا گیا ہے اور میرے مؤکل کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کیا گیا ہے۔

(ii) تفتیشی اہلکار نے مختلف مقامات پر تلاشیوں میں غیر قانونی طریقے اختیار کر کے ملکی قوانین کی خلاف ورزی کی ہے۔

(iii) تفتیشی اہلکار نے برآمدگیوں کے ضمن میں بھی جان بوجھ کر ملکی قوانین کی خلاف ورزی

کی ہے، اس لئے ان پر انحصار نہیں کیا جاسکتا۔

(iv) ایف آئی آر بنیادی طور پر نقائص کی حامل ہے کیونکہ یہ ایف آئی آر کی تشریح پر پوری نہیں اُترتی۔

(v) غیر قانونی امر کی بنیاد پر کچھ ملزمان کے سیکشن 164 سی آر پی سی کے تحت بیان قابلِ اعتبار نہیں ہیں اور ویسے بھی ان بیانات سے میرے مؤکل کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔

اور اس لئے میرے ضمیر نے میرے مؤکل کو بری کر دیا ہے اور میں اس دعا کے ساتھ عدالت کے ضمیر کو فیصلہ کرنے دیتا ہوں کہ خدا اس عدالت کے اراکین کو اس عدالت میں کئے گئے فیصلے کے علاوہ اسلامی جمہوریہء پاکستان کے آئین کی شق 244 کے تحت اُٹھائے گئے حلف کے مطابق انصاف کرنے کی توفیق دے۔

دستخط

(محمد شفیع محمدی)

ایڈووکیٹ

مدعا علیان کی جانب سے
استغاثہ کے گواہان کی
گواہی کا تجزیہ

مدعاعلیان کی جانب سے
استغاثہ کے گواہان کی گواہی کا تجزیہ

تفتیش

استغاثہ کا گواہ نمبر 1 امام بخش

''کسی مقدمے کی تفتیش کیلئے ایس ایچ او عمومی طور پر ڈیوٹی افسر یا کسی اور کو مقرر کرتا ہے۔ منسلک خط میں ہدایات جاری کی گئی ہیں کہ مقدمہ درج کیا جائے اور تفتیش مکمل کی جائے۔ ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریشن ٹیم نے تفتیش کرائی تھی۔''

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور خان

''رات ساڑھے آٹھ بجے ہم نے برآمد کیا گیا سامان اور ملزمان ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریشن ہیڈ کوارٹرس میں میجر طفیل کے حوالے کیے۔ میں نے نہ مقدمے کی تفتیش کی ہے اور نہ ہی کیس ڈائری تیار کی ہے۔''

سب انسپکٹر ظفر اقبال، میجر سلیم اور میجر طفیل کو بیانات دینے کیلئے عدالت کے روبرو پیش نہیں کیا گیا، اگر چہ انکے نام گواہی کے درج ہونے کے دوران انگنت مرتبہ سامنے آئے ہیں۔ استغاثہ کی جانب سے ان گواہان / چشم دید افراد کو روکنا مشکوک اور داغدار عمل ہے جو اہم ثبوتوں کو دبانے کی ایک کوشش سمجھا جانا چاہئے۔

شکایت کنندہ

استغاثہ کا گواہ نمبر 1 امام بخش

استدعا

استغاثہ کا گواہ نمبر 1 تسلیم کرتا ہے کہ ایف آئی آر اصل نہیں ہے (سیکشن 154 سی آر پی سی)۔

عدالتی حکم پر صفدر بھٹی نے ایف آئی آر کی ایک نقل پیش کی جو کہ نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن کے رجسٹر سے نقل کی گئی ہے جبکہ دوسری نقل جناب بدر ابڑو کے وکیل صفائی نے پیش کی ہے۔

یہ ثابت کرتا ہے کہ ملزمان کو ملوث کرنے کی غرض سے اصل ایف آئی آر دبا دی گئی ہے اور اصل مسودے کو مخفی مقاصد کیلئے نظروں سے اوجھل کر دیا گیا ہے۔

میجر طفیل کا نام شکایت کنندہ کے کالم میں درج نہیں ہے۔ میجر طفیل کے خط کی اصل کاپی فائل میں موجود نہیں ہے۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 3 رمضان لغاری

شکایت میں تبدیلی

استغاثہ کا گواہ نمبر 1 امام بخش

ایف آئی آر میں احذاف کا کام استغاثہ کے گواہ نمبر 1 نے ذاتی طور پر ایس آئی او کی ہدایت پر کیا، جس نے مجھے مشورہ دیا کہ چونکہ ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریشن کی ٹیم تفتیش کر رہی ہے اس لئے جانچ / تفتیش ٹیم کے بجائے ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریشن ٹیم کو شامل کیا جائے۔

یہ درست ہے کہ لفظ آئی ایس آئی ڈائریکٹوریٹ کالم 5 اور آخر میں نظر آتا ہے، جس کو بعد ازاں ہٹا کر ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریشن ٹیم میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

جرم کے ارتکاب کا وقت اور تاریخ

استغاثہ کا گواہ نمبر 1 امام بخش

تسلیم کرنا / ماننا

جرم کے ارتکاب کا وقت اور تعین درج نہیں کیے گئے ہیں۔ میں نے تاخیر کا سبب نہیں دیا ہے کیونکہ مجھے وقوعے کے وقت اور تاریخ کا علم نہیں تھا۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور خان

جرم کے ارتکاب کے وقت اور تاریخ کا ذکر نہیں کرتا۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 3 رمضان لغاری

29 جولائی 1980، وقت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 4 دولت خان

27 ستمبر 1980، وقت کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔

آزاد گواہان

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور

یہ قانونی تقاضہ نہیں ہے کہ پولیس اہلکاروں کے علاوہ دو آزاد معتبر افراد برآمدگی کے مشیر ہونے کیلئے ضروری ہیں۔

اس نے متصل دو گھروں پر دستک دی تاہم کوئی بھی دستک کا جواب دیتا ہوا نظر نہیں آتا۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 4 دولت خان

میں نہیں گیا تھا بلکہ فیاض باہر گیا تھا تاکہ مشیران کو لا سکے تاہم کوئی بھی میسر نہیں تھا۔ اسلم نور باہر گیا لیکن اسکو کوئی نہیں ملا۔

مجھے یاد نہیں ہے کہ مشیران کی تلاش میں کوئی باہر گیا تھا یا نہیں تاہم میں باہر نہیں گیا تھا۔ میں اندر ہی رہا۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 7 غلام محمد

یہ کہنا درست ہے کہ برآمدگی کا مشیر نامہ تیار کرتے ہوئے دو آزاد مشیران موجود ہونے چاہئے تھے۔ میں ذاتی طور پر کسی آزاد مشیر کی تلاش میں نہیں نکلا تاہم میں نے کانسٹیبل ولایت کو ایسا کرنے کی ہدایت کی تھی۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 10، شیخ محمود

میں نے گواہی کے خلاصے میں یہ بھی بتایا تھا کہ مشیران میں سے ایک میرا بھائی تھا، جو اس وقت میری دکان پر موجود تھا۔ میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ دوسرا مشیر دکان پر کام کرنے والا میرا ملازم تھا۔

استغاثہ کا گواہ خلیل باجوہ

میں نے متصل گھر سے مشیر تلاش کیا تھا تاہم اُس وقت مجھے کوئی بھی نہیں مل سکا تھا۔ میں خصوصی فوجی عدالت نمبر 2 حیدرآباد میں جام ساقی کے خلاف گواہان میں سے ایک تھا۔

استغاثہ کا گواہ محمد یعقوب

وقوعے کے اگلے روز پولیس پارٹی سادہ کپڑوں میں ملبوس دو افراد کے ہمراہ آئی تھی اور تفتیش کرنے کے ساتھ میرا بیان درج کیا تھا۔

استغاثہ کا گواہ ممتاز برنی

چونکہ یہ (الیوسف چیمبرز) ایک تجارتی عمارت تھی اس لئے کوئی بھی عام شہری مشیر بننے کو تیار نہیں تھا، چناچہ میں نے مخدوم حیات کو مشیر بنایا۔

جائے وقوعہ

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور

جائے وقوعہ کا ایگزامنیشن انچیف میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ میں گھر کا نمبر نہیں دے سکتا۔ مذکورہ گھر کے سامنے نہ کوئی گلی ہے اور نہ ہی کوئی روڈ، تاہم وہاں ایک کچا رقبہ ہے۔ جس گھر پر چھاپہ مارا گیا وہ شمال مشرق کی جانب کھلتا ہے۔ گھر کا مرکزی دروازہ ندی کی جانب کھلتا ہے، دو اطراف گھر ہیں۔ مذکورہ گھر کی چاردیواری نہیں ہے۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 3 رمضان

چھاپہ مارے گئے گھر کے دونوں اطراف زیرِ تعمیر گھر تھے۔ پیپلز کالونی کے اس گھر کے آگے ایک چاردیواری تھی۔

گھر کا وقوعہ اور نمبر نہیں دیا گیا ہے

جس گھر کی تلاشی لی جانی تھی، مجھے اس کا نمبر نہیں دیا گیا تھا۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 4 دولت خان

گھر کے نمبر کا ذکر نہیں کرتا۔ ڈرائیور کو مجسٹریٹ اور اسلم نور نے نارتھ ناظم آباد جانے کو کہا۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 4 دولت خان

گھر میں صرف ایک کمرہ اور ایک باورچی خانہ تھا۔ کمرے کا کوئی دروازہ نہیں تھا اور ملزمان کو باہر سے دیکھا جا سکتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ صحن میں درخت یا باغیچہ تھا۔ صحن میں کوئی دیوار نہیں تھی۔ صحن میں پانی کی ٹنکی نہیں تھی۔

مجھے پیپلز کالونی کے گھر کا نمبر معلوم نہیں ہے۔

گھر کے سامنے نالہ ہے جبکہ گھر سے متصل دونوں جانب گھر بنے ہوئے ہیں۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 5 زبیر

اس گھر کے سامنے دس فٹ کا خالی رقبہ ہے۔ دروازہ صحن میں کھلتا ہے۔ ایک کمرہ ہے جسکی چھت ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کمرے کا دروازہ ہے یا نہیں۔ صحن میں درخت ہے۔ اس گھر کے براہ راست مقابل کوئی گھر نہیں ہے تاہم گلی کی مخالف سمت میں گھر ہیں۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 6 شفیق احمد

چھاپہ مارے گئے گھر کے دونوں جانب گھر ہیں، سامنے بھی گھر ہیں تاہم اسکے بالمقابل نہیں ہیں۔ گھر میں صرف ایک کمرہ ہے۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 7 غلام محمد

غسلخانہ اور باورچی خانہ ہیں تاہم میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ صحن کی کس جانب ہیں۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ وہاں پر کتنے کمرے ہیں۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 8 ولایت

صحن میں ایک بیت الخلا ہے جبکہ ٹوائلٹ اور باورچی خانہ کمرے میں ہیں۔ صحن میں کوئی درخت نہیں ہے۔

جائے وقوعہ / تضاد

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور خان

دروازہ مقفل نہیں تھا، جب ہم نے اسکو دھکیلا تو یہ کھل گیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔

ہم نے وہاں دولوگوں کو دیکھا۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 3 رمضان لغاری

ہم نے دروازے پر دستک دی، جو اندر سے بند تھا۔ ہم نے مکینوں کو باہر آنے کیلئے زور سے پکارا۔ کوئی بھی باہر نہیں آیا۔ چھاپہ مارنے والی ٹیم کا ایک رکن گھر کے اندر داخل ہونے کیلئے دیوار پھلانگ کر اندر گیا اور دروازہ کھولا۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 4 دولت خان

مجسٹریٹ نے دروازے کو دھکیلا اور ہم اندر داخل ہوئے۔

دروازہ خود مجسٹریٹ نے کھولا تھا۔ ہم نے دیوار نہیں پھلانگی تھی۔

مجسٹریٹ اور اسلم نور پہلے اندر داخل ہوئے، جس کے بعد انہوں نے ہمیں اندر آنے کیلئے آواز دی۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے یادداشت کی کمزوری کی وجہ سے ریٹائرمنٹ کی درخواست کی تھی، میری یادداشت اب بھی اچھی ہے۔

جب میں اور فیاض گھر کے اندر داخل ہوئے تو مجسٹریٹ اور اسلم نور صحن میں تھے۔ یہ کہنا مکمل طور پر غلط ہوگا کہ مجسٹریٹ نے مجھے دیوار پھلانگنے کیلئے کہا تھا۔ یہ کہنا مکمل طور پر غلط ہوگا کہ دروازے پر کنڈی چڑھی ہوئی تھی اور ہم نے دروازے پر دستک دی تھی۔

مبینہ قابلِ جرم مواد کو ملزمان کی ملکیت ہونا ثابت نہیں کیا گیا

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور

سائیکلو اسٹائل شدہ تمام تر کاغذات پر کسی فرد کا نام نہیں ہے۔

پاکستان کوارٹرس سے برآمد کی گئی اشیا اور پیپلز کالونی سے برآمد شدہ اشیا گڈمڈ ہوگئیں۔ میں نے برآمدگی کے مشیرنامے میں دونوں ملزمان کے ناموں کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ میں کمال وارثی اور شبیر شر سے برآمد ہونے والی اشیا میں تفریق نہیں کرسکتا۔ یہ پارٹی ملکیت تھیں۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مجسٹریٹ نے برآمد کی ہیں۔ مجسٹریٹ نے کسی اور برآمد شدہ چیز پر دستخط نہیں کیے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ سرخ پرچم کیلئے مختص کوئی اسٹینسل ملا تھا۔ یہ درست ہے کہ کسی ایسے اسٹینسل کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جس سے سرخ پرچم شائع ہونا ہے۔

یہ کہنا درست ہوگا کہ اس گھر سے برآمد ہونے والا مواد اُنہی اسٹینسل سے شائع کیا گیا تھا۔

میں نے کرنسی نوٹوں پر مجسٹریٹ یا گواہان کے دستخط نہیں لیے۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 3 رمضان لغاری

ہلچل کے اُس شمارے میں، جس کا میں نے پیپلز کالونی کے گھر میں جائزہ لیا، کوئی مخصوص شناختی علامت نہیں تھی۔

میں ہلچل کے علاوہ باقی ماندہ تحویل میں لئے گئے مواد پر کوئی تبصرہ نہیں کرسکتا کیونکہ میں نے اسکا مطالعہ نہیں کیا۔ وہاں پر ہلچل کے کئی شمارے تھے، اب میں کہہ نہیں سکتا کہ میں نے کون سا پرچہ دیکھا تھا/ پڑھا تھا۔

میں نے برآمد کیے گئے کسی خط، کتاب یا کسی اور چیز پر دستخط نہیں کیے تھے۔

میں ملزمان میں سے کسی کی دستی تحریر سے شناسا نہیں ہوں، اس لئے پولیس کی جانب سے برآمد کیے گئے خطوط پر کہہ نہیں سکتا کہ یہ کس کے ہیں۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 4 دولت خان

اسلم نور نے جائے وقوعہ پر برآمدگی نامہ تیار کیا اور مجھ سے اس پر دستخط لئے۔ میں نے ملزمان کی جامہ تلاشی نہیں لی۔ میں نے مضامین کے مندرجات پڑھے نہیں تھے، میں نے صرف مشیر نامے پر دستخط کیے تھے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ کون سی چیز دونوں ملزمان میں سے کس سے برآمد کی گئی۔ میں پاکستان کوارٹرس اور پیپلز کالونی سے برآمد ہونے والی اشیا میں تفریق نہیں کرسکتا۔

استغاثہ کا گواہ حنیف (اے سی ایم حیدرآباد)

میں نے مواد کے مندرجات کا جائزہ نہیں لیا ہے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ بیان جام ساقی کا تحریر کردہ ہے، تاوقتیکہ اس ضمن میں کوئی مثبت عندیہ نہیں ملتا۔

کسی پولیس اہلکار نے گھر کے اندر میری موجودگی میں مواد کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔

میں نے دو مشیران سے دریافت کیا اور انہوں نے مجھے بتایا کہ کمال وارثی مکین تھا۔

میں نے یہ بات مشیر نامہ اے اے اور اے اے 9 اور گواہی کے خلاصے میں نہیں کی ہے۔

استغاثہ کا گواہ محمد یعقوب

مجھے نہیں معلوم کہ چھاپہ مارنے والی ٹیم نے کیا کچھ برآمد کیا تھا۔

استغاثہ کا گواہ ممتاز برنی

میں نے چھ ملزمان میں سے کسی کی بھی دستی تحریر کسی ماہر کو جانچ پڑتال کیلئے نہیں بھیجی۔

کسی جرم کے ارتکاب کے بغیر گرفتاری

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور

مجھے اس کی معلومات نہیں ہے کہ اس برآمدگی ایگزبیٹ میں موجود اشیا، کتابچوں یا کسی مواد پر حکومت کی جانب سے کوئی پابندی عائد کی گئی ہے یا نہیں۔ میں پاکستانی ادب کا شمارہ دیکھ رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس پر پابندی ہے یا نہیں۔

مجھے اس کتاب میں کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں ملی۔ میری جانب سے تحویل میں لیے گئے مواد کا بڑا حصہ قابلِ اعتراض ہے یا کچھ اشیا قابلِ اعتراض نہیں ہیں۔

پاکستانی ادب

یہ کتابچہ ڈکلریشن کے قوانین کے تحت شائع کیا جاتا رہا ہے۔ اسکو یہ سوچ کر شامل کیا گیا کہ یہ تفتیش میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے، تاہم مجھے ان کتابوں میں کوئی قابلِ اعتراض چیز نظر نہیں آئی۔ میں کتابچہ ''سوویت جمہوریت'' دیکھ رہا ہوں۔ یہ......... پبلیکیشن حیدرآباد کی جانب سے شائع کیا گیا ہے۔ میں نے اس کتاب کے حوالے سے کوئی تفتیش نہیں کی اور اس کے علاوہ ناشر کی کوئی اور کتاب تحویل میں نہیں لی۔

میں نے اس وقوعے کے علاوہ اپنی ملازمت کے دوران کبھی بھی تخریبی مواد اپنی تحویل میں نہیں لیا۔

مجھے اس کتاب ''غیر جانبدار تحریک'' کے صفحات 59 تا 62 پر کوئی قابلِ اعتراض یا تخریبی بات نظر نہیں آئی۔

کتاب ''مارکسی فلسفہ'' دارالاشاعت لاہور کی جانب سے شائع کیا گیا ہے۔ میں نے اس کتاب کی اشاعت کے حوالے سے کسی فرد یا ادارے کی نہ تو تفتیش کی ہے اور نہ ہی کچھ تحویل میں لیا ہے۔

میں نے ان کتابوں کی اشاعت سے متعلق کسی اور فرد یا ادارے کو آگاہ نہیں کیا، میں نے خطوط یا ایگزبیٹ میں شامل دوسرے مواد کا جائزہ نہیں لیا اور کہہ نہیں سکتا کہ اس میں کیا لکھا ہوا ہے۔

(پاکستان کوارٹرس اور پیپلز کالونی کا مشیر نامہ)

استغاثہ کا گواہ نمبر 3 رمضان لغاری

میں کسی ایسے قانون سے باخبر نہیں ہوں جو حکومت پر سخت تنقید کو ممنوع قرار دیتا ہو۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 5 زبیر (جمال نقوی کے متعلق)

میجر سلیم نے ہمیں حکم دیا تھا کہ اس گھر پر آنے والے ہر شخص کو گرفتار کیا جائے۔ مجھے اُس قانون کا نہیں بتایا گیا تھا جس کے تحت یہ گرفتاریاں ہونی تھیں۔ ہمیں ہر ایک کی گرفتاری کا حکم تھا چاہے کسی نے جرم کا ارتکاب کیا ہو یا نہیں۔

کسی سے ملنے کیلئے جانا کوئی جرم نہیں ہے۔

یہ میرے ذہن میں نہیں آیا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ پروفیسر جمال نقوی جمعہ کی وجہ سے اس گھر کے مکینوں سے خیر سگالی کے طور پر ملنے آئے ہوں۔

ہم نے جمال نقوی سے کوئی قابلِ اعتراض چیز برآمد نہیں کی۔

صدر میں کتابوں کے اسٹال پر چھاپے کے موقعہ پر میرے پاس کسی اختیاری کا کوئی تحریری حکم نامہ نہیں تھا۔ کہہ نہیں سکتا کہ ان کتابوں کو ممنوع قرار دینے کیلئے حکومت کی جانب سے کوئی حکم جاری کیا گیا تھا۔ میں نے اسٹال سے ''ماسکو اولمپکس'' اور ''سوویت یونین میں مسلمان''

نامی کتابیں برآمد کیں۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 7 غلام محمد (سہیل سانگی سے متعلق)

دو کانسٹیبلز نے مجھے بتایا کہ ہمیں احکامات ہیں کہ اس گھر میں داخل ہونے والے ہر فرد کو حراست میں لیا جائے۔

میں نے ایسی کوئی چیز برآمد نہیں کی جس کی بنیاد پر اسکو گرفتار کیا جا سکے۔

میں نے اس گھر کی تلاشی لینے یا اس پر نظر رکھنے اور اس میں داخل ہونے والے ہر فرد کو حراست میں لینے کیلئے مجسٹریٹ سے زبانی یا تحریری احکامات نہیں لیے۔

ظفر اقبال نے ملزم کی عمومی تلاشی لی تھی۔ اُس نے کوئی مواد برآمد نہیں کیا تھا۔

استغاثہ کا گواہ اے سی ایم محمد حنیف (بابن شاہ کالونی)

برآمدگی کے وقت میں نے اس گھر سے برآمد ہونے والا کوئی مواد نہیں پڑھا تھا، جس کو تخریبی قرار دیا جا سکے۔ جن حالات میں تلاشی کی گئی انہوں نے مجھے شکوک میں مبتلا کیا کہ برآمد کیا جانے والا مواد تخریبی ہو سکتا ہے۔

میں اس کے متعلق یقین سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں نے اسکا جائزہ نہیں لیا تھا۔

میں نے ایس ایچ او کو ایف آئی آر درج کرنے یا مزید کارروائی کا کوئی حکم نہیں دیا کیونکہ میں نے اس مواد کا جائزہ نہیں لیا تھا۔

استغاثہ کا گواہ باجوہ

چونکہ میں نے تمام تر مواد کا جائزہ نہیں لیا ہے اس لئے کہہ نہیں سکتا کہ یہ قابلِ اعتراض تھا۔ میں نے مذکورہ گھر سے برآمد ہونے والا کوئی پمفلٹ، رسالہ یا کوئی دوسرا مواد نہیں پڑھا اس لئے میں نے اپنے گواہی کے خلاصے کے دوران اس عدالت کے سامنے اپنے بیان میں کہیں بھی اسکا تذکرہ نہیں کیا ہے کہ آیا برآمد ہونے والے مضامین / اشیا تخریبی / قابلِ اعتراض تھے یا نہیں۔

پولیس پارٹی میں سے کسی نے بھی برآمد ہونے والا کوئی مضمون نہیں پڑھا، نہ ہی میں نے پڑھا۔

مشیر نامہ

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور

مشیران کی موجودگی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 3 رمضان لغاری

پولیس نے مواد تحویل میں لیا اور مشیران کی موجودگی میں مشیر نامہ تیار کیا جس پر میں نے توثیقی دستخط کیے۔

مشیران ہمارے ساتھ آئے تھے۔

جائے وقوعہ من گھڑت

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور خان

میں نے گھر پر چھاپے اور ملزمان کی گرفتاری کے حوالے سے نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن میں کوئی اندراج نہیں کیا، نہ ہی میں نے بعدازاں نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن کو مطلع کیا، نہ ہی میں نے گارڈن پولیس اسٹیشن میں کوئی اندراج کیا۔

یہ کہنا درست ہوگا کہ پیپلز کالونی میں ایک ہزار سے زائد گھر ہوں گے۔ پاکستان کوارٹرس میں ایک سؤ سے زائد گھر ہوں گے۔

کسی چشم دید گواہ کی عدم موجودگی

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور خان

برآمدگی اور حراست کے وقت موجود واحد چشم دید گواہان مجسٹریٹ، میں، ہیڈ کانسٹیبل فیاض اور کانسٹیبل دولت تھے۔ یہ درست ہے کہ مندرجہ بالا تینوں چشم دید گواہان نے جائے وقوعہ اور جرم کی نوعیت سے متعلق کسی بھی پولیس اسٹیشن پر کوئی ایف آئی آر درج نہیں کرائی۔

اگر شکایت کنندہ کی جانب سے کوئی نام دیا گیا ہے تو چشم دید گواہان کا نام تحریر کرنا لازمی ہے۔

چھاپہ مارے جانے والے گھر سے متصل کچھ گھر ہیں تاہم ہمیں کسی بھی گھر میں کوئی بالغ مرد نہیں ملا۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 3 رمضان لغاری

میں نے کسی عام شہری کو مشیر بننے کیلئے نہیں کہا، کیونکہ یہ میرا کام نہیں تھا۔ پاکستان کوارٹرس میں پولیس کو پڑوس سے کوئی سویلین مشیر نہیں ملا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ انہوں نے اس ضمن میں کوئی کوشش کی تھی یا نہیں۔

چھاپہ کے تفاصیل میں عدم موافقت

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور خان

یہ ایک خانگی ٹویوٹا جیپ تھی، ایک سرکاری نمبر پلیٹ والی تھی۔

مجسٹریٹ نے میجر طفیل کو اطلاع کی / رپورٹ کیا۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 3 رمضان لغاری

میں چھاپہ مارنے والے ٹیم کے دیگر اراکین سے علیحدہ ہوا اور اپنی خانگی سواری بلا کر اپنے گھر چلا گیا۔

جب چھاپوں کے بعد میں اپنے گھر روانہ ہوا تو ملزمان برآمدشدہ اشیا کے ساتھ پولیس کے پاس تھے۔ مجھے پیپلز کالونی یا پاکستان کوارٹرس میں چھاپہ مارے گئے گھروں کے نمبر یاد نہیں ہیں۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 4 دولت خان

میں مجسٹریٹ اور اسلم نور کے ہمراہ ایم پی اے ہاسٹل پہنچا۔

برآمدشدہ املاک / الزام کی تائید گھڑنا

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور

ہم نے ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریشن ہیڈ کوارٹرس میں برآمد شدا اشیا میجر طفیل کے سپرد کیں۔ مجھے اشیا اور ملزمان میجر طفیل کے حوالے کیے جانے کی کوئی رسید نہیں دی گئی۔

مجھے نہیں معلوم کہ میجر طفیل نے یہ اشیا کہاں رکھیں، میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ اشیا کسی کمرے میں، صحن میں، الماری میں یا کسی کھلے میدان میں رکھی گئیں۔

میں نے مقدمے کے دستاویزات کے کھُلے اوراق نہیں پڑھے، تاہم میں نے دیکھا ہے کہ تمام کھُلے اوراق ایک ہی کے نقل ہیں۔

مجسٹریٹ کی جانب سے کسی اور برآمدشدہ چیز پر دستخط نہیں کیے گئے۔

میں کہہ نہیں سکتا کہ سرخ پرچم کا اسٹینسل مل گیا تھا۔ یہ درست ہے کہ کسی ایسے اسٹنسل کا ذکر نہیں ہے جس سے سرخ پرچم شائع ہوسکتا ہو۔

سرخ پرچم کی سرخی کے ساتھ کوئی بیس بائیس کاغذ تھے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ لگتا تھا کہ لفظ سرخ پرچم والی شہ سرخی شائع ہوچکی ہے۔

یہ کہنا درست ہوگا کہ میں نے برآمدگی کے روزنامچے میں کہیں ذکر نہیں کیا ہے کہ گھر سے برآمد ہونے والا مواد اُنہی اسٹینسل پیپرز سے شائع ہوا تھا۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 3 رمضان لغاری

وہاں پر کافی مواد تھا، جس میں سے مجھے اس وقت صرف ہلچل یاد ہے۔

پولیس نے مواد تحویل میں لیا اور مشیران کی موجودگی میں مشیرنامہ تیار کیا، جس پر میں نے تصدیقی دستخط کیے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تحویل میں لیا گیا مواد کہاں رکھا گیا۔

میں کسی بھی اردو یا انگریزی مواد کا جائزہ نہیں لیا۔

پولیس نے گھر سے برآمد ہونے والا مواد میری موجودگی میں سربہ مہر نہیں کیا تھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ پولیس نے برآمد ہونے والے مواد پر کوئی علامتی نشان لگایا تھا۔ میں مذکورہ گھروں سے برآمد ہونے والے مواد میں تفریق نہیں کر پاؤں گا کیونکہ ایک جگہ سے حاصل کیا گیا مواد دوسری جگہ سے حاصل کیے گئے مواد کے ساتھ گڈمڈ ہوگیا ہے۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 4 دولت خان

ہم نے تحویل میں لی گئی اشیا اور ملزمان کو فوجی اہلکاروں کے سپرد کردیے تھے۔

میں نے ان سے برآمد کیے گئے پمفلٹ اور رسالے نہیں پڑھے۔

ہم نے مواد ملزمان کے بستر کی چادروں میں باندھا۔

اسلم نور نے ملزمان اور برآمد شدہ اشیا فوجی اہلکاروں کے سپرد کرنے کا حکم دیا۔ مجھے ان پمفلٹوں کے عنوان/نام معلوم نہیں ہیں جو مجھے پڑھ کر سنائے گئے تھے۔ میں فرق نہیں کر سکتا کہ کون سا مجھے پڑھ کر سنایا گیا تھا۔

میں بستر کی چادروں کے برآمدگی نامے میں ذکر سے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں بستر کے چادروں کی تعداد نہیں بتا سکتا جن میں برآمد شدہ اشیا باندھی گئی تھیں۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ آیا تحویل میں لی گئی اشیا میں سے کچھ گم ہے یا اس میں کوئی چیز شامل کی گئی ہے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ یہاں پر پیش کی گئی اشیا وہی ہیں جو دونوں چھاپوں کے نتیجے میں تحویل میں لی گئی تھیں۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ پاکستان کوارٹرس سے برآمد ہونے والی اشیا کی کتنی گٹھڑیاں بنائی گئی تھیں۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں ہے کہ آیا پاکستان کوارٹرس سے برآمد کی گئی اشیا بستر کی چادروں میں باندھی گئیں یا کسی اور کپڑے یا چیز میں۔

استغاثہ کا گواہ حنیف اے سی ایم (بابن شاہ کالونی)

تلاشی لینے والی پارٹی نے تحویل میں لی جانے والی اشیا پر کوئی واضع علامت نہیں لگائی۔ یہ درست ہے کہ ایگز بیٹ اے اے میں صرف ایک اخبار/کاغذ کا ذکر ہے نہ کہ پانچ کا جیسا کہ ایگز بیٹ اے اے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ایگز بیٹ اے اے 1 میں 120 اشیا کا عندیہ نہیں دیا گیا ہے۔

دونوں ایگز بیٹ پر ٹائپسٹ کے دستخط نہیں ہیں جس نے ایگز بیٹ اے اے 1 انگریزی میں ٹائپ کیا، نہ ہی اُن کانسٹیبلز کے دستخط ہیں جو تلاشی کے موقعہ پر موجود تھے۔

مواد کو سربہ مہر نہیں کیا گیا تھا۔ مواد شاید لوہے کی صندوق اور بستر کی چادر میں باندھا گیا تھا جو کہ اس گھر سے برآمد ہوئی تھیں۔

استغاثہ کا گواہ شمس الدین

برآمد شدہ اشیا کو کمبلوں میں باندھا گیا جو کہ کمروں سے ملے تھے اور یہ پولیس ویگن میں ڈال کر لے گئی تھی۔

برآمدشدہ مواد کے تفصیل اُس گھر میں تحریر/ٹائیپ نہیں کیے گئے تھے۔

مجھے نہیں معلوم کہ پولیس یہ اشیا کہاں لے گئی۔

ایگزبیٹ اے اے 1 میرے پاس دستخط کیلئے اگلے روز لایا گیا تھا۔ برآمدشدہ مواد نہ سربہ مہر کیا گیا اور نہ ہی گٹھڑیوں میں لے جایا گیا۔ میں نے کمال وارثی کو کسی غیرقانونی سرگرمی میں ملوث نہیں پایا۔

استغاثہ کا گواہ خلیل باجوہ

برآمد ہونے والا مواد چھاپہ مارنے والی ٹیم نے سربہ مہر نہیں کیا تھا۔

یہ درست ہے کہ ایگزبیٹ اے اے میں صرف ایک کاغذ/شمارے کا ذکر ہے۔

اے ایس آئی اور چار پانچ کانسٹیبلز پر مشتمل پولیس پارٹی کو اس مقدمے میں بیان دینے کیلئے کبھی بھی طلب نہیں کیا گیا۔ مجھے کوئی معلومات نہیں ہے کہ اے سی ایم حنیف مواد کہاں لیکر گئے تھے اور مجھے مجسٹریٹ نے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ مواد کس ایف آئی آر کے تحت کس ملزم کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔

مجھے ٹائیپ رائٹر کا انتظام کرنے کیلئے کہا گیا جو کہ میں نے کیا اور جائے وقوعہ پر اُسی وقت تمام تر برآمدشدہ اشیا کی فہرست ٹائیپ کرائی۔

میں نے اپنے بیان میں یہ نہیں کہا ہے کہ ٹائیپسٹ کو اے سی ایم حنیف نے بلایا تھا۔

میں برآمدشدہ اشیا باندھنے والے کپڑے کے متعلق واضع نہیں ہوں اور نہ ہی اسکے تفصیل بیان کر پاؤں گا۔ کہہ نہیں سکتا کہ اے سی ایم حنیف برآمدشدہ اشیا کہاں لیکر گئے اور یہ کہاں اور کسی حالت میں رکھی گئیں۔

استغاثہ کا گواہ محمد یعقوب

مجھے نہیں معلوم کہ چھاپہ مارنے والی پارٹی نے کیا کچھ برآمد کیا تھا۔

استغاثہ کا گواہ اشرف ملک

اشیا گٹھڑیوں میں باندھی گئیں اور سربہ مہر کی گئیں، جو کہ پولیس پارٹی نے کیا۔ مجھے یاد

نہیں ہے کہ گٹھڑیاں باندھنے کیلئے یہ کپڑا کہاں سے حاصل کیا گیا تھا۔

گرفتاریاں غیر قانونی اور میجر طفیل کی خواہشات پر کی گئیں

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور

یہ درست ہے کہ میں نے میجر طفیل کو بتایا کہ انکے احکامات پر جوں کا توں عمل ہو گا۔ مجسٹریٹ خاموش رہا۔

احکامات زبانی طور پر دیئے گئے تھے۔ میں نے مجسٹریٹ سے تلاشی کے وارنٹ حاصل نہیں کیے، کیونکہ وہ خود وہاں موجود تھے۔

میں نے ان ملزمان کا کسی بھی مجسٹریٹ سے ریمانڈ نہیں لیا۔ میں نے پاکستان کوارٹرس یا پیپلز کالونی میں ملزمان سے کوئی جانچ پڑتال یا تفتیش نہیں کی۔

میجر طفیل نے مجھی بتایا تھا کہ کچھ لوگ نارتھ ناظم آباد میں تخریبی مواد شائع کر رہے ہیں اور میں وہاں پر مجسٹریٹ کے ہمراہ پولیس اہلکار کے طور پر جاؤں۔

ہم نے ملزمان کو نہیں بتایا تھا کہ وہ زیرِ حراست ہیں۔ ملزمان کرسیوں پر ہی بیٹھے رہے، جس دوران ہم مواد کا مطالعہ کرتے رہے۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 3 رمضان لغاری

میں نے انہیں انکی گرفتاری کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کسی پولیس اہلکار نے میری سماعت میں انہیں بتایا ہو کہ وہ زیرِ حراست ہیں۔

میری حدود ڈاکس اور جیکسن پولیس اسٹیشن پر محیط تھیں۔ دیگر تمام پولیس اسٹیشنز میری حدود سے باہر ہیں۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جنوبی کے احکامات تحریری نہیں بلکہ زبانی تھے۔ آرٹلری میدان اور نارتھ ناظم آباد میری حدود میں نہیں تھے۔

پولیس کو مقدمے کے اندراج، اشیا برآمد کرنے اور گھر کی تلاشی لینے کا بتانا میرا کام اور فرض نہیں تھا۔ میں پولیس پارٹی اور ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریشن ہیڈکوارٹرس کے فراہم کردہ مخبر کے تحت تھا۔ مجھے ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریشن ہیڈکوارٹرس نے تحریری احکامات نہیں دیئے تھے۔

جس افسر نے مجھے احکامات دیئے وہ سب مارشل لا ایڈمنسٹریٹر یا ڈپٹی مارشل لا

ایڈمنسٹریٹر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ مجھے احکامات دینے والا افسر میجر رینک کا تھا۔

میں نے ٹیلی فون پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہیڈ کوارٹرس کے احکامات کی تعمیل سے متعلق آ گاہ کیا۔

میں نے کسی پولیس اسٹیشن پر کوئی شکایت درج نہیں کرائی۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 4 دولت خان

مجھے سب انسپکٹر اسلم نور نے برآمدے میں انتظار کرنے کیلئے کہا اور وہ خود اوپری منزل پر واقع دفتر میں ایک میجر سے ملنے گیا۔ کچھ دیر کے بعد اسلم نور واپس آیا۔ اُن میں سے ایک مجسٹریٹ تھا جبکہ دوسرا شخص سادہ کپڑوں میں تھا، جس کو میں نہیں جانتا۔

میری موجودگی میں کوئی تحریری یا زبانی حکم نہیں دیا گیا۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 7 غلام محمد

میں نے اپنی پولیس اسٹیشن ڈائری میں ملزم سہیل کی گرفتاری اور برآمدگی کا کوئی اندراج نہیں کیا۔ رضا کارانہ طور پر اضافہ کیا کہ اُسکو ایس ایچ او نے زبانی طور پر ایسا کرنے کیلئے کہا تھا۔

استغاثہ کا گواہ محمد حنیف اے سی ایم

برآمدگی نامہ ظاہر کرتا ہے کہ برآمد شدہ اشیا قابلِ اعتراض/تخریبی تھیں۔ میں اس سے متعلق قطعی نہیں ہوں کیونکہ میں نے ان کا جائزہ نہیں لیا۔

استغاثہ کا گواہ خلیل باجوہ

میرا پولیس اسٹیشن اے سی ایم حنیف کی حدود میں نہیں تھا۔

استغاثہ کا گواہ ممتاز برنی

ایف آئی آر ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریشن کی ہدایت پر درج کی گئی تھی۔

ریمانڈ اور تشدد

استغاثہ کا گواہ نمبر 5 زبیر

30 جولائی 1980 کو میں میجر ضیا کی رہائشگاہ پر واقع سرسری سماعت کی فوجی عدالت

گیا اور چار ملزمان کا ریمانڈ حاصل کیا۔

میں نے خصوصی فوجی عدالت نمبر 1، جو کہ فریئر ہال میں واقع ہے، سے ریمانڈ حاصل کیا۔ ریمانڈ کے بعد میں ملزمان کو پیپئر بیرکس پر حوالے کرتا رہا۔

تمام تینوں ریمانڈ سرسری سماعت کی فوجی عدالت واقع ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریشن ہیڈ کوارٹرس سے ایس ایچ او نارتھ ناظم آباد نے حاصل کیے۔ ریمانڈ حاصل کرنے کے بعد ان افراد کو مارشل لا ٹیم کے حوالے کیا گیا۔ میں وکیل صفائی کی جانب سے پیش کی گئی رپورٹ دیکھ رہا ہوں جو کہ ملزمان شبیر شر اور کمال وارثی کے پولیس اسٹیشن نارتھ ناظم آباد کے مقدمہ نمبر 236/80 سے متعلق ہے۔ مذکورہ رپورٹ کہتی ہے کہ مندرجہ بالا مذکورہ اشخاص 29 جولائی 1980 کو اپنی گرفتاری سے ہماری تحویل میں ہیں اور تفتیش کیلئے ہماری تحویل میں رہیں گے، بتاریخ 30 جولائی 1980-اس پر محمد سلیم اسسٹنٹ ڈائریکٹر آئی ایس آئی کے دستخط ہیں۔ میں 31 جولائی 1980 کو سہیل سانگی کی گرفتاری سے متعلق ایک اور رپورٹ دیکھ رہا ہوں، جس میں گرفتاری کی تاریخ 31 جولائی 1980 بتائی گئی ہے اور اس پر بھی اسسٹنٹ ڈائریکٹر آئی ایس آئی کے دستخط ہیں۔ اسی نوعیت کی مشیری رپورٹ پروفیسر جمال نقوی اور نذیر عباسی سے متعلق دیکھ رہا ہوں۔ 30 جولائی 1980 کی اس رپورٹ پر بھی اُسی اسسٹنٹ ڈائریکٹر آئی ایس آئی کے دستخط ہیں۔ یہی میں ایگزبیٹ پی-4، پی-5، اور پی-6 میں شامل دیکھ رہا ہوں۔

30 اور 31 جولائی کے یہ دونوں ریمانڈ میں نے رات کے وقت لیے تھے۔

یہ کہنا درست ہوگا کہ میں نے اپنے گواہی کے خلاصے کے دوران میجر ضیا کے پتے یا ایم پی اے ہاسٹل جانے یا جیپ کے متعلق یا ملزمان کو پیپئر بیرکس سے ملیر لے جانے کا ذکر نہیں کیا ہے۔

میں ریمانڈ کے کیلئے پولیس کانسٹیبلز کے ساتھ گیا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ جانے والے پولیس کانسٹیبلز کے نام یاد نہیں ہیں۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 9 امین جمالی

میرے مطابق اگر کسی کو دو یا تین راتیں سونے کی اجازت نہیں دی جاتی تو یہ تشدد ہوگا۔ مجھے ملزم سے بیان لیتے ہوئے معلوم ہوا کہ اس کو آرمی سروس کور کوارٹرس کینٹ اسٹیشن میں حراست میں

رکھا گیا ہے۔

استغاثہ کا گواہ ممتاز برنی

یہ درست ہے کہ ایگزبیٹ ایف ایف میں لکھا ہوا ہے کہ ملزمان کو مارشل لا اختیاری کی تحویل میں رکھا گیا تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ ملزم نذیر عباسی کی مارشل لا اختیاری کی حراست کے دوران موت واقع ہوئی۔

استغاثہ کا گواہ شفیع محمد سومرو

میں نے 23 دسمبر 1980 سے قبل ملزم امرلال کا کوئی ریمانڈ نہیں لیا۔ میں نے ریمانڈ حاصل کرنے کے دو دن بعد ڈی آئی جی پولیس حیدرآباد کی زبانی ٹیلی فون ہدایت پر ملزم امرلال کو نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن کے حوالے کر دیا۔

ملوث اہلکاروں کو نوازش

مارشل لا اختیاری کی پشت پناہی پر متعصب گواہی/ثبوت

استغاثہ کا گواہ نمبر 1 امام بخش

میری ترقی اس ایف آئی آر کے بعد ہوئی

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور

وہ جگہ جہاں سے ملزم نمبر 1 اور 2 کو حراست میں لیا گیا، آرٹلری میدان پولیس اسٹیشن کی حدود میں نہیں آتی، جہاں میں تعینات تھا، اسی طرح پاکستان کوارٹرس بھی آرٹلری میدان پولیس اسٹیشن کی حدود میں نہیں ہے۔

مجسٹریٹ نے اپنی رپورٹ میجر طفیل کو پیش کی۔

مجھے کمیونسٹوں سے نفرت ہے۔

یہ درست ہے کہ اسلام میں ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اللہ کی وحدانیت کی تشہیر کرے، اللہ پر ایمان نہ رکھنے والوں کے خلاف جہاد کرے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

استغاثہ کا گواہ شفیع سومرو

جس جگہ امرلال گرفتار ہوا وہ جامشورو کے بجائے حیدرآباد کی حدود میں آتی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ امرلال کے خلاف جامشورو میں کوئی ایف آئی آر نہیں ہے۔

جہاں تک عدالتی ریکارڈ کا تعلق ہے تو ہمیں ایس ایچ او جامشورو کا 4 اپریل 1982 کا دستخط کیا ہوا لیٹر نمبر جے اینڈ ایچ 1041/1042 موصول ہوا ہے کہ ملزم امرلال کو اس پولیس اسٹیشن نے گرفتار نہیں کیا۔

گواہان

استغاثہ کا گواہ نمبر 7 دولت خان

عدالت تصدیق کرتی ہے کہ یہ شخص سچ نہیں بول رہا ہے۔

استغاثہ کا گواہ ممتاز برنی

مقدمے کی فائل میں سب انسپیکٹر امام بخش، اے سی ایم حنیف، اے سی ایم محمد رمضان لغاری، انسپیکٹر شفیع سومرو، اشفاق زمان، محمد اشفاق، پروفیسر اکرام رحیم وغیرہ کے بیانات نہیں ہیں۔

میں کہہ نہیں سکتا کہ کس نے سیکشن 161 کے تحت ایس ایچ او شمس الدین، خلیل باجوہ اور ہاشم کے بیانات درج کیے تھے کیونکہ میں دستخط شناخت کرنے سے قاصر ہوں۔ گواہ الیوسف چیمبرز پر چھاپے سے متعلق عدالت کی جانب سے طلب کیے گئے متعلقہ اندراج نہیں لا سکا۔

استغاثہ کا گواہ خود کو تفتیشی اہلکار مقرر کرنے سے متعلق ایس پی لیاقت آباد کی جانب سے دیا گیا اصل خط پیش نہیں کر سکا۔ گواہ وہ اصل خط بھی نہیں لایا جس کے تحت امرلال کو اعترافی بیان کیلئے اے سی ایم سرور خان کے روبرو پیش کیا گیا تھا۔

استغاثہ کا گواہ شفیع سومرو

گواہ اسٹیشن ڈائری پیش کرنے میں ناکام رہا جیسا کہ اس نے پچھلی مرتبہ کہا تھا تاہم اُس نے مقدمے کی ڈائری پیش کی۔ گواہ کا یہ بھی کہنا تھا کہ اُس نے جامشورو کی پولیس اسٹیشن ڈائری تلاش

کی تاہم وہ نہیں مل سکی۔

گواہ مشیر نامہ پیش نہیں کرسکا، جو کہ عدالت نے طلب کیا تھا۔

چاروں صوبوں میں منافرت پھیلانا

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ سرخ پرچم میں ایسا کوئی مواد ہے جو پاکستان کے چاروں صوبوں کے لوگوں کے درمیان منافرت یا ٹکراؤ پیدا کرتا ہو۔

اسلام/ مذہبی ضابطہ

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور

یہ مکمل طور پر درست ہے کہ اسلام کا مطلب اللہ اور اسکے رسول کے احکامات کی پیروی کرنا ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس مواد میں ایسی کوئی چیز ہے جو ہمیں اللہ یا اسکے رسول کی پیروی کرنے سے منع کرتی ہو۔

یہ درست ہے کہ مضمون میں لکھا ہوا ہے کہ پاکستان میں زکواۃ کا متعارف کرایا گیا نظام اسلام کے بنیادی نظام سے مطابقت نہیں رکھتا۔

مواد میں یہ نہیں ہے کہ ہم اللہ یا اسکے رسول کی پیروی نہ کریں تاہم رضا کارانہ طور پر کہتا ہے کہ مواد میں اللہ کے خلاف جملے لکھے ہوئے ہیں۔

میں نے لوگوں سے سُنا ہے کہ کمیونسٹ اللہ کو نہیں مانتے تاہم میں نے خود ایسا کچھ نہیں پڑھا ہے۔

مارشل لا کا مقصد

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور

مجھے نہیں معلوم کہ پاکستان کے دوست کون ہیں۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ تمام تر مسلمانوں کی ہمدردیاں فلسطینی عوام کے ساتھ ہیں۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ بحرہ ہند میں امریکی بحری بیڑے کی موجودگی پاکستان اور خطے میں امن کے خلاف ہے۔

تخریب

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور

تخریب سے میری مراد ایسی پرتشدد سرگرمیاں ہیں جو پرتشدد طریقوں سے حکومت کا تختہ اُلٹنے کا مقصد پیشِ نظر رکھتی ہوں۔

یہ درست ہے کہ ایگزیبیٹ ایم 5 میں ذکر کیا گیا خط کے بی ایس 41 حیدرآباد کے ڈاکٹر اعزاز نذیر کے نام اسپین سے ہے اور اس میں حکومت کے خلاف کوئی تخریبی بات نہیں ہے۔

چونکہ میں سندھی نہیں سمجھتا، اس لئے کہہ نہیں سکتا کہ کون سا خط/مواد تخریبی مواد کے زمرے میں آئے گا۔

کے بی ایس 65 میں ملک کے خلاف یا اس کے متعلق کوئی بات شامل نہیں ہے۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 3 رمضان لغاری

بہت سا مواد تھا جس میں سے مجھے صرف ہلچل نامی کتابچہ دیا گیا۔ اس کتابچے میں حکومت کے خلاف تخریبی مواد شامل تھا۔

حکومت مخالف

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور

میں نہیں سمجھتا کہ حکومت پر درست تنقید کوئی جرم ہے۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ کچھ مواد حکومت مخالف نہیں ہے، جیسا کہ ذاتی خطوط۔ شبیر شر کے نام خطوط تخریبی نہیں ہیں۔

میری جانب سے تحویل میں لیے گئے مواد کا بڑا حصہ قابلِ اعتراض ہے جبکہ کچھ حصہ قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ میں جنوری 1979 کا سرخ پرچم کا صفحہ اول دیکھ رہا ہوں، جس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔

صفحہ نمبر 4 پر اداریہ بھی دیکھ رہا ہوں، اس میں بھی کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔

دوہرا معیار

ایران سے متعلق ذرائع ابلاغ میں لکھنا ہوسکتا ہے کہ درست ہوتا ہم اس انداز میں تعریف کرنا شاید درست نہ ہو۔

میں اعادہ کرتا ہوں کہ مواد کا زیادہ تر حصہ قابلِ اعتراض ہے جبکہ کچھ نہیں ہے اس میں سرخ پرچم کے دونوں شمارے بھی شامل ہیں۔

میں اس کتاب کے صفحہ نمبر 59 تا 62 پر کوئی چیز قابلِ اعتراض یا تخریبی نہیں دیکھتا۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 4 دولت خان

میں نے اُن سے برآمد کیے گئے پمفلٹ اور رسالے نہیں پڑھے۔ مجسٹریٹ اور اسسٹنٹ سب انسپیکٹر اسلم نور نے پمفلٹ پڑھے اور مجھے بتایا کہ مذکورہ مواد حکومت مخالف ہے۔

استغاثہ کا گواہ محمد حنیف اے سی ایم

برآمدگی کے وقت، میں نے گھر سے برآمد ہونے والا ایسا کوئی مواد نہیں پڑھا جس کو تخریبی کہا جاسکے۔ اگرچہ برآمدگی نامہ ظاہر کرتا ہے کہ مواد قابلِ اعتراض/تخریبی تھا۔ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں نے اس کا مطالعہ نہیں کیا۔

استغاثہ کا گواہ خلیل باجوہ

میں نے مذکورہ گھر سے برآمد ہونے والا کوئی پمفلٹ یا کوئی اور مواد نہیں پڑھا اس لئے گواہی کے خلاصے اور اس عدالت کے سامنے اپنے بیان میں یہ نہیں کہا کہ برآمد ہونے والا مواد تخریبی/قابلِ اعتراض تھا یا نہیں۔ میں یہ بھی گذارش کرتا ہوں کہ مجھے اسکی کوئی معلومات نہیں ہے کہ آیا برآمد ہونے والا کوئی مضمون/رسالہ حکومت کی جانب سے ممنوع قرار دیا گیا تھا یا نہیں۔ چونکہ میں نے ایگزبیٹ اے اے میں شامل تمام تر مواد کا مطالعہ نہیں کیا اس لئے کہہ نہیں سکتا کہ یہ قابلِ اعتراض مواد ہے۔ ایگزبیٹ اے اے 1، نمبر شمار 2 میں ذکر کی گئی کتب 54، 61، 72، 74، 82 اور 92 یا تو ادبی کتب ہیں یا تعلیمی نصاب کی، جن پر میں کوئی رائے دینے سے قاصر ہوں کیونکہ میں نے انکا جائزہ نہیں لیا ہے۔

استغاثہ کا گواہ ممتاز برنی

ایگز بیٹ اے اے کے نمبر شمار 10، 12، 8، 7، 11، 99 تخریبی ہیں۔

تفصیلات

پیش کرر ہاہوں:

۱-حکمران ٹولہ پاکستان کو سامراجی مفادات پر قربان کرنے کو تیار

۲- پاکستان کے عوام افغان انقلاب کے تحفظ کیلئے متحد ہیں

۳-انقلاب کی اکیسویں سالگرہ پر پارٹی کا تہنیتی پیغام

۴-اکتوبر انقلاب کی 62 ویں سالگرہ پر کامریڈ برژنیف کے نام کامریڈ سیکریٹری کا تہنیتی پیغام

۵-کون معشوق ہے پردہ زرنگاری میں

۶- پاکستان کے قاتل وحشی حکمران فوجی جنرل

۷-سوویت افواج کی افغانستان میں آمد

۸-عوام اقتدار سنبھالنے کیلئے تیار ہو جائیں

اہم: ملزم جام ساقی کی جانب سے اعتراض، گواہ نہ مشیر ہے اور نہ ہی چھاپہ مارنے والی ٹیم کا رکن، وہ مندرجہ بالا مواد پیش نہیں کرسکتا۔ اعتراض بحال اور نقول جو ایگز بیٹ بنائی گئیں، عدالت نے گواہ کو واپس کردیں۔

نظریہءپاکستان

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور

نظریہءپاکستان یہ ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر معرض وجود میں آیا اور یہ اسلام کے نام پر برقرار رہے گا۔

میں کہہ نہیں سکتا کہ قائداعظم نے اعلان کیا تھا کہ پاکستان کا ہر شہری اپنے مذہب، رنگ، ذات نسل، جنس، قومیت کی تفریق کے بغیر پاکستان کا مساوی شہری ہوگا اور مساوی سیاسی اور معاشی حقوق کا حامل ہوگا۔

اور میں کہتا ہوں کہ مندرجہ بالا فقرہ پاکستان کے مقصد اور تصور کو واضح کرتا ہے اور یہی نظریہء پاکستان ہے۔

لیاقت علی

اور میں یہ کہتا ہوں کہ اسکے مطابق یہی نظریہء پاکستان ہے۔

استغاثہ کا گواہ ممتاز برنی

نظریہء پاکستان کی تشریح پروفیسر عبدالقیوم ناطف کی تحریر کردہ اور طاہر سنز کراچی کی شائع کردہ کتاب میں دی گئی ہے۔ سرخ پرچم اور ہلچل کے نومبر 76، اکتوبر 77، جنوری، فروری، اپریل، مئی، جون، جولائی 78، دسمبر 79، جنوری اور فروری 80 کے شماروں میں بالخصوص نظریہء پاکستان کے خلاف نظریات کی پروپگنڈا کی گئی ہے۔

یہ درست ہے کہ مطالعہ پاکستان کی کتاب پہلی مرتبہ مارچ 1982 میں شائع ہوئی ہے۔ میں 1973 کے آئینِ پاکستان کو مستند کتاب سمجھتا ہوں، جو کہ نظریہء پاکستان کی درست تشریح ہے۔ میں نظریہء پاکستان کو قائداعظم کے اقوال کی روشنی میں دیکھتا ہوں، بانیء پاکستان ہونے کے ناطے وہ ہی درست اور مستند ہیں جبکہ دیگر تمام تشریحات جو انکے نقطہءنظر سے متصادم ہیں کو ثانوی حیثیت دی جانی چاہیئے۔

یہ کہنا درست ہوگا کہ نومبر 76، اکتوبر 77، جنوری، فروری، اپریل، مئی، جون 1978 اور دسمبر 1979 کے سرخ پرچم اور ہلچل کے شمارے برآمدگی نامے میں شامل نہیں ہیں۔ رضاکارانہ طور پر کہنا ہے کہ یہ عدالتی سوالات کے دوران نظر چوک کی وجہ سے شامل کیے گئے۔

یہ درست ہے کہ 1976 میں مارشل لاضوابط نافذ العمل نہیں تھے۔

افغان مسئلہ

استغاثہ کا گواہ ممتاز برنی

پاکستان کے عوام کی نظر میں افغانستان ایک مثال بن چکا ہے، جہاں وہ ساری تبدیلیاں ہو رہی ہیں پاکستان کے عوام جس کی آرزو رکھتے ہیں۔

کمیونزم/روسی نظریہ

استغاثہ کا گاوہ نمبر 2 اسلم نور

تاثر یہ ہے کہ کمیونزم ایک اچھا نظام ہے۔ کمیونزم سے متعلق پڑھنا کوئی جرم نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ مارکسی فلسفہ کیا ہے۔

استغاثہ کا گواہ ممتاز برنی

اولمپکس 80

یہ کتابیں روسی نظامِ حیات کے نظرئے سے پُر ہیں۔

عدالت میں پیش کی گئی ایگزبیٹ ایم-4، ایم-5اے، ایم-5اےاے میں پاکستان میں کمیونزم کی پروپگنڈا کیلیئے مواد شامل ہے، جوکہ نظریہءپاکستان کے خلاف ہے۔

کمیونسٹ سے میری مراد ہے ذرائع پیداوار کا ایک طریقہ جو زندگی کے سماجی، سیاسی، روحانی عمل کے عمومی کردار کا تعین کرتا ہے۔ کمیونزم میں مذہب اور خدا کا کوئی تصور نہیں ہے۔

یہ تشریح جو میں نے دی ہے میری ذاتی معلومات پر مبنی ہے اور کسی مستند کتاب سے حاصل نہیں کی گئی ہے۔

میں کمیونسٹ مواد کا ماہر نہیں ہوں تاہم مجھے تھوڑی بہت معلومات ہے۔ میرے نقطہءنظر کو مستند نہیں سمجھا جاسکتا اور میں کمیونزم یا ادب وفلسفہ جیسے دیگر سماجی علوم کا مستند ماہر نہیں ہوں۔

شبیر اور وارثی کی شناخت

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور خان

شبیر ٹائیپ کررہا تھا، وارثی لکھ رہا تھا۔ شاید احمد کمال وارثی قلم سے لکھ رہا تھا۔ مشیر نے اُس کاغذ پر دستخط نہیں کیے جو شبیر ٹائیپ کررہا تھا۔ میں نے یہ پڑھا نہیں ہے، اب میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ مجسٹریٹ نے برآمد کیا ہے۔ مجسٹریٹ نے برآمد ہونے والی کسی اور چیز پر دستخط نہیں کیے۔

وہی شخص کہتا ہے

جب میں گھر کے اندر داخل ہوا تو دو افراد وارثی اور شبیر کرسیوں پر بیٹھے تھے اور انکے آگے میز

پڑی ہوئی تھی۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 3 رمضان لغاری

میں ملزمان کی شناخت نہیں کرسکتا کیونکہ وقوعے کو ڈیڑھ برس سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔

میں نے ٹائپ رائیٹر پر کاغذ نہیں دیکھا تھا۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 4 دولت خان

میں نے ایک کمرے میں دو افراد کو دیکھا، اُن میں سے ایک ٹائپ کر رہا تھا جبکہ دوسرا کچھ لکھ رہا تھا۔

دونوں ملزمان زمین پر بیٹھے تھے۔

کمرے میں کرسی یا میز نہیں تھے اور ملزمان زمین پر بیٹھے تھے، کوئی صوفہ یا بستر بھی نہیں تھا۔

دونوں ملزمان ایک دوسرے کے قریب بیٹھے تھے تاہم مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا کر رہے تھے۔

استغاثہ کا گواہ محمد امین جمالی

میں عدالت میں موجود دونوں ملزمان کو شناخت کرنے سے قاصر ہوں کیونکہ وقوعے کو ڈیڑھ برس سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے۔

استغاثہ کا گواہ خلیل باجوہ

کیا آپ اُس شخص کا حلیہ بتا سکتے ہیں جس نے تصدیق کی تھی کہ احمد کمال مذکورہ گھر کا مکین تھا؟

جواب: نہیں

استغاثہ کا گواہ ممتاز برنی

میں اس گھر کے اصل مالک یا مکین کی تصدیق نہیں کرسکتا کیونکہ مذکورہ گھر کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے دفتر کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے جیسا کہ پارٹی رکن شبیر اور کمال وارثی اپنے اعترافی بیانات میں خود انکشاف کر چکے ہیں۔

میں کہہ نہیں سکتا کہ اِمیئنمل پر یہ مضمون کس نے لکھا ہے۔

اردو میں سرخ پرچم کمال وارثی کا لکھا ہوا ہے جبکہ سندھی میں ہلچل شبیر شر کا لکھا ہوا ہے اور یہ کمال وارثی کے اعتراف سے ظاہر ہوتا ہے۔

نذیر عباسی

استغاثہ کا گواہ نمبر 5 زبیر احمد

مارشل لا ٹیم کے میجر سلیم جو ہمارے ساتھ گاڑی میں تھے، نے مجھے کہا کہ انکا ایک نمائندہ اسسٹنٹ سب انسپیکٹر ظفر اقبال تمہارے یہاں ہونے کے دوران تمہارے ساتھ رہے گا، اُس نے مجھے مزید بتایا کہ اس گھر میں داخل ہونے والے ہر ایک کو حراست میں لیا جائے۔

30 جولائی 1980 کو صبح ساڑھے نو بجے ایک شخص اندر آیا جس کا نام بعد ازاں نذیر عباسی معلوم ہوا، جسکو ہم نے گرفتار کیا اور جس کی جامہ تلاشی سے ایک ہزار روپے نقد، کچھ کاغذات اور کچھ لوگوں کی تصاویر برآمد ہوئیں۔

میجر سلیم نے ہمیں اس گھر پر آنے والے ہر ایک کو گرفتار کرنے کا حکم دیا تھا۔ مجھے اُس قانون کا نہیں بتایا گیا تھا جس کے تحت یہ گرفتاریاں کی جاتی تھیں۔ ہمیں ہر ایک کو گرفتار کرنے کا حکم دیا گیا تھا، چاہے اس نے کوئی جرم کیا تھا یا نہیں۔

جہاں تک میری معلومات ہے تو نذیر عباسی انتقال کر گیا ہے۔

میں خود نذیر عباسی کی لاش دیکھنے 10 اگست 1980 کو سول ہسپتال گیا تھا۔ میں نذیر عباسی کی لاش دیکھنے سول ہسپتال کے مردہ خانے گیا تھا۔

جس وقت میں نے نذیر عباسی کی لاش دیکھی اسکو کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ اسکے جسم پر کوئی نشان تھا یا نہیں۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 6 شفیع احمد

30 جولائی 1980 کو صبح ساڑھے نو بجے کے قریب ایک شخص گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور پولیس اہلکاروں کو دیکھ کر بھاگنے لگا۔ سب انسپیکٹر ظفر اقبال اسکے تعاقب میں دوڑا اور گھر سے کچھ فاصلے پر اسکو پکڑ لیا اور اسکو سب انسپیکٹر زبیر کے حوالے کیا۔

اس کا نام بعد ازاں نذیر عباسی معلوم ہوا۔

جام ساقی

استغاثہ کا گواہ ممتاز برنی

یہ درست ہے کہ اس مقدمے کے وقوعے سے ایک برس قبل سے جام ساقی جیل میں مقید تھا۔

یہ درست ہے کہ ملزم جام ساقی نے جیل میں ہوتے ہوئے یہ مواد شائع نہیں کیا ہے۔

میں نے جیل انتظامیہ کا ریکارڈ نہیں جانچا تھا جس سے معلوم کر سکتا کہ ملزمان میں سے ایک نے جام ساقی سے ملاقات کی درخواست کی تھی۔

تحریری مواد جو جام ساقی کے شامل ہونے کا عندیہ دے سکتا ہے وہ ان کے خطوط ہیں جو کہ اگیز بیٹ ایم-5، ایل ایم 5 ایم میں شامل ہیں۔

میں نے کسی سے ماہرانہ رائے نہیں لی، کیونکہ اپنے حیدر آباد جیل کے دورے کے دوران میں نے جام ساقی سے دستی تحریر کا نمونہ مانگا تھا جس سے انہوں نے انکار کر دیا تھا۔

سائیکلو اسٹائل مشین کی خریداری کیلئے پروفیسر کے پاس دس ہزار روپے جمع کرائے۔

بابن شاہ کالونی، پیپلز کالونی اور پاکستان کوارٹرس سے برآمدگیوں اور شبیر شر اور کمال وارثی کے اعترافات کے علاوہ جام ساقی کو اس سے ملوث کرنے کا کوئی اور ثبوت میسر نہیں ہے۔

یہ کہنا درست ہے کہ کسی بھی استغاثہ کے گواہ نے سیکشن 161 کے تحت یہ نہیں بتایا ہے کہ جام ساقی کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان اور اسکے دیگر اراکین کی مالی معاونت کرتے رہے ہیں۔

یہ درست ہے کہ جام ساقی کے والد پرائمری اسکول میں اُستاد ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ جام ساقی کسی ملکیت یا زمین کے مالک ہیں۔ میں نے کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی مالی معاونت کرنے کے ضمن میں جام ساقی کے ذرائع آمدنی سے متعلق کوئی ثبوت تلاش نہیں کیا اور نہ ہی اسکے متعلق کچھ جانتا ہوں۔

استغاثہ کا گواہ اسلم نور

مجھے جام ساقی کے تعلق ہونے کا پتہ ایک شمارے میں انکی تصویر اور مختلف جگہوں پر انکے نام آنے سے معلوم ہوا۔

دیگر ملزمان

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور

مجھے کسی نے بھی سرخ پرچم کے ناشر سے متعلق نہیں بتایا۔

ان دو لوگوں (وارثی اور شبیر) اور جام ساقی کے علاوہ مجھے کسی اور کا سرخ پرچم سے تعلق معلوم نہیں ہوا ہے۔

جمال نقوی

استغاثہ کا گواہ نمبر 3 رمضان لغاری

ایگزبیٹ ایم 1 کے نمبر شمار 186 پر ایک ٹیلی فون ڈائریکٹری ہے جس پر صرف جمال نقوی کا نام تحریر ہے۔

مجھے یاد نہیں ہے کہ آیا ہلچل پر کوئی نام بھی درج تھا۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 5 زبیر

ہم نے جمال نقوی سے کوئی قابلِ اعتراض چیز برآمد نہیں کی۔

سہیل سانگی

استغاثہ کا گواہ نمبر 7 غلام محمد

گواہ نے ملزم سہیل سانگی کے فاصلے پر ہونے پر فوری طور پر ملزم امر لال کی جانب اشارہ کیا۔ بعد ازاں جب ملزم کو لایا گیا تو اس نے درست نشاندہی کی۔

میں نے اس سے ایسی کوئی چیز برآمد نہیں کی جس کی بنیاد پر اسکو گرفتار کیا جا سکتا ہو۔ ظفر اقبال نے ملزم کی عمومی تلاشی لی تھی اور اس نے کوئی چیز برآمد نہیں کی تھی۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 8 ولایت خان

سہیل داخل ہو رہا تھا تو میں نے اسکو روکا۔ سہیل سانگی کو جائے وقوعہ سے فوجی اہلکار لے گئے جو وہاں آئے تھے۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 11 مخدوم حیات

بدر جمال کو ڈی ایس پی ممتاز برنی نے گرفتار کیا تھا۔ ڈائری میں چار کارڈ تھے جن میں ایک شخص کو کوڑے مارے جا رہے ہیں اور بڑے الفاظ سے پاکستان لکھا ہوا تھا، یہ کارڈ پاکستان یونین آف اسٹوڈنٹس نے شائع کیے تھے اور 4 جون 1979 اور 3 جون 1978 کی روز نامہ ہلال پاکسان کے شمارے جن میں بدر جمال ابڑو کے مضامین اور تصویر شائع ہوئے، شامل تھے۔

بدر جمال کی جامہ تلاشی لی گئی تاہم کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی۔

جہاں تک مجھے یاد ہے کہ ملزم کے دفتر میں دو لوگ موجود تھے جن سے دو لیکچر برآمد ہوئے جو ہم نے نہیں لیے۔

مجھے یاد نہیں ہے کہ بدر کے دفتر سے برآمد ہونے والی اشیا سر بہ مہر کی گئی تھیں یا نہیں۔

جب میں نے یہ اشیا عدالت میں پیش کیں تو وہ سر بہ مہر نہیں تھیں۔ میں نے یہ اشیا سب انسپیکٹر زبیر سے وصول کیں۔

یہ درست ہے کہ روز نامہ ہلال پاکستان حکومت کی اجازت سے شائع ہوتا ہے۔ بدر ابڑو کے تحریر کردہ ان دونوں مضامین پر حکومت نے کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔

استغاثہ کا گواہ خلیل باجوہ

جہان تک ان ایگزبیٹ کا تعلق ہے تو میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن چونکہ وہ (کمال وارثی) مذکورہ گھر کا مکین تھا چناچہ ایگزبیٹ اے اے اور اے اے 1 میں دکھائی گئی اشیا کا تعلق بھی انہی سے ہے۔

استغاثہ کا گواہ ممتاز برنی

شبیر شر نے اپنے بیان میں اعتراف کیا ہے کہ بدر جمال ابڑو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے مالی معاونت کار تھے۔

انکے دو کمروں میں بدر جمال کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔

میں نے گواہی کے خلاصے میں یہ نہیں کہا کہ بدر جمال ابڑو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی مالی معاونت کرتے رہے ہیں جبکہ اپنے ایگرزمینیشن انچیف میں یہ بتایا ہے۔اس بات کا کوئی اعتراف میسر نہیں ہے کہ بدر جمال کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی مالی معاونت کرتے رہے ہیں۔میں نے بدر جمال ابڑو کو اعترافی بیان کیلئے عدالت میں پیش کیا تاہم اُس نے اعترافی بیان دینے سے انکار کردیا تھا۔

جب میں نے بدر ابڑو کے دفتر پر چھاپہ مارا تو میں نے انکے عملے، چپڑاسی،کلرک،مہمانوں اورموکلان میں سے کسی کا بھی بیان نہیں لیا تھا۔

ملزم بدر جمال ابڑو کے کیلئے سیکشن 161 سی آر پی سی کے تحت ریکارڈ ہونے والے کسی بیان اورگواہی کے خلاصے سے یہ عندیہ نہیں ملتا کہ وہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا رکن ہے اوراسکے لئے کام کررہا ہے۔

ملزم بدر ایک شاعر ہے تاہم مجھے نہیں معلوم کہ وہ سنگ تراش بھی ہے۔ملزم بدر افرادی قوت بھرتی کرنے والا ہے۔

میرے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے جس سے ثابت کیا جاسکے کہ بدر جمال ابڑو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی مالی معاونت کرتے رہے ہیں۔

میں نے برآمدشدہ اشیایعنی چیک بکس،اکاؤنٹس بکس،اخبارروزنامہ ہلال پاکستان میں کوئی قابلِ اعتراض چیزنہیں پائی ہے۔

یہ درست ہے کہ ملزم شبیر کئی اداروں میں کام کرتا رہا ہے اور بدر جمال ابڑو کا بھی ملازم رہا ہے۔

یہ کہنادرست ہے کہ ماسوائے فائلوں کی ایک کاپی،فوٹو اسٹیٹ کاپی،سرخ پرچم یاکسی اورمواد کے کسی مضمون کا کوئی مسودہ جو پاکستان کوارٹرس سے برآمد ہوا،ملزم بدروابڑو سے برآمد ہواہو۔

میں نے اسکوکمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی مالی معاونت کرنے کے الزام میں گرفتارکیا۔

میں نے بدرابڑوکو عارفہ انٹر پرائیزز کی کچھ فائلیں پاکستان کوارٹرس سے ہلچل اورسرخ پرچم جیسے

تخریبی مواد کے ساتھ برآمد ہونے پر گرفتار کیا۔ان کارڈوں کے پیچھے مقصد یہ ہے کہ پاکستان میں انصاف نہیں ہے اور کارڈ پر سرخ دائرہ اشارہ کرتا ہے کہ کوڑے لگائے جانے والا شخص کمیونسٹ بلاک سے مدد کی درخواست کر رہا ہے۔

مجھے ان فائلوں سے کوئی تخریبی چیز نہیں ملی۔عارفہ انٹرنیشنل میں شبیر شر کی ملازمت کو جرم قرار نہیں دیا جاسکتا۔

میں ایگزبیٹ ایم این میں 20 اکتوبر 1979 کا روزنامہ جنگ دیکھ رہا ہوں۔اس اخبار پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ایگزبیٹ ایل ایل سے ایل ایل 6 میں مجرموں کو کوڑے مارتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ایگزبیٹ یہ واضح کرتا ہے کہ ملک میں مناسب تشہیر نہیں کی گئی ہے۔ایسی تصاویر بظاہر بتاتی ہیں کہ مجرموں کو انکے کیے کی سزا مل رہی ہے اور ملک میں انصاف کیا جارہا ہے۔

یہ درست ہے کہ اخبارات میں کوڑے مارے جانے کی تصاویر شائع کرنا کوئی جرم نہیں ہے اور اس طرح کی تصاویر سے لوگوں کے دلوں میں مجرموں کے خلاف نفرت پیدا ہوتی ہے۔اس طرح کی تصاویر شائع ہونے سے حکومت کی نیک نامی ہوتی ہے کہ ملک میں مکمل انصاف کیا جارہا ہے۔

ایگزبیٹ سی جی میں شامل کارڈ پر کوئی تبصرہ تحریر کیا ہوا نہیں ہے کہ کوڑے مارے جانے والا شخص گنہ گار ہے، معصوم ہے کہ مجرم۔

ایگزبیٹ سی جے میں موجود کارڈ یہ عندیہ نہیں دیتا کہ کوڑے مارے جانے والا شخص کمیونسٹ ہے جبکہ کوڑے مارنے والا ہاتھ ظاہر کرتا ہے کہ پاکستان میں کوڑے مارنے کی اجازت ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ پاکستان فیڈرل یونین آف اسٹوڈنٹس کمیونسٹوں کی تنظیم ہے۔

تفتیشی اہلکار کے طور پر میں نے پاکستان فیڈرل یونین آف اسٹوڈنٹس کا دفتر تلاش کرنے کی کوشش کی تاہم اس میں ناکام رہا۔

مجھے پاکستان فیڈرل یونین آف اسٹوڈنٹس سے تعلق رکھنے والا کوئی طالب علم نہیں ملا۔

میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ امرلال سمیت کوئی بھی ملزم پاکستان فیڈرل یونین آف

اسٹوڈنٹس کا رکن نہیں ہے۔

یہ درست ہے کہ ایگزبیٹ جی جی میں یہ باور نہیں کرایا گیا ہے کہ یہ کارڈ بدر ابڑو کے دفتر میں کس جگہ سے برآمد ہوئے تھے۔

یہ کہنا درست ہوگا کہ بدر ابڑو کے اپنے دفتر سے ایسا کوئی مواد برآمد نہیں ہوا تھا جو پاکستان کی مسلح افواج کے خلاف اشتعال انگیزی اور منافرت کو ثابت کر سکے۔

مجھے اسکے دفتر سے ایسا کوئی تحریری مواد بھی نہیں ملا جو لوگوں کو موجودہ حکومت کے خلاف بھڑکا تا ہو۔ مجھے اپنی تفتیش کی دوران ایسا کوئی شخص نہیں ملا جو کہہ سکے کہ بدر ابڑو نظریہء پاکستان سے متصادم کسی نقطہء نظر کی تشہیر میں ملوث رہا ہو۔

اہمیت کا حامل

عارفہ انٹرنیشنل کے مشیر نامے ایگزبیٹ ایم-3 کی برآمدگی کے علاوہ، جو کہ پاکستان کوارٹرس سے برآمد شدہ ہیں، بدر ابڑو کے خلاف ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے جو اسکو اُس جرم کا معاونت کار ظاہر کر سکے، جس کیلئے اس پر مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔

استغاثہ کا گواہ اشرف ملک

پمفلٹس کی برآمدگی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ میں بدر ابڑو کی میز اور اسکے قبضے اور دیگر دو افراد سے برآمد ہونے والی اشیا کی شناخت نہیں کر سکتا۔

اعادہ: امرلال

میں نے امرلال سے کوئی تخریبی چیز برآمد نہیں کی، علاوہ ازیں مجھے نہیں معلوم کہ پہلے والے تفتیشی اہلکار یا چھاپہ مارنے والی پارٹی نے کوئی تخریبی مواد برآمد کیا تھا یا نہیں۔

تاہم اس نے کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے ساتھ اپنے تعلق کا انکشاف کیا تھا، جہاں سے پہلے مارے گئے چھاپوں کے دوران تخریبی مواد برآمد کیا گیا تھا۔

وہ سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا قائم مقام صدر بھی تھا جو کہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی نرسری ہے۔

چونکہ وہ سرخ پرچم اور ہلچل رکھنے اور تقسیم کرنے میں انتہائی سرگرم تھا۔

شفیع محمد سومرو

امرلال 27 ستمبر کو گرفتار ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ امرلال 21 ستمبر کو گرفتار ہوا تھا، میں نے 23 ستمبر 1980 سے قبل ملزم امرلال کا کوئی ریمانڈ نہیں لیا تھا۔

مجھے یاد نہیں ہے کہ ملزم امرلال کا نام میری حدود میں کسی تخریبی سرگرمی/عمل کے حوالے سے کبھی سامنے آیا ہو

استغاثہ کا گواہ ممتاز برنی

اپنے اعترافی بیان میں امرلال نے یہ انکشاف نہیں کیا کہ وہ خود سرخ پرچم اور ہلچل اپنے پاس رکھتا اور تقسیم کرتا رہا ہے۔ اُس میں اس نے اعتراف کیا کہ وہ اسکی دیگر طالب علموں میں تقسیم کی منع کرتا رہا ہے۔

اسکے اعتراف سے عیاں ہے کہ ستمبر 1978 میں وہ سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی مرکزی ورکنگ کمیٹی کیلئے نامزد ہوا۔ نذیر عباسی جو سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا صدر تھا۔ سرخ پرچم اور ہلچل کے بنڈل کمرہ نمبر 67 انٹرنیشنل ہاسٹل لاتا رہا اور غسل خانے کی گیلری میں چھپاتا رہا۔

سرفراز میمن سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن سندھ یونیورسٹی کا صدر اور طالب علموں میں سرخ پرچم اور ہلچل تقسیم کرنے میں نذیر عباسی کا ساتھی تھا جو کہ ہر ایک طالب علم کو معلوم تھا۔

جام ساقی

صفائی کے گواہ جناب ممتاز قاضی، سپرنٹنڈنٹ سنٹرل جیل کراچی نے مدعا علیہ کی جانب سے ثبوت پر بتایا کہ جام ساقی کی خط وکتابت سنسر ہوتی تھی تاہم مجھے یاد ہے کہ انکے میری تحویل میں ہونے دوران انکی ایسی کوئی خط وکتابت نہیں ہوئی ہے۔

صفائی کے گواہ قاسم علی خواجہ، سپرنٹنڈنٹ لانڈھی جیل بتاتے ہیں کہ میں نے بدر جمال، امرلال اور جام ساقی کو جیل کی حدود میں تمہارے (شبیر شر) کے ساتھ رابطہ کرنے کی کوئی کوشش کرتے نہیں دیکھا۔

صفائی کے گواہ سلیم واحدی، ایس ایس پی کا کہنا تھا کہ ایس ایچ او جامشورو نے لیٹر نمبر 909 بتاریخ 24 جون 1980 کے ذریعے مطلع کیا کہ ملزم امر لال کو میجر عبدالغفور، اے ایس پی محمد اعظم نے ہوٹل انڈس حیدرآباد سے گرفتار کیا ہے اور جامشورو پولیس اسٹیشن کا ریکارڈ ملزم امر لال کی گرفتاری اور اس سے ہونے والی برآمدگی پر خاموشی ہے۔

(ان گواہان کو اس عدالت کے سامنے کبھی بھی پیش نہیں کیا گیا)

ریکارڈ پر موجود ان تمام تر ثبوتوں کی جانچ پڑتال سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تفتیش غیر قانونی اور قانون کی نظر میں نقائص کی حامل تھی۔ اصل شکایت کنندہ سے جانچ پڑتال نہیں کی گئی ہے۔ طبعی ثبوتوں کو پس پشت رکھا گیا ہے اور ثبوتوں کو دبایا گیا ہے۔ شکایت میں طبعی اور ناقابل تردید تبدیلی کی گئی ہے۔ شکایت جرم کے وقت اور تارخ سے متعلق خاموش ہے، جو امر یہ تاثر پیدا کرتا ہے کہ اسکو استغاثہ کے حق میں کرنے کیلیئے گھڑا گیا ہے۔ ثبوتوں کی تائید میں آزادانہ گواہی پیش نہیں کی گئی ہے۔ تمام گواہان کانسٹیبلز، سب انسپیکٹرز وغیرہ ہیں، جن کی گواہی پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ جرم کی مبینہ جگہ سے متعلق متضاد اور متصادم گواہیاں پیش کی گئی ہیں جن پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ ان تضادات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جائے وقوعہ پر کوئی بھی گواہ موجود نہیں تھا۔ استغاثہ کسی شک وشبہہ سے بالا یہ ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے کہ ایسا کوئی قابلِ جرم مواد موجود تھا، جس سے یہ متعین کیا جا سکے کہ ملزمان مبینہ جرم میں کسی طور ملوث تھے۔ تفتیشی اہلکاروں نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا ہے اور معصوم افراد کو گرفتار اور شاملِ تفتیش کر کے قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔ استغاثہ اس عدالت کی روبرو جائے وقوعہ کی شناخت جیسی کوئی گواہی/ ثبوت پیش نہیں کر سکا ہے۔ استغاثہ گرفتاریوں اور برآمدگیوں کی تائید میں کوئی آزاد مشیر اور گواہ پیش کرنے میں ناکام رہا ہے۔ ثبوتوں سے یہ واضح ہے کہ قابلِ جرم مواد کو ملزمان پر ڈالا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اس نام نہاد مواد میں 1977 سے قبل کا مواد بھی شامل کیا گیا ہے۔ مارکیٹ سے باآسانی دستیاب کتابیں اور رسالے جو کہ قانون کے عین مطابق شائع ہوئے ہیں کو بھی اس مواد میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ مقدمہ کچھ مارشل لا اختیاری والوں کی جانب سے جھوٹ کی بنیاد پر قائم کیا گیا

ہے، جوملزمان کی گرفتاری تشدداورحراست کیلئے ذمہ دار ہیں۔اسی لئے گرفتاری، ریمانڈ،حراست، تفتیش اورنام نہاداعتراف کےضمن میں قانون کی صریحاً خلاف ورزی کی گئی ہے۔

استغاثہ ذیل کےضمن میں الزامات کوثابت کرنے کیلئے کوئی بھی ثبوت پیش کرنے میں نا کام رہا رہا ہے:

(a) مختلف طبقات اور مذہبی نظاموں کے درمیان مخاصمت اورمنافرت پیدا کرنا۔

(b) عوام الناس میں بے چینی پیدا کرنا

(c) پاکستان کےنظریئے یاسلامتی یا خودمختیاری سے متصادم کوئی عمل

(d) کوئی ایسا عمل جو مارشل نافذ کرنے کے اسباب سے متصادم ہو

(e) کوئی ایسا عمل جو قانون کی تحت قائم حکومت یا مسلح افواج کی جانب بے اطمینانی پیدا کرنے کا باعث ہو۔

چارج شیٹ میں ذکر کیے گئے مبینہ جرائم میں سہیل سانگی، بدرابڑو، امرلال، جمال نقوی اور جام ساقی کےملوث ہونے سے متعلق کوئی ثبوت موجودنہیں ہے، نہ ہی چارج شیٹ میں لگائے گئے مبینہ جرائم کے ارتکاب میں انکے ملوث ہونے کوکسی طرح ثابت کیا گیا ہے۔اس امر کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کہ ملزمان میں سے کوئی کسی غیرقانونی گروہ کارکن ہو۔

جہاں تک احمد کمال وارثی اور غلام شبیر شر کے خلاف الزمات کا تعلق ہے تو استغاثہ مبینہ اعترافات کے رضا کارانہ ہونے کوثابت کرنے میں نا کام رہا ہے جو کہ سیکشن163 سی آر پی سی اوراسلامی جمہوریہء پاکستان کے آئین کی شق 4 میں فراہم کی گئی لازمی شرائط کی صریحاً خلاف ورزی کرتے ہوئے تشدد کے ذریعے حاصل کیے گئے ہیں۔استغاثہ ان جبری طور پر حاصل کیے گئے اعترفات کی تائیدوتوثیق میں آزادانہ یا قابلِ قبول ثبوت پیش کرنے میں مکمل طور پر نا کام رہا ہے۔ان دونوں ملزمان کے حوالے سے بھی اس عدالت کے روبروکوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا ہے۔

استغاثہ کے گواہان کی جانب سے پیش کیے گئے ایگزبیٹس ظاہر کرتے ہیں کہ نظریہء پاکستان

کیا ہے، اسکو استغاثہ کی جانب سے پیش کیے گئے مبینہ مواد سے تقابل کیا جاتا ہے تو یہ بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ عدالت کے سامنے موجود مواد میں سے کچھ بھی نظریہء پاکستان سے متصادم نہیں ہے اور نہ ہی اس مواد سے مختلف طبقات کے درمیان عدم اطمینان پیدا کرنے کی غرض سے منافرت اور دشمنی پیدا کرنے یا عوام الناس میں بے چینی پیدا کرنے کا شائبہ ملتا ہے۔

اختیارات کے حامل افراد کی جانب سے اپنے فرائض کی عدم ادائیگی یا کمزوریوں پر تنقید کسی بھی طور عدم اطمینان پیدا کرنے کی زمرے میں نہیں آتی۔

سپریم کورٹ آف پاکستان کا نصرت بھٹو مقدمہ پی ایل ڈی 77 سپریم کورٹ 657 میں صفحہ نمبر 715 پر کہنا تھا:

''یہ متعین کرنے کے بعد کہ پاکستان کی مسلح افواج کی جانب سے لیا گیا ماورائے آئین اقدام ریاستی ضرورت اور عوام الناس کی بہتری میں باجواز تھا، اب اسکی قانونی حیثیت کا جائزہ لینا ضروری ہے۔۔۔(اور)۔۔۔درست قانونی حیثیت، جو اسکے نتیجے میں سامنے آتی ہے: (۱) کہ 1973 کا آئین تاحال ملک کا اعلیٰ ترین قانون ہے، ماسوائے اسکے کہ اسکے کچھ حصے ضرورت کے تحت تعطل میں رہیں گے، (۲) کہ صدر مملکت اور اعلیٰ عدالتیں آئین کے تحت کام کرتے رہیں گے۔

(۳) کہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے ریاست کے مفاد اور عوام الناس کی بہتری میں ایک ماورائے آئین اقدام کے ذریعے اقتدار حاصل کیا ہے، کو ایسے تمام اقدامات کرنے اور تمام قانون ساز اقدامات نافذ کرنے کا اختیار حاصل ہوگا جو نظریہء ضرورت کے دائرے میں آنے کی صورت میں عدالتی اختیاری کی جانب سے ضروری سمجھے جائیں گے، ان میں ذیل درج شامل ہوں گے:

(a) تمام اقدامات یا قانون سازی کے اقدامات جو کہ بشمول ترمیم کرنے کے، 1973 کے آئین سے مطابقت میں ہوں گے، یا اسکے تحت اُٹھائے گئے ہوں گے۔

(b) تمام اقدامات جو عوام الناس کی بہتری کیلئے ہوں گے

(c) تمام اقدامات جو ریاستی امور کو نظم و ضبط سے چلانے کیلئے مطلوب ہوں گے۔ مارچ تا جولائی 1979 کے واقعات کا ایک خلاصہ فیصلے کا ایک حصہ ہے، ملاحظہ کیجئے پی ایل ڈی 1977 سپریم کورٹ 697 تا 703۔

(d) ایسے تمام اقدامات جو مارشل لا کے نفاذ کے واضح کردہ مقاصد کو قائم کرنے یا انکی راہ ہموار کرنے ضروری ہوں، جیسا کہ امن امان اور ملک میں پرامن حالات کی بحالی، اور 1973 کے آئین کے تحت جمہوری اداروں کی بحالی کے مقصد کے پیش نظر آزادانہ اور شفاف انتخابات کا ممکن حد تک جلد از جلد انعقاد۔

(۴) کہ یہ اقدامات یا ان میں سے کچھ ضرورت محسوس ہونے کی صورت میں صدارتی احکامات، آرڈیننسز، مارشل لا ضوابط یا احکامات کے ذریعے اُٹھائے یا کیے جا سکتے ہیں۔

(۵) کہ اعلیٰ عدالتوں کو مندرجہ بالا نظریہء ضرورت کے قانون میں شامل اصولوں کی روشنی میں چیلنج ہونے کی صورت میں مارشل لا اختیاری کے کسی عمل یا اقدام کی معقولیت کا عدالتی جائزہ لینے کا اختیار بدستور حاصل ہوگا۔ آئین کی شق 199 کے تحت انکے اختیارات اپنی تمام تر قوت کے ساتھ میسر ہوں گے اور انکو کسی مارشل لا ضابطے یا حکم نامے، صدارتی حکم نامے یا آرڈیننس میں شامل کسی امر پر استعمال کیا جا سکے گا (پی ایل ڈی 1977 سپریم کورٹ، 705، 715 تا 716)

چیف جسٹس نے اس نکتے پر زور دیا کہ:.........میں نے متعین کیا ہے کہ نیا نظام قانون کے بجائے آئینی انحرافی کے ایک مرحلے کی ہی نمائندگی کرتا ہے، جو کہ ضرورت کے تحت مسلط ہوا۔۔۔ عدالت واضح انداز میں کہنا چاہے گی کہ اُس نے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے ماورائے آئین عمل کی صرف اس لئے توثیق نہیں کی ہے کہ وہ سنگین قومی بحران اور آئینی انتشار کے وقت ملکی تحفظ کے لئے آگے بڑھے بلکہ اس لئے بھی کہ انہوں نے اپنے اس عزم کا اعادہ کیا ہے کہ آئین سے انحراف کا عرصہ ممکنہ حد تک مختصر ہوگا، اور اس دوران تمام تر توانائی ایسے حالات پیدا کرنے پر صرف کی جائے گی جن میں آزادانہ اور شفاف انتخابات کا انعقاد ممکن ہو سکے جو کہ آئین کے وضع کردہ

اصولوں کے تحت جمہوری حکمرانی کی بحالی کی راہ ہموار کرسکیں، اس لئے عدالت چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر سے توقع رکھتی ہے کہ وہ پاکستان کے عوام کی جانب سے اس اختیار کی پاسداری کریں گے جو انہوں نے عمومی لحاظ سے اپنی انتظامیہ کو پاکستان کی عبوری حکومت کے طور پر قبول کیا ہے۔''

ایک مخصوص مقصد کیلئے آئین سے روگردانی کی ایک محدود توثیق دی گئی تھی۔ موجودہ حکومت اپنی قانونی توضیح سپریم کورٹ کے مندرجہ بالا ذکر کیے گئے فیصلے سے حاصل کرتی ہے۔ یہ اپنی متعین کردہ حدود سے آگے نہیں جاسکتی۔ اسکی محدود توثیق اختتام کو پہنچ چکی ہے۔ اسکو اقتدار لازماً عوام کے منتخب نمائندوں کے سپرد کرنا چاہیئے۔

ہماری مندرجہ بالا گذارش سے قطع نظر، استغاثہ کسی بھی ملزم کے خلاف کسی شک وشبہہ سے بالاتر کوئی بھی الزام ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے، جس کے معیار پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں اور مہذب دنیا میں متعین کیے گئے ہیں۔

کسی اور ثبوت کی عدم موجودگی میں صرف یہ حقائق کہ پمفلٹ کے صفحہ اول پر ملزم کا نام درج ہے، یہ اخذ کرنے کا جواز پیدا نہیں کرتا کہ وہ اور کوئی نہیں اس کا مصنف یا ناشر یا کسی اور طرح سے متعلقہ ہوسکتا ہے۔

اے آئی بی 25 ایل 569

20 پی ایل آر 751

سامراج خلاف لڑائی کی حمایت کرنا یا محنت کشوں کی حکومت کیلئے کام کرنا یا سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی خواہش کرنا یا مختلف طرز حکومت تجویز کرنا یا سرمایہ داری کے خلاف بولنا یا وزرا یا سربراہ ِحکومت پر تنقید کرنا سیکشن 124 اے پاکستان پینل کوڈ کے تحت نہیں آتی اور نہ ہی یہ بغاوت کے مترادف ہے۔

اے آئی آر 37 تمام 295

اے آئی آر 50 بمبئی 210

اے آئی آر 39 کلکتہ 306

اے آئی آر 33 بمبئی 65

پی ایل ڈی 58 پشاور 15، بغاوت، حسین بخش بخلاف ریاست

پی ایل ڈی 54 سندھ 80 ملزمان غیاث الدین سلہری 124/A

مارشل لا مردہ باد کا نعرہ لگانا مارشل لا ضابطہ نمبر 13 کی خلاف ورزی کے زمرے میں نہیں آتا۔

پی ایل ڈی 1980 کے پی 27

کسی متنازعے سرگرمی کے جرم کا مرتکب ہونے والی کسی تنظیم کا رکن بننا کسی اقدام کا جواز فراہم نہیں کرتا۔

پی ایل ڈی 65 ایل 112

امریکہ 1 ایل اشاعت دوئم 1361

امریکہ 19 ایل اشاعتِ دوئم 510

صوبوں کے درمیان عدم توازن یا اقتصادی صورتحال کی جانب حکومت کی توجہ مبذول کرانا متنازعہ عمل نہیں ہے۔

پی ای ایل ڈی 71 ڈی 154

ملزمان کو حکومت پر تنقید کرنے کی صورت میں عدم اطمینان یا نفرت پیدا کرنے یا متنازعہ عمل کرنے کا مرتکب قرار نہیں دیا جاسکتا

1969 پی ایل سی 476

اے آئی آر 48 ایل 46

پی ایل ڈی 50 ایل 429 ملک نصر اللہ خان عزیز (ادیب)

پی ایل ڈی 65 اڈی 478 صفحہ نمبر 484، تفضّل حسین کیس

پی ایل ڈی 65 ایل 212 ''نیا زمانہ'' اخبار، پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت

1969 پاکستان کرمنل لا جرنل 307، صفحہ 308 پر، عبدالحئی بخلاف حکومتِ مشرقی پاکستان

طلبہ سرگرمیوں پر

نظریہء پاکستان سے متصادم کسی عمل کا کوئی ثبوت نہیں ہے تاہم جناب شریف المجاہد اپنی کتاب ''پاکستان کی نظریاتی اساس'' میں نظریہء پاکستان کے زیرِعنوان صفحہ نمبر 156 تا 187 پر لکھتے ہیں:

''سوئم، ہر ایک کی جانب سے سیاسی اور ذاتی مفادات کی خاطر اسلام کے مسلسل اور بے دریغ استعمال نے عوام الناس کی اسلام سے وفاداری کو کند کر دیا ہے، جس نے پاکستان کے امور میں اسلام کے کردار اور اہمیت پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں، مثلاً، ایوب خان اور انکے حمائیتوں نے 1965 کے صدارتی انتخابات میں حزبِ مخالف کی اُمیدوار مس فاطمہ جناح کے خلاف مہم میں اسلام کے نام کو استعمال کیا۔ انہوں نے فتویٰ حاصل کیے کہ کوئی عورت اسلامی ملک/ ریاست کی سربراہی نہیں کر سکتی (اس دوران انہوں نے اتنا بھی پیشِ نظر نہیں رکھا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں حضرت عائشہ نے جنگِ جمل میں فوج کی سربراہی کی، حضرت زینب نے واقعہء کربلا میں قافلے کے لٹ جانے پر اسکی قیادت کی۔) کئی مواقع پر لوگوں کو انکے جمہوری حقوق سے محروم رکھنے کیلئے بھی اسلام کو استعمال کیا گیا۔ دیگر معاملات میں بھی، ایوب حکومت نے اپنی مرکزی آمریت کو برقرار رکھنے کی غرض سے بھی اسلام کا بے دریغ استعمال کیا۔ ایوب اپنے نظام کا اکثر اسلامی نظام کے طور پر دفاع کرتا تھا:

''مرکزیت، اتحاد اور یکجھتی کے بغیر کوئی بھی نظام اپنے اسلامی نظام ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔''

اسی طرح، مشرقی پاکستان کے گورنر منیم خان نے چیئرمین ماؤزے تنگ کے اقوال پر مشتمل ''سرخ کتاب'' کی طرز پر صدر محمد ایوب خان کے اقوال پر مشتمل ''مختصر سبز کتاب'' کے جواز کیلئے اسلام کو استعمال کیا۔ انہوں نے 1967 میں ایک غیر ملکی صحافی کو بتایا کہ ''قران پاک کہتا ہے کہ حاکمِ وقت خدا کا سایہ ہے۔ پیغمبر محمد نے کہا ہے کہ ہمیشہ اپنے امیر یا حاکم کے وفادار رہو۔'' منیم خان کی جانب سے ایوب خان کی ''سایہء خدا'' کے طور پر تشہیر کو ادارتی شکل دینے اور مسلم آبادی کو ''رہنما'' کی تابعداری کرنے کے اسلامی فریضے کی جانب راغب کرنے کی غرض سے چوہدری

خلیق الزمان، ایوب خان کو اکثر امیر المومنین کے لقب سے نوازتے رہے۔

بہ الفاظ دیگر، اقتداری ٹولے نے نظریہء پاکستان کو ایک ثمر بخش نعمت کے طور پر استعمال کرنے کے بجائے ''حربے'' کے طور پر ہی استعمال کیا، کسی نظریئے کے بنیادی جُز کے طور پر آگے بڑھنے کی راہ روشن کرنے کے بجائے وقتی مفادات کے تابع بنایا۔

اگر نظریہ ایک تحریک ہے تو یہ صرف پیروکاروں کے دماغوں پر اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ رہنماؤں کو بھی اپنے زیرِ اثر لاتا ہے، لیکن اگر یہ صرف ایک حربہ ہے تو نظریے کو رہنما اپنے پیروکاروں میں تابعداری پیدا کرنے یا بصورت دیگر نا قابلِ رسائی رنگروٹوں کی مجوق کیلئے ہی مسلسل استعمال کرتا ہے تاہم ایسا رہنما خود اس نظریئے کی پاسداری نہیں کرتا جس کی ترویج وتشہیر میں وہ مصروف ہوتا ہے۔۔

اس طرح، پاکستان میں مختلف حکومتوں، بالخصوص ایوب شاہی نے نہ صرف اپنی کم تر صلاحیتوں کیلئے ایک متبادل پالیسی کے طور پر اسلام کو استعمال کیا بلکہ اسکی آڑ میں آمرانہ اقتدار مسلط کرنے اور اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کے جواز بھی پیش کیے۔''

نظریہء پاکستان اور ظلمت پسندی کے نعروں کا حالیہ استعمال بھی اسی مقصد کے تحت ہے۔

قانونی بنیاد پر بھی، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ملزمان کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں بنتا۔ استغاثہ کی جانب سے مفرور قرار دیئے گئے ملزمان امام علی (نازش)، جبار خٹک، نرنجن کمار کے خلاف الزامات کے حق میں کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا کی روشنی میں، ملزمان کے خلاف کسی بھی نوعیت کا کوئی مقدمہ نہیں بنتا۔ مارشل لا ضوابط 4، 13، 18، 36 اور سیکشن 124 اے اور 149 پاکستان پینل کوڈ کے تحت کوئی الزام ثابت نہیں کیا گیا ہے، انہیں کسی اور مقصد کے تحت پھنسایا گیا ہے جس کے نتیجے میں وہ طویل عرصے سے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔ ہم استدعا کرتے ہیں کہ انہیں بری کیا جائے اور آزاد کر دیا جائے تا کہ انصاف کا بول بالا ہو اور ان افراد کے خلاف اقدامات کی سفارش کی جائے جو اس جھوٹے اور بے بنیاد مقدمے کیلئے ذمہ دار ہیں۔

ملزمان کے خلاف زیردرج الزامات عائد کیے گئے ہیں:

سویلین ملزمان (1) احمد کمال وارثی ولد عبدالوحید، ساکن جی/458، ڈرگ کالونی، کراچی (2) غلام شبیر شر ولد عبدالرزاق، ساکن خیر پور، (3) سید جمال الدین نقوی ولد سید اقبال نقوی، ساکن سی-56، بلاک ایل، نارتھ ناظم آباد، کراچی، (4) محمد سہیل سانگی ولد بدر اقبال، ساکن حیدر آباد (5) امر لال ولد ٹھاکر داس، ساکن پنو عاقل، سکھر (6) محمد جام ساقی ولد محمد سچل، ساکن حیدر آباد اور (7) بدر جمال ابڑو ولد جمال الدین ابڑو، پر مشترکہ طور پر الزام ہے کہ:

پہلا الزام مارشل لا ضابطہ نمبر 4	مختلف طبقات وغیرہ کے درمیان منافرت پیدا کرنے کی غرض سے مواد شائع کرنا، تقسیم کرنا اور اپنے پاس رکھنا، اس ضمن میں وہ جولائی 1980 میں کراچی میں ریاست مخالف مواد بشمول ہلچل اور سرخ پرچے کے شماروں کے ساتھ پائے گئے اور انکو ایسے مواد کی موجودگی کا علم تھا جو مختلف طبقات اور مذہبی حلقوں کے درمیان دشمنی اور منافرت کے جذبات بھڑکانے کا باعث تھا، اور اس لئے وہ اس جرم کے مرتکب ہوئے۔
دوسرا الزام مارشل لا ضابطہ نمبر 13	مسلح افواج سے متعلق عدم اطمینان پھیلانا، اس ضمن میں وہ جولائی 1980 کے دوران کراچی میں قابل اعتراض مواد رکھنے اور عوام الناس میں اشتعال پھیلانے کا باعث بننے والی قابلِ اعتراض سرگرمیوں میں ملوث پائے گئے اور اس طرح اس جرم کے مرتکب ہوئے۔
تیسرا الزام مارشل لا ضابطہ نمبر 18	نظریۂ پاکستان سے متصادم نقطۂ نظر کی پروپگنڈا، جس دوران انہوں نے قابلِ اعتراض مواد کی اشاعت، تشہیر اور تقسیم کے ذریعے نظریۂ پاکستان اور مارشل لا نافذ کرنے کی وجوہات سے متصادم انداز میں جولائی 1980 کے دوران کراچی میں عمل کیا ہے اور جس کی بنیاد پر مذکورہ جرم کے ارتکاب کا باعث بنے ہیں۔

متبادل الزام مارشل لا ضابطہ نمبر 36 بخلاف ملزم نمبر 5،4 اور 7	جرم کے ارتکاب میں مددگار بننا، جس کے دوران انہوں نے، جولائی 1980 کے دوران کراچی میں شریک ملزمان کی تائید میں سازش کی تکمیل کیلئے مسلح افواج اور قانونی طور پر قائم حکومت کے خلاف عدم اطمینان پیدا کرنے کی کوشش میں حصہ دار بننے کے علاوہ عوام الناس میں بے چینی پیدا کرنے اور مختلف طبقات اور مذہبی فرقوں کے درمیان منافرت پھیلانے کی کوشش کی اور اس طرح جرم کرنے کے مرتکب ہوئے۔
چوتھا الزام بغاوت، سیکشن 124 / اے 149 پاکستان پینل کوڈ	اس کے تحت وہ، جولائی 1980 کے دوران کراچی میں ریاست مخالف مواد رکھنے کے علاوہ قانونی طور پر قائم حکومت کے خلاف بے چینی پیدا کرنے کے ساتھ نفرت پھیلانے والی سرگرمیوں میں ملوث ہوئے ہیں اور اس طرح وہ جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔

فاضل استغاثہ نے عدالت کے سامنے اپنی ابتدائی تحریر میں بیان کیا ہے کہ:

ملزمان

1- غلام شبیر شر

2- احمد کمال وارثی

3- پروفیسر سید جمال الدین نقوی

4- سہیل سانگی

5- امر لال

6- بدر جمال ابڑو

7- محمد جام ساقی

8- امام علی (نازش)

9-جبار خٹک

10-نرنجن کمار

کو سیکشن 18/15/13(3) اور 48 مارشل لا ضابطہ 197 / بی/ ڈبلیو 77 /512 مارشل لا حکم نامہ اور 124-اے، 153-اے پاکستان پینل کوڈ، 24 (1) (i) اور (1) ویسٹ پاکستان پریس اینڈ پبلیکیشن آرڈیننس مجریہ 1963 کے تحت نارتھ ناظم آباد، پولیس اسٹیشن کراچی کی ایف آئی آر نمبر 236/80 کے تحت چالان کیا گیا ہے جبکہ امام علی (نازش)، جبار خٹک اور نرنجن کمار کو چالان میں مفرور ظاہر کیا گیا ہے۔ انکے خلاف الزامات یہ ہیں کہ وہ تخریبی مواد کی اشاعت اور تقسیم کے ذریعے حکومت کے خلاف تخریبی سرگرمیوں میں ملوث رہے ہیں۔ ایسا مواد اور اشاعتی مواد بشمول مشینیں تحویل میں لی گئی ہیں۔ استغاثہ ملزمان کے خلاف اپنا مقدمہ ثابت کرنے کے ضمن میں کافی ثبوت رکھتا ہے اور اپنا مقدمہ ثابت کرنے کی حیثیت کا حامل ہے کہ اس نوعیت کے مواد کے ذریعے ملزمان کا بنیادی مقصد طبقاتی منافرت، کم آمدنی والے طبقات کی تخریب، مسلح افواج اور پولیس کے خلاف نفرت پیدا کرنا، حکمرانوں اور عوام کے درمیان خلیج پیدا کرنا، چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر پر تنقید کرنا، کمیونسٹ نظریے اور روسی/ افغان نقطہء نظر کی ترویج کرنا، پاکستان کی افغان مہاجرین کی حمایت کو مشکوک بنانا تھا۔ غلام شبیر شر اور حمد کمال وارثی کے اعترافی بیانات سیکشن 164 سی آر پی سی کے تحت ریکارڈ/ درج کیے گئے ہیں اور انہوں نے کچھ دیگر ملزمان کو بھی ملوث کیا ہے۔

مارشل لا ضوابط اور پاکستان پینل کوڈ کی شقوں کا تجزیہ استغاثہ پر لازم کرتا ہے کہ وہ کسی شک و شبہہ سے بالا ثابت کرے کہ ملزمان انفرادی یا اجتماعی طور پر کسی نقطۂ نظر کی ترویج کے طور پر مواد کی کسی صورت اشاعت، تقسیم یا رکھنے میں ملوث ہیں یا انہوں نے مختلف طبقات یا مذہبی سلسلوں میں منافرت یا دشمنی کے جذبات کو بھڑکانے کی کوئی کوشش کی ہے یا عوام الناس میں بے چینی پھیلانے کی باعث بنے ہوں یا نظریہء پاکستان سے متصادم کسی عمل یا تشہیر میں ملوث رہے ہوں یا مارشل لا نافذ کرنے کے مقاصد کے خلاف رہے ہوں یا پھر قانونی طور پر قائم حکومت سے عدم اطمینان پیدا

کرنے کا باعث بنے ہوں یا اسکی کوشش کی ہو۔

فاضل استغاثہ نے الزامات کا دائرہ وسیع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے ابتدائی اظہار میں مارشل لاضوابط 15، 48، 77، پاکستان پینل کوڈ کے سیکشن 512، 531 اے اور مغربی پاکستان پریس اینڈ پبلیکیشن آرڈیننس مجریہ 1963 کے 24 (1) (i) (1) کو بھی شامل کیا ہے، جو کہ وہ پاکستان ملٹری قانون مینوئل جلد اول کے صفحہ 28 کی پیرا 47 میں واضح ہدایات کے پیش نظر نہیں کر سکتے، جو کہ ذیل درج طور ہے:

''47- استغاثہ کے فرائض- استغاثہ کسی گھمبیر مقدمے کی صورت میں ہمیشہ ابتدائی اظہار/ خطاب کرے، اور عدالت ایسے خطاب کو طلب کر سکتی ہے۔ انہیں الزامات کی وقعت کی وضاحت کرنی چاہئے اور اسکی تائید میں پیش کیے جانے والے مجوزہ ثبوت کا خاکہ پیش کرنا چاہئے۔''

ضابطہ 46 (ii) صفحہ 352 متقاضی ہے کہ:

(ii) استغاثہ، اگر خود چاہے تو اور عدالت کی جانب سے مطالبہ ہونے کی صورت میں لازماً، ابتدائی اظہار/ خطاب کرے گا اور اس میں ملزم/ ملزمان کے خلاف الزام/ الزامات کا احاطہ کرے گا اور کسی غیر ضروری تفصیل میں پڑے بغیر اسکی تائید کیلئے اپنے ثبوت کی نوعیت اور عمومی اثرات پیش کرے گا۔''

عدالت نے اُن سے خطاب کیلئے نہیں کہا، بلکہ انہوں نے خود خطاب کو ترجیح دی۔ وہ وضاحت اور الزمات کا جواز پیش کر سکتے تھے۔ تاہم وہ قانون کے تحت اپنے اختیارات یا کام سے تجاوز کر گئے اور وہ مارشل لاضوابط اور پاکستان پینل کوڈ کے سیکشن شامل کیے جو وہ نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی اسکی قانونی طور پر اجازت تھی کہ ''حکمرانوں اور رعیت کے درمیان تناؤ پیدا کرنے، کم آمدنی والے افراد، مسلح افواج اور پولیس کے تخریب، چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر پر تنقید، کیمونسٹ نظریئے، روسی اور افغان موقف کی تشہیر'' جیسی بات خطاب کے آخری فقرے میں شامل کرنا غیر ضروری، غیر قانونی اور قانون سے مبرا ہے اور اسکو مدِ نظر نہیں رکھنا چاہئے۔

12 جولائی1981 کو ملزمان کے خلاف عائد کیے گئے الزام میں نہ کوئی تبدیلی کی گئی اور نہ ہی کوئی اضافہ۔ کسی تبدیلی یا اضافے کیلئے کوئی درخواست دائر نہیں کی گئی۔ قانون کے تحت درخواست دائر کرنی پڑتی ہے اور وہ بھی الزام عائد کرنے کے بعد فوری طور پر۔

اگر کوئی تبدیلی کی گئی ہے تاہم ملزم کے سامنے اسکو پڑھا اور واضح نہیں کیا گیا ہے تو سزا غیر قانونی ہے (آ ئی آئی بی 1926، الہ آباد صفحہ 227اے)

ایسا الزام جیسا کہ ملزمان کے خلاف 12 جولائی 1981 کو عائد کیا گیا، جو کہ انہیں پڑھ کر سنایا گیا اور پاکستان آرمی ایکٹ ضوابط کے ضابطہ نمبر 38 کے تحت پیش کیا گیا:

''مندرجہ بالا الزام بتاریخ 12 جولائی 1981 کسی تعصب کے بغیر بے سروپا ہے، یہ صرف قانون کے الفاظ دہراتا ہے، یہ کسی مبینہ جرم اور اِسکا ارتکاب کرنے والے افراد کے نام، وقت، مقام، تفصیل نہیں فراہم کرتا جو کہ آرمی ایکٹ ضوابط کے ضابطہ نمبر 19، 20 اور 21 کے تحت لازمی ہیں۔ کسی جرم کے الزام کو حقائق کی تائید کے بغیر قبول نہیں کیا جا سکتا، الزام میں سیکشن کا صرف ذکر قانونی تقاضوں کا حامل نہیں ہو سکتا، یا پھر یہ ظاہر کرتا ہے کہ عدالت اپنا فہم استعمال کرنے کی بجائے صرف سیکشن کے اس ذکر پر اکتفا کرے۔

چونکہ اس طرح کا کوئی الزام قابلِ فہم الزام نہیں سمجھا جا سکتا اس لئے ایسے کسی مبینہ جرم پر کسی کو سزا بھی نہیں دی جا سکتی۔

ملزم نمبر 6 جام ساقی نے پاکستان آرمی ایکٹ ضوابط کے سیکشن 90 اور ضابطہ نمبر 43 کے تحت ایک تحریری استدعا کی ہے کہ اُن پر ایسے کسی جرم کے ارتکاب کا مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا جس کیلئے وہ پہلے سے ہی خصوصی فوجی عدالت نمبر 1 حیدرآباد سے چارج شیٹ بتاریخ 11 مارچ 1980 کی بنا پر 13 اکتوبر 1981 کو ایک حکم نامے کے ذریعے دس سال قید با مشقت کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ چارج شیٹ اور حکم نامے کی نقل اس معزز عدالت کو فراہم کی جا چکی ہے۔

عدالت نے متعین کیا کہ شواہد کے اختتام پر اس ضمن میں فیصلہ کیا جائے گا۔ اس ملزم کو 10 دسمبر 1978 کو گرفتار کیا گیا اور اس وقت سے مسلسل قید میں ہوتے ہوئے اپنی سزا کاٹ رہا ہے۔

مندرجہ بالا استدعا سے کسی قسم کا تعصب برتنے کے بغیر یہ مودبانہ طور پر استدعا کی گئی ہے کہ تاریخ 12 جولائی 1981 کی چارج شیٹ زیادہ سے زیادہ مارشل لا ضوابط نمبر 4، 13، 18، 36 اور 121/A/149 کے تحت آتی ہے۔

اولاً، سیکشن 124 اے یا 153 اے پاکستان پینل کوڈ کے تحت کسی جرم پر کوئی کیس چلانے یا کسی ملزم کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کیلئے سیکشن 196 سی آر پی سی کے تحت قانوناً مرکزی یا صوبائی حکومت سے مقدمہ چلانے کی منظوری حاصل کرنا لازمی ہے۔ اس عدالت کے روبرو ایسی کوئی منظوری پیش نہیں کی گئی ہے، نہ ہی ایسی کوئی منظوری ثابت کی گئی ہے، درحقیقت استغاثہ نے ایسی کوئی منظوری حاصل ہی نہیں کی ہے۔

1969، پاکستان کرمنل لا جرنل صفحہ 73، صفحہ 74 پر

1976، پاکستان کرمنل لا جرنل صفحہ 73، صفحہ 74 پر

پی ایل ڈی 1969، کوئٹہ صفحہ 34، صفحہ 40 پر

1969، پاکستان کرمنل لا جرنل صفحہ 120، صفحہ 121 تا 122 پر

استغاثہ کی استدعا سیکشن 196 سی آر پی سی سے عدم مطابقت (1976 پاکستان کرمنل لا جرنل 184) کی بنیاد تک جاتی ہے۔ یہ متعین کیا گیا ہے کہ سیکشن 196 سی آر پی سی کی شرائط کی عدم پیروی قانونی کارروائی، مقدمے اور سزا کو غیر قانونی بنا دیتی ہے۔ (976) پاکستان کرمنل لا جرنل صفحہ 184، صفحہ 188 پر) - درحقیقت پوری کارروائی صفحہ 191 کے پیرا 7 کے مطابق غیر قانونی اور صوابدیدی اختیارات سے بالا ہو جاتی ہے۔

(پی ایل ڈی 1972، سپریم کورٹ صفحہ 271، صفحہ 274 اے اور بی پر)

منظوری کی شرط فوجی عدالتوں پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ پی ایل ڈی 79 صفحہ 623 صفحہ 627 پر یہ استدعا کی گئی ہے کہ عدالت کی جانب سے سیکشن 124 اے پاکستان پینل کوڈ کے تحت کسی ملزم کا مقدمہ قانون کی نظر میں ناجائز اور انصاف کے تقاضاؤں کے منافی نہ ہو۔

استغاثہ کی جانب سے اپنے ابتدائی کلمات میں پریس اینڈ پبلیکیشن آرڈیننس مجریہ 1963

کے حوالے پر کسی نوعیت کی قبولیت کے بغیر، یہ گذارش کی گئی ہے کہ مذکورہ آرڈیننس کا سیکشن (2)57 لازمی قرار دیتا ہے کہ کوئی بھی عدالت ایسے کسی جرم کے ارتکاب پر اُس وقت تک کوئی کارروائی نہیں کرے گی جب تک حکومت یا اسکی جانب سے اختیارات کا حامل کوئی افسر اس ضمن میں کوئی تحریری درخواست نہیں کرتے۔ ایسی کوئی اجازت حاصل نہیں کی گئی ہے، نہ ہی عدالت کے روبرو اسکا کوئی ثبوت پیش کیا گیا ہے، چناچہ اس کو کارروائی کا حصہ بنانے سے مقدمہ غیر قانونی اور اختیارات سے مبرا ہے اور درحقیقت قانون کی اس لازمی شق سے مطابقت میں اس ضمن میں تمام تر کارروایاں غیر قانونی اور اختیارات/ دائرہ کار سے مبرا ہو جاتی ہیں۔

ملزمان مکمل طور پر معصوم/ بے گناہ ہیں، قابل ِگرفت قانون مواد جو اس مقدمے میں اس معزز عدالت کے روبرو پیش کیا گیا ہے، اُن پر مونڈھا گیا ہے۔ پریس اینڈ پبلیکشن آرڈیننس 1963 کے سیکشن 37، 38 اور 39 کے تناظر میں کوئی بھی مطبوعہ مواد یا پرنٹنگ مشین تحویل میں نہیں لیے گئے ہیں۔

مذکورہ سیکشن ایک مناسب قانونی طریقہء کار فراہم کرتے ہیں، جس کی مطابق ایسے اقدامات کیے جاتے ہیں، جس کو مودبانہ انداز میں گذارش کی جاتی ے کہ نظر انداز کیا گیا، قابلِ پیروی نہیں سمجھا گیا کہ ملزمان کے خلاف مبینہ قابلِ گرفتِ قانون مواد کا الزام عائد کیا جا سکے۔

مزید براں، یہ گذارش کی جاتی ہے کہ پریس اینڈ پبلیکشن آرڈیننس1963 کے سیکشن 37، 38 اور 39 میں شامل لازمی شرائط کی عدم تکمیل، تمام تر کارروائی کو لغو، غیر قانونی اور بے سروپا بنا دیتی ہے۔ یہ بھی گوش گذار کیا گیا ہے کہ استغاثہ کے گواہان نے تسلیم کیا ہے کہ مبینہ قابلِ گرفت قانون مواد پر دستخط نہیں کیے گئے تھے، نہ ہی ان پر کوئی علامتی نشان ثبت کیا گیا تھا۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ مبینہ مواد بستر کی چادروں میں لپیٹا گیا تھا اور سربہ مہر، دستخط یا علامت کے بغیر ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہیڈ کوارٹر میں فوجی افسر کے سپرد کیا گیا تھا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ مبینہ مواد کہاں رکھا گیا تھا یا اس کو تبدیل کیا گیا ہوگا۔ استغاثہ کے گواہان نے تسلیم کیا ہے کہ انکے لئے یہ کہنا مشکل ہوگا کہ یہ وہی مواد ہے یا نہیں جو مبینہ طور پر برآمد کیا گیا تھا۔

مزید یہ گوش گذار کیا جاتا ہے کہ نہ صرف قانونی تقاضاؤں کی پامالی کی گئی ہے بلکہ گرفتاریوں، مبینہ برآمدگیوں، مبینہ مشیر ناموں کی تیاری، ملزمان کو تحویل میں رکھنے، انکی نظربندیوں، تحویل میں کیے گئے برتاؤ، نام نہاد اعترافی بیانات حاصل کرنا اور یہاں تک کہ اس مقدمے میں گرفتار ایک شخص نذیر عباسی کی تحویل میں موت پر کوئی کھلی جانچ نہ کرنے کے حوالے سے متعین تمام تر اصولوں اور طور طریقوں کی مسلسل خلاف ورزی کی جاتی رہی ہے۔

انہیں رات کی تاریکی میں نامعلوم افراد نے انکے رشتہ داروں کو مطلع کیے بغیر دفن کر دیا، بلکہ انکی بیگم کی گرفتاری کے وارنٹ تک جاری کر دیئے۔ ایک ترقی پسند نوجوان شخص کی یہ پراسرار موت انکی موت کے ذمہ داران کا واضح عندیہ دیتی ہے۔ نذیر عباسی کی موت اور استغاثہ کی جانب سے اس مقدمے کی کارروائی کے دوران تمام تر ضوابط اور قوانین کو پس پشت ڈالنا انکی جانب سے ایک بے بنیاد مقدمے کی کارروائی کے انکے جرم کو چھپانے کی ایک کوشش ہے جو معمولی سی فہم رکھنے والے فرد پر بھی عیاں ہے۔

اس معاملے کو سرد خانے کے سپرد کرنے کی ایک اور کوشش کے دوران 7 مارچ 1981 کو سپرنٹنڈنٹ جیل لانڈھی جناب قاسم علی خوجہ نے تحریری طور پر ملزمان احمد کمال وارثی، غلام شبیر شر، پروفیسر جمال نقوی اور سہیل سانگی سے دریافت کیا کہ، ''اگر انہیں جیل سے رہا کر دیا جائے تو کیا وہ افغانستان چلے جانے کیلئے تیار ہوں گے۔'' یہ بیان مذکورہ صفائی کے گواہ نے عدالت کے روبرو دیا ہے۔ اس حقیقت کو استغاثہ نے جھٹلانے کی کوشش نہیں کی، جس سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا ملزمان کو کسی سیاسی مقصد کے تحت یرغمال بنایا گیا ہے، ورنہ کسی ملک کے شہریوں کو اس طرح کا اقدام اُٹھانے کی پیشکش نہیں کی جاتی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اختیارات کے حامل لوگ ان محبّ وطن شہریوں کو اپنے خلاف جھوٹے اور بے بنیاد مقدمات کے باوجود ملک چھوڑنے پر راضی کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

استغاثہ نے مجسٹریٹ عدالت نمبر XI، جنوبی کراچی کے روبرو تاریخ 31 اگست 1980 اور 28 اگست 1980 کو مبینہ طور پر شریک ملزمان کمال وارثی اور غلام شبیر شر کے مبینہ اعترافی بیانات

پر اپنا مقدمہ کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے۔

شریک ملزمان کے اعترافات دیگر ملزمان کے خلاف قابلِ وزن ثبوت نہیں ہوتے۔ اس لئے کسی ملزم کو صرف شریک ملزم کے اعترافی بیان کی بنیاد پر سزا نہیں دی جاسکتی، اگر اس ضمن میں دیگر مضبوط شواہد پیش نہیں کیے جاتے ورنہ ایسی سزا غیر قانونی ہوگی۔

(1) اے آئی آر، 1956، سپریم کورٹ 56

(2) ان ری میکی، اے آئی آر، ایم اے ڈی 278

(3) 1972، پاکستان لا جنرل، 1302 (اے) 1306

(4) پی ایل ڈی، 1973 لاہور 563، صفحہ 565 پر

دوسری صورت میں بھی اعترافی بیانات رضاکارانہ نہیں تھے بلکہ دباؤ کے ذریعے حاصل کیے گئے۔ ملزم شبیر شر کو مسلسل جگایا گیا اور بعدازاں بیان دینے کیلئے لے جایا گیا۔ استغاثہ کا گواہ نمبر 9 محمد امین جمالی واضح طور پر عدالت میں ملزمان کی شناخت میں ناکام رہا۔ اُس نے تسلیم کیا کہ ملزمان کو انتباہ کے ضمن میں، گواہی کا خلاصہ ریکارڈ کرتے ہوئے اس نے اپنے بیان میں اضافہ کیا ہے۔

واضح طور پر، دونوں ملزمان کی تحویل کے ضمن میں سب انسپیکٹر زبیر کی جانب سے اختیارات کا حامل کوئی لیٹر پیش نہیں کیا گیا۔

استغاثہ کا گواہ نمبر 9 اردو لکھنا نہیں جانتا تھا لیکن اس نے کمال وارثی کا بیان اردو سے انگریزی میں ترجمہ کیا، جبکہ شبیر شر نے بیان تو سندھی میں دیا لیکن یہ تحریر انگریزی میں کیا گیا۔

خود استغاثہ کے گواہ نمبر 9 کے مطابق دو سے تین دن تک نیند سے محروم رکھنا، تشدد کے زمرے میں آتا ہے، اس امر کیلئے کافی ہے کہ بیان رضاکارانہ بنیاد پر نہیں تھا۔ شبیر شر کے بیان کے صفحہ نمبر 2 پر دستخط کی عدم موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ یہ کاغذات بعدازاں اعترافی بیان میں شامل کیے گئے جبکہ اصل پھاڑ کر پھینک دیئے گئے۔

واضح طور پر مذکورہ بیانات پر عدالتی مہر نہیں ہے، اور نہ ہی ان کے اختتام پر حاشیہ، جو کہ سیکشن

(3)164 سی آر پی سی کے تحت قانوناً لازمی ہے۔

استغاثہ کے گواہ نمبر 9 نے تسلیم کیا کہ اعترافی بیانات مقدمہ چلانے والی عدالت کو بھیجنے کے بجائے سٹی کورٹس کے ریکارڈ کیپر کو ارسال کیے گئے جو کہ سیکشن (2)164 سی آر پی سی کی خلاف ورزی ہے اور یہ بظاہر سر بہ مہر بھی نہیں تھے۔ یہ بھی تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ استغاثہ کے گواہ نمبر 9 نے یہ بیانات کھلی عدالت میں ریکارڈ نہیں کیے تھے۔ استغاثہ کے گواہ نمبر 9 نے یہ بھی تسلیم کیا کہ مبینہ بیانات ریکارڈ کرنے کے بعد اس نے ملزمان کو سب انسپکٹر زبیر کے حوالے کیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ نارتھ ناظم پولیس اسٹیشن استغاثہ کے گواہ نمبر 9 کی حدود میں نہیں آتا پھر بھی اعترافی بیانات ریکارڈ کرنے کیلئے انہیں منتخب کیا گیا۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں اعترافی بیانات مشکوک ہو جاتے ہیں اور ان اعترافی بیانات کے مشکوک ہونے کی وجہ سے اس معزز عدالت کو ملزمان کے حق میں ہونا چاہئے۔

اے آئی بی 1925، کلکتہ 587

یہ اعترافات حاصل کیے گئے اعترافات ہیں اور انکو سزا دینے کیلئے استعمال نہیں کیا جا سکتا، تاوقتیکہ تائید میں ٹھوس مواد ثبوت کے طور پر پیش نہیں کیا جاتا اور ثبوت کا مواد میسر نہیں ہے۔

پی ایل ڈی 1958، ڈھاکہ 75 (ای) صفحہ نمبر 891 پر

پی ایل ڈی 1968، پشاور 23 صفحہ 28 بی پر

(جسٹس فیض اللہ کنڈی)

قانون میں شریک ملزم کا اعتراف تائیدی ثبوت کے بغیر قابلِ غور نہیں ہے۔

پی ایل ڈی 1974، نوٹ 89، صفحہ 148، صفحہ 149 پر

جہاں اعتراف ریکارڈ کرنے کیلئے زیادہ وقت لیا گیا ہے، جیسا کہ اس معاملے میں ہوا ہے، عدالت بھی تسلیم کرے گی کہ وقت کو اعتراف کرنے والے سے اعتراف حاصل کرنے کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔

پی ایل ڈی 1960، پشاور T4، (c) (d) (e) پر

واضح طور پر استغاثہ کے گواہ نمبر 9 کی جانب سے اعترافات ریکارڈ کرنے سے قبل بنیادی قانونی تقاضے پورے کرنے میں ناکامی سامنے آتی ہے، جو کہ ملزمان کے اعترافات کو ناقابلِ قبول اور غیر رضاکارانہ کردیتی ہے۔

پی ایل ڈی 1975، سی آر سی لاہور 353 (بی)

ملزمان کو انتباہ دینا سیکشن 164(3) سی آر پی سی کی خلاف ورزی ہے، یہ امر اعتراف کو بے اثر بنادیتا ہے۔

پی ایل ڈی 1971، لاہور، صفحہ 850 (بی)

جسٹس عبداللہ سجاد، جسٹس مشتاق حسین اور جسٹس محمد منیر پر مشتمل لاہور ہائی کورٹ کا فل بینچ

مبینہ اعترافات اس امر کا عندیہ نہیں دیتے کہ مجسٹریٹ استغاثہ کے گواہ نمبر 9 نے اعترافات کے رضاکارانہ طور پر یا اسکے برعکس ہونے کا معلوم کرنے کی کوشش کی، اس طرح یہ اعترافات اپنی گواہی کے طور پر قدر گنوا بیٹھے ہیں۔

1972 پاکستان کرمنل لا جرنل 81 (اے) (بی) (ڈویژنل بینچ)

اعترافات انگریزی میں ریکارڈ کیے گئے اور واضح طور پر اسکا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ دستخط کرنے سے قبل یہ ملزمان کو ترجمہ کرکے سنائے گئے، اس لئے ان کو قابلِ بھروسہ نہیں سمجھا جاسکتا۔

1972 پاکستان کرمنل لا جرنل، نوٹ 112، صفحہ نمبر 71، صفحہ نمبر 72 پر

(جسٹس زیڈ اے چنا کا فیصلہ)

واضح طور پر سیکشن 164(1) اور 364 کی مکمل عدم تکمیل کی صورت میں اعترافات ناقابلِ تسلیم اور ناقابلِ قبول ہوں گے۔

پی ایل ڈی 1950 لاہور، صفحہ 68 (اے)

سیکشن 164 کی لازمی تقاضہ کی خلاف ورزی سیکشن 533 سی آر پی سی کے تحت قابلِ داد رسی نہیں ہے۔

1969 پاکستان کرمنل لا جرنل 463 (اے)

جیسا کہ استغاثہ کے گواہ نمبر 9 کا کہنا ہے کہ مبینہ اعترافات کے بعد ملزمان کو سب انسپیکٹر زبیر استغاثہ کا گواہ نمبر 5 کے سپرد کیا گیا، اعترافات کی رضا کارانہ نوعیت کی نفی کرتا ہے۔

پی ایل ڈی 1960، کراچی 674 ,(a) (b) (f) پر

جیسا کہ استغاثہ کے گواہ نمر 9 نے بتایا ہے کہ اعترافرات درج کیے جانے سے قبل ملزمان طویل عرصے تک مارشل لا اختیاری والوں کی تحویل میں تھے، اعترافات کے غیر رضا کارانہ ہونے کا تعین کرنے کے لئے کافی ہے، تاوقتیکہ اسکی وضاحت نہ کی جائے، جو کہ اس معاملے میں نہیں کی گئے ہے۔

پی ایل ڈی 1956، سپریم کورٹ 186 (a) اور (b)

عدالت کو اطمینان دلانا کہ اعترافات آزادانہ اور رضا کارانہ طور پر اور کسی اثر رسوخ کے بغیر کیے گئے ہیں، استغاثہ کی ذمہ داری ہے۔

(1) (1893) 2 کیو بی 2 صفحہ 18 پر

(2) اے آئی آر 52 سپریم کورٹ 354

مندرجہ بالا سے غیر متعلقہ رہتے ہوئے بھی، کسی طور حاصل کیا گیا اعتراف شریک ملزم/ملزمان کے خلاف استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

1971، ڈی ایل سی، 588 (b)

مودبانہ گذارش میں یہ عرض کیا جا تا ہے کہ پیش کردہ مبینہ اعترافات قانون کی نظر میں اعترافات قطعی نہیں ہیں اور نہ ہی قابلِ قبول ہیں اوران پر انحصار نہیں کیا جاسکتا۔

استغاثہ کی مکمل گواہی کا چابکدستی سے جائزہ لینے کے بعد جس میں دس پولیس کانسٹیبلز، سب انسپیکٹر ز، جن میں سے ایک تفتیشی اہلکار بھی تھا جبکہ صرف چار عام شہریوں سے تعلق رکھتے ہیں، اس نوعیت کے اہم مقدمے میں استغاثہ عام شہریوں سے کوئی مشیر بھی حاصل نہیں کرسکا۔ انہیں غلط بیانی کرنے کیلئے انتہائی داغدار، قیاس آرائی پرمبنی بیانات دیئے گئے، جس دوران مکمل طور پر انکی زبانی گواہی پر انحصار کیا گیا، جو کہ قانون سے صریحاً متضاد عمل ہے۔

اے آئی بی 1923، ایل 333، صفحہ 334 پر

یوں بھی مقدمے کا ریکارڈ ظاہر کرتا ہے کہ ایک جانب یہ پولیس کانسٹیبلز اور سب انسپکٹرز ہیں تو دوسری جانب پاکستان کے قومی رہنما، نامور پروفیسرز، صحافی، وکلا، اساتذہ اور اعلیٰ سرکاری ملازمین ملزمان کے حق میں پیش ہوئے جنہوں نے اپنے بیانات میں کسی قابلِ اعتراض مواد یا کسی نوعیت کی منافرت یا عدم اطمینانی کا باعث بننے والے مواد کی واضح طور پر نفی کی ہے۔ انہوں نے ملزمان کی بے گناہی کی گواہی دی ہے اور انکی ساکھ کو معتبر ٹھہرایا ہے۔

ملزمان کے حق میں اس گواہی کی موجودگی میں، کسی تردید کے خوف کے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ استغاثہ مارشل لا ضوابط نمبر 4، 13، 18، 36 اور پاکستان پینل کوڈ کے سیکشن 24 اے، 149 کے تحت الزامات کے حق میں کوئی ثبوت پیش کرنے یا اپنا مقدمہ ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے۔

تاہم مندرجہ بالا کو مدِ نظر رکھے بغیر بھی، پیش کیے گئے ثبوتوں کا تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ ملزمان کے خلاف الزامات کے حق میں کوئی ٹھوس گواہی پیش نہیں کی گئی ہے۔ گواہی/ثبوت ان لوگوں کی بے گناہی کا اعلان ہیں۔

استغاثہ کے گواہان

سے

وکلاءصفائی کی جرح

7 فروری 1982

استغاثہ گواہ نمبر 1: امام بخش ایگزامنیشن انچیف

اعتراض: میجر طفیل پہلے اپنی پوزیشن واضع کریں

سب انسپکٹر امام بخش ولد محمد عرس، عمر 35 سال، ساکن 11/4 نیو کراچی

سوال: 30 جولائی 1980 کو آپکی تعیناتی کہاں تھی؟

30 جولائی 1980 کو رات 8 بجے میں اسسٹنٹ سب انسپکٹر کے طور پر نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن پر تعینات تھا۔ مجھے ایک لیٹر نمبر 320/56/ML بتاریخ 30 جولائی 1980، بمعہ دستخط میجر طفیل ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر دفتر موصول ہوا، جس پر ایس ایچ او کی جانب سے مقدمہ درج کرنے کی ہدایت درج تھی۔ میں نے اس لیٹر کی بنیاد پر ایف آئی آر درج کی اور اس خط کے مندرجات جوں کے توں اس میں شامل کیے۔ میں نے عدالتی دستاویز 'N' میں مذکورہ ایف آئی آر دیکھی ہے اور یہ بالکل درست ہے۔ میں نے خط کی اصل کاپی، ایف آئی آر سمیت ایس ایچ او صفدر علی بھٹی کے سپرد کی، کیونکہ اس مقدمے کی تفتیش ڈی ایم ایل اے ٹیم نے کرنی تھی (استغاثہ نے لیٹر کی فوٹو کاپی داخل کرنے کی کوشش کی۔ سہیل سانگی کے وکلا صفائی جناب لغاری اور جناب منشی نے اعتراض کیا)۔ لیٹر کی اصل کاپی عدالت میں پیش نہیں کی گئی کیونکہ یہ پولیس ریکارڈ میں موجود نہیں ہے۔ (صفائی کے وکلا کے اعتراضات بحال رکھے گئے)۔

جناب لغاری کی جانب سے جرح

مذکورہ لیٹر ایک کانسٹیبل لایا تھا۔ نہ تو ڈی ایم ایل اے دفتر سے اور نہ ہی ایس ایچ او کے دفتر سے کوئی میرے دفتر میں موجود تھا۔ ایف آئی آر میں ایک کالم ہوتا ہے جس میں شکایت کنندہ کا نام درج کیا جاتا ہے۔ میجر طفیل کا نام وہاں درج نہیں تھا۔ شکایت کنندہ میجر طفیل کو ایف آئی آر پڑھ کر نہیں سنائی گئی۔ عدالتی دستاویز N (ایف آئی آر) میں حذف/اضافہ میں نے ایس ایچ او کی ہدایت پر کیا، جنہوں نے مجھے ہدایت کی کہ چونکہ ڈی ایم ایل اے ٹیم تفتیش کرے گی چنانچہ تحقیقاتی ٹیم کے بجائے 'ڈی ایم ایل اے ٹیم' کا اندراج کیا جائے۔ میں نے اندراج کے پانچ سے دس منٹ کے اندر مذکورہ ایف آئی آر ایس ایچ او کے حوالے کر دی تھی۔

4 فروری 1982

استغاثہ کا گواہ نمبر 4

ایگزامنیشن انچیف

دولت خان پولیس کانسٹیبل ولد لال خان

29 جولائی 1980 کو میں پولیس کانسٹیبل کے طور پر آرٹلری میدان پولیس اسٹیشن پر تعینات تھا۔ مجھے اور ہیڈ کانسٹیبل فیاض کو ایس ایچ او فضل الرحمان نے سب انسپکٹر اسلم نور کے ہمراہ ایم پی اے ہاسٹل جانے کی ہدایت کی۔ مجھے سب انسپکٹر اسلم نور نے باہر برآمدے میں انتظار کرنے کیلئے کہا اور وہ خود اوپری منزل پر بیٹھے ہوئے میجر کے پاس گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دو اور لوگ سب انسپکٹر اسلم نور کے ہمراہ نیچے آئے۔ اُن میں سے ایک مجسٹریٹ تھا اور سادہ کپڑوں میں ملبوس دوسرے شخص کا مجھے نہیں معلوم۔ میں سب انسپکٹر اسلم نور، ہیڈ کانسٹیبل فیاض، ڈرائیور، مجسٹریٹ اور سادہ کپڑوں میں دوسرے شخص کے ہمراہ جیپ پر سوار ہوا اور پیپلز کالونی، نارتھ ناظم آباد روانہ ہوئے۔ ہم نے نشاندہی کیے ہوئے گھر سے کچھ قدم دور اپنی گاڑی روکی، اس گھر کی نشاندہی سادہ کپڑوں میں ملبوس شخص نے کی تھی، جو اس کے بعد گم ہوگیا۔ مجسٹریٹ نے دروازہ دھکیلا اور ہم گھر کے اندر داخل ہوئے۔ جب میں چھاپہ مارنے والی پارٹی کے ہمراہ گھر کے اندر داخل ہوا تو میں نے ایک کمرے میں دو افراد کو دیکھا، جن میں سے ایک لیٹا ہوا تھا جبکہ دوسرا کچھ لکھ رہا تھا۔ میں دونوں ملزمان کو شناخت کر پا رہا ہوں جو کہ میرے سامنے عدالت میں موجود ہیں۔ میں نے کچھ پمفلٹ / کاغذ وہاں دیکھے جو ٹائپ مشین، سیاہی وغیرہ کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ مجسٹریٹ اور سب انسپکٹر اسلم نور نے وہ پمفلٹ پڑھے اور مجھے بتایا کہ یہ مواد حکومت مخالف تھا۔ سب انسپکٹر اسلم نور نے وہیں پر برآمدگی کا مشیر نامہ تیار کیا اور مجھ سے دستخط لئے۔ میں برآمدگی کا مشیر نامہ دیکھ رہا ہوں جس پر میرے دستخط ہیں جو کہ عدالتی دستاویز ایم 1 میں شامل ہے۔

ساڑھے تین بجے ہم پیپلز کالونی پہنچے اور تقریباً پانچ بجے وہاں سے نکلے۔ جس کے بعد میں چھاپہ مارنے والی بقیہ پارٹی کے ہمراہ دونوں ملزمان اور برآمد کیے گئے مواد کے ساتھ پاکستان کوارٹرز روانہ ہوا۔ اس گھر کی ملزمان میں سے ایک نے نشاندہی کی۔ گھر کی چابیاں اُن میں سے ایک کے پاس تھیں جس نے دروازہ کھولا اور ہم گھر کے اندر داخل ہوئے اور پمفلٹ، کاغذات وغیرہ کی صورت میں ویسا ہی مواد پایا۔ سب انسپکٹر اسلم نور نے برآمدگی کا مشیر نامہ تیار کیا اور مجھ سے اس پر دستخط لئے۔ پاکستان کوارٹرز سے نکل کر ہم تقریباً ساڑھے سات بجے دونوں ملزمان اور برآمد شدہ مواد کے ہمراہ ایم پی اے ہاسٹل پہنچے۔ ہم نے تحویل میں لی گئی اشیا اور ملزمان فوجی اہلکاروں کے سپرد کئے۔ میں نے ان سے برآمد کئے گئے پمفلٹ اور رسالے نہیں پڑھے۔

سید عبدالودود کی جرح

اس عدالت سے قبل، جیل میں بھی گواہی ریکارڈ کی گئی تھی۔ میں گواہی کا خلاصہ دیکھ رہا ہوں جس پر میرے دستخط ہیں۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ میں عدالت میں غلط بیانی کر رہا ہوں۔ مجھے گواہی کا بیان پڑھ کر سنایا گیا تھا جو گواہی کے خلاصے میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ عدالت نے گواہی کے خلاصے کا معائنہ کیا۔ تیسری سطر جس میں یہ درج ہے کہ اسکوایس ایچ او چودھری نذیر نے سب انسپکٹر اسلم نور کے ساتھ جانے کی ہدایت کی پر گواہ کا کہنا تھا کہ یہ کتابت کی غلطی ہے، اسکوایس ایچ او فضل الرحمان نے ایسی ہدایت کی تھی۔ عدالت نے گواہی کے خلاصے کی ساتویں سطر کا جائزہ لیا جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ سب انسپکٹر اسلم نور اُسکو اور کانسٹیبل محمد طفیل کو چھوڑ کر دفتر کے اندر گیا۔ گواہ کا کہنا تھا کہ یہ بھی کتابت کی غلطی ہے، دراصل یہ ہیڈ کانسٹیبل فیاض ہونا چاہئے تھا۔ اسلم نور نے مجھے جیپ میں سوار ہونے کیلئے کہا۔ سب انسپکٹر نے ہمیں نہیں بتایا کہ ہمیں کہاں جانا تھا۔ ہم جس جیپ پر سوار تھے وہ سرکاری تھی، وہ فوج کی تھی۔ اس جیپ میں، میں، فیاض، اسلم نور، مجسٹریٹ، مخبر اور ڈرائیور سوار تھے۔ ڈرائیور یونیفارم میں نہیں تھا۔، مجسٹریٹ آگے والی نشست پر بیٹھا۔ میری موجودگی میں کوئی تحریری یا زبانی حکم نہیں دیا گیا تھا۔ میرے اور فیاض کے علاوہ کوئی دوسرا کانسٹیبل

نہیں تھا۔ مجھے جیپ کا نمبر اور ماڈل معلوم نہیں ہے۔، مجسٹریٹ اور اسلم نور نے ڈرائیور سے نارتھ ناظم آباد چلنے کیلئے کہا۔ ہم نے اپنے ساتھ کوئی ذاتی اسلحہ نہیں اُٹھایا تھا اور ہمارے پاس قطعی طور پر کچھ بھی نہیں تھا۔ شاید، مجسٹریٹ کے پاس قلم اور کاغذ ہی تھے۔ نشاندہی کیا ہوا گھر ہمارے جیپ روکنے کے مقام سے پچاس قدم کے فاصلے پر ہوگا۔ دروازہ خود، مجسٹریٹ نے ہی کھولا تھا۔ ہم نے دیوار نہیں پھلانگی تھی۔ اس گھر کے آگے اور پیچھے دوسرے گھر تھے۔ ہم پہلو سے آئے تھے۔ دروازے سے ہم صحن میں داخل ہوئے، جس کے بعد کمرے میں داخل ہوئے۔ مرکزی دروازہ براہ راست صحن میں کھل رہا تھا۔ ہم کچھ دیر کیلئے صحن میں رُکے۔ پہلے، مجسٹریٹ اور اسلم نور داخل ہوئے اور بعد میں انہوں نے ہمیں اندر آنے کیلئے آواز دی۔ دونوں ملزمان کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔، مجسٹریٹ اور اسلم نور دونوں کھڑے ہوئے تھے جبکہ دونوں ملزمان زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ملزمان نے کچھ نہیں کہا اور نہ ہی کسی قسم کے طیش کا اظہار کیا۔ مخبر گھر کے اندر نہیں آیا تھا۔

مذکورہ گھر میں ایک کمرہ اور باورچی خانہ تھے۔ کمرے کا کوئی دروازہ نہیں تھا اور ملزمان کو باہر سے دیکھا جا سکتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ صحن میں درخت یا باغیچہ تھا۔ صحن میں کنواں نہیں تھا۔ صحن میں پانی کی ٹنکی بھی نہیں تھی۔ یہ گھر سیمنٹ کے بلاکوں سے بنا ہوا تھا جسکی چھت سیمنٹ سے رنگی ہوئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ چھت پکی تھی یا چھپر والی۔ مجھے نہیں معلوم کہ جس جگہ ہم نے جیپ چھوڑی تھی وہاں سے گھر تک کا راستہ کچہ ہے یا پکا۔ ہم گھر کی جانب اکیلے ہی گئے تھے، ہمارے پیچھے/تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ میں اور فیاض سادہ کپڑوں میں تھے جبکہ اسلم نور یونیفارم میں تھا۔ میں پولیس اسٹیشن پر موجودگی کی ڈیوٹی (Runner) پر تھا جبکہ فیاض اُن دنوں اسپیشل پولیس میں تھا۔ چھاپہ مارے جانے والے گھر کے قرب و جوار میں کوئی بھی نہیں تھا۔ مشیر نامہ جائے وقوعہ پر تیار کیا گیا اور اسکے بعد ہم نے مواد/اشیا کو سمیٹا۔ مجھے نہیں معلوم کہ، مجسٹریٹ نے سوالات پوچھے یا کوئی پوچھ گچھ کی تھی۔، مجسٹریٹ نے ہمیں بتایا کہ انہوں نے ان لوگوں کی گرفتاری کا حکم دیا ہے اور ہمیں انہیں گرفتار کر کے جیپ میں لے جانے کا حکم تھا۔ میں تیسری جماعت تک پڑھا ہوا ہوں اور

دستخط کرنے کے علاوہ لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ کسی نے بھی ملزمان کو کوئی حکم نامہ نہیں دکھایا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کتابچوں اور کھُلے کاغذات میں کیا تھا۔ہم نے ملزمان کے بستر کی چادر میں مواد جمع کیا۔ میں نے ملزمان میں سے کسی کی جامہ تلاشی نہیں لی تھی۔ مجھے پیپلز کالونی میں گھروں کی تعداد کا علم نہیں ہے۔ میں عدالت کو پیپلز کالونی کے گھر کی نشاندہی کرسکتا ہوں۔ اس گھر کے سامنے ایک نالہ تھا اور اسکے دو اطراف اور عقب میں کچھ گھر ہیں۔ ہم کوئی پانچ بجے شام پیپلز کالونی سے نکلے اور کوئی ساڑھے پانچ بجے پاکستان کوارٹرز پہنچے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ ہم کس راستے سے پاکستان کوارٹرز گئے تھے۔ میں گذشتہ 26 برس سے کراچی میں تعینات ہوں۔ پاکستان کوارٹرز لسبیلہ کے قریب جمشید کوارٹرز کے علاقے میں واقع ہیں۔ یہ سرکاری کوارٹرز ہیں جو کہ سرکاری ملازمین کیلئے مختص ہیں۔ پاکستان کوارٹرز کے گھر کی نشاندہی کیلئے ہمارے ساتھ کوئی مخبر نہیں تھا۔ مجسٹریٹ ہمارے ساتھ تھا۔ ہم تالا کھول کر دونوں ملزمان کے ہمراہ گھر میں داخل ہوئے۔ وہاں پر کئی چیزیں تھیں جو جمع کر کے جیپ میں ڈالی گئیں۔ میں مجسٹریٹ اور اسلم نور کے ہمراہ ایم پی اے ہاسٹل پہنچا۔ جیپ کو ایم پی اے ہاسٹل کے اندر لے جایا گیا۔ میں، فیاض، اسلم نور، مجسٹریٹ اور دو ملزمان ایم پی اے ہاسٹل پہنچے۔ میں اور فیاض ملزمان کے ساتھ بیٹھے رہے جبکہ اسلم نور اوپر گیا اور واپس آ کر ہمیں حکم دیا کہ ہم برآمد کی گئی اشیا اور ملزمان فوجی اہلکاروں کے سپرد کردیں۔ مجھے ایم پی اے ہاسٹل پہنچنے کے بعد مجسٹریٹ کی موجودگی کا علم نہیں ہے۔ ایم پی اے ہاسٹل میں ہم تیس سے چالیس منٹ کیلئے تھے۔ میں نے مضامین کے مندرجات نہیں پڑھے تھے، میں نے صرف مشیر نامے پر دستخط کیے تھے۔ میں تو نہیں گیا تھا تاہم فیاض مشیران کو لانے کیلئے باہر گیا تھا تاہم کوئی بھی میسر نہیں تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ہم پیپلز کالونی یا پاکستان کوارٹرسز گئے ہی نہیں تھے اور برآمدگی کا مشیر نامہ نہ تو جائے وقوعہ پر تیار کیا گیا تھا اور نہ ہی وہاں پر دستخط کیے گئے تھے۔

8 فروری 1982

یوسف لغاری ایڈووکیٹ کی دولت خان سے جرح

پیپلز کالونی میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد رہائش پذیر ہے۔ مذکورہ گھر کی جانب جاتے ہوئے راستے میں دکانیں نہیں ہیں اس لئے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ ایک مصروف راستہ ہے۔ میں 29 جولائی 1980 کو آرٹلری میدان پولیس اسٹیشن پر تعینات تھا۔ پریڈی اسٹریٹ پولیس اسٹیشن اس سے بالکل علیحدہ ہے۔ میں نے خود اُس دن تھانے سے روانگی کا اندراج نہیں کیا تھا تاہم میری آمد کا اندراج موجود ہے۔ میں نے صبح آٹھ بجے تھانے پر اپنی آمد کی اطلاع دی۔ میں ایس ایچ او آرٹلری میدان پولیس اسٹیشن کا آفس رنر تھا۔ اس مقدمے سے قبل میں کبھی بھی ایس ایچ او کے ہمراہ کسی تفتیش پر نہیں گیا۔ فضل الرحمان اس وقوعے سے دو یا تین ماہ قبل وہاں تعینات ہوا تھا۔ ایس ایچ او چودھری نذر نے چارج فضل الرحمان کے سپرد کیا تھا۔

میں نے چھاپوں کے بعد کوئی اندراج نہیں کیا۔ مجھے فوجی اہلکاروں کے نام یاد نہیں ہیں نہ ہی میں انکو شناخت کرسکتا ہوں جنکو میں نے ملزمان حوالے کیے تھے۔

پیپلز کالونی سے پاکستان کوارٹرز جانے والوں میں پولیس کانسٹیبل دولت خان، ہیڈ کانسٹیبل محمد فیاض، سب انسپکٹر اسلم نور، مجسٹریٹ، ڈرائیور اور دو ملزمان شامل تھے۔ اسلم نور نے مجھے پمفلٹ پڑھ کر سنائے۔ مجھے ان پمفلٹوں کے نام معلوم نہیں ہیں جو مجھے پڑھ کر سنائے گئے۔ میں فرق نہیں کرسکتا کہ کون سا مجھے پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ مجھے پڑھ کر سنائے جانے والے پمفلٹ کا کوئی حصہ یاد نہیں ہے۔ میں پڑھ کر سنائے جانے والے مواد کے مندرجات پر رائے دینے سے قاصر ہوں۔ میں برآمدگی کے مشیر نامے میں بستر کی چادروں کے اندراج کے متعلق کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ میں اُن بستر کی چادروں کی تعداد بتانے سے قاصر ہوں جن میں برآمد کی گئی اشیا باندھی گئی تھیں۔ میں ان چادروں کے رنگ سے متعلق کچھ بتانے سے قاصر ہوں۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ برآمد کی گئی اشیا میں سے کوئی چیز لا پتہ ہے، نہ ہی یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس میں کوئی چیز شامل کی گئی

ہے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ عدالت میں پیش کی گئی اشیا وہی ہیں جو چھاپوں میں برآمد کی گئی تھیں۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ ان برآمد شدہ اشیا کی کتنی گٹھڑیاں بنائی گئی تھیں۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ کون سی اشیا کس گٹھڑی میں ڈالی گئی تھیں۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ پاکستان کوارٹرز سے برآمد ہونے والی اشیا کی کتنی گٹھڑیاں بنائی گئی تھیں۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں ہے کہ پاکستان کوارٹرز سے برآمد ہونے والی اشیا بستر کی چادروں میں باندھی گئی تھیں یا کسی اور کپڑے میں۔ پاکستان کوارٹرز میں بڑی تعداد میں گھر ہیں۔ میں پیپلز کالونی اور پاکستان کوارٹرز سے برآمد ہونے والی اشیا میں تفریق نہیں کر سکتا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ کون سی چیز کس ملزم سے برآمد کی گئی تھی۔

میں جیپ کا رنگ اور ماڈل نہیں بتا سکتا اور نہ ہی ڈرائیور کا نام جانتا ہوں۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ اسلم نور کی جانب سے کتنے کاغذات مجھے دستخط کرنے کیلئے دیئے گئے تھے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ کتنے مشیر نامے مجھے پڑھ کر سنائے گئے تھے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ کون سا مشیر نامہ مجھے پڑھ کر سنایا گیا تھا۔

اسلم نور مشیران کو تلاش کرنے کیلئے باہر گیا تھا تاہم اُسکو کوئی نہیں ملا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ پاکستان کوارٹرز کے مذکورہ گھر میں کوئی رہتا ہے یا نہیں۔

یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ مشیر نامے جائے وقوعہ پر تیار نہیں کیے گئے تھے اور یہ کہ میں چھاپہ مارنے والی ٹیم کا حصہ نہیں تھا اور برآمدگی میری موجودگی میں نہیں ہوئی تھی۔

مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے اپنے بیان میں یہ بتایا ہے کہ دو مخبر کب اور کہاں ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تھے، نہ ہی کہ میں نے اُن بستر کی چادروں کا ذکر کیا ہے جن میں برآمد کی گئی اشیا باندھی تھیں۔

عدالت نے گواہی کے خلاصے میں دیئے گئے بیان کا جائزہ لیا۔

گواہی کا خلاصہ مجھے درج کرنے والے اہلکار نے اُس زبان میں پڑھ کر سنایا جو میں سمجھتا ہوں۔ میں نے گواہی کے خلاصے پر اُس وقت ہی دستخط کیے تھے جب میں نے اسکو درست سمجھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں ایس ایچ او فضل الرحمان کا خاص آدمی ہوں اس لئے میں نے یہ بیان دیا ہے۔

8 فروری 1982 کو چائے کے وقفے کے بعد

شفیع محمدی ایڈووکیٹ کی جاری جرح

میں نے رضا کارانہ ریٹائرمنٹ کی درخواست دی ہوئی ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے کمزور یادداشت کی وجہ سے ریٹائرمنٹ کی درخواست کی ہے بلکہ میری اب بھی اچھی یادداشت ہے۔ مجھے 29 جولائی 1980 کا دن یاد نہیں ہے۔ اسلم نور نے مجھے اور فیاض کو کچھ دیر کے بعد اندر داخل ہونے کیلئے کہا تھا۔ جب میں اور فیاض گھر کے اندر داخل ہوئے تو مجسٹریٹ اور اسلم نور برآمدے میں تھے۔ کمرے کے دروازے اور اسلم نور کے درمیان دو یا تین قدم کا فاصلہ تھا۔ گواہی کا خلاصہ چار یا پانچ ماہ بعد ریکارڈ کیا گیا تھا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ آیا کوئی باہر مشیر کی تلاش میں گیا تھا تاہم میں باہر نہیں گیا تھا اور اندر ہی رہا تھا۔ پاکستان کوارٹرز میں باہر گیا تھا تاہم مجھے باہر نہیں بھیجا گیا تھا۔ مجھے دوسروں کا یاد نہیں ہے۔ میں پاکستان کوارٹرز سے مرکزی شاہراہ کے فاصلے سے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ کہنا قطعی طور پر غلط ہوگا کہ مجسٹریٹ نے مجھے دیوار پھلانگنے کیلئے کہا تھا۔ یہ کہنا مکمل طور پر غلط ہوگا کہ دروازے پر کنڈی لگی ہوئی تھی اور ہم نے دروازے پر دستک دی تھی۔

کمرے میں کرسیاں اور چارپائی نہیں تھیں اور ملزمان زمین پر بیٹھے تھے، وہاں پر صوفہ یا پلنگ نہیں تھے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ اسلم نور نے مشیر نامہ کھڑے ہوکر بنایا تھا یا چارپائی پر بیٹھ کر۔ دونوں ملزمان ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے تاہم مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا کر رہے تھے۔

میں نے یہ اس سے قبل اندراج کرنے / ریکارڈ کرنے والے افسر کو بھی بتایا تھا۔ میں نے ایس ڈی ای کے سامنے اپنا بیان ریکارڈ کراتے ہوئے کچھ بھی مخفی نہیں رکھا تھا۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ جو میں نے بیان کیا ہے وہ مکمل طور پر یاد تھا۔

11فروری 1982

استغاثہ کا گواہ نمبر 5

سب انسپکٹر زبیر احمد ولد مرحوم چودھری احمد دین،

ذات کمبوہ، عمر 30 سال، 4/7 فیملی کوارٹرز لیاقت آباد پولیس اسٹیشن، کراچی

انور شیر کی جانب سے اگزامنیشن انچیف

29 جولائی 1980 کو میں نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن پر سب انسپکٹر تعینات تھا اور تقریباً رات دس بجے ایس ایچ او صفدر علی بھٹی نے مجھے حکم دیا کہ میں سرکاری فریضے پر مارشل لا ٹیم کے ساتھ جاؤں۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل شفیق، پولیس کانسٹیبل سعید شاہ اور سکندر اپنے ہمراہ لئے اور مارشل لا ٹیم کے ساتھ پیپلز کالونی روانہ ہوا۔ ہم ایک سرکاری گاڑی پر پیپلز کالونی گئے۔ مجھے جیپ میں گھر نمبر C/19 پیپلز کالونی پر نظر رکھنے کیلئے کہا گیا، جس پر اُسی دن چھاپہ مار کر تخریبی مواد برآمد کیا گیا تھا۔ میجر سلیم جو مارشل لا ٹیم میں سے ہمارے ساتھ جیپ میں تھے، نے مجھے بتایا کہ میری وہاں موجودگی کے دوران انکا نمائندہ سب انسپکٹر ظفر اقبال میرے ہمراہ ہوگا۔ انہوں نے مجھے مزید بتایا کہ اس گھر (C/19) میں داخل ہونے والے ہر فرد کو گرفتار کیا جائے۔ ہم اس گھر میں 29 اور 30 جولائی 1980 کی درمیانی شب رہے۔

30 جولائی 1980 کو صبح ساڑھے نو بجے ایک شخص وہاں آیا جس کا نام بعدازاں نذیر عباسی معلوم ہوا، جس کو ہم نے گرفتار کیا جبکہ اسکی جامہ تلاشی پر اس سے ایک ہزار روپے، کچھ کاغذات اور کچھ لوگوں کی تصاویر برآمد ہوئیں۔ کوئی پندرہ منٹ بعد ایک اور شخص اس گھر میں داخل ہوا، جس کا نام بعدازاں پروفیسر جمال الدین نقوی معلوم ہوا۔ اسکو بھی گرفتار کیا گیا اور جامہ تلاشی پر ایک جیبی سائیز کی سرخ رنگ کی ڈائری برآمد ہوئی۔ میں نے وقوعے پر دونوں افراد کی حراست کا مشیر نامہ تیار کیا اور مشیران ہیڈ کانسٹیبل شفیق احمد مرزا، پولیس کانسٹیبل سکندر خان، سعید شاہ اور

سب انسپکٹر ظفر اقبال سے اس پر دستخط لئے۔ میں نے بھی اُس مشیر نامے پر دستخط کیے۔ عدالتی دستاویز N کے طور پر جامہ تلاشی کا برآمدگی مشیر نامہ پیش کر رہا ہوں۔ میں نے صبح تقریباً دس بجے دونوں ملزمان بمعہ برآمدگی سب انسپکٹر ظفر اقبال کے حوالے کیے۔ سب انسپکٹر ظفر اقبال ملزمان، برآمدگی کے مشیر نامے اور برآمد کی گئی اشیا کے ساتھ جائے وقوعہ سے روانہ ہو گیا۔ اسکے بعد ہمیں دوسری پارٹی نے فارغ کیا اور سب انسپکٹر ظفر اقبال کو بھی مارشل لا ٹیم کے ایک نمائندے نے فارغ کیا۔ میں نے اپنی ٹیم کے دیگر اراکین کے ہمراہ اپنے پولیس اسٹیشن پر رپورٹ کیا۔

میں ایس ایچ او صفدر بھٹی کے ہمراہ 30 جولائی 1980 کو صبح تقریباً نو بجے ملیر کینٹ میں واقع میجر ضیا کی رہائشگاہ پر قائم سمری ملٹری کورٹ گیا اور چار ملزمان احمد کمال وارثی، شبیر شر، پروفیسر جمال نقوی اور نذیر عباسی کا ریمانڈ حاصل کیا۔ 28 اگست 1980 کو میں نے غلام شبیر شر کو مارشل لاء ٹیم سے لیکر اے سی ایم جناب محمد امین جمالی کی عدالت نمبر 11 میں دفعہ 164 سی آر پی سی کے تحت بیان ریکارڈ کرانے کیلئے پیش کیا۔ اُنکا اعترافی بیان چیمبر میں میری غیر موجودگی میں اُسی دن ریکارڈ کیا گیا۔ میں نے سہ پہر ساڑھے تین بجے شبیر شر کو مجسٹریٹ کے سامنے اعترافی بیان ریکارڈ کرانے کے بعد واپس لیا اور لانڈھی جیل کے ڈیوٹی افسر کے سپرد کیا۔

میں نے 31 اگست 1980 کو ملزم احمد کمال وارثی کو مارشل لاء ٹیم سے لیکر مجسٹریٹ محمد امین جمالی (اے سی ایم نمبر 11) کے روبرو اعترافی بیان ریکارڈ کرانے کیلئے پیش کیا جو چیمبر میں میری غیر موجودگی میں ریکارڈ ہوا۔ میں تقریباً ساڑھے تین بجے عدالت سے نکلا اور لانڈھی جیل روانہ ہوا اور مذکورہ ملزم جیل انتظامیہ کے حوالے کیا۔

19 اکتوبر 1980 کو میں نے مارشل لا ٹیم کے میجر سلیم کی ہدایات پر ریگل چوک صدر بس اسٹاپ پر محمود کی ملکیت والے کتابوں کی اسٹال پر چھاپہ مارا۔ مجھے میجر سلیم نے اس کتابوں کے اسٹال کی ایک رسید دکھائی تھی جو کہ چھاپہ مارے گئے C/19 پیپلز کالونی کے گھر سے برآمد ہوئی تھی۔ میں نے دو مشیران کی موجودگی میں اس کتابوں کے اسٹاک پر چھاپہ مار کر کتابیں برآمد کیں جنکا مشیر نامہ وقوعے پر تیار کیا۔ میں نے اس پر ماسٹر سعود احمد اور نسیم احمد سے دستخط حاصل کئے اور

میں نے بھی اس پر دستخط کیئے۔ میں یہ عدالتی دستاویز 1 کے طور پر پیش کررہا ہوں۔ میں نے برآمد کی گئی اشیاء، برآمدگی کے مشیرنامے سمیت مارشل لا ٹیم کے سپرد کیں۔ میں تمام ملزمان غلام شبیر، پروفیسر جمال نقوی اور احمد کمال وارثی کو شناخت کررہا ہوں جبکہ نذیر عباسی موجود نہیں ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے نذیر عباسی کا انتقال ہو چکا ہے۔

16 فروری 1982 ایگزامنیشن انچیف جاری:

میں عدالتی دستاویز نمبر 2 میں درج مشیرنامے کے مطابق نذیر عباسی سے برآمد ہونے والی اشیا پیش کررہا ہوں۔ عدالت نے رقعوں اور کرنسی کا جائزہ لینے کے بعد گواہ کو واپس کردیئے۔ گواہ نے تین تصویریں اور نو دیگر کاغذات پیش کیئے جو نذیر عباسی سے برآمد ہوئے اور مشیرنامے میں درج ہیں۔ ایک چھوٹی جیبی ڈائری پروفیسر جمال نقوی سے جامہ تلاشی کے دوران برآمد ہوئی، عدالت نے اسکا بھی جائزہ لیا۔ عدالت نے جائزے کے بعد ڈائری گواہ کو واپس کردی۔ علی امجد ایڈووکیٹ نے اعتراض اُٹھایا کہ مبینہ طور پر نذیر عباسی سے برآمد ہونے والے دستاویزات گواہی میں شامل نہیں کی جاسکتیں کیونکہ نذیر عباسی صاحب نہ تو ملزم ہیں اور نہ ہی گواہ بلکہ انکے انتقال کر جانے کا بتایا جارہا ہے۔

اعتراض بحال ہوا اور اشیا گواہ کو واپس کردی گئیں۔

میرے مطابق مارشل لا ٹیم سے مراد ہے وہ تمام افراد جو مارشل لاء انتظامیہ کی جانب سے کسی کام پر تعینات کیے جائیں۔

علی امجد ایڈووکیٹ کی جانب سے جرح

ہم رات تقریباً دس بجے پولیس اسٹیشن نارتھ ناظم آباد سے نکلے اور پندرہ سے بیس منٹ میں پیپلز کالونی پہنچ گئے۔ میں اس گھر پر پہلے کبھی نہیں گیا تھا۔ اس گھر کی نشاندہی سب انسپکٹر ظفر اقبال نے کی تھی۔ گھر کے دروازے کو اندر یا باہر سے کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ گھر لوٹا جا چکا تھا۔ ہم وہاں پر اس پر نظر رکھنے اور وہاں سونے کیلئے گئے تھے۔ میجر سلیم نے

ہمیں حکم دیا تھا کہ اس گھر پر آنے والے ہر فرد کو گرفتار کیا جائے۔ ہمیں حکم تھا کہ ہر ایک کو گرفتار کیا جائے چاہے اس نے کوئی جرم کیا ہو یا نہیں۔ میں اس وقوعے سے قبل پروفیسر جمال نقوی سے واقف نہیں تھا، ہم تو دودھ والے یا پھیری والے کو بھی گرفتار کرتے جیسا کہ ہمیں حکم تھا۔ میں کسی غیر قانونی حکم کی پیروی کرنے کیلئے پابند نہیں ہوں۔ میں نے جمال نقوی کو صرف اس گھر میں داخل ہونے کے جرم میں گرفتار کیا تھا۔ مجھے اس سے قبل مذکورہ گھر سے گرفتار ہونے والے افراد کا علم نہیں تھا، نہ ہی میں انکے کسی دوست، احباب یا رشتہ دار کو جانتا تھا۔ اگر کوئی کسی سے ملنے جاتا ہے تو یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ یہ میرے ذہن میں نہیں آیا کہ ہوسکتا ہے کہ پروفیسر جمال نقوی اس گھر کے مکینوں سے رسماً ملنے آئے ہوں۔ میں نے پولیس اسٹیشن ڈائری میں گرفتاریوں کا اندراج کیا۔ مجھے ایس ایچ او نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن نے 10 اگست 1980 کو نذیر عباسی کے انتقال کا بتایا۔ میں نے اُن سے یہ دریافت نہیں کیا کہ انکی موت کہاں واقع ہوئی۔ میں نے جمال نقوی کو ہتھکڑی نہیں لگائی تھی۔ میں اُنکو تھانے نہیں لے گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ظفر اقبال انہیں جائے وقوعہ سے کہاں لیکر گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ مذکورہ گھر کس کی اور کب تک نگرانی میں رہا۔ ہم نے جمال نقوی سے کوئی قابلِ اعتراض مواد برآمد نہیں کیا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے غیر قانونی طور پر پروفیسر جمال نقوی کو گرفتار کیا اور اُن سے غلط اعترافی بیان حاصل کرنے کیلئے تشدد کیا۔ (سماعت 17 فروری 1982 تک ملتوی)

17 فروری 1982 سید عبدالودود کی جرح

میں ملزم سہیل سانگی کے ضمن میں 31 جولائی 1980 کو جاری ہونے والی ریمانڈ رپورٹ دیکھ رہا ہوں۔ (مذکورہ ریمانڈ رپورٹ کی CEC عدالت کے روبرو ملزمان کے وکیل کی جانب سے عدالتی دستاویز پی 1 بتاریخ 31 جولائی 1980 اور پی 2 بتاریخ 30 جولائی 1980 بحوالہ احمد کمال وارثی اور شبیر شر پیش کی۔) میں پروفیسر جمال الدین نقوی اور نذیر عباسی کے حوالے سے عدالتی دستاویز پی 3 بتاریخ 30 جولائی 1980 کو جاری کی گئی تیسری ریمانڈ رپورٹ دیکھ رہا ہوں۔ مذکورہ تینوں ریمانڈ ایس ایچ او نارتھ ناظم آباد نے سرسری سماعت کی فوجی عدالت

واقع ڈی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹرز کراچی سے حاصل کیے تھے۔ان افراد کو ریمانڈ حاصل کرنے کے بعد مارشل لاء ٹیم کے سپرد کیا گیا۔ میں پولیس اسٹیشن نارتھ ناظم آباد کے مقدمہ 236/80 میں ملزمان شبیر اور کمال وارثی کے حوالے سے وکیل صفائی کی جانب سے پیش کی گئی رپورٹ دیکھ رہا ہوں۔ مذکورہ رپورٹ کہتی ہے مارشل لاء آرڈر 77 کے ساتھ مارشل لاء ریگولیشن کے سیکشن 15 اور 18(3) کے تحت مذکورہ ملزمان 29 جولائی 1980 کو اپنی گرفتاری سے ہماری تحویل میں ہیں اور برائے تفتیش ہماری تحویل میں رہیں گے۔ بتاریخ 30 جولائی 1980 اور اس پر محمد سلیم، اسسٹنٹ ڈائریکٹر انٹر سروسز انٹیلی جنس (آئی ایس آئی) کے دستخط ہیں۔ میں ایسی ہی ایک اور رپورٹ بتاریخ 31 جولائی 1980 جو کہ سہیل سانگی کی اُسی دن حراست میں لیے جانے کا دکھا رہی ہے، یہ بھی اسسٹنٹ ڈائریکٹر آئی ایس آئی کی دستخط شدہ ہے۔اسی نوعیت کی تیسری رپورٹ بتاریخ 30 جولائی 1980 کی پروفیسر جمال نقوی اور نذیر عباسی کے حوالے سے ہے اس پر بھی اسسٹنٹ ڈائریکٹر آئی ایس آئی کے دستخط ہیں۔ میں یہ عدالتی دستاویز پی-4، پی-5 اور پی-6 کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔

میں اور میری پارٹی یونیفارم میں تھی جبکہ سب انسپکٹر ظفر اقبال سادہ کپڑوں میں تھے۔ نذیر عباسی گھر کے اندر داخل ہوا اور ہمیں دیکھ کر بھاگنے کی کوشش کرنے لگا تاہم سب انسپکٹر ظفر اقبال نے اُس پر کچھ قدم کے فاصلے پر قابو پا لیا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ نذیر عباسی کو ایک بس سے گرفتار کیا گیا نہ کہ گھر سے۔ میں نذیر عباسی کی تلاشی لے رہا تھا کہ پروفیسر جمال نقوی پہنچا، تلاشی مکمل کرنے کے بعد میں نے انہیں گرفتار کیا۔ دوبارہ کہا کہ جب وہ مشیر نامہ لکھ رہا تھا تو پروفیسر جمال نقوی پہنچا اور اسکو میں نے حراست میں لیا۔ جب میں دونوں ملزمان کی گرفتاری تقریباً مکمل کر چکا تھا تو میرا متبادل پہنچا۔اسی دوران سب انسپکٹر ظفر اقبال کا متبادل بھی پہنچ گیا اور وہ دونوں ملزمان کو جیپ میں لے گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ملزمان کو کہاں لے جایا گیا۔اُس نے مجھے نہیں بتایا کہ وہ ملزمان کو کہاں لے جا رہا ہے۔ میں ظفر اقبال کو اس دن سے پہلے نہیں جانتا تھا۔
یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ پروفیسر جمال نقوی کی گرفتاری کے وقت میں موجود نہیں تھا۔

یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں ملزمان کا ریمانڈ لینے کیلئے ایس ایچ او کے ساتھ نہیں تھا۔ میں نے 30 جولائی، 31 جولائی، 11 اگست اور 24 اگست 1980 کے علاوہ جب انکا سرسری سماعت کی فوجی عدالت اور خصوصی فوجی عدالت نمبر 1 سے ریمانڈ حاصل کیا جو کہ فریئر ہال میں واقع ہے۔ ریمانڈ حاصل کرنے کے بعد میں ملزمان کو نپیئر بیرکس میں سپرد کرتا رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ آیا نپیئر بیرکس میں کوئی تشدد مرکز ہے۔ ریمانڈ لیتے وقت وہ ٹھیک ٹھاک ہوتے تھے۔ میں ماسوائے 11 اگست 1980 کے، جب نذیر عباسی کی 10 اگست 1980 کو موت واقع ہو چکی تھی، پانچوں ملزمان کو ریمانڈ کیلئے لے جاتا رہا۔ میں نے 11 اگست 1980 کو نذیر عباسی کے متعلق دریافت نہیں کیا کیونکہ یہ پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ اسکا 10 اگست 1980 کو انتقال ہو چکا ہے۔ میں خود نذیر عباسی کی لاش دیکھنے کیلئے 10 اگست 1980 کو سول اسپتال کراچی گیا تھا۔ میں لاش دیکھنے سول اسپتال کے مردہ خانے گیا تھا۔ جہاں تک میری معلومات ہے نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن نے نذیر عباسی کی حراست میں موت کی کوئی جانچ پڑتال / تفتیش نہیں کی۔ نذیر عباسی کی لاش نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن کے سپرد نہیں کی گئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ نذیر عباسی کی لاش کو 10 اگست 1980 کی شب سخی حسن قبرستان میں دفن کیا گیا۔ یہ درست نہیں ہے کہ میں، ایس ایچ او نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن اور صفدر بھٹی نذیر عباسی کی لاش دفنانے سخی حسن قبرستان گئے تھے۔ میں صرف نپیئر بیرکس کے دفتر گیا تھا، جس کا وقوعہ تاج محل ہوٹل کے بالمقابل اور سی بریز اپارٹمنٹ کی جانب ہے۔ میں پولیس کانسٹیبلز کے ساتھ ریمانڈ کیلئے گیا تھا۔ مجھے ان پولیس اہلکاروں کے نام یاد نہیں ہے جو میرے ساتھ تھے۔ جب میں نے نذیر عباسی کی لاش دیکھی تو اس نے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اسکے جسم پر کوئی نشانات تھے یا نہیں۔ میں قطعی وقت بتانے سے تو قاصر ہوں البتہ میں سورج غروب ہونے کے بعد سول اسپتال گیا تھا۔

میں ملزمان کی تفتیش میں شامل نہیں رہا۔ صدر میں کتابوں کے اسٹال پر چھاپہ مارنے کیلئے مجھے کسی بھی اختیاری کی جانب سے تحریری احکامات نہیں دیئے گئے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ آیا اس ضمن میں احکامات جاری کیے گئے تھے یا نہیں۔ میں نے کتابوں کی اسٹال سے حاصل کی گئی

ماسکو اولمپکس اور سوویت یونین میں مسلمان کتابیں نہیں پڑھی تھیں اس لیے کہہ نہیں سکتا کہ ان میں کوئی تخریبی مواد تھا یا نہیں۔

یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں 28 اگست 1980 کو اعترافی بیان ریکارڈ کرانے کی غرض سے شبیر شر کو نہیں لے گیا تھا۔ یہ بھی کہنا درست نہیں ہوگا کہ اسی مقصد سے 31 اگست 1980 کو احمد کمال وارثی کو نہیں لے گیا تھا۔ میں نے ملزمان کے ریمانڈ سرسری سماعت کی فوجی عدالت نمبر 6 سے رات کو اس کے صدر میجر ضیا کے گھر سے حاصل کیے جبکہ خصوصی فوجی عدالت سے ریمانڈ فریئر ہال سے حاصل کیا۔ میں ملزمان کو رات تقریباً دس بجے ملیر کینٹ میں واقع میجر ضیا کے گھر لے گیا تھا۔ ایس ایچ او صفدر بھٹی پولیس پارٹی کے ہمراہ میرے ساتھ تھا۔ دونوں مرتبہ یعنی 30 اور 31 جولائی 1980 کو میں نے میجر ضیا کے گھر پر ریمانڈ حاصل کیا اور دونوں مرتبہ ایس ایچ او میرے ساتھ تھے۔

پیپلز کالونی کا گھر نارتھ ناظم آباد میں واقع ہے۔ اس گھر کے سامنے تقریباً دس فٹ کا رقبہ ہے، اس گھر تک پہنچنے کیلئے دو فٹ کی گلی سے گذرنا ہوتا ہے۔ اسکا دروازہ برآمدے میں کھلتا ہے۔ اس میں ایک چھت والا کمرہ ہے۔ چھت تپش روک چادروں کی بنی ہوئی ہے۔ میں قطعی نہیں کہہ سکتا ہوں کہ کمرے کا دروازہ ہے یا نہیں۔ اس کمرے کے آگے چھوٹی سی جگہ ہے جو باورچی خانے کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ جب 29 جولائی 1980 کی رات ہم وہاں گئے تو کمرہ بالکل خالی تھا۔ اس میں کسی بھی نوعیت کا کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ آیا کوئی برتن بھی تھے۔ صرف راکھ پھیلی ہوئی تھی۔ صحن میں ایک درخت تھا لیکن مجھے یاد نہیں ہے کہ وہ درخت کون سا تھا۔ اس گھر کے پیچھے اور دونوں اطراف گھر ہیں۔ معمولی مقدار میں گندے پانی کے ساتھ ندی بہتی ہے۔ صحن میں پانی کی ٹنکی نہیں ہے تاہم بیت الخلا کی چوکھٹ کے قریب کونے میں ایک چھوٹا گڑھا ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے مذکورہ گھر نہیں دیکھا، گرفتاریاں نہیں کیں یا ریمانڈ نہیں لیا اور ملزمان سے ستمبر 1980 کے دوران ہی جیل میں ملا۔ یہ کہنا انتہائی غلط ہوگا کہ میں ملزمان سے ستمبر 1980 کے اواخر میں جیل کے جیلرز روم میں جیلر کی موجودگی میں ملا تھا۔

اختر حسین ایڈووکیٹ کی جرح

جب میں پیپلز کالونی کے گھر گیا تو ہم سب ایک ہی جیپ میں تھے ماسوائے سب انسپکٹر ظفر اقبال کے، جو کہ چھاپہ مارے جانے والے گھر پر موجود تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ اس گھر کے قریب مارشل لا ٹیم کے دیگر اراکین بھی موجود تھے۔ 30 جولائی 1980 کو مارشل لا ٹیم کے ایک سب انسپکٹر نے آ کر سب انسپکٹر ظفر اقبال کو فارغ کیا۔ آنے والے دونوں سب انسپکٹرز سادہ کپڑوں میں تھے۔ مجھے سب انسپکٹر ظفر اقبال کو فارغ کرنے والے سب انسپکٹر کا نام معلوم نہیں ہے۔ میں نے ان سب انسپکٹرز کو پہلے کبھی پولیس وردی میں نہیں دیکھا تھا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ سب انسپکٹرز ریٹائرڈ فوجی اہلکار تھے جو کہ پاکستانی فوج کے تحت انٹیلی جنس سروس میں کام کر رہے تھے۔

میں نے سب انسپکٹر ظفر اقبال کی ہدایت اور نشاندہی پر دونوں ملزمان کی گرفتاری کی اور جامہ تلاشی لی۔ مجھے ایس پی منور علی نے اس مقدمے میں مستقل طور پر تعینات کیا۔ ضرورت پڑنے پر، مجھے نپیئر بیرکس میں واقع مارشل لا ٹیم کے ہیڈ کوارٹرز سے ٹیلی فون آتے رہتے تھے۔ میں نے اپنی آمد یا روانگی کا پولیس اسٹیشن ڈائری میں کبھی اندراج نہیں کیا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ گرفتاریوں کے دن سے لیکر ملزمان کی جیل منتقلی کے دن تک مجھے نپیئر بیرکس میں مارشل لا ٹیم کے دفتر میں موجود رہنے کو کہا گیا تھا۔ یہ درست نہیں ہے کہ میں ملزم احمد کمال وارثی کو طبیعت کی خرابی کی وجہ سے پی این شفا لے گیا تھا۔

میں نہیں جانتا کہ مارشل لا ٹیم کا نپیئر بیرکس میں واقع دفتر آئی ایس آئی کے تحت فیلڈ انٹروگیشن سنٹر ہے۔ میں ڈی ایس پی شفیع اللہ قریشی کو نہیں جانتا۔ میں سب انسپکٹر اختر حسین کو جانتا ہوں جو اُن دنوں ڈیفنس پولیس اسٹیشن پر تعینات تھے اور میرے پڑوسی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ نذیر عباسی کا انتقال 10 اگست کو ہوا۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ نذیر عباسی کا انتقال 9 اگست 1980 کو ہوا۔ دوبارہ کہا کہ مجھے 10 اگست 1980 کو اس کا علم ہوا۔ مجھے نہیں معلوم کہ آیا اسکی لاش کو

پی این شفا لے جایا گیا تھا۔ مجھے مارشل لاء ٹیم کی جانب سے ٹیلی فون کیا جاتا تھا۔ کبھی میں براہ راست مارشل لاء ٹیم کا ٹیلی فون موصول کرتا تھا تو کبھی کوئی اور وصول کرتا تھا۔ عام طور پر یہ ٹیلی فون میجر سلیم کی جانب سے ہوتے تھے۔ 30 جولائی 1980 سے ملزمان کو عدالتی تحویل میں دینے تک انہیں کبھی بھی نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن کے ریمانڈ میں نہیں دیا گیا۔ یہ درست نہیں ہے کہ میں نے تمام مشیر ناموں پر دستخط مارشل لاء ٹیم کے دفتر میں کیے تھے۔ یہ کہنا بھی درست نہیں ہوگا کہ میں نے کبھی ریمانڈ نہیں لیا۔

22 فروری 1982 — یوسف لغاری ایڈووکیٹ کی جرح

میں اس مقدمے کی تفتیشی ٹیم کا رکن نہیں تھا۔ میں نے کسی بھی ملزم کا بیان ریکارڈ نہیں کیا ہے۔ میں نے ان ملزمان سے کوئی تفتیش نہیں کی ہے۔ مجھے میجر سلیم نے کہا کہ میں غلام شبیر شر اور احمد کمال وارثی کو اعترافی بیان کیلئے لے جاؤں۔ مجھے کہا گیا کہ میں ملزمان کو اعترافی بیان کیلئے لے جانے کیلئے ٹیپئر بیرکس پر رپورٹ کروں۔ مجھے غلام شبیر شر اور کمال وارثی کو بالترتیب 28 اگست اور 31 اگست کو لے جانے کیلئے کہا گیا۔ ٹیپئر بیرکس میرے پولیس اسٹیشن کی حدود میں نہیں ہیں۔ مجھے میجر سلیم نے ملزمان کے اعترافی بیان کیلئے انہیں کسی بھی عدالت لے جانے کا حکم دیا تھا۔ میں نے یہ اعترافی بیانات محمد امین جمالی کی عدالت سے حاصل کیے۔ مجھے تفتیشی افسر سے کوئی لیٹر موصول نہیں ہوا۔ میں نے اے سی ایم محمد امین جمالی کو تفتیشی افسر کا کوئی لیٹر پیش نہیں کیا۔ اے سی ایم جمالی کی عدالت ایک عدالتی کمرے اور مجسٹریٹ کے چیمبر پر مشتمل ہے۔ لگ بھگ بارہ بجے دوپہر میں نے ملزمان ٹیپئر بیرکس سے لئے اور کوئی ایک بجے عدالت پہنچ کر فوری طور پر اے سی ایم کو اطلاع دی۔ اس جگہ پر کئی ایک عدالتیں ہیں۔ میرا تھانہ اے سی ایم جمالی کی حدود میں نہیں آتا۔

اس مقدمے سے قبل، اپنے پورے عرصۂ ملازمت کے دوران میں کسی ملزم کو اعترافی بیان کیلئے نہیں لے گیا تھا۔ میرے پہنچنے کے پندرہ منٹ بعد، مجسٹریٹ نے مجھے چیمبر میں طلب کیا۔ مجھے عدالت کے اوقات کار کا علم نہیں ہے۔ انکے اعترافی بیانات کے ریکارڈ ہونے کے بعد

میں نے ملزمان کو انکی متعلقہ تاریخوں پر تحویل حوالے کی۔ دونوں مواقع پر میں نے اسٹیشن ڈائری میں اپنی روانگی کا اندراج نہیں کیا تھا۔ یہ کہنا درست ہے کہ، پولیس ضوابط کے مطابق، پولیس اہلکاروں کو اپنی آمد اور روانگی اور اپنی ڈیوٹی سے جانے کی وجہ کا اندراج کرنا ہوتا ہے۔ یہ کہنا درست ہے کہ پولیس ضوابط کے مطابق، کوئی بھی پولیس اہلکار کسی ایسی ڈیوٹی کے لئے جاتا ہے جو کہ اسکی جغرافیائی حدود سے باہر ہے تو اسکو اس لئے ایس پی سے اجازت لینی ہوتی ہے۔ ایس پی منور علی نے مجھے کوئی تحریری حکم نامہ نہیں دیا تاہم انہوں نے میرے پولیس اسٹیشن ڈائری میں اندراج کرالیا تھا۔ میں نے خود وہ اندراج دیکھے تھے تاہم مجھے نمبر شمار، تاریخ یا وقت یاد نہیں ہے۔ ڈائری میں یہ درج تھا کہ مجھے ایس پی نے مارشل لاء ٹیم کو رپورٹ کرنے کیلئے تعینات کیا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے روزنامچے میں یہ احکامات 31 جولائی سے قبل پڑھے تھے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ مجھے مذکورہ گھر پر چھاپہ مارنے اور نگرانی کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ میں مارشل لاٹیم کے ساتھ دس دن سے زائد کا عرصہ رہا۔ جب بھی مارشل لاٹیم کو میری ضرورت پڑتی، میں اس ڈیوٹی کیلئے جاتا۔ مجھے اپنی حدود سے باہر مختلف ڈیوٹیاں کرنے کیلئے ایس پی کی جانب سے علیحدہ سے احکامات نہیں ملے۔ میں نے کیس ڈائری میں کوئی اندراج نہیں کیا، نہ ہی میں نے روزنامچے میں کوئی اندراج کیا، نہ ہی ریمانڈ آرڈر اور اعترافی بیانات میں۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ اس مقدمے کے سلسلے میں میرے اُٹھائے ہوئے تمام اقدامات، میں نے کسی ڈائری میں درج نہیں کیے۔ میں نے دونوں ملزمان میجر سلیم کے دفتر سے اپنی تحویل میں لیے۔ میں نے اپنے ماتحتین کے آنے اور ملزمان کو ہتھکڑی لگانے کیلئے میجر سلیم کے دفتر میں تقریباً نصف گھنٹہ انتظار کیا۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ تھانے سے ہتھکڑی جاری ہونے کی صورت میں انکا ضروری اندراج کیا جاتا ہے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ دو پولیس کانسٹیبلز کی جانب سے ملزمان کیلئے لائی گئی ہتھکڑیوں کا پولیس ریکارڈ میں کوئی اندراج کیا گیا تھا یا نہیں۔

یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ مجھے متعلقہ ایس پی سے کوئی ہدایات موصول نہیں ہوئیں اور میں نے یہ اقدامات مارشل لاء اختیاری والوں کے دباؤ پر کیے۔ گواہی کے خلاصے میں ملزمان کے

ریمانڈ یا انکے اعترافی بیانات کے سلسلے میں ایس پی کی جانب سے مجھے دیئے گئے احکامات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ کہنا درست ہے کہ ایس ایچ او مجھے ایس پی کے احکامات کے بغیر اپنی حدود سے باہر تعینات نہیں کر سکتا۔ اس وقت میں مارشل لاء ٹیم کے ساتھ تعینات نہیں ہوں۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ مجھے کب مارشل لاء ڈیوٹی سے فارغ کیا گیا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں ملزمان کی جیل منتقلی تک مارشل لاء ٹیم کے ساتھ منسلک تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے اپنے دیگر اہلکار ساتھیوں کے ساتھ ان ملزمان کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ یہ کہنا بھی درست نہیں ہوگا کہ ملزمان کو حراست کے دوران مناسب خوراک، پانی اور دیگر ضروریات فراہم نہیں کی گئیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے اور میرے اعلیٰ افسران نے اعترافی بیانات پر ملزمان سے دباؤ کے تحت دستخط حاصل کیے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ان دونوں ملزمان نے جمالی صاحب کے سامنے کوئی اعترافی بیان نہیں دیا تھا۔ میں اس پر کوئی رائے نہیں دے سکتا کہ انتظامیہ نے کن حالات میں ملزمان کو رکھا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں صفدر بھٹی کا پسندیدہ ماتحت تھا اور میں انکی ہدایت پر یہ بیان دے رہا ہوں۔

شفیع محمدی ایڈووکیٹ کی جرح

میں اس مقدمے سے قبل میجر ضیا سے واقف نہیں تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ صفدر بھٹی انکو پہلے سے جانتے تھے یا نہیں۔ سب سے پہلے میں ایم پی اے ہاسٹل گیا تھا تاہم مجھے سرسری سماعت کی فوجی عدالت کا نمبر یاد نہیں ہے۔ رات تقریباً نو بجے ایم پی اے ہاسٹل کے دروازے پر تعینات سنتری نے مجھے میجر ضیا کا نام اور انکا پتہ بتایا۔ 30 اور 31 جولائی کو میں نے دونوں ریمانڈ رات کو لئے تھے۔ بعدازاں میں ملزمان کو ایک فوجی گاڑی میں نیپئر بیرکس سے لے گیا۔ مجھے اس سنتری کا نام یاد نہیں ہے جو مجھے ملا تھا۔ صرف صفدر بھٹی کو بلایا گیا تھا جو مجھے نیپئر بیرکس لے گیا تھا جبکہ میرے ساتھ کوئی کانسٹیبل نہیں تھا۔ جب ہم نیپئر بیرکس پہنچے تھے تو دونوں ملزمان میجر سلیم کے کمرے میں موجود تھے۔ ہم چار ملزمان کو ایم پی اے ہاسٹل لے گئے۔ انکو ہتھکڑی لگی ہوئی نہیں تھی۔ مجھے میجر ضیاء کے گھر کی گلی یا گھر نمبر یاد نہیں ہے۔ ہم دس یا ساڑھے دس بجے میجر صاحب

کے ہاں پہنچے تھے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ میں نے اپنے بیان کے خلاصے میں میجر ضیاء کے پتے یا ایم پی اے ہاسٹل جانے یا جیپ کے ذکر یا ملزمان کو نپیئر بیرکس سے ملیر لے جانے کا کوئی ذکر نہیں کیا (نہ ہی اس سے متعلق کسی نے تفصیلی سوالات کیے)۔ میں اپنا بیان دے چکا ہوں۔ مجھے مارشل لاء ٹیم نے بتایا تھا کہ انہوں نے گھر نمبر C/36(C/19) پر چھاپہ مارا ہے اور دو افراد کو گرفتار اور تخریبی مواد برآمد کیا ہے۔

میں نے گرفتار کیے جانے والے دو ملزمان نذیر عباسی اور جمال نقوی کے خلاف کسی بھی جرم کے تحت اپنے پولیس اسٹیشن پر کوئی ایف آئی آر درج نہیں کی، نہ ہی ٹیم کے کسی اور رکن نے ایسا کیا۔

یکم مارچ 1982

استغاثہ کا گواہ نمبر 6

شفیق احمد ہیڈ کانسٹیبل 4149 ولد شیر بہادر

گوٹھ کومالا، تحصیل اور ضلع اٹک

29 جولائی 1980 کو میں نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن پر تعینات اور ڈیوٹی پر تھا۔ مجھے ایس ایچ او صفدر بھٹی نے ہدایت کی کہ رات کو میری ڈیوٹی سب انسپکٹر زبیر کے ساتھ ہوگی۔ رات تقریباً دس بجے میں سب انسپکٹر زبیر، دو پولیس کانسٹیبلز اور مارشل لاء ٹیم کے ہمراہ ایک جیپ پر سوار ہوکر پولیس اسٹیشن سے نکلا۔ ہم پیپلز کالونی پہنچے اور جیپ مرکزی روڈ پر کھڑی کی۔ وہاں سے ہم گھر نمبر C/19 کی جانب گئے جو روڈ سے کوئی ایک سَو یا ایک سَو دس گز کے فاصلے پر تھا۔ گھر کا دروازہ بند تو تھا تاہم اسکو باہر سے یا اندر سے کنڈی لگی ہوئی نہیں تھی۔ سب انسپکٹر زبیر نے دروازہ کھولا اور ہم سب گھر کے اندر داخل ہوئے۔ مارشل لاء ٹیم کے ایک رکن اور سب انسپکٹر زبیر کے درمیان کچھ بات چیت ہوئی اور مارشل لاء ٹیم اپنے ایک نمائندے کو چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ اس نمائندے کا نام بعدازاں سب انسپکٹر ظفر اقبال معلوم ہوا تھا۔

30 جولائی 1980 کو صبح تقریباً ساڑھے نو بجے ایک شخص اس گھر میں داخل ہوا اور دروازہ کھولتے ہی پولیس پر نظر پڑنے پر وہ بھاگنے لگا۔ سب انسپکٹر ظفر اقبال اسکے تعاقب میں بھاگا اور گھر سے کچھ قدموں کے فاصلے پر ہی اس کو دبوچ لیا اور اسکو سب انسپکٹر زبیر کے حوالے کیا۔ انہوں نے جامہ تلاشی لی اور کچھ کاغذات کے علاوہ ایک ہزار روپے نقد برآمد کیے۔ مذکورہ شخص کا نام بعدازاں تصدیق ہوا کہ نذیر عباسی ہے۔ دس سے پندرہ منٹ کے دوران، جب رسمی کاروائی کی جاری تھی، ایک اور شخص گھر کے اندر داخل ہوا، اسکو بھی سب انسپکٹر زبیر نے گرفتار کیا، اسکی بھی جامہ تلاشی لی گئی اور ایک ڈائری بازیاب ہوئی۔ بعدازاں اسکا نام پروفیسر جمال الدین نقوی

کے طور پر تصدیق کیا گیا۔ گواہ نے پروفیسر جمال نقوی کی شناخت کی اور اسکی نشاندہی کی جبکہ کہا کہ نذیر عباسی عدالت میں موجود نہیں ہے۔ میں نے دونوں ملزمان کی جامہ تلاشی کے مشیر ناموں پر دستخط کیے اور وہ عدالت میں پیش کیے۔ اس پر سب انسپکٹر ظفر اقبال اور دیگر دو کانسٹیبلز کے بھی دستخط تھے۔

بیرسٹر عبدالودود کی جرح

ایس ایچ او صفدر بھٹی نے مجھے سب انسپکٹر زبیر کے ہمراہ جیپ میں پیپلز کالونی جانے کا حکم دیا۔ جیپ میں پہلے سے موجود افراد سادہ کپڑوں میں ملبوس تھے تاہم ہم یونیفارم میں تھے۔ مجھے مذکورہ جیپ کا رنگ اور نمبر یاد نہیں۔ مجھے ان لوگوں کے نام معلوم نہیں ہیں۔ ہم نے جیپ مرکزی روڈ پر چھوڑی، وہاں سے چار سے پانچ فٹ چوڑی ایک گلی اُس گھر کی جانب جاتی ہے۔ ہم آٹھوں لوگ مذکورہ گھر کی جانب گئے تاہم ہم پانچ گھر پر ہی رہے۔ مذکورہ گھر کے دونوں اطراف گھر ہیں، تاہم اس گھر کے سامنے ایک خالی گلی اور ندی ہے جس میں پانی بہتا ہے۔ دروازہ صحن میں کھلتا ہے۔ صحن مختصر ہے جس میں درخت لگا ہوا ہے صحن میں ہی باورچی خانہ اور بیت الخلا ہے۔ گھر میں صرف ایک کمرا ہے جس کو دروازہ تھا۔ گھر میں راکھ کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ گھر مکمل طور پر خالی اور ویران تھا۔ ہم رات ساڑھے دس بجے سے صبح تک زمین پر بیٹھے رہے۔ گھر میں چونکہ بجلی نہیں تھی چنانچہ ہم نے کچھ دیئے جلائے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تیل اور چراغ کا بندوبست کہاں سے کیا گیا۔ سب انسپکٹر ظفر اقبال نذیر عباسی کے پیچھے دوڑا اور اسکو پکڑ کر سب انسپکٹر زبیر کے حوالے کیا۔ میں اسکے پیچھے نہیں بھاگا تھا۔ سب انسپکٹر مشیر نامہ تیار کر رہا تھا کہ ایک اور شخص اندر آیا جس کو سب انسپکٹر زبیر نے گرفتار کیا۔ ہمارے وہاں ہوتے ہوئے سب انسپکٹر زبیر نے دونوں ملزمان سے تفتیش کی۔ ہم نے دس پندرہ منٹ میں رسمی کاروائی مکمل کی۔ مجھے سب انسپکٹر زبیر نے سب انسپکٹر ظفر اقبال کے ہمراہ ملزمان کو لیکر جانے کیلئے کہا۔ ہم ابھی کچھ ہی قدم چلے تھے کہ مارشل لاء انتظامیہ والوں کی ایک اور جیپ آ گئی، جس میں تین افراد سوار تھے جن کے مجھے نام معلوم نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک نے سب انسپکٹر ظفر اقبال کو فارغ کیا جو دونوں ملزمان کے ہمراہ مارشل لاء دفتر روانہ

ہوا۔ اسی دوران ہماری جگہ لینے والے بھی آ گئے اور ہمیں بھی سب انسپکٹر زبیر کے ہمراہ فارغ کیا گیا۔ نذیر عباسی اور پروفیسر جمال نقوی سے بازیاب ہونے والی اشیا سب انسپکٹر زبیر نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن لے گیا۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ہم پیپلز کالونی نہیں گئے تھے اور دونوں ملزمان کو گرفتار نہیں کیا تھا۔ یہ کہنا بھی درست نہیں ہوگا کہ میں نے مشیر نامے پر دستخط مارشل لاء دفتر میں کیے تھے۔

اختر حسین ایڈووکیٹ کی جرح

میں میٹرک پاس ہوں۔ میں1968 میں پولیس سروس میں آیا۔ میں اگلی ترقی کیلئے اہل ہوں۔ میں نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن پر..... کے آخری مہینوں میں تعینات ہوا تھا۔ میں اگست 1980 تک اسی پولیس اسٹیشن پر تعینات رہا۔ بعدازاں میری تقرری ڈی ایس پی دفتر میں ہوئی جو اُسی پولیس اسٹیشن سے متصل ہے۔ سب انسپکٹر زبیر نے پولیس اسٹیشن ڈائری میں اندراج کیا تاہم مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے ڈائری میں کیا درج کیا۔ میں بیان کے خلاصے کیلئے سرسری سماعت کی فوجی عدالت کے سربراہ (صدر) کے سامنے بھی پیش ہوا۔ بیان کے خلاصے کے ریکارڈ کے دوران استغاثہ کا سب انسپکٹر موجود تھا۔ گواہی کے خلاصے میں بیان میجر نے لکھوایا اور استغاثے کے سب انسپکٹر نے ریکارڈ کیا، دوبارہ کہا کہ مجھے قطعی طور پر یادنہیں ہے کہ کس نے میرا بیان لکھوایا اور ریکارڈ کیا۔ یہ سرسری سماعت کی فوجی عدالت سنٹرل جیل کی حدود میں واقع تھی۔ مجھے گواہی کا خلاصہ ریکارڈ کرانے کی قطعی تاریخ یا مہینہ یا سال یادنہیں ہے اور نہ ہی میں اسکو اندازاً بتا سکتا ہوں۔ میرا بیان حلفیہ طور پر ریکارڈ کیا گیا اور مجھ سے پورا وقوعہ درست طور پر بیان کرنے کیلئے کہا گیا تھا۔ اپنی گواہی کے خلاصے کے دوران میں نے بتایا تھا کہ دو کانسٹیبل سعید شاہ جبکہ دوسرے کا نام مجھے یادنہیں ہے میرے ساتھ گئے تھے۔ یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس گواہی کے خلاصے میں میں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ایس ایچ او صفدر بھٹی نے مجھے سب انسپکٹر زبیر اور سعید شاہ کے ہمراہ جانے کیلئے ہدایت دی تھی۔ مجھے یادنہیں کہ میں نے بتایا تھا کہ مارشل لاء کی ایک ٹیم ہمیں لینے کیلئے پولیس اسٹیشن آئی تھی۔ یہ کہنا درست ہے کہ گواہی کے خلاصے میں مارشل لاٹیم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے بتایا تھا کہ ہماری ٹیم ایک فوجی جیپ پر سوار ہو کر مذکورہ گھر پر چھاپہ مارنے گئی تھی۔ گواہی کے خلاصے کے دوران میرے بیان میں یہ شامل نہیں ہے۔ یہ درست نہیں ہے کہ میں نے کہا تھا کہ سب انسپکٹر زبیر نے ملزمان کو گرفتار کیا تھا۔ (گواہ کو گواہی کے خلاصے میں اسکا بیان دکھایا گیا جس کے مطابق ''اگلی صبح 30 جولائی 1980 کو نو بجے سے دس بجے کے درمیان سب انسپکٹر زبیر احمد نے دو افراد کو گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے گرفتار کیا، جہاں ہم نے رات بسر کی تھی۔'') یہ درست ہے کہ یہ گواہی کے خلاصے میں درج نہیں ہے کہ نذیر عباسی کو چھاپہ مارے جانے والے گھر سے بھاگتے ہوئے گرفتار کیا گیا۔ جائے وقوعہ کی جانب جاتے ہوئے میں نے صرف لاٹھی اُٹھائی تھی۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ دیگر کانسٹیبلز اور سب انسپکٹر زبیر کے پاس کیا تھا۔ میں اس بات پر کچھ کہنے سے قاصر ہوں کہ دیگر دونوں کانسٹیبلز کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ سب انسپکٹر زبیر کے پاس صرف ریوالور تھا اور کچھ نہیں۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ آیا ہم نے اپنے ساتھ کھانے پینے کی اشیا لی تھیں یا نہیں۔ ہم نے رات سے صبح تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ وہاں گلاس یا لوٹا موجود تھے۔ ہم نے رات سے صبح تک پانی استعمال نہیں کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ سب انسپکٹر زبیر نے مجھے بتایا تھا کہ میں دو دیگر کانسٹیبلز اور اسکے ہمراہ سب انسپکٹر ظفر اقبال کے ساتھ ملزمان کو لیکر مارشل لاء دفتر جاؤں گا۔ ہم ملزمان کے ساتھ مرکزی روڈ تک گئے جہاں مارشل لاء ٹیم جیپ پر آئی۔ ہمیں فارغ کرنے والے دو پولیس کانسٹیبلز پیدل آئے۔ مجھے ان دونوں کانسٹیبلز کے نام یاد نہیں ہیں۔ سب انسپکٹر ظفر اقبال بھی مرکزی روڈ پر ہمارے ساتھ تھا۔ ہم نے گھر کو خالی (بغیر کسی فرد کے) چھوڑا تھا۔ فارغ کرنے والی دونوں پارٹیاں ہمیں مرکزی روڈ پر ملیں۔ میں نے ان ملزمان کو کبھی بھی نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن پر نہیں دیکھا۔

9 مارچ 1982

استغاثہ کا گواہ ہیڈ کانسٹیبل شفیق - یوسف لغاری ایڈووکیٹ کی جرح

میں نے اپنی گواہی کے خلاصے کے بیان میں یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ سب انسپکٹر ظفر اقبال چھاپہ مارے گئے گھر میں نذیر عباسی کی گرفتاری کیلئے اسکے پیچھے دوڑا تھا۔ میں نے گواہی کے خلاصے میں بتایا ہے کہ سب انسپکٹر استغاثہ زبیر نے صبح نو بجے اور دس بجے کے درمیان دو افراد کو گرفتار کیا تھا، جو اُس گھر میں داخل ہوئے تھے جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ سب انسپکٹر استغاثہ زبیر نے دونوں کیلئے ایک مشیر نامہ (گرفتاری اور اشیا کی برآمدگی) تیار کیا اور میں نے اُس مشیر نامے پر دستخط کیے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ دونوں ملزمان کیلئے ایک ہی مشیر نامہ تیار کیا گیا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ مشیر نامہ دونوں ملزمان کی گرفتاری سے پہلے تیار کیا گیا۔ یہ کہنا درست ہے کہ مشیر نامہ دونوں ملزمان کی گرفتاری کے بعد مکمل کیا گیا جو کہ زبیر نے تیار کیا تھا۔ ظفر اقبال شروع سے آخر تک گھر پر موجود تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ سنٹرل جیل (کراچی) میں کوئی سرسری سماعت کی فوجی عدالت نہیں تھی جہاں مجھ پر جرح ہوئی تھی۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ گواہی کے خلاصے میں میرا بیان ریکارڈ نہیں کیا گیا بلکہ بعد میں مجھے اس پر دستخط کرنے کیلئے کہا گیا تھا۔ میں نے گواہی کے خلاصے میں یہ نہیں کہا ہے کہ میں زبیر کے ہمراہ ملزمان کو مارشل لاء ہیڈ کوارٹرز لے گیا تھا۔ پولیس کانسٹیبل ولایت گھر پر چھاپہ مارنے والی ہماری ٹیم کا رکن نہیں تھا۔ جب مارشل لاء ہیڈ کوارٹرز کی جیپ پولیس اسٹیشن آئی تو زبیر، میں اور دو کانسٹیبل پولیس اسٹیشن پر موجود تھے۔ اسکے بعد ہم سیدھے چھاپہ مارے جانے والے گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ جیپ میں سادہ کپڑوں میں ملبوس چار لوگ تھے جو مارشل لاء ہیڈ کوارٹرز سے آئے تھے۔ ہم آٹھوں لوگ چھاپہ مارے جانے والے گھر گئے تھے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نہ تو ٹیم کا رکن تھا نہ ہی میں نے کوئی گرفتاری کی، نہ مشیر نامہ میری موجودگی میں تیار کیا گیا نہ ہی میری موجودگی میں کوئی برآمدگی ہوئی۔

(استغاثہ کے گواہ شفیق کی جرح مکمل ہوئی - اگلی سماعت 10 مارچ 1982 کو)

10 مارچ 1982

استغاثہ کا گواہ غلام محمد

استغاثہ کا گواہ نمبر 7 ایگزامنیشن انچیف

31 جولائی 1980 کو میں بطور اے ایس آئی پولیس اسٹیشن سولجر بازار تعینات تھا۔ میں صبح نو بجے سے سہ پہر چار بجے تک علاقے میں گشت کی ڈیوٹی پر مامور تھا۔ پاکستان کوارٹرز سولجر بازار پولیس اسٹیشن کے حدود میں واقع ہیں۔ میں اُس دن گشت کرنے والی پارٹی کا انچارج اہلکار تھا۔ میں مختلف مقامات پر اپنی پارٹی کا معائنہ کرنے کے بعد تقریباً تین بجے سہ پہر پاکستان کوارٹرز روانہ ہوا۔ چونکہ میرے علم میں تھا کہ کچھ روز قبل کوارٹر نمبر 344/E سے کچھ تخریبی مواد برآمد ہوا تھا اور کانسٹیبل ولایت خان اور کانسٹیبل نیاز احمد اُس گھر پر تعینات تھے چناچہ میں اُنکے پاس بھی گیا۔ وہاں پہنچنے پر میں نے دیکھا کہ دو کانسٹیبلز گھر پر موجود تھے اور سادہ کپڑوں میں ملبوس ایک شخص سے تفتیش کر رہے تھے۔ میرے دریافت کرنے پر دونوں کانسٹیبلز نے بتایا کہ انہیں احکامات دیئے گئے ہیں کہ اس گھر میں داخل ہونے والے ہر شخص کو گرفتار کیا جائے کہ مبادا اُسکا اس گھر سے ملنے والے تخریبی مواد رکھنے والوں سے کوئی تعلق نہ ہو۔ میں نے جامہ تلاشی لی۔ (گواہ نے پہلے امر لال کی جانب اشارہ کیا جب کہ ملزم سہیل سانگی وہاں موجود نہیں تھا۔ بعدازاں ملزم کے وہاں لانے پر اس نے درست ملزم کی نشاندہی کی۔ جامہ تلاشی اور گرفتاری کے مشیر نامے کے طور پر واضع کیا گیا، گواہ نے اپنے دستخط کی تصدیق کی۔ اس پر پولیس کانسٹیبل ولایت خان، کانسٹیبل نیاز احمد اور سب انسپکٹر ظفر اقبال کے بھی دستخط تھے۔ گواہ نے ملزم کی جامہ تلاشی پر برآمد ہونے والی اشیا بھی عدالت کے سامنے پیش کیں۔ عدالت نے انکا جائزہ لیکر تصدیق کی کہ یہ مشیر نامے سے مطابقت رکھتی ہیں جس کے مطابق بٹوے میں 135 روپے تھے جو کہ گواہ کو واپس کیے گئے جبکہ باقی اشیا عدالت نے رکھیں۔) میں نے ملزم، برآمد ہونے والی اشیا اور مشیر نامہ سب

انسپکٹر ظفر اقبال کے حوالے کیے، جن کا تعلق مارشل لا ٹیم سے تھا۔ سب انسپکٹر ظفر اقبال کو مجھ سے دو کانسٹیبلز نے متعارف کرایا تھا جنہوں نے پچھلے سات دنوں کے دوران وہاں ڈیوٹی کی تھی۔ میں نے شام چار بجے کے بعد پولیس اسٹیشن پر واپسی کی رپورٹ دی۔ (وقفے کے بعد عدالت نے شناختی کارڈ اور تصویر کے علاوہ باقی ماندہ برآمد کی گئی اشیا واپس کر دیں۔)

شفیع محمدی ایڈووکیٹ کی جرح (استغاثہ کا گواہ غلام محمد)

میری فروری 1981 میں سب انسپکٹر استغاثہ کے طور پر ترقی ہوئی ہے۔ میں اس مقدمے کے سلسلے میں سرسری سماعت کی فوجی عدالت کے روبرو مئی 1981 کے دوران پیش ہوا تھا۔ میں گواہی کے خلاصے کے نمبر 13 پر اپنے دستخط دیکھ سکتا ہوں۔ میں نے بیان پڑھنے کے بعد اس پر دستخط کیے ہیں۔ میں محکمۂ پولیس میں گذشتہ پچیس برس سے ہوں (ریٹائرمنٹ کے قریب)۔ یہ درست ہے کہ اپنے پولیس اسٹیشن کی حدود میں کسی قابلِ گرفت قانون جرم کے میری معلومات میں آنے پر اسکی رپورٹ درج کرنا میرا فرض ہے۔ یہ کہنا درست ہے کہ اگر کسی پولیس اہلکار کو اپنے علاقے میں کسی جرم کے ارتکاب کا علم ہے اور وہ جرم کو چھپاتا ہے یا ڈیوٹی افسر کے ذریعے اسکی رپورٹ درج نہیں کرتا تو اسکا مطلب ہے کہ وہ لاپرواہی/غفلت کا مرتکب ہوا ہے نہ کہ کسی غیر قانونی عمل یا جرم کا مرتکب۔ پولیس اہلکار کے طور پر میں پاکستان پینل کوڈ، پولیس ضوابط اور سی آر پی سی (ضابطہ فوجداری قانون) سے آگاہ ہوں۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ ایک ذمہ دار پولیس اہلکار کے طور پر میں قانون کی پاسداری کروں گا اور کسی افسر کے غیر قانونی احکامات ماننے سے انکار کروں گا۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ اگر کسی فرد نے میرے پولیس اسٹیشن کی حدود کے اندر یا اس سے باہر کوئی جرم نہیں کیا ہے تو ایسے فرد کی گرفتاری غیر قانونی اور غلط ہوگی۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں اپنے پولیس اسٹیشن کی حدود سے باہر کوئی جرم کرنے والے کسی شخص کو گرفتار نہیں کر سکتا۔ مجھے معلوم ہوا کہ کوئی دو یا تین روز قبل اس کوارٹر پر چھاپہ مار کر تخریبی مواد برآمد کیا گیا۔ یہ درست

ہے کہ میرے پولیس اسٹیشن کے کچھ اہلکاروں نے مجھے 31 جولائی 1980 سے کچھ روز قبل اس چھاپے کے متعلق بتایا تھا۔ یہ درست ہے کہ سولجر بازار پولیس اسٹیشن کے دیگر اہلکاروں کو بھی میری طرح اس چھاپے کا علم تھا۔ تخریبی مواد رکھنا عدالتی دائرۂ کار میں آنے جیسا جرم ہے۔ میں نے اس وقوعے کے اپنی معلومات میں آنے کے بعد اپنے پولیس اسٹیشن پر اس کے متعلق کوئی رپورٹ درج نہیں کی۔ مذکورہ گھر پر دو کانسٹیبلز کی تعیناتی ایس ایچ او نے کی تھی، نہ کہ میں نے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ میں نے گواہی کے خلاصے میں بتایا ہے کہ ''وہاں پر میں نے ایک شخص کو دیکھا، جس کی بعدازاں شناخت محمد سہیل سانگی کے طور پر ہوئی جس کو اب میں ملزم کے طور پر شناخت کر پا رہا ہوں وہ مذکورہ دونوں کانسٹیبلز کی تحویل میں تھا۔ سب انسپکٹر ظفر اقبال بھی مارشل لا ٹیم کی جانب سے وہاں موجود تھا (سطریں 10 تا 14، صفحہ 12، گواہی کا خلاصہ)۔ جب میں وہاں پہنچا تو ظفر اقبال نے جامہ تلاشی نہیں لی تھی جو کہ میں نے لی تھی۔ میں نے ملزم سے برآمد ہونے والی تمام اشیا کا مشیرنامہ تیار کیا تھا۔ برآمد ہونے والی رقم بٹوے میں تھی۔ میں نے اپنے برآمدگی کے مشیرنامے میں بٹوے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ میں نے مضامین یا تحریروں کے مندرجات کا جائزہ نہیں لیا۔ ابتدائی طور اسکا کہنا تھا کہ یہ عدالتی دائرہ کار میں آنے والا جرم نہیں تھا۔ بعد میں کہا کہ سہیل سانگی سے برآمد ہونے والی اشیا/ مضامین عدالتی دائرۂ کار میں آنے والے جرم کے تحت نہیں آتے۔

(شفیع محمدی کی جرح جاری رہے گی اگلی سماعت پر جو کہ 13 مارچ 1982 کو ہوگی- علی امجد ایڈووکیٹ بھی موجود تھے۔)

13 مارچ 1982

استغاثہ کے گواہ غلام محمد سے شفیع محمدی کی جرح (دوسرا دن)

مجھے نہیں معلوم کہ آیا 31 جولائی 1980 سے قبل میرے پولیس اسٹیشن پر سہیل سانگی کے خلاف کوئی مقدمہ درج تھا یا نہیں۔ مجھے 31 جولائی 1980 یا اس سے قبل یا آج تک متعلقہ انتظامیہ سے سہیل سانگی پر نظر رکھنے کی کوئی تحریری ہدایت نہیں ملی۔ میں 31 جولائی 1980 یا اس

سے قبل سہیل سانگی کو نہیں جانتا تھا۔ میں 9 مارچ 1982 کو عدالت کی کاروائی کیلئے آیا تھا۔ اُس دن میں نے نہ تو کسی کانسٹیبل کے ذریعے سہیل سانگی کو طلب کیا اور نہ ہی کسی نے شناخت کیلئے سہیل سانگی کو میرے سامنے پیش کیا۔ یہ درست ہے کہ کسی کانسٹیبل نے شناخت کیلئے مجھے سہیل سانگی کی نشاندہی کی تھی۔ میں نے خود کسی کو سہیل سانگی کی نشاندہی کرنے کیلئے نہیں کہا تھا۔ یہ درست ہے کہ سب انسپکٹر استغاثہ زبیر نے نشاندہی کی تھی کہ یہ سہیل سانگی ہے۔ یہ درست ہے کہ میں نے زبیر سے کہا تھا کہ سہیل سانگی کی نشاندہی کی جائے کیونکہ اسکو دیکھے ہوئے ایک عرصہ گذر چکا تھا۔ میں نے سہیل سانگی سے اسکا پیشہ دریافت نہیں کیا تھا۔ موجود تینوں مشیران میں سے کسی نے بھی مجھے سہیل سانگی کے پیشے سے متعلق نہیں بتایا تھا۔ مجھے دو کانسٹیبلز نے بتایا کہ سہیل سانگی گھر نمبر E/344 میں داخل ہو رہا تھا۔ سب انسپکٹر ظفر اقبال نے بھی بعد ازاں یہی کچھ مجھے بتایا، جس کے بعد میں نے اسکی جامہ تلاشی لی۔ خود سہیل سانگی نے بھی میرے دریافت کرنے پر بتایا کہ وہ گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ظفر اقبال وہاں پر میرے پہنچنے سے کتنی دیر قبل آیا تھا۔ نہ تو کانسٹیبلز نے مجھے بتایا اور نہ ہی میں نے معلوم کیا کہ ظفر اقبال کب سے وہاں موجود تھا۔ میں تو کانسٹیبلز کی خیریت دریافت کرنے وہاں اتفاقاً پہنچا تھا۔ یہ کہنا درست ہے کہ مذکورہ کوارٹر کے دو اطراف متصل کوارٹر ہیں جبکہ اس کے سامنے اور عقب میں کوارٹروں کی قطار ہے۔ کوارٹروں کے باہر قریب ترین روڈ کوئی تین سو قدم کے فاصلے پر ہوگی۔ مذکورہ گھر سے کوئی بیس قدم کے فاصلے پر ایک اندرونی رہگذر ہے تاہم اس وقت وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔

مذکورہ کوارٹر میں داخلے کی ممانعت کی کوئی علامت نہیں لگائی گئی تھی۔ مجھے مذکورہ گھر کی تلاشی لینے یا اس پر نظر رکھنے یا اس میں داخل ہونے والے کسی شخص کو حراست میں لینے سے متعلق مجسٹریٹ سے کوئی تحریری یا زبانی احکامات موصول نہیں ہوئے۔ یہ درست ہے کہ میرے پاس سہیل سانگی یا اس گھر میں داخل ہونے والے کسی اور فرد کو حراست میں لینے کے تحریری یا زبانی احکامات نہیں تھے اور نہ ہی اس نے کوئی قابلِ گرفت جرم کیا تھا، اسکے باوجود میں نے اسکو گرفتار کیا۔ میں نے سہیل سانگی کو شک کی بنیاد پر حراست میں لیا تھا۔ میں نے ایسی کوئی چیز برآمد نہیں کی

تھی جس کی بنیاد پر اسکو گرفتار کرتا۔ مجھے رکشہ والے، موٹر کار والے وغیرہ جیسے چار افراد کے علاوہ کوارٹر کے اندر یا باہر کوئی نظر نہیں آیا۔ میں نے اپنے کانسٹیبلز کو مشیران لانے کیلئے بھیجا تاہم وہ کسی کو اپنے ساتھ نہیں لائے۔ میں نے اپنے گواہی کے خلاصے کے بیان میں مشیران نہ ملنے کی بات نہیں کی تھی کیونکہ مجھ سے اس ضمن میں دریافت ہی نہیں کیا گیا تھا۔

مجھے کسی نے بھی نہیں بتایا تھا کہ ظفر اقبال کو مذکورہ کوارٹر پر تعینات کیا گیا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ مجھے ظفر اقبال کے احکامات ماننے سے متعلق کوئی تحریری یا زبانی احکامات نہیں ملے تھے۔ جیسا کہ ظفر اقبال نے مجھے بتایا کہ اُس نے مذکورہ مقدمے میں کچھ اور افراد کو بھی گرفتار کیا ہے، اس لئے یہ بھی اسکے حوالے کیا جائے۔ میں نے برآمد کی گئی اشیا اور ملزم کے مارشل لا ٹیم کے سپرد کرنے کے مشیر نامے کی ایک نقل اپنے پاس رکھی۔ میں نے اپنے پولیس اسٹیشن میں اس وقوعے / جرم سے متعلق کوئی ایف آئی آر درج نہیں کی۔ رسمی کاروائی مکمل کرنے اور ملزم کی حوالگی کے بعد میں اُنکو اسی گھر پر چھوڑ کر چلا گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کب اور کس طرح باقی تینوں افراد اور ملزم وہاں سے گئے۔ کوارٹر سے نکلنے کے بعد مجھے اپنے پولیس اسٹیشن جاتے ہوئے کوئی سرکاری اہلکار نہیں ملا۔ میں نے سہیل سانگی کی گرفتاری سے لیکر آج تک اس مقدمے کی کوئی جانچ پڑتال / تفتیش نہیں کی ہے۔ ظفر اقبال میرے وہاں پہنچنے کے وقت موجود تھا اور اس لئے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ وہ میرے بعد آئے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے اس لئے ایف آئی آر درج نہیں کی کیونکہ میں وہاں موجود نہیں تھا اور تمام تر کاغذی کاروائی مارشل لاء اختیاری والوں کے دباؤ پر کی گئی ہے۔ مجھے اُس گھر پر ملزمان کو لے جانے کیلئے مارشل لا ٹیم کا کوئی اہلکار یا کوئی گاڑی نظر نہیں آئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری موجودگی یا غیر موجودگی میں سب انسپکٹر ظفر اقبال اور کانسٹیبلز نے کوئی جانچ پڑتال یا تفتیش کی تھی۔ جب میں نے ملزم کو ظفر اقبال کے حوالے کیا تو اس نے ملزم کی عمومی تلاشی لی اور اس سے مزید کچھ برآمد نہیں کیا۔

(15 مارچ 1982 بروز پیر تک ملتوی)

(شفیع محمدی ایڈووکیٹ نے اپنی جرح مکمل کرلی)

15 مارچ 1982

استغاثہ کے گواہ غلام محمد سے اختر حسین ایڈووکیٹ کی جرح

میں جنوری 1980 سے اگست 1980 تک سولجر بازار پولیس اسٹیشن پر تعینات رہا۔ میری تقرری بطور اسسٹنٹ سب انسپکٹر ہوئی تھی۔ میری فروری 1981 میں سب انسپکٹر استغاثہ کے طور پر ترقی ہوئی۔ مئی 1981 میں میرا گواہی کے خلاصے کا بیان ریکارڈ ہوا۔ مجھے علم تھا کہ کانسٹیبلز کو چھاپہ مارے گئے گھر پر مقرر کیا گیا ہے اور میں وہاں انکو جانچنے گیا تھا۔ پولیس اسٹیشن کے ایک سینئر اہلکار نے مجھے آگاہ کیا تھا کہ کچھ روز قبل مذکورہ گھر سے تخریبی مواد برآمد کیا گیا تھا۔ میری پولیس اسٹیشن پر اس ضمن میں کوئی رپورٹ درج نہیں کی گئی تھی۔ جب میں چھاپہ مارے گئے گھر پہنچا تھا تو وہاں دو کانسٹیبلز کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ ملزم میرے پہنچنے سے دس پندرہ منٹ قبل سے کانسٹیبلز کی تحویل میں تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ظفر اقبال نے ملزم کی جامہ تلاشی لی اور مجھے برآمدگی کا مشیر نامہ تیار کرنے کی ہدایت کی۔ یہ درست ہے کہ برآمدگی کا مشیر نامہ تیار کرتے ہوئے دو آزاد مشیران کی موجودگی ہونی چاہیئے۔ میں ذاتی طور پر آزاد مشیران کی تلاش میں نہیں گیا تاہم میں نے کانسٹیبل ولایت کو اس کی ہدایت کی تھی۔

میں نے جامہ تلاشی لی، برآمدگی کا مشیر نامہ تیار کیا اور ملزم کو گرفتار کیا۔ میں چھاپہ مارے گئے گھر پر کوئی آدھا گھنٹہ رہا۔ گرفتاری کے بعد سہیل سانگی کو کبھی بھی میرے پولیس اسٹیشن پر نہیں رکھا گیا، کم از کم جب تک میں وہاں تعینات تھا اُس وقت تک تو نہیں۔ میں نے اپنے پولیس اسٹیشن کی ڈائری میں ملزم کی گرفتاری اور برآمدگی کا کوئی اندراج نہیں کیا۔ رضا کارانہ طور پر آگاہ کیا کہ میں نے اس سے متعلق اپنے ایس ایچ او کو زبانی طور پر ضرور بتایا تھا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ جب زبیر نے سہیل سانگی کی نشاندہی کی تھی تو اس وقت فوجی سپاہی موجود تھے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں فوجیوں سے ڈرتا ہوں۔ میں صرف اللہ سے ڈرتا ہوں۔

مجھے ایس ایچ او نارتھ ناظم آباد کے ذریعے ڈی ایس پی نارتھ ناظم آباد نے سیکشن 161

سی آر پی سی کے تحت میرا بیان درج کرانے کیلئے بلایا تھا۔ وہاں پر میں سب انسپکٹر استغاثہ زبیر سے ملا، جس کو میں ایک ہی محکمے میں کام کرنے کی وجہ سے پہلے سے جانتا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نہ تو مذکورہ گھر گیا تھا، نہ ہی میں نے برآمدگی کا مشیر نامہ بنایا، جامہ تلاشی لی اور ملزم کو گرفتار کیا، بلکہ میں نے یہ تمام تر کاروائی مارشل لا دفتر میں اپنے بالا افسران کے کہنے پر مکمل کی۔ یہ بھی کہنا درست نہیں ہوگا کہ میرا بیان ملزم کی غیر موجودگی میں ریکارڈ کیا گیا۔

بیرسٹر سید عبدالودود کی جرح

میں اپنے ملازمتی کیریئر کے دوران کئی جائے وقوعوں پر گیا ہوں۔ میں نے اپنی گواہی کے خلاصے کے موقع پر اپنی آمد کے وقت کا ذکر نہیں کیا۔ پاکستان کوارٹرز لورس پُل کی جانب جاتے ہوئے نشتر روڈ پر واقع ہیں۔ وہاں پر ایک کھلا میدان ہے تاہم میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ کھیل کا میدان ہے۔ 344/E کے بعد صرف ایک کوارٹر ہے تاہم یہ نہیں کہہ سکتا کہ گلی میں کل کتنے کوارٹر ہیں۔ کہہ نہیں سکتا کہ گھر کے دروازے کس نوعیت کے تھے۔ کہہ نہیں سکتا کہ آیا گھر کے پچھواڑے پر جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ جب میں گھر میں داخل ہوا تو کانسٹیبلز کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے جنہوں نے مجھ سے دعا سلام کی۔ وہاں پر باورچی خانہ اور غسل خانہ تھا تاہم میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ صحن میں کس جانب ہیں۔ کہہ نہیں سکتا کہ آیا صحن میں کوئی درخت بھی ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ مذکورہ کوارٹر میں کتنے کمرے تھے۔ عقبی دروازہ براہ راست کمرے میں کھُل رہا تھا۔ اسکے عقب اور سامنے کی دونوں گلیاں کچی ہیں۔

وہ چارپائی اور کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ وہاں پر چار لوگ سادہ کپڑں میں ملبوس تھے اور وہ مسلح تھے۔ سہیل سانگی کانسٹیبلز کے ساتھ کمرے میں اکیلے تھے۔ میری روانگی تک کوئی بھی مذکورہ گھر میں داخل نہیں ہوا، اور میں کوئی نصف گھنٹہ وہاں رہا۔ میں نے تفتیش تو نہیں کی تاہم میرے دریافت کرنے پر سہیل سانگی نے تصدیق کی کہ انہیں گھر میں داخل ہونے پر تحویل میں لیا گیا تھا۔ ظفر اقبال نے اپنی شناخت کرائی اور اپنا شناختی کارڈ مجھے دکھایا، جس کے بعد

میں نے سہیل سانگی کو اسکے حوالے کیا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ آیا میری روانگی کے بعد مزید گرفتاریاں کی گئیں یا نہیں۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ ملزم کو کب اور کہاں لے جایا گیا اور میرے جانے کے بعد ملزم کو کس کی تحویل میں رکھا گیا۔ گواہی کا خلاصہ مئی 1981 میں سنٹرل جیل میں ریکارڈ کیا گیا۔ گرفتاری سے قبل میں سہیل سانگی کو نہیں جانتا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ سہیل سانگی کو میں نے گرفتار نہیں کیا تھا اور یہ کہ میں نے برآمدگی اور گرفتاری کے مشیرنامے مارشل لاء ہیڈ کوارٹرز میں تیار کیے تھے اور میں جائے وقوعہ پر موجود نہیں تھا۔

(یوسف لغاری ایڈووکیٹ نے اس جرح پر اکتفا کیا- اگلی سماعت 16 مارچ 1982)

16 مارچ 1982- علی امجد ایڈووکیٹ موجود نہیں تھے، اس لئے سماعت 17 مارچ 1982 تک ملتوی۔

علی امجد ایڈووکیٹ نے جرح نہیں کی۔

غلام محمد کی جرح مکمل۔

17 مارچ 1982

استغاثہ کا گواہ ولایت خان ولد حاجی

ایگزامنیشن انچیف

31 جولائی 1980 کو میں سولجر بازار پولیس اسٹیشن پر بطور کانسٹیبل تعینات تھا۔ مجھے سولجر بازار پولیس اسٹیشن کے ایس ایچ او چودھری نثار نے پاکستان کوارٹرز کے ایک کوارٹر پر تعینات کیا۔ ایک اور کانسٹیبل نیاز احمد کو بھی میرے ساتھ مقرر کیا گیا تھا۔ ہمارے اوقات کار صبح آٹھ سے رات آٹھ بجے تک تھے۔ مجھے ایس ایچ او نے بتایا تھا کہ اس گھر پر کچھ روز قبل چھاپہ مارا گیا تھا اور مذکورہ گھر سے سیاسی مواد برآمد کیا گیا تھا۔ ہدایت یہ دی گئی تھی کہ مرکزی دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی جائے اور اندر آنے والے ہر شخص کو اے ایس آئی غلام محمد کے آنے اور رسمی کاروائی کرنے تک حراست میں رکھا جائے۔ اے ایس آئی غلام محمد گشت پر مامور اہلکاروں کا انچارج تھا۔ سہ پہر تقریباً تین بجے ایک شخص آیا، جس کا نام بعدازاں سہیل سانگی معلوم ہوا، جس کو ہم نے حراست میں لے لیا۔ دو تین منٹ بعد، سب انسپکٹر ظفر اقبال وہاں پہنچا۔ وہ وہاں پر ایک نجی موٹر کار کے ڈرائیور سمیت تین لوگوں کے ہمراہ وہاں آیا تھا۔ صرف ظفر اقبال وہاں رکا جبکہ باقی لوگ واپس چلے گئے۔ میں نے ظفر اقبال کو ملزم کے گھر میں داخل ہونے اور ہماری جانب سے اسکو حراست میں لینے کا بتایا۔ اسسٹنٹ سب انسپکٹر غلام محمد بھی چار پانچ منٹ بعد مذکورہ گھر پہنچ گیا تھا۔ گواہ نے ملزم کی نشاندہی کی اور اسکی شناخت کی۔ اسسٹنٹ سب انسپکٹر غلام محمد نے ملزم کی جامہ تلاشی لی اور برآمدگی و گرفتاری کا مشیر نامہ تیار کیا۔ گواہ نے مشیر نامے پر اپنے دستخط کی تصدیق کی۔ اس نے ملزم سے برآمد ہونے والی شناختی کارڈ عدالتی دستاویز Q-1 اور تصویر عدالتی دستاویز Q-2 کی بھی تصدیق کی۔ اس نے برآمد ہونے والی ڈائری اور کچھ کاغذات کا بھی ذکر کیا۔ سب انسپکٹر ظفر اقبال نے بھی ملزم کی عمومی تلاشی لی لیکن کچھ بھی برآمد نہیں کیا۔ اس نے ملزم اور برآمد ہونے والی اشیا ظفر اقبال کے سپرد کیں کیونکہ اس نے خود کو مارشل لاء ٹیم کے رکن کے طور پر متعارف کرایا

تھا۔ میں مرکزی دروازے کے پاس کھڑا تھا جب ظفر اقبال ملزم کولیکر روانہ ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسسٹنٹ سب انسپکٹر غلام محمد بھی ہمیں اپنی ڈیوٹی کے اوقات کار کے دوران وہاں رہنے کی ہدایت کر کے چلا گیا۔ رات تقریباً آٹھ بجے ہم مذکورہ گھر سے روانہ ہوکر رسمی اندراج کیلئے اپنے پولیس اسٹیشن گئے اور بعدازاں میں اپنے گھر چلا گیا۔ سنٹرل جیل کراچی میں واقع سرسری سماعت کی فوجی عدالت نے میرا بیان ریکارڈ کرنے کیلئے میری جرح/جانچ پڑتال کی۔ مجھے وہ قطعی وقت یاد نہیں ہے۔

علی امجد ایڈووکیٹ کی جرح

میں نے ملزم سہیل سانگی کو گرفتار نہیں کیا تھا، تاہم اسکو وہاں بٹھا دیا تھا۔ میں نے اسکو وہاں بٹھانے کیلئے طاقت کا استعمال نہیں کیا تھا، بلکہ وہ خود مذکورہ گھر میں داخل ہوا تھا۔ گھر کا دروازہ کنڈی چڑھا کر بند کیا ہوا تھا۔ میں مرکزی دروازے سے کوئی پانچ قدم کے فاصلے پر تھا۔ میں نے اس سے وہاں آنے کا مقصد دریافت نہیں کیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ پہلے اس گھر میں کون رہتا تھا۔ مجھے ایس ایچ او چودھری نثار نے حکم دیا ہوا تھا کہ وہاں آنے والے ہر ایک کو حراست میں لیا جائے۔ چودھری نثار تاحال محکمۂ پولیس کراچی میں ہے۔ میں چودھری نذیر کے قانونی احکامات ماننے کا پابند تھا، کیونکہ وہ میرے اعلیٰ افسر تھے۔ میں نے اُس سے کوئی سوال/دلیل نہیں کیا کہ آیا میں وہاں آنے والے ہر شخص کو گرفتار کروں، چاہے اس نے کوئی جرم نہ بھی کیا ہو۔ جب میں نے سہیل سانگی کو پکڑا تو اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ میں نے اُسکو کوئی جرم کرتے ہوئے یا امکانی طور پر کوئی جرم کرنے والا نہیں پایا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ غلام محمد مذکورہ گھر پر نہیں آیا تھا اور اس نے میری موجودگی میں مشیر نامہ تیار نہیں کیا تھا۔ یہ بھی کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں اُس گھر میں موجود نہیں تھا اور میں نے مشیر نامے پر دستخط کر دیئے۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اسکو چودھری نثار نے کوئی حکم نہیں دیا تھا، یا اس نام کا کوئی بندہ وجود ہی نہیں رکھتا۔

17 مارچ 1982

استغاثہ کے گواہ ولایت حسین سے بیرسٹر ایس عبدالودود کی جرح

اس وقت میں فیروز آباد پولیس اسٹیشن پر تعینات ہوں۔ میری ڈیوٹی کا اندراج روزنامچے میں کیا گیا تھا۔ میرے ساتھ جانے والا کانسٹیبل نیاز احمد تھا نہ کہ نیاز خان، جس کا نام گواہی کے خلاصے میں شامل ہے۔ میں نے اپنے بیان میں نیاز احمد نام بتایا تھا۔ پاکستان کوارٹرز لسبیلہ چوک جانے والے راستے پر واقع ہیں۔ یہ گاندھی گارڈن کے قریب ہیں۔ گھر کے سامنے ایک کچا راستہ ہے۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ہم اس میں داخل ہو کر چارپائی پر بیٹھ گئے جو وہاں موجود تھی۔ ہم صحن میں پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ صحن میں صرف ایک بیت الخلا ہے جبکہ باورچی خانہ اور دوسرا بیت الخلا کمرے میں ہیں۔ غسل خانے اور باورچی خانے والے کمرے میں کوئی فرنیچر موجود نہیں تھا۔ صحن سے کمروں کو جایا جاتا ہے۔ گھر کا عقبی دروازہ لکڑی کا ہے۔ دروازہ براہ راست کمرے میں کھل رہا تھا جسکی دیواریں سیمنٹ کی تھیں۔ صحن میں کوئی درخت نہیں ہے۔ صحن میں لوہے کی ایک پانی کی ٹنکی تھی۔ کمرے کے عقبی دروازے پر اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ سب انسپکٹر ظفر اقبال سہیل سانگی کے آنے سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ ظفر اقبال ہمارے پولیس اسٹیشن آتا رہتا تھا اور ہمارے ایس ایچ او کے ساتھ بیٹھتا تھا، اسی دوران مجھے معلوم ہوا کہ وہ فوجی اہلکار ہے۔ سہیل سانگی اکیلا تھا اور اسکے ساتھ کوئی اور نہیں تھا۔ سب انسپکٹر ظفر اقبال نے دروازہ کھٹکھٹایا تو میں نے باہر آ کر اسکو بتایا کہ ہم نے ایک شخص کو حراست میں لیا ہے اور وہ اندر ہے، جس پر اس نے ہمارے افسر غلام محمد کا دریافت کیا۔ میں نے اسکو بتایا کہ وہ وہاں آ کر چلا گیا ہے اور ہمیں کہہ کر گیا ہے کہ دوبارہ آئے گا۔ اسکے بعد ظفر اقبال ہمارے ساتھ اندر آیا اور صحن میں چارپائی پر بیٹھ گیا اور سہیل سانگی سے سوالات کرنا شروع کیے۔

میں یونیفارم میں لاٹھی اُٹھائے ہوئے تھا، نیاز بھی ویسے ہی تھا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ غلام محمد مذکورہ گھر تک کس گاڑی میں آیا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ گرفتاری اور برآمدگی کا مشیر نامہ پولیس اسٹیشن پر تیار کیا گیا۔ مجھے اس گھر میں داخل ہونے والے ہر فرد کو تحویل میں لینے کا حکم دیا گیا

تھا۔ ظفر اقبال ملزم اور برآمد کی گئی اشیا کے ہمراہ جائے وقوعہ سے روانہ ہوا، جس کے دس پندرہ منٹ بعد غلام محمد بھی چلا گیا اور ہم سے یہ کہہ گیا کہ وہ دوبارہ آئے گا۔ یہ سب کچھ تقریباً ساڑھے تین بجے مکمل ہوا۔ ہم وہاں پر رات آٹھ بجے تک موجود رہے۔ میں نے مغرب کی اذان سنی لیکن روشنی نہیں کی اور صحن میں ہی بیٹھا رہا۔ کوارٹرز میں بجلی کا انتظام ہے۔ سب انسپکٹر ظفر اقبال اور اسسٹنٹ سب انسپکٹر غلام محمد کے آنے کی تفصیل گواہی کے خلاصے میں دی تھی۔ مجھے بیان پڑھ کر نہیں سنایا گیا تھا تاہم مجھ سے اس پر دستخط کرنے کیلئے کہا گیا تھا۔ میں نے پہلے عدالت میں بیٹھے ہوئے ملزم کو نہیں دیکھا تھا جس کو میں نے 31 جولائی 1980 کو گرفتار کیا تھا۔ میں ملزم سے گواہی کے خلاصے والے کے ریکارڈ کرائے جانے والے دن ملا تھا۔ میں نے گواہی کے خلاصے کے وقت سنٹرل جیل میں جام ساقی کا نام سُنا تھا۔ گواہی کی خلاصے کے موقعے پر سہیل سانگی نے ہم سے بھاگنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ ملزم کو سادہ کپڑوں میں ملبوس دو افراد کے ہمراہ کس وقت موٹر کار میں لے جایا گیا۔ یہ وہی گاڑی تھی جو صبح بھی آئی تھی۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ چھاپہ مارے جانے والے گھر سے ایسی کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی اور مشیر نامہ مارشل لاء ہیڈ کوارٹرز میں تیار کیا گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ سہیل سانگی کو اس لئے گرفتار کیا گیا کہ وہ جام ساقی کا چچازاد بھائی ہے۔

شفیع محمدی ایڈووکیٹ کی جرح

میں محکمۂ پولیس میں گذشتہ چھ برس سے ہوں۔ میں مکمل طور پر ان پڑھ ہوں۔ سوائے دستخط کرنے کے، میں کچھ بھی لکھ پڑھ نہیں سکتا تاہم میں ''فرد'' کے دستخط کو شناخت کرسکتا ہوں، میرا مطلب ہے کہ فرد اور کسی جگہ یا فرد سے برآمد ہونے والی اشیا کے تفصیل شناخت کرسکتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ مذکورہ جگہ پر تیار کیے جانے والے مشیر نامے میں اسسٹنٹ سب انسپکٹر غلام محمد نے کیا لکھا تھا تاہم میں نے اس مشیر نامے پر دستخط کیے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ دوسرا کانسٹیبل نیاز پڑھا لکھا ہے یا نہیں۔ میں نے سہیل سانگی سے برآمد ہونے والی اشیا پر دستخط نہیں کیے۔ میں نے ان اشیا پر کوئی علامت ثبت نہیں کی تھی جس کی بنیاد پر عدالت کے روبرو اس بات کی تصدیق کر

سکوں کہ آیا یہ وہی چیزیں ہیں جو کہ مجھے دکھائی گئی تھیں۔ مجھے ان کانسٹیبلز کے نام یادنہیں ہیں جنہوں نے ہمیں فارغ کیا تھا، اگر چہ وہ ہماری ہی پولیس اسٹیشن کے تھے۔اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ دونوں کانسٹیبلز اسکے پولیس اسٹیشن پر حال ہی میں تعینات ہوئے تھے۔ مذکورہ گھر پر میری اور نیاز کی پہلی تعیناتی تھی۔ مجھے یا میرے کسی دوست کو ملازمت کے پورے دورانیے میں کبھی بھی پاکستان کوارٹرز میں کوئی کوارٹر الاٹ نہیں ہوا۔ میں اور نیاز چھاپہ مارے گئے مذکورہ کوارٹر پر ایک ساتھ گئے تھے تاہم کوئی افسر یہ کوارٹر دکھانے کیلئے ہمارے ساتھ نہیں گیا تھا۔ مجھے پولیس اسٹیشن کے ڈیوٹی افسر نے بتایا تھا کہ ہمیں ایک پولیس کانسٹیبل پل کے قریب دروازے پر ملے گا جو کہ کوارٹر تک ہماری رہنمائی کرے گا۔ وہ کانسٹیبل بھی ہماری پولیس اسٹیشن کا تھا تاہم مجھے اسکا نام یادنہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آج کل وہ کہاں تعینات ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے سرسری سماعت کی فوجی عدالت میں کہا تھا کہ ”اسکے (سہیل) اندر داخل ہونے کے دوران میں نے اسکو روکا تھا۔“ یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ میں نے سرسری سماعت کی فوجی عدالت کو بتایا تھا کہ ”میں اُس سے جانچ پڑتال کر رہی رہا تھا کہ اُسی پولیس اسٹیشن کا اسسٹنٹ سب انسپکٹر غلام محمد بھی وہاں پہنچ گیا۔“ یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ میں نے سرسری سماعت کی فوجی عدالت کو بتایا تھا کہ اُس نے (اسسٹنٹ سب انسپکٹر) سہیل سانگی کی جامہ تلاشی لی، جس دوران ایک موٹر گاڑی بھی آ گئی۔“ یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ میں نے سرسری سماعت کی فوجی عدالت کے سامنے کہا تھا کہ ”اس دوران وہ لوگ بیٹھ گئے اور خود کو فوجی اہلکار کے طور پر متعارف کرایا، جن میں سے ایک ظفر اقبال تھا۔“ عدالت تصدیق کرتی ہے کہ عدالتی اِقتباس میں جملے گواہی کے خلاصے کے بیان کے عین مطابق ہیں۔ یہ شخص درست نہیں بول رہا ہے کہ اسسٹنٹ سب انسپکٹر غلام محمد ظفر اقبال کے ساتھ چلا گیا تھا بلکہ وہ ہمارے ساتھ ملزم کے ہمراہ موجود تھا۔ اس مرحلے پر وکیلِ صفائی نے گواہ پر منکشف کیا کہ اسسٹنٹ سب انسپکٹر غلام محمد نے ہی ایسا بتایا ہے۔ جس پر گواہ نے کہا کہ ”مجھ سے غلطی ہوئی ہے، درحقیقت ظفر اقبال ہمارے ساتھ تھا اور غلام محمد چلا گیا تھا۔

(شفیع محمدی ایڈووکیٹ 24 مارچ 1982 کو اپنی جرح جاری رکھیں گے)

24 مارچ 1982

شفیع محمدی کی جرح

بیان ایک فوجی اہلکار نے ریکارڈ کیا تھا تاہم مجھے اُس کا رینک معلوم نہیں ہے۔ جس فوجی اہلکار نے میرا بیان ریکارڈ کیا تھا اس نے مجھے وہ اس زبان میں نہیں پڑھ کر سنایا تھا جو کہ میں سمجھتا ہوں۔ یہ میرے بیان میں درست طور پر لکھا ہوا ہے کہ ''ایک موٹر کار بھی آئی جس سے سادہ کپڑوں میں ملبوس لوگ اُترے اور انہوں نے خود کو فوجی اہلکار کے طور پر متعارف کرایا۔ ان میں سے ایک ظفر اقبال تھا۔ یہ درست نہیں ہے کہ میں نے گواہی کے خلاصے میں بتایا تھا کہ سہیل سانگی کو وہاں آنے والے فوجی اہلکار اپنے ساتھ لے گئے۔ رضا کارانہ طور پر آگاہ کیا کہ اسکو ظفر اقبال لے گیا تھا تاہم اسکو معلوم نہیں کہ ملزم کو کس گاڑی میں لے جایا گیا۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ میں نے گواہی کے خلاصے میں کہا تھا کہ میں ابھی اس سے جانچ پڑتال کر رہا تھا کہ اُسی پولیس اسٹیشن کا اسسٹنٹ سب انسپکٹر غلام محمد بھی وہاں آ گیا اور اس نے سہیل سانگی کی جامہ تلاشی لی، جس دوران ایک موٹر کار بھی آئی جس سے سادہ کپڑوں میں ملبوس لوگ اُترے۔ گواہ کی جانب سے دستخط کیا ہوا بیان گواہ کو دکھایا گیا۔

مجھے ایس ایچ او نے مذکورہ گھر پر چھاپے کی تاریخ اور وقت کے متعلق نہیں بتایا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ مجھے بتایا گیا تھا کہ مذکورہ چھاپہ میری تعیناتی سے دو تین روز قبل مارا گیا تھا۔ یہ درست ہے کہ ہم نے مذکورہ گھر میں دو کانسٹیبلز کی جگہ لیکر انکو فارغ کیا تھا۔ اُن دو کے علاوہ وہاں پر کوئی اور نہیں تھا۔ مجھے ان کانسٹیبلز کے نام معلوم نہیں ہیں۔ ہمیں کسی نے آ کر فارغ نہیں کیا تھا اور ہم نے گھر کو خالی چھوڑا تھا۔ سہیل سانگی سہ پہر تین بجے گھر میں اکیلا داخل ہوا تھا۔ ظفر اقبال اسکے آنے کے کوئی دس پندرہ منٹ بعد آیا تھا۔ سب انسپکٹر ظفر اقبال نے ملزم کی جامہ تلاشی نہیں لی تھی۔ اسسٹنٹ سب انسپکٹر غلام محمد ظفر اقبال کے آنے کے تین چار منٹ بعد آیا تھا۔ جب اسسٹنٹ سب انسپکٹر غلام محمد نے میری موجودگی میں جامہ تلاشی لی اور مشیر نامہ تیار ہوا تو میں نے اس پر دستخط کیے۔ میں اُس گھر میں تلاشی سے لیکر، مشیر نامہ بننے اور دستخط ہونے تک موجود رہا۔ یہ بھی درست

ہے کہ میں اس دوران گھر سے باہر نہیں گیا تھا۔ کانسٹیبل نیاز نے بھی یہی کیا اور وہ بھی گھر سے باہر نہیں گیا۔ مشیر نامہ تیار کرتے ہوئے اسسٹنٹ سب انسپکٹر غلام محمد اردگرد کا جائزہ لینے کیلئے باہر گیا تھا۔ اسسٹنٹ سب انسپکٹر غلام محمد کی جانب سے جامہ تلاشی کے بعد سب انسپکٹر ظفر اقبال نے شاید اسکے جسم کو چھوا تھا۔ میں نے عمومی تلاشی لی تھی۔ مجھے جائے وقوعہ پر ملزم کی لی جانے والی جامہ تلاشی کا مطلب معلوم نہیں ہے۔ دوبارہ کہا کہ مجھے ذاتی/جامہ تلاشی کا مطلب معلوم ہے۔

استغاثہ کا گواہ محمد امین جمالی

اگست 1980 کے دوران میں اے سی ایم II-، ضلع جنوبی کراچی تھا۔ 28 اگست 1980 کو میں نے سیکشن 164 کے تحت ملزم غلام شبیر شر کا ایس پی زبیر احمد نارتھ ناظم آباد کے توسط سے اعترافی بیان ریکارڈ کیا۔ ملزم کو میری تحویل میں دیا گیا، جس کو آگاہ کیا گیا کہ اس کی کہی ہوئی باتیں تحریر میں لائی جائیں گی اور وہ اسکے خلاف بھی استعمال ہوسکتی ہیں۔ ملزم کو ڈیڑھ بجے سے ڈھائی بجے تک غوروخوص کرنے کا موقعہ فراہم کیا گیا جس دوران تفتیشی پولیس کا اس سے کوئی بلاواسطہ یا بالواسطہ رابطہ نہیں تھا۔ اسکا بیان میرے چیمبر میں لیا گیا جہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ غوروخوص والے دورانیے میں وہ میرے چیمبر میں تھا۔ میں نے اپنے طور پر اطمینان کیا تھا کہ کوئی بھی پولیس اہلکار کسی ایسی جگہ نہیں ہو جہاں سے وہ کارروائی سن یا دیکھ سکے۔ میں نے اسکو دوبارہ آگاہ کیا کہ وہ کوئی اعتراف کرنے کیلئے پابند نہیں ہے اور اگر (اعتراف) کرتا ہے تو وہ اسکے خلاف بھی استعمال ہوسکتا ہے۔ اسکے بعد میں نے مقررہ فارم پر اسکا بیان درج کیا اور اس پر ملزم غلام شبیر شر کے دستخط حاصل کیے۔ میں نے تفصیلی بیان کے ہر صفحے پر دستخط لیے تھے۔ بیان اور پروفارما پر میرے بھی دستخط ہیں۔ گواہ نے اصل اعترافی بیان اور فارم عدالت میں پیش کیئے جن کو عدالت نے عدالتی دستاویز R.O کے طور پر شامل کیا۔

31 اگست 1980 کو سب انسپکٹر استغاثہ زبیر احمد نے اعترافی بیان ریکارڈ کرانے کیلئے دوپہر تقریباً دو بجے ملزم احمد کمال وارثی کو پیش کیا۔ میں نے ملزم کو متنبہ کیا کہ وہ کوئی بیان دینے کیلئے پابند نہیں ہے اور یہ اسکے اپنے خلاف بھی استعمال ہوسکتا ہے۔ بعدازاں اسکو غوروخوص کرنے کیلئے دو بجے سے تین بجے کا وقت دیا گیا۔ ملزم کو میرے چپراسی کی تحویل میں رکھا گیا تھا۔ تفتیشی پولیس کی کارروائی تک کوئی رسائی نہیں تھی۔ غوروخوص کے بعد میں نے اسکو ایک مرتبہ پھر متنبہ کیا کہ وہ کوئی اعتراف کرنے کیلئے پابند نہیں ہے اور سب کچھ تحریری صورت میں لایا جائے گا

اور یہ اسکے خلاف بھی استعمال ہوسکتا ہے۔ میں نے اپنے طور پر اطمینان کیا کہ کوئی بھی پولیس اہلکار ایسی کسی جگہ نہیں ہے جہاں سے وہ اس کاروائی کو دیکھ یا سن سکے۔ بیان مقررہ فارم پر میرے چیمبر میں ریکارڈ ہوا اور اس پر ملزم کے دستخط لیے گئے، جس کے بعد میں نے بھی دستخط کیے۔ میں دستخط کی تصدیق کرتا ہوں۔ تفصیلی بیان کے ہر صفحے پر ملزم کے دستخط حاصل کئے گئے تھے۔ ملزم کا اصل بیان عدالت میں پیش کر رہا ہوں۔ عدالت نے اسکا جائزہ لیکر اسکو "s" کی علامت دی۔ میں دونوں ملزمان کو عدالت میں بیٹھے ہوئے شناخت کرنے سے قاصر ہوں، کیونکہ اس امر کو ڈیڑھ برس سے زائد کا عرصہ بیت چکا ہے۔

علی امجد ایڈووکیٹ کی جرح

میں گذشتہ 38 برس سے سرکاری ملازمت میں ہوں، جس دوران مختلف مواقع پر مجسٹریٹ کے طور پر فرائض ادا کرتا رہا ہوں۔ میں نے کئی اعترافی بیانات ریکارڈ کیے ہیں۔ میں نے اس مقدمے کے ضمن میں گواہی کے خلاصے کے سامنے اپنا بیان درج کرایا تھا۔ میں نے عدالت کے سامنے پیش کیے گئے دستاویزات سے اپنی یادداشت کو تازہ کیا ہے۔ یہ درست نہیں ہے کہ دونوں ملزمان کے مقدمے میں گواہی کے خلاصے کے دوران مقررہ فارم پیش نہیں کیے گئے تھے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ میں نے یہ ذکر نہیں کیا کہ، ''کہ میں نے ملزم کو متنبہ کیا تھا کہ وہ اعترافی بیان دینے کیلئے پابند نہیں ہے اور کوئی بھی بیان خود اسکے خلاف بھی استعمال ہوسکتا ہے۔'' میں نے سرسری سماعت کی فوجی عدالت کے سامنے گواہی کا خلاصہ دیتے ہوئے نہیں بتایا تھا۔ ''کہ میں نے غور وخوص کے وقفے کے بعد دوبارہ متنبہ کیا تھا کہ وہ اعتراف کرنے کیلئے پابند نہیں ہے، اور یہ کہ یہ بیان اسکے خلاف بھی استعمال ہوسکتا ہے'' اور یہ کہ میں نے گواہی کے خلاصے کے دوران یہ نہیں بتایا تھا کہ غور وخوص کے وقفے کے دوران تفتیشی پولیس کی کسی بھی ملزم تک بلاواسطہ یا بالا واسطہ رسائی نہیں تھی۔ میں نے کسی بھی ملزم کے حوالے سے یہ بیان نہیں دیا تھا۔ مجھے گواہی کا خلاصہ ریکارڈ ہونے کی تاریخ اور مہینہ یاد نہیں ہے۔ شاید میں نے گواہی کے خلاصے کا بیان 1981 میں

دیا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ مئی 1981 تھا۔ ایک مجسٹریٹ کے طور پر میں جانتا ہوں کہ اعترافی بیان ریکارڈ کرتے ہوئے ملزم کو یہ باور کرانا ضروری ہے کہ وہ ایسا کرنے کیلئے پابند نہیں ہے اور یہ بیان خود اُسکے خلاف بھی استعمال ہوسکتا ہے۔ میں نے اُس جرم کو جاننے کی کوشش نہیں کی جو ملزم پر عائد کیا گیا تھا۔ میں ملزم سے اسکے بیان کے ذریعے جان سکا کہ اسکو آرمی سروس کور بیس کوارٹر کینٹ اسٹیشن پر قید رکھا گیا ہے اور میرے پاس 28 اگست 1980 کو کوارٹر گارڈ سے دوپہر ساڑھے بارہ بجے بھیجا گیا ہے۔ مجھے کمال وارثی نے بتایا کہ اُسکو 29 جولائی 1980 کو سہ پہر ساڑھے تین بجے پیپلز کالونی کراچی سے گرفتار کیا گیا اور گرفتاری کے بعد مارشل لاء ہیڈکوارٹرز لے جایا گیا جہاں سے اسکو لایا گیا ہے۔ سب انسپکٹر استغاثہ زبیر نے دونوں ملزمان کی حراست کے ضمن میں کوئی وارنٹ یا سند پیش نہیں کی۔ یہ کہنا درست ہے کہ میں نے گواہی کے خلاصے میں یہ نہیں بتایا کہ ملزمان کو کہاں سے لایا گیا تھا۔ میں اردو لکھ نہیں سکتا، لیکن شائع شدہ مواد پڑھ سکتا ہوں۔ ملزم شبیر شر نے اپنا بیان سندھی میں جبکہ کمال وارثی نے اپنا بیان اردو میں دیا۔ میں اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرسکتا ہوں لیکن سندھی سے انگریزی میں نہیں کرسکتا۔ اعتراف قبولیت ہے۔ میں اس سے اتفاق کروں گا کہ بہتر ہوگا کہ اعترافی بیان اُسی زبان میں ریکارڈ کیے جائیں جس میں وہ دیئے گئے ہوں تاہم یہ ضروری نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ ملزمان کو نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن کی حدود سے حراست میں لیا گیا تھا اور نہ جانے کیوں انہیں میرے سامنے پیش کیا گیا جبکہ نہ تو نارتھ ناظم آباد میری حدود میں ہے اور نہ ہی میں اردو پڑھ سکتا ہوں۔ میرے خیال میں اگر کسی شخص کو مسلسل دوراتیں سونے نہ دیا جائے تو یہ تشدد کے زمرے میں آتا ہے۔ اگر یہ ثابت ہو کہ کوئی ملزم تشدد کی وجہ سے اعترافی بیان دے رہا ہے تو ایسا بیان رضاکارانہ بیان کے زمرے میں نہیں آتا۔ کسی بھی ملزم کے مقررہ فارم کی دوسری جانب دستخط نہیں ہیں، یہ اس کام کیلئے نہیں ہے۔ میں نے انہیں مقررہ فارم کی دوسری جانب درج احتیاطی تدابیر / ہدایات کے متعلق نہیں بتایا تھا، جو کہ میری جانب سے اختیار کی گئیں۔ میں ملزمان کے لائے جانے سے لیکر انکے بیان مکمل ہونے تک اپنے دفتر میں ہی رہا۔

مخدوم حیات خان ولد محمد حیات

مسلم، بالغ

سکنہ: لیاقت آباد پولیس لائین کراچی، ذات پٹھان

4 نومبر 1980 کو میں ایس ایچ او منگھوپیر کے طور پر تعینات تھا۔ اُس دن دو پہر ایک بجے، میں ممتاز حسین برنی، ڈی ایس پی نارتھ کراچی اور ایک شہری گواہ ملک محمد اشرف کے ہمراہ الیوسف چیمبر، فریئر روڈ، شاہراہ لیاقت کی چھٹی منزل گیا تھا، جہاں پر بدر جمال ابڑو کا دفتر تھا۔ بدر جمال ابڑو اُس وقت اپنے دفتر میں موجود تھے۔ میں عدالت میں بیٹھے ہوئے بدر جمال ابڑو کو شناخت کرسکتا ہوں۔ ان کو ڈی ایس پی ممتاز برنی نے گرفتار کیا۔ ڈی ایس پی ممتاز برنی نے میری موجودگی میں تلاشی لی۔ مشیر نامہ ڈی ایس پی نے میری، ملک اشرف اور ملزم کی موجودگی میں تیار کیا تھا، جس پر میں نے ملک محمد اشرف اور ملزم کی موجودگی میں دستخط کیے تھے۔ گواہ نے یہ عدالتی دستاویز U کے طور پر پیش کیا۔ ملک اشرف نے بھی جائے وقوعہ پر اسی مشیر نامے پر دستخط کیے تھے۔ میں جائے وقوعہ سے برآمد ہونے والی اشیا یہاں پر دیکھ رہا ہوں، جس میں اہم پاسپورٹ نمبر اے ایچ 413739، اسکا قومی شناختی کارڈ نمبر 8-0101-53-510، ڈائری، چار کارڈز سمیت، جس میں سے ایک پر کوڑے لگتے ایک شخص کا خاکہ اور جلی حروف میں پاکستان تحریر ہے جو کہ پاکستان فیڈرل یونین آف اسٹوڈنٹس کی جانب سے شائع کردہ، تاریخ 4 جون 1979 اور 3 جون 1978 کے روزنامہ ہلال پاکستان کے دو شمارے، بدر جمال ابڑو کے مضامین اور تصاویر کے ساتھ، اور ایک عدد فائل جس میں کاغذات اور ہاتھ سے تحریر کی ہوئی نظمیں اور دیگر خطوط شامل تھے (برآمد کی گئی ان اشیا کی اہمیت پر تفتیشی اہلکار ممتاز احمد برنی روشنی ڈالیں گے)۔ میں نے گذشتہ برس ایم پی اے ہاسٹل میں گواہی کے خلاصے کا بیان دیا تھا۔

5 مئی 1982

شفیع محمدی ایڈووکیٹ کی جرح

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں ممتاز برنی اور ملک اشرف کے ہمراہ نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن میں واقع ایس ڈی پی او دفتر سے گیا تھا۔ ہم ایک پولیس جیپ میں گئے تھے جو کہ ڈی ایس پی نے دی تھی۔ میں نے ملک اشرف کو نہیں بلایا تھا۔ میں اس سے قبل ملک اشرف کو نہیں جانتا تھا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ مجھے پولیس اسٹیشن سے بلایا گیا تھا یا کہیں اور سے۔ مجھے یاد نہیں کہ جس وقت میں نے ڈی ایس پی کو رپورٹ کیا تھا اس وقت ملک اشرف موجود تھا یا نہیں۔ میں، ڈی ایس پی ممتاز برنی، ملک اشرف اور ہیڈ کانسٹیبل منشی، جس کا نام مجھے یاد نہیں ہے، الیوسف چیمبرز میں واقع بدر جمال ابڑو کے دفتر میں داخل ہوئے تھے۔ اس چوتھے فرد نے تلاشی میں حصہ لیا تھا یا نہیں؟

جواب: وہ کمرے یعنی دفتر میں موجود تھا، تلاشی ڈی ایس پی ممتاز نے لی تھی اور اسکو برآمد ہونے والی اشیا کی فہرست تیار کرنے کیلئے کہا گیا تھا۔ یہ بات درست نہیں ہے کہ اس نے کمرے میں موجود الماری اور بکسوں کی تلاشی لی تھی۔ ڈی ایس پی ممتاز برنی کی جانب سے برآمدگی کے بعد ہاتھ کی جانے والی اشیا چھاپہ مارنے والی ٹیم کے نظروں کے سامنے واضح تھیں۔ جب ہم چھاپہ مارنے کیلئے روانہ ہوئے تو مجھے علم نہیں تھا کہ ہم کس جگہ چھاپہ مارنے جا رہے ہیں۔ مجھے بدر جمال کا نام معلوم تھا اور ہم اس مقدمے کے سلسلے میں اسکی تلاش میں تھے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے جزوی طور پر اس مقدمے میں تفتیش کی ہے۔ بدر ابڑو کے علاوہ اسکے دفتر میں عملے کے دیگر لوگ بھی تھے۔ اسکے دفتر میں ایک تقسیم تھی اور برآمد ہونے والی زیادہ تر اشیا اسکی ذاتی میز سے ہی حاصل کی گئیں۔ صرف ایک یا دو رجسٹر دوسرے حصے سے حاصل کیے گئے، جہاں دو لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ عدالتی دستاویز U میں نمبر شمار 1 سے 18 تک ذکر کی گئی اشیا بدر کی ذاتی میز سے حاصل کی گئیں جبکہ باقی دو چیزیں دو دیگر افراد کی میزوں سے حاصل کی گئیں جو کہ وہاں موجود تھے۔ گواہی کے خلاصے یا کہیں اور میں نے وہاں موجود دیگر دو افراد کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی ہیڈ کانسٹیبل منشی کا، کیونکہ مجھ سے اس ضمن میں دریافت نہیں کیا گیا تھا۔

مجھے یاد نہیں ہے کہ آیا ڈی ایس پی برنی نے بدر ابڑو کو کوئی وارنٹ دکھایا تھا۔ بدر ابڑو کو برنی نے تلاشی اور اسکی گرفتاری کے اسباب سے آ گاہ کیا تھا۔ تلاشی اور رسمی کاروائی کی تکمیل کیلئے لگ بھگ ایک گھنٹہ مطلوب ہوتا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی بشمول چھاپہ مارنے والی پارٹی اور دفتر میں موجود افراد رسمی کاروائی مکمل ہونے تک دفتر سے کہیں نہیں گیا۔ وہاں چار سو سے چھ سو کمرے (دفاتر) ہیں جہاں سے وکلا اور ایجنٹس سمیت مختلف لوگ اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ بدر ابڑو کے دفتر سے متصل دوسرے دفاتر ہیں۔ ہم سب سادہ کپڑوں میں تھے اس لئے کسی کو ہمارے دفتر میں داخل ہونے اور ارادے کا عندیہ نہیں ملا۔ برآمد ہونے والی اشیا پر انکی برآمدگی کی جگہ یا ملکیت کا تعین کرنے والی کوئی مخصوص علامت ثبت نہیں کی گئی، تاہم مجھے قطعی طور پر یاد ہے کہ عدالتی دستاویز U میں نمبر شمار 1 سے 18 تک درج کی گئی اشیا بدر ابڑو کی میز سے برآمد ہوئی تھیں جبکہ باقی دو چیزیں دیگر افراد سے۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ڈی ایس پی برنی نے کمرے میں موجود دونوں افراد سے انکی شناخت دریافت کی تھی، اُن میں سے ایک مینیجر یا کلرک تھا جبکہ دوسرا موکل۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ آیا ان دونوں افراد کے بیانات ریکارڈ کیے گئے تھے یا نہیں۔ بدر کی جامہ تلاشی لی گئی تھی لیکن کچھ بھی برآمد نہیں ہوا تھا۔ ایک چھوٹے تھیلے میں کچھ نقدی تھی جس کو قبضے میں نہیں لیا گیا تھا اور یہ بدر جمال نے مینیجر / کلرک کے حوالے کی تھی۔ چونکہ نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن پر لاکپ نہیں ہے اس لئے ملزم کو حراست کیلئے منگھوپیر پولیس اسٹیشن لے جایا گیا (بدر ابڑو کا نوٹ: میں ایک ہفتہ تک نارتھ ناظم آباد میں رہا)۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ ملزم کے دفتر میں موجود دونوں افراد کو، جن سے رجسٹر برآمد کیے گئے تھے، ہم نے اپنے ساتھ نہیں لیا تھا۔ دفتر کو تحویل میں نہیں لیا گیا تھا۔ میں نے اس مقدمے میں کوئی براہ راست تفتیش نہیں کی تاہم میں ڈی ایس پی ممتاز برنی کی ملزم سے تفتیش کے دوران موجود رہا کیونکہ وہ میرے پولیس اسٹیشن کی تحویل میں تھا۔

یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ملک اشرف نامی شخص کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، جس نے بدر جمال ابڑو کے دفتر کی تلاشی میں حصہ لیا۔ یہ کہنا بھی درست نہیں ہوگا کہ مشیر نامہ (عدالتی دستاویز U)

جعلی ہے اور اس پر ایک جعلی شخص کے دستخط ہیں۔ یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ مشیر نامہ پولیس اسٹیشن پر تیار کیا گیا اور اس پر پولیس ٹاؤٹ کے دستخط لیے گئے۔ یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ بدر ابڑو کی گرفتاری کے بعد انکے دفتر سے کچھ بھی برآمد نہیں کیا گیا تھا۔

8 مئی 1982

مخدوم حیات سے یوسف لغاری ایڈووکیٹ کی جرح

میں 4 اکتوبر 1980 سے قبل کبھی بھی اس مقدمے میں تفتیشی اہلکار نہیں رہا۔ مجھے اس مقدمے میں تفتیشی اہلکار کی معاونت کرنے پر تعینات کیا گیا تاہم مجھے تاریخ یاد نہیں ہے۔ بدر ابڑو کے دفتر پر چھاپے سے قبل مجھے تفتیشی اہلکار کی معاونت کرنے کی ہدایت کی گئی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ایس پی لیاقت آباد نے مجھے اس ضمن میں ہدایت دی تھی۔ یہ درست ہے کہ یہ مقدمہ منگھوپیر پولیس کا نہیں ہے۔ میں ایس ایچ او نارتھ ناظم آباد انسپکٹر صفدر بھٹی کے ہمراہ تفتیشی اہلکار ممتاز برنی کی صرف اس مقدمے میں معاونت کر رہا تھا۔ جب برنی اس مقدمے کی تفتیش کر رہا تھا تو صرف ہم دونوں ہی اسکی ٹیم کے اراکین تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایس پی لیاقت آباد نے مجھے تحریری ہدایات کی تھیں۔ اس تحریر کا پولیس اسٹیشن کے ریکارڈ میں اندراج ہے۔ میں نے اس ضمن میں کیس ڈائری کے اندراج کا جائزہ نہیں لیا ہے۔

مجھے یاد نہیں ہے کہ آیا بدر ابڑو کے دفتر سے برآمد کی گئی اشیا سر بہ مہر کی کی گئی تھیں یا نہیں۔ اس وقت عدالت کے روبرو پیش کرتے وقت بدر کے دفتر سے برآمد کی گئی اشیا سر بہ مہر نہیں ہیں۔ جب میں نے اشیا عدالت میں پیش کیں تو یہ سر بہ مہر نہیں تھیں۔ میں نے یہ اشیا 5 مئی کو سب انسپکٹر استغاثہ زبیر سے وصول کیں۔ دفتر پر چھاپے سے لیکر آج تک یہ اشیا میری تحویل میں نہیں تھیں۔ یہ اشیا نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن پر تھیں۔ میں سندھی تھوڑی بہت پڑھ اور سمجھ سکتا ہوں۔ میں نے بدر جمال کے دفتر سے برآمد ہونے والے دو اخبارات (ہلال پاکستان) پر سرسری نظر ڈالی

تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہلال پاکستان کو سرکاری مالی معاونت حاصل ہے یا نہیں۔ یہ درست ہے کہ ہلال پاکستان حکومتی اجازت کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ مذکورہ اخبار میں شائع ہونے والے بدر جمال کے دونوں مضامین پر حکومت نے پابندی عائد نہیں کی ہے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ آیا کیس ڈائری میں دو افراد یعنی مینیجر / کلرک اور موکل کے بیان کا کوئی ذکر ہے یا نہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ان دونوں افراد کا بیان تفتیشی اہلکار برنی نے ریکارڈ کیا تھا بلکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ اُس نے اُن سے کچھ معلوم کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ بدر جمال کا دفتر چھٹی منزل پر تھا نہ کہ دوسری منزل پر۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ کمرہ نمبر 201 بدر کا دفتر تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ کمرہ نمبر 29 تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ''میں نے'' کمرہ نمبر 201 کی تلاشی لی۔ بدر کا دفتر افرادی قوت کی بھرتی اور ٹریولنگ ایجنسی کے دفتر کے طور پر چلایا جا رہا تھا۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ عدالتی دستاویز U کے نمبر شمار 6 اور 7 کے علاوہ تمام نمبر شمار اسکے اپنے دفتر کی بھرتیوں کے ریکارڈ کے حوالے سے ہیں۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ نمبر شمار 1 سے 5 اور 8 سے 20 تک میں درج اشیا کا بدر جمال کے مجرمانہ ثبوت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ قابلِ اعتراض نہیں ہیں۔ میں نے بدر کیلئے کوئی ریمانڈ نہیں لیا۔ گارڈ کمانڈر پولیس لاکپ کا انچارج سمجھا جاتا ہے اور وہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ گارڈ کمانڈر ایس ایچ او کے تحت ہوتا ہے۔ ایس ایچ او کے طور پر میں عمومی طور پر جانچ پڑتال کرتا رہتا ہوں کہ کہیں کسی کو غیر قانونی حراست میں تو نہیں رکھا گیا ہے۔ بدر جمال سے متعلق تمام تر اندراج منگھوپیر پولیس اسٹیشن پر موجود ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ایسا ریکارڈ پولیس اسٹیشن پر موجود نہیں ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے بدر کو غیر قانونی طور پر ریمانڈ کے بغیر حراست میں رکھا۔ یہ بھی کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے 164 سی آر پی سی کیلئے ملزم بدر کے ساتھ غیر مناسب برتاؤ کیا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے ڈی ایس پی برنی اور صفدر بھٹی ایس ایچ او نارتھ ناظم آباد کے ساتھ مل کر بدر ابڑو کو دیگر ملزمان جام ساقی، پروفیسر جمال اور دیگر کے خلاف بیان دینے کیلئے ڈرایا دھمکایا۔ میں برنی کے ساتھ عدالت گیا تھا جب ملزم کو سیکشن 164 سی آر پی سی کے تحت بیان کیلئے پیش کیا گیا تھا، جہاں اُس نے 164 سی آر پی سی

کے تحت بیان دینے سے انکار کیا تھا اور وہاں سے اسکو عدالتی تحویل میں جیل بھیج دیا گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے عدالت کو کیا بتایا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ مجھے معلوم ہے کہ بدر جمال نے پولیس کے غیر مناسب برتاؤ کی شکایت کی تھی۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ہم نے بدر جمال کو اس لئے ملوث کیا ہے کہ اس نے پولیس کے خلاف شکایت کی ہے اور اس نے دیگر ملزمان کے خلاف وعدہ معاف گواہ بننے سے انکار کیا جس کی وجہ سے اسکو اس مقدمے میں ملوث کیا گیا ہے۔ میں نے مجھ سے کیے ہوئے تمام سوالات کے جواب گواہی کے خلاصے کے صدر کو دیئے ہیں۔ مجھے کوئی ایسا سوال یاد نہیں ہے جو مجھ سے پوچھا گیا ہو اور میں نے اسکا جواب دیا ہو اور وہ درج /ریکارڈ نہ کیا گیا ہو۔ یہ درست ہے کہ میرے بیان میں کمرہ نمبر اور منزل کا ذکر نہیں ہے۔ میں نے گواہی کے خلاصے میں اپنا بیان حلفیہ طور پر ریکارڈ کرایا تھا۔

(سماعت 10 مئی 1982 تک ملتوی)

11 مئی 1982
ایس ایچ او صفدر علی خان
ایگزامینیشن انچیف

30 اگست 1980 کو میں ایس ایچ او نارتھ ناظم آباد تھا۔ مجھے C-19 پیپلز کالونی کے رہائشی غلام شبیر اور کمال وارثی کے خلاف مقدمہ درج کرنے کیلئے ایس پی لیاقت آباد کے ذریعے ڈی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹرز کے احکامات موصول ہوئے۔ میں نے اسسٹنٹ سب انسپکٹر انعام بخش کو دونوں ملزمان کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کی ہدایت کی۔ میں عدالتی دستاویز ایف آئی آر نمبر 236/80 دیکھ رہا ہوں، جو کہ وہی ہے۔
(سماعت 12 مئی 1982 تک ملتوی، عدالت نے اصل ایف آئی آر پیش کرنے کا حکم صادر کیا)
12 مئی 1982 کو سماعت 13 مئی 1982 کیلئے ملتوی، جب گواہ اصل ایف آئی آر پیش کرنے میں ناکام رہا)

15 جون 1982

عدالت نے اصل ایف آئی آر کا جائزہ لیا اور گواہ کو واپس کردی۔ ایس پی لیاقت آباد کراچی کو ارسال کیا گیا اصل ہیڈ کوارٹرز ڈی ایم ایل اے لیٹر نمبر ML/56/320 بتاریخ 30 جولائی 1980 عدالت میں پیش کیا گیا اور عدالتی دستاویز 'V' کے طور پر شامل کیا گیا۔
میں نے ڈیوٹی افسر اسسٹنٹ سب انسپکٹر انعام بخش کو ان احکامات کی تعمیل کا ذمہ دیا۔ 31 جولائی کو میں نے ایف آئی آر بشمول دیگر دستاویزات ہیڈ کوارٹرز ڈی ایم ایل اے بذریعہ لیٹر نمبر 4341، بتاریخ 31 جولائی 1980 ارسال کی۔ میں نے ایس پی لیاقت آباد سے مارشل لا ٹیم سے کاغذات حاصل کرنے اور چالان تیار کرنے کی غرض سے احکامات S.P.L/CB/11/80-1948283 بتاریخ 17 ستمبر 1980 وصول کیے۔ مجھے کہا گیا کہ میں مقدمے کے اندراج کے بعد تفتیشی ٹیم کے ساتھ کام کرنے کی غرض سے سب انسپکٹر استغاثہ

زبیر سے رابطہ میں رہوں جو ملزمان (وارثی اور شر) کو اعترافی بیانات کیلئے سٹی کورٹ لے گیا تھا اور جس نے دورانِ تفتیش اعترافی بیانات میرے حوالے کیے۔ میں نے فہرست کے مطابق تفتیشی ٹیم سے کاغذات حاصل کیے۔ گواہ نے میجر سلیم اور خود کے دستخطوں والی فہرست پیش کی جو کہ عدالتی دستاویز W کے طور پر شامل ہے۔ میں نے 2 ستمبر 1980 کو گواہان سب انسپکٹر استغاثہ اسلم نور، آرٹلری میدان پولیس اسٹیشن، ہیڈ کانسٹیبل محمد فیاض آرٹلری میدان پولیس اسٹیشن، کانسٹیبل دولت خان آرٹلری میدان پولیس اسٹیشن، کانسٹیبل ولایت خان 8936 سولجر بازار پولیس اسٹیشن، اسسٹنٹ سب انسپکٹر غلام محمد، سب انسپکٹر استغاثہ زبیر، ہیڈ کانسٹیبل شفیق مرزا نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن کے بیانات درج کیے۔ 22 ستمبر 1980 کو سب انسپکٹر استغاثہ زبیر نے سیکشن 164 سی آر پی سی کے تحت غلام شبیر شر کا بیان پیش کیا، 25 ستمبر 1980 کو چار ملزمان احمد کمال، غلام شبیر شر، سید جمال نقوی اور سہیل سانگی کا تقابلی کردار حوالے کیا۔ ملزم امر لال کو جامشورو پولیس اسٹیشن کی ایک پارٹی نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن لائی تھی۔ ملزم امر لال کو بھی اُسی ایف آئی آر 236/80 کے تحت گرفتار کیا گیا تھا جس کیلئے ثبوت پہلے ہی درج کیے جا چکے تھے۔ 7 اکتوبر 1980 کو میں نے سیکشن 161 کے تحت شاھنواز ولد غلام حیدر، سکنہ E/43 پاکستان کوارٹرز کراچی اور نثار احمد ولد غلام حیدر سکنہ E-344 سے جانچ پڑتال کی، اسی دن میں نے سیکشن 161 کے تحت بشیر ولد راجا خان سکنہ کچا گھر بالمقابل C/19، نزد راشن شاپ نمبر 2539، پیپلز کالونی، نارتھ ناظم آباد اور محمد یعقوب ولد حسین بخش سکنہ کچا گھر بالمقابل C/19 نزد راشن شاپ نمبر 2539 کے بیان ریکارڈ کیے۔ 19 اکتوبر 1980 کو سب انسپکٹر استغاثہ زبیر نے کتابوں کی برآمدگی کے مشیر نامے کے ساتھ گواہان مسعود احمد سکنہ B-419، سیکٹر L، نارتھ کراچی اور نعیم احمد ولد شبیر احمد، سکنہ M-234 کے بیانات پیش کیے۔ میں نے 11 اکتوبر 1980 کو امر لال کا 17 اکتوبر 1980 تک کا ریمانڈ بھی حاصل کیا۔ میں نے مزید تفتیش کیلئے مقدمہ ڈی ایس پی برنی، نارتھ کراچی کو سپرد کرنے کی ہدایات کا حامل ایس پی لیاقت آباد کا لیٹر نمبر SPL/CB/ii/80-24046/48 وصول کیا۔

9 جون 1982 تک سماعت ملتوی

9 جون 1982

یوسف لغاری ایڈووکیٹ کی جرح

میں کیس ڈائری دیکھ رہا ہوں جس کے مطابق ڈی ایس پی برنی تفتیشی اہلکار تھا۔ مجھے 17 ستمبر 1980 کو تفتیشی اہلکار مقرر کیا گیا اور میں نے مقدمے کے کاغذات میجر محمد سلیم سے حاصل کیے اور میجر سلیم سے کاغذات لینے کی رسید جاری کی۔ 17 ستمبر 1980 کی کوئی کیس ڈائری نہیں ہے۔ 18 ستمبر 1980 کی کیس ڈائری میں میجر سلیم سے دستاویزات وصول ہونے کا ذکر ہے اور میں نے فہرست عدالتی دستاویز w پر دستخط بھی کیے ہوئے ہیں جو میجر سلیم سے میری جانب سے حاصل کیے گئے کاغذات کے تفصیل ظاہر کر رہی ہے۔ فہرست کے پیراگراف اول میں ایف آئی آر کا ذکر ہے۔ میں نے یہ کاغذات ایس پی لیاقت آباد کے لیٹر نمبر S.P.L/C.B-II/80-1948283 بتاریخ 17 ستمبر 1980 کے تحت حاصل کیے۔ میں نے اسسٹنٹ سب انسپکٹر انعام بخش کا کوئی بیان ریکارڈ نہیں کیا جنہوں نے سیکشن 161 سی آر پی سی کے تحت ایف آئی آر درج کی تھی۔ جب میں نے کاغذات وصول کیے تو مجھے میجر سلیم سے کوئی ایف آئی آر وصول نہیں ہوئی تھی، جو کہ اُس وقت تفتیشی اہلکار تھے تاہم کسی دستخط کے بغیر ایک ٹائپ شدہ سادہ کاپی ہے جو کہ مقدمہ کے فائل میں موجود ہے۔ یہ ذکر موجود ہے کہ ایف آئی آر ڈی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹرز میں واقع سرسری سماعت کی فوجی عدالت کو ارسال کی گئی ہے۔ ڈی ایم ایل اے کے تحت ایک سے زائد سرسری سماعت کی فوجی عدالتیں ہیں۔ ایف آئی آر کے اوپر سرسری سماعت کی فوجی عدالت کا نمبر درج نہیں ہے۔ ایف آئی آر ڈی ایم ایل اے اسٹاف افسر میجر طفیل کو ارسال کی گئی تھی، جس کا نقول میرے دستخط کے ساتھ حسین خان سپرنٹنڈنٹ پولیس لیاقت آباد اور ایس ڈی پی او نیو کراچی کو بھیجی گئی تھیں۔ میجر طفیل وہی ہیں جن کے دستخط سے ایف آئی آر نمبر 236/80 درج ہوئی تھی۔ میں ایف آئی آر رجسٹر اور اسکا کالم نمبر 2 دیکھ رہا ہوں جو ظاہر کرتا ہے کہ میجر طفیل شکایت کنندہ ہیں۔ ایف آئی آر پر میجر طفیل کے دستخط نہیں ہیں تاہم وہ اس مقدمے کے شکایت کنندہ ہیں۔ میں نے اپنے لیٹر میں یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ ایف آئی آر

عدالت کو ارسال کی جائے۔ میں نے ایف آئی آر کسی عدالت یا میجر طریل سے حاصل نہیں کی ہے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ ایف آئی آر عدالت کو ارسال کی گئی تھی یا نہیں۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ آیا ایف آئی آر میجر طفیل نے رکھ لی تھی اور میں میجر طفیل کو بھیجی گئی اس ایف آئی آر سے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ایف آئی آر گُم ہوگئی۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ایف آئی آر نمبر 236/80 جو میجر طفیل کو ارسال کی گئی تھی، عدالت میں پیش کی گئی ایف آئی آر سے مختلف تھی۔ یہ کہنا بھی درست نہیں ہوگا کہ چونکہ میجر طفیل نے میری جانب سے انہیں ارسال کی گئی ایف آئی آر کے مندرجات سے انکار کیا ہے چناچہ میں نے اس مقدمے کو تقویت دینے کی غرض سے ایک نئی ایف آئی آر تیار کی ہے۔ میں 18 ستمبر 1980 سے 11 اکتوبر 1980 تک اس مقدمے میں تفتیشی اہلکار تھا اور اسکے بعد میں نے کوئی تفتیش نہیں کی ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ مجھ سے تفتیش اس لئے واپس لے لی گئی تھی کہ میں ملزمان کے خلاف ثبوت حاصل نہیں کرسکا تھا۔ 30 جولائی 1980 سے 18 ستمبر 1980 تک مارشل لا ٹیم نے تفتیش کی تھی۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ مارشل لا ٹیم نے کیس ڈائری حوالے نہیں کی اس لئے میں کہہ نہیں سکتا کہ انہوں نے تفتیش کس طرح سے کی تھی۔ مجھے ملزمان کے بجائے صرف مقدمے کے کاغذات دیئے گئے تھے۔ مجھے اس کا کوئی علم نہیں تھا کہ ملزمان کہاں حراست میں تھے۔ میرے تفتیش مکمل کرنے تک ملزمان کو کبھی بھی میرے سپرد نہیں کیا گیا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں ملزمان کے فوجی تحویل میں ہونے کے دوران ان سے ملا تھا۔ مجھے گواہان نے کسی مجسٹریٹ کے سامنے ملزمان کی نشاندہی نہیں کرائی تھی۔ امر لال کے علاوہ میں نے کسی بھی ملزم کو مقدمے کا چالان پیش ہونے تک نہیں دیکھا تھا۔ میں نے ملزمان کو پہلی مرتبہ گواہی کے خلاصے کے وقت دیکھا تھا۔ اُس دن سب انسپکٹر استغاثہ زبیر نے مجھے ملزمان کا ناموں کے ساتھ متعارف کرایا تھا۔ اب میں امر لال کے علاوہ باقی تمام ملزمان کو انکے ناموں سے شناخت کرسکتا ہوں کیونکہ میں انہیں گواہی کے خلاصے کے دوران دیکھ چکا ہوں۔ یہ درست ہے کہ اگر سب انسپکٹر استغاثہ زبیر مجھے انکی شناخت نہیں کراتا تو میں انکو پہچان نہیں پاتا۔ مجھے برآمدگی کا صرف مشیر نامہ دیا گیا تھا، نہ کہ میجر سلیم کی جانب سے مشیر نامے میں ذکر کی گئی اشیا جیسا کہ تصویر، مواد اور مقدمے کی مکمل اشیا۔ میں نے سیکشن 161 سی آر پی سی کے تحت

مخدوم حیات کا بیان ریکارڈ نہیں کیا البتہ اسکا بیان مقدمے کے کاغذات میں موجود ہے جو کہ ڈی ایس پی برنی نے ریکارڈ کیا تھا۔ایف آئی آر کا آخری جملہ پڑھ رہا ہوں، جو کہ کہتا ہے کہ ”تفتیش مارشل لاء ٹیم کی جانب سے کی جائے گی۔“ مارشل لاء لفظ کی دوہری تحریر ریکارڈ نگ اہلکار کی جانب سے کی گئی ہے۔ایف آئی آر میں کی گئی دوہری تحریر پر ریکارڈ نگ اہلکار نے اپنے دستخط نہیں کیے ہیں۔اس دوہری تحریر کے نیچے لکھا ہوا پڑھ نہیں سکتا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ مجھے عدالت میں دکھائی گئی عدالتی دستاویز M (ایف آئی آر) پر لفظ ڈی ایم ایل اے کی دوہری تحریر میری ہدایت پر انعام بخش نے کی ہے۔ یہ درست ہے کہ عدالت میں پیش کی جانے والی ایف آئی آر پر دوہری تحریر مارشل لاء ٹیم کے طور پر کی گئی ہے نہ کہ ڈی ایم ایل اے کے طور پر جیسا کہ عدالتی دستاویز میں دکھایا گیا ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ایف آئی آر سے مٹایا ہوا لفظ ISI ہے۔ یہ درست ہے کہ میں نے ڈیوٹی اہلکار کو ISI کی توثیق کی تھی۔ یہ درست ہے کہ میری جانب سے ڈیوٹی اہلکار کو کی گئی توثیق آئی ایس آئی ڈائریکٹوریٹ کی جانب سے تفتیش کیے جانے والے مقدمے کے اندراج کیلئے ہیڈ کوارٹرز سے موصول ہونے والے لیٹر ڈی ایم ایل اے/360/56 ایم ایل بتاریخ 30 جولائی 1980 پر تھی۔آئی ایس آئی سے میری مراد انٹر سروسز انٹیلیجنس ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے اس مقدمے کی تفتیش نہیں کی ہے بلکہ اس مقدمے کی تفتیش آئی ایس آئی نے کی ہے۔ میں عدالتی دستاویز x کے طور پر ایف آئی آر کی تصدیق شدہ درست نقل پیش کر رہا ہوں۔ میں عدالتی دستاویز M اور X دیکھ رہا ہوں اور اس پر انعام بخش کی جانب سے کسی توثیق کا ذکر نہیں ہے، جس نے ایف آئی آر کی تصدیق شدہ درست نقل بتاریخ 2 مارچ 1981 (کتاب کا صفحہ نمبر 235) پیش کی۔ میں نے گواہ بشیر ولد راجا خان سے ملزمان نذیر عباسی شہید اور کمال وارثی وصول نہیں کیے۔ میں نے اُسکا بیان ایف آئی آر درج ہونے کے دو ماہ بعد ریکارڈ کیا، یہی محمد یعقوب کے معاملے میں ہوا۔ میں نے گواہی کے خلاصے میں گواہان کے بیانات کے اندراج سے متعلق کچھ نہیں کہا ہے اگر چہ اب بتا رہا ہوں۔ میں نے یہ نہیں کہا ہے کہ میں نے گواہی کے خلاصے سے قبل 7 اکتوبر 1980 اور 11 اکتوبر 1980 کو امر لال کا ریمانڈ لیا۔

13 جون 1982

استغاثہ کے گواہ صفدر بھٹی سے یوسف لغاری ایڈووکیٹ کی جرح

میں نے اپنی تفتیش کی تاریخ 8 اگست 1980 سے قبل سب انسپکٹر استغاثہ زبیر کو مارشل لاء تفتیشی ٹیم کے ساتھ مقرر کیا تھا۔ میں نے سب انسپکٹر استغاثہ زبیر کو ایس پی لیاقت آباد کی ہدایت پر 28 اگست 1980 کو مقرر کیا تھا۔ اسکو 29 جولائی 1980 کو اسی مقدمے کیلئے بھی مقرر کیا گیا تھا۔ میں نے اپنی تفتیش کے عرصے سے قبل یعنی 29 جولائی 1980 سے 18 ستمبر 1980 سے قبل ملزمان میں سے کسی کو نہ تو دیکھا تھا نہ ہی ان سے کوئی تفتیش کی تھی۔ میں ان ملزمان کے فوجی تحویل میں ہونے کے دوران ان سے کبھی نہیں ملا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نپیئر بیرکس یا ملیر کیمپ گیا تھا۔ زبیر کے روزمرہ کا مثلاً ملزمان کو اعترافی بیانات کیلئے لے جانا اندراج پولیس اسٹیشن کے روزنامچے میں موجود ہے۔ میں 18 ستمبر 1980 سے قبل مارشل لا تفتیشی ٹیم میں شامل نہیں تھا۔ سب انسپکٹر زبیر میرا ماتحت تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے ان ملزمان اور تفتیش میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور مارشل لاء ٹیم اور سب انسپکٹر استغاثہ زبیر سے ہدایات حاصل کیں۔ میں اپنی مرضی سے سب انسپکٹر استغاثہ زبیر کے ہمراہ سرسری سماعت کی فوجی عدالت گیا تھا۔ میں نے تفتیش سنبھالنے کے بعد سب انسپکٹر استغاثہ زبیر کو ریگل بس اسٹاپ کے قریب شفیع محمود کے کتابوں کے اسٹال پر چھاپہ مارنے کی ہدایت کی۔ میں نے اسکو لانڈھی جیل بھیجا تاکہ ملزمان کا بیان اور انکے تفصیلی کردار کے تفصیل لانے کے علاوہ گھر نمبر C/19 پیپلز کالونی کی کرایہ داری، مالکی اور سکنہ سے متعلق تفتیش جاری رکھنے کی بھی ہدایت کی۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے سب انسپکٹر استغاثہ زبیر کو ملزمان کے بیانات ریکارڈ کرنے اور انکے تفصیلی کردار کی معلومات حاصل کرنے کیلئے لانڈھی جیل نہیں بھیجا تھا۔ میرے احکامات کی تکمیل میں زبیر لانڈھی جیل گیا اور کمال وارثی کا بیان ریکارڈ کیا اور ملزم کے مددگار کردار کے تفصیل بھی لایا۔ میں نے ملزم امرلال کی گرفتاری کا مشیرنامہ تیار نہیں کیا کیونکہ وہ جامشورو پولیس اسٹیشن کی جانب سے پیش کیا گیا تھا۔ میرے پاس نہ ریکارڈ ہے اور نہ ہی مجھے یاد ہے تاہم تفصیلات کو جانچا جا سکتا ہے۔ اب مجھے یاد نہیں

ہے کہ جب 25 ستمبر 1980 کو جامشورو پولیس نے امرلال کو میرے حوالے کیا تو کون موجود تھا۔ امرلال کے ضمن میں ہمارے پولیس اسٹیشن نے 27 ستمبر 1980 سے 4 اکتوبر 1980 تک کا ریمانڈ لیا تھا۔ ملزم امرلال کو مجسٹریٹ جامشورو نے 27 ستمبر 1980 تک ریمانڈ میں دیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ آیا جامشورو میں کوئی عدالت ہے یا نہیں۔ مجھے امرلال کی گرفتاری کا علم 25 ستمبر 1980 کو ہوا جب اسکو میرے حوالے کیا گیا۔ میں نے جامشورو پولیس سے یہ نہیں کہا تھا کہ امرلال اس مقدمے میں میری پولیس کو مطلوب ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ جامشورو پولیس کو کس نے ملزم میرے حوالے کرنے کی ہدایت کی تھی۔ میں نے امرلال کو اس مقدمے میں احمد کمال وارثی کے بیان اور وزارتِ داخلہ حکومت پاکستان کے لیٹر نمبر 8/11/80-Pol/1(i) یکم اگست 1980 کی بنیاد پر گرفتار کیا تھا۔ کیس ڈائری میں احمد کمال وارثی کا بیان موجود نہیں ہے، میں اس وقت احمد کمال وارثی کا بیان پیش نہیں کرسکتا۔ کمال وارثی کا بیان پولیس کیس فائل میں لگا ہوا تھا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ کس نے کیس ڈائری سے مذکورہ بیان نکال دیا ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے نہ تو احمد کمال وارثی کا بیان لیا تھا اور نہ ہی یہ اس کیس فائل کے ساتھ منسلک تھا۔ وزارتِ داخلہ کے لیٹر کے مطابق یہ درست ہے کہ ڈائریکٹوریٹ جنرل آئی ایس آئی کی ٹیم نے نارتھ ناظم آباد میں دو گھروں پر چھاپہ مارا اور تخریبی مواد برآمد کیا۔ اس لیٹر میں یہ بھی درج ہے کہ پانچ ملزمان امداد چانڈیو، گھنشام پرکاش، جبار خٹک، تاج مری اور غلام رسول سہتو تخریبی مواد کی اشاعت اور تقسیم میں انتہائی سرگرم ہیں۔ یہ بھی درج ہے کہ مذکورہ بالا پانچوں افراد کو فوری طور پر حراست میں لیا جائے اور ان سے انٹیلی جنس بیورو، ڈی جی آئی ایس آئی اور اسپیشل برانچ سندھ پر مشتمل مشترکہ تفتیشی ٹیم کے ذریعے تفتیش کی جائے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے ملزمان کو صرف مذکورہ بالا لیٹر کی بنیاد پر ہی گرفتار کیا تھا۔ یہ پیرا 2 میں درج ہے کہ صدر بخوشی یہ ہدایت جاری کرتے ہیں کہ مقدمے کی تفصیلی تفتیش کی جائے اور ملزمان پر تیزی سے مقدمہ چلایا جائے۔ لیٹر کے مندرجات عدالت اور وکلا کو دکھائے گئے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے اس مقدمے کی تفتیش نہیں کی ہے بلکہ صرف اپنے اعلیٰ افسران کے کہنے پر بیان دے رہا ہوں۔

(یوسف لغاری ایڈووکیٹ نے اپنی جرح مکمل کرلی)۔

عدالت 21 جون 1982 کو صبح گیارہ بجے دوبارہ بیٹھی، التوا کیلئے کوشش کی گئی، 19 جون 1982 کی طرح تمام اراکین موجود تھے۔

ملزم بدر ابڑو کے وکیلِ صفائی کی جانب سے جرح

یہ کہنا درست ہوگا کہ پوری تفتیش تین دورانیوں پر مشتمل تھی۔ پہلا دورانیہ 30 جولائی 1980 سے 17 ستمبر 1980 تک تھا جس دوران تفتیش آئی ایس آئی، ڈی ایم ایل اے ٹیم اور مارشل لا اتھارٹی ٹیم نے کی۔ دوسرا دورانیہ 18 ستمبر 1980 سے 12 اکتوبر 1980 سے لیکر چالان داخل کرنے تک کا تھا جو کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس ممتاز برنی نے کی۔ میرے پاس بالا الذکر تفتیش کے تینوں دورانیوں کے تفصیل موجود ہیں۔ گواہ نے دوبارہ کہا کہ وہ اپنے دورانیے کے تفصیل جانتا ہے۔ مجھے ڈی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹرز کا لیٹر، عدالتی دستاویز V، 30 جولائی 1980 کو شام چھ بجے کے قریب سپرنیٹڈنٹ آف پولیس کی توثیق کے ساتھ موصول ہوا۔ میں نے یہ لیٹر ایک کانسٹیبل کے ذریعے، جس کا نام مجھے معلوم نہیں حیدری کے علاقے میں وصول کیا، جو کہ پولیس اسٹیشن سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ہے اور اس وجہ سے مجھے نہیں معلوم کہ یہ لیٹر پولیس اسٹیشن کون لایا تھا اور یہ درست ہے کہ اس لیٹر پر کوئی نمبر شمار نہیں ہے اور اس لئے میں کہہ نہیں سکتا کہ اسکا پولیس ڈائری میں کوئی اندراج ہوا یا نہیں۔ یہ کہنا درست ہے کہ عدالتی دستاویز v کی میری جانب سے توثیق کی گئی ہے، جس میں درج ہے کہ ”آئی ایس آئی تفتیش کرے گی“ اور یہی الفاظ عدالتی دستاویز N کالم 5 کی کاربن کاپی میں نظر آتے ہیں۔ عدالتی دستاویز N عدالتی دستاویز X کی کاربن کاپی ہے۔ عدالتی دستاویز V اور عدالتی دستاویز M دونوں اگلے روز کام کاج کے اوقات کار کے دوران ارسال کی گئیں۔ جب میں نے تحریر کیا کہ آئی ایس آئی ڈائریکٹوریٹ تفتیش کرے گا تو مجھے مارشل لاء اتھارٹی کی جانب سے کوئی ہدایات نہیں تھیں تاہم میں نے حیدری سے فون کر کے سپرنٹنڈنٹ آف پولیس سے دریافت کیا تھا لیکن مجھے فون نمبر یاد نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ ایف آئی آر کے مطابق، آئی ایس آئی کو تفتیش کرنی تھی۔

میں کہہ نہیں سکتا کہ آیا پیپلز کالونی، پاکستان کوارٹرز اور حیدر آباد سے مبینہ طور پر برآمد ہونے والے مواد کے علاوہ بھی کسی کو کہیں سے ثبوت کے طور پر کوئی اور مواد ملا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ آئی ایس آئی ملزمان کے خلاف ثبوت اکٹھا کرنے میں ناکام رہی۔ میری پولیس اسٹیشن کو لفظ آئی ایس آئی مارشل لاٹیم سے تبدیل کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ عدالتی دستاویز M کے کالم 5 اور عدالتی دستاویز X کی دوسری جانب۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ جب ڈی ایم ایل اے ٹیم بھی ثبوت ہاتھ کرنے میں ناکام رہی تو مجھے ذاتی طور پر کالم 5 میں لفظ آئی ایس آئی کی جگہ لفظ ڈی ایم ایل اے اس طرح ڈالنے کی ہدایت کی گئی کہ لفظ آئی ایس آئی ڈائریکٹوریٹ مٹ جائے۔ یہ درست ہے کہ اس جرم کی سیکشن 154 سی آر پی سی کے تحت ایف آئی آر ہیڈ کوارٹرز ڈی ایم ایل اے روانہ کرنے سے قبل درج کی گئی تھی۔ میں نے اسکی مکمل طور پر جانچ پڑتال کی تھی۔

یہ درست ہے کہ ایف آئی آر درج ہونے میں تاخیر ہمیشہ استغاثہ کیلئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے، اور اس لئے اس پر میسر ہونے کی صورت میں وقت اور تاریخ ضرور تحریر کیے جاتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ایف آئی آر وقوعے کی تاریخ اور وقت ظاہر نہیں کر رہی ہے جیسا کہ اس کیلئے ضروری ہوتا ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ کالم 5 میں ایف آئی آر درج کرنے میں ہونے والی تاخیر کے اسباب تحریر کرنے ہوتے ہیں، لیکن یہ نہیں لکھے گئے ہیں۔ یہ درست ہے کہ لیٹر عدالتی دستاویز V اور ایف آئی آر M اور N میں پاکستان کوارٹرز کا کوئی ذکر نہیں ہے جہاں سے مبینہ طور پر تخریبی مواد برآمد کیا گیا تھا۔ یہ کہنا درست ہے کہ لیٹر عدالتی دستاویز V ظاہر نہیں کرتا کہ گھر نمبر C-19 پیپلز کالونی بلاک این، نارتھ ناظم آباد سے کوئی تخریبی مواد برآمد کیا گیا تھا۔ یہ کہنا درست ہے کہ لیٹر عدالتی دستاویز V اور ایف آئی آر عدالتی دستاویز M اور N میں چھاپہ مارنے والی ٹیم میں شامل مجسٹریٹ اور مشیران کے نام درج نہیں ہیں۔ یہ کہنا درست ہے کہ لیٹر یا ایف آئی آر میں کسی بھی چشم دید گواہ سویلین یا فوجی کا نام درج نہیں ہے۔

میں نے اپنی تفتیش سیکشن (3)15/18 مارشل لاء ضابطہ بشمول مارشل لا قلم نامہ 77

تک ہی محدود رکھی۔ میں کتابوں کے مطالعے کے بعد ہی وضاحت کر سکتا ہوں، تاہم اس وقت انکی وضاحت سے قاصر ہوں۔ میں نے برآمد ہونے والے مواد پر سرسری نظر ڈالی تھی تاہم میں نے وہ مکمل طور پر نہیں پڑھا ہے۔ اب تک میں نے جو پڑھا ہے اس سے ایسی کوئی چیز نہیں ملی ہے جو مختلف مذاہب، مذہبی لوگوں یا طبقات کے درمیان منحاصمت اور نفرت کا باعث بنے۔ یہ کہنا درست ہے کہ مجھے ایک بھی ایسا گواہ نہیں ملا جس نے مجھے مسلح افواج پر عدم اطمینان کا باعث بننے والا مواد دیا ہو یا یہ کہا ہو کہ اسکو مذکورہ مواد ملزمان میں سے کسی نے ذاتی طور پر دیا ہو۔ میں نے کہیں بھی نظریۂ پاکستان کی تشریح نہیں پڑھی ہے۔ میں نے کبھی بھی کسی فرد کے خلاف نظریۂ پاکستان کے حوالے سے کوئی ایف آئی آر درج نہیں کی ہے۔ میں نظریۂ پاکستان کے تفصیل نہیں جانتا۔ مجھے کسی بھی گواہ کے بیان سے ایسی کوئی بات حاصل نہیں ہوئی ہے جس سے میں یہ کہہ سکوں کہ ملزمان میں سے کسی نے نظریۂ پاکستان کے خلاف کوئی جرم کیا ہے۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ حکومت کے خلاف کوئی بیان حکومت کی مخالفت کے زمرے میں آتا ہے جبکہ کسی حکومت کا تختہ اُلٹنے کا کوئی عمل بغاوت کے زمرے میں آتا ہے۔ مجھے ایک بھی ثبوت نہیں ملا ہے جس کے مطابق ملزمان نے بغاوت کا جرم کیا ہو یا مذکورہ بالا کسی جرم کی سازش میں شریک ہوں۔

29مارچ1982

محمد امین جمالی سے یوسف لغاری ایڈووکیٹ کی جرح

یہ درست ہے کہ ملزم غلام شبیر شر نے اپنے اعترافی بیان میں بتایا تھا کہ ''ہمیں اس طرح زنجیروں اور ہتھکڑیوں سے باندھا گیا کہ ہم سو نہیں سکے۔ بعدازاں 30 جولائی کو مجھے کامریڈ احمد کمال وارثی سے علیحدہ کر دیا گیا۔ مجھے ایک فوجی کیمپ میں رکھا گیا جہاں مجھے سونے کی اجازت نہیں تھی۔'' کمال وارثی نے اپنا بیان اردو میں دیا۔ جبکہ شبیر شر نے اپنا بیان سندھی میں دیا۔ میں نے اعترافی بیانات سندھی اور اردو کے بجائے انگریزی میں لکھے۔ میں سیکشن 543 سی آر پی سی سے آگاہ ہوں جس کے تحت ترجمان کو ایسی کسی گواہی یا بیان کی درست ترجمانی کرنی ہے۔ میں نے سیکشن 543 سی آر پی سی کے ضمن میں کسی ترجمان کی خدمات حاصل نہیں کیں۔ میں نے بیان کے آخری صفحے کے علاوہ کسی اور صفحے پر دستخط نہیں کیے۔ میرے پاس ایک عدالتی مُہر ہے۔ پورے اعترافی بیان بشمول مقررہ فارم پر عدالتی مُہر نہیں ہے۔ میں نے غلام شبیر شر کے اعترافی بیان پر اپنے دستخط کے ساتھ مجسٹریٹ تحریر کرنے کے علاوہ اپنا مکمل عہدہ نہیں لکھا ہے۔ سیکشن (3)164 کے تحت مجسٹریٹ کیلئے یہ لازمی ہے کہ اعترافی بیان ریکارڈ کرتے ہوئے بیان کے آخر میں میمورنڈم کا ریکارڈ دے گا۔ یہ درست ہے کہ میں نے (شبیر اور وارثی) دونوں بیانات کے آخر میں اس طرح کا میمورنڈم نہیں دیا ہے۔ یہ کہنا درست ہے کہ قانون کے تحت مجسٹریٹ کو اعتراف ریکارڈ کرنے کے بعد آخر میں میمورنڈم دینا ہوتا ہے۔ یہ اعترافات ریکارڈ کرنے کے بعد میں نے یہ سٹی کورٹ کے ریکارڈ کیپر کو ارسال کر دیئے۔ سیکشن (2)164 سی آر پی سی کے تحت اعترافی بیانات اس مجسٹریٹ کو ارسال کیے جس کے پاس مذکورہ مقدمہ ہوگا۔ انہوں نے رضا کارانہ طور پر مزید بتایا کہ اعترافی بیانات محفوظ تحویل کیلئے سٹی کورٹ کے ناظر کو بھیجے جاتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اختیار کیا جانے والا طریقہ/انداز سیکشن (2)164 کے مطابق نہیں تھا۔ یہ درست ہے کہ اعترافی بیان سیکشن (2)164 سی آر پی سی کے تحت ریکارڈ کیے جانے چاہئیں اور ان پر سیکشن 364 میں بتائے

گئے انداز میں دستخط ہوں۔ سندھی میری مادری زبان ہے اور میں یہ لکھ، پڑھ اور بول سکتا ہوں۔ بیان سندھی میں لکھنا ممکن تھا۔ سندھی زبان عدالتی زبان ہے۔ میں نے سندھی میں سوال نہیں کیے، نہ ہی ملزم کی جانب سے دیا جانے والا کوئی جواب سندھی میں لکھا گیا۔ یہ درست ہے کہ میں نے اعترافی بیان میں یہ نہیں لکھا ہے کہ میری جانب سے انگریزی میں لکھا ہوا بیان ملزم پر واضع کیا گیا تھا۔ نارتھ ناظم آباد کا مجسٹریٹ بھی سٹی کورٹ کی عمارت میں بیٹھتا ہے۔ یہ درست ہے کہ میں نے اعترافی بیان کے دوران کیے گئے اپنے سوالات تحریر نہیں کیے ہیں۔ یہ درست ہے کہ عدالت کے روبرو عدالتی دستاویزات S اور R کے طور پر پیش کیے گئے اعترافی بیانات میں ناظر کو ارسال کیا جانے والا میرا لیٹر شامل نہیں ہے۔ میں اس پر رائے نہیں دے سکتا کہ میں نے بیان کب ریکارڈ روم انچارج کو ارسال کیا تاہم یہ عدالت میں موجود ریکارڈ سے دیکھا/جانچ پڑتال کیا جا سکتا ہے۔ مجھے اس ریکارڈ کیپر کا نام معلوم نہیں جس کو اس کام کیلئے مقرر کیا گیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ یہ ریکارڈ کیسے اور کہاں رکھتا ہے۔ میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ آیا اسکی تحویل میں دستاویزات محفوظ تحویل میں ہوتے ہیں یا نہیں۔ میں نے یہ نہیں لکھا کہ ملزمان کے ساتھ پولیس یا کسی اور تحویل میں رکھنے والی اختیاری نے ناروا سلوک کیا گیا ہے۔ میں نے فارم میں یہ درج نہیں کیا کہ میں اے سی ایم فرسٹ کلاس مجسٹریٹ ہوں۔ انکے اعترافی بیانات درج کرنے کے بعد میں نے ملزمان کو میرے سامنے پیش کرنے والے سب انسپکٹر استغاثہ زبیر احمد کو جیل منتقلی کیلئے حوالے کیے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ زبیر احمد انہیں جیل لے گیا یا کہیں اور۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ میرے سامنے پیش کیے جانے والے ملزمان کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے آیا دونوں ملزمان کے ریمانڈ پر دستخط کیے تھے۔ عدالت میں پیش کیے جانے والے کاغذات میں ایسا کوئی ریمانڈ وارنٹ موجود نہیں ہے۔ یہ کہنا درست ہے کہ میں نے کچھ حذف کی گئی جگہوں پر دستخط کیے ہیں جبکہ کچھ پر نہیں کیے ہیں۔ میں نے اعترافی بیانات کے حامل لفافوں کو سربہ مہر نہیں کیا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے ملزمان سے کوئی سوال نہیں پوچھا تھا اور میں نے دونوں ملزمان کے بیان ریکارڈ نہیں کیے تھے۔ یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ اعترافی بیانات مارشل لاء ہیڈ کوارٹرز میں

ریکارڈ کیے گئے تھے اس لئے رازداری کے حامل لفافے پر عدالتی مُہر لگی ہوئی نہیں ہے۔ میں نے ملزمان کی جامہ تلاشی نہیں لی تھی۔ میں نے دونوں ملزمان کی جانچ پڑتال/جرح کی تھی۔ میں نے ملزمان کے جسم کی جانچ پڑتال کی تھی لیکن انکے جسم پر تشدد کی کوئی علامت نظر نہیں آئی تھی۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے ملزمان کے جسم کی جانچ پڑتال نہیں کی تھی۔ میں نے ملزمان سے انکی گرفتاری کی تاریخ سے میرے روبرو پیش کیے جانے کی تاریخ کا دریافت کیا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ عدالت کے روبرو پیش کیا جانے والا ریکارڈ جعلی ہے اور ملزمان کو کبھی بھی میرے روبرو پیش نہیں کیا گیا تھا۔

5 اپریل 1982

استغاثہ کے گواہ محمد امین جمالی سے اختر حسین ایڈووکیٹ کی جرح

میں نے زبیر سے یہ تو دریافت نہیں کیا تھا کہ ملزمان کو کہاں سے لایا گیا ہے تاہم اس نے مجھے اعترافی بیان لینے سے متعلق لیٹر دکھایا تھا۔ یہ درست ہے کہ اعترافی بیانات لینے سے متعلق مجھے دکھایا جانے والا لیٹر یہ نشاندہی نہیں کر رہا تھا کہ ملزمان کو کہاں سے لایا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ میرے پاس اعترافی بیان کیلئے آنے والے کسی بھی معاملے میں تفتیشی اہلکار کے پاس اپنے بالا اہلکاروں کے ذریعے ایک اختیار نامے کا لیٹر ہونا ضروری ہے۔ میں نے سب انسپکٹر استغاثہ زبیر سے یہ دریافت نہیں کیا تھا کہ آیا وہ اس مقدمے میں تفتیشی اہلکار ہے یا نہیں۔ یہ درست ہے کہ سیکشن 167 سی آر پی سی کے تحت زیادہ سے زیادہ ریمانڈ پندرہ دن کا ہوتا ہے۔ سب انسپکٹر استغاثہ زبیر نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ میرے سامنے پیش ہونے سے قبل دونوں ملزمان گذشتہ ایک ماہ سے مارشل لاء ٹیم کی حراست میں تھے۔ یہ درست ہے کہ مجھے دیئے گئے لیٹر میں یہ درج نہیں تھا کہ شبیر شر کو 29 جولائی 1980 کو گرفتار کیا گیا اور 28 اگست 1980 کو میرے ربروپیش کیا گیا اور نہ ہی ایسا کمال وارثی کے ضمن میں تھا۔ یہ میرے ذہن میں نہیں آیا کہ میرے سامنے پیش کیے گئے ملزمان غلط/غیر قانونی حراست میں تھے۔ میں نے سب انسپکٹر استغاثہ زبیر

سے انکی ہتھکڑیاں اُتارنے اور اعترافی بیان ریکارڈ ہونے تک چیمبر سے باہر رہنے کیلئے کہا۔ چپراسی میرے چیمبر کے دروازے پر تھا۔164 کا خالی مقررہ فارم مجھے میرے ریڈر نے دیا تھا۔

زبیر نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ ملزمان کو مارشل لاءٹیم سے لایا گیا ہے، اس نے مجھے صرف لیٹر دیا تھا۔ میں نے ملزمان سے یہ دریافت نہیں کیا تھا کہ انکے مقدمے میں تفتیشی اہلکار کون ہے۔ میں اخبارات پڑھتا رہا ہوں۔ مجھے اخبارات میں سرخیوں اور تصویروں سمیت خبر کی اشاعت یاد نہیں ہے۔ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ نذیر عباسی دورانِ حراست انتقال کر گیا تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ اس مقدمے سے ماخوذ تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ دونوں ملزمان نے مجھے بتایا تھا کہ نذیر عباسی تشدد سے ہلاک ہوا۔ میں نے اُس وقت ان سے یہ دریافت نہیں کیا کہ وہ کس وجہ سے اعترافی بیان دے رہے ہیں۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ سرسری سماعت کی فوجی عدالت میں کون اعترافی بیان ریکارڈ روم سے لایا تھا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ آیا مجھے گواہی کے خلاصے میں اعترافی بیانات پیش کرنے سے متعلق کوئی لیٹر موصول ہوا تھا۔ میں نے اعترافی بیانات کے لفافے سربمہر نہیں کیے تھے۔ مجھے گواہی کے خلاصے میں دونوں ملزمان کے کھُلے اعترافی بیان دیئے گئے تھے۔ میں اعترافی بیانات سے قبل اور بعد میں کئی مرتبہ مارشل لاء ہیڈ کوارٹرز جا چکا ہوں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ملزمان کو اعترافی بیان کیلئے میرے روبرو پیش نہیں کیا گیا تھا اور میں نے یہ بیانات ڈی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹرز میں ریکارڈ کیے تھے۔

شفیع محمدی ایڈووکیٹ کی جرح

مجھے یاد نہیں ہے کہ آیا میرا استغاثہ کے مقدمے کے حصے کے طور پر سیکشن 164 کے تحت کسی دوسرے مقدمے میں بیان لینے سے واسطہ رہا ہو۔ یہ درست ہے کہ سیکشن 164 کے تحت بیان ریکارڈ کرتے ہوئے قانونی تقاضاؤں کا انتہائی خیال رکھا جاتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ اگر ان قانونی تقاضوں کو پورا نہیں کیا جائے گا تو بیان قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ یہ درست ہے کہ سیکشن 164 کے تحت بیان ریکارڈ کرنے کیلئے مقررہ فارم استعمال کیا جاتا ہے اور اس میں بیان ریکارڈ

کرنے سے متعلق رہنمائی شامل ہے۔ یہ درست ہے کہ جیسا کہ فارم میں بتایا گیا ہے ہمیں سیکشن (b)(2)544 کے تحت تمام تقاضاؤں کو مدِ نظر رکھنا ہوگا۔ میں وفاقی دارالحکومت اور سندھ کی عدالتوں کے فوجداری سرکلر کا باب 6 حصہ C دیکھ رہا ہوں۔ مذکورہ باب کا پیراگراف 7 کہتا ہے ''اعترافات عمومی لحاظ سے عدالتی اوقاتِ کار کے دوران اور کھلی عدالت میں ریکارڈ کیے جائیں۔'' جس دن متعلقہ اعترافات ریکارڈ کیے گئے وہ تعطیلات کے ایام نہیں تھے اور ضلعی مجسٹریٹ، ایس ڈی ایم اور دیگر مجسٹریٹ اپنے دفاتر میں موجود تھے۔ میں نے سب انسپکٹر استغاثہ زبیر سے نہیں کہا کہ اعترافی بیان ایس ڈی ایم کے پاس ریکارڈ کرایا جائے، اگرچہ مذکورہ بالا کتاب کے باب 6 کا پیراگراف 11 کہتا ہے کہ، ''اعتراف کرنے پر رضامند ملزم کو اس مقصد کیلئے مجسٹریٹ کے عہدے میں اعلیٰ ترین عہدے کے حامل کے پاس لے جایا جائے، جو کہ سب ڈویژنل مجسٹریٹ ہوتا ہے۔''

میں نے ملزمان کی اندرونی اور بیرونی چوٹوں کے معائنے کیلئے کسی ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ یہ درست ہے کہ سیکشن (2)164 سی آر پی سی کے مطابق اعترافی بیانات سیکشن 364 سی آر پی سی میں وضع کردہ انداز کے تحت دستخط شدہ ہونے چاہئے۔ یہ درست ہے کہ سیکشن 364 کے تحت یہ لازمی ہے کہ ایسی مکمل تفتیش بشمول اس سے دریافت کیا جانے والا ہر سوال اور اسکی جانب سے دیا جانے والا ہر جواب اس زبان میں مکمل طور پر ریکارڈ کیے جائیں جن میں یہ تفتیش/جانچ پڑتال کی گئی ہے۔ میرے لئے سندھی میں بیان ریکارڈ کرنا مشکل نہیں تھا جس میں سوالات پوچھے گئے اور جس ملزم نے جوابات دیئے۔ یہ درست ہے کہ میں فارم میں بتائے گئے سوالات کرنے کا پابند ہونے کے ساتھ ضروری محسوس ہونے پر دیگر سوالات کرنے کا پابند تھا تاہم میں نے صرف فارم میں واضع کیے گئے سوالات ہی کیے تھے۔

ہائی کورٹ کے قواعد وضوابط (لاہور) جلد III، باب 13 کے مطابق آپ یہ سوال کرنے کے پابند ہیں کہ وہ یہ اعتراف کیوں کر رہا ہے؟ استغاثہ نے اعتراض کیا کہ وکیلِ صفائی کوئی ایسی سند پیش کریں جس سے ثابت ہو کہ یہ زیرِ سماعت معاملے پر قابلِ اطلاق ہے۔ عدالت

نے یہ سوال مسترد کردیا۔ وکیل صفائی سندھ ہائی کورٹ کے ضوابط کے مطابق سند پیش کرے۔ میں نے ملزمان کے اعترافی بیانات سے متعلق وارنٹ کے ذریعے جیل سپرنٹنڈنٹ کو کوئی اطلاع ارسال نہیں کی۔ اگرچہ یہ مندرجہ بالا کتاب کے پیرا گراف 10 باب 6 حصہ 'C' کے تحت ضروری تھا۔ میں نے زبیر سے یہ دریافت نہیں کیا کہ اس مقدمے سے ماخوذ دیگر ملزمان کس طرح گرفتار ہوئے۔ میں نے جیل کو ایسی کوئی ہدایت نہیں جاری کی تھی کہ پولیس ضوابط باب (E)(2)25 کے تناظر میں ملزمان کو دیگر ملزمان سے علیحدہ رکھا جائے۔ مندرجہ بالا باب کے ضمن میں یہ درست ہے کہ جب ایک سے زائد افراد اعترافی بیان دیں یا کسی مقدمے میں وعدہ معاف بن جائیں تو ان کے بیانات ممکن ہونے کی صورت میں مختلف مجسٹریٹ ریکارڈ کریں اور انہیں انکی گواہی ریکارڈ ہونے تک ایک دوسرے سے ملنے نہ دیا جائے۔ میں نے مندرجہ بالا ضابطے کے تناظر میں دونوں ملزمان کے اعترافات کے عوامل سے متعلق دریافت نہیں کیا۔

7 اپریل 1982 تک سماعت ملتوی، جب درخواستوں پر غور ہوگا۔

10 اپریل 1982 پوری کاروائی سیکشن (A)46 سی آر پی سی کے تحت ہوئی ہے۔ پی پی سی کے مختلف سیکشنز ہیں جن پر (A)46 سی آر پی سی لاگو ہوتا ہے۔

i- عائد کئے گئے الزامات ثابت نہیں ہوئے ہیں۔

ii- استغاثہ نے مقدمہ مکمل کرلیا۔

(k)265 کو ملٹری ایکٹ (A)46 کے ساتھ پڑھنا قبل از وقت ہے اور عدالتی کاروائی میں فائل کردیا گیا۔ عدالتی حکم

بری کی درخواست - عدالتی دستاویز T سے T-3 کے طور پر شامل کی گئی۔

استغاثہ کا گواہ شیخ محمود : ایگزامنیشن انچیف

میں ریگل چوک صدر میں واقع بدر نیوز ایجنسی نامی کتابوں کے اسٹال کا مالک ہوں۔ جنوری 1980 کے پہلے ہفتے میں ایک شخص جس کا نام بعدازاں احمد کمال وارثی معلوم ہوا میرے بک اسٹال پر آیا اور مجھے ایک کتاب اولمپک 1980 دکھائی۔ میں نے اس سے کہا کہ تمام تر مسلمان ممالک نے ان اولمپک کھیلوں کا بائیکاٹ کیا ہوا ہے۔ اُس نے مجھے جواب دیا کہ مسلمان ممالک اولمپک میں شامل ہوں گے جو کہ اپنے وقت پر منعقد ہونے والے ہیں۔ میرے دریافت کرنے پر اس نے مجھے بتایا کہ کتاب سنسر کے عمل سے گذر چکی ہے۔ اس نے مجھے کہا کہ مجھے اس کیلئے فکرمند نہیں ہونا چاہئے اور کسی بھی وقت مجھے اس کتاب کی ضرورت ہو تو میں اسکو فون کروں، جس کا نمبر اس نے مجھے دیا تھا۔ اگلے روز تقریباً بارہ بجے وہ اس کتاب کے ایک ہزار نسخے فروخت کیلئے لے آیا۔ میں نے اُس سے ایک ہزار نسخے وصول کر کے اپنی نیوز ایجنسی کی بتاریخ 19 جنوری 1980 کی رسید فراہم کی۔ عدالتی دستاویز ایم 5 پی۔ میں اپنی جانب سے جاری کردہ اصل رسید عدالتی دستاویز میں دیکھ پا رہا ہوں۔ اگلے روز احمد کمال وارثی کتاب سوویت یونین کے مسلمان کے پانچ سو نسخے میرے بک اسٹال پر لے آیا جو کہ میں نے وصول کر کے تاریخ 20 جنوری 1980 کی اسکو رسید فراہم کی جو کہ میں عدالتی دستاویز ایم 5 کیو کی صورت میں دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اسکو رقم کی کوئی ادائیگی نہیں کی تھی کیونکہ یہ ادائیگی کتابوں کے فروخت ہونے کے بعد ہونی تھی۔ اس دن کے بعد سے ملزم کمال وارثی میری دکان پر نہیں آیا۔ اسکے کوئی سات آٹھ ماہ بعد سب انسپکٹر استغاثہ زبیر دو کانسٹیبلز کے ہمراہ ریگل چوک کے علاقے میں آ کر بدر نیوز ایجنسی کا دریافت کرنے لگا تھا۔ میں نے تصدیق کی کہ میں بدر نیوز ایجنسی کا مالک ہوں تو اس نے دو کتابوں اولمپکس 1980 اور سوویت یونین کے مسلمان سے متعلق دریافت کیا۔ میں نے ان کتابوں کی موجودگی سے متعلق کوئی دستاویزی ثبوت دکھانے کیلئے کہا جس پر اس نے مجھے وہ اصل

رسید دکھائی جو میں نے احمد کمال وارثی کو دی تھی۔ چونکہ کتابیں دکان کے گودام میں پڑی ہوئی تھیں اس لئے میں نے تمام کتابیں جمع کر کے زبیر کے حوالے کیں جو کہ اولمپکس 1980 کے 800 نسخوں اور سوویت یونین کے مسلمان کے 400 نسخوں پر مشتمل تھیں۔ زبیر نے برآمدگی کا مشیر نامہ تیار کیا جس پر دو مشیران مسعود احمد اور نسیم احمد سے دستخط حاصل کیے۔ میں عدالتی دستاویز این-1 پر یہ دستخط شناخت کر سکتا ہوں۔ آج سے کوئی سات آٹھ قبل ایم پی اے ہاسٹل میں گواہی کے خلاصے کے دوران مجھ سے باز پرس کی گئی تھی۔

15 اپریل 1982

بائیکاٹ کی درخواست پر عدالت کا فیصلہ

عدالت نے درخواست کا جائزہ لیا اور عدالت فیصلہ کرتی ہے کہ آپکی معروضات میں کوئی قابلِ اہمیت توضیع نہیں ہے اور آپکے وکیل کو آپ کا مقدمہ لڑنے کی ہدایت دینے کا ارادہ رکھتی ہے وگرنہ دیگر عدالت قانونی طور پر مقدمہ جاری رکھے گی اور آپکو ریاستی اخراجات پر وکیل صفائی فراہم کرے گی۔

شفیع محمدی ایڈووکیٹ کی جرح

سب انسپکٹر استغاثہ زبیر اور دیگر دو کانسٹیبلز میرے ساتھ میری دکان میں کوئی نصف گھنٹہ رہے۔ وہ میری دکان پر دوپہر ایک بجے کے بعد آئے تھے۔ میری دکان کے دونوں جانب اور سامنے کئی دکانیں ہیں اور وہ تمام کھلی ہوئی تھیں کیونکہ وہ خریداری کے معمول کے اوقات کار تھے۔ میری دکان میں پولیس کو دیکھ کر کئی لوگ میری دکان کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ سب انسپکٹر استغاثہ زبیر نے ان جمع ہونے والے افراد میں سے کسی کو بھی مشیر بننے کیلئے نہیں کہا۔ اولمپک 1980 اور سوویت یونین کے مسلمان نامی دونوں کتابیں مجھ سے یا دکان کی شوکیس سے برآمد نہیں ہوئیں بلکہ یہ میری دکان کے گودام میں رکھی ہوئی تھیں۔ تینوں پولیس اہلکاروں اور وہاں جمع

ہونے والے سویلین افراد میں سے کوئی بھی یہ کتابیں برآمد کرنے کیلئے میرے گودام میں داخل نہیں ہوا۔ سب انسپکٹر استغاثہ نے اردگرد کی اراضی کی کسی دکان کا کوئی خاکہ نہیں بتایا تھا۔ یہ درست ہے کہ میں نے گواہی کے خلاصے میں نہیں بتایا تھا کہ کتابیں گودام میں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے گواہی کے خلاصے میں بتایا تھا کہ اولمپک 1980 کی 800 کتابیں اور سوویت یونین کے مسلمان کی 400 کتابیں میری دکان سے برآمد ہوئیں۔ عدالت نے گواہی کے خلاصے کے بیان کو دیکھنے کے بعد تصدیق کی کہ بیان میں مندرجہ بالا جملے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ میں نے گواہی کے خلاصے میں یہ بھی کہا تھا کہ مشیران میں سے ایک میرا بھائی تھا جو اس وقت میری دکان پر موجود تھا۔ میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ دوسرا مشیر دکان پر کام کرنے والا میرا ملازم تھا۔ عدالت نے تصدیق کی کہ ان مشیران (بھائی اور ملازم) کا کوئی ذکر نہیں ہے، جن کے دستخط لئے گئے تھے۔ دو گواہان کا ذکر ہے جن کے برآمدگی کے مشیرنامے پر دستخط لیے گئے تھے۔ میں نے کمال وارثی کے دیئے ہوئے فون نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تاہم وہاں سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ زبیر نے صرف کتابیں اسکے حوالے کرنے کو کہا تھا، اس نے اور کوئی چیز نہیں مانگی تھی اور نہ ہی یہ معلوم کیا کہ مجھے یہ کتابیں کس نے دی تھیں۔ دوبارہ بتایا کہ اس نے دریافت کیا تھا کہ کسی ایجنسی/ادارے نے تمہیں یہ کتابیں فراہم کی ہیں۔ میں نے اسکو بتایا کہ یہ کتابیں کسی ادارے نے نہیں بلکہ احمد کمال وارثی نے مجھے دی تھیں جس کو میں نے اسکی رسید بھی جاری کی تھی۔ دکان پر آنے سے قبل میری احمد کمال وارثی سے کوئی جان پہچان نہیں تھی۔ دو رسیدوں عدالتی دستاویزات ایم-5 پی اور ایم-5 کیو کے علاوہ کتابوں کی فروخت سے متعلق میرے اور کمال وارثی کے درمیان کوئی دوسرا تحریری معاہدہ نہیں تھا۔ میری جانب سے جاری ہونے والی رسید پر میں نے یہ نہیں لکھا تھا کہ مجھے یہ کتابیں احمد کمال وارثی نے دی ہیں۔ اس رسید پر کسی گواہ کے دستخط نہیں تھے۔ یہ درست ہے کہ میری دکان سے ان کتابوں کی برآمدگی پر سب انسپکٹر استغاثہ زبیر کے بنائے ہوئے مشیرنامے (این 1) میں یہ کہیں بھی درج نہیں ہے کہ مجھے یہ کتابیں کمال وارثی نے مہیا کی تھیں۔ تیس سے چالیس لوگ کمیشن پر کتابیں فراہم کرتے ہیں۔ میں اس کے تفصیل ایک ڈائری میں درج کرتا ہوں۔ میں نے ان تفامیل والی ڈائری سب انسپکٹر استغاثہ زبیر کو نہیں دکھائی تھی۔ بدر نیوز ایجنسی گذشتہ تیس برس سے

ہماری ملکیت ہے اور کسی بھی ملزم کا اس نیوز ایجنسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حکومت نے 1960 میں اور بعدازاں 1981 میں میری دکان گرادی تھی۔ میں نے اپنی دکان 4x4 کی سائز میں دوبارہ تعمیر کی ہے۔ میں اس جگہ کا نہ تو کوئی کرایہ دیتا ہوں اور نہ ہی کوئی ٹیکس، میری دکان کے حوالے سے کسی بھی عدالت میں کوئی مقدمہ زیرِ سماعت نہیں ہے۔ میں انجمن اخبار فروشان کو فیس دیتا ہوں۔ انجمن ہی جگہ کے استعمال یا دکان کی از سرِ نو تعمیر کے سلسلے میں پولیس اور کراچی میٹرو پولیٹن کارپوریشن سے معاملات طے کرتی ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں حکومت کو کرایے یا ٹیکس کی عدم ادائیگی کے سلسلے میں پولیس معاملے میں فریق ہوں اور یہ کتابیں میری دکان سے برآمد نہیں ہوئی ہیں اور سب انسپکٹر استغاثہ زبیر نے یہ مشیر نامہ میری دکان پر نہیں بلکہ پولیس اسٹیشن پر تیار کیا تھا۔

جناب شفیع محمدی ایڈووکیٹ نے اپنی جرح مکمل کی۔ سماعت 17 اپریل 1982 تک ملتوی۔

17 اپریل 1982 - وکلا کو واپس آنے کی ہدایات دینے کیلئے پیر تک کی مہلت، بصورت دیگر عدالت ریاستی اخراجات پر وکلا صفائی مقرر کرے گی۔

19 اپریل 1982 - جناب یوسف لغاری ایڈووکیٹ کی جانب سے جام ساقی اور دیگر کی درخواستِ ضمانت پر فیصلہ دوبارہ پڑھ کر سنایا گیا۔

استغاثہ کے گواہ شیخ محمود سے یوسف لغاری ایڈووکیٹ کی جرح

یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں پولیس کے زیرِ اثر بیان دے رہا ہوں اور میری جانب سے جاری کی گئی رسیدیں جعلی ہیں۔

جام ساقی اور دیگر کی جانب سے جرح کا موقعہ فراہم ہونے پر جواب: عدالت کی جانب سے دیا گیا فیصلہ ہمارے لئے قابلِ اطمینان نہیں ہے کیونکہ یہ ہماری جانب سے اُٹھائے گئے کئی نکات کو مخاطب نہیں کرتا۔ اس پر تحریری جواب اپنے وکلا سے مشورے کے بعد دیا جائے گا۔

12 اپریل 1982

خصوصی فوجی عدالت نمبر 5، کراچی کے روبرو

ریاست

بمخالف

کمال وارثی ودیگر

ملزمان کی جانب سے ذیل کے طور پر استدعا کی جاتی ہے:

1- یہ کہ نذیر عباسی کو فوجی حکام نے پروفیسر جمال نقوی کے ہمراہ 30 جولائی 1980 کو گرفتار کیا اور انہیں پیپئر بیرکس کراچی میں فوجی حکام کی تحویل میں رکھا گیا تھا۔

2- یہ کہ مذکورہ بالا مرکز میں ملزمان کو مسلسل ساٹھ گھنٹوں تک پیروں اور ہاتھوں میں زنجیریں ڈال کر کھڑا رکھنے کے علاوہ لاتوں، گھونسوں سے مار پیٹ کرنے کے علاوہ انتہائی غیر انسانی برتاؤ کا نشانہ بنایا گیا، شبیر شر اور کمال وارثی اس بہیمانہ برتاؤ کے بالخصوص شکار ہوئے۔ شبیر شر اس برتاؤ کی علامات کا تا حال ثبوت رکھتا ہے۔

3- یہ کہ مذکورہ بالا مرکز ملزمان کی معلومات کے مطابق ایف آئی ایس مرکز نمبر 736 ہے جس کا انچارج میجر جمیل ہے اسے ملزمان کو برائے تفتیش ایک اور مرکز بھی لے جاتا رہا گیا ہے، جو کہ ملزمان کی معلومات کے مطابق مذکورہ مرکز سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر تھا۔

4- یہ کہ اس عدالت کی جانب سے تا حال ریکارڈ کی گئی گواہی واضع طور پر ثابت کرتی ہے کہ ڈرامے کے اصل ملزم اس عدالت کے روبرو پیش ہونے سے انتہائی گھبرائے ہوئے ہیں اور جان بوجھ کر راز داری کے پردے کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں تا کہ انکے بھیانک جرائم کا پردہ فاش نہ ہو۔ نہ میجر جمیل نہ میجر سلیم یا ظفر اقبال جو کہ گواہان کے مطابق نہ صرف گرفتاریوں، حراستوں، تشدد بلکہ ہمارے ایک ساتھی اور شریک ملزم نذیر عباسی کی حراست میں ہلاکت کیلئے ذمہ دار تھے، نہ سنٹرل جیل میں سرسری سماعت کی فوجی عدالت میں گواہی کے خلاصے کیلئے پیش ہوئے اور نہ ہی اس عدالت کے روبرو آئے ہیں۔

5- یہ کہ اب یہ بات عالمِ آشکار ہے کہ نذیر عباسی جو کہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے ایک رہنما تھے، اپنی غیر قانونی حراست اور اسکے دوران بہیمانہ تشدد کے نتیجے میں ہلاک کر دیئے گئے۔ تاہم اس عدالت کے روبرو اسکی گرفتاری اور مارشل لا ٹیم کو اسکی سپردگی کی گواہی دینے والے اس امر سے لاعلمی کا اظہار کر رہے ہیں کہ کہاں، کیسے اور کن حالات میں اسکی موت واقع ہوئی۔

6- یہ کہ یہ بھی اب عالمِ آشکار ہے کہ نذیر عباسی کی لاش اسکی بیوی یا والدہ کے حوالے کرنے کے بجائے ایک دور کے رشتہ دار کو دی گئی جس سے لاش کی وصولی پر زبردستی دستخط کرائے گئے۔ نذیر کو رات کے اندھیرے میں دفن کیا گیا۔

7- یہ کہ ان حالات میں جب نذیر عباسی سے تعلق میں آنے کی دعویٰ کرنے والے لوگ جرم اور اس کو درپیش آنے والی صورتحال میں حصہ داری سے انکاری ہیں، یہ اس عدالت کا فریضہ بنتا ہے کہ وہ نذیر عباسی کی موت کے ذمہ دار بننے والے حالات وقرائن کی جانچ پڑتال کا حکم جاری کرے۔

8- یہ کہ ہماری معلومات کے مطابق نذیر عباسی کی بیگم نے اپنے شوہر کی تشدد کے ذریعے ہلاکت کے الزامات کے تحت ایف آئی آر درج کرائی ہے، جس میں اس عدالت کو تشکیل دینے والی انتظامیہ کو بھی فریق بنایا گیا ہے۔

9- یہ کہ موجود ملزمان نے پہلا موقعہ ملتے ہی اس عدالت کی تشکیل پر اعتراض اُٹھایا تھا کیونکہ یہ عدالت خود اس فرد کی تشکیل کردہ ہے جو کہ نذیر عباسی کے قتل اور ہم پر تشدد کیلئے ذمہ دار ہے۔ اس اعتراض کو کوئی سبب بتائے بغیر مسترد کر دیا گیا تھا۔

10- یہ کہ تاحال پیش کی جانے والی گواہی مکمل طور پر من گھڑت داستان پر مبنی ہے اور ملزمان کے شعور کا اعادہ کرتی ہے کہ یہ مقدمہ مخفی مقاصد کی تکمیل کے من گھڑت منصوبوں کیلئے قائم کیا گیا ہے، جس میں ملزمان نے استغاثہ کے اس غیر قانونی مطالبے کو ماننے سے انکار کیا کہ وہ ہمارے اس ملک میں جمہوریت کی بحالی پر اپنے اعتقاد اور مطالبے سے دست بردار ہوں۔

11- یہ کہ باوجود اسکے کہ ضوابط کے تحت یہ مقدمہ کھلی سماعت میں ہونا تھا۔ اس عدالت نے اس مضحکہ خیز مقدمے کیلئے جان بوجھ کر ایک چھوٹا کمرہ منتخب کیا ہے اور بغیر اعلان کیے ہوئے اسکو بند

کمرے کے مقدمے میں تبدیل کر دیا ہے، یہاں تک کہ رشتہ داروں اور دوستوں کو بھی کارروائی سننے سے روکا جارہا ہے۔

12- یہ کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس عدالت نے ابتدائی مراحل پر کارروائی کو ملنے والی شہرت اور گواہان کے بیانات کی مقامی ذرائع ابلاغ میں تشہیر سے خوفزدہ ہوکر اخبارات کو ہدایت جاری کر کے کسی خبر یا کارروائی کی اشاعت سے روک دیا ہے۔ ذرائع ابلاغ سے تعلق رکھنے والے افراد کو، جو کارروائی کا مشاہدہ کرنے آئے تھے کو واپس بھیج دیا گیا ہے۔

13- یہ کہ 180 برس قبل بینتھیم یہ لکھنے پر مجبور ہوا کہ ''رازداری کی تاریکی میں مکروہ مفادات اور بداعمالی ہی ہر ایک پر بالادست ہیں۔ جہاں عدالتی ناانصافیوں کا دور دورہ ہو وہاں پر ہی تشہیر پر قدغن عائد ہوتی ہے۔ تشہیر کی عدم موجودگی انصاف کی عدم موجودگی ہے۔ تشہیر انصاف کی اصل روح ہے۔ یہ بداعمالی کے خلاف ایک ڈھال ہے۔ یہ جانتی ہے کہ خود جج بھی دورانِ مقدمہ کٹہرے میں کھڑا ہوتا ہے۔''

یہ آج کی اُس صورتحال پر بھی صادر ہے جو ملزمان بلکہ پوری قوم کو درپیش ہے۔

14- یہ کہ ہمارے وکلا صفائی کو گواہی کے تصدیق شدہ نقول فراہم کرنے سے انکار کیا گیا ہے جو کہ انکی موجودگی میں ریکارڈ ہوئی ہیں جو عمل اس خدشے میں اضافہ کرتا ہے کہ ریکارڈ گواہان کی جانب سے عدالت میں بتائی جانے والی باتیں ظاہر نہیں کرے گا بلکہ وہ کچھ ہی سامنے لایا جائے گا جو استغاثہ کی جانب سے گھڑے گئے جھوٹ کو تقویت دینے میں مددگار ہوگا۔

15- یہ کہ ان حالات میں جب یہ عدالت کسی بھی طور عدالتی اختیارات کے حامل کسی نگران کے تابع نہیں ہے اور یہ کہ اسکا فیصلہ قابلِ اطلاق نہیں ہوگا اور مزید برآں یہ کہ یہ عدالت کسی طور بھی پابند نہیں ہے کہ اپنے احکامات یا مارشل لاء کے تحت دی جانے والی سزاؤں کی توجیہات پیش کرے، ہم کم از کم یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ گواہی کا ریکارڈ درست اور واضع رکھا جائے۔

16- یہ کہ ہم اُن ناقابلِ برداشت حالات کا حوالہ دینے سے گریز کر رہے ہیں جن میں ہم میں سے دو کے علاوہ باقی تمام کو شہر سے بیس میل دور لانڈھی جیل میں طبی سہولیات اور سیاسی قیدی کی

حیثیت سے محروم رکھا گیا ہے۔ یہ تمام اُمور عدالتی توجہ پر لانے کی تمام تر کوششوں کے باوجود ہماری ملاقات کرانے کا انتظام کرنے سمیت تمام تر شکایات / مشکلات کو مسترد کیا جاتا رہا ہے۔

17- یہ کہ ان حالات میں، ملزمان سمجھتے ہیں کہ انکی جانب سے اپنے وکلا صفائی کو اپنا دفاع جاری رکھنے کا کہنا نقصاندہ ہوگا تاوقتیکہ اس عدالت کی جانب سے مناسب برتاؤ اور غیر جانبداری کی کچھ ضمانتیں فراہم نہیں کی جاتیں۔

i) کہ اولین، یہ مقدمہ دنیا کی نظروں کے سامنے کھُلی عدالت کے طور پر چلایا جائے، تاکہ ملزمان کے رشتہ دار اور دوست احباب مقدمے کے کارروائی میں شریک ہوسکیں۔

ii) کہ مقدمے کی کارروائی کے سچائی پر مبنی موقف کی اشاعت پر عائد پابندیاں ختم کی جائیں اور ذرائع ابلاغ کو کارروائی میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے۔

iii) کہ عدالت اولین طور پر نذیر عباسی کی موت کے حقائق، حالات اور ذمہ داران کا تعین کرے اور اس کے تعین تک ملزمان پر غیر حاضری میں مقدمہ چلائے۔

iv) کہ یقینی بنایا جائے کہ حراست کے دوران ملزمان سے انسانی اور سیاسی برتاؤ کیا جائے، جوکہ کم از کم مقدمے کی کارروائی تک برقرار رہے۔

v)-----------------

ملزم نمبر 1 جام ساقی

ملزم نمبر 2 پروفیسر جمال الدین نقوی

ملزم نمبر 3 شبیر شر

ملزم نمبر 4 کمال وارثی

ملزم نمبر 5 امر لال

کراچی بتاریخ 12 اپریل 1982

اسلم نور خان ولد نور خان لوچی، پولیس سب انسپکٹر

ساکن 0-4-4، آرٹلری میدان پولیس لائن کراچی، عمر 49 سال

استغاثہ کا گواہ

جون اور جولائی 1980 کے دوران میں آرٹلری میدان پولیس اسٹیشن کراچی میں سب انسپکٹر کے طور پر تعینات تھا۔ 29 جولائی 1980 کو مجھے جناب فضل رحمان ایس ایچ او آرٹلری میدان پولیس اسٹیشن نے ہدایت کی کہ میں دو نائیبین کے ساتھ ڈی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹر میں میجر طفیل کو رپورٹ کروں۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل محمد فیاض اور پولیس کانسٹیبل دولت خان ساتھ لیا اور ڈی ایم ایل اے کو رپورٹ اور میجر طفیل سے رابطہ کیا۔ وہاں مجھے ایک مجسٹریٹ ملے۔ میجر طفیل نے اے سی ایم محمد رمضان کو بتایا کہ انہیں اطلاع ملی ہے کہ پیپلز کالونی نارتھ ناظم آباد میں حکومت مخالف مواد شائع کیا جا رہا ہے اور مجھے ہدایت کی کہ میں مجسٹریٹ کے ہمراہ اس جگہ پر چھاپہ ماروں۔ انہوں نے ایک مخبر کو بھی میرے ہمراہ جا کر اس جگہ کی نشاندہی کرنے کیلئے کہا جہاں مذکورہ مواد شائع ہو رہا تھا۔ ہم تینوں مجسٹریٹ اور مذکورہ مخبر کے ہمراہ پیپلز کالونی نارتھ ناظم آباد میں واقع اس مکان پر ساڑھے تین بجے پہنچے۔ مذکورہ مخبر ہمیں ایک کچے گھر لے گیا جو بغیر نمبر کے ندی کے کنارے پر واقع تھا۔ اس مرحلے پر مخبر چلا گیا۔ دروازے پر اندر سے تالا نہیں لگا ہوا تھا اور میں نے اسے دھکیلا تو کُھل گیا۔ مجھے دو لوگ نظر آئے، ایک شخص جس کا نام بعد میں شبیر شر معلوم ہوا ٹائیپ کر رہا تھا جبکہ دوسرا، جسکی بعد میں احمد کمال وارثی کے طور پر شناخت ہوئی، ایک کاغذ پر قلم سے لکھ رہا تھا۔ یہ دونوں افراد عدالت میں موجود ہیں اور میں انہیں شناخت کر سکتا ہوں۔ مجھے وہاں سے سندھی کتابچے ہلچل اور اردو کتابچے سرخ پرچم کے کئی ایک نسخے ملے۔ میں نے سرخ پرچم کا ایک نسخہ پڑھا جبکہ اے سی ایم نے ہلچل اور سرخ پرچم کے نسخے پڑھے۔ نسخے پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا مواد حکومت مخالف ہے اور لوگوں میں منافرت اور بے چینی پھیلانے کا باعث ہے۔ مجسٹریٹ بھی ہلچل اور سرخ پرچم دونوں پڑھنے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچے

جس پر انہوں نے مسروقہ اشیا کی تحویل کا حکم دیا۔ میں نے مسروقہ اشیا کی فہرست تیار کی جو میرے ہاتھ سے لکھی ہوئی ہے، جس پر میرے اور دو گواہان دولت اور فیاض کے دستخط ہیں جبکہ اس پر مجسٹریٹ کے تصدیقی دستخط بھی موجود ہیں۔ میں عدالت میں اسکی شناخت کرسکتا ہوں۔M-1 میں ذکر کیئے گئے تمام کاغذات تحویل میں لئے گئے اور مجسٹریٹ اور دو کانسٹیبلز کے ہمراہ پاکستان کوارٹرز لائے گئے، جس کی نشاندہی غلام شبیر شر نے کی تھی۔ غلام شبیر شر نے کوارٹر کا دروازہ کھولا، جب ہم اس میں داخل ہوئے تو ہمیں سرخ پرچم اور ہلچل کے نسخوں کے علاوہ دستاویزات پر مبنی فائل بھی ملی جس میں افغانستان، شمالی مغربی صوبۂ سرحد اور سندھ کے لوگوں کے ساتھ خط و کتابت والے خط شامل تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے دو فہرستیں تیار کیں ایک مقدمے کی املاک کی اور دوسری ذاتی اشیا کی، جن پر بھی گواہان اور مجسٹریٹ کے دستخط لئے گئے۔ میں چھاپہ مار ٹیم ملزمان اور تمام مواد/اشیا کے ساتھ ساڑھے آٹھ بجے ڈی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹر میں میجر طفیل کے پاس پہنچا اور انکو سپرد کیا۔

16 جنوری 1982

میں نے سرخ پرچم جنوری 1979، جون، جولائی اور اگست 1980 کے دو اور جنوری اور فروری 1980 مہینوں کی ہلچل کا ایک شمارہ (ایم 4، ایم 5، ایم 6) اُٹھائے۔ یہ تمام سائیکلو اسٹائل تھے، جن پر کسی اشاعتی پریس کا نام درج نہیں تھا اور نہ ہی انکی اشاعت کیلئے حکومتی اجازت نامہ۔ ان سائیکلو اسٹائل کتابچوں کے بہت سارے کھلے اوراق تھے جو دو تھیلوں میں بھرے ہوئے تھے اور جو میں نے عدالت میں دیکھے ہیں۔ مسروقہ سامان کے روزنامچے کے مطابق دو ٹائیپ رائٹر، سائیکلو اسٹائل مشین، سیاہی اور قلم بھی برآمد ہوئے۔ میں نے متفرقہ کاغذات پر مبنی تین فائلیں بھی تحویل میں لیں، جن میں جام ساقی اور نازش امروہی کے دستی تحریر شدہ خطوط، شبیر شر کے نام ذاتی خطوط اور امر لعل کی مارک شیٹ شامل ہیں۔ میں نے فائل کیے ہوئے دستاویزات نمبر 24, 25, 27, 28, 26, 40, 41, 42, 44, 45, 48, 49, 50, 58, 65, 71, 72, 76, 79, 88, 90, 140, 141, 142, 143, 144, 145 کل 27 کو

مسروقہ روزنامچہ عدالتی دستاویز ایم-5 کے طور پر اندراج کیا۔ میں نے حکومت مخالف مواد پر مبنی یہ خطوط اور جام ساقی کی جانب سے لکھے گئے ذاتی خطوط اور ان ملزمان کے علاوہ مثلاً شبیر شر کے نام خط و کتابت اور ایک گمنام کامریڈ کے عمومی خطوط پڑھے ہیں۔ میں نے مقدمے کی کارروائی اور تفتیش کے دوران بھی ان کا جائزہ لیا ہے۔

یوسف لغاری کی جانب سے جرح

1- پہلی جگہ جہاں سے ملزم احمد کمال وارثی اور شبیر شر گرفتار کیے گئے، آرٹلری میدان پولیس اسٹیشن کی حدود میں نہیں آتی، جہاں میں تعینات تھا اور نہ ہی پاکستان کوارٹرز اس تھانے کے حدود میں آتا ہے۔

2- میں نے ڈی ایم ایل اے ہیڈکوارٹر کو رپورٹ کرنے کیلئے آرٹلری میدان پولیس اسٹیشن کے جاری کیے گئے لیٹر کا اندراج کیا۔

3- ایس ایچ او آرٹلری میدان پولیس اسٹیشن نے ڈی ایم ایل اے ہیڈکوارٹرز سے میجر حنیف کا ٹیلی فون وصول کرنے کے بعد مجھے ڈی ایم ایل اے ہیڈکوارٹرز میں میجر طفیل سے رابطہ کرنے کیلئے کہا۔

4- یہ درست ہے کہ مجھے اور مجسٹریٹ محمد رمضان کو حکم دیا گیا تھا کہ گھر میں موجود تمام افراد کو گرفتار کیا جائے۔ یہ درست ہے کہ میں نے میجر طفیل کو بتایا کہ انکے احکامات کی تعمیل ہوگی جبکہ مجسٹریٹ اس دوران خاموش رہے۔

5- یہ کہنا درست ہوگا کہ اس سے قبل مجھے کبھی بھی مارشل لا انتظامیہ کی جانب سے چھاپہ مارنے کی ذمہ داری نہیں دی گئی۔

6- مجھے اور مجسٹریٹ کو مارشل لاء انتظامیہ کی جانب سے ایک گاڑی فراہم کی گئی۔ میں وہ گاڑی نہیں چلا رہا تھا۔ گاڑی مارشل لا ہیڈکوارٹر کی جانب سے آنے والا ڈرائیور چلا رہا تھا۔ وہ ایک خانگی ٹویوٹا جیپ تھی، دوبارہ کہا کہ اس پر سندھ حکومت کی پلیٹ تھی۔ مجھے ڈرائیور کا نام معلوم نہیں ہے۔ میں اور مجسٹریٹ، دو کانسٹیبل اور ایک مخبر ڈرائیور کے ہمراہ جائے وقوعہ پر گئے۔ میں

نے لاگ بک میں کسی اندراج کے بغیر سرکاری گاڑی استعمال کی، چونکہ مجسٹریٹ موجود تھا اور اس نے لاگ بک میں اندراج کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ جائے وقوعہ جہاں سے احمد کمال وارثی اور شبیر شر کو گرفتار کیا گیا، نارتھ ناظم آباد پولیس کی حدود میں تھی تاہم وہاں مذکورہ گھر پر چھاپے، ملزمان کی گرفتاری اور اشیا کی برآمدگی کا اندراج نہیں کرایا گیا جبکہ اس چھاپے سے متعلق بعد میں بھی نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن کو مطلع نہیں کیا، نہ ہی میں نے گھر نمبر آر 344 پاکستان کوارٹرز پر چھاپے سے متعلق گارڈن پولیس اسٹیشن پر کوئی اندراج کیا۔ میں نے پہلے پیپلز کالونی کے گھر پر چھاپہ مارا، جس کے بعد آر 344 پاکستان کوارٹرز پر چھاپہ مارا، جسکے بعد مجسٹریٹ کے ہمراہ ڈی ایم ایل اے ہیڈکوارٹر کو رپورٹ کیا۔ مجسٹریٹ نے میجر طفیل کو رپورٹ پیش کی۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجسٹریٹ کس وقت ہیڈکوارٹر سے واپس ہوا اور اس نے میجر طفیل سے کیا کہا۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ پیپلز کالونی میں چھاپے کے بعد میں نے ڈی ایم ایل اے ہیڈکوارٹر میں میجر طفیل کو رپورٹ دی۔ میں نے گواہ کے طور پر طلبی سے قبل پولیس کے سامنے اس ضمن میں کوئی بیان نہیں دیا ہے۔ دونوں چھاپوں میں وہی ایک ڈرائیور تھا۔ تفتیش کے دوران پولیس نے ڈرائیور کے متعلق معلوم نہیں کیا اور نہ ہی میری موجودگی میں۔ ڈرائیور سادہ کپڑوں میں تھا۔ چھاپہ مارنے والے جتھے میں کوئی بھی یونیفارم میں نہیں تھا۔

وقت: ساڑھے تین بجے سے پانچ بجے شام، پیپلز کالونی

پانچ بجے سے ساڑھے پانچ بجے شام، پاکستان کوارٹرز کی جانب سفر

ساڑھے پانچ بجے سے ساڑھے سات بجے تک پاکستان کوارٹرز

میں جائے وقوعہ پر فائلوں کے ساتھ کاربن پیپر، بال پین اور سفید کاغذ تھیلے میں ڈال کر لے گیا تھا۔ میرے پاس تحریری اشیا کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ پیپلز کالونی سے برآمد ہونے والا تمام مواد جیپ میں رکھا گیا اور پاکستان کوارٹرز لے جایا گیا جہاں پر برآمد ہونے والی اشیا پیپلز کالونی سے برآمد ہونے والی اشیا کے ساتھ آپس میں مل گئیں، بعدازاں برآمد کی گئی تمام اشیا ڈی ایم ایل اے ہیڈکوارٹر لے جائی گئیں۔ مجھے میجر طفیل سے برآمد شدہ اشیا اور ملزمان کی سپردگی کی

کوئی رسید نہیں ملی۔ بعدازاں، اس کاروائی کے تین چار روز بعد میں نے یہ مسروقہ اشیا نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن پر دیکھیں۔ دوبارہ میں نے یہ فوجی مقدمے کی تیاری کے دن ڈی ایم ایل اے ہیڈکوارٹر میں دیکھیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میجر طفیل نے ڈی ایم ایل اے ہیڈکوارٹر میں یہ اشیا کہاں رکھی تھیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا یہ اشیا کسی کمرے میں رکھی گئی تھیں، یا کسی برآمدے میں یا کھلے میدان میں۔ مجسٹریٹ نے صرف اشیا کی ضبطگی اور عدالت میں موجود ملزمان کی گرفتاری کا حکم صادر کیا تھا۔ مجسٹریٹ نے اسکے علاوہ کوئی اور حکم نہیں دیا تھا۔ فقط یہ دو احکامات دیئے گئے تھے۔ احکامات زبانی دیئے گئے تھے۔ مجھے مجسٹریٹ سے تلاشی کا کوئی وارنٹ نہیں ملا کیونکہ وہ خود چھاپے کے دوران موجود تھے۔ میں نے مجسٹریٹ کو اس مکان میں داخل ہونے کی کوئی درخواست نہیں کی تھی، وہ خود مکان میں داخل ہوئے اور میں انکے پیچھے داخل ہوا۔

17 جنوری 1982

برآمدگی کے اندراج میں کسی فاؤنٹین قلم کا ذکر نہیں ہے۔ احمد کمال وارثی اور شبیر شر کی گرفتاری کا روزنامچہ میں نے تیار نہیں کیا۔ میں نے دونوں ملزمان کے نام برآمدگی کے روزنامچے میں درج نہیں کیے ہیں۔ پولیس دفعہ 54 سی آر پی سی کے تحت ملزم کی مدد کر سکتی ہے۔ برآمدگی کا روزنامچہ دفعہ 550 سی آر پی سی کے تحت تیار کیا گیا ہے۔ مقدمے کی اشیا انکی ذاتی اشیا نہیں ہیں۔ رضاکارانہ طور پر کہا گیا کہ یہ پارٹی کی ملکیت ہیں۔ جب میں پارٹی کہتا ہوں تو اس سے مراد لوگوں کا گروہ جیسا کہ وکیل صفائی یا ملزمان ہے۔ عدالتی دستاویز ایم-1 میں شامل تمام تر اشیا دونوں ملزمان کی تحویل سے برآمد ہوئیں ہیں۔ میں کمال وارثی اور شبیر شر کی تحویل سے ملنے والی اشیا کو علیحدہ سے واضع کرنے سے قاصر ہوں۔ میں نے مشیر نامہ پیپلز کالونی کے گھر پر تیار کیا تھا۔ مجھے چھاپے کا مکمل وقوعہ یاد ہے۔ میں نے مقدمے کی نہ تو تفتیش کی ہے اور نہ ہی مقدمے کی ڈائری تیار کی ہے۔ میں اس گھر کا نمبر بتانے سے قاصر ہوں۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ پیپلز کالونی میں ایک ہزار سے زائد گھر ہوں گے۔ پاکستان کوارٹرز میں سینکڑوں گھر ہوں گے۔ پاکستان کوارٹرز سرکاری ملازمین کیلئے تعمیر ہوئے اور انہیں ہی الاٹ ہوتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کوارٹر نمبر 344 کب

الاٹ کیا گیا۔ چھاپے کے وقت پیپلز کالونی کی گلی میں صرف عورتیں اور بچے ہی تھے۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ وہاں لوگ جمع ہو گئے تھے اور ہمارے دھمکانے کے بعد ہی وہاں سے منتشر ہوئے۔ میں نے کسی بھی مجسٹریٹ سے ان دونوں ملزمان کا ریمانڈ حاصل نہیں کیا۔ میں نے پیپلز کالونی یا پاکستان کوارٹرز کے گھروں پر ملزمان سے کوئی جانچ پڑتال یا تفتیش نہیں کی۔ میں صرف نویں جماعت تک پڑھا ہوا ہوں۔ میں نے ابن صفی کے ناول پڑھے ہیں۔ میں ادب کا ماہر نہیں ہوں۔ میں نے ماؤزے تنگ اور لینن کی کتابیں نہیں پڑھیں۔ میں کمیونسٹوں سے نفرت کرتا ہوں، اس لئے کمیونسٹ مواد نہیں پڑھتا۔ میں نے پرولتاریہ اور بورژوا کے الفاظ اردو میں نہیں پڑھے ہیں، اس لئے ان الفاظ کی تشریح نہیں کر سکتا۔

میں نے سیاسی مواد نہیں پڑھا ہے تاہم اردو میں سیاسی مواد پڑھ اور سمجھ سکتا ہوں۔ میں سیاسی رہنماؤں کی جانب سے مختلف حکومت مخالف انداز اختیار کیے جانے کا سنتا رہا ہوں۔ میں نے جو بھی حکومت مخالف تقریریں سُنی ہیں ان پر کچھ عوامی ردعمل سامنے آیا ہے۔ میں نے برآمد ہونے والا تقریباً تمام مواد پڑھا ہے۔ میں نے عدالتی دستاویز میں شامل سرخ پرچم کے دونوں شمارے پڑھے ہیں۔ میں نے مقدمے کی املاک میں شامل بلا جلد اوراق نہیں پڑھے ہیں تاہم یہ دیکھ چکا ہوں کہ تمام بلا جلد اوراق ایک ہی کی نقول تھیں۔ ہلچل اور سرخ پرچم کے مندرجات پر مجسٹریٹ کے ساتھ بات کرتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ دونوں کا موضوع یکساں ہے۔ میں نے جائے وقوعہ پر ان کتابچوں کا جائزہ لیا، جیسا کہ مجسٹریٹ نے بھی کیا۔ میں نے وقوع پر موجود ایف سی کے ہیڈ کانسٹیبل کو بھی انکے مندرجات پڑھ کر سنائے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ حکومت کی جانب سے ہلچل اور سرخ پرچم پر پابندی عائد کی گئی ہے یا نہیں۔ مجھے ایسی کوئی معلومات نہیں ہے کہ اس عدالتی دستاویز میں شامل مضامین، کتابچوں یا برآمد ہونے والے دیگر مواد پر حکومت کی جانب سے کوئی پابندی عائد کی گئی ہے یا نہیں۔ مجھے یاد نہیں ہے۔ میں اس مواد یا کتابچوں کے مندرجات سے متعلق کچھ بھی کہنے سے قاصر ہوں جو میں نے نہیں پڑھے ہیں۔ میں تو ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی پوری کتاب کو سمجھ سکتا ہوں۔ یہ کہہ سکتا ہوں کہ کچھ مواد زیادہ حکومت مخالف نہیں

ہے۔ ماسوائے اس خط کے باقی ماندہ تمام تر میری نظر میں حکومت مخالف ہے۔ میں حکومت پر درست تنقید کو جرم نہیں سمجھتا۔

19 جنوری 1982 اعادہ

میں ''پاکستانی ادب'' دسمبر 1973 تا جنوری 1976، جلد 3، شائع کنندہ سعیدہ گذدر، بہ پتہ اسٹیٹ لائف بلڈنگ نمبر 7، ایم اے جناح روڈ، کراچی دیکھ رہا ہوں۔ یہ سید سبطِ حسن اور سعیدہ گذدر کا مرتب کردہ ہے۔ یہ کتاب چھاپے کے دوران برآمد کی گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس پر پابندی تھی یا نہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اسی نوعیت کا مواد حیدرآباد پولیس نے بھی برآمد کیا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ تمام تر مشیر نامہ ڈی ایم ایل اے ہیڈکوارٹر میں پولیس نے مارشل لاء انتظامیہ کے اصرار پر تیار کیا نہ کہ میری جانب سے جائے وقوعہ پر۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میری جانب سے برآمد کی گئی اشیا مجھے محمد شفیع سومرو ایس ایچ او جامشورو کے ذریعے حیدرآباد پولیس نے دیں تاکہ امر لال اور دیگر شریک ملزمان کے خلاف بھی استعمال کی جاسکیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میری جانب سے عدالت میں پیش کیا گیا مواد میں نے پڑھا نہیں ہے، رضا کارانہ طور پر کہہ رہا ہوں کہ میں نے ماسوائے انکے اندر کے مواد/خطوط کے، تمام تر مواد پڑھا ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے میں نے مارشل لاء انتظامیہ کے اصرار پر ملزمان کے خلاف بیان دیا ہے۔ ملزمان مظلوم لوگوں کے حقوق کیلئے سیاسی کارکن ہیں۔ رضا کارانہ طور پر کہتا ہوں کہ حکومت مخالف یا قانون مخالف افراد کو گرفتار کرنا میرا فرض بنتا ہے۔ گواہان نے رضا کارانہ طور پر مسروقہ روزنامچہ نمبر 186 کے طور پر جمال الدین نقوی کی ایک ٹیلی فون ڈائری پیش کی۔ وکیلِ صفائی نے اعتراض اُٹھایا کہ گواہ کوئی دستاویز پیش نہیں کرسکتا۔

شفیع محمدی کی جانب سے جرح 21 جنوری 1982

اسلام میں کوئی بھی خدائی قانون کسی بھی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بھی درست ہے کہ آخری پیغمبر کا بھی کوئی قانون کسی بھی عدالت میں چیلنج نہیں ہوسکتا۔ انسان کے

بنائے ہوئے قوانین، پھر حاکم چاہے کوئی بھی ہو، عدالت میں چیلنج ہو سکتے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اگر کسی سربراہِ مملکت کے خلاف کوئی شکایت ہو تو اسکو بھی عدالت میں طلب کیا جا سکتا ہے اور اس میں کوئی استثنٰی نہیں ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ اسلام کی رو سے کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسکا قانون چیلنج ہونے سے مبرا ہے کیونکہ فقط خدا اور اسکے رسول کے قوانین چیلنج ہونے سے مبرا ہیں۔

میں ملکی قوانین کی پیروی کروں گا چاہے وہ اسلام کے منافی ہوں۔ رضا کارانہ طور پر کہتا ہوں کہ مکمل اسلامی قوانین نافذ نہیں ہیں اس لئے ان قوانین کے علاوہ، میں امن امان کے نفاذ کیلئے حکومتی احکامات کی پیروی کروں گا۔ میں قانون کے خلاف کوئی عمل نہیں کروں گا چاہے اس کے متعلق مجھے میرے بالا حکام احکامات دیں۔ اگر میرا کوئی حکام بالا ریاستی قوانین کے خلاف عمل کرتا ہے تو میں اسکی پیروی نہیں کروں گا اور خود کو اس سے علیحدہ کرلوں گا۔ میں دفعہ 165 اور 166 سی آر پی سی کے تحت وارنٹ کے بغیر کسی بھی ایسی جگہ پر داخل ہوسکتا ہوں جہاں خلافِ قانون کوئی کام ہورہا ہو۔ یہ لازمی اور ضروری ہے کہ کسی بھی گھر میں داخل ہونے یا اسکی تلاشی لینے سے قبل اس گھر کے مکینوں سے اجازت لی جائے۔

ڈی ایم ایل یا ڈی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹر کا کوئی افسر یا میجر طفیل کسی گھر پر چھاپے کے دوران کوئی غیر قانونی عمل / کام کر سکتے ہیں۔ میں واضع کرتا ہوں کہ مجھے ڈی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹرز کی جانب سے معلومات دی گئی اور میں نے اے سی ایم کے احکامات کی پیروی کی جو کہ میرے ساتھ تھے۔ یہ کرنا میرا فرض تھا اور میں نے یہ ریاستی قانون کے تحت کیا۔ یہ کوئی قانونی شرط نہیں ہے کہ برآمدگی کے مشیرنامے کی تیاری کے وقت پولیس اہلکاروں کے علاوہ علاقے کے دو معززین کی موجودگی لازمی ہو۔ میں رضا کارانہ طور پر یہ کہتا ہوں کہ اگر گواہ کے طور پر پیش کرنے جیسا کوئی فرد موجود نہ ہو تو چھاپہ مارنے کے مقام پر دو سویلین افراد کو موجود ہونا چاہئے۔ برآمدگی کے وقت شبیر شر ٹائپ کر رہا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنا ٹائپ ہو چکا تھا اور کیا ٹائپ کیا جا رہا تھا۔ میں نے نہیں پڑھا ہے اور اب میں یہ نہیں کہہ سکتا ہوں کہ یہ مجسٹریٹ نے برآمد کیا تھا۔ مشیر نے یا میں نے ان کاغذات پر دستخط نہیں کیے جو شبیر شر یا کسی اور نے ٹائپ کیے تھے۔ میں نے برآمدگی

کے مشیر نامے میں کہیں بھی شبیر شر کی جانب سے ٹائپ کیے جانے والے اور احمد کمال وارثی کی جانب سے لکھے جانے والے کاغذات کا ذکر نہیں کیا۔ احمد کمال وارثی فل اسکیپ کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا جو میں نے نہیں پڑھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ مجسٹریٹ نے پڑھا تھا۔ اس پر نہ مجسٹریٹ نے دستخط کیے، نہ مشیر نے اور نہ ہی میں نے۔ میں قانونی ضروریات کے مطابق برآمدگی کیلئے مناسب تیاری کے ساتھ گیا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ سرخ پرچم کا کوئی اسٹینسل برآمد ہوا۔ سرخ پرچم کے عنوان سے بیس بائیس کاغذ تھے جو کہ لگتا ہے کہ شائع ہونے تھے۔ یہ درست ہے کہ کسی ایسے اسٹینسل کا ذکر نہیں ہے جس سے سرخ پرچم شائع ہوسکتا ہو۔

مجھے تخریبی مواد سے متعلق پہلی اطلاع میجر طفیل سے ملی۔ میجر طفیل نے یہ ابتدائی معلومات صرف مجھے اور مجسٹریٹ کو ہی دی، نہ کہ کانسٹیبلز اور ہیڈ کانسٹیبل کو۔ یہ ہر پولیس اہلکار کا فرض نہیں ہے کہ وہ ملنے والی ابتدائی معلومات پولیس اسٹیشن پر داخل کرے۔ رضا کارانہ طور پر اضافہ کیا کہ پولیس اسٹیشن کے ڈیوٹی افسر یا مقامی ایس ایچ او کو ہی ابتدائی رپورٹ داخل کرنی ہوتی ہے۔ رپورٹ داخل کرنا میری ذمہ داری نہیں تھی کیونکہ ایک سینئر اہلکار یعنی مجسٹریٹ میرے ساتھ تھا جس کا فرض تھا کہ ابتدائی رپورٹ درج کرائے۔ اگر مجسٹریٹ میرے ساتھ نہیں ہوتے تو پھر ابتدائی رپورٹ داخل کرنا میرا فرض تھا۔ مجھے قانون کا سیکشن یاد نہیں ہے جس کے تحت ایف آئی آر کا اندراج مجسٹریٹ یا کسی سینئر افسر کا فرض ہے۔ میجر طفیل نے مجھے بتایا تھا کہ کچھ لوگ نارتھ ناظم آباد میں تخریبی مواد شائع کر رہے ہیں اور میں قانون کے تحت ایک پولیس اہلکار کی حیثیت میں ایک مجسٹریٹ کے ساتھ جا کر انکے خلاف کاروائی کروں۔ میجر طفیل نے مجھے کوئی تحریری احکامات نہیں دیئے تھے۔ جب میں گھر کے اندر داخل ہوا تو دو افراد وارثی اور شبیر کرسیوں پر بیٹھے تھے اور انکے آگے میزیں پڑی تھیں۔ میں نے میزیں اور کرسیاں تحویل میں نہیں لیں۔ مجسٹریٹ نے جس چیز کا کہا تحویل میں لی گئی جبکہ باقی کچھ سامان چھوڑ دیا گیا۔ مذکورہ گھر کو تالا لگا کر چابیاں ملزم کمال وارثی کے حوالے کی گئیں۔ میں نے تالے کی چابیاں تحویل میں نہیں لیں۔

سوال: کیا آپ کے خیال میں سینئر کی حیثیت میں پولیس اسٹیشن پر ریکارڈ/ برآمدگی کی رپورٹ

درج کرانا مجسٹریٹ کا فرض تھا اور اس لئے تم نے ایسی رپورٹ درج نہیں کرائی؟

جواب: میں اس سوال کا پہلے ہی جواب دے چکا ہوں۔

برآمدگی کے وقت مجسٹریٹ، میں، ہیڈ کانسٹیبل فیاض اور کانسٹیبل دولت ہی جائے وقوعہ پر چشم دید گواہ کے طور پر موجود تھے۔ یہ درست ہے کہ مندرجہ بالا افراد میں سے کسی نے بھی جائے وقوعہ کے متعلق کسی بھی تھانے پر کوئی ایف آئی آر درج نہیں کرائی۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ میں نے برآمدگی کے مشیر نامے میں کہیں بھی درج نہیں کیا ہے کہ گھر سے برآمد ہونے والا مواد اسی اسٹینسل پیپرز سے شائع ہوا تھا۔ مجھے ملزم احمد کمال وارثی کی جامہ تلاشی سے صرف 604 روپے ملے تھے۔ میں نے ان کرنسی نوٹوں پر مجسٹریٹ یا کسی گواہ کے دستخط نہیں لئے۔ میں نے جامہ تلاشی پر ملنے والے کرنسی نوٹوں کے تفصیل تحریر نہیں کیے۔ مجھے ملزم شبیر شر کی جامہ تلاشی میں کوئی چیز نہیں ملی۔ یہ درست ہے کہ دونوں ملزمان کی جامہ تلاشی سے بالا ذکر کرنسی نوٹوں کے علاوہ مجھے کوئی تخریبی چیز نہیں ملی۔ میں محکمۂ پولیس میں گذشتہ تیس برسوں سے کام کر رہا ہوں، جس دوران میں نے ہزاروں ایف آئی آرز درج کی ہیں۔ اگر شکایت کنندہ کے بیان سے لگتا ہے کہ چشم دید گواہ موجود ہیں تو پھر ہم انکے نام دریافت کرتے ہیں۔ اگر شکایت کنندہ چشم دید گواہان کے نام دیتا ہے تو پھر انکا اندراج کرنا لازمی ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے ایف آئی آر اس لئے درج نہیں کی کہ میں اس وقوعے کا چشم دید گواہ نہیں تھا اور میں نے کوئی بھی چیز برآمد نہیں کی۔ یہ کہنا بھی درست نہیں ہوگا کہ میں ایف آئی آر کے نقائص کا ازالہ کرنے کیلئے اپنے اعلیٰ اہلکاروں کی ہدایت پر بیان دے رہا ہوں۔ وقوعے کے دو یا تین دن بعد ایس ڈی پی او ممتاز برنی نے میرا بیان ریکارڈ کیا تھا نہ کہ ڈی ایم ایل اے ٹیم نے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ممتاز برنی نے اپنی مرضی کے مطابق بیان ریکارڈ کیا تھا۔ انہوں نے سورج غروب ہونے کے بعد نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن پر میرا بیان ریکارڈ کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ میں نظریۂ پاکستان سے بخوبی آگاہ ہوں جو اس وقت قیام میں آیا تھا جب میں تیرہ یا چودہ برس کی عمر کا تھا۔ نظریۂ پاکستان یہ ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا اور یہ اسلام کے نام پر قائم رہے گا۔ یہ کُلی طور پر درست ہے کہ اسلام کا مطلب اللہ کی

پیروی اور رسول کے احکامات کو ماننا ہے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ عدالتی دستاویز میں شامل مواد میں اللہ یا رسول کی پیروی نہ کرنے سے متعلق کوئی بات ہے یا نہیں۔ میں اسلام کا ماہر/عالم نہیں ہوں۔

سوال: آپکے نقطۂ نظر کے لحاظ سے بریلوی، دیوبندی، اثناعشری، اہل حدیث وغیرہ میں سے کون سا فرقہ اسلام کے عین مطابق ہے؟

جواب: میں اسکا جواب نہیں دے سکتا کیونکہ اس سے مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہو سکتے ہیں۔ میں نے فرقوں کے متعلق مواد نہیں پڑھا ہے، میں سُنی ہوں۔ میں نہ بریلوی ہوں اور نہ ہی دیوبندی۔ شیعہ اور سُنی فرقوں میں زکوۃ کا تنازعہ حل کیا جا چکا ہے اور اب کوئی اختلاف نہیں ہے، تاہم مجھے نہیں معلوم کہ دونوں فرقوں نے کیا طے کیا ہے۔

سوال: کیا یہ آپ کے علم میں ہے کہ اہلِ قرآن یا پرویزی کہلانے والے فرقے کا خیال ہے کہ زکوۃ ٹیکس کے طور پر ہو اور انکے عقیدے کے مطابق اسکی مالیت وقت کے ساتھ تبدیل ہونی چاہئے؟

اجازت نہیں دی گئی۔

کسی اسلامی ریاست کا سربراہ زکوۃ لے سکتا ہے چاہے وہ مسلمان یا خلیفہ نہ ہو۔ یہ الفاظ لکھے ہوئے نہیں ہیں مواد میں کہ ہم اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت نہ کریں لیکن رضا کارانہ طور پر کہتا ہے کہ مواد میں کچھ جملے اللہ اور رسول پاک کے خلاف ہیں۔ میں سرخ پرچم جون/جولائی 1980 کا حوالہ دے سکتا ہوں۔ مضمون کی سرخی ہے، ''زکوۃ کے نام پر ٹیکس!'' یہ درست ہے کہ سرخی کے بعد عجب کی علامت ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس علامت کا مطلب مثبت ہے کہ منفی۔ میں نے مندرجہ بالا سرخی والا پورا مضمون پڑھا ہے۔ اس مضمون سے کوئی ادراک نہیں ہو رہا ہے جس کی بنیاد پر میں یہ کہہ سکوں کہ زکوۃ اسلام کا ایک بنیادی عنصر ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ مضمون پاکستان میں نافذ ہونے والے اس حالیہ نظام سے متعلق ہے جس کو زکوۃ کا اسلامی نظام نہیں کہا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ اس مضمون میں تحریر کیا گیا ہے کہ زکوۃ مسلمانوں کی املاک سے ہر سال وصول کی جاتی ہے۔ یہ درست ہے کہ زکواۃ اسلام میں ایک سال کے دورانیے کے بعد کرنٹ اکاؤنٹ سے منہا کی جائے گی۔ یہ بھی میرے علم میں ہے کہ زکوۃ زرعی پیدوار پر بھی ہوتی ہے (میں خود بھی

زمیندار ہوں) اور زندہ مویشیوں پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ اس پر رائے نہیں دے سکتا کہ کرنٹ یا سیونگ اکاؤنٹ پر زکوۃ کی مقرری اسلامی قانون کے مطابق ہے۔ میرا کوئی کرنٹ اکاؤنٹ نہیں ہے اس لئے یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ بینکوں میں زکوۃ منہا کی جاتی ہے یا نہیں۔ یہ میری معلومات میں نہیں ہے کہ ملوں، فیکٹریوں یا ایسی دیگر املاک سے زکوۃ لی جاتی ہے یا نہیں۔ مجھے موجودہ وقت ملک میں زکوۃ کے نافذ العمل نظام کے تفصیل معلوم نہیں ہیں۔ پورے عدالتی مواد میں سے صرف صفحہ نمبر 17 زکوۃ سے متعلق ہے جو کہ میری دانست میں اسلام کے خلاف ہے۔ میرے مطابق اس صفحے پر ایسے واضع الفاظ نہیں ہیں کہ اللہ کے احکامات کے مطابق زکوۃ ادا نہ کی جائے تاہم اس سے تاثر ایسا ہی پیدا ہوتا ہے۔

سوال: کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس صفحے پر زکوۃ سے متعلق بیان کیا گیا نقطۂ نظر اسلام کے تمام فرقوں کا عقیدہ ہے؟

جواب: میں اس پر کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ میں صرف کمیونزم سے نفرت کرتا ہوں، لیکن کمیونسٹوں سے نفرت نہیں کرتا۔ میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ کمیونسٹ اللہ کو نہیں مانتے تاہم میں نے اسکے متعلق کہیں پڑھا نہیں ہے۔ میں نے مولانا حسرت موہانی کا نام سُنا ہے تاہم یہ نہیں جانتا کہ وہ کمیونزم کو مانتے تھے۔ یہ درست ہے کہ اسلام میں ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اللہ کی وحدانیت کا پرچار کرے اور اللہ پر ایمان نہ لانے والوں کے خلاف جہاد کرے اور ایسے لوگوں کے ساتھ دوستی/تعلقات کی اجازت نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ چین، بلغاریہ، رومانیہ، ویتنام وغیرہ کمیونسٹ ممالک ہیں اور میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان ممالک کے ساتھ ہمارے اچھے تعلقات ہیں یا نہیں۔ میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ ایک مسلمان ملک ہونے کی حیثیت میں ہمیں کمیونسٹ ممالک کے ساتھ تعلقات استوار نہیں کرنے چاہئیں کیونکہ اس کا تعلق بین الاقوامی سیاست سے ہے۔ اگر یہ ملکی قوانین کے مطابق ہے تو پاکستان کے ہر شہری کو بین الاقوامی سیاست میں حکومتی موقف سے مختلف موقف اختیار کرنے کا قانونی حق ہے۔ یہ میرے علم میں نہیں ہے کہ اس نوعیت کا کوئی قانون ملک میں ہے یا نہیں۔ میری معلومات کے مطابق ملزمان قیامِ پاکستان

سے لیکر جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ میں قانون کے مطابق احکامات کی پیروی کروں گا۔ میں مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ عدالت کا ہر عمل / فیصلہ قانونی ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر طرزِ حکومت کی طرح اسلام میں بھی عدلیہ بالا دست (سپریم) ہے۔ یہ درست ہے کہ اسلام میں کوئی بھی حکمران عدالتی اختیارات پر پابندیاں عائد نہیں کرسکتا۔

23جنوری 1982

استغاثہ کے گواہ اسلم نور سے بیرسٹر سید عبدالودود کی جرح

میں نے کتاب ''سوویت یونین میں مسلمان'' دیکھی ہے۔ یہ کتاب پڑھنے کے بعد میں سمجھتا ہوں یا مجھے معلومات حاصل ہوئی ہے کہ سوویت یونین میں مسلمانوں کو پاکستان کے مسلمانوں سے زیادہ آزادی حاصل ہے۔ سرسری طور پر میں نے اس کتاب میں لفظ پاکستان نہیں دیکھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کتاب سوویت یونین کے سفارتخانے نے پاکستان کے شہریوں کو سوویت یونین کے مسلمانوں سے متعلق معلومات دینے کیلئے شائع کی ہے۔ کتاب کے صفحہ نمبر 28 کا آخری پیراگراف گواہ کو پڑھ کر سنایا گیا اور اس سے دریافت کیا گیا کہ کیا اسکو اس پیراگراف میں کوئی چیز تخریبی لگتی ہے۔ اس نے سابقہ جواب دہرایا۔ میں جانتا ہوں کہ سوویت یونین میں لگ بھگ دس کروڑ مسلمان ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ سوویت یونین میں مسلمان اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ اگر لوگوں کو حقوق حاصل ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں ازبکستان اور بخارا شہر کے نام جانتا ہوں۔ میں امام بخاری کے متعلق جانتا ہوں۔ میں مہتم العالم اسلامی کے صدر ڈاکٹر انعام اللہ خان کے متعلق نہیں جانتا۔ میں نے مہتم العالم اسلامی کا نام سنا ہے۔ صفحہ نمبر 62 کی چھٹی سطر پڑھی گئی۔ مجھے کوئی قابلِ اعتراض چیز نظر نہیں آتی تاہم سابقہ جواب کا اعادہ کیا۔

یہ کتاب عدالتی کمرے کے باہر کے کمرے سے لائی گئی ہے اور برآمد کیا ہوا مواد ایس این زبیری روزانہ لاتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ یہ ناظم آباد پولیس اسٹیشن سے لاتے ہیں۔

میں کتاب ماسکو اولمپکس 1980 دیکھ رہا ہوں۔ ایس-182 مسلم نامہ- یہ کتاب نیشنل پبلیکیشنز کراچی نے شائع کی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اولمپک کھیل ہر چار سال میں ہوتے ہیں۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ 1980 میں اولمپک کھیل ماسکو میں ہوئے تھے۔ یہ کتاب ان اولمپکس کے حوالے سے ہے جو ماسکو میں ہوئے تھے۔ مجھے اس کتاب میں کوئی قابلِ اعتراض چیز نظر نہیں آ

رہی ہے۔ میرا ضبط کیا ہوا زیادہ تر مواد قابلِ اعتراض ہے جبکہ کچھ قابلِ اعتراض نہیں ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ بی اے اور ایم اے کی سطح پر تعلیمی اداروں میں مارکسزم پڑھایا جاتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ مارکسزم سے متعلق کتابیں شہر میں کتابوں کی دکانوں پر میسر ہیں۔ مجھے مارکسزم سے متعلق علم نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مارکسزم ایک سماجی علم ہو اور معاشرے کو سمجھنے کیلئے اسکا جاننا ضروری ہو۔ میں جانتا ہوں کہ معاشرے میں زمیندار، جاگیردار اور سرمایہ دار ہیں۔ زمینداروں کے خلاف کسانوں کی شکایات سے متعلق مجھے علم نہیں ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت میں نابالغ تھا اس لئے سیالکوٹ کی کسان تحریکوں کے متعلق نہیں جانتا۔ سات برس قبل مزدوروں نے صنعت کاروں کے خلاف ہڑتالیں کی تھیں۔ شہر میں بہت سی ٹریڈ یونینز ہیں۔ یقیناً اس مارشل لا سے قبل پمفلٹ شائع ہوئے تھے اور مزدوروں نے ہنگامہ آرائی کی تھی۔ اس نے رضا کارانہ طور پر اضافہ کیا کہ اگر حقیقی مصائب ہیں تو پھر احتجاج حق بنتا ہے اور اگر ان سے کسی قانون دشمن عناصر کو فائدہ پہنچتا ہے تو ضروری اقدامات کیے جانے چاہئیے۔ اگر کوئی اشاعتی مواد قانونی دائرے کے اندر ہے اور اگر وہ سرمایہ داروں یا جاگیرداروں کے خلاف ہے تو یہ درست ہوسکتا ہے۔ میں سرخ پرچم جنوری 1979 دیکھ رہا ہوں۔ اسکے صفحۂ اول پر اس ضمن میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔

میں صفحہ نمبر 4 پر اداریہ بھی دیکھ رہا ہوں جس میں بھی کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ پہلا پیراگراف ایران سے متعلق ہے تاہم میرے خیال میں یہ لوگوں کو اسلام کے خلاف مشتعل کرتا ہے۔ میں صفحہ پانچ کے پیراگراف تین کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا تاہم میرا تاثر یہ ہے کہ ہماری حکومت کے دوستوں کے خلاف کچھ لکھ کر اور اس نوعیت کا مواد شائع کر کے ان دوست ممالک کے خلاف کچھ تاثر قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں امام خمینی کے متعلق کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ اخباری خبروں کے مطابق، یہ درست ہے کہ ایران میں اسلامی انقلاب آیا ہے۔ میں ایران میں رونما ہونے والی کسی بھی چیز سے لاعلم ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ ذرائع ابلاغ میں ایران سے متعلق تحریر کرنا درست ہو لیکن شاید ایسی کسی اور اشاعت میں اس انداز سے تعریف کرنا مناسب نہ

ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ سبط حسن کی ایرانی انقلاب پر لکھی ہوئی کوئی کتاب بھی موجود ہے، مجھے نہیں معلوم کہ ایرانی انقلاب پر کوئی اور بھی کتاب ہے، جس کی تعارفی تقریب پریس کلب میں ہوئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کتاب مجیب الرحمان نے تحریر کی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اسکا تعارف پاکستان میں ایرانی قونصل جنرل جناب گنجی دستی نے تحریر کیا ہے۔ پریس کلب آرٹلری میدان پولیس اسٹیشن کی حدود میں ہے۔ میرا ستمبر 1980 میں آرٹلری میدان پولیس اسٹیشن سے تبادلہ ہوگیا تھا۔ ''ایران جدوجہد کے فیصلہ کن موڑ پر'' کی سرخی کے ساتھ شائع ہونے والے مضمون پر میرا اعتراض یہ ہے کہ یہ حکومتی اجازت کے بغیر شائع ہوا ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ پاکستان کے دوست کون ہیں۔ رومانیہ، اٹلی اور یوگوسلوا کیہ کمیونسٹ ممالک ہیں۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ مغرب میں سب سے بڑی کمیونسٹ پارٹی اٹلی میں ہے۔ ایران ایک دوست ملک ہے۔ میں دہراتا ہوں کہ زیادہ تر مواد قابلِ اعتراض ہے جبکہ کچھ مواد قابلِ اعتراض نہیں ہے، اس میں سرخ پرچم کے دونوں شمارے شامل ہیں۔ یکم جولائی 1976 کا پاکستانی ادب دیکھ رہا ہوں، جو کہ سندھی مسلم سوسائٹی سے سعیدہ گذدر اور سید سبطِ حسن کی زیرِ ادارت شائع ہوا ہے۔ یہ کتابچہ ڈکلریشن کے تحت قانون کے مطابق شائع ہوا ہے۔ یہ تفتیش میں کسی قسم کی مدد کی غرض سے اُٹھایا گیا تھا تاہم اس کتابچے میں کوئی قابلِ اعتراض بات سامنے نہیں آئی ہے۔

میں ایک سوویت مصنف کے چرمینکو کا تحریر کردہ کتابچہ ''سوویت جمہوریت'' دیکھ رہا ہوں جو کہ رحمان پبلیکیشنز حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔ میں نے اس کتاب سے متعلق کوئی تفتیش نہیں کی ہے اور نہ ہی عدالت میں پیش کیے گئے مواد کے علاوہ اس ناشر کی دیگر اشاعتیں برآمد کی ہیں۔ میں نے ان کتابوں سے یہ تاثر لیا کہ کمیونزم ایک اچھا نظام ہے۔ کمیونزم ایک نظام ہے۔ یہ نظام کچھ ممالک میں رائج ہے۔ کیمونزم سے متعلق کچھ پڑھنا جرم نہیں ہے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ ان کتابوں یعنی سوویت جمہوریت، سوویت یونین میں مسلمان، اولمپکس 1980، پاکستان مزدور کسان پارٹی کا اصلی چہرہ پر حکومت کی جانب سے پابندی کا کوئی نوٹیفکیشن جاری ہوا ہے۔ میں نے

اس مقدمے کے علاوہ اپنی ملازمت کے دوران کبھی بھی تخریبی مواد کی برآمدگی یا تفتیش نہیں کی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ کسی فوجی عدالت میں تخریبی مواد سے متعلق کوئی مقدمہ زیرِ سماعت ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ روزنامہ صداقت حکومت نے ضبط کیا ہے۔ میں محمد حسن جعفری کا تحریر کردہ کتابچہ ''غیر جانبدار تحریک'' دیکھ رہا ہوں جو کہ مکتبہ نئی دنیا کراچی نے شائع کیا ہے۔ میں نے اس مقدمے کے علاوہ کسی اور جگہ سے یہ کتاب برآمد نہیں کی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ پاکستان غیر جانبدار ممالک کی تحریک کا رکن ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کچھ غلط نظر نہیں آتا کہ سوویت یونین نے پاکستان اسٹیل مل کی تعمیر میں ہماری مدد کی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کہنا مناسب ہوگا یا نہیں کہ پاکستان اور سوشلسٹ ممالک کے درمیان اقتصادی تعلقات ہونے چاہئیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اسٹیل مل کے علاوہ بھی سوشلسٹ ممالک نے ہمارے ہاں صنعتیں لگائی ہیں۔ میں اس کتاب ''غیر جانبدار تحریک'' کے صفحات 59 تا 62 پر کوئی چیز قابلِ اعتراض یا تخریبی نہیں سمجھتا۔ اگر پچھلے سوال سے متعلق کوئی چیز تحریر کی گئی ہے یا کوئی تقریر کی گئی ہے تو یہ نہ قابلِ اعتراض ہوگی اور نہ ہی تخریبی۔ کتاب ''مارکسی فلسفہ'' قومی ادارہ الاشاعت لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ میں نے اس کتاب کی اشاعت کے ضمن میں کوئی برآمدگی یا تفتیش نہیں کی ہے اور نہ ہی کسی فرد یا ادارے کو مطلع کیا ہے۔ اس کتاب کا آخری صفحہ دیکھ رہا ہوں، جس پر کمیونزم سے متعلق کچھ اہم کتابوں کے نام دیئے گئے ہیں:

1- اشتراکی روس 2- مارکسزم کیا ہے؟ 3- سامراج اور عوام 4- سرمایہ داری کا زوال 5- مشرقی یورپ کا زرعی انقلاب 6- سرمایہ داروں کا سمجھوتہ 7- کمیونسٹ مینی فیسٹو 8- لینزم کی اساس 9- پرولتاری انقلاب 10- محکوم ملکوں کا مسئلہ - محکوم ملکوں کی انقلابی تحریک 12- مارکسی فلسفہ، اس کتاب کے مطابق، مندرجہ بالا کتب قومی دارالاشاعت لاہور سے دستیاب ہیں۔ میں نے صرف مارکسی فلسفہ اور مندرجہ بالا کتابیں برآمد کی ہیں۔ میں نے کسی اور فرد یا ایجنسی یا ادارے کو ان کتابوں کی اشاعت سے متعلق مطلع نہیں کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ ناشر لاہور میں ہے۔

26 جنوری 1982

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 : اسلم نور

علی امجد کی جانب سے جرح

میں نے جیپ پیپلز کالونی میں چھاپہ مارنے والے گھر سے کچھ فاصلے پر روکی۔ اس گھر کے سامنے کوئی گلی یا راستہ نہیں بلکہ ایک کھلا کچا میدان ہے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ ہم نے مرکزی شاہراہ سے پیپلز کالونی جانے کیلئے کون سا موڑ لیا تھا۔ ہم نے علامہ رشید ترابی کی مزار سے شمال مشرق کا راستہ لیا اور بعد میں دائیں جانب مڑ گئے۔ مجھے کالونی کی جانب جاتے ہوئے کوئی اہم مقام یاد نہیں تاہم رضا کارانہ طور پر بتایا کہ ہم نے وہاں پر رہنمائی لی تھی۔ ہم ایک گلی میں داخل ہوئے اور دو سے تین سو گز کا فاصلہ طے کیا۔ بعدازاں ہم نے جیپ سے اُتر کر ایک سو قدم کا فاصلہ پیدل طے کیا۔ پیپلز کالونی کے جس گھر پر ہم نے چھاپہ مارا وہ شمال مشرق کی سمت سے کھلی جگہ کے مقابل تھا۔ گھر کا مرکزی دروازہ ندی کی جانب کھلتا ہے۔ اسکے دونوں جانب گھر تھے۔ اس گھر کی چار دیواری نہیں ہے۔ میں دروازے کھولتے ہی صحن میں داخل ہوا۔ یہ ایک کھلا صحن تھا۔ پانچ یا چھ قدم کے بعد ایک کمرہ ہے اور ہم اس کمرے میں داخل ہوئے۔ ملزمان احمد کمال وارثی اور شبیر شر کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے نہ کہ صحن میں۔ یہ کمرے دروازے کے بغیر ہیں۔ دونوں ملزمان صحن سے واضع طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ صحن میں ایک اور بغیر چھت کے کمرہ ہے۔ ہم نے ملزمان سے یہ نہیں کہا کہ وہ زیرِ حراست ہیں۔ ہیڈ کانسٹیبل اور پولیس کانسٹیبل بھی میرے اور مجسٹریٹ کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ ہمارے مواد پڑھنے کے دوران ملزمان کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ وہاں پہنچنے کے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد مجسٹریٹ نے مجھے انہیں گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ میں نے ملزمان کو ہتھکڑی نہیں لگائی۔ ملزمان کو حراست میں لینے کے فوراً بعد ہم وہاں سے چل پڑے۔ اس دورانیے میں مجسٹریٹ یا میں گھر سے کہیں نہیں گئے تاہم رضا کارانہ طور پر اضافہ کیا کہ میں نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل کو باہر سے دو بالغ افراد کو چشم دید گواہ کے طور پر لانے کیلئے بھیجا۔ مجھے یاد نہیں ہے ہیڈ کانسٹیبل

نے باہر کتنا وقت لگایا۔ ہوسکتا ہے کہ چھاپہ مارے گئے اس گھر کے پیچھے بھی کوئی گھر ہو تاہم میں وہاں نہیں گیا۔ ہم نے دو متصل گھروں پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ پاکستان کوارٹرز میں جس گھر پر ہم نے چھاپہ مارا اُس سے متصل گھر ہیں۔ پاکستان کوارٹرز میں جس گھر پر ہم نے چھاپہ مارا اسکے سامنے گھروں کی قطار ہے۔ چھاپہ مارنے والے گھر سے متصل کچھ گھر ہیں تاہم گھروں میں ہمیں کوئی بالغ مرد نہیں ملا۔ مجھے اس گھر اور نشتر روڈ کے درمیان فاصلے کا اندازہ نہیں ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ درمیانی فاصلہ ایک سو یا دو سو گز ہے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ نشتر روڈ سے پاکستان کوارٹرز کی جانب موڑ پر کوئی دکان بھی تھی۔ چھاپے والے دن کے بعد میں نشتر روڈ سے کبھی نہیں گذرا۔ ہوسکتا ہے کہ اس وقوعے سے قبل میں کچھ مرتبہ یہاں سے گذرا ہوں۔ یہ درست ہے کہ میں اس علاقے سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔ اس چھاپے میں خود میں نے کسی مرد بالغ گواہ کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ میں نے چار پانچ گھروں پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ یہ میں نے چھاپہ مارنے والے گھر میں داخل ہونے سے قبل کیا۔ اس گھر میں شاید دو کمرے اور ایک برآمدہ بشمول باورچی خانہ اور غسل خانہ اور صحن تھے۔ ہم نے ہر کمرے کی تلاشی لی۔ جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے دونوں چھاپوں اور برآمدگیوں کی کوئی ڈائری یا نوٹس نہیں بنائے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ اس عدالت کے روبرو میرا بیان ماسوائے برآمدگی کا مشیر نامہ، میری یادداشت پر مبنی ہے۔

مجھے سرخ پرچم میں ایسا مواد نظر نہیں آیا جو مختلف طبقات کے درمیان نفرت یا ٹکراؤ پھیلانے کا باعث بنتا ہو۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ سرخ پرچم میں ایسا کوئی مواد ہے جو پاکستان کے چاروں صوبوں کے لوگوں کے درمیان منافرت پھیلانے کا باعث بنتا ہو۔ رضاکارانہ طور پر اضافہ کرتا ہے کہ شاید اس طرح کا مواد تلاش کرنا ممکن ہو یا نہیں ہو۔ تخریبی سرگرمیوں سے میری مراد پرتشدد سرگرمیاں ہیں جو پرتشدد ذرائع سے حکومت کا تختہ اُلٹنے کا مقصد پیشِ نظر رکھتی ہوں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ سرخ پرچم میں پرتشدد طریقے سے حکومت کا تختہ اُلٹنے سے متعلق مواد نہیں ہوتا۔ مجھے اس سے قبل کبھی بھی سرخ پرچم پڑھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ مجھے کسی نے بھی سرخ پرچم کی اشاعت

سے متعلق نہیں بتایا تھا۔ مجھے اس کتابچے سے متعلق اس سے قبل کوئی علم نہیں تھا۔ ان دو افراد (وارثی اور شر) اور جام ساقی کے علاوہ مجھے کوئی دوسرا فرد نہیں ملا جس کا سرخ پرچم سے کوئی تعلق ہو۔ مجھے جام ساقی کے اس سے تعلق کا علم صرف ایک شمارے میں اسکی تصویر شائع ہونے سے ہوا جبکہ انکا نام کئی جگہوں پر ہے۔ میں تفتیشی افسر کے سامنے یا کہیں اور پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو دو بالغ مرد گواہ لانے کیلئے بھیجا تھا۔ میں یہ بھی کسی کو بتا چکا ہوں کہ پاکستان کوارٹرز پر کوئی بالغ مرد گواہ نہیں مل سکا، اور یہ کہ میں خود ذاتی طور پر دو گھروں پر دستک دینے کیلئے گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ موجود مارشل لاء 5 جولائی 1977 کو نافذ کیا گیا تاہم مجھے یہ یاد نہیں ہے کہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے مارشل لاء کے مقاصد اُسی دن ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے ذریعے بیان کیے تھے یا اسکے اگلے روز۔ مجھے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی مارشل لاء نافذ کرنے کے اسباب سے متعلق کوئی اور تقریر یاد نہیں ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ مجھے پیپلز کالونی یا پاکستان کوارٹرز سے تخریبی مواد نہیں ملا، یا یہ کہ میرا بیان میرے بالا دست اہلکاروں کی جانب سے سکھایا ہوا ہے۔

27جنوری1982

اسلم نور سے اختر حسین ایڈووکیٹ کی جرح

میں نے گھر پر چھاپے کے دوران کئی سوال بھی کیے تھے۔ چھاپے کے دوران، ضرورت پڑنے پر سوالات کیے گئے۔ میں نے عدالتی دستاویز ایم-15 کے طور پر شامل خطوط کا جائزہ نہیں لیا ہے۔ رضا کارانہ طور پر کہا کہ میں نے سرسری طور پر یہ دیکھے ہیں۔ یہ کہنا درست ہے کہ سرخ پرچم کا کوئی بھی صفحہ پڑھنے میں پانچ منٹ کا وقت لگے گا تاہم یہ درست نہیں ہے کہ ہر صفحے پر سرسری نظر ڈالنے میں دو سے تین منٹ لگیں گے۔ میں ایک صفحے کو سرسری طور پر دیکھنے میں نصف منٹ لگاؤں گا۔ میں اس پر کوئی رائے نہیں دوں گا کہ آیا اسرائیلی حکومت دنیا بھر کی مسلمان ریاستوں کے خلاف ہے یا نہیں۔ یہ درست ہے کہ اسرائیلی حکومت نے یروشلم پر جبری قبضہ کیا ہوا ہے۔ اگر کوئی حکومت مسلمانوں کی کسی مقدس جگہ یا زمین پر قبضہ کرتی ہے تو وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی دشمن سمجھی جائے گی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر کوئی حکومت اسرائیلی حکومت کو فوجی امداد فراہم کرتی ہے تو وہ مسلمانوں کی دشمن ہوگی۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ فلسطینیوں کی سرزمین اسرائیلی حکومت کے قبضے میں ہے اور فلسطینی اپنی آزادی کی لڑائی میں مصروف ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اسرائیلی حکومت اور دنیا کی کسی اور حکومت کے درمیان ہونے والا معاہدہ بالخصوص پاکستانی عوام اور بالعلوم مسلمانوں کے مفادات کے خلاف ہوگا۔ یہ کہنا درست ہے کہ اگر دنیا کے کسی اور ملک کی افواج ہمارے ملک کی سرحد کے قریب آتی ہیں تو اس کا عندیہ دینا ریاست کے مفادات میں باجواز ہوگا، رضا کارانہ طور پر کہتا ہے کہ اگر اس معلومات کا ذریعہ قابلِ اعتبار ہے تو اس معاملے کو دیکھنا مسلح افواج کا فرض بنتا ہے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ 1979 کے دوران ذرائع ابلاغ میں یہ خبریں شائع ہوئی تھیں کہ امریکی بیڑہ بحرِ ہند میں موجود ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ پاکستان (موجودہ حکومت) کی پالیسی ہے کہ خطے میں امن ہماری خارجہ پالیسی کا اہم ستون ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ بحرۂ ہند میں امریکی بیڑے کی موجودگی پاکستان اور خطے میں امن کے خلاف ہے۔

میں نے محکمہ جاتی امتحان پاس کیا ہے اور اپنی باری پر ترقی کا اہل ہوں۔ میں نے کراچی میں ملازمت کی ہے۔ میں نے ایک سال سی آئی اے میں کام کیا ہے جو سی آئی ڈی کی شاخ ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ مسلم لیگ نے پاکستان قائم کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلم لیگ نے پاکستان قائم کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح اور لیاقت علی خان مسلم لیگ کے سب سے بڑے رہنما تھے۔ میں نے پڑھا ہے کہ قائداعظم اور لیاقت علی خان نے قیامِ پاکستان کے اغراض و مقاصد بیان کیے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ قائداعظم نے اعلان کیا تھا کہ پاکستان کا ہر شہری بلا تفریقِ مذہب، رنگ، ذات، نسل، جنس، قومیت کے ریاست کا مساوی شہری ہوگا اور مساوی سیاسی اور معاشی حقوق کا حامل ہوگا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مملکت کے بانی قائداعظم نے اعلان کیا تھا کہ ریاست کا مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہوگا کیونکہ مذہب فرد کا نجی معاملہ ہے۔ میں آپکو 11 اگست 1947 کو قائداعظم آئین ساز اسمبلی میں کی ہوئی تقریر کا اقتباس دکھاتا ہوں:

''اگر آپ اپنا ماضی تبدیل کریں اور ایک جذبے کے ساتھ مل کر کام کریں تو آپ میں سے ہر ایک، چاہے آپ کسی بھی برادری سے تعلق رکھتے ہوں، چاہے ماضی میں آپ کے کیسے بھی تعلقات ہوں، چاہے آپ کا رنگ، ذات یا نسل کچھ بھی ہو اول تا آخر آپ ایک ایسی ریاست کے شہری ہوں گے جس میں حقوق، مراعات اور فرائض یکساں ہوں گے، تو پھر آپ کی ترقی کی کوئی حد/انتہا نہیں ہوگی۔''

''میں اس پر زیادہ زور نہیں دے سکتا کہ ہم اس جذبے کے ساتھ کام کرنا شروع کریں کہ وقت کے ساتھ اکثریتی اور اقلیتی برادریوں جیسا کہ ہندو برادری اور مسلمان برادری کی تفریق ختم ہو جائے گی، کیونکہ مسلمانوں کے حوالے سے آپ کے ہاں پٹھان، پنجابی، شیعہ، سنی اور دیگر جبکہ ہندوؤں کے طور پر آپ کے ہاں برھمن، وشنو، کھتری اور بنگالی، مدراسی اور دیگر بھی ختم ہو جائیں گے۔''

''آپ اپنے مندروں میں جانے کیلئے آزاد ہیں، آپ اپنی مساجد میں جانے کیلئے آزاد ہیں، یا چاہے آپ کی عبادت کی کوئی اور جگہ ہو، اس ریاستِ پاکستان میں آپ چاہے کسی بھی مذہب یا ذات یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں اسکا ریاستی امور سے کوئی سروکار نہیں ہوگا.......''

''اب میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اسکو اپنے افکار / مطمع نظر کے طور پر اپنے سامنے رکھنا چاہئے اور آپ پائیں گے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے، مذہبی حوالے سے نہیں کیونکہ یہ ہر فرد کے ذاتی عقیدے کا معاملہ ہے بلکہ سیاسی حوالے سے، ریاست کے شہری کے طور پر۔''

اور میں کہتا ہوں کہ مندرجہ بالا فقرہ قیامِ پاکستان کے تصور اور مقصد کو واضع کرتا ہے اور یہ نظریۂ پاکستان ہے؟

جواب:

اگر یہ اسمبلی ریکارڈ پر موجود ہے تو درست ہوسکتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ لیاقت علی خان نے کہا تھا کہ پاکستان جس تصور پر قائم کیا گیا وہ اسلامی سوشلزم تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ لیاقت علی خان نے کہا تھا کہ ہمارے لئے صرف ایک ہی ازم ہے اور وہ ہے اسلامی سوشلزم۔ میں آپکو رچرڈ سیمنڈ کی کتاب ''تشکیلِ پاکستان''، جو کہ قائداعظم کی صد سالہ تقاریبِ پیدائش کیلئے وزارتِ تعلیم، حکومتِ پاکستان کی قومی کمیٹی کی جانب سے مستند قرار دی گئی ہے، کے صفحہ نمبر 182 پر شامل ایک فقرہ پڑھ کر سناتا ہوں، جو کہ 4 ستمبر 1949 کو پاکستان نیوز میں شائع ہونے والی وزیرِ اعظم پاکستان لیاقت علی خان کی تقریر کے ایک حصے پر مبنی ہے۔

''ہمارے لئے صرف ایک ''ازم'' ہے، اسلامی سوشلزم، جس کا مختصراً مطلب ہے کہ یہاں کے ہر باشندے کو یکساں حقوق حاصل ہوں گے، جن کو خوراک، رہائش، لباس، تعلیم اور طبی سہولیات فراہم کی جائیں گی، جو ممالک اپنی عوام کیلئے ان کی یقین دہانی نہیں کر سکتے وہ کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتے''

اور میں اسکی بنیاد پر کہتا ہوں کہ یہ نظریۂ پاکستان تھا۔

جواب:

اگر یہ مستند اشاعت ہے تو پھر درست ہوگا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ لیاقت علی خان سے لیکر اس وقت کی مسلم لیگ کے صدر ایوب خان تک کی تمام حکومتیں نظریۂ پاکستان کی مطابقت میں کام

کررہی تھیں۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یحیٰ خان سے لیکر بھٹو صاحب اور جنرل ضیاالحق کی موجودہ حکومت تک بھی نظریۂ پاکستان کے مطابق کام کیا جارہا ہے۔ میں نے کہیں کسی کتاب میں نظریۂ پاکستان کی تشریح نہیں پڑھی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ قائداعظم کے بعد سے لیکر آج تک تمام حکومتوں نے اپنے مخالفین پر نظریۂ پاکستان کے مخالف ہونے کا الزام عائد کیا ہے اور ان پر مقدمات بھی چلے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ نظریۂ پاکستان کے خلاف کام کرنے کے الزامات کے تحت کسی بھی فرد کے خلاف پاکستان کی عدالتوں سے کوئی فیصلہ یا حکم نہیں آیا ہے۔ یہ درست ہے کہ اسلام میں سود ممنوع ہے، اسی طرح غلامی۔ اسلام میں خواتین کی خرید وفروخت پر پابندی ہے۔ یہ درست ہے کہ اگر کوئی حکومت اپنے احکامات کے ذریعے سود، غلامی اور خواتین کی خرید و فروخت پر پابندی عائد کرتی ہے تو یہ اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ افغانستان میں خواتین کی خرید وفروخت معمول تھا، میں نہیں کہہ سکتا کہ ہزاروں کسان جاگیرداروں کے غلام تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ سود کا کاروبار لوگوں کی روزمرہ کی زندگی کا حصہ تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ افغانستان میں اپریل1978 کے انقلاب نے خواتین کی خرید وفروخت کو قانون کے ذریعے ممنوع قرار دیا ہے۔ افغانستان میں انقلابی حکومت نے اپنے احکامات، فرمانات کے ذریعے اعلان کیا کہ جہیز اسلامی شریعت کے مطابق ہوگا اور اسکی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دی جائے گی۔ مجھے مندرجہ بالا سوال سے متعلق معلومات نہیں ہے اس لئے کہہ نہیں سکتا کہ موجودہ افغان انقلابی حکومت نے اعلان کیا ہوا ہے کہ ریاست کے ہر شہری کو مذہب، ذات، رنگ اور قومیت کی تفریق کے بغیر مساوی سیاسی اور اقتصادی حقوق حاصل ہوں گے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مندرجہ بالا اعلان قائدِاعظم کی جانب سے آئین ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں کیے ہوئے اعلان سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اگر کوئی حکومت قائداعظم کے اوپر بیان کیے گئے اعلان کے مطابق کوئی اعلان کرتی ہے تو پھر اسکی حمایت کرنا ہر پاکستانی کا فرض بنتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ امریکہ اور برطانیہ جیسے سرمایہ دار ممالک میں خواتین کو مردوں کے مساوی حقوق حاصل نہیں ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ امریکہ میں خواتین کو مار پیٹ اور تشدد کرنے کے تقریباً بیس لاکھ

واقعات ہوئے ہیں۔ نہ ہی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ برطانیہ میں پچاس فیصد خواتین تشدد کا نشانہ بنتی ہیں۔ میں سوشلسٹ ممالک کے متعلق نہیں کہہ سکتا کہ مردوں اور خواتین کو مساوی حقوق حاصل ہیں اور خواتین کو یکساں مراعات حاصل ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ تین ہزار خواتین سوویت پارلیمنٹ کا حصہ ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ سوویت یونین میں پچاس فیصد خواتین صنعتوں میں انجنیئر ز اور مینیجرز کے طور پر کام کر رہی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں، سوشلزم سرمایہ داری سے بہتر ہے، رضا کارانہ طور پر کہا کہ میرے ذاتی خیال میں اسلام باقی تمام نظریات سے بہتر ہے۔

بیرسٹر سید عبدالودود کی جرح

میں نے اس سے قبل کتاب ''مارکسی فلسفہ'' نہیں پڑھی تھی۔ میں نے یہ کتاب آج 27 جنوری 1982 کو پڑھی ہے۔ مجھے کارل مارکس کے نام کا معلوم نہیں تھا، مجھے مارکسزم کے دیگر مصنفین کی تحریروں کا بھی علم نہیں ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ کتاب معاشرے کی ترقی کے قوانین سے متعلق ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ مارکسی فلسفہ کیا ہے۔

باب XIII

شہری اور ریاست

اسلامی سوشلزم- شریعت- تعلیم- صحت- محنت- شہری آزادیاں

لیاقت علی، وزیراعظم پاکستان نے اگست 1949 میں لاہور کے ایک عوامی اجتماع کو بتایا:

ہمارے لئے صرف ایک ''ازم'' ہے، اسلامی سوشلزم، جس کا مختصراً مطلب ہے کہ یہاں کے باشندوں کو یکساں حقوق حاصل ہوں گے، جن کو خوراک، رہائش، لباس، تعلیم اور طبی سہولیات فراہم کی جائیں گی، جو ممالک اپنی عوام کیلئے ان چیزوں کی یقین دہانی نہیں کر سکتے، وہ کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتے۔' معاشی پروگرام جو ساڑھے تیرہ سو سال قبل [1] بنایا گیا وہ آج بھی ہمارے لئے بہترین ہے... کوئی بھی اصلاحات کرتے ہوئے، پورے معاملے کو شریعت کی روشنی میں جانچا جائے گا، اور اصلاحات کے نفاذ سے قبل اس یقین دہانی کیلئے تمام ممکنہ توجہ برتی جائے گی کہ یہ کسی بھی طور پر ان مقدس قوانین سے ٹکراؤ میں نہ ہوں۔ [2]

شریعت، لغوی طور پر 'راستہ' نہ صرف قرآن کے احکامات بلکہ پیغمبر محمد صلعم کے برتاؤ کے انداز کی روایات پر مبنی ہے۔ یہ 'ابتدائی خلفا کے دور میں نافذ ہونے والے اسلام کے بنیادی قانون کے طور پر سمجھی جاتی ہے'' جو کہ اسلام کی پیروی کرنے والوں کی مکمل طور پر مذہبی، سیاسی، سماجی، گھریلو اور نجی زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔' [3]

---

(1) یعنی کہ پیغمبر محمد کی زندگی

(2) پاکستان نیوز، 4 ستمبر 1949 میں شائع شدہ

(3) 'شریعت'، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

30 جنوری 1982

استغاثہ کا گواہ نمبر 2 اسلم نور

دوبارہ طلبی اور دوبارہ رسمی بیان

محمد یوسف لغاری ایڈووکیٹ کی جانب سے جرح

میں سندھی زبان نہ جانتا اور نہ ہی سمجھتا ہوں اور نہ لکھ یا پڑھ سکتا ہوں۔ میں نے عدالتی دستاویز میں ذکر کئے گئے خطوط یا دیگر مواد کا جائزہ نہیں لیا اور میں نہیں کہہ سکتا کہ ان میں کیا لکھا ہوا ہے۔ کے آر ایس-65 میں ملک سے متعلق یا اسکے خلاف کچھ بھی نہیں ہے۔ پڑھنے کے بعد میں انگریزی کا مفہوم سمجھ سکتا ہوں۔ میں ملزمان میں کوئی فرق نہیں کرسکتا تاوقتیکہ ملزمان میں سے کسی کے دستخط ہوں یا اس کا نام درج ہو۔ ملزمان میں سے کوئی بھی نہ تو میرا اہم جماعت تھا نہ ہی انہوں نے میرے ساتھ کام کیا ہے اور نہ ہی میں نے ان کے ساتھ کوئی خط و کتابت کی ہے۔ میں کسی بھی ملزم کی تحریر سے واقف نہیں ہوں۔ میں خطوط میں دی گئی تحریر کسی ملزم کے حوالے سے شناخت نہیں کرسکتا۔ چونکہ میں سندھی زبان سے ناواقف ہوں، اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ کون سا خط/مواد تخریبی ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ مجسٹریٹ نے ہلچل (1977) اپریل کے علاوہ سندھی میں تحریر شدہ کسی خط کے مندرجات کو تخریبی قرار دیا ہو۔ مارشل لاء 5 جولائی 1977 کو نافذ ہوا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ یہ تمام خطوط میں نے جائے وقوعہ سے برآمد نہیں کیے تھے اور ان میں کوئی تخریبی بات نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ عدالتی دستاویز ایم-5 میں ذکر کیا ہوا کے آر ایس 141 اسپین سے حیدرآباد کے ڈاکٹر اعزاز نذیر کے نام پر ہے اور اس میں حکومت کے خلاف کوئی تخریبی بات نہیں ہے تاہم رضا کارانہ طور پر کہتا ہے کہ یہ مختلف فریقین کے مقدمے سے متعلق ہے۔

ختم شد　　　　دستخط اسلم نور

یکم فروری 1982

رمضان لغاری

29 جولائی 1980 کو میری تعیناتی اے سی ایم ضلع جنوبی کراچی کے طور پر تھی۔ مجھے ضلعی مجسٹریٹ جنوبی کراچی نے ڈی ایم ایل ہیڈ کوارٹرز میں رپورٹ کرنے کی ہدایت کی۔ میں ڈی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹرز گیا اور اسٹاف آفیسر سے رابطہ کیا۔ اُس نے پولیس کو طلب کیا اور مجھے پولیس کے ہمراہ پیپلز کالونی کے کسی گھر پر چھاپہ مارنے کی ہدایت کی گئی۔ میں پولیس اور مخبروں کے ہمراہ وہاں گیا، مخبر کی نشاندہی پر مذکورہ گھر میں داخل ہوا، جہاں دو لوگ موجود تھے اور مواد پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے نام غلام شبیر شر اور احمد کمال وارثی بتائے۔ اس وقت میں ملزمان کو شناخت نہیں کر سکتا کیونکہ اس واقعہ کو ڈیڑھ برس سے زائد کا عرصہ گذر چکا ہے۔ پولیس نے مواد اپنی تحویل میں لیا اور مشیران کی موجودگی میں مشیر نامہ تیار کیا جس پر میں نے تصدیقی دستخط کیے۔ وہاں پر بہت سارا مواد تھا، جس میں سے مجھے صرف ہلچل نامی کتابچہ یاد ہے جو سندھی میں تھا، کیونکہ میں نے وہ پڑھا تھا۔ اس کتابچے میں حکومت کے خلاف تخریبی مواد شامل تھا۔ عدالت کی جانب سے پیش کیا گیا میمو پولیس کے انسپکٹر نے تیار کیا تھا، جس پر دو مشیران نے اور تصدیقی طور پر میں نے دستخط کیے تھے۔ عدالتی دستاویز ایم-1 کے نمبر شمار 186 پر ٹیلی فون ڈائریکٹری ہے جس پر صرف جمال نقوی کا نام تحریر ہے۔ بعد میں ہم پاکستان کوارٹرز گئے۔ (عدالت نے ڈائری کا جائزہ لیا- اسکے 153 صفحات ہیں)۔ ہم پولیس اور دو لوگوں کے ساتھ پاکستان کوارٹرز گئے۔ ہم نے پاکستان کوارٹرز میں ایک گھر کی تلاشی لی، جس کی گرفتار شدگان میں سے ایک نے نشاندہی کی تھی۔ ہم نے وہاں سے بھی اُسی نوعیت کا مواد برآمد کیا۔ میں پولیس کی جانب سے تیار کردہ مشیر نامہ اور اس پر تصدیقی دستخط دیکھ رہا ہوں۔ عمومی کارروائی کے مکمل ہونے کے بعد میں اپنے گھر چلا گیا۔

علی امجد ایڈووکیٹ کی جانب سے جرح

میں ایک جیپ میں پولیس پارٹی کے ہمراہ ڈی ایم ایل اے ہیڈکوارٹرز سے روانہ ہوا۔ میں اگلی نشست پر تھا۔ ہم نے اپنی جیپ چھاپے والے گھر سے کوئی ایک فرلانگ دور کھڑی کی۔ مجھے اس گھر تک جانے والا راستہ یاد نہیں ہے۔ ہم نے جیپ پکی سڑک پر روکی تھی۔ یہ پکی سڑک نالے کے ساتھ متصل سڑک نہیں ہے۔ پکی سڑک جس پر جیپ روکی تھی وہ مشرق / مغرب سڑک تھی۔ ہم نے جیپ مغربی سمت کی طرف روکی تھی۔ جیپ سے اُترنے کے بعد ہم مشرقی سمت مُڑ گئے اور مختلف گلیوں میں داخل ہوئے۔ جس گھر پر چھاپہ مارا گیا اُس کے آگے کوئی گھر نہیں تھا۔ چھاپہ مارے جانے والے گھر کے دونوں اطراف زیرِ تعمیر گھر تھے۔ ہم نے دروازے پر دستک دی، دروازہ اندر سے بند تھا۔ ہم نے مکینوں کو باہر آنے کیلیئے زور سے صدا بھی لگائی۔ کوئی بھی باہر نہیں نکلا۔ چھاپہ مارنے والی پارٹی میں سے ایک دیوار پھلانگ کر اندر گیا تا کہ دروازہ کھولا جا سکے۔ گھر کے آگے ایک چار دیواری تھی۔ دیوار کی بلندی چھ یا سات فٹ ہوگی۔ مجھے یاد نہیں کہ دیوار پر چڑھنے والے پولیس کانسٹیبل کی کسی نے مدد کی تھی یا اس نے یہ کام خود اپنے طور پر کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں سب سے پہلے اس گھر میں داخل ہوا تھا جس کے بعد باقی لوگ اندر آئے تھے۔ چھاپہ مارنے والی پارٹی میں میرے علاوہ دو مشیران، ایک مخبر اور انسپکٹر تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہاں پر دو ملزمان موجود تھے۔ مرکزی دروازے اور کمرے کے درمیان فاصلہ بیس سے تیس فٹ ہوگا۔ کمرے میں داخل ہونے پر ہم نے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ درحقیقت کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہا تھا کہ وہ پہلے سے ہی اپنی گرفتاری کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے انہیں انکی گرفتاری کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ کسی پولیس اہلکار نے ان سے کہا ہو کہ وہ زیرِ حراست ہیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ ہم وہاں پر معلومات ملنے کی بنا پر مواد کی جانچ پڑتال کرنے آئے ہیں۔ ملزمان نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ چھاپہ مارنے والی پارٹی کے تمام اراکین اُس گھر میں کوئی ڈیڑھ گھنٹہ رہے۔ میں نے کسی بھی مرحلے پر ملزمان کو گرفتار نہیں کیا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم معمول کی کارروائی اور برآمد کیے گئے مواد اور ملزمان کے ساتھ وہاں سے چل دیئے۔ مشیران بھی

ہمارے ساتھ چلے۔ چھاپہ مارنے والی پارٹی کے تمام اراکین ملزمان کے ہمراہ پاکستان کوارٹرز چل پڑے۔ہم گارڈن کی شمال میں واقع پاکستان کوارٹرز گئے۔ہم نے چھاپہ مارے جانے والے گھر سے متصل گھر کے ساتھ جیپ روکی۔ملزمان میں سے ایک نے گھر کا تالا کھولا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ملزمان میں سے کس نے تالا کھولا۔ایک ملزم چھاپہ مارنے والی پارٹی کے ایک رکن کے ہمراہ باہر رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ باہر رہنے والا شخص پولیس اہلکار تھا یا مخبر۔ چھاپہ مارنے والی پارٹی کے دیگر اراکین میرے اور انسپکٹر اسلم نور کے ہمراہ گھر کے اندر گئے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ گھر کی چابیاں کس کے پاس تھیں تاہم ہمیں گھر کے اندر داخل ہونے سے قبل کچھ وقت انتظار کرنا پڑا تھا۔ہم نے تالا کھلنے کیلئے دروازہ پر پانچ سے دس منٹ انتظار کیا تھا۔ پاکستان کوارٹرز کی تلاشی میں بھی پیپلز کالونی میں تلاشی جتنا ہی وقت لگا تھا۔تلاشی کی کاروائی مکمل کرنے کے بعد میں نے چھاپہ مارنے والی پارٹی کے دیگر اراکین کو تعینات کیا اور پھر ایک نجی سواری کے ذریعے اپنے گھر چلا گیا۔ مجھے پیپلز کالونی میں جائزہ لئے ہوئے ہلچل کی تاریخ یا سال یاد نہیں ہے۔ہلچل کے اُس شمارے کی کوئی مخصوص شناخت نہیں تھی جس کا میں نے جائزہ لیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تحویل میں لئے جانے کے بعد برآمد شدہ مواد کہاں رکھا گیا۔ میرے خیال میں حکومت کے خلاف منافرت پیدا کرنے والا کوئی بھی مواد تخریبی ہوتا ہے۔اگر ملک میں نافذ العمل قانون اجازت نہ دے تو حکومت پر تنقیدی مواد تخریبی بن جاتا ہے۔ مجھے ایسے کسی قانون کا علم نہیں ہے جو حکومت پر سخت تنقید کی ممانعت کرتا ہو۔ یہ درست ہے کہ 1973 کا آئین کچھ تبدیلیوں کے ساتھ تا حال ملک کا بنیادی قانون ہے۔

2فروری 1982

استغاثہ کا گواہ نمبر 3 محمد رمضان لغاری

محمد یوسف لغاری کی جرح

میرے پاس ڈاکس اور جیکسن پولیس اسٹیشنز کی حدود تھیں۔ مجھے یہ حدود ڈپٹی کمشنر/ضلعی مجسٹریٹ جنوبی نے تفویض کی تھیں۔ دیگر تمام پولیس اسٹیشنز میری حدود سے باہر تھے۔ ضلعی مجسٹریٹ جنوبی کی جانب سے مجھے ڈی ایم ایل اے ڈیوٹی کیلئے متعین کرنے کے احکامات زبانی تھے اور کچھ بھی تحریری نہیں تھا۔ ضلعی مجسٹریٹ جنوبی نے تحریری طور پر مجھے ڈاکس اور جیکسن پولیس اسٹیشنز کی حدود تفویض کی تھیں۔ ضلعی مجسٹریٹ کو حدود تفویض کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ میں آرٹلری میدان اور نارتھ ناظم آباد کی حدود کے متعلق نہیں جانتا، تاہم سمجھتا ہوں کہ یہ پولیس اسٹیشنز میری حدود میں نہیں تھے۔ میں نے چھاپہ مارنے والی پارٹی کو تحریری یا زبانی صورت میں کوئی احکامات نہیں دیئے۔ میں نے موجود دونوں ملزمان کی گرفتاری کے احکامات بھی نہیں دیئے تھے۔ ملزم کا ریمانڈ ہمیشہ پولیس کی جانب سے تحریری درخواست پر دیا جاتا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تو ان دونوں ملزمان کیلئے مجھ سے کبھی بھی ریمانڈ نہیں مانگا گیا۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ مجسٹریٹ کے طور پر پولیس کو دیئے گئے میرے احکامات تحریری ہوں گے۔ پولیس کو مقدمہ درج کرنے، املاک کی ضبطگی اور گھر کی تلاشی کا بتانا میرا فرض نہیں ہے۔ پولیس نے مجھ سے دونوں گھروں کی تلاشی کیلئے وارنٹ جاری کرنے کی درخواست نہیں کی۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ ڈی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹرز کے اسٹاف آفس میں مجھے احکامات چھاپہ مارنے والی پارٹی کی موجودگی میں دیئے گئے تھے۔ مجھے اسٹاف آفیسر نے نہیں بتایا تھا کہ چھاپہ مارنے کیلئے کہاں جانا ہے۔ میں پولیس پارٹی اور مخبر کے بس میں تھا جو ڈی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹر نے متعین کیے تھے۔ مجھے ڈی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹرز نے کوئی تحریری احکامات نہیں دیئے تھے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ مجھے اور پولیس پارٹی کو جا کر کسی کو بھی حراست میں لینے کے احکامات دیئے گئے تھے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ گھر،

جس پر میں نے اور پولیس پارٹی نے چھاپہ مارا، ضلع جنوبی میں واقع نہیں تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ مارشل لا کے فرائض کی ادائیگی کیلئے کوئی ضلع سب مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی کمان میں ہوتا ہے اور اسی طرح ڈویژن ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے تابع ہوتی ہے۔ میں اس پر کوئی رائے نہیں دے سکتا کہ احکامات دینے والا افسر ایس ایم ایل اے کے تحت کام کر رہا تھا یا کہ ڈی ایم ایل اے کے تحت۔ مجھے احکامات دینے والا افسر میجر کی رینک کا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجسٹریٹ یا پولیس کو مارشل لاء انتظامیہ کی جانب سے جاری ہونے والے احکامات تحریری صورت میں ہوں۔ ہم مجسٹریٹ مقدمے / کیس ڈائری کے علاوہ کوئی ڈائری نہیں بناتے۔ میں نے ہیڈ کوارٹر چھوڑنے سے قبل ضلعی مجسٹریٹ سے احکامات حاصل کیے تھے۔ مجھے ضلعی مجسٹریٹ کو مطلع کرنا تھا۔ ملزمان میری تحویل میں دس پندرہ منٹ بھی نہیں رہے تھے۔ جب چھاپوں کے بعد میں اپنے گھر کے لئے روانہ ہوا تو دونوں ملزمان مواد سمیت پولیس کے پاس تھے۔ میں پاکستان کوارٹرز میں رسمی کاروائی کے مکمل ہونے کے بعد پولیس سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ پاکستان کوارٹرز میں کئی ایک کوارٹرز ہیں۔ لوگ ان کوارٹرز میں رہائش پذیر ہیں جو کہ گھر نہیں ہیں۔ میں نے کسی بھی سویلین فرد سے مشیر بننے کیلئے نہیں کہا کیونکہ یہ میرا کام نہیں تھا۔ یہ پولیس کا فرض تھا کہ تلاشی لے اور علاقے سے مشیر تلاش کرے۔ پاکستان کوارٹرز میں پولیس کو کوئی سویلین مشیر نہیں ملا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ آیا انہوں نے علاقے میں کسی سویلین مشیر کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔

سوال: پولیس نے آپکی موجودگی میں کتنے مشیر نامے تیار کیے؟

جواب: میرے تصدیقی دستخط والے مشیر نامے پولیس نے میری موجودگی میں تیار کیے، باقی کیلئے مجھے نہیں معلوم کہ پولیس نے کتنے مشیر نامے تیار کیے۔ میں برآمدگی کے مشیر ناموں کی قطعی تعداد بتانے سے قاصر ہوں تاہم مجھے یقین ہے کہ انکی تعداد دو سے زائد نہیں تھی۔ میں نے برآمد کی گئی اشیا یعنی کہ خطوط، کتابیں اور دیگر پر دستخط نہیں کیے۔ پولیس نے میری موجودگی میں گھروں سے برآمد ہونے والی اشیا سربمہر نہیں کیں۔ میں اپنی یادداشت سے اشیا پر کسی مخصوص علامت کو یاد نہیں کر سکتا جو کہ پولیس نے کھنگالی تھیں۔ کسی مخصوص علامت کی عدم موجودگی میں، میں دونوں گھروں

سے برآمد ہونے والی اشیا میں تفریق کرنے سی قاصر ہوں۔ میں کسی بھی ملزم کی دستی تحریر سے واقف نہیں ہوں، اس لئے رائے دینے سے قاصر ہوں کہ پولیس کی جانب سے برآمد کیے گئے خطوط کس کے تحریر کیے ہوئے ہیں۔ میں تحویل میں لیے گئے مواد/خطوط سے یہ تفریق نہیں کر سکتا کہ کون ساخط کس کا ہے۔ مجھے ملزمان کی مستقل رہائش کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ میں ملزمان کو نہیں جانتا، اس لئے پاکستان میں انکی کسی ملکیت سے متعلق لاعلم ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ چھاپے مارے گئے گھر کس کے ہیں۔

مجھے خاص طور پر سندھی جریدہ ہلچل دیا گیا۔ میں نے کسی اردو یا انگریزی مواد کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ میں ہلچل کے علاوہ کسی اور برآمد شدہ مواد پر تبصرہ نہیں کر سکتا کیونکہ میں نے وہ نہیں پڑھا تھا۔ وہاں ہلچل کے کئی شمارے تھے جن میں سے میں نے صرف ایک کا مطالعہ کیا اور اب مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون سا تھا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ آیا ہلچل پر کوئی نام بھی درج تھا۔ جو شمارہ میں نے پڑھا اُس میں کسی قابلِ اعتراض چیز کا میں نے ذکر نہیں کیا ہے۔

گھر پر چھاپے کے بعد اس مقدمے کے ضمن میں میں کبھی بھی ڈی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹرز نہیں گیا۔ اس مقدمے کے ضمن میں مجھے فوجی اہلکاروں نے کبھی بھی طلب نہیں کیا۔ میں نے کسی بھی پولیس اسٹیشن پر کوئی شکایت درج نہیں کرائی۔ میں نے ڈی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹرز کے دیئے ہوئے احکامات کی تکمیل سے متعلق ضلعی مجسٹریٹ کو فون پر آگاہ کیا۔ میں نے کبھی کمیونسٹ مواد یا اسکی اصطلاحات کے متعلق نہیں پڑھا۔ میں نے برآمد کی گئی اشیا فوجی افسر کی جانب سے میرے ریکارڈ کیے جانے والے بیان کے دن کے علاوہ کبھی نہیں دیکھیں اور وہ بھی کچھ کتابچے۔ یہ کتابچے استغاثہ کے پاس تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت استغاثہ کون تھا۔ استغاثہ سویلین تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ برآمد شدہ اشیا کہاں سے لائے۔ گواہی کے دوران میں نے کچھ کتابچوں کے علاوہ کوئی اور برآمد شدہ اشیا نہیں دیکھیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ اشیا کب اور کہاں لے جائی گئیں۔ یہ درست نہیں ہے کہ رائے کیلئے پیش کیے جانے والا تحویل میں لیا گیا میمو اور کتابچے ہم نے برآمد نہیں کیے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ جیپ کس نے فراہم کی تھی۔ مجھے یاد نہیں

ہے کہ آیا اس جیپ کا ڈرائیور یونیفارم میں تھا۔ یہ درست ہے کہ میں اور پولیس سپاہی ایک ہی گاڑی میں تھے۔ مذکورہ بالا جیپ کے علاوہ کوئی اور گاڑی نہیں تھی۔ پیپلز کالونی میں چھاپے کے بعد، چھاپہ مارنے والی پارٹی کے ایک رکن کو وہیں چھوڑ کر، باقی ماندہ پارٹی دونوں ملزمان کے ہمراہ اُسی گاڑی میں پاکستان کوارٹرز روانہ ہوئی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مخبر سویلین کپڑوں میں تھا۔ مجھے یاد نہیں ہے اس لئے کہہ نہیں سکتا کہ پاکستان کوارٹرز جانے والے ہم پانچ افراد میں دو ملزمان کے علاوہ باقی دونوں افراد پولیس اہلکار شامل تھے یا نہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ پیپلز کالونی میں چھوڑا ہوا فرد دولت خان تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ ایسا مواد پاکستان بھر میں میسر ہے۔ میں نے یا کسی اور نے لاگ بک میں کوئی اندراج کیا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ پاکستان میں کئی ایک سیاسی جماعتیں ہیں تاہم میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی موجودگی سے لاعلم ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے رہنما کون اور کہاں ہیں۔

میں نے کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے منشور یا مواد کا مطالعہ نہیں کیا اور نہ ہی جائزہ لیا ہے، اس لئے نہیں جانتا کہ اسکا مواد کون تیار کرتا ہے اور یہ کہاں سے میسر ہوسکتا ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں چھاپہ مارنے والی ٹیم کا حصہ نہیں تھا اور برآمدگی کا مشیر نامہ میری موجودگی میں تیار نہیں ہوا۔ یہ کہنا درست ہے کہ برآمدگی کے مشیر نامے پر میں نے تصدیقی دستخط ڈی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹرز میں کیے تھے۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ میں اپنے بالا دست افسران کے زور ڈالنے پر بیان دے رہا ہوں۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ سندھ میں ون یونٹ مخالف کوئی تحریک تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ کچھ لوگ جمہوریت کا قیام چاہتے ہیں۔ میں نے اخبارات میں جام ساقی کا نام سیاسی کارکن کے طور پر پڑھا ہے۔ وہ جمہوری نظام کے انتہائی سرگرم حامی ہو سکتے ہیں۔ یہ کہنا درست ہے کہ جام ساقی کو فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، جنرل یحیٰ خان اور وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے ادوارِ حکومت کے دوران جیل میں قید رکھا گیا تھا تاہم مجھے انکی حراست کے اسباب معلوم نہیں ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ولی خان اور دیگر کے خلاف ایک سازش کیس تھا، جس میں جام ساقی بھی

ایک ملزم تھا۔ حکومت نے بعدازاں وہ مقدمہ واپس لے لیا۔

شفیع محمدی

مجھے پیپلز کالونی یا پاکستان کوارٹرز میں چھاپہ مارے گئے گھروں کے نمبر یاد نہیں ہیں۔ میرے لئے پیپلز کالونی کے گھر تک پہنچنا ممکن نہیں ہے، تاہم یہ ممکن ہے کہ میں پاکستان کوارٹرز تک لے جاؤں۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ آیا رسمی ضروری کاروائی کے بعد کسی نے ان گھروں کو سربمہر کیا تھا۔

عدالتی سوالات

سوال: کیا مخبر پیپلز کالونی میں گھر تک آپ کے ساتھ گیا تھا یا گھر کی نشاندہی کر کے چلا گیا تھا؟

جواب: اسکا جواب پہلے ہی دیا جا چکا ہے۔

سوال: کیا آپ نے چھاپے کے دوران برآمد ہونے والے مواد پر نظر ڈالی تھی؟

جواب: جی ہاں میں نے موجود مواد پر نظر ڈالی تھی تاہم میں نے تفصیل کے ساتھ صرف ہلچل کا جائزہ لیا تھا۔

سوال: جب آپ پیپلز کالونی کے گھر میں داخل ہوئے تو دونوں ملزمان کیا کر رہے تھے؟

جواب: ایک ملزم ٹائپ کر رہا تھا جبکہ دوسرا چٹائی پر بیٹھا ہوا تھا تاہم مجھے یہ یاد نہیں ہے کہ کون کیا کر رہا تھا۔

سوال: کیا آپ نے ٹائپ رائٹر پر چڑھا ہوا کاغذ اپنی تحویل میں لیا؟

جواب: نہیں۔

23جون1982

پروفیسر جمال نقوی، جام ساقی، کمال وارثی، امرلال، شبیر شر

چونکہ آج وکلا برادری اور دیگر لوگ لبنان میں اسرائیلی جارحیت اور پاکستان کی جانب سے فلسطینیوں کی حمایت میں کھڑے نہ ہونے کے خلاف احتجاجی ہڑتال پر ہیں چناچہ انکے ساتھ یکجہتی کے طور پر میں ہم بھی آج عدالتی کارروائی میں شریک نہیں ہوں گے۔

24جون1982

استغاثہ کا گواہ صفدر بھٹی

کمال وارثی، شبیر شر، پروفیسر جمال نقوی، جام ساقی اور امرلال کی جانب سے جرح نہیں کی گئی۔

ایگزامینیشن انچیف استغاثہ کا گواہ محمد یعقوب عمر52 سال

میں گذشتہ چار پانچ برس سے پیپلز کالونی میں رہائش پذیر ہوں۔ میں اپنے گھر کی گلی میں ایک چھوٹا سا چائے خانہ چلاتا ہوں۔ اُس گلی میں دس سے بارہ گھر ہیں اور ان گھروں کے مکین گذشتہ چار پانچ برس سے وہاں رہتے ہیں۔ میں چونکہ چار پانچ برس سے وہاں رہتا ہوں اس لئے ہر نئے رہائشی کو شناخت کرسکتا ہوں۔ اس مقدمے سے کوئی چھ سات ماہ قبل اور اس وقوع سے آٹھ دس دن قبل کچھ نئے رہائشی ہماری گلی کے ایک گھر میں آکر رہنے لگے۔ میں عدالت میں بیٹھے ملزم غلام شبیر شر اور احمد کمال وارثی کو شناخت کرسکتا ہوں۔ یہ وہ نئے مکین تھے جو ہماری گلی میں رہنے لگے تھے۔ اپنے قیام کے دوران دونوں ملزمان میری دکان سے سگریٹ خریدنے آتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ گلی میں ہر کوئی اپنے خاندان کے ساتھ رہتا ہے جبکہ وہ اکیلے رہتے ہیں تو انہوں نے بتایا تھا کہ وہ گھر کی مرمت وغیرہ کے بعد آٹھ دس روز میں اپنے اہل خانہ کو لے آئیں گے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ روزنامہ جنگ میں کام کرتے ہیں۔ وقوعے کے دوسرے دن، پولیس پارٹی سویلین کپڑوں میں ملبوس دو دیگر افراد کے ہمراہ آئی اور تفتیش کے ساتھ میرا بیان بھی لیا۔

24جون1982

کمال وارثی، شبیر شر، پروفیسر جمال نقوی، جام ساقی اور امر لال کی جانب سے کوئی جرح نہیں کی گئی (موقعہ دیا گیا لیکن جرح نہیں کی گئی)

شفیع محمدی کی جرح

کئی لوگ تھے جنہوں نے وقوعہ ہوتے ہوئے دیکھا تھا اور میری دکان پر چائے پیتے ہوئے اس کے متعلق مجھے بتایا تھا۔ مجھے اسکی معلومات میری دکان کے عام گاہکوں نے فراہم کی تھی۔ میں اپنی گلی میں رہنے والے تمام افراد سے واقف ہوں، ان میں وہ بھی شامل ہیں جو دودھ فروش سے دودھ لینے آتے ہیں۔ مجھے وقوعے والے دن ہی کئی لوگوں نے اسکے متعلق بتایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ وہاں سے کچھ برآمدگی بھی ہوئی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ چھاپے کے دوران کیا کچھ برآمد ہوا تھا۔ میں صبح پانچ بجے سے رات نو بجے تک اپنی دکان پر موجود ہوتا ہوں۔ اس گلی کے مکانات کے نمبر نہیں ہیں۔ میری دکان ایک گلی میں ہے جبکہ میرا گھر دوسری گلی میں ہے اور شبیر شر اور وارثی کے گھر پر میری دکان سے نظر نہیں پڑتی۔ یہ درست ہے کہ وقوعے کے اگلے روز صفدر علی بھٹی نے میرا بیان ریکارڈ کیا تھا۔ میں نے اپنے گھر اور ملزمان کے گھر کے نمبر نہیں بتائے تھے۔ (عدالت نے سیکشن 161 کے تحت گواہ کے دیئے ہوئے بیان کو دیکھا جس میں چھاپہ مارے گئے گھر نمبر C-19 بتانے کے علاوہ اسکی دکان کا نمبر بھی درج ہے۔) میرے پہلے بیان کے بعد ایس ایچ او صفدر دوبارہ مجھ سے ملنے کبھی نہیں آیا۔ (عدالت نے مذکورہ بیان کا جائزہ لیا جس میں بیان ریکارڈ کرنے کی تاریخ 8 اکتوبر 1980 درج ہے۔) شبیر شر نے داڑھی رکھی ہوئی تھی تاہم میں اعتماد کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ مستقل طور پر رکھی گئی داڑھی تھی یا نہیں۔ میں نے پولیس کو اس شخص کا نام نہیں بتایا تھا جسکی داڑھی تھی۔ (عدالت نے سیکشن 161 کے تحت ریکارڈ کیے جانے والے بیان کا جائزہ لیا جس میں گواہ نے بتایا ہے کہ داڑھی والا شخص نذیر عباسی تھا۔) میں نے پولیس کو بتایا تھا کہ ملزم روزنامہ جنگ میں کام کرتے تھے (عدالت نے بیان کا جائزہ لیا جس میں یہ درج نہیں تھا کہ وہ روزنامہ جنگ میں کام کرتے تھے۔) جب میرا بیان ریکارڈ ہوا تھا تو اس وقت مجھے وہاں

رہتے ہوئے دوڈھائی سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ میں نے پولیس کو یہ عرصہ بتایا تھا۔(عدالت نے بیان کا جائزہ لیا جس میں اس گھر میں سکونت کا عرصہ ڈیڑھ سال لکھا ہوا تھا۔) موجودہ گھر میں رہنے سے قبل میں 1 -ایف کوثر نیازی کالونی میں رہتا تھا جو پتہ میرے قومی شناختی کارڈ پر بھی درج ہے۔ میرے پاس ایسی کوئی دستاویز نہیں ہے جس سے عدالت کے روبرو اپنی سکونت ثابت کر سکوں، تاہم رضا کارانہ طور پر کہا کہ یہ اُس علاقے میں رہائش پذیر لوگوں سے تصدیق کرایا جاسکتا ہے کہ وقوعہ پیش آنے کے دنوں میں، میں وہاں پر رہائش پذیر تھا اور وہاں میری دکان بھی تھی۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں اس علاقے کا رہائشی نہیں ہوں اور پولیس کے کہنے پر یہ بیان دے رہا ہوں۔ اُس علاقے میں گھر لیز شدہ نہیں ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ پولیس نے مجھ سے زبردستی بیان دلوایا ہے، بصورت دیگر مجھے ناجائز قبضے کی آڑ میں گھر سے بے دخل کر دیا جاتا۔ میں ملزمان کے گھر کبھی نہیں گیا۔ میں نے انہیں علاقے کے کسی شخص کو کوئی مواد وغیرہ دیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ مجھے ان ملزمان کی کسی سرگرمی کا کوئی علم نہیں ہے اور نہ ہی کسی نے مجھے اسکے متعلق بتایا ہے۔ شبیر اور وارثی کے زیرِ مصرف گھر پہلے کچھ کشمیری لوگوں کے پاس تھا۔ مجھے ان سابقہ مکینوں کا معلوم نہیں ہے اور نہ ہی میرے علم میں ہے کہ یہ گھر سابقہ مکینوں سے کس نے حاصل کیا۔ کشمیریوں نے یہ گھر پولیس کی جانب سے میرا بیان ریکارڈ کرنے سے قبل خالی کر دیا تھا۔ میں نے ان ملزمان کو سابقہ مکینوں کی موجودگی کے دوران کبھی اپنی دکان پر نہیں دیکھا تھا۔

(عدالت 26 جون 1982 تک برخاست)

28 جون 1982 استغاثہ کے گواہ یعقوب سے یوسف لغاری کی جرح

یہ درست ہے کہ میں نے گواہی کے خلاصے اور ایگزامینیشن انچیف کے دوران بتایا ہے کہ ملزمان شبیر شر اور وارثی میری دکان پر خریداری کیلئے آتے تھے جبکہ میری جانب سے گواہی کے خلاصے کے بیان میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ آیا گواہی کے خلاصے میں اپنا بیان ریکارڈ کرانے کے دوران میں نے یہ حقائق گواہی کے خلاصے کے روبرو بیان کیے تھے یا نہیں۔ صفدر بھٹی ایس ایچ او وہاں موجود تھا، جس کے علاوہ ایک کرنل میجر اور ملزمان سمیت دیگر لوگ بھی

موجود تھے۔ میں نے بیان پر دستخط نہیں کیے تھے البتہ اس پر میرے انگوٹھے کا نشان لیا گیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہی تو میں نے صرف انگوٹھا ثبت کیا تھا۔ میں نے اپنے گواہی کے خلاصے میں بتایا تھا کہ کمال وارثی اور شبیر شر کو میں وقوعے سے چودہ پندرہ روز قبل سے ہی جانتا تھا جبکہ یہ گواہی کے خلاصے میں درج نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ملزمان کمال وارثی اور شبیر شر کب ہماری گلی میں سکونت پزیر ہوئے۔ میں نے گواہی کے خلاصے میں بتایا تھا کہ اس گھر کے سابق مکین کچھ کشمیری تھے، جو کہ گواہی کے خلاصے میں درج نہیں ہے۔ مجھے کشمیریوں کے گھر چھوڑنے کی قطعی تاریخ معلوم نہیں ہے۔ اس وقت وہ گھر مقفل ہے اور اس میں کوئی نہیں رہتا۔ میں اُس گھر کے اندر کبھی نہیں گیا اور نہ ہی وہاں جا کر ان سے ملا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ گھر کس نے ملزمان کو فروخت کیا یا کرائے پر دیا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے پولیس کے دباؤ پر بیان دیا ہے۔ مجھے گواہی کے خلاصے کے صدر نے میرے سمجھنے والی زبان میں یہ بیان پڑھ کر نہیں سنایا تھا۔ جبکہ سیکشن 161 کے تحت دیا ہوا بیان بھی مجھے پڑھ کر نہیں سنایا گیا۔

(یوسف لغاری کی جرح مکمل ہوئی)

26 جون 1982

استغاثہ کا گواہ اشفاق الزمان خان ایگزامینیشن انچیف

میں فروری 1979 سے وفاقی حکومت کے تحت کالج میں سپرنٹنڈنٹ کے طور پر ملازمت کر رہا ہوں۔ پروفیسر جمال الدین نقوی شعبہ انگریزی کے سربراہ کے طور پر خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ میں انکو عدالت میں شناخت کرسکتا ہوں۔ نومبر 1980 کے دوران ڈی ایس پی ممتاز برنی پروفیسر جمال نقوی کی ذاتی فائل سے کچھ خطوط حاصل کرنے کی غرض سے کالج کے اوقات کار کے دوران کالج آئے تھے۔ کالج پرنسپل محمد اکرام الرحمان نے جمال نقوی کی ذاتی فائل سے کچھ دستاویزات / خط میری اور محمد اشفاق کی موجودگی میں ڈی ایس پی برنی کے سپرد کیے۔ میری موجودگی میں جرم نمبر 236/8 سیکشن 15، 18 مارشل لاضوابط بشمول 77 مارشل لاحکم نامہ کے پروفیسر جمال نقوی سے متعلق ممتاز برنی کو سپرد کی گئی دستاویزات کے تفصیل پیش کر رہا ہوں جبکہ درست ایگزبیٹ کے طور پر عدالت کے سامنے اپنے دستخط کی تصدیق کرتا ہوں۔ ایگزبیٹ میں ذکر کیے گئے خطوط دیکھ رہا ہوں اور تصدیق کرتا ہوں کہ یہ وہی ہیں جو ممتاز برنی کے سپرد کیے گئے تھے۔ ایگزبیٹ Y-1 کے طور پر پروفیسر جمال نقوی کے اپنے ہاتھ سے اردو میں تحریر کیا ہوا خط بتاریخ 17 نومبر 1971، Y-2 کے طور پر اپنی ملازمت سنبھالنے سے متعلق 11 مارچ 1978 کا انکے ہاتھ سے تحریر کیا ہوا انگریزی خط، ایگزبیٹ Y-3 کے طور پر 28/27 اگست 1973 کی درمیانی شب اپنی گرفتاری سی متعلق پروفیسر جمال نقوی کا 22 دسمبر 1973 کا انگریزی خط، ایگزبیٹ Y-5 انکی اپنی ہاتھ کی تحریر میں انگریزی میں پروفیسر جمال نقوی کا بایوڈیٹا، انکی اپنی دستی انگریزی تحریر میں جمال نقوی کی جانب سی ڈیوٹی پر آنے کا خط Y-5 شامل ہیں۔

(کمال وارثی، شبیر شر، امرلال، جام ساقی کی جانب سے جرح نہیں کی گئی)

میں پروفیسر جمال نقوی کو اردو سائنس کالج میں اپنی تعنیاتی کے دن سے جانتا ہوں۔ میں نے انہیں کالج میں پروفیسر کی حیثیت میں ایک انتہائی مہذب اور اچھا شہری پایا۔ میں نے کالج میں انہیں سیاسی اور قابل اعتراض سرگرمیوں میں ملوث نہیں دیکھا۔ میں نے انہیں کالج کی حدود میں ایسی سرگرمیوں میں بھی ملوث نہیں پایا جو مختلف طبقات اور مذہبی فرقوں کے درمیان منافرت

اور دشمنی کا باعث بن سکتی ہوں۔ میں نے انہیں کالج میں فوج پر بد اعتمادی پھیلاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ میں نے انہیں کبھی بھی نظریہء پاکستان سے متضاد کسی نظریے کا پرچار کرتے ہوئے نہیں پایا۔ میں نے انہیں کسی ایسی سرگرمی میں ملوث نہیں دیکھا جو بغاوت کے زمرے میں آتی ہو۔ میں مندرجہ بالا الزمات/ جرائم/ سرگرمیوں کے کالج کی حدود سے باہر کیے جانے پر کوئی رائے نہیں دے سکتا کیونکہ مجھے اسکا کوئی علم نہیں ہے۔ کالج کے کسی طالب علم/ پروفیسر/ یا عملے کے کسی اور فرد نے پروفیسر جمال نقوی کے خلاف مندرجہ بالا جرائم/ سرگرمیوں کے حوالے سے کوئی شکایت نہیں کی۔ گواہی کے خلاصے میں میرا بیان ریکارڈ کیا گیا تھا۔ گواہی کے خلاصے کے صدر نے مجھے ایگزبیٹ Y تا Y5 بھی دکھائی تھیں۔ کالج میں کام کرنے والے عملے کی ذاتی فائل میری زیرِ نگرانی کام کرنے والا ایک کلرک دیکھتا ہے۔ میں ایگزبیٹ Y-4 دیکھ رہا ہوں تاہم کہہ نہیں سکتا کہ انہیں اسکے تحت بے گناہ قرار دیا گیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے اپنی ملازمت دوبارہ سنبھال لی تھی تاہم انکی ذاتی فائل دیکھنے تک میں اس ضمن میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ذاتی فائل میں اس حوالے سے یقیناً کچھ دستاویزات ہوں گے۔ (وکیل صفائی نے عدالت سے استدعا کی کہ گواہ کو ذاتی فائل لانے کیلئے کہا جائے تاکہ وہ عدالت کو دکھا سکے کہ پروفیسر جمال نقوی کو سابقہ مقدمے میں غلط طور پر ملوث کیا گیا تھا اور وہ اپنی ملازمت پر بحال ہوئے تھے جو کہ ایگزبیٹ Y-4 میں درج ہے۔ وکیل صفائی کی درخواست مسترد کر دی گئی کیونکہ عدالت کا کسی سابقہ مقدمے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔)

مرکزی حکومت کی کوئی بھی تفتیشی ٹیم اس مقدمے کے سلسلے میں ہمارے کالج نہیں آئی ہے۔ یہ کالج وفاقی حکومت کے تحت ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آیا اس مقدمے کے ضمن میں مارشل لا کی کوئی ٹیم ہمارے کالج آئی ہے یا نہیں۔ میرے علم میں نہیں ہے کہ آیا ممتاز برنی کے علاوہ بھی ملیر یا نارتھ ناظم آباد کا کوئی پولیس اہلکار اس مقدمے کے تفتیش کے سلسلے میں ہماری کالج آیا ہے یا نہیں۔ میں نے کسی مجسٹریٹ یا اعلیٰ اختیاری یا وزارتِ تعلیم کی جانب سے جاری ہونے والا ایسا کوئی لیٹر نہیں دیکھا جس میں مجھے پروفیسر جمال نقوی کی ذاتی فائل سے کوئی دستاویز ممتاز برنی کے حوالے کرنے کی ہدایت کی گئی ہو۔ برنی کو دی گئی دستاویزات کی رسید پروفیسر جمال نقوی کے ذاتی فائل میں

موجود ہے۔ کالج نے پروفیسر جمال نقوی کے اس مقدمے کے حوالے سے کوئی انکوائری نہیں کی۔
(شفیع محمدی نے اپنی جرح مکمل کی)

30 جون 1982 استغاثہ کے گواہ اشفاق سے شفیع محمدی کی جرح جاری

عدالت میں موجود سات ملزمان میں سے صرف پروفیسر جمال نقوی کو جانتا ہوں اوران چھ میں سے کوئی بھی کالج حدود میں پروفیسر جمال نقوی سے کبھی بھی ملنے نہیں آیا۔ ایگزبیٹ Y-5 میں پروفیسر جمال نقوی کی ذاتی فائل سے حاصل کیا گیا بایو ڈیٹا مجھے پروفیسر اکرام نے نہیں دیا تھا بلکہ یہ میری تقرری سے قبل ہی فائل میں موجود تھا۔ میری معلومات کے مطابق پروفیسر اکرام کے پروفیسر جمال نقوی کے ساتھ تعلقات خوشگوار تھے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ان دونوں کے درمیان تعلقات کشیدہ تھے۔ میں انکی دستی انگریزی تحریر کسی حد تک شناخت کرسکتا ہوں کیونکہ کچھ درخواستیں/خطوط میرے دفتر کے ذریعے پرنسپل کو بھیجے جاتے رہے ہیں۔ میں نے اس کالج کے علاوہ کسی اور کالج میں پروفیسر جمال نقوی کے ساتھ کام نہیں کیا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، پروفیسر جمال نقوی کالج کے باہر بھی اچھی شہرت کے حامل ہیں۔

استغاثہ کا گواہ محمد شفیق ایگزامینیشن انچیف

میں اردو سائنس کالج میں لیکچر کے طور پر اپریل 1973 سے تعینات ہوں۔ میں پروفیسر جمال نقوی کو عدالت میں ملزم کے طور بیٹھے ہوئے شناخت کرسکتا ہوں، جن سے میرا اپریل 1973 سے تعلق رہا ہے۔ 1980 میں (قطعی مہینہ مجھے یاد نہیں ہے) ایک دن میں کالج کے اوقات میں کسی کام سے پرنسپل کے دفتر گیا جہاں ڈی ایس پی ممتاز برنی موجود تھے۔ اُس وقت پروفیسر جمال نقوی کے ذاتی فائل سے کچھ دستاویزات ڈی ایس پی برنی کو دی گئیں، جس پر میں نے گواہ کے طور پر دستخط کیئے۔ (گواہ نے ایگزبیٹ Y پر اپنے دستخط کی تصدیق کی۔ گواہ نے ایگزبیٹ Y-1 تا Y-5 کا معائنہ کیا اور تصدیق کی کہ یہی وہ دستاویزات تھے جو پروفیسر اکرام نے ڈی ایس پی برنی کو اسکی موجودگی میں دیئے تھے۔)

شفیع محمدی کی جرح

جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں نے پروفیسر جمال نقوی کو کبھی بھی ایسی سرگرمی میں ملوث نہیں دیکھا

جو مختلف طبقات اور مذہبی عقائد رکھنے والوں کے درمیان دشمنی اور نفرت کا باعث بنے۔ میں نے انہیں کبھی بھی مسلح افواج کے خلاف بداعتمادی پھیلاتے ہوئے نہیں پایا۔ میں نے پروفیسر نقوی کو اپنے نقطہء نظر کی تشہیر کرتے ہوئے نہیں دیکھا جو کہ نظریہء پاکستان سے متصادم ہو۔ ہمارے درمیان کبھی کبھار باعثِ اختلاف بات صدارتی یا پارلیامانی طرزِ حکومت کے موضوع پر بحث کے دوران سامنے آتی رہی۔ (استغاثہ نے ملزم بدرابڑو کے وکیل صفائی شفیع محمدی کی جرح پر اعتراض اُٹھایا کہ بحث کو گواہ کی جانب سے پیش کردہ دستاویزات تک ہی محدود رہنا چاہئے۔ عدالت نے اسکو مسترد کردیا۔) میں نے کالج کی حدود میں انکی ایسی کوئی سرگرمی نہیں دیکھی جو بغاوت کے زمرے آتی ہو۔ میں نے اپنی کالج میں پروفیسر جمال نقوی کے علاوہ کسی ملزم کو نہیں دیکھا کہ وہ پروفیسر سے مل رہے ہوں۔ میں نے اپنی کالج کی حدود میں ان ملزمان کی جانب سے پروفیسر جمال نقوی کے ساتھ مل کر کوئی سرگرمی کرنے سے متعلق کبھی نہیں سنا۔ یہ درست ہے کہ اشفاق زمان خان میری موجودگی میں نہ تو پرنسپل کے کمرے میں داخل ہوا نہ ایگزبیٹ Y پر دستخط کیے۔ مندرجہ بالا ایگزبیٹ میں ذکر کی گئی اشیا میری موجودگی میں پروفیسر جمال نقوی کی ذاتی فائل سے نہیں نکالی تھیں۔ مجھے کسی مجسٹریٹ یا اعلیٰ اختیاری یا وزارتِ تعلیم سے ایسا کوئی ہدایت آمیز لیٹر نہیں ملا تھا جس کے تحت ڈی ایس پی برنی یہ دستاویزاتِ لے جا سکتا تھا۔ میں کالج سے باہر پروفیسر کی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تاہم وہ کالج کے باہر بھی اچھی شہرت کے حامل تھے۔

7 جولائی 1982

محمد سرور خان ایگزامینیشن انچیف

3 اکتوبر 1980 کو میں بطور اے سی ایم عدالت نمبر 6، غربی کراچی کام کر رہا تھا کہ ایس ڈی پی او ممتاز برنی نے سیکشن 164 سی آر پی سی کے تحت بیان ریکارڈ کرانے کی غرض سے ملزم امرلال کو میری عدالت میں پیش کیا۔ میں امرلال کو عدالت میں بیٹھے ہوئے شناخت کر سکتا ہوں۔ صبح تقریباً گیارہ بجے امرلال کو میری عدالت میں لایا گیا۔ میں نے ایس ڈی پی او ممتاز برنی کو امرلال کی ہتھکڑی کھولنے کیلئے کہا اور اسکو میرے چپراسی کی تحویل میں دیکر اسکو میرے چیمبر میں سکون سے بیٹھنے کو کہا گیا۔ اسی دوران، ایس ڈی پی او ممتاز برنی کو عدالت کی حدود سے باہر جانے کو کہا گیا۔ ملزم کو میں نے آگاہ کیا کہ وہ اعترافی بیان دینے کیلئے پابند نہیں ہے اور یہ خود اسکے خلاف بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ ملزم کو گیارہ بجے سے ایک بجے تک کُل دو گھنٹے غور و خوص کرنے کا وقت دیا گیا۔ میں نے اسکا اعتراف ریکارڈ کیا۔ غور و خوص کے دورانیہ میں کسی کو بھی ملزم سے رابطہ کرنے نہیں دیا گیا۔ میں نے اسکا بیان انگریزی میں خود اپنے ہاتھ سے ریکارڈ کیا۔ میں عدالت میں پیش کیے گئے اعترافی بیان کی تصدیق کرتا ہوں کہ یہی وہ اصل بیان ہے جو 13 اکتوبر 1980 کو ریکارڈ کیا تھا۔ اعترافی بیان ایگزیبیٹ Z کے طور پر پیش کیا گیا۔

امرلال، وارثی، شر، پروفیسر اور جام کی جانب سے جرح نہیں کی گئی۔

شفیع محمدی کی جرح 7 جولائی 1982

میں مئی 1975 میں اے سی ایم مقرر ہوا تھا۔ میں نے سیکشن 164 سی آر پی سی تحت کئی اعترافی بیان ریکارڈ کیے ہیں۔ میں انگریزی اور اردو زبانیں لکھ، پڑھ اور بول سکتا ہوں۔ یہ درست ہے کہ سیکشن 164 سی آر پی سی تحت ریکارڈ کیا جانے والے بیان ملزم کے خلاف بھی استعمال ہو سکتا ہے اور اسکو اسکی بنیاد پر سزا بھی ہو سکتی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ اسکے لئے کئی ایک اجزا مکمل کرنے ہوتے ہیں اور کاٹ پیٹ کی صورت میں بیان نقائص کا حامل ہو جاتا ہے اور ملزم کے خلاف استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ ملزم اردو اور انگریزی میں بیان دے رہا تھا اور میرے دریافت

کرنے پراس نے بتایا کہ وہ دونوں زبانیں لکھ، پڑھ اور بول سکتا ہے۔ میرے ساتھ اسکی گفتگو اردو اور انگریزی میں تھی۔ میں قانون سے مکمل طور پر آگاہ ہوں کہ (2)164 کے تحت ریکارڈ کیے جانے والے بیانات سیکشن 364 میں واضح کیے گئے انداز میں ریکارڈ کیے جانے چاہئیں اور مذکورہ بیانات اُس مجسٹریٹ کوارسال کیے جائیں جو جانچ کررہا ہو۔ یہ درست ہے کہ میں سیکشن 364 سی آر پی سی تحت ملزم سے کیا جانے والا ہر سوال درج کرنے اور اسکی جانب سے دیا گیا ہر جواب، استعمال کی جانے والی زبان میں درج کرنے کا پابند تھا۔ ایگزیبیٹ z سے یہ واضح ہے کہ میں نے ملزم امرلال سے کیے گئے اردو سوالات درج نہیں کیے ہیں، نہ ہی قانونی تقاضوں کے مطابق اسکی جانب سے دیئے گئے جوابات مکمل طور پر درج کیے ہیں، جو کہ عملاً ممکن تھا۔ یہ درست ہے کہ ملزم امرلال نے اپنے اعترافی بیان میں بتایا تھا کہ سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن (SNSF) چونکہ کسی سیاسی جماعت سے الحاق نہیں رکھتی اس لئے اخبارات (ہلچل اور سرخ پرچم) طلبہ میں تقسیم نہیں کیے جا سکتے تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ ملزم امرلال نے اپنے بیان میں بتایا تھا کہ وہ SNSF کا سینئر نائب صدر تھا اور نذیر عباسی شہید کی موت کے بعد فیڈریشن کا صدر بن گیا تھا۔ ملزم امرلال نے مجھے بتایا تھا کہ انکی تنظیم یا فیڈریشن کا کسی سیاسی جماعت یا کسی بیرونی ملک سے کوئی تعلق نہیں ہے اور انہوں نے کسی بیرونِ ملک یا جماعت سے کوئی مالی معاونت حاصل نہیں کی اور نہ ہی ایسا کوئی ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ درحقیقت طلبہ مسائل کے حل کیلئے جدوجہد کررہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ملزم امرلال نے میرے سامنے اعتراف نہیں کیا ہے کہ وہ عدالت میں موجود چھ ملزمان کے تعاون یا گٹھ جوڑ کے ساتھ کوئی جرم یا کوئی غیر قانونی سرگرمی کرنے کیلئے کوئی سازش کر رہا تھا۔

سوال: کیا ملزم امرلال نے اپنے بیان میں اعتراف کیا ہے کہ وہ مختلف طبقات اور مذہبی فرقوں کے درمیان دشمنی اور نفرت کے جذبات بھڑکانے کیلئے مواد شائع، تقسیم کرتا اور اپنے پاس رکھ رہا تھا۔ اور آیا اُس نے عدالت میں موجود چھ ملزمان میں سے کسی کے مندرجہ بالا جرائم میں ملوث ہونے کا بتایا ہے؟

جواب: جی ہاں! اس نے میرے سامنے اعتراف کیا کہ وہ SNSF کی مرکزی ورکنگ کمیٹی کا رکن نامزد ہوا۔ نذیر عباسی، جو کہ فیڈریشن کا صدر تھا، اسکے کمرہ نمبر 67، انٹرنیشنل ہاسٹل سندھ یونیورسٹی پر ہلچل کے بنڈل لاتا تھا، جو کہ غسلخانے کے اوپر گیلری میں رکھے جاتے تھے۔ سرفراز میمن، جو کہ SNSF سندھ یونیورسٹی کا صدر اور نذیر عباسی کا قریبی ساتھی تھا، طلبہ میں کھلے عام سرخ پرچم اور ہلچل تقسیم کرتا تھا۔ تاہم اُس نے عدالت میں موجود چھ ملزمان میں سے کسی کا بھی نام نہیں لیا تھا۔

سوال: مہربانی فرما کر عدالت کو دکھایئے کہ امر لال نے مختلف طبقات اور مذہبی فرقوں کے درمیان جذبات بھڑکانے والا مواد شائع کرنے کا اعتراف کیا ہے (گواہ نے جواب دینے سے اجتناب کیا)

(تندو تیز بحث ومباحثے کے بعد سماعت 8 جولائی 1982 کیلئے ملتوی)

11 جولائی 1982

جواب: نہیں، اس نے سوال میں معلوم کی گئی سرگرمی سے متعلق اعتراف نہیں کیا۔ میں نے ملزم امر لال سے کوئی براہ راست سوال نہیں کیا تاہم میرے دریافت کیے گئے سوالات اور اسکی جانب سے انکے دیئے گئے جوابات اعترافی بیان میں شامل کیے گئے ہیں۔ میں نے تمام باتوں کا اعترافی بیان میں احاطہ کیا ہے اور کچھ چھوڑا نہیں ہے۔ میں نے ملزم کے اعترافی بیان ریکارڈ کرنے کے حوالے سے تمام تر قانونی تقاضے پورے کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ ملزم نے بیان کے دوران مجھے ولی خان، عطاءاللہ مینگل، غوث بخش بزنجو، حیدر بخش جتوئی، جام ساقی اور دیگر سیاستدانوں اور طالب علم رہنماؤں کی تقریروں اور ہنگامہ آرائی کے تفصیل نہیں بتائے اور نہ ہی ملزم امر لال نے اس ضمن میں کوئی اعتراف کیا۔

یہ درست ہے کہ پولیس نے مجھے ایسے کوئی تفصیل فراہم نہیں کیے جس سے مجھے اندازہ ہوتا کہ مذکورہ تقریریں غیر قانونی تھیں۔ میں نے ملزم سے ان تقاریر کے تفصیل معلوم نہیں کیے تا کہ تعین کرسکوں کہ ملزم کا ان تقاریر سے کسی نوعیت کا کوئی تعلق تھا۔ پولیس میرے پاس سرخ پرچم یا

ہلچل کا کوئی پرچہ نہیں لائی تھی جو مبینہ طور پر امر لال سے برآمد ہوا ہو۔ملزم امر لال نے میرے روبرو کوئی اعتراف نہیں کیا کہ اس سے کسی نوعیت کا تخریبی مواد برآمد ہوا تھا۔اس لئے مجھے ان پمفلٹوں/خبرناموں کے جلد، مہینے اور سال یا مواد کا معلوم نہیں ہے۔ملزم امر لال نے میرے روبرو اعتراف نہیں کیا کہ اس مقدمے میں ملوث دیگر ملزمان اس نوعیت کا تخریبی مواد اپنے پاس رکھتے تھے۔ بیان میں ذکر کیے گئے پمفلٹ سال 1979 کے ہیں نہ کہ جولائی 1980 کے۔ یہ درست ہے کہ ملزم امر لال نے میرے روبرو اعتراف نہیں کیا کہ وہ مختلف طبقات اور مذہبی فرقوں کے درمیان نفرت پھیلانے کا باعث بننے والے مواد کی اشاعت، تقسیم اور رکھنے کی عمل میں شریک رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ ملزم امر لال نے میرے روبرو یہ اعتراف نہیں کیا کہ وہ مسلح افواج کے خلاف بدگمانیاں پھیلا رہا ہے۔اُس نے عدالت میں موجود دیگر ملزمان سے متعلق بھی ایسا کوئی اعتراف نہیں کیا۔نذیر عباسی شہید کی موت کے اسباب جاننے کی درخواست کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔

ملزم امر لال نے بیان میں اعتراف نہیں کیا کہ وہ نظریہء پاکستان کے خلاف نقطہءنظر کی تشہیر اور مارشل لا نافذ کرنے کے اسباب کے خلاف پروپگنڈہ میں ملوث رہا ہے، اس میں قابلِ اعتراض مواد کی اشاعت اور تقسیم شامل ہے۔اُس نے دیگر ملزمان کے متعلق بھی ایسا کوئی اعتراف نہیں کیا۔ ملزم امر لال نے اپنے بیان میں یہ اعتراف بھی نہیں کیا کہ وہ مسلح افواج سے متعلق عدم اطمینان پھیلانے کے الزام کے ضمن میں کوئی جرم کرنے یا کرانے کے حوالے سے کسی سازش میں شریک رہا ہے، نہ ہی وہ مختلف طبقات اور مذہبی فرقوں کے درمیان نفرت پھیلانے کی کسی سازش کا شریک رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ حکومت کی مخالفت کرنا اور حکومت کے خلاف بولنا حکومتی مخالفت کے زمرے میں آتا ہے جبکہ بزور طاقت حکومت کا تختہ الٹنا بغاوت کے زمرے میں آتا ہے۔ملزم امر لال نے اپنے بیان میں ایسا کوئی اعتراف نہیں کیا کہ وہ یا عدالت میں موجود دیگر ملزمان ایسے کسی جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔

یہ درست ہے کہ میں نے بیان عدالت کے بجائے چیمبر میں ریکارڈ کیا تھا۔میرے خیال

میں یہ عدالت کے بجائے چیمبر میں ہی ریکارڈ ہونا چاہئے۔ علاقے کا ایس ڈی ایم سٹی کورٹس کی حدود میں بیٹھتا ہے۔ میں وفاقی حکومت، سندھ کی عدلیہ اور حکومتِ سندھ کے سرکیولر دیکھ چکا ہوں جس کا باب 6 حصہ سی پیرا 7 کہتا ہے کہ 'اعترافات عدالتی اوقات کار میں کھلی عدالت میں ضوابط کے تحت ریکارڈ کیے جائیں۔ یہ میرے لئے ضروری نہیں تھا کہ میں اس سے ان تمام تر حالات کا تفصیل سے معلوم کروں جن کے تحت وہ یہ اعترافی بیان دے رہا تھا۔ میں باب 6 حصہ سی سیکشن اے دیکھ رہا ہوں جہاں میرا فرض تھا کہ میں ملزم سے اعترافی بیان دینے کے حالات کا تفصیل سے دریافت کرتا اور میں مانتا ہوں کہ سوالات اعترافی بیان میں شامل نہیں ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ مذکورہ بالا باب کا سیکشن 11 اور کتاب کے تحت یہ ضروری تھا کہ اعترافی بیان اعلیٰ ترین مجسٹریٹ (i) سب ڈویژنل مجسٹریٹ اور بعد ازاں مجسٹریٹ لیتا۔ میں نے ڈی ایس پی ممتاز برنی سے دریافت نہیں کیا کہ آیا ایس ڈی ایم اپنی عدالت میں موجود تھا کہ نہیں۔ میں نے بیان ریکارڈ کرنے سے انکار نہیں کیا تھا۔ بیان درج کرنے کیلئے مجھے ایس ڈی ایم سے کوئی لیٹر موصول نہیں ہوا۔ رضا کارانہ طور پر بتایا کہ مجھے تحریری طور پر بیان ریکارڈ کرنے کیلئے کہا گیا تھا، جس کا ڈپٹی کمشنر کی جانب سے جاری کیا جانے والا خط وہ پیش نہیں کرسکتا۔ یہ خط شاید عدالتی فائل میں موجود ہو۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ملزم امرلال کو پولیس نے میرے روبرو 12 اکتوبر 1980 کو پیش کیا لیکن اُس نے بیان دینے سے انکار کیا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے 12 اکتوبر 1980 کو ملزم پولیس کے حوالے کیا جب اُس نے اعترافی بیان دینے سے انکار کیا۔ یہ کہنا بھی درست نہیں ہوگا کہ میں نے 13 اکتوبر 1980 کو ڈی ایس پی ممتاز برنی، ایس ایچ او نارتھ ناظم آباد مخدوم حیات اور میجر سلیم کی موجودگی میں منگھوپیر پولیس اسٹیشن پر یہ بیان ریکارڈ کیا تھا۔ یہ کہنا بھی درست نہیں ہوگا کہ بدر جمال کو اعترافی بیان ریکارڈ کرانے کی غرض سے میرے روبرو پیش کیا گیا تھا۔ میں نے ملزم کے اعترافی بیان کے ضمن میں سپرنٹنڈنٹ جیل سے وارنٹ کے ذریعے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ اگرچہ باب 6 حصہ سی سیکشن 10 کے تحت یہ ضروری تھا کہ مجسٹریٹ متعلقہ جیل سپرنٹنڈنٹ کی اطلاع کیلئے وارنٹ پر ملزم کے اعترافی بیان سے متعلق نوٹ تحریر کرے۔ مجھے یاد

نہیں ہے کہ آیا میں نے سپرنٹنڈنٹ جیل کوملزم کو دیگر ملزمان سے علیحدہ رکھنے کی ہدایت کی تھی، اگرچہ پولیس ضوابط بابت 25 سیکشن 29 ای کے تحت یہ ضروری ہے کہ اعتراف کرنے والے ملزم کو باقی ملزمان سے علیحدہ رکھنے کیلئے مجسٹریٹ کی جانب سے احکامات جاری کرنا مطلوب ہوتے ہیں۔اعتراف میں اسکا کوئی ذکر نہیں ہے کہ میں نے اعتراف کرنے کا موجب بننے والے حالات سے متعلق جانچ پڑتال کی تھی اوراس ضمن میں پولیس اہلکار نے معلومات فراہم کی جو کہ پولیس ضوابط 1934 کے باب 25 سیکشن 29 سی کے تحت مطلوب تھی۔

مجھے وہ قطعی سیکشنز یاد نہیں ہیں جن کے تحت ملزم کو میرے سامنے پیش کیا گیا چنانچہ کہہ نہیں سکتا کہ ملزم نے کسی جرم کے حوالے سے بیان دیا تھا تاہم مجھے یاد ہے کہ ایس ڈی پی اوممتاز برنی نے مجھے وہ الزامات دکھائے تھے جن کے لئے وہ بیان دے رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ الزامات مارشل لاضوابط 4، 13، 18، 36، پاکستان پینل کوڈ 24 اے، 149 کے تحت تھے۔یہ درست ہے کہ ملزم نے مندرجہ بالا الزامات کے حوالے سے کوئی اعتراف نہیں کیا تھا۔

یوسف لغاری کی جرح 11 جولائی 1982

امرلال کے اعترافی بیان کے آخر میں سرٹیفکیٹ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ میں نے نہ سرٹیفکیٹ ریکارڈ کیا نہ ہی اس پر دستخط کیے۔اعترافی بیان کے اختتام پر کسی حاشیے کا ذکر نہیں ہے۔میں نے اعترافی بیان کے ہر صفحے پر دستخط نہیں کیے ہیں۔میں نے کچھ حذف کیے گئے الفاظ پر اپنے دستخط کیے ہیں۔ایس ڈی پی او برنی کی جانب سے مجھے دکھایا گیا لیٹر، جس کی بنیاد پر میں نے اعترافی بیان ریکارڈ کیا، اعترافی بیان کے ساتھ منسلک نہیں ہے۔ میں نے یہ اعترافی بیان مقدمہ چلانے والی عدالت کو ارسال نہیں کیا کیونکہ مجھے اسکا معلوم نہیں تھا۔ میں نے اعترافی بیان لیٹر نمبر MAG/L.N/J/545/80 بتاریخ 14-10-1980 کے تحت ریکارڈ روم سٹی کورٹس کراچی کے ریکارڈ کیپر کو ارسال کیا۔ یہ درست ہے کہ اعترافی بیان ریکارڈ کیے جانے والے دن ارسال نہیں کیا گیا۔ میں نے اُسی دن لیٹر پر دستخط کیے تھے جوایک سربمہر لفافے میں اگلے روز ریکارڈ کیپر کو ارسال کیا گیا۔اعترافی بیان کی روانگی تک یہ میرے تحویل میں تھا اور اگلی صبح سربمہر تھا۔

اعترافی بیان میز کی دراز میں تالے میں رکھا گیا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ یہ ریکارڈ کرنے کے بعد ممتاز برنی کو دکھایا گیا تھا۔ یہ کہنا بھی درست نہیں ہوگا کہ بیان ممتاز برنی کے صلاح مشورے سے ریکارڈ کیا گیا تھا۔ یہ درست ہے کہ ملزم امر لال نے بیان جزوی طور پر اردو میں اور جزوی طور پر انگریزی میں دیا تھا۔ میں اعترافی بیان دیکھ رہا ہوں اور یہ امر لال کے کہے کے عین مطابق ہے۔ اس وقت میں یہ فرق نہیں کر سکتا کہ بیان کا کونسا حصہ میں نے انگریزی میں ترجمہ کیا اور کون سا حصہ امر لال کی زبان سے براہ راست ادا ہوا۔

سوال: آپ انگریزی میں ایم اے ہیں یا اردو میں؟ عدالت نے یہ سوال مسترد کر دیا۔ میں اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو ترجمے کا ماہر ہوں۔ ملزم کو میرے عدالتی عملے کے سپرد کیا گیا، جس نے اسکو وارنٹ سمیت سٹی کورٹس کے لاک اپ میں رکھا۔ سٹی کورٹس لاک اپ کا انچارج ایک پولیس اہلکار ہے۔ وہاں پر ایسا کوئی طور طریقہ/ سلسلہ نہیں ہے کہ میرے اُس عملے سے کوئی رسید لی جائے جس کے ذمے ملزم کو سٹی کورٹس لاک اپ کے انچارج کے حوالے کرنے کا ذمہ سونپا گیا تھا۔ میں نے ملزم امر لال کو اعترافی بیان ریکارڈ کرنے کے فوراً بعد حوالے/ سپرد کر دیا تھا۔ میں نے ریمانڈ وارنٹ اپنی عدالت کے دو افراد کے حوالے کیا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میرے عدالتی عملے کے دو افراد ملزم کو سٹی کورٹس لاک اپ نہیں لے گئے تھے بلکہ اسکو ایس ڈی پی او ممتاز برنی لے گیا تھا۔ میرے عملے کے افراد نے ملزم کو سٹی کورٹس لاک اپ انچارج کے حوالے کر کے واپس آ کر مجھے اطلاع دی تھی۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ انہوں نے ریمانڈ وارنٹ بھی سٹی کورٹس لاک اپ انچارج کو دیا ہے۔ میں نے یہ تمام تر کارروائی اُسی دن سہ پہر تین بجے تک مکمل کر لی تھی۔ مجھے پانچ دس منٹ قبل ممتاز برنی نے کچھ کاغذات اور الزامات دکھائے تھے جو کہ میں نے اپنے روبرو پیش کیے جانے والے ملزم کو پڑھ کر سنائے تھے۔ مجھے ملزم امر لال کا اعترافی بیان ریکارڈ کرنے سے متعلق ڈپٹی کمشنر غربی کا لیٹر ممتاز برنی اور ملزم کی آمد سے پہلے موصول ہوا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے ممتاز برنی اور ڈپٹی کمشنر غربی کے اصرار پر بیان ریکارڈ کیا تھا۔ 20 نومبر 1980 کو میں اے سی ایم عدالت نمبر۔۔۔۔۔تھا۔

عدالت کی جانب سے سوالات

سوال: کیا ڈپٹی کمشنر کی جانب سے جاری کیا گیا لیٹر پولیس کے لیٹر سے علیحدہ تھا؟

جواب: یہ علیحدہ لیٹر نہیں تھا بلکہ پولیس کی جانب سے جاری ہونے والے لیٹر پر ہی ڈپٹی کمشنر نے توثیق کی تھی۔

سوال: جب ملزم کو آپ کے روبرو پیش کیا گیا تو کیا آپ نے اس سے دریافت کیا تھا کہ اسکو پولیس کی بدسلوکی کا نشانہ تو نہیں بنایا گیا؟

جواب: اُس سے یہ دریافت کیا گیا تھا اور ملزم نے جواباً بتایا تھا کہ اسکو پولیس زیادتی کا نشانہ نہیں بنایا گیا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ملزم سے کیا جانے والا یہ سوال اور اسکا جواب ایگزبیٹ زیڈ (اعترافی بیان) میں شامل نہیں ہے۔

سوال: کیا آپ نے ملزم سے اپنا تعارف کرایا تھا کہ آپ فرسٹ کلاس مجسٹریٹ ہیں اور یہ بتایا تھا کہ اگر اس نے اعتراف کیا یا نہیں کیا تو اسکو پولیس تحویل ریمانڈ میں نہیں دیا جائے گا۔

جواب: میں نے اعترافی بیان ریکارڈ کرنے کے اہل فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کے طور پر اپنا تعارف کرایا تھا اور میں نے اسکو یہ بھی بتایا تھا کہ اسکو پولیس تحویل ریمانڈ میں نہیں دیا جائے گا تاہم یہ سوالات اور جوابات مقررہ فارم میں ریکارڈ نہیں کیے گئے تھے۔

(سماعت 13 جولائی 1982 تک ملتوی)

14جولائی 1982

استغاثہ کا گواہ محمد حنیف اے سی ایم

ایگزامینیشن انچیف:

2 اگست 1980 کو میں اے سی ایم حیدر آباد تھا۔ اُس دن صبح تقریباً دس بجے مجھے اے ڈی ایم نے ہدایت کی کہ میں لطیف آباد پولیس اسٹیشن جاؤں اور گھر نمبر 752 بابن شاہ کالونی کی تلاشی کی نگرانی کروں۔ میں نے لطیف آباد پولیس اسٹیشن پر اپنی آمد کی اطلاع کی اور انسپکٹر خلیل باجوہ اور اسکی پولیس پارٹی کے ہمراہ مذکورہ گھر کی تلاشی کیلئے روانہ ہوا۔ گھر باہر سے بند تھا۔ پولیس اہلکار نے تالا توڑا اور ہم اس علاقے کے مقامی مکین محمد ہاشم اور شمس الدین کے ہمراہ گھر کے اندر داخل ہوئے۔ میں نے پولیس پارٹی کے ہمراہ اس گھر کے دو کمروں سے کتابیں، رسائل اور پمفلٹ ہاتھ کیے۔ انسپکٹر خلیل باجوہ نے میری اور دو سویلین مشیران محمد ہاشم اور شمس الدین کی موجودگی میں مشیر نامہ تیار کیا۔ مشیر نامہ عدالت میں پیش کیا گیا، میں اس پر اپنے دستخط کی تصدیق کرتا ہوں۔ مشیر نامہ ایگزبیٹ اے اے طور پر شامل کیا گیا۔ مشیر نامہ میری موجودگی میں مذکورہ گھر کے اندر ٹائپ کیا گیا۔

شفیع محمدی کی جرح 14جولائی 1982

میں ایگزبیٹ اے اے دیکھ رہا ہوں اور اس پر دستخط کی توثیق کرتا ہوں۔ اگرچہ مجھے یاد نہیں ہے کہ مشیر نامہ کس نے تیار کیا تھا البتہ وہ پولیس اہلکار ہی تھا۔ ہم چھاپہ مارے گئے گھر میں چار پانچ گھنٹے رہے تھے۔ میں نے دستخط کرنے سے قبل مشیر نامہ کو غور سے پڑھا تھا اور ایگزبیٹ اے اے میں شامل مندرجات درست ہیں۔ مشیر نامہ میری جانب سے باجوہ نے تحریر کرایا تھا اور میری جانب سے اُس نے جو کچھ تحریر کرایا وہ درست ہے۔ ایگزبیٹ اے اے میں اے ڈی ایم کا ذکر نہیں ہے تاہم یہ ہے کہ ضلعی مجسٹریٹ نے مذکورہ گھر کی تلاشی کی ہدایت جاری کی تھی۔ مجھے اپنے بیان دینے کیلئے گواہی کے خلاصے کے ریکارڈنگ افسر نے بلایا تھا۔ میں گواہی کے خلاصے کے بیان پر اپنے دستخط دیکھ رہا ہوں جو کہ درست ہیں۔ میں نے یہ بیان پڑھا تھا اور اس کو درست جان

کراس پر دستخط کیے تھے۔ عدالت میں موجود بیان (گواہی کا خلاصہ) میں یہ درج نہیں ہے کہ مجھے اے ڈی ایم نے لطیف آباد پولیس اسٹیشن جانے کی ہدایت کی تھی بلکہ اس میں لکھا ہوا ہے کہ مجھے گھر نمبر 752 بابن شاہ کالونی جانے اور تلاشی لینے کی ہدایت کی گئی تھی، جو کہ درست نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ مجھے مشیران کے نام اور مذکورہ گھر کا نمبر یاد نہیں تھا اور میں نے ان کا ایک رقعہ بنایا تھا جس پر میں نے عدالت سے قبل صلاح مشورہ کیا تھا۔ میں نے پولیس کے ہمراہ تلاشی لی تھی، یہ چھاپہ نہیں تھا۔ مجھے اے ڈی ایم مامون خان جمالی نے طلب کیا تھا۔ مجھے انکے دفتر سے زبانی ہدایات ملی تھیں۔ میں نے اس مقدمے کے ضمن میں کبھی بھی ضلعی مجسٹریٹ سے رابطہ نہیں کیا۔ میں نے اے ڈی ایم سے معلومات موصول ہونے کے بعد کوئی ایف آئی آر درج نہیں کی کیونکہ میرے خیال میں اسکی کوئی قانونی ضرورت نہیں تھی۔ ہم نے مذکورہ گھر سے برآمد ہونے والی تمام اشیا کا برآمدگی نامہ/مشیر نامہ میں ذکر کیا ہے۔ اے اے میں ڈائریوں، تصویروں، خطوط، مہروں، سیاہی، پنچنگ مشین کا ذکر ہے تاہم ایگزبیٹ اے اے 1 کی فہرست میں نہیں ہے۔

ایگزبیٹ اے اے 1 مذکورہ گھر سے برآمد ہونے والے دستاویزات کے تفاصیل دیتا ہے تاہم مواد پر تبصرہ اس میں شامل نہیں ہے۔ برآمد شدہ دستاویزات پر کچھ عندیے مل سکتے ہیں، جیسا کہ نمبر شمار 11، جس میں لکھا ہے کہ شاید جام ساقی کا تیار کیا ہوا۔ نمبر شمار 11 ایگزبیٹ اے اے 1 پر میں نے جام ساقی کی دستی تحریر نہیں دیکھی، نہ ہی اس تلاشی سے قبل یا بعد میں میں نے جام ساقی کا کوئی مضمون پڑھا ہے، اس لئے میں کہہ نہیں سکتا کہ مذکورہ بیان جام ساقی کا ہی لکھا ہوا ہے تا وقتیکہ اس ضمن میں کچھ مثبت/ٹھوس اشارے نہ ملیں۔ میرے علم میں نہیں ہے کہ آیا مذکورہ گھر سے برآمد ہونے والی کتابوں پر حکومت کی جانب سے کوئی پابندی عائد کی گئی ہے یا نہیں۔ میں نے ایگزبیٹ اے اے 1 میں درج برآمد شدہ مواد کے مندرجات کا بغور مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اس لئے یہ کہہ نہیں سکتا کہ کس مواد کو حکومت کے خلاف تخریبی سمجھا جائے۔ برآمدگی کے وقت مذکورہ گھر سے بازیاب ہونے والے مواد میں ایسا کوئی مواد میں نے نہیں پڑھا تھا جس کو تخریبی مواد کے زمرے میں لایا جا سکے اگرچہ برآمدگی نامہ مواد کے تخریبی اور قابل اعتراض ہونے کا عندیہ دے رہا ہے۔

میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ پا رہا تھا کیونکہ میں نے وہ مواد پڑھا نہیں تھا۔ برآمد کی گئی اشیا گواہی کے خلاصے کے دوران پیش کی گئیں تاہم اُس وقت ریکارڈ ہونے والے کسی بیان میں اسکا ذکر نہیں ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ تھانے سے جانے والی تلاشی کی ٹیم انسپکٹر خلیل باجوہ، ایک اے ایس آئی، تین چار کانسٹیبلز اور مجھ پر مشتمل تھی۔ پولیس کا تمام عملہ وردی میں تھا۔ تفتیشی اہلکار نے سیکشن 161 سی آر پی سی کے تحت میرا بیان ریکارڈ نہیں کیا تھا۔ میں نے اپنے بیان میں کہیں بھی چھاپے کے دوران ایس ایچ او کی جانب سے ٹائپسٹ کو بلانے کا ذکر نہیں کیا ہے اور میں یہ پہلی مرتبہ عدالت کے روبرو بتا رہا ہوں۔ زیادہ تر کتابیں اردو میں تھیں۔ ہمارے لئے ایگزبیٹ اے اے 1 اردو میں تیار کرنا مشکل نہیں تھا جیسا کہ ہم ایگزبیٹ اے اے میں تحریر کر چکے تھے۔ یہ درست ہے کہ ایگزبیٹ اے اے میں صرف ایک اخبار کا ذکر ہے نہ کہ پانچ کا جو کہ ایگزبیٹ اے اے 1 کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ ایگزبیٹ اے اے اُن 126 اشیا کا ذکر نہیں کرتی جو ایگزبیٹ اے اے 1 میں دکھائی گئی ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ اسکا بھی کوئی ذکر نہیں ہے کہ اے اے 1 کے پانچ اوراق اے اے کا ضمیمہ ہیں۔ دونوں ایگزبیٹس پر اُس ٹائپسٹ کے دستخط نہیں ہیں جس نے ایگزبیٹ اے اے 1 انگریزی میں ٹائپ کیا نہ ہی اُن پولیس اہلکاروں کے دستخط ہیں جو تلاشی کے وقت موجود تھے۔ میں نے نہیں بلکہ خلیل باجوہ نے ٹائپسٹ کو بلایا تھا۔ میں نے ایس ایچ او کو مزید کارروائی کیلئے ایف آئی آر درج کرنے کا حکم نہیں دیا تھا کیونکہ میں نے تمام تر مواد کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ تلاشی کے پورے دورانیے میں، عدالت میں موجود ساتوں ملزمان میں سے نہ تو کوئی اس گھر میں موجود تھا اور نہ ہی اس دوران وہاں آیا تھا۔ میں نے گواہی کے خلاصے اور مشیرنامے میں کبھی نہیں کہا کہ گھر پر باہر سے تالا لگا ہوا تھا اور ہم نے گھر میں داخل ہونے کیلئے تالا توڑا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ مشیرنامہ جائے وقوعہ پر تیار نہیں کیا گیا تھا بلکہ بعد میں پولیس اسٹیشن پر تیار کیا گیا تھا۔ یہ کہنا بھی درست نہیں ہوگا کہ ایگزبیٹ اے اے 1 پر میرے دستخط جائے وقوعہ پر لینے کے بجائے بعدازاں لئے گئے تھے۔

وہاں پر برتن وغیرہ بھی تھے جو ہم نے اپنی تحویل میں نہیں لیے۔ مقدمے سے غیر متعلقہ سازو سامان وہیں گھر پر ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔

15 جولائی 1982

یوسف لغاری کی استغاثہ کے گواہ محمد حنیف سے جرح

مجھے اس مقدمے کے حوالے سے کراچی میں مارے گئے چھاپے کا کوئی علم نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری جانب سے پولیس پارٹی کے ہمراہ لی گئی تلاشی یا چھاپے کے ضمن میں حیدرآباد میں مقدمہ چلایا گیا ہے۔ گھر نمبر 752، بابن شاہ کالونی کی تلاشی کے حوالے سے چلنے والا مقدمہ اس عدالت کے روبرو ہے۔ گھر نمبر 752، بابن شاہ کالونی کی ہماری تلاشی کے دوران کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی۔ میں نے مذکورہ گھر کے مالک سے متعلق کوئی جانچ پڑتال نہیں کی۔ میں نے مذکورہ گھر کے دونوں جانب رہائش پذیر افراد سے متعلق بھی کوئی جانچ پڑتال نہیں کی۔ مشیران شمس الدین اور ہاشم سے میں نے سکونت کے متعلق جانچ پڑتال کی تاہم میں نے ان کا بیان ریکارڈ نہیں کیا۔ ایس ایچ او خلیل باجوہ ہمیں چھاپہ مارے گئے گھر لے گیا تھا۔ مشیران کو پولیس نے اُسی علاقے سے بلایا تھا۔ پولیس اہلکار نے مذکورہ گھر میں میری موجودگی میں مواد کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ مجھے کوئی علم نہیں ہے کہ گھر نمبر 752 بابن شاہ کالونی ایس ایچ او خلیل باجوہ کے بھائی یونس کا ہے۔ میرا بیان انسپکٹر خلیل باجوہ نے ریکارڈ کیا تھا۔ اسی نوعیت کا ایک مقدمہ خصوصی فوجی عدالت نمبر 7، حیدرآباد میں زیر سماعت ہے، جس میں ایک ملزم امداد چانڈیو ہے۔

مجھے ٹائپسٹ کا نام معلوم نہیں اور میں یہ بھی نہیں جانتا کہ اسکو کہاں سے بلایا گیا تھا۔ اے ڈی ایم کے ذریعے ضلعی مجسٹریٹ کے دیئے گئے احکامات سے قبل میرے پاس ریکارڈ پر کوئی چیز نہیں تھی۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ مجنوں خان جمن اے ڈی ایم نہیں تھا بلکہ انکے پاس اے ڈی سی II کا صرف عہدہ تھا۔ اے ڈی ایم کے زبانی احکامات کے علاوہ اور کوئی بھی ریکارڈ/مواد نہیں تھا جو مجھے اس گھر کی تلاشی پر مطمئن کرتا۔ میری حال ہی میں 2 اگست 1980 کو اے سی ایم حیدرآباد کے طور پر ترقی ہوئی تھی۔ مجھے کوئی حد بندی تفویض نہیں ہوئی تھی۔ لطیف آباد پولیس نے مذکورہ گھر کی تلاشی کیلئے کوئی تحریری درخواست نہیں کی تھی۔ میں نے کوئی ریکارڈ یا ڈائری تیار نہیں کی تھی۔ مذکورہ گھر کی تلاشی کے دوران ہمارے ساتھ کوئی فوجی اہلکار نہیں تھا۔ گھر کی تلاشی کیلئے میں

نے سیکشن 100 سی آر پی سی کے تحت ضلعی مجسٹریٹ کے احکامات کی تعمیل کی تھی۔ مذکورہ گھر پر کارروائی مکمل کرنے بعد میری جانب سے کوئی لیٹر یا حکم نہیں دیا گیا تھا، اور تمام تر مواد باجوہ لے گیا تھا۔ مواد کو سربمہر نہیں کیا گیا تھا۔ مواد شاید مذکورہ گھر سے برآمد ہونے والے ٹین کے صندوق اور چادر میں بھرا گیا تھا۔ یہ درست ہے کہ تلاشی کی دوران تیار کی گئی ایگزبیٹ اے اے 1 ظاہر کرتی ہے کہ سرخ پرچم جنوری 1979 کے 29 پرچے برآمد ہوئے تھے۔ ایگزبیٹ ایم-4 میں بھی سرخ پرچم کا ایک پرچہ دکھایا گیا ہے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ ایم 4 والا سرخ پرچم مذکورہ گھر سے برآمد ہونے والے 29 میں سے ایک ہے یا نہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے تلاشی نہیں لی تھی اور اپنے بالا افسران کے زور دینے پر بیان دے رہا ہوں۔

عدالتی سوالات

سوال: گھر نمبر 752 کا سکنہ/ رہائشی کون تھا؟

جواب: میں نے دونوں مشیران سے دریافت کیا تھا تو انہوں نے بتایا تھا کہ کمال وارثی اس گھر کا مکین تھا۔

سوال: کیا آپ نے مشیرنامہ میں مذکورہ گھر سے سکونت اور اس ضمن میں اپنی پوچھ گوچھ کا کوئی ذکر کیا ہے؟

جواب: نہیں! میں نے مشیرنامہ اے اے اور اے اے 1 اور گواہی کے خلاصے میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

26 جولائی 1982

استغاثہ کا گواہ مسعود　　　　　　ایگزامینیشن انچیف:

میں اخبار فروش ہوں اور کراچی کے صدر اور بندر روڈ کے علاقوں میں اخبارات فروخت کرتا ہوں۔ کوئی ڈیڑھ برس قبل ستمبر/ اکتوبر کے مہینے میں یہ وقوعہ پیش آیا جب میں ریگل بس اسٹاپ کے قریب کتابوں کے اسٹال کے مالک شفیع محمود کیلئے کھانا لیکر جاتا تھا۔ دوپہر دو بجے کے قریب دو تین اہلکاروں پر مشتمل ایک پولیس پارٹی کتابوں کے اسٹال پر آئی اور دکان سے ''ماسکو اولمپکس'' اور ''روس کے مسلمان'' نامی کچھ کتابیں اپنے ساتھ لے گئی۔ برآمد کی گئی کتابوں کی تعداد گیارہ سے بارہ سو ہوسکتی ہے۔ میں عدالت کے روبرو ایگزبیٹ پر اپنے دستخط کی شناخت کرسکتا ہوں۔ یہ وہی ہے۔ مجھے جائے وقوعہ پر ایگزبیٹ این 1 پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ رسمی کارروائی مکمل کرنے کے بعد پولیس پارٹی کتابیں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

شبیر، وارثی، امر، پروفیسر، جام: ہم پہلے ہی 5 جولائی 1982 کو درخواست دے چکے ہیں۔

شفیع محمدی کی جرح

میں صبح پانچ بجے سے آٹھ بجے تک صدر اور بندر روڈ کی علاقوں میں اخبارات فروخت کرتا ہوں۔ مجھے کتابوں کی دکان کے مالک شیخ محمود کے گھر کا معلوم ہے، جوکہ B-419/11 ہے جبکہ میرا گھر بھی B-419/11 نارتھ کراچی ہے۔ گھر سے دکان کا فاصلہ تقریباً نو میل ہے۔ اخبارات فروخت کرنے کے بعد میں صبح تقریباً ساڑھے نو بجے گھر واپس آجاتا ہوں۔ میں گیارہ بجے سے بارہ بجے کے درمیان دوپہر کا کھانا کھاتا ہوں۔ ساڑھے بارہ اور ایک بجے کے درمیان شیخ محمود کے گھر سے اسکا کھانا لیتا ہوں۔ مجھے اپنے گھر سے دکان تک پہنچنے میں بمشکل بیس منٹ لگتے ہیں۔ میں ایک اور ڈیڑھ بجے کے درمیان دکان پر پہنچ جاتا ہوں۔ مذکورہ دن میرے دکان پر پہنچنے کے کوئی ایک گھنٹے کے بعد پولیس آئی تھی، جوکہ تقریباً دو بجے کا وقت ہوگا۔ پولیس آدھے گھنٹے کے قریب دکان پر رہی تھی۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ پولیس پارٹی میں سینئر اہلکار کون تھا اور اسکا

عہدہ کیا تھا البتہ جس نے مجھ سے دستخط لیے وہ کانسٹیبل تھا۔ میں نے صرف ایک برآمدگی نامے پر دستخط کیے تھے۔ دکان سے برآمد ہونے والی کتابیں شیخ محمود اور پولیس پارٹی نے مشترکہ طور پر گنتی کی تھیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ دکان سے برآمد ہونے والی کتابیں دو نوعیت کی اور چار سو اور آٹھ سو کی تعداد میں تھیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ دوسرا مشیر کون تھا جس نے برآمدگی نامے پر دستخط کیے تھے۔

میں اس دکان پر گذشتہ سات آٹھ برس سے جا رہا ہوں۔ میں اس دکان کے مالک اور اسکے ملازمین سے واقف ہوں۔ میں نے اس بندے کو کبھی دکان پر نہیں دیکھا۔ کتابوں کو رسی سے باندھا گیا تھا تاہم میری موجودگی میں انکو سربہ مہر نہیں کیا گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ پولیس نے جائے وقوعہ پر ان کتابوں کا مطالعہ کیا تھا یا نہیں۔ وقوعے پر کئی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ محمود کی دکان کے آس پاس کئی دکانیں ہیں اور یہ ایک مصروف بازار ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے برآمدگی نامہ/مشیر نامے پر شیخ محمود کے اصرار پر دستخط کیے تھے۔ اور یہ میری موجودگی میں تیار نہیں ہوا تھا اور میں غلط بیانی پر مبنی بیان دے رہا ہوں۔ میری شیخ محمود سے اچھی دوستی ہے۔ ہمارے خاندانوں کے درمیان بھی قربت ہے۔

27 جولائی 1982

شفیع محمدی کی جرح جاری

پریڈی اسٹریٹ کی فٹ پاتھ پر شیخ محمود کے بک اسٹال کے اردگرد کئی ایک کتابوں کے اسٹال ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ شیخ محمود کا اسٹال موجودہ مارشل لا حکومت نے غیر قانونی تجاوزات کی بنا پر مسمار کر دیا تھا۔ شیخ محمود کا اسٹال اس وقت لکڑی کے کیبن کا ہے نا کہ پکی تعمیرات کا۔ کوئی چار پانچ ماہ قبل تک یہ پکا تھا جو کہ مسمار کر دیا گیا۔ پولیس چھاپے کے وقت اردگرد کی دکانوں میں سے کوئی بھی شیخ محمود کے اسٹال پر نہیں آیا تھا تاہم دکان کے اندر گاہک جمع ہو گئے تھے۔ انجمن اخبار فروشان کا کوئی رکن جائے وقوعہ پر نہیں آیا تھا۔ پولیس اہلکار نے انجمن کے کسی رکن یا کسی قریبی اسٹال سے کسی کو نہیں بلایا تھا۔ پولیس پارٹی دکان پر آئی، تلاشی لی اور کتابیں برآمد

کیں، جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں، دکان کا کوئی گودام نہیں ہے۔ کچھ کتابیں الماریوں میں تھیں تا کہ گاہکوں کی نظر میں رہیں جبکہ باقی فرش پر تھیں۔ یہ میرے علم میں نہیں ہے کہ آیا پولیس پارٹی نے تلاشی کے ضمن میں شیخ محمود کو کوئی تلاشی کا وارنٹ یا کوئی دوسرا کاغذ دکھایا تھا یا نہیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ پولیس اہلکار نے شیخ محمود کو صرف ایک کاغذ دکھایا تھا۔ گواہی کے خلاصے میں میرا بیان درج ہونے کے دوران ریکارڈنگ افسر نے میرے بیان میں ذکر کی گئی دو کتابیں دکھائی تھیں اور میں نے تصدیق کی تھی کہ ان کتابوں کی ایک تعداد دکان سے برآمد کی گئی تھی۔ ایگزبیٹ O، وہ برآمدگی نامہ جس پر میں نے دستخط کیے تھے، مجھے اس بیان درج کرانے کے دوران نہیں دکھایا گیا تھا۔ میں کبھی بھی شیخ محمود کا ملازم نہیں رہا۔ میں اخبارات فروخت کرنے کا اپنا ذاتی کام کرتا ہوں۔ دوسرا مشیر دکان کے ارد گرد کا نہیں تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کون اور کب یہ کتابیں شیخ محمود کو دے گیا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہو گا کہ مجھے اور شیخ محمود کو پولیس اسٹیشن لے جایا گیا تھا اور زبردستی برآمدگی نامے/مشیر نامے پر دستخط کرائے گئے تھے۔

27 جولائی 1982

استغاثہ کا گواہ شمس الدین   ایگزامینیشن انچیف:

میں بابن شاہ کالونی حیدرآباد میں ایک دکاندار ہوں۔ اگست 1980 کے دوران ایک دن میں اپنی دکان پر بیٹھا تھا کہ صبح تقریباً گیارہ بجے ایک سب انسپکٹر اور ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر میری دکان پر آئے، جن کے نام میں نہیں جانتا۔ وہ مجھے گھر نمبر 752 لے گئے جہاں اُنہیں چھاپہ مارنا تھا۔ اس گھر کے باہر کئی ایک اہلکار کھڑے تھے۔ گھر کا تالا توڑا گیا اور ہم گھر کے اندر داخل ہوئے۔ گھر کے ایک کمرے پر تالا لگا ہوا تھا جبکہ بقیہ دو تالے کے بغیر تھے۔ کمرے کا تالا بھی توڑا گیا اور بڑی تعداد میں رسالے، کتابیں اور اخبارات برآمد کی گئیں۔ برآمد شدہ اشیا کمرے میں موجود کمبلوں میں لپیٹی گئیں اور انکو پولیس اپنے ساتھ لے گئی۔ پولیس کارروائی مکمل کی گئی اور برآمدگی نامہ اے اے جائے وقوعہ پر تیار کیا گیا، جس پر میں نے دستخط کیے۔ میں ایگزبیٹ اے اے اور اے اے 1 پر اپنے دستخط شناخت کرسکتا ہوں۔

شفیع محمدی کی جرح

پولیس پارٹی نے کسی میونسپل کونسلر یا کالونی کے کسی معزز شخص کو مشیر کے طور پر بلانے کی بات نہیں کی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایگزبیٹ اے اے کس نے تحریر کیا۔ میں چھاپہ مارنے والی پارٹی کے کسی رکن یا بالخصوص مجسٹریٹ محمد حنیف کو نہیں جانتا، جن کا نام ایگزبیٹ اے اے میں درج ہے۔ میں صرف باجوہ کو جانتا تھا۔ چھاپہ مارنے والی پارٹی کے کسی بھی رکن نے مجھے اپنا تعارف نہیں کرایا تھا۔ برآمد ہونے والے مواد کے تفصیل اُسی گھر میں تحریر/ ٹائپ نہیں کیے گئے تھے۔ برآمد ہونے والا مواد گٹھڑیوں میں باندھا گیا، جس کو پولیس اپنے ساتھ لے گئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ برآمد ہونے والی اشیا پولیس کہاں لے گئی تھی۔

میرے علاوہ اس گھر میں تین چار اور لوگ بھی داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے اُس گھر میں کوئی ایک گھنٹہ گذارا۔ میں نے اس گھر سے برآمد ہونے والا کوئی مواد نہیں پڑھا تھا۔ مجھے جائے وقوعہ پر صرف ایک کاغذ پر دستخط کرنے کیلئے کہا گیا تھا اور اسی واحد مقصد کیلئے اگلے روز ایگزبیٹ اے اے

1 میرے پاس لایا گیا تاہم مجھے یاد نہیں ہے کہ یہ دستخط کیلئے کون لایا تھا۔ برآمد ہونے والا مواد سر بہ مہر نہیں کیا گیا بلکہ گٹھڑیوں میں باندھا گیا تھا۔ چھاپہ مارنے والوں میں سے کسی نے بھی مجھ سے اس گھر کے رہائشیوں سے متعلق کوئی باز پرس نہیں کی تھی۔ مذکورہ گھر میری دکان سے نظر نہیں آتا کیونکہ درمیان میں کچھ بنگلوز ہیں اس لئے میں کہہ نہیں سکتا کہ اس گھر کے اصل مکین کون تھے۔ چھاپے کے دوران عدالت میں موجود ملزمان میں سے کوئی بھی وہاں نہیں تھا۔ میں نے کمال وارثی کو وقوعے سے کوئی ڈیڑھ ماہ قبل اپنی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے اسکو کسی غیر قانونی سرگرمی میں ملوث نہیں دیکھا۔ میں نے اسکو اپنے علاقے میں کچھ مرتبہ دیکھا ہے۔

11 اگست 1982

استغاثہ کا گواہ شفیع سومرو   ایگزامینیشن انچیف:

میں نومبر 1979 سے مارچ 1981 کے دوران پولیس اسٹیشن جامشورو کا ایس ایچ او رہا ہوں۔ میرے پولیس اسٹیشن کے اسسٹنٹ سب انسپکٹر غلام نبی نے 23 ستمبر کو دوپہر سے قبل حیدرآباد کے ہوٹل انڈس سے امرلال کو گرفتار کیا۔ اُس نے گرفتاری کے روز شام یعنی 23 ستمبر 1980 کو ہی ملزم میرے سامنے پیش کیا۔ میں نے مختیارکار اور فرسٹ کلاس مجسٹریٹ، جس کا نام اب مجھے یاد نہیں ہے، کے سامنے ملزم کو پیش کیا۔ میں عدالت میں بیٹھے ہوئے ملزم امرلال کو شناخت کرسکتا ہوں۔ میں نے اُس ملزم امرلال کا 23 سے 27 ستمبر 1980 کے پانچ دنوں کا پولیس ریمانڈ حاصل کیا۔ ریمانڈ کے دو دن بعد، اسکو نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن کراچی منتقل کیا گیا۔ میں یہاں پر فرسٹ کلاس مجسٹریٹ، کوٹری کی جانب سے تاریخ 23 ستمبر 1980 جاری کیا گیا ریمانڈ بشمول مہر لگی ہوئی، پیش کررہا ہوں۔ ایگزبیٹ پی پی

امر، وارثی، شر، پروفیسر اور جام کی جانب سے جرح نہیں کی گئی۔ یوسف لغاری کی جرح

یہ درست ہے کہ میں نے بتایا تھا اور گواہی کے خلاصے میں لکھا ہوا ہے کہ ملزم امرلال کو 27 ستمبر کو گرفتار کیا گیا۔ میرے خیال میں امرلال کو جامشورو پولیس کے جرم نمبر 72/80 کے لئے سیکشن 342 اور 435 کے تحت 21 ستمبر کو گرفتار کیا گیا تھا۔ یہ درست ہے کہ مذکورہ سیکشن کے تحت میں نے 23 ستمبر 1980 سے قبل ملزم امرلال کا ریمانڈ نہیں لیا تھا۔ میں نے ڈی آئی جی حیدرآباد پولیس کی زبانی ہدایات پر ریمانڈ کے دو دن بعد ملزم امرلال کو نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن کے حوالے کردیا تھا۔ میں نے ہائی کورٹ میں مذکورہ ملزم کے حوالے سے کوئی ایف آئی آر یا کوئی دوسرا ریکارڈ پیش نہیں کیا تھا۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ کوٹری پولیس اسٹیشن پر پولیس لاکپ موجود تھا تاہم اسکو میرے اتھارٹی لیٹر کے تحت سٹی پولیس لاکپ میں رکھا گیا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ملزم امرلال کی جامشورو پولیس اسٹیشن پر موجودگی کا کوئی اندراج نہیں ہے۔ میں نے اسکے سٹی لاکپ میں ہونے کے دوران اس سے کوئی تفتیش نہیں کی تھی، نہ ہی اسکو اس دوران لیاقت میڈیکل

ہسپتال یا کمبائنڈ ملٹری ہسپتال لے جایا گیا تھا تاہم اسکو لاکپ کرنے سے قبل ہسپتال لے جایا گیا تھا۔ میں نے نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن کے ایس آئی رب نواز کے ذریعے، جو اسکو نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن لایا تھا، امرلال کی رسید حاصل کی تھی۔ چونکہ میں امرلال کی گرفتاری کے وقت موجود نہیں تھا چنانچہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ملزم کو میجر عبدالغفور، میجر افضل، کرنل خضر حیات اور اے ایس پی اعظم نے گرفتار کیا تھا۔ اے ایس آئی غلام نبی نے ملزم امرلال کی گرفتاری کے وقت مشیر نامہ تیار کیا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ مشیر نامہ نہیں بنایا گیا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں اے ایس پی اعظم خان کے اصرار پر بیان دے رہا ہوں۔

میں اس وقت امرلال کی گرفتاری کا مشیر نامہ عدالت کے روبرو پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ انڈس ہوٹل جہاں سے امرلال کو گرفتار کیا گیا تھا وہ جامشورو کے بجائے حیدرآباد کی حدود میں واقع ہے۔ مجھے حیدرآباد پولیس اسٹیشن پر امرلال کی گرفتاری کے اندراج کا علم نہیں ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ امرلال کے خلاف جامشورو پولیس اسٹیشن پر کوئی ایف آئی آر نہیں تھی جو کہ یہ ظاہر کرے کہ وہ مختلف طبقات اور مذہبی فرقوں کے درمیان منافرت کی حوصلہ افزائی کرنے والے مواد کی اشاعت و تقسیم، مسلح افواج کے خلاف عدم اطمینان پھیلانے، نظریہء پاکستان سے متصادم نقطہء نظر کی تشہیر، سیکشن 124 اے اور 149 کے تحت آنے والے کسی جرم اور مارشل لا ضوابط نمبر 36 کے زمرے میں آنے والے کسی جرم کا مرتکب رہا ہو۔

عدالت کی جانب سے سوالات

سوال: کیا آپ نے اے ایس آئی غلام نبی کو امرلال کی گرفتاری کا حکم دیا تھا؟

جواب: میں نے اے ایس آئی غلام نبی کو امرلال کی گرفتاری کیلئے نہیں بھیجا تھا تاہم اسکو اے ایس پی اعظم خان نے طلب کیا تھا، اس لئے میں نے اسکی رپورٹ کرنے کیلئے کہا۔

سوال: جامشورو پولیس اسٹیشن پر ایف آئی آر نمبر 72/80 کے برتنے کے متعلق کیا بتاؤ گے، جس کے تحت تم نے فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کوٹری سے ریمانڈ حاصل کیا تھا؟

جواب: مجھے مذکورہ بالا مقدمے کے برتے جانے/ خارج کیے جانے کا علم نہیں ہے۔

سوال: کیا آپ ایف آئی آر پیش کر سکتے ہیں؟

جواب: اس وقت تو نہیں البتہ اگلی سماعت پر پیش کر سکتا ہوں۔

سوال: کیا آپ امر لال کو نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن کے سپرد کرنے کی رسید پیش کر سکتے ہیں؟

جواب: اس وقت تو نہیں البتہ اگلی سماعت پر پیش کر سکتا ہوں۔

سوال: کیا آپ مشیر نامہ پیش کر سکتے ہیں؟

جواب: اس وقت تو نہیں البتہ اگلی سماعت پر پیش کر سکتا ہوں۔

سوال: جہاں تک عدالتی ریکارڈ کا تعلق ہے ہمیں ایک لیٹر نمبر جے ایس ایچ 1041 بتاریخ 4 اپریل 1982 بمہ دستخط ایس ایچ او جامشورو موصول ہوا ہے کہ ملزم امر لال کو نہ اسکے پولیس اسٹیشن نے گرفتار کیا تھا اور نہ ہی انہیں اسکی گرفتاری کے وقت برآمد ہونے والی اسکی اشیا اور نقد رقم کا علم ہے۔ جبکہ آپ کا بتانا تھا کہ ملزم امر لال کو جامشورو پولیس اسٹیشن نے گرفتار کیا تھا۔

جواب: ایگزبیٹ بی بی کے طور پر شامل میری جانب سے پیش کی گئی ریمانڈ رپورٹ واضع طور پر نشاندہی کرتی اور ثبوت فراہم کرتی ہے کہ امر لال کو جامشورو پولیس اسٹیشن کی جانب سے گرفتار کیا گیا تھا اور فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کوٹری سے 23 ستمبر کو جامشورو پولیس اسٹیشن نے اس کا ریمانڈ حاصل کیا تھا۔

سوال: کیا معمول کی کارروائی ہے کہ آپ نے ملزم کو ایک دوسرے ضلع کے پولیس اسٹیشن کے سپرد کیا، وہ بھی ڈی آئی جی کی زبانی ہدایات پر اور کیا آپ اپنی پولیس اسٹیشن ڈائری میں ایسا ریکارڈ رکھتے ہیں؟

جواب: جی ہاں یہ معمول کی کارروائی ہے۔ ملزمان کو دیگر اضلاع میں داخل مقدمات کی بنا پر دیگر اضلاح کی پولیس کے سپرد کیا جاتا ہے اور اس ضمن میں احکامات کا ریکارڈ پولیس اسٹیشن کی ڈائری میں درج کیا جاتا ہے۔

سوال: کیا آپ اتھارٹی لیٹر پیش کر سکتے ہیں جس کی بنیاد پر آپ نے امر لال کو نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن کے حوالے کیا؟

جواب: جی ہاں میں پولیس اسٹیشن ڈائری ریکارڈ اگلی سماعت پر پیش کرسکتا ہوں۔

سوال: کیا آپ کوملزم سے گرفتاری کے وقت برآمد ہونے والی کلائی گھڑی اور 165 روپے نقد کا کوئی علم ہے؟

جواب: میں پولیس اسٹیشن کے ریکارڈ اور مال خانے میں تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔

سوال: کیا آپ کو یاد ہے کہ ملزم امر لال کو نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن منتقلی کیلئے مطلوب ڈی آئی جی حیدرآباد کی جانب سے موصول ہونے والی ہدایات میں جرم/مقدمہ نمبر 80 / 72 / 435 / 52 پی پی سی کے علاوہ کسی اور مقدمے/ جرم کا حوالہ دیا گیا تھا؟

جواب: مجھے ہدایات کے تفصیل یاد نہیں ہیں۔ میں نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن منتقلی سے متعلق ہدایات کے متعلق پُر یقین ہوں۔

شفیع سومرو کی جرح 11 آگست 1982 کو مکمل ہوئی۔ اگلی سماعت 15 آگست 1982

16 اگست 1982

شفیع سومرو

میں یہاں پر پولیس اسٹیشن جامشورو میں داخل کی گئی ایف آئی آر کی نقل صفحہ نمبر 20 تاریخ 24 اگست 1980، بک نمبر 559، ایف آئی آر 72/80 پیش کر رہا ہوں۔ ایگزبیٹ سی سی میں یہاں پر پولیس اسٹیشن ڈائری بتاریخ 24 ستمبر 1980، صفحہ نمبر 5، بمعہ دستخط کے بھی پیش کر رہا ہوں جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ڈی آئی جی حیدرآباد کے احکامات پر ملزم امرلال کو نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن منتقل کیا گیا ہے۔ ایگزبیٹ ڈی ڈی گواہ نے ہیڈ کانسٹیبل نذر احمد 5281 کے دستخط کے ساتھ نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن کی 24 ستمبر 1980 کو جاری کی گئی رسید بھی پیش کی، جس میں بتایا گیا ہے کہ ملزم امرلال کو 24 ستمبر 1980 کو سہ پہر ساڑھے چار بجے وصول کیا گیا ہے۔ ایگزبیٹ ای ای

گواہ عدالت کے طلب کرنے پر مشیر نامہ پیش نہیں کر سکا جو کہ پولیس اسٹیشن جامشورو کے ریکارڈ میں ہاتھ نہیں آ سکا ہے۔ گواہ کا کہنا ہے کہ اُس نے پولیس اسٹیشن جامشورو پر مختیار نامہ تلاش کیا تاہم وہ برآمد کی گئی اشیا یعنی کہ 165 روپے نقد اور کلائی کی گھڑی تلاش نہیں کر پایا ہے جن کا ریکارڈ میں کوئی ذکر میسر نہیں ہے۔

17 اگست 1982

یوسف لغاری کی جرح

یہ درست ہے کہ ایگزبیٹ ڈی ڈی مقدمہ نمبر 72/80 کی کیس ڈائری ہے اور وہ بھی ڈائری کے 24 ستمبر 1980 کے حصے کی اور یہ پولیس اسٹیشن جامشورو کی اسٹیشن ڈائری نہیں ہے۔ ملزم امرلال کا ریمانڈ ایگزبیٹ بی بی، جو کہ ایس ایچ او جامشورو نے حاصل کیا مقدمہ نمبر 72/80 کے حوالے سے تھا نہ کہ اس مقدمے کے ضمن میں، جس میں ملزم کو اس عدالت میں مقدمہ زیرِ سماعت ہے۔ کیس ڈائری مقدمے کے تفتیشی اہلکار کی تحریر کردہ ہے اور میں تفتیشی اہلکار تھا۔ مقدمہ نمبر 72/80 کے حوالے سے تفتیش نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن کے سپرد نہیں کی گئی تھی جہاں ملزم کو منتقل کیا گیا تھا۔ ایف آئی آر ایگزبیٹ سی سی ملزم امرلال کے نام کی نشاندہی نہیں کرتی۔ میں

ڈی ڈی اور ای ای کی تین ایگزیبیٹ دیکھ رہا ہوں۔ مقدمہ نمبر 72/80 کیلئے ملزم امر لال کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے جو تا حال پولیس اسٹیشن میں موجود ہو، جس میں بیان درج کرانے اور تفتیش کیلئے ایک بھی گواہ کو نہیں بلایا گیا ہے۔ چونکہ مقدمہ نمبر 72/80 میں کوئی بیان ریکارڈ نہیں ہوا ہے اس لئے پولیس کے پاس ملزم امر لال کے خلاف کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ ملزم امر لال کو 24 ستمبر 1980 کی صبح بھیجا گیا اور وہ اسی دن سہ پہر ساڑھے چار بجے نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن نے وصول کیا۔ سندھ یونیورسٹی کیمپس، انجنیئرنگ یونیورسٹی اور لیاقت میڈیکل کالج پولیس اسٹیشن جامشورو کی حدود میں واقع ہیں۔ کسی بھی ملزم کے خلاف قبل ازیں کوئی قابل گرفت جرم کا مقدمہ درج نہیں ہے۔ جامشورو پولیس اسٹیشن کا پولیس عملہ طلبہ کی تخریبی سرگرمیوں میں شرکت پر نظر رکھتا ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ملزم امر لال اور دیگر کا نام کبھی میری حدود میں کسی تخریبی سرگرمی میں حصہ لینے کے حوالے سے سامنے آیا ہو۔ یونیورسٹی کیمپس میں کئی طلبہ تنظیمیں ہیں، سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن ان میں سے ایک ہے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ مقامی انتظامیہ طلبہ کے مطالبات سے تنگ آ چکی ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ مجھے ملزم امر لال اور ایس این ایس ایف کے دیگر اراکین کو پکڑنے اور انہیں غلط مقدمات میں پھنسانے کی اعلیٰ اختیاری اور مقامی انتظامیہ کی جانب سے ہدایات موصول ہوئی تھیں۔

گواہ اسٹیشن ڈائری پیش کرنے میں ناکام رہا، جیسا کہ پچھلی مرتبہ اس نے کہا تھا تاہم اس نے کیس ڈائری پیش کی۔ گواہ نے یہ بھی بتایا کہ اس نے جامشورو پولیس اسٹیشن ڈائری کی تلاش کی تاہم وہ مل نہیں سکی۔

17 اگست 1982

استغاثہ کا گواہ ملک محمد اشرف   ایگزامنیشن انچیف

میں نارتھ ناظم آباد میں واقع اعوان انٹرنیشنل لمیٹڈ نامی فیکٹری کا مالک ہوں۔ میں درآمد و برآمد کا کام کرتا ہوں۔ کوئی اٹھارہ بیس ماہ قبل میں اپنے کسی ذاتی کام سے نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن پر ڈی ایس پی ممتاز برنی سے ملنے گیا تھا۔ انہوں نے مجھے حکومت مخالف تخریبی سرگرمیوں میں ملوث ایک شخص کے خلاف چھاپہ مارنے کیلئے اپنے ساتھ چلنے کیلئے کہا۔ میں پولیس پارٹی کے ساتھ، ان کی جیپ میں دوپہر بارہ بجے کے قریب الیوسف چیمبرز، فریئر روڈ پہنچا۔ میں چھاپہ مارنے والی ٹیم کے ہمراہ الیوسف چیمبرز کی چھٹی منزل پر پہنچا، جہاں مجھے بدر جمال ابڑو نظر آیا، جو یہاں عدالت میں موجود ہے۔ ڈی ایس پی ممتاز برنی نے اس کے دفتر کی تلاشی لی اور پمفلٹ اور سرخ دائرہ لگے ہوئے کچھ کارڈ برآمد کیے۔ کارڈ کے تفصیل مجھے یاد نہیں ہیں، اس کے علاوہ چیک بک، رجسٹر، فائیلیں بھی بدر ابڑو کے دفتر سے برآمد ہوئیں۔ پولیس نے کارروائی مکمل کی اور میرے دستخط حاصل کیے۔ وہاں پر بدر ابڑو کے ہمراہ ایک دو اور لوگ بھی موجود تھے۔ میں عدالت میں موجود بدر ابڑو کو شناخت کر سکتا ہوں۔ مجھ سے دستخط لیے گئے۔ کاغذ پر برآمد ہونے والی اشیا کے تفصیل درج تھے۔ گواہ نے عدالت کے روبرو ایگزیبیٹ یو پر اپنے دستخط کی شناخت کی۔ پولیس پارٹی نے بدر جمال ابڑو کو انکے دفتر سے گرفتار کیا۔

17 اگست 1982   یوسف لغاری کی جرح

اس مقدمے میں میرا بیان گواہی کے خلاصے میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ یہ درست ہے کہ گواہی کے خلاصے کے اپنے بیان میں میں نے بتایا تھا کہ 4 اکتوبر 1980 کو ایس ڈی پی او ممتاز احمد برنی کی سربراہی میں ایک پولیس پارٹی کے ہمراہ کمرہ نمبر 201 میں واقع ایک دفتر پر چھاپہ مارنے گیا تھا۔

میں نے 4 اکتوبر 1980 کو پولیس اسٹیشن جانے کے اپنے مقصد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، کیونکہ اس کا مجھ سے دریافت نہیں کیا گیا تھا۔ یہ درست ہے کہ اسکو چھاپے کے دوران ہی گرفتار کیا گیا تھا۔ میرے بیٹوں اور ہمارے پڑوسی کے درمیان تلخ کلامی ہوئی تھی اور نارتھ ناظم آباد پولیس

اسٹیشن پر ہمارے خلاف جوابی مقدمہ دائر کیا گیا تھا، میں اُسی مقدمے کے سلسلے میں ممتاز برنی سے ملاقات کرنے گیا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں ممتاز برنی کو 4 اکتوبر 1980 سے قبل جانتا تھا۔ یہ کہنا بھی درست نہیں ہوگا کہ میں پولیس اسٹیشن ڈی ایس پی ممتاز برنی سے مدد اور ہمدردی حاصل کرنے گیا تھا۔ میں وہاں پر پانچ دس منٹ رہا، جس کے بعد مجھے پولیس پارٹی کے ہمراہ چھاپے کے لئے لے جایا گیا۔ میں پولیس اسٹیشن سے اپنی موٹر کار میں گیا تھا۔ مجھے پولیس پارٹی کے ساتھ رہنے کے دوران ممتاز برنی سے مقدمے سے متعلق بات چیت کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ چھاپہ مارنے کیلئے جانے والی پولیس پارٹی ڈی ایس پی ممتاز برنی، انسپکٹر مخدوم حیات اور کچھ دیگر پولیس اہلکار، جن میں سے کچھ سادہ کپڑوں میں ملبوس تھے پر مشتمل تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ڈی ایس پی ممتاز برنی وردی میں تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تو بدر ابڑو کا دفتر دو یا تین کمروں پر مشتمل تھا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ وہاں کوئی تختی بھی لگی ہوئی تھی جو دفتر کی نشاندہی کر رہی ہو۔ اسکے دفتر کے کسی بھی کمرے پر کوئی علامت یا نشان نہیں تھا۔ تلاشی تمام کمروں کی لی گئی تھی۔ جیسے ہی میں چھاپہ مارنے والی ٹیم کے ہمراہ دفتر میں داخل ہوا تو ہاں موجود تمام لوگ ایک جگہ جمع ہو گئے اور میرے لئے یہ طے کرنا مشکل ہو گیا کہ اس سے قبل وہ سب کہاں بیٹھے تھے۔ پولیس نے تمام کمروں کی تلاشی لی اور برآمد کی گئی تمام اشیا ایک جگہ جمع کیں اور مجھے دکھائیں۔ میرے لئے یہ نشاندہی کرنا مشکل ہوگا کہ کون سی چیز کس سے برآمد ہوئی۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ آیا بدر ابڑو سے ذاتی اشیا اور نقدی بھی برآمد کی گئی تھی۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ کون سا رجسٹر، فائل یا دیگر اشیا الماری سے یا کسی اور جگہ سے برآمد ہوئی، کیونکہ برآمدگی کے بعد تمام اشیا کو ایک ہی جگہ جمع کیا گیا تھا۔ چونکہ میں دفتر کے ایک کمرے میں بیٹھا تھا اس لئے کہہ نہیں سکتا کہ پولیس نے مختلف کمروں سے کیا برآمد کیا، تاہم تمام کمروں سے برآمد کی گئی تمام اشیا مجھے اس کمرے میں دکھائی گئیں جہاں میں بیٹھا تھا۔ پولیس پارٹی نے برآمد شدہ اشیا پر کوئی مُہر وغیرہ نہیں ثبت کی۔ برآمد کی گئی اشیا کی گٹھڑی بنائی گئی، جس کو پولیس پارٹی نے سربمہر کیا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ گٹھڑی کے لئے کپڑا کہاں سے حاصل کیا گیا تھا۔ میں ایگزبیٹ یو دیکھ رہا ہوں اور تصدیق کرتا ہوں کہ اس میں کپڑے اور برآمد کی گئی اشیا کو سربمہر

کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ میں بدر ابڑو کے دفتری میز اور اس سے ذاتی طور پر برآمد کی گئی اشیا اور دیگر افراد سے برآمد کی گئی اشیا کی شناخت نہیں کر سکوں گا۔ مجھے برآمد ہونے والے پمفلٹ کا عنوان یاد نہیں ہے تاہم ایک پمفلٹ مجھے پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ برآمد ہونے والے پمفلٹ فل اسکیپ کاغذ کی پیمائش کے تھے اور ہر ایک دو اوراق پر مشتمل تھا۔ مجھے پمفلٹس کی تعداد یاد نہیں ہے تاہم یہ دس سے زیادہ تھے۔ ایگزبیٹ یو میں پمفلٹس کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ ہی یہ ذکر ہے کہ یہ اسکو پڑھ کر سنایا گیا تھا اور اس کے مندرجات تخریبی تھے۔ یہ درست ہے کہ مجھے وہاں پر پڑھنے کیلئے دیا جانے والا پمفلٹ تخریبی مندرجات کا حامل تھا۔ یہ ایگزبیٹ یو میں درج نہیں ہے، جس پر میں نے دستخط کیے تھے۔ میں نے نہ تو جانچ پڑتال کی نہ ہی اشیا کی تصدیق کی کہ یہ ایگزبیٹ یو کے عین مطابق ہیں۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ برآمدگی نامہ / مشیر نامہ کس نے تحریر کیا تھا تاہم مجھے یہ یاد ہے کہ یہ وقوع پر ہی تحریر کیا گیا تھا۔ مجھے دوسرے مشیر کا نام یاد نہیں ہے، جس نے دستخط کیے تھے تاہم وہ کوئی سویلین شخص تھا، جس نے میرے سامنے دستخط کیے تھے۔

جرح 18 اگست 1982 کو جاری رہے گی

(بدر ابڑو کا قلم سے نوٹ: یہ گواہ مخبر ہے جو زیادہ تر بڑھا چڑھا کر گواہی دے رہا ہے)

18 اگست 1982

میں اس مقدمے سے قبل انسپکٹر مخدوم حیات کو نہیں جانتا تھا۔ ڈی ایس پی ممتاز برنی نے مجھے اس دفتر کا قطعی پتہ نہیں بتایا تھا، جہاں چھاپہ مارا جانا تھا۔ ممتاز برنی نے جانچ پڑتال کی کہ چھاپے کے وقت بدر جمال ابڑو کے دفتر میں کون کون موجود تھا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ ان سب سے کیا دریافت کیا گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہمارے نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن واپس پہنچنے کے بعد ملزم کو کہاں لے جایا گیا۔ انسپکٹر مخدوم حیات نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن پر تعینات نہیں تھا۔ گواہی کے خلاصے کے درج ہونے کے دوران تمام ملزمان بشمول بدر جمال موجود تھے اور میرا بیان میجر سہیل نے ریکارڈ کیا تھا۔ میجر سہیل نے تمام ملزمان کو گواہ سے جرح کرنے کیلئے کہا تھا تاہم مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا گیا۔ گواہی کے خلاصے کے دوران بدر جمال ابڑو جس کی میں نے شناخت کی، سمیت تمام ملزمان موجود تھے۔ یہ کہنا درست نہیں کہ اس وقت عدالت میں موجود تمام ساتوں ملزمان

میرے بیان ریکارڈ ہونے کے وقت موجود نہیں تھے اور صرف بدر جمال ابڑو موجود تھا۔ بدر جمال ابڑو کے دفتر سے برآمد ہونے والی اشیا گواہی کے خلاصے کے وقت موجود تھیں تاہم مجھے دکھائی نہیں گئی تھیں۔ اُس وقت برآمد کی گئی اشیا سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس اہلکار کی تحویل میں تھیں۔ اگرچہ میرا بیان میجر سہیل نے ریکارڈ کیا تھا تاہم سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس اہلکار بھی وہاں موجود تھا۔ تمام ملزمان میرے سامنے بیٹھے تھے۔ مجھے اُس کمرے میں داخل ہونے کی اجازت دی گئی جہاں میرا گواہی کا خلاصہ ریکارڈ ہونا تھا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ میرے کمرہء عدالت سے نکلنے کے بعد کس وقت سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس اہلکار وہاں سے گیا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ مذکورہ سادہ کپڑوں میں پولیس اہلکار کو ڈی ایس پی برنی نے بیان کے دوران میری مدد کرنے کی ہدایت کی تھی۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ڈی ایس پی برنی نے مجھے دھمکایا تھا کہ اس کی مرضی کا بیان نہ دینے کی صورت میں مجھے جیل میں ڈالا جائے گا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں چھاپے کے وقت وقوع پر موجود نہیں تھا اور میں نے مشیر نامے پر پولیس اسٹیشن میں دستخط کیے تھے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ گواہی کے خلاصے کے دوران صرف بدر جمال ابڑو موجود تھا جبکہ دیگر ملزمان وہاں نہیں تھے۔ ایگزبیٹ یو میں ملزم کے حلیہ جاتی تفصیل نہیں ہیں۔ یہ درست نہیں ہے کہ میں پولیس اہلکاروں کے زور بار کی بنا پر یہ بیان دے رہا ہوں۔

شفیع محمدی کی جرح

میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا ہے کہ چھاپے کے وقت بدر جمال ابڑو کے دفتر میں بیٹھے ہوئے لوگ عملے کے افراد تھے۔ میں گواہی کے خلاصے میں اپنا بیان دیکھ رہا ہوں اور یہ درست ہے کہ میرے بیان کے بعد یہ لکھا ہوا ہے کہ ملزم بدر جمال ابڑو نے گواہ سے جرح کرنے سے انکار کیا اور باقی ملزمان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ یہ لکھا ہوا ہے کہ ایس ڈی پی او ممتاز برنی نے جائے وقوعہ پر برآمدگی نامہ/مشیر نامہ تیار کیا اور میرے دستخط حاصل کیے۔ الیوسف چیمبرز میں چار پانچ سَو دفاتر ہوں گے اور جس منزل پر بدر جمال ابڑو کا دفتر تھا اس پر بھی کئی دیگر دفاتر تھے۔ چونکہ چھاپہ مارنے کی کارروائی دن میں ہوئی تھی اس لئے کارکنوں اور آنے والے افراد سمیت کئی لوگ اُس وقت وہاں موجود تھے۔

24اگست 1982

استغاثہ کا گواہ خلیل باجوہ ایگزامنیشن انچیف

(اسپیشل برانچ)33اے، فضل ٹاؤن، حیدرآباد۔

میں ایس ایچ او لطیف آباد، حیدرآباد کے طور پر فرائض منصبی ادا کر رہا تھا کہ اے سی ایم حنیف میرے پولیس اسٹیشن آئے اور کہا کہ مجھے ایک خفیہ کام کے سلسلے میں ساتھ جانا ہوگا۔ میں نے پارٹی لی، جس میں ایک اے ایس آئی، جس کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں ہے اور چار پانچ کانسٹیبلز شامل تھے۔ہم ان کی جیپ میں گھر نمبر 752 بابن شاہ کالونی پہنچے، جس پر باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔مجسٹریٹ نے مجھے تالا توڑنے کے لئے کہا، جس کے بعد میں نے دو سویلین شہری محمد ہاشم اور شمس الدین کو بلایا اوران کی موجودگی میں تالا توڑا۔ہم گھر کے اندر داخل ہوئے تو ایک کمرے پر تالا لگا ہوا تھا، جب کہ باقی تین چار کمرے تالے کے بغیر تھے۔ میں نے مشیران کی موجودگی میں کمرے کا تالا توڑا اور اندر داخل ہوا۔اُس کمرے میں انگنت پمفلٹ، کتابیں، رسائل، مہریں، پنچنگ مشین اور دیگر اشیا پڑی تھیں، جو کہ ایگزبیٹ اے اے میں درج ہیں۔اے سی ایم حنیف نے مشیران کی موجودگی میں برآمد ہونے والی اشیا کا مشیر نامہ تیار کیا۔ بعدازاں مجھے ایک ٹائپ رائٹر کا بندوبست کرنے کیلئے کہا گیا، جو کہ میں نے اپنے ایک کانسٹیبل کے ذریعے کیا۔اے سی ایم نے جائے وقوعہ پر ہی برآمد ہونے والی اشیا کی فہرست ٹائپ کی۔ گواہ نے ایگزبیٹ اے اے اور اے اے 1 دیکھنے کے بعد اپنے دستخط کی عدالت کے روبرو تصدیق کی۔ برآمد ہونے والی اشیا کپڑے کے ایک ٹکڑے میں باندھی گئیں اور انہیں اے سی ایم اپنے ساتھ لے گیا، جب کہ پولیس پارٹی واپس اپنے پولیس اسٹیشن آ گئی۔

شفیع محمدی کی جرح

میں نے گواہی کے خلاصے میں بیان دیا تھا۔ یہ درست ہے کہ میں نے گواہی کے خلاصے میں یہ ذکر نہیں کیا تھا کہ گھر پر باہر سے تالا تھا اور مجھے اے سی ایم حنیف نے اسکو توڑنے کی ہدایت کی تھی۔ یہ بھی درست ہے کہ میں نے گواہی کے خلاصے میں یہ نہیں بتایا کہ گھر کے ایک

کمرے پر تالا لگا ہوا تھا اور میں نے یہ تالا اے سی ایم حنیف کے حکم پر توڑا تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ میں نے اپنے بیان میں یہ نہیں بتایا کہ مجھے اے سی ایم حنیف نے ٹائپسٹ بلانے کے لئے کہا تھا اور نہ ہی اُس ٹائپسٹ کا نام یا اس کا پتہ وغیرہ بتایا تھا۔ مذکورہ گھر کے دونوں جانب متصل گھر ہیں۔ میں نے متصل گھر سے مشیر تلاش کیا تھا، تاہم اُس وقت گھر پر کوئی مرد موجود نہیں تھا۔ چونکہ میں نے مشیر نامہ تیار نہیں کیا تھا، اس لئے گھر کا خاکہ نہیں بنایا تھا۔ یہ درست ہے کہ ایگزبیٹ اے اے میں صرف ایک کاغذ کا ذکر ہے۔ یہ مشیر نامہ کہتا ہے کہ اشیا کے تفصیل مشیر نامے کے ساتھ منسلک ہیں۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ ایگزبیٹ اے اے میں درج اشیا میں بالخصوص تصاویر، خطوط، پنچنگ مشین شامل ہیں یا نہیں، تاہم یہ ضرور شامل ہونی چاہئیں۔ میرا پولیس اسٹیشن اے سی ایم حنیف کے دائرہ اختیار میں نہیں تھا۔ میں نے اس چھاپے کیلئے اُن سے کوئی تحریری احکامات نہیں لئے، تاہم میں نے ان کے احکامات کی تعمیل کی، کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ حیدرآباد کے مجسٹریٹ ہیں۔ اپنی پولیس پارٹی کے ہمراہ مجسٹریٹ کی جانب سے اس گھر تک لے جانے سے قبل مجھے خفیہ تفصیل نہیں بتائے گئے تھے۔ جب ہم مذکورہ گھر کے قریب پہنچے تب ہی مجھے معلوم ہوا کہ ہمیں گھر نمبر 752 پر چھاپہ مارنا ہے۔ میں نے چھاپے سے قبل اپنے پولیس اسٹیشن پر کوئی ایف آئی آر داخل نہیں کی تھی، کیونکہ اے سی ایم حنیف نے مجھے کسی جرم کی تفصیل سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ چونکہ برآمد شدہ تمام اشیا اے سی ایم حنیف اپنے ساتھ لے گئے تھے، چنانچہ چھاپے کے بعد بھی کوئی ایف آئی آر درج نہیں کی اور مجھے برآمد ہونے والے مواد کے مندرجات کا بھی علم نہیں تھا۔ برآمد شدہ اشیا چھاپہ مارنے والی ٹیم نے سربہ مہر نہیں کی تھیں۔ پولیس پارٹی، بشمول اے ایس آئی اور چار پانچ کانسٹیبلز کو اس مقدمے میں بیان دینے کیلئے کبھی نہیں بلایا گیا۔ چونکہ میں تفتیشی اہلکار نہیں تھا، اس لئے اس مقدمے میں مذکورہ گھر یا وہاں سے برآمد ہونے والی اشیا سے متعلق میں نے کوئی تفتیش نہیں کی۔ میں نے اس چھاپے کے ضمن میں کسی مجسٹریٹ یا کسی اور بالا اہلکار کی جانب سے کوئی احکامات وصول نہیں کیے، جن کے تحت میرا پولیس اسٹیشن آتا ہو۔ مجھے علم نہیں ہے کہ اے سی ایم حنیف برآمد شدہ اشیا کہاں لے گئے اور نہ ہی مجھے مجسٹریٹ نے یہ بتایا کہ یہ کس ایف آئی آر کے تحت

اور کس ملزم کے خلاف استعمال کی جائیں گی۔ 25 اگست 1982ع

میں گواہی کے خلاصے میں صفحہ نمبر 5 پر اپنا بیان دیکھ رہا ہوں، جس میں یہ کہا گیا ہے کہ برآمد کی جانے والی اشیا انگنت رسائل، کتابوں، سادہ کاغذات، پرنٹنگ مشین، ڈائریوں، خطوط وغیرہ پر مشتمل تھیں، جب کہ ایگزیبیٹ اے اے میں پرنٹنگ مشین کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ میں نے مذکورہ گھر سے برآمد ہونے والا کوئی پمفلٹ، رسالہ وغیرہ نہیں پڑھا، اس لئے میں نے گواہی کے خلاصے کے اپنے بیان اور اس عدالت کے سامنے اپنے بیان میں کہیں یہ نہیں کہا کہ برآمد شدہ اشیا میں تخریبی/ قابل اعتراض مواد بھی تھا۔ میں یہ بھی گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اس کا کوئی علم نہیں ہے کہ آیا ان میں سے کوئی مواد حکومت کی جانب سے پابندی شدہ بھی تھا۔ میری پولیس پارٹی میں سے کسی نے بھی برآمد کیا گیا مواد نہیں پڑھا تھا، نہ ہی یہ مجھے پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ نہ تو اے سی ایم حنیف نے ٹائپسٹ کو مذکورہ گھر پر بلایا تھا اور نہ ہی میں نے اس کا انتظام کیا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ مشیرنامہ پولیس اسٹیشن پر تیار کیا گیا۔ یہ کہنا بھی درست نہیں ہوگا کہ مشیرنامہ میں نے تحریر کیا یا اے سی ایم حنیف کی ہدایات پر میں نے تحریر کرایا۔ ہم اُس گھر میں کوئی دو گھنٹے رہے اور رسمی کارروائی مکمل کی۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں یہ بیان اپنے بالا افسران کے دباؤ یا زور بار کرنے پر دے رہا ہوں۔ یہ کہنا بھی درست نہیں ہوگا کہ میں نے اس بیان میں غلط بیانی سے کام لیا ہے۔

یوسف لغاری کی جرح

میں خصوصی فوجی عدالت نمبر 2، حیدرآباد میں جام ساقی کے خلاف گواہ تھا۔ میں امداد چانڈیو کے مقدمے میں گواہ نہیں ہوں، جن کے خلاف حیدرآباد کی خصوصی فوجی عدالت میں مقدمہ زیرِ سماعت ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں طالب علم رہنماؤں اور سیاسی رہنماؤں کے خلاف تمام تر مقدمات میں گواہ کے طور پیش ہوتا ہوں۔ اس نے رضاکارانہ طور پر بتایا کہ اگر کسی طالب علم یا سیاسی رہنما کے خلاف ان کی حدود میں واقع کسی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا ہے تو وہ گواہ کے طور پر اس میں پیش ہوئے ہوں گے۔

میں ایگزبیٹ ایم اور اے اے 1 دیکھ رہا ہوں اور ایم 1 میں تحریر کی ہوئی کتابیں نمبر شمار 87,75,192,204,210,89,403 وہی ہیں جو ایگزبیٹ اے اے 1 کے نمبر شمار 3,17,19,12,7,18,22,24,40,33 اور 99 پر ہیں۔ میں ایگزبیٹ اے اے 1 دیکھ رہا ہوں اور اس میں شامل تمام تر مواد ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ محمد حنیف کی جانب سے قابل اعتراض قرار دیا گیا ہے اور میں نے اس پر گواہ کے طور پر دستخط کیے ہوئے ہیں چونکہ میں نے اے اے 1 میں ذکر کئے گئے تمام مواد کا جائزہ نہیں لیا اس لئے کہہ نہیں سکتا کہ یہ قابلِ اعتراض مواد تھا۔ ایگزبیٹ اے اے 1 کے نمبر شمار 115 میں 1974 میں سندھ ہاری کمیٹی کی جانب سے شائع کردہ ٹیننسی ایکٹ اور اُسی ایگزبیٹ کے نمبر شمار 125 پر جولائی 1970، اکتوبر 1970 کو جاری ہونے والے پاکستان گزیٹ کو بھی قابلِ اعتراض مواد کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ اُسی اگزبیٹ کے نمبر شمار 106 میں شامل انگریزی میں شایع شدہ کتابوں کو بھی قابلِ اعتراض قرار دیا گیا ہے۔ ایگزبیٹ اے اے 1 کے نمبر شمار 82,74,72,61,54 اور 92 یا تو ادبی کتب ہیں یا تدریسی کتب، جن کیلئے میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں، کیونکہ میں نے ان کا بغور جائزہ نہیں لیا ہے۔ میں اپنے پولیس اسٹیشن کی حدود میں تمام قابلِ گرفت قانون جرائم کا اندراج رکھتا ہوں، چونکہ میں نے چھاپہ مارے جانے والے گھر سے برآمد ہونے والے پمفلٹ، کتب، رسائل پڑھے نہیں ہیں، اس لئے میں نے اس وقوع کو قابلِ گرفت قانون نہیں گردانا اور اس لئے میں نے اپنے طور پر اس ضمن میں کوئی تفتیش/ جانچ پڑتال نہیں کی۔

مجھے اُس کپڑے کی نوعیت واضح نہیں ہے، جس میں برآمد شدہ اشیا باندھی گئی تھیں، نہ ہی میں اس کو واضح کر سکتا ہوں۔ ملزم جام ساقی سیاسی کارکن نہیں بلکہ ایک طالب علم رہنما ہے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ اے سی ایم محمد حنیف برآمد شدہ اشیا/ مواد کہاں لے گئے اور یہ کس طرح رکھا گیا۔ میں نے گواہی کے خلاصے کے دوران مسروقہ سامان دیکھا اور یہاں عدالت میں دیکھ رہا ہوں۔ اگر چھاپہ کسی قابلِ گرفت قانون جرم کے پیشِ نظر مارا گیا تھا تو اس کا اندراج لطیف آباد پولیس اسٹیشن پر ہونا چاہیئے تھا اور اس پر حیدرآباد کی عدالتوں میں مقدمہ چلنا چاہیئے تھا۔ یہ کہنا

درست نہیں ہوگا کہ میں اپنی بالا اختیاریوں کے اصرار پر یہ بیان دے رہا ہوں۔ ایگز بیٹ اے اے 1 کے نمبر شمار 53,40,23 اور 108 میں درستگی / دوہری تحریر میں نے نہیں کی ہے۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں ہے کہ یہ کس نے کی ہے۔ مجھے گواہ کے طور پر شمس الدین کے دستخط کے نیچے 3 اگست کو 2 اگست 1980 میں تبدیل کرنے کی دوہری تحریر/ درستگی سے متعلق بھی معلوم نہیں ہے۔

عدالتی سوالات

سوال: آپ کتنا عرصہ ایس ایچ او لطیف آباد رہے؟

جواب: جنوری 1980 سے جنوری 1981 تک لگ بھگ ایک سال۔

سوال: کیا ایس ایچ او لطیف آباد کے طور پر آپکے دورانیے کے دوران کبھی آپ کے علم میں آیا کہ گھر نمبر 752 بابن شاہ کالونی تخریبی سرگرمیوں کیلئے استعمال ہو رہا تھا۔ اگر ہاں تو پھر آپ نے اس ضمن میں کیا اقدامات کیے؟

جواب: گھر نمبر 752 بابن شاہ کالونی میں کسی تخریبی سرگرمی کا مجھے کوئی علم نہیں تھا، اس لئے میری جانب سے کوئی اقدام نہیں لیا گیا۔ مجھے اس کے متعلق وقوعے کے دن ہی معلوم ہوا اور اس کے بعد میں نے مذکورہ گھر پر نظر رکھنا شروع کی۔

سوال: کیا آپ کو ایگزبیٹ اے اے اور اے اے 1 میں دکھائے گئے مضامین سے ایسا کوئی عندیہ ملا کہ ان کا ملزمان میں سے کسی سے کوئی تعلق ہو، جو اس وقت اس عدالت میں موجود ہیں؟

جواب: جہاں تک تعلق کا سوال ہے تو احمد کمال وارثی اس گھر میں رہتا رہا ہے، چنانچہ برآمد شدہ مواد اس کا ہے۔ جہاں تک ان ایگزبیٹس کا تعلق ہے تو میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا، تاہم چونکہ وہ اس گھر کا مکین تھا اس لئے ایگزبیٹ اے اے اور اے اے 1 میں دکھایا گیا برآمد شدہ مواد اُسی کا ہے۔

سوال: کیا ایس ایچ او لطیف آباد کے طور پر آپ نے جانچ پڑتال کی کہ گھر نمبر 752 بابن شاہ کالونی کا مکین کون تھا؟

جواب: ایس ایچ او کے طور پر میں نے علاقے کے لوگوں سے مذکورہ گھر کے مکینوں کا دریافت کیا

اور یہ تصدیق ہوئی کہ احمد کمال وارثی اس گھر کا مکین تھا۔

وکیلِ صفائی کے عدالت کے ذریعے پوچھے گئے سوالات

سوال: کیا آپ اُس مخصوص شخص کا نام بتا سکتے ہیں جس نے تصدیق کی تھی کہ احمد کمال وارثی اس گھر کا مکین تھا؟

جواب: نہیں۔

سوال: کیا مذکورہ گھر کے مکین طور پر سامنے آنے والے نام والا احمد کمال وارثی وہی شخص ہے جو اس وقت عدالت میں موجود ہے؟

جواب: جی ہاں، یہ وہی ملزم ہے، جو اس وقت عدالت میں موجود ہے، ماضی کے طالب علم رہنما احمد کمال وارثی کو کراچی پولیس نے گرفتار کیا تھا۔ میں نے ایس ایچ او لطیف آباد کے طور پر کمال وارثی کو کبھی نہیں دیکھا، میں نے صرف اندازہ لگایا کہ کراچی پولیس کی جانب سے گرفتار کیا گیا کمال وارثی وہی شخص ہے۔

سوال: ایک طالب علم رہنما احمد کمال وارثی ملک سے فرار ہوگیا، جب کہ دوسرا عدالت میں موجود ہے، کیا آپ انہیں ملزم کے طور پر شناخت کر سکتے ہیں؟

جواب: میں احمد کمال وارثی کے متعلق پُر یقین ہوں، وہ عدالت میں موجود ہے۔

سوال: کیا عدالت میں موجود احمد کمال وارثی کراچی کا رہائشی ہے؟

جواب: میں کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن چھاپے کے وقت وہ گھر نمبر 752 بابن شاہ کالونی کا مکین تھا۔

نوٹ: بوجہ بیماری پروفیسر جمال نقوی کو مقدمے سے علیحدہ کر دیا گیا

اگیزامینیشن انچیف 20 نومبر 1982

استغاثہ کا گواہ ممتاز برنی سکنہ 143 - کیو، پی ای سی ایچ ایس، کراچی

میں مارچ 1980 تک ایس ڈی پی او نارتھ ناظم آباد تعینات تھا۔ 11 اکتوبر 1980 کو مجھے ایس پی لیاقت آباد ڈویژن نے ایف آئی آر 236/80 ناظم آباد کی تفتیش کرنے کی ہدایت کی۔ میں اگیزبیٹ ایم دیکھ رہا ہوں جو بالکل درست ہے۔ امرلال جس کی میں عدالت میں شناخت کر رہا ہوں، کو ایس ایچ او نارتھ ناظم پولیس اسٹیشن نے گرفتار کیا تھا اور میں نے ناظم آباد پولیس اسٹیشن پر تفتیش کی۔ ایس ایچ او منگھو پیر مخدوم حیات نے ملزم امرلال کو اے سی ایم سرور کے روبرو سیکشن 164 سی آر پی سی کے تحت اعترافی بیان کے لئے پیش کیا۔ مجھے اے سی ایم کے سامنے ملزم کے پیش ہونے کی تاریخ یاد نہیں ہے۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ شبیر شر نے سیکشن 164 سی آر پی سی کے تحت اپنے بیان میں اعتراف کیا ہے کہ بدر جمال ابڑو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی مالی معاونت کر رہا تھا۔ میں نے ایس ایچ او مخدوم حیات، مشیر ملک اشرف اور کانسٹیبل کے ہمراہ الیوسف چیمبرز شاہراہ لیاقت میں واقع بدر ابڑو کے دفتر پر چھاپہ مارا۔ چھاپے کی تاریخ مجھے یاد نہیں ہے۔ ہم جائے وقوعہ پر سرکاری گاڑی میں گئے تھے۔ اسکا دفتر پانچویں منزل پر تھا جس کا نمبر مجھے یاد نہیں ہے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ بدر جمال ابڑو عرفہ انٹر پرائیز نامی ٹریولنگ ایجنسی چلا رہے تھے۔ اس چھاپے سے قبل میں ملزم بدر جمال ابڑو کو نہیں جانتا تھا۔ میں اُس کے دفتر میں داخل ہوا اور اُس سے اسکی شناخت دریافت کی (ملزم کے شناخت)۔ ایک کے بعد ایک وہاں پر دو کمرے تھے اور ملزم بدر دوسرے کمرے میں موجود تھا۔ اسکے دو کمروں کے دفتر میں بدر جمال کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں تھا۔ میں وردی میں تھا اور میں نے بدر کو اپنے چھاپے کا مقصد واضح کیا۔ میں نے ایس ایچ او مخدوم کے ہمراہ چھاپے مارنے والی ٹیم کی موجودگی میں تلاشی لی اور میں نے برآمدگی/مشیر نامہ جائے وقوعہ پر تیار کیا۔ میں اگیزبیٹ یو دیکھ رہا ہوں جو کہ درست ہے، جس پر میرے دستخط ہیں۔ میں نے برآمدگی/مشیر نامے پر دو مشیران مخدوم حیات اور ملک اشرف کے دستخط

حاصل کیے۔ بدر جمال ابڑو کو برآمد شدہ اشیا کے ہمراہ منگھو پیر پولیس اسٹیشن لایا گیا۔ میں ملزم بدر کو شناخت کر سکتا ہوں جو کہ عدالت میں بیٹھے ہیں۔ میں ایس ایچ او مخدوم حیات کے ہمراہ 1981 میں، تاریخ اور مہینہ مجھے یاد نہیں ہیں، ایف آئی آر 236/80 کے تحت ملزم جام ساقی کی گرفتاری کیلئے حیدرآباد جیل گیا تھا۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ جیل سے ملاقات کی اور نہ صرف ان سے جام ساقی کی ملاقات کی اجازت طلب کی بلکہ اپنی آمد کے مقصد سے بھی انہیں آگاہ کیا۔ میں نے ایس ایچ او مخدوم حیات کی موجودگی میں سیکشن 161 کے تحت بیان حاصل کیا۔ جبار خٹک، نرنجن کمار اور (امام علی) نازش بھی اس مقدمے کی تفتیش میں مطلوب ہیں، جن کی گرفتاری کی کوشش جاری ہیں۔ سابقہ تفتیشی اہلکار کی جانب سے برآمد کی گئی کیس پراپرٹی کا میں نے اپنے دفتر میں بغور جائزہ لیا۔ چار دیگر ملزمان کمال وارثی، پروفیسر جمال نقوی، شبیر شر اور چوتھے ملزم کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں آرہا ہے، ایک اور پولیس اہلکار نے گرفتار کیے تھے۔ تمام ملزمان سے تفتیش مکمل کرنے کے بعد میں نے چالان تیار کیا۔ میں نے چارج شیٹ 230/80 بتاریخ 17 دسمبر 1980 تیار کی۔ یہاں پر چالان پیش کر رہا ہوں۔ عدالت نے اصل چالان کا معائنہ کیا اور ایگزبیٹ ایف ایف کے طور پر شامل کیا۔

23 نومبر 1982

ممتاز بر نی استغاثہ کا گواہ نمبر 24

یوسف لغاری کی جرح

مجھے مقدمے کی فائل سمیت 11 اکتوبر 1980ء کو تفتیشی اہلکار مقرر کیا گیا۔ مجھے تاریخ اور مہینہ یاد نہیں ہیں جب میں نے چالان عدالت کو ارسال کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ تاریخ 17 دسمبر 1980ء کو چارج شیٹ چالان خصوصی فوجی عدالت نمبر 1 کو بھیجا گیا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں حقیقی تفتیشی اہلکار نہیں تھا اور کوئی اور پردے کی پیچھے تفتیشی اہلکار تھا۔ میں نے ملزم بدر جمال ابڑو، امر لال اور جام ساقی کو گرفتار کیا جبکہ باقی تینوں ملزمان کمال وارثی، سہیل سانگی اور غلام شبیر شر میری تحویل میں نہیں تھے۔ (اس نے رضا کارانہ طور پر شامل کیا کہ) ملزم جام ساقی حیدرآباد

میں عدالتی تحویل میں تھا جب میں نے اس سے تفتیش کی تھی۔ملزم بدر جمال اور امر لال عدالتی تحویل میں لیے جانے تک میری تحویل میں تھے۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ امر لال اور بدر ابڑو درست اختیاری سے ریمانڈ حاصل کیے بغیر پولیس کی تحویل میں تھے۔

میں 11 اکتوبر 1980ء سے مرکزی تفتیشی اہلکار تھا اور ایس ایچ او مخدوم حیات اس مقدمے میں میری ہمکاری کرر ہے تھے۔ میں نے ملزم سہیل سانگی، احمد کمال وارثی اور غلام شبیر شر کے حوالے سے بیانات ریکارڈ نہیں کیے۔ مجھ سے قبل ایس ایچ او صفدر بھٹی نے تفتیش کی تھی۔ نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن کا ایس ایچ او صفدر بھٹی میرا ایک ماتحت اہلکار تھا۔ میں تفتیشی اہلکار کے طور پر ایس ایچ او صفدر بھٹی کی جانب سے کی گئی تفتیش کی تصدیق/توثیق کرتا ہوں۔ اپنی تفتیش کے دوران اُس نے نہ صرف ملزمان کے ریمانڈ حاصل کیے بلکہ سیکشن 164 سی آر پی سی کے تحت انکے بیانات بھی ریکارڈ کیے۔

میں نے سرسری سماعت کی فوجی عدالت کے سربراہ کی جانب سے ایس ایچ او صفدر بھٹی کی تفتیش کی تصدیق سے قبل شروعات نہیں کی۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے اسکی جانب سے کی گئی تفتیش کی توثیق/تصدیق نہیں کی۔

میں نے گواہی کے خلاصے میں یہ نہیں کہا تھا کہ بدر جمال ابڑو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی مالی معاونت کرتے تھے جبکہ اپنے ایگزامینیشن انچیف میں، میں نے یہ کہا ہے۔ میں ایگزبیٹ آر دیکھ رہا ہوں (ملزم غلام شبیر شر کا اعترافی بیان) جس میں ایسا کوئی اعتراف نہیں ہے کہ بدر جمال ابڑو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی مالی معاونت کرتے رہے ہیں۔ میں نے بدر جمال ابڑو کو اعترافی بیان کیلئے عدالت کے روبرو پیش کیا تاہم اُس نے اعترافی بیان دینے سے انکار کر دیا تھا۔ تفتیشی اہلکار کے طور پر میری معیاد کے دوران آئی ایس آئی/فوج سے تعلق رکھنے والا کوئی اہلکار تفتیش کیلئے نہیں آیا تھا۔ملزم امر لال اور بدر ابڑو کو کبھی بھی فوجی تشدد مراکز میں نہیں رکھا گیا تھا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ حیدر آباد جیل میں جام ساقی سے میری تفتیش کے دوران کوئی تیسرا شخص بھی موجود ہوتا تھا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ حیدر آباد جیل میں میری تفتیش کا کوئی اندراج کیا گیا ہے یا

نہیں۔ میں نے اپنی تفتیش کے دوران استغاثہ کے کسی گواہ کا بیان ریکارڈ نہیں کیا تاہم اس ضمن میں مجھے صفدر بھٹی نے تفتیشی فائل حوالے کی تھی۔ مقدمے کی فائل سے مجھے صرف سب انسپکٹر اسلم نور کا بیان ہی مل سکا تھا۔

سماعت 25 نومبر 1982ء تک ملتوی۔

25 نومبر 1982 ممتاز برنی سے یوسف لغاری کی جرح

مقدمے کی فائل میں سب انسپکٹر امام بخش، اے سی ایم حنیف، اے سی ایم محمد رمضان لغاری، انسپکٹر شفیع سومرو، اشفاق زمان، محمد اشفاق، پروفیسر سکندر خان، سعید شاہ، پولیس کانسٹیبل نیاز، اسسٹنٹ سب انسپکٹر غلام نبی، میجر طفیل اور سب انسپکٹر ظفر اقبال کا کوئی بیان نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس نے سیکشن 161 کے تحت شمس الدین، ایس ایچ او خلیل بیگ اور ہاشم کے بیانات ریکارڈ کیے تھے، کیونکہ میں دستخط شناخت کرنے سے قاصر ہوں۔

جب میں نے بدر ابڑو کے دفتر پر چھاپہ مارا تھا تو میں نے اسکے عملے، چپراسی، کلرک، مہمانوں اور گاہکوں کے بیانات ریکارڈ نہیں کیے تھے۔ ملزم بدر جمال ابڑو کیلئے سیکشن 161 سی آر پی سی کے تحت کسی گواہ کا بیان ریکارڈ نہیں کیا گیا اور گواہی کے خلاصے نے کوئی عندیہ نہیں دیا کہ وہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا رکن ہے یا اس کیلئے کام کررہا ہے۔ یہی صورتحال دیگر ملزمان کی ہے جن کیلئے کسی گواہ نے یہ نہیں کہا کہ وہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے رکن ہیں۔ ملزم بدر ابڑو شاعر ہیں تاہم مجھے نہیں معلوم کہ وہ سنگتراش بھی ہیں۔ ملزم بدر ابڑو ایک ریکروٹنگ ایجنٹ ہیں۔ یہ درست ہے کہ ملزم غلام شبیر کئی جگہوں پر کام کر چکے ہیں اور وہ بدر جمال ابڑو کے پاس بھی ملازم رہے ہیں۔ میرے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے جس سے ثابت کیا جا سکے کہ بدر جمال ابڑو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی مالی معاونت کرتے رہے ہیں۔

دو تفتیشی ٹیمیں تھیں، جن میں سے ایک میری تھی۔ چارج شیٹ ایگزبیٹ ایف ایف جس پر ہم نے دستخط کیے، 17 دسمبر 1980 کو تیار کی گئی۔ میں کہہ نہیں سکتا ہوں کہ ملزمان کس کی تحویل میں تھے اور کس حال میں تھے۔ انکو تحویل میں لیے جانے کی تاریخ سے لیکر میرے سپرد کیے جانے

تک، میں صرف ملزم امر لال اور بدر جمال ابڑو سے متعلق ہی کہہ سکتا ہوں جو کہ پولیس کی تحویل میں تھے جبکہ جام عدالتی لاکپ (جیل) میں تھے۔ یہ درست ہے کہ ملزم جام ساقی اس مقدمے کے وقوع کی تاریخ سے قبل ایک برس سے جیل کی تحویل میں تھے۔ یہ درست ہے کہ ملزم جام ساقی نے جیل تحویل میں ہونے کے دوران ایسا کوئی مواد شائع نہیں کیا۔ یہ درست ہے کہ دوستوں/ رشتہ داروں سے ملاقات جیل سپرنٹنڈنٹ کی اجازت سے ہوتی ہے اور انکے نام رجسٹر میں درج کیے جاتے ہیں۔ میں نے ریکارڈ میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ جیل انتظامیہ سے فراہم کردہ ریکارڈ سے مجھے ایسا کوئی عندیہ نہیں ملا کہ ملزمان میں سے کسی نے جام ساقی سے ملاقات کی درخواست کی ہو۔ میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اسٹینسلز، سائیکلو اسٹائل مشین اور کاغذ کہاں سے حاصل کیے گئے تاہم میں یہ گوش گذار کرتا ہوں کہ یہ اشیا احمد کمال وارثی اور غلام شبیر کی موجودگی میں اس گھر سے برآمد ہوئی تھیں جہاں سے وہ گرفتار کیے گئے تھے۔

میں نے اس یقین دہانی کیلئے چھ میں سے کسی بھی ملزم کی تحریر ماہر تحریر شناسی کو نہیں بھیجی کہ برآمد ہونے والے اسٹینسل پر کس کی تحریر تھی اور نہ ہی میں نے برآمد ہونے والے ٹائپ رائٹر کی نوعیت کا تعین کیا کہ املا کی یقین دہانی ہو سکے۔ مجھے نہیں معلوم کہ سابقہ تفتیشی اہلکار نے اس ضمن میں کوئی کوشش کی تھی یا نہیں۔ دستی تحریر اور ٹائپ رائیٹر پر ٹائپ کیا گیا مواد اس مقدمے کے ریکارڈ پر موجود ہیں۔

ایف آئی آر ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی ہدایت پر داخل کی گئی تھی۔ یہ درست ہے کہ ایگزبیٹ ایف ایف میں یہ لکھا ہوا ہے کہ اس مقدمے کے ملزمان کو مارشل لا انتظامیہ کی تحویل میں رکھا گیا تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ ایگزبیٹ ایف ایف میں درج ہے کہ ملزم نذیر عباسی کی مارشل لا انتظامیہ کی تحویل کے دوران موت واقع ہوگئی تھی۔ تمام تر برآمد شدہ اشیا ایس ایچ او انسپکٹر صفدر بھٹی نے میرے حوالے کی تھیں۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ آیا میں نے بدر ابڑو کے دفتر سے برآمد ہونے والی اشیا کو سربہ مہر کیا تھا یا نہیں؟

میں نے چیک بکس، اکاؤنٹ بکس اور روزنامہ ہلال پاکستان کی صورت میں برآمد کی گئی

اشیا میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں دیکھی۔ میں نے تمام تر برآمد کی گئی اشیا انسپکٹر مخدوم حیات کے سپرد کیں۔ میں ملک محمد اشرف کو مشیر کے طور پر چھاپہ مارنے والی ٹیم کے ساتھ لے گیا تھا۔ میں اس مقدمے سے قبل انکو نہیں جانتا تھا۔ وہ اپنے بیٹوں کے حوالے سے میرے دفتر نہیں آیا تھا۔ میں نے اُسکو اپنے دفتر نہیں بلایا تھا۔ جب میں اپنے دفتر سے باہر آیا تو اردگرد کا جائزہ لینے کی بعد میں نے اسکو منتخب کیا کیونکہ وہ ایک معزز شخص نظر آ رہے تھے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ وہ میرے دوست ہیں اور اپنے بیٹے کی مقدمے کے سلسلے میں مجھ سے ملنے آئے تھے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ مختلف برآمدگی ناموں میں دکھائی گئی اشیا صفدر بھٹی نے میرے حوالے نہیں کی تھیں اور کچھ اشیا گم ہیں یا کچھ اشیا میں نے شامل کی ہیں۔ یہ درست ہے کہ میں نے امداد چانڈیو، شیر محمد منگریو اور محمد خان سولنگی سے تفتیش کی تھی۔ یہ درست ہے کہ میں تمام مقدمات کے حوالے سے مقدمے کی ڈائری تیار کرتا ہوں۔ تفتیش، چالان، گرفتاری وغیرہ کی ڈائری میں مذکورہ بالا تینوں ملزمان کے نام شامل نہیں ہیں۔ یہ درست نہیں ہے کہ پیار علی الانا کو بھی اس مقدمے میں گرفتار کیا گیا تھا۔ میں نے بلدیہ پولیس اسٹیشن میں تفتیش کی تھی۔ میں سب انسپکٹر ظفر اقبال کو نہیں جانتا اور نہ ہی انہوں نے اس مقدمے کے سلسلے میں مجھ سے کوئی رابطہ کیا ہے۔ میں نے دیگر پولیس اہلکاروں کی جانب سے مارے گئے چھاپوں کے مشیران کے بیان نہیں لیے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے بدر جمال ابڑو کو اس لئے گرفتار کیا کہ ملزم غلام شبیر انکے ملازم رہے ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے بدر جمال ابڑو کے خلاف چالان تیار کیا۔ یہ درست نہیں ہے کہ تمام سیاسی قیدیوں کو بلدیہ پولیس اسٹیشن پر رکھ کر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ یہ درست نہیں ہے کہ اس مقدمے میں ماخوذ چھ ملزمان کو بلدیہ پولیس اسٹیشن پر میں نے تشدد کا نشانہ بنایا۔ میں بدر جمال اور امر لال کو ریمانڈ حاصل کرنے کیلئے ایم پی اے ہاسٹل لے گیا تھا۔ میں میجر سلیم کو نہیں جانتا۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میرے بالا افسران نے اس مقدمے کے سلسلے میں مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ میرے علاوہ سب انسپکٹر مخدوم حیات اور انسپکٹر صفدر بھٹی نے اس مقدمے میں تفتیش کی ہے اور کسی نے نہیں۔ یہ کہنا درست نہیں کہ میں نے یہ چالان مارشل لا انتظامیہ کی ہدایات پر تیار کیے۔

27نومبر1982

شفیع محمدی کی جرح

مجھے ایس ایچ او صفدر بھٹی سے اس مقدمے کی تفتیش سپرد ہونے سے قبل تفتیشی اہلکاروں کے نام معلوم نہیں ہیں۔ میں نے ایس ایچ او صفدر بھٹی کی جانب سے کی گئی تفتیش کو آگے بڑھایا اور سابقہ تفتیشی اہلکار کی جانب سے فراہم کردہ بنیادوں پر ہی مقدمے کو آگے بڑھایا۔ ملزم غلام شبیر کا سیکشن 164 سی آر پی سی کے تحت بیان میرے تفتیشی اہلکار بننے سے قبل ہی ریکارڈ ہو چکا تھا۔ مجھے ملزم غلام شبیر کے مذکورہ بیان کے مندرجات کا علم نہیں ہے کیونکہ یہ تفتیشی اہلکار نے میرے حوالے نہیں کیا تھا۔ میں نے پولیس اہلکاروں کی جانب سے فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر ملزم بدر جمال ابڑو کو گرفتار نہیں کیا بلکہ اسکو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی مالی معاونت کرنے کے الزام میں گرفتار کیا تھا کیونکہ اُس کی عرفہ انٹر پرائیزز کی فائیلیں سرخ پرچم اور ہلچل جیسے تخریبی مواد کے ساتھ پاکستان کوارٹرس میں گھر سے برآمد ہوئی تھیں۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ ملزم بدر ابڑو کے دفتر سے فائلوں کے علاوہ پاکستان کوارٹرس سے برآمد ہونے والے ہلچل یا سرخ پرچم کے کسی مضمون کا کوئی مسودہ یا کاپی یا فوٹو کاپی نہیں ملی۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں عدالت میں موجود چھ ملزمان کے خلاف مارشل لا انتظامیہ کے اصرار پر بول رہا ہوں۔

(شفیع محمدی کی جرح مکمل)

(احمد کمال وارثی، غلام شبیر شر، امرلال اور جام ساقی کی جانب سے جرح نہیں کی گئی)

6دسمبر1982

عدالتی سوالات

سوال: کیا آپ ایس پی لیاقت آباد کا تحریری حکم نامہ پیش کر سکتے ہیں جس میں انہوں نے آپ کو مقدمے کی تفتیش کرنے کیلئے کہا ہو اور یہ کہ تفتیشی ٹیم کے اراکین کون تھے؟

جواب: جی ہاں، اگلی سماعت پر یہ پیش کر دوں گا کیونکہ اس وقت موجود نہیں ہے۔

سوال: کیا الیوسف چیمبرز نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن کی حدود میں واقع ہے؟

جواب: نہیں۔
سوال: کیا آپ نے الیوسف چیمبرز میں چھاپے سے متعلق پولیس اسٹیشن کی ڈائری میں کوئی اندراج کیا تھا؟

جواب: مجھے یاد نہیں ہے تاہم متعلقہ پولیس اسٹیشن (میٹھادر پولیس اسٹیشن) کا ریکارڈ دیکھ کر حتمی طور پر کچھ کہہ سکوں گا اور اگر ایسا کوئی ریکارڈ ملا تو اگلی سماعت پر پیش کردوں گا۔

سوال: ملک اشرف کو پولیس اسٹیشن سے خاص طور پر کیوں لے جایا گیا جبکہ وہ کوئی ویران جگہ تو نہیں تھی؟

جواب: چونکہ جائے وقوعے پر گواہ حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے، اس لئے میں ملک اشرف کو چھاپہ مارنے والی ٹیم کے ہمراہ لے گیا تھا۔

سوال: تفتیشی ٹیم کے رکن ایس ایچ او مخدوم حیات کو بدرابڑو کے دفتر پر چھاپے کا مشیر کیوں بنایا گیا؟

جواب: اگر جائے وقوعہ پر کوئی مشیر میسر نہ ہو تو ہم چھاپہ مارنے والی ٹیم میں سے کسی ایک کو مشیر بنالیتے ہیں۔

سوال: کیا آپ نے جائے وقوعہ پر کوئی سویلین مشیر تلاش کرنے کی کوشش کی تھی؟

جواب: چونکہ یہ ایک تجارتی عمارت تھی اس لئے کوئی بھی سویلین مشیر بننے کو تیار نہیں تھا چنانچہ میں نے مخدوم حیات کو مشیر بنالیا۔

سوال: مشیر نامہ ایگزبیٹ یو کی رو سے بدرابڑو کے دفتر سے کون سا مجرمانہ/تخریب کارانہ مواد برآمد ہوا تھا؟

جواب: ایگزبیٹ یو کے نمبر شمار (4)6 میں ذکر کیے گئے چار کارڈ پیش کررہا ہوں جس میں ایک شخص کو کوڑے مارتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہ کارڈ پاکستان فیڈرل یونین آف اسٹوڈنٹس کی جانب سے شائع کیا گیا ہے۔ عدالت نے کارڈوں کا معائنہ کیا اور ایگزبیٹ جی جی کے طور پر شامل کیا۔

سوال: آپ نے کس طرح اخذ کیا کہ بدر ابڑو کا جام ساقی سے تعلق ہے؟

جواب: پاکستان کوارٹرس اور پیپلز کالونی میں چھاپے مارے گئے گھروں سے برآمد ہونے والے تخریبی مواد کی جام ساقی اور دیگر مالی معاونت کرتے تھے جبکہ پاکستان کوارٹرس کے گھر سے ملزم بدر ابڑو سے متعلق کچھ فائلیں بھی برآمد ہوئیں۔ عدالت کے اطمینان کیلئے ایگزبیٹ ایم 3 کے نمبر شمار 1 میں ذکر کی گئی کچھ فائلیں پیش کر رہا ہوں۔ عدالت نے فائلوں کا جائزہ لینے کے بعد گواہ کو واپس کر دیں۔

سوال: ایگزبیٹ یو کے نمبر شمار 6 میں شامل چار کارڈز میں ایک شخص کو کوڑے لگتے ہوئے دکھایا گیا ہے، کیا آپ ان کارڈوں کے پیچھے مقصد بیان کر سکتے ہیں کیونکہ ان کو آپ نے ملزم بدر ابڑو کے خلاف تخریبی مواد کے طور پر لیا ہے؟

جواب: ان کارڈوں کے پیچھے مقصد یہ ہے کہ پاکستان میں انصاف ناپید ہے اور کارڈ پر سرخ دائرہ ظاہر کرتا ہے کہ کوڑے لگنے والا شخص کمیونسٹ بلاک سے مدد طلب کر رہا ہے۔

سوال: کیا ان کارڈوں کی اشاعت پر کوئی پابندی عائد تھی، اگر تھی تو کیا ان کے ناشر پاکستان یونین آف اسٹوڈنٹس کے خلاف کوئی کارروائی کی گئی؟

جواب: جی ہاں۔ ایسے کارڈوں کی اشاعت پر پابندی ہے تاہم مجھے یاد نہیں ہے کہ ان کے ناشر کے خلاف کوئی کارروائی کی گئی تھی یا نہیں۔

سوال: کیا ہم اس کارڈ کو موجودہ حکومت کے حق میں ہونے کے طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ، جرائم کے خلاف مکمل انصاف کیا جا رہا ہے اور مرتکبین کو قرار واقعی سزا دی گئی ہے؟

جواب: نہیں

سوال: ملک اشرف کے بیان سے عدالت نے اخذ کیا ہے کہ جائے وقوعہ پر اسکو پمفلٹ پڑھ کر سنایا گیا تھا اور اسکو تخریبی سمجھا گیا وہ چھاپے کے دوران برآمد نہیں ہوا کیونکہ جائے وقوعہ پر تیار کیے جانے والے مشیر نامے میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، کیا آپ اس کو وضاحت کریں گے؟

جواب: وہ ناخواندہ شخص ہے، ہوسکتا ہے کہ اس نے ایگزبیٹ جی جی میں شامل اس کارڈ کو

پمفلٹ سمجھا ہو۔

سوال: وہ تیسرا شخص کون تھا، جس نے ایگزبیٹ یومشیرنامے پر دستخط نہیں کیے تھے، جس کو ملک اشرف نے سادہ کپڑوں میں ملبوس کے طور پر بیان کیا ہے؟

جواب: وہ میرا کانسٹیبل تھا۔

سوال: بابن شاہ کالونی، حیدرآباد سے برآمد ہونے والی اشیا کو اس مقدمے کے ساتھ کس طرح جوڑیں گے، جب کہ اُس گھر میں ملزمان میں سے کوئی بھی موجود ہی نہیں تھا؟

جواب: شبیر شر کے اعترافی بیان ایگزبیٹ آر سے واضح ہے کہ اس گھر کو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے دفتر کے طور پر استعمال کیا جارہا تھا اور حاجی صاحب اس کو اس گھر تک لے گیا تھا اور کمال وارثی سے اس کو سرخ پرچم کے مدیر کے طور پر متعارف کرایا۔ کمال وارثی کے اعترافی بیان ایگزبیٹ ایس سے بھی یہ بات عیاں ہے کہ وہ گزشتہ پانچ چھے سال سے کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے ساتھ تعلق میں تھے اور وہ کمیونسٹ پارٹی کا ماہنامہ سرخ پرچم جاری کررہے تھے جو کہ اردو میں ہے، جب کہ ہلچل سندھی زبان میں ہے۔ مذکورہ بالا پرچے گھر نمبر 752، بابن شاہ کالونی، حیدرآباد سے جاری کیے جاتے تھے۔ یہ گھر میرا (کمال وارثی) تھا اور جام ساقی، شمیم واسطی، شبیر شر اور قادر بخش حیدرآباد سے سرخ پرچم کے اجرا میں مددگار تھے۔ وہ ہلچل شایع کرنے میں بھی میری مدد کرتے تھے۔

سوال: کیا آپ بابن شاہ کالونی سے برآمد ہونے والے مواد میں تُزتخریبی چیزیں واضح کر سکتے ہیں؟ جام ساقی کی جانب سے اعتراض: وہ (ممتاز برنی) نہ مشیر ہے اور نہ ہی چھاپہ مارنے والی ٹیم کا رکن، چنانچہ وہ پیش نہیں کرسکتا (اعتراض مسترد کردیا گیا)۔

جواب: ایگزبیٹ اے اے کے نمبر شمار 99,11,7,8,12,10 پیش کررہا ہوں۔

عدالت نے دستاویزات کا معائنہ کرکے گواہ کو واپس کردیئے۔

سوال: آپ نے اس مقدمے کے تفتیشی اہلکار ہونے کے ناطے سیکشن 161 سی آر پی کے تحت اے سی ایم حنیف، خلیل باجوہ، اے ایس آئی غلام نبی کے بیانات کیوں ریکارڈ نہیں کیے؟

جواب: میں نے اے سی ایم حنیف اور اے ایس آئی غلام نبی کے بیانات ریکارڈ نہیں کیے تاہم چھاپہ مارنے والے سینئر اہلکار ایس ایچ او خلیل باجوہ کا بیان ریکارڈ پر موجود تھا جب یہ مقدمہ میرے سپرد کر دیا گیا۔

سوال: کیا اس مقدمے کے تفتیشی اہلکار کے طور پر آپ نے بابن شاہ کالونی کے گھر کے اصل مکین کا معلوم کیا؟

جواب: نہیں، کیونکہ مذکورہ گھر کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے دفتر کے طور پر استعمال ہو رہا تھا، جیسا کہ پارٹی اراکین شبیر شر اور کمال وارثی سیکشن 164 سی آر پی کے تحت اپنے اعترافی بیانات میں اس کا انکشاف کر چکے ہیں۔

سوال: اپنے ایگزامنیشن انچیف میں آپ نے بتایا ہے کہ آپ نے نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن پر ملزم تفتیش کی تاہم آپ نے نام نہیں بتایا ہے۔ کیا آپ ملزم کا نام بتا سکتے ہیں؟

جواب: ملزم امر لال سے میں نے نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن پر تفتیش کی۔

سوال: ملزم امر لال کو جامشورو پولیس نے سیکشن 342 اور 435 کے تحت مقدمہ نمبر 72/80 میں گرفتار کیا تھا، اس ملزم کو نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن کی ایف آئی آر 236/80 کے تحت کس طرح شامل کیا گیا؟

جواب: مقدمہ 236/80 نارتھ ناظم آباد کا جامشورو پولیس اسٹیشن کے مقدمہ نمبر 72/80 سے کوئی تعلق نہیں ہے، جس کے تحت امر لال کو گرفتار کیا گیا تھا۔ وہ جامشورو یونیورسٹی کی حدود میں خاص طور پر سرخ پرچم اور ہلچل تقسیم کرنے میں انتہائی سرگرم رہا ہے، جیسا کہ وہ اپنے اعترافی بیان میں خود بتا چکا ہے۔

سوال: کیا امر لال سے کوئی تخریبی، قابل گرفت قانون مواد برآمد ہوا تھا؟

جواب: میں نے امر لال سے کوئی تخریبی مواد برآمد نہیں کیا۔ علاوہ ازیں مجھے نہیں معلوم کہ آیا سابقہ تفتیشی اہلکار یا چھاپہ مارنے والی پارٹی نے کوئی تخریبی مواد برآمد کیا تھا یا نہیں۔ تاہم اس کا کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سے قریبی تعلق تھا، جس سے مختلف چھاپوں کے دوران تخریبی مواد

برآمد ہوا ہے۔ وہ سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا قائم مقام صدر بھی تھا جو کہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی ایک نرسری ہے۔

سوال: کیا آپ وہ خط دکھا سکتے ہیں جس کے تحت ملزم امر لال کو سیکشن 164 سی آر پی سی کے تحت اعترافی بیان ریکارڈ کرانے کیلئے اے سی ایم سرور خان کے پاس بھیجا گیا تھا؟

جواب: ملزم کو 164 کیلئے مجسٹریٹ کے پاس بھیجنے کا کوئی خط نہیں ہے۔ عام طور پر ملزمان کو ان کی اپنی رضامندی سے مجسٹریٹ کے روبرو پیش کیا جاتا ہے۔

سوال: اے سی ایم سرور خان کے پاس سیکشن 164 سی آر پی سی کے تحت امر لال کا بیان ہونے کے بعد، اُس کو کہاں لے جایا گیا؟

جواب: امر لال کے بیان کے بعد وہ براہ راست اے سی ایم کے کنٹرول میں تھا، نہ کہ پولیس تحویل میں۔

سوال: پیپلز کالونی، پاکستان کوارٹرس اور بابن شاہ کالونی سے برآمد ہونے والے مواد میں سے آپ کس مواد کو نظریۂ پاکستان کے منافی سمجھتے ہیں؟

جواب: بالخصوص سرخ پرچم اور ہلچل کے پرچے، جو کہ نومبر 1976، اکتوبر 1977، جنوری، فروری، اپریل، مئی، جون جولائی 1978، دسمبر 1979، جنوری 1980، فروری 1980 میں شائع کیے گئے پرچے نظریہء پاکستان کے خلاف خیالات کا پرچار کرتے ہیں۔

سوال: نظریہء پاکستان کیا ہے؟ براہ مہربانی اس ضمن میں کسی معتبر کتاب کا حوالہ دیجئے؟

جواب: نظریہء پاکستان کی وصف پروفیسر عبدالقیوم ناطق کی مطالعہء پاکستان کی کتاب میں دی گئی ہے، جو کہ طاہر سنز کراچی کی شائع کردہ ہے۔

سوال: آپ ملزم جام ساقی سے تفتیش کیلئے سینٹرل جیل حیدرآباد کب گئے؟ کیا آپ نے سپرنٹنڈنٹ جیل حیدرآباد سے اُن الزامات کی تصدیق کی تھی، جن کے تحت وہ وہاں پر قید تھے؟

جواب: نہیں۔

8دسمبر1982

استغاثہ کے گواہ ممتاز برنی سے عدالتی سوالات جاری

ایس پی لیاقت آباد کے دفتر سے جاری ہونے والا لیٹر ایس پی ایل / سی بی /80/2/ 48-4046 بتاریخ 11 اکتوبر 1980 پیش کر رہا ہوں، جس میں سرخ پرچم اور ہلچل کی خفیہ اشاعت اور تقسیم کے حوالے سے گرفتار شدگان کراچی کے احمد کمال وارثی اور شبیر شر کی مجھے ذاتی طور پر تفتیش کرنے کی ہدایت کی گئی۔ سہیل سانگی کے وکیلِ صفائی نے اعتراض کیا کہ فوٹو کاپی کو اس وقت تک قابلِ غور قرار نہیں دیا جا سکتا، جب تک اصل کاپی عدالت میں پیش نہیں کی جاتی۔ اعتراض بحال۔ گواہ کو عدالت کے اطمینان کیلئے اس لیٹر کی اصل کاپی پیش کرنے کی ہدایت کی گئی۔

سوال: کیا آپ ایسا کوئی تحریری مواد فراہم کر سکتے ہیں جو جام ساقی کو اس مقدمے میں ملوث کر سکتا ہو؟

جواب: ایگزیبیٹ ایم (5) ایل، ایم (5) ایم ملاحظہ کیجئے۔

سوال: کیا آپ سندھی لکھ، پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں؟

جواب: میں سندھی زبان تھوڑی بہت پڑھ اور سمجھ تو لیتا ہوں تاہم لکھ نہیں سکتا۔

سوال: ایگزیبیٹ ایم (5) ایل اور ایم 5 (ایم) کے لیٹرز نام، پتے، تاریخ اور سال کے بغیر ہیں۔ آپ کس طرح ثابت کریں گے کہ یہ خطوط انہوں نے جیل سے تحریر کیے ہیں؟

جواب: خطوط کے مندرجات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ خطوط جام ساقی نے لکھے تھے، کیونکہ مندرجات میں سائیکلو اسٹائل مشین کی خریداری کا ذکر ہے، جس کی کمال وارثی کے اس اعترافی بیان سے توثیق ہوتی ہے کہ جام ساقی نے سائیکلو اسٹائل مشین کی خریداری کیلئے پروفیسر کے پاس دس ہزار روپے جمع کرائے تھے۔

سوال: آپ نے جام ساقی کی دستی تحریر کے حوالے سے کسی کی ماہرانہ رائے لی ہے؟

جواب: میں نے کسی ماہر سے رائے نہیں لی، کیونکہ جب میں حیدرآباد جیل گیا تھا تو میں نے جام ساقی سے ان کی دستی تحریر کا نمونہ مانگا تھا، جس سے انہوں نے انکار کر دیا تھا۔

سوال: حیدر نیوز ایجنسی سے برآمد ہونے والی کتابیں ایگزبیٹ ایم-5 (پی) اور ایم-5 (کیو) مبینہ طور پر تخریبی ہیں۔کیا آپ ان کتابوں سوویت یونین کے مسلمان اور اولمپک 1980 سے قطعی مثالیں پیش کر سکتے ہیں؟

جواب: یہ کتابیں روسی نظریے اور طریقہ زندگی سے متعلق ہیں۔

سوال: کیا آپ معلوم کر سکتے ہیں کہ کوارٹر نمبر ای/344 پاکستان کوارٹرس کس کو الاٹ ہوا ہے؟

جواب: میں نے اصل الاٹی کے متعلق جاننے کی کوشش کی ہے لیکن اس میں کامیاب نہیں ہوا ہوں، تاہم یہ کوارٹر کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے دفتر کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔

جواب: کیا آپ اپنی تفتیش کے دوران یہ معلوم کر پائے کہ ایف آئی آر 236/80 ایگزبیٹ ایم میں حذف/دوہری تحریر کیلئے کون ذمہ دار ہے؟

جواب: نہیں۔

سوال: آپ نے اپنی ایگزامنیشن انچیف میں بتایا ہے کہ آپ نے سیکشن 161 سی آر پی سی کے تحت حیدرآباد سنٹرل جیل میں جام ساقی کا بیان ریکارڈ کیا، کیا آپ وہ بیان عدالت کو دکھا سکتے ہیں؟

جواب: جی ہاں۔عدالت نے بیان ملاحظہ کر کے گواہ کو واپس کر دیا۔

سوال: کیا پاکستان میں کمیونزم یا اس کے نظریے کے پرچار پر کوئی قانونی پابندی ہے؟

جواب: میں ریکارڈ کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد اگلی سماعت پر اس کا جواب دونگا۔

سوال: کیا پاکستان میں سرخ پرچم اور ہلچل پر کوئی پابندی ہے؟

جواب: جی ہاں۔کل دکھا دوں گا۔گواہ عدالت کی جانب سے 6 دسمبر 1982 کو دریافت کیے جانے والے الیوسف چیمبرز پر چھاپے سے متعلق متعلقہ اندراج نہیں لا سکا کیونکہ چھاپہ مارنے والی پارٹی نے اندراج نہیں کیے تھے۔

سوال: کیا آپ امر لال کو اعترافی بیان کیلئے اے سی ایم سرور کے پاس لے گئے تھے؟

جواب: جی ہاں، میں امرلال کو اعترافی بیان کیلئے عدالت لے گیا تھا۔

جواب: آپ نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ آپ نے امرلال کو کسی لیٹر کے بغیر اعترافی بیان کے لیئے پیش کیا، جب کہ اعترافی بیان ایگزبیٹ زیڈ عندیہ دیتا ہے کہ امرلال کو ڈپٹی کمشنر کی جانب سے 12 اکتوبر 1980 کو کی گئی توثیق کے ساتھ ایس ڈی پی او کے لیٹر کے تحت اے سی ایم سرور کے روبرو پیش کیا گیا؟

جواب: ایگزبیٹ زیڈ پر دی گئی توثیق درست ہے۔

سوال: کیا آپ عدالت میں وہ اصل لیٹر پیش کر سکتے ہیں جس کے تحت امرلال کو عدالت کے روبرو پیش کیا گیا تھا؟

جواب: اگلی سماعت پر یہ پیش کر دوں گا۔

سوال: عدالتی سوال کے جواب میں آپ نے بتایا ہے کہ امرلال جامشورو یونیورسٹی کی حدود میں سرخ پرچم اور ہلچل اپنے پاس رکھتا اور تقسیم کرتا رہا ہے۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ اس نے اس کا اپنے بیان ایگزبیٹ زیڈ میں اعتراف بھی کیا ہے۔ کیا آپ اس حصے کی نشاندہی کریں گے؟

جواب: وہ اعترافی بیان میں واضح طور پر کہتے ہیں کہ ستمبر 1978 میں مجھے سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی قومی مجلسِ عاملہ میں نامزد کیا گیا، نذیر عباسی جو فیڈریشن کے صدر تھے، سرخ پرچم اور ہلچل کے بنڈل کمرہ نمبر 67 انٹرنیشنل ہاسٹل لاتے تھے اور کمرے کی گیلری میں چھپا دیتے تھے۔ سرفراز میمن جو فیڈریشن کے سندھ یونیورسٹی کے صدر اور نذیر عباسی کے ساتھی تھے، طلبہ میں سرخ پرچم اور ہلچل تقسیم کرتے تھے، جو کہ یونیورسٹی میں ہر ایک کو معلوم ہے۔

سوال: عدالت کے اطمینان کیلئے، کیا آپ برآمدگی نامہ دکھا سکتے ہیں، جس میں سرخ پرچم اور ہلچل کے نومبر 1976، اکتوبر 1977، جنوری، فروری، اپریل، مئی، جون، جولائی 1978، دسمبر 1979، جنوری، فروری 1980 کے شمارے چھاپہ مارے گئے گھروں سے برآمدگی کے طور پر دکھائے گئے ہیں۔

(عدالتی سماعت 12 دسمبر 1982 تک ملتوی)

12دسمبر1982

پیپلز کالونی برآمدگی نامہ ایم-1، نمبر شمار 90 ہلچل جنوری، فروری 1980ء، نمبر شمار 91 سرخ پرچم فروری 1980ء، نمبر شمار 93 سرخ پرچم اپریل، مئی 1977ء، نمبر شمار 94 سرخ پرچم جنوری 1977ء، نمبر شمار 84 ستمبر 1979ء، نمبر شمار 15 سرخ پرچم، نمبر شمار 17 ہلچل، نمبر شمار 91 ہلچل اپریل 1977ء۔

برآمدگی نامہ حیدرآباد، ایگزبیٹ اے اے 1، نمبر شمار 2 سرخ پرچم جنوری 1979ء، جولائی 1979ء، مارچ، اپریل، مئی 1980۔

استغاثہ کا گواہ تفتیشی اہلکار طور پر اپنی تقرری سے متعلق ایس پی لیاقت آباد کا اصل لیٹر پیش نہیں کر سکا۔ اس نے مذکورہ لیٹر اگلی سماعت کو پیش کرنے کی استدعا کی ہے۔ گواہ اپنے ہمراہ وہ اصل لیٹر بھی نہیں لایا ہے جس کے تحت امرلال کو اعترافی بیان کیلئے اے سی ایم سرور خان کے روبرو پیش کیا گیا، جو کہ اگلی سماعت پر پیش کیا جائے گا۔

کمیونزم پر قانونی پابندی سے متعلق قبل ازیں دریافت کیے گئے سوال کا بھی استغاثہ کے گواہ نے جواب پیش نہیں کیا اور درخواست کی کہ اس کا جواب بھی وہ اگلی سماعت پر پیش کریگا۔

20دسمبر1982ع کو ممتاز برنی

جی ہاں۔ سرخ پرچم اور ہلچل کی اشاعت پر محکمہء داخلہ حکومتِ سندھ کے نوٹیفکیشن نمبر 6/117/5.0 (پریس ایچ ڈی 1976 بتاریخ 6 اکتوبر 76 برائے اپریل، مئی 1976 سرخ پرچم، نمبر 6/125/5.0 (پریس ایچ ڈی 76 بتاریخ جنوری 1977 برائے ہلچل، جولائی 1977 نمبر 6-a/125-5.0 (پریس ایچ ڈی) 9 ہلچل مارچ 1980 بتاریخ 20 جولائی 1980، 6-a/125/5.0. (پریس ایچ ڈی/80 بتاریخ 2 ستمبر 1980 ہلچل مئی جون 1980۔

سرخ پرچم پر پابندی کے حوالے سے وزارتِ اطلاعات ونشریات، حکومتِ پاکستان کا لیٹر (3)117/76/P1 اگست 1976 موجود ہے جو غالب لطیف کی جانب سے جاری کیا گیا اور ڈپٹی سیکریٹری میڈیا نے تمام صوبائی حکومتوں کو ارسال کیا۔

جام ساقی کا اعتراض

مذکورہ بالا لیٹر پابندی سے متعلق نہیں ہے چنانچہ اس کے مندرجات کو مندرجہ بالا سوال کے جواب کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ کسی اشاعت کو غیر قانونی قرار دینے کا عمومی طریقہ کار کسی عدالت کے کسی قانونی فیصلے کی صورت میں سرکاری گزیٹ میں نوٹیفکیشن شایع کرنا ہوتا ہے۔ اعتراض مسترد کر دیا گیا۔

بدرابڑو کے وکیلِ صفائی کی جانب سے اعتراض

اراکین کیلئے محدود سائیکلو اسٹائیل مواد اور پریس کی جانب سے شائع کیے جانے والے مواد میں انتہائی فرق ہے، آخر الذکر کیلئے پریس آرڈیننس استعمال کیا جاتا ہے، اس لئے مذکورہ سرکاری لیٹر کو سائیکلو اسٹائل مواد پر لاگو نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں کسی عدالتی نوٹس کی فوٹو کاپی قانون کے تحت قابلِ حوالہ نہیں ہوتی تاوقتیکہ اس ضمن میں عدالتی فیصلہ ہو۔ اعتراض بحال۔ علاوہ ازیں، عدالت نے ہدایت کی کہ استغاثہ کا گواہ وزارتِ اطلاعات ونشریات کی جانب سے جاری کیا گیا اصل لیٹر پیش کرے یا اس کی تصدیق شدہ نقل پیش کرے۔

سوال: عدالتی سوال کے جواب میں آپ نے قبل ازیں کہا کہ سرخ پرچم اور ہلچل میں شامل مواد تخریبی ہے اور یہ لوگوں کو حکومت کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ کیا آپ ایسے مضامین کی عدالت کے روبرو نشاندہی کر سکتے ہیں؟

جواب: اس ضمن میں سرخ پرچم فروری 1980، صفحہ نمبر 2 اور 3، زیرِ عنوان "حکمران ٹولہ پاکستان کو سامراجی مفادات پر قربان کرنے پر تیار"، صفحہ نمبر 4، بعنوان "پاکستان کے عوام افغان انقلاب کے تحفظ کیلئے متحد رہیں"، صفحہ نمبر 5 اور 6 بعنوان "انقلاب کی اکیسویں سالگرہ پر پارٹی کا تہنیتی پیغام: کامریڈ فیڈل کاسترو کے نام" اور "اکتوبر انقلاب کی باسٹھویں سالگرہ پر کامریڈ برژنیف کے نام کامریڈ سیکریٹری جنرل کا تہنیتی پیغام"، صفحہ نمبر 6 پر بعنوان "کون معشوق ہے پردہ زنگاری میں" ہلچل جنوری اور فوری 1980، صفحہ 1 اور 2 بعنوان "پاکستان جا قاتل ۽ وحشي حکمران فوجي جنرلو" صفحہ نمبر 8,7,6,5

"سوویت یونین کے کمیونسٹ فوجوں کی افغانستان میں آمد" پیش کر رہا ہوں۔

13 دسمبر 1998

سرخ پرچم اور ہلچل کے مندرجہ بالا پرچے اگیزبیٹ ایم-1، اگیزبیٹ ایچ ایچ، اگیزبیٹ جے جے میں شامل ہیں۔

سرخ پرچم جنوری 1979 پیش کر رہا ہوں، عدالت نے اس کا جائزہ لیکر یہ گواہ کو واپس کر دیا، کیونکہ یہ اگیزبیٹ ایم-4 میں شامل تھا۔ میں "عوام اقتدار سنبھالنے کے لئے تیار ہو جائیں" کے عنوان سے پمفلٹ پہلے ہی پیش کر چکا ہوں۔ عدالت نے اس کا جائزہ لیکر گواہ کو واپس کر دیا کیونکہ یہ اگیزبیٹ ایم-5 (ای) میں پہلے سے شامل تھا۔ میں جنوری فروری 1980 کی ہلچل بھی پیش کر رہا ہوں، عدالت نے یہ گواہ کو واپس کر دی، کیونکہ یہ شمارہ اگیزبیٹ ایم-5 میں شامل تھا۔ اگیزبیٹ اے اے-1 کے نمبر شمار 2 میں شامل مئی 1980 کے سرخ پرچم کا شمارہ بھی پیش کر رہا ہوں، عدالت نے اس کا جائزہ لیکر اس کو اگیزبیٹ ایل ایل کے طور پر شامل کر لیا۔

ملزم جام ساقی کی جانب سے اعتراض کہ استغاثہ کا گواہ نہ مشیر ہے اور نہ ہی چھاپہ مارنے والی ٹیم کا رکن، چنانچہ وہ بالا الذکر مواد پیش نہیں کر سکتا۔ اعتراض بحال ہوا اور اگیزبیٹ ایچ ایچ سے ایل ایل تک شامل کیے گئے نقول عدالت نے گواہ کو واپس کر دیئے۔

استغاثہ کے گواہ نے ایس پی لیاقت آباد کی جانب سے تحریری لیٹر نمبر ایس پی ایل/سی بی (ii)/80-121046-48 بتاریخ 11 اکتوبر 1980 کی اصل کاپی پیش کی، جس میں اس کو ایف آئی آر 236/80 کے تحت مقدمے کی تفتیش کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ عدالت نے فوٹو اسٹیٹ کاپی کا اصل سے تقابل کیا اور کارروائی کے ساتھ نتھی کرتے ہوئے اس کو اگیزبیٹ ایچ ایچ 1 بنایا۔ گواہ نے ایس پی لیاقت آباد کی جانب سے جاری لیٹر نمبر SPL/CB-2/80/208009/10 بتاریخ 6 اکتوبر 1980 بھی پیش کیا، جس میں مذکورہ مقدمے میں ایس ایچ او منگھوپیر، پولیس اسٹیشن نارتھ ناظم آباد کو اس کی معاونت کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ عدالت نے فوٹو کاپی کا اصل سے تقابل کیا اور اس کو کارروائی کا حصہ بناتے ہوئے اگیزبیٹ جے جے 1 کے طور پر شامل کیا۔

میں وزارتِ اطلاعات ونشریات، حکومتِ پاکستان کے سیکشن آفیسر پریس، حکومتِ سندھ کی جانب سے تصدیق شدہ لیٹر نمبر (3) P.I. 4117/76 بتاریخ اگست 1976 بھی پیش کر رہا ہوں، عدالت نے سیکشن آفیسر پریس، محکمہء داخلا حکومتِ سندھ کی جانب سے تصدیق شدہ فوٹو کاپی کا جائزہ لیا اور ایگزبیٹ کے کے بنا کر اس کو کارروائی کا حصہ کر لیا۔

جام ساقی کی جانب سے اعتراض: استغاثہ کے گواہ کی جانب سے پیش کیا گیا یہ لیٹر گزیٹ نوٹیفکیشن کا حصہ نہیں ہے اور یہ وزارتِ داخلہ کی جانب سے جاری کردہ بھی نہیں ہے، جو کہ حکومتی مشینری میں اس نوعیت کے کاموں کے لئے مختص ہے۔ پریس اینڈ پبلیکیشنز کے خلاف ایک فرد کی جانب سے دوسرے کو تحریر کردہ ایسے لیٹرز کو ملک اور ملک کی آبادی کے خلاف سازش ہی سمجھا جا سکتا ہے، اس لئے اس لیٹر کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔

اعتراض مسترد

گواہ نے ڈپٹی کمشنر ضلع غربی کراچی کا وہ اصل لیٹر بھی پیش کیا جس میں سیکشن 164 سی آر پی سی کے تحت اعترافی بیان ریکارڈ کرنے کے لئے کوئی مجسٹریٹ نامزد کرنے کی استدعا کی گئی تھی۔ عدالت نے اصل لیٹر کا جائزہ لیکر گواہ کو واپس کر دیا۔

کمیونزم پر پابندی

جہاں تک پاکستان میں کمیونزم پر پابندی کا تعلق ہے تو میں عدالت کی توجہ مارشل لا ریگیولیشن 18 کی جانب مبذول کراؤں گا جو کہ 5 جولائی 1977 سے نافذ العمل ہے۔ جام ساقی کی جانب سے اعتراض، مارشل لا ریگیولیشن 18 کمیونزم سے متعلق کوئی چیز واضح نہیں کرتا، اس لئے اس کو نہیں لیا جا سکتا۔ عدالت نے اعتراض مسترد کر دیا۔

14 دسمبر 1982

عدالتی سوالات کے بعد شفیع محمدی

مجھے معلوم ہے کہ سزا کے طور پر کوڑے مارنے کی اسلام میں اجازت ہے، مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ موجودہ حکومت نے حدود آرڈیننس اور مارشل لا ضوابط کے تحت کوڑے مارنے

کی اجازت دی ہوئی ہے، اس لئے کسی اختیارات کے حامل فرد کے ذریعے کوڑے مارنے کا عملی مظاہرہ نظریہ ء پاکستان سے متصادم نہیں ہے۔ اختیارات کے حامل فرد سے میری مراد ایک ایسا شخص ہے جس کو اہل اختیاری نے کسی کو کوڑے مارنے کا اختیار دیا ہو۔

وکیلِ صفائی نے روزنامے جنگ کے تاریخ 5، 7، 11، 22، 26، 27، 29، 30، 31 اکتوبر 1979 کے اصل اور فوٹو اسٹیٹ تراشے عدالت کے روبرو پیش کیے، جن میں مجرمان کو کوڑے مارتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ عدالت نے مذکورہ بالا فوٹو اسٹیٹ اخباری تراشوں کا اصل کے ساتھ تقابل کیا اور ان کو ایگزبیٹ ایل ایل 1 کے طور پر عدالتی کارروائی کا حصہ بنایا۔ گواہ نے ایگزبیٹ کا جائزہ لیا اور جواب دیا کہ مجرمان کو کوڑے مارنے کی تصاویر اخبارات میں شائع کرنا نہ اسلامی قوانین کے خلاف ہے اور نہ ہی ملکی قوانین کے۔ بقول اُس کے، مجھے نہیں معلوم کہ اسلام میں کوڑے مارنے کی اجازت ہے یا نہیں، جب مجرمان کو رسی سے باندھا گیا ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ جرم اور گناہ میں کوئی فرق ہے۔ ایگزبیٹ جی جی میں دکھائے گئے کارڈ سے عیاں نہیں ہوتا کہ کوڑے مارے جانے والا شخص کمیونسٹ ہے جبکہ کوڑا اُٹھانے والا ہاتھ واضح طور پر عندیہ دیتا ہے کہ پاکستان میں کوڑے مارنے کی اجازت ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ پاکستان فیڈرل یونین آف اسٹوڈنٹس کمیونسٹوں کی تنظیم ہے۔ تفتیشی افسر کے طور پر تفتیش کے دوران میں نے پاکستان فیڈرل یونین آف اسٹوڈنٹس کے دفتر معلوم کرنے کی کوشش کی تاہم اس میں ناکام رہا۔ میں نے بدر ابڑو کے عملے/ ملازمین کے نام اور پتے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اسکی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے پاکستان فیڈرل یونین آف اسٹوڈنٹس سے وابستہ کوئی طالب علم نہیں ملا اور نہ ہی ملزم امرلال کے علاوہ کسی اور ملزم کا سیکشن 164 یا 161 سی آر پی سی کے تحت اس تنظیم سے وابستگی کی حوالے سے کوئی بیان ریکارڈ کیا اور میں یہ بھی گوش گذار کرتا ہوں کہ ملزمان بشمول امرلال میں سے کوئی بھی پاکستان فیڈرل یونین آف اسٹوڈنٹس کا رکن نہیں ہے۔

یہ درست ہے کہ عبدالقیوم کی تحریر کردہ کتاب مطالعہ پاکستان مارچ 1982 میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی میں نظریہ ء پاکستان کی تشریح کے سلسلے میں آئین پاکستان 1973 کی کتاب کو معتبر

سمجھتا ہوں۔ بدر ابڑو کے دفتر پر چھاپے کے سلسلے میں مشیر نامہ ایگزبیٹ یو کسی ایسے جملے کا عندیہ نہیں دیتا جو کسی تخریبی مواد یا کسی قابلِ اعتراض چیز کی برآمدگی کا ذکر کرتا ہو۔ یہ درست ہے کہ ایگزبیٹ جی.جی میں ذکر کیے ہوئے چار کارڈوں کے بدر ابڑو دفتر میں جس جگہ سے برآمد ہوئے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ زیادہ تر مواد/ اشیا بشمول کارڈ عملے کے کمرے سے برآمد ہوئے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ بدر ابڑو کے دفتر سے ایسا کوئی مواد برآمد نہیں ہوا جو مختلف فرقوں اور مذاہب کے درمیان منافرت کا باعث بنتا ہو۔ یہ کہنا درست ہے کہ بدر ابڑو کے دفتر سے ایسا کوئی مواد برآمد نہیں ہوا جو افواج پاکستان کی خلاف نفرت بھڑکانے کا باعث بنتا ہو۔ مجھے اس دفتر سے ایسا کوئی تحریری مواد بھی نہیں ملا جو لوگوں کو موجودہ حکومت کے خلاف بھڑکاتا ہو۔ مجھے اپنی تفتیش کے دوران کوئی بھی ایسا فرد نہیں ملا جو یہ کہہ سکے کہ بدر ابڑو نظریہء پاکستان کے خلاف نقطہء نظر کی تشہیر میں ملوث رہا ہے۔ ایگزبیٹ ایم 3 مشیر نامے جو کہ ای 344 پاکستان کوارٹرس سے عارفہ انٹرنیشنل، الیوسف چیمبرز، شاہراہ، لیاقت، کراچی کی فائلوں پر مشتمل ہے، کے علاوہ بدر ابڑو کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے، جو کہ اُن الزامات کو ثابت کر سکے جن کے تحت اس کے خلاف مقدمہ چل رہا ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ قبل ازیں عدالت کو دکھائی گئی تینوں فائلیں پاکستان کوارٹرس سے برآمد نہیں ہوئی تھی۔ گواہ کو ایگزبیٹ یو کی فائل نمبر 7 دکھانے کیلئے کہا گیا لیکن وہ اس میں ناکام رہا اور اگلے روز یعنی 5 دسمبر 1982 کو پیش کرنے کی مہلت طلب کی۔

15 دسمبر 1982

وہ فائلیں جو عدالت کو گذشتہ سماعت اور عدالتی سوالات کے دوران دکھائی گئیں، پاکستان کوارٹرس کے بجائے بدر ابڑو کے دفتر سے برآمد ہوئیں، جیسا کہ ایگزبیٹ یو میں دکھایا گیا ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ شبیر شر مختلف اداروں کے ساتھ کام کرتا رہا ہے اور جیسا کہ اسکے اعترافی بیان سے بھی عیاں ہے کہ وہ عارفہ انٹرنیشنل کا بھی ملازم رہا ہے، جہاں وہ کلرک کی حیثیت سے کام کرتا رہا ہے، جس کا مالک بدر ابڑو تھا۔ میں نے دفتر کی ملکیت سے متعلق تصدیق کیلئے الیوسف چیمبرز میں چھاپے کے وقت کسی بھی فرد کا بیان نہیں لیا۔ ایگزبیٹ یو میں عارفہ انٹرنیشنل کی ملکیت اور

بدر ابڑو کے اسکے مالک ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مشیر نامہ یو میں عارفہ انٹرنیشنل کے شراکت داروں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ایگزبیٹ جی جی میں دکھائے گئے کارڈز پر یہ تحریر نہیں ہے کہ کوڑے مارے جانے والا شخص گناہ گار ہے، معصوم ہے یا مجرم۔ میرے خیال میں یہ ظاہر کرتا ہے کہ پاکستان میں معصوم لوگوں کو کوڑے مارے جا رہے ہیں۔ میری کسی کیس فائل میں ایگزبیٹ جی جی میں دکھائے گئے کارڈز سے مماثلت والی کوئی نشانی یا اشاعت موجود نہیں ہے۔ مجھے کمیونسٹ بلاک کے معنی معلوم ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ جاپان کی علامت سرخ رنگ کے سورج پر مبنی ہے۔ کمیونسٹ بلاک میں، میں بالخصوص روس اور ان ممالک کو شامل کرتا ہوں جہاں کمیونزم برسرِ اقتدار ہے۔ ایگزبیٹ جی جی میں دکھایا گیا سرخ دائرہ کسی ملک کی علامت نہیں ہے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ ایگزبیٹ جی جی میں شامل پاکستان فیڈرل یونین آف اسٹوڈنٹس کے شائع کردہ کارڈ کو تخریبی ہونے کی بنا پر ضبط کرنے کا کوئی سرکاری حکم نامہ جاری ہوا تھا۔ تاہم رضا کارانہ طور پر بتایا کہ مارشل لا ضوابط 18(3) کے تحت کوئی بھی سیاسی جماعت یا فرد بولے گئے یا تحریر کیے گئے یا اشارہ/علامت کیے گئے الفاظ یا کسی واضح اظہار والے الفاظ یا کسی اور طریقے سے نظریہ ء یا سلامتی پاکستان یا مارشل لا نافذ کیے جانے کے مقاصد سے متصادم کسی بھی نوعیت کا کوئی پروپگنڈا یا عمل نہیں کر سکتے۔

جام ساقی کا سوال: مارشل لا ضابطہ 18 صرف سیاسی جماعت اور فرد کا احاطہ کرتا ہے، جبکہ متعلقہ کارڈ ایک طلبہ تنظیم نے شائع کیا ہے۔ اس لئے مارشل لا ضابطہ نمبر 18 کا اس پر اطلاق نہیں ہوتا۔ (اعتراض مسترد)۔ یہ کہنا درست ہے کہ بدر ابڑو کی کسی سیاسی جماعت سے وابستگی نہیں ہے۔ یہ کہنا بھی درست ہے کہ بدر ابڑو نظریہ ء یا سلامتی اور خودمختیاری پاکستان یا مارشل لا نافذ کرنے کے مقاصد کے خلاف اس کارڈ کے ذریعے کوئی پروپگنڈا یا کسی موقف کی تشہیر کا مرتکب نہیں ہوا ہے۔ یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ میں نے مذکورہ کارڈ کے متعلق محکمہ ء داخلہ سے کوئی رائے یا موقف حاصل نہیں کیا۔

18 دسمبر 1982

عدالتی سوالات کے بعد یوسف لغاری کی جرح

عدالتی سوالات پر میرے جواب اس مقدمے سے متعلق میری ذاتی معلومات پر مبنی ہیں۔ سابقہ تفتیشی اہلکار ایس ایچ او صفدر بھٹی نے برآمد شدہ اشیا میرے حوالے کیں تھیں۔ میں نے اُن سے یہ اشیا عدالت کے روبرو پیش کیے گئے ایگزبیٹ برآمدگی ناموں کے مطابق نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن پر وصول کیں۔ میں نے ایگزبیٹ ایم 3 میں ذکر کی گئی عارفہ انٹرنیشنل الیوسف چیمبرز کراچی کی 202 فائلیں دیکھیں ہیں۔ ان فائلوں میں مختلف لوگوں کے فارم تھے جن کو عارفہ انٹرنیشنل کی ذریعے بھرتی کیا جانا تھا، عارفہ انٹرنیشنل رجسٹرڈ اور قانونی طور پر کام کرنے والا ادارہ ہے مجھے ان فائلوں سے کوئی تخریبی مواد نہیں ملا۔ ملزم شبیر شر کو عارفہ انٹرنیشنل میں ملازمت دینے کو جرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وہ بدرا بڑو کا ملازم تھا۔ جہاں تک ریکارڈ کا تعلق ہے، اس مقدمے سے قبل شبیر شر نہ تو سزا یافتہ تھا اور نہ ہی کسی جرم کا مرتکب تھا۔ ہم کسی پولیس اسٹیشن کی حدود میں رہائش پذیر جرائم پیشہ افراد کا ریکارڈ رکھتے ہیں۔ عدالت کے روبرو پیش چھ ملزمان میں سے کسی کا بھی اس مقدمے سے قبل کوئی ریکارڈ میرے تحت پولیس اسٹیشن پر نہیں ہے۔ یہ ملزمان میرے پولیس اسٹیشن کی جانب سے زیرِ نگرانی تھے۔ امرلال نے اپنے اعترافی بیان میں، یہ انکشاف نہیں کیا ہے کہ وہ اپنے پاس سرخ پرچم اور ہلچل رکھتا تھا یا تقسیم کرتا تھا۔ اُس میں اس نے یہ اعتراف کیا کہ وہ دیگر طالب علموں کو تقسیم کرنے سے روکتا تھا۔ 11 اکتوبر 1980ء سے قبل میں علاقے کے ڈی ایس پی کے طور پر اس مقدمے کی تفتیش کی نگرانی/نظر داری کر رہا تھا۔ میں نے ڈپٹی کمشنر غربی کو امرلال کے اعترافی بیان کیلئے مجسٹریٹ نامزد کرنے کیلئے ایک خط تحریر کیا تھا، تاہم اس پر نمبر شمار اور تاریخ نہیں ہیں۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ تمام فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کو اعترافی بیان ریکارڈ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اے سی ایم سرور سٹی کورٹس میں واقع دفتر میں بیٹھتے رہے ہیں۔ سٹی کورٹس میں کئی دیگر مجسٹریٹس بھی بیٹھتے ہیں۔ ایک طریقہء کار ہے جس کے تحت کوئی تفتیشی اہلکار اعترافی بیان کیلئے ضلعی مجسٹریٹ کو کسی فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کی نامزدگی کیلئے درخواست کرتا ہے۔ یہ کہنا

درست نہیں ہوگا کہ اس ضمن میں کوئی طریقہء کار نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ ملزمان کو سیکشن 164 سی آر پی سی کے تحت اعترافی بیان کیلئے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ میں نے بدرا بڑو کے اعترافی بیان کیلئے کسی فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کی نامزدگی سے متعلق ضلعی مجسٹریٹ کو کوئی خط تحریر نہیں کیا۔ نہ ہی ایسا کوئی خط کسی سابق تفتیشی اہلکار نے ارسال کیا تھا۔

ہم پولیس اسٹیشن پر روزانہ روزنامہ جنگ لیتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اخبارات پر 1979 سے سنسر شپ عائد ہے۔ میں ایگزبیٹ ایل ایل، روزنامہ جنگ بتاریخ 26 اکتوبر 1979 دیکھ رہا ہوں، اس اخبار پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ ایگزبیٹ ایل ایل میں مجرموں کو کوڑے مارتے ہوئے دکھایا گیا ہے، یہ بھی درست ہے کہ ایگزبیٹ ایل ایل میں مجرموں کو کوڑے مارتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ایگزبیٹ ایل ایل میں لکھا ہوا ہے کہ راولپنڈی میں کوڑے لگنے کا یہ منظر ایک لاکھ سے زائد افراد نے دیکھا۔ ایگزبیٹ ایل ایل میں تصویر اس امر کا ثبوت ہے کہ مجرموں کو سزا دی جاتی ہے اور مُلک میں مکمل انصاف برتا جاتا ہے۔ ایگزبیٹ ایل ایل کی تصویر سے لیکر ایل ایل-6 تک یہ واضح ہے کہ پورے ملک کو یہ دکھانے کیلئے کہ مجرموں کو قرار واقعی سزا دی گئی اور ملک میں انصاف فراہم کیا جارہا ہے، مناسب تشہیر کی گئی ہے۔ یہ درست ہے کہ ایسی تصاویر رکھنا جو اخبارات میں شائع ہو چکی ہوں، کوئی جرم نہیں ہے اور اس طرح کی تصاویر لوگوں کے من میں مجرموں کے خلاف نفرت اور حکومت کے حق میں جذبات پیدا کرتی ہیں کہ انصاف کی فراہمی بھی کی جارہی ہے۔

میں مطالعہ پاکستان کی کتاب میں شامل نظریہء پاکستان کی تشریح سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔ میں نے آئین پاکستان کا مطالعہ نہیں کیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر عبدالقیوم ناطق جماعت اسلامی کے رکن ہیں۔ ایگزبیٹ ایم-4، ایم-5، 5-اے، ایم-5 اے اے عدالت کے سامنے پیش کی گئیں، جن میں وہ مواد موجود تھا، جو کہ پاکستان میں کمیونزم کے حق میں اور نظریہء پاکستان کے خلاف تھا۔ کمیونزم سے میری مراد مادی زندگی میں ایک ایسا طریقہء پیداوار جو زندگی کے سماجی، سیاسی اور روحانی عمل کا بنیادی کردار متعین کرے جبکہ کمیونزم میں مذہب اور خدا کا کوئی تصور نہیں ہے۔ میری دی ہوئی تشریح میری ذاتی معلومات پر مبنی ہے اور یہ کسی مستند کتاب سے اخذ نہیں کی گئی

ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ کمیونزم مذہب اور خدا کے خلاف نہیں ہے۔ میں ایگزبیٹ ایم-4، سرخ پرچم، صفحہ نمبر 3 بعنوان ''پاکستان کے عوام افغان انقلاب کے تحفظ کیلئے متحد ہیں'' کا حوالہ دے سکتا ہوں جو کہتا ہے:

''پاکستان کے عوام کی نظر میں افغانستان ایک مثال بن چکا ہے جہاں وہ ساری تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، پاکستان کے عوام جن کی آرزو کرتے ہیں۔'' یہ کہنا درست ہوگا کہ مندرجہ بالا مضمون کامریڈ احمد نے تحریر کیا ہے، جس میں سیکریٹری جنرل کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی جانب سے کامریڈ ببرک کارمل کو پاکستان کے لوگوں کے جذبات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں افغانستان میں انقلاب پر کامریڈ ببرک کارمل کو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان، مزدوروں، جمہوریت، پسندوں اور معززین کی جانب سے مبارکباد پیش کی گئی ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ مذکورہ مضمون افغانستان میں انقلاب کے متعلق نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ مسودہ اسٹینسل پر تحریر کر کے سائیکلو اسٹائل مشین پر شائع کیا ہوا ہے، میں عدالت میں موجود ملزمان کی دستی تحریر سے واقف نہیں ہوں، اس لئے کہہ نہیں سکتا کہ اسٹینسل پر کس کے ہاتھ کی تحریر ہے، کہہ نہیں سکتا کہ یہ مضمون کس نے تحریر کیا ہے۔ میں نے عدالت میں موجود ملزمان میں سے کسی کی بھی دستی تحریر پر ماہرانہ رائے حاصل نہیں کی ہے۔ سرخ پرچم کا اردو حصہ کمال وارثی کا لکھا ہوا ہے، جبکہ سندھی میں ہلچل شبیر شر کا لکھا ہوا ہے، جو کہ کمال وارثی کے اعتراف سے عیاں ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ میں نے انکی دستی تحریر اور اسٹینسل کے معاملے کی بنیاد کمال وارثی کے اعترافی بیان کو بنایا ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ایگزبیٹ ایم-4 اور ایم-5 کی اسٹینسل ملزم کمال وارثی اور شبیر شر کی لکھی ہوئی نہیں ہیں۔ ایگزبیٹ کے کے (غالب لطیف کا خط) کے علاوہ مارشل لا ضابطہ نمبر 18 بھی ایسے تخریبی مواد کی ضبطگی کا اختیار دیتا ہے۔ میں عدالت کے روبرو موجود ملزمان کے علاوہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے دیگر اراکین جیسا کہ امام علی نازش، جبار خٹک، نرنجن کمار کا علم رکھتا ہوں۔ یہ درست ہے کہ 1976 میں مارشل لا ضوابط نہیں تھے۔

(سماعت اگلے روز تک ملتوی)

20دسمبر1982

ملزمان امرلال، جام ساقی، شبیر شر کے بیانات سیکشن161 سی آر پی سی کے تحت تفتیشی اہلکار نے ریکارڈ کیے جبکہ دیگر ملزمان سہیل سانگی، بدر ابڑو اور احمد کمال وارثی نے بیان دینے سے انکار کیا تھا۔شبیر شر کا اعترافی بیان28 اگست 1980 کو ریکارڈ کیا گیا۔شبیر شر کا سیکشن161 سی آر پی سی کے تحت بیان سب انسپکٹر استغاثہ زبیر نے ریکارڈ کیا تھا۔اعترافی بیان کے بعد شبیر شر کو عدالتی تحویل میں دیا گیا۔ میں کیس ڈائری سے تاریخ29 آگست1980 کو زبیر کے دستخط کے ساتھ ریکارڈ کیا ہوا بیان دیکھ رہا ہوں۔ میں سیکشن161 سی آر پی سی کے تحت داخل کیا گیا امرلال کا بیان دیکھ رہا ہوں جو کہ میں نے ریکارڈ کیا تھا اور آخری صفحے پر دستخط اور تاریخ نظر نہیں آرہے ہیں کیونکہ آخری صفحے کا ایک چھوٹا حصہ پھٹ گیا تھا، البتہ جہاں تک کیس ڈائری کا تعلق ہے تو یہ12 اکتوبر 1980 کو ریکارڈ کیا گیا تھا۔امرلال کو جامشورو پولیس اسٹیشن نے23 ستمبر1980 کو گرفتار کیا تھا اور اسکو24 ستمبر1980 کو نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن منتقل کیا گیا اور میں نے اسکا بیان ریکارڈ کیا۔ میں گواہی کے خلاصے میں اپنا بیان دیکھ رہا ہوں۔سوال نمبر 2 کے جواب میں، میں نے بتایا کہ میں نے اس مقدمے کی تفتیش امرلال کے نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن منتقلی والے دن سنبھالی۔ میں2 اکتوبر1980 کی کیس ڈائری دیکھ رہا ہوں اور امرلال کا بیان ریکارڈ کرنے کے علاوہ میں نے اپنے عملے کو اس مقدمے کے ضمن میں کچھ ہدایات دی ہیں اور اس کے علاوہ اس مقدمے کے حوالے سے اور کچھ نہیں ہے۔ میں اپنی جانب سے13 دسمبر1980 کو جام ساقی کا مخدوم حیات کی موجودگی میں سیکشن161 کے تحت لیا گیا بیان دیکھ رہا ہوں، جس پر جیل انتظامیہ کے دستخط نہیں ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے سنٹرل جیل حیدرآباد میں جام ساقی کا سیکشن 161 کے تحت کوئی بیان ریکارڈ نہیں کیا تھا۔

میں نے نہ تو کوئی تحقیق کی ہے اور نہ ہی میرا کسی موضوع پر کوئی مقالہ ہے۔ مجھے صحافت کی کوئی معلومات نہیں ہے۔ میں کمیونسٹ مواد کا ماہر نہیں ہوں تاہم مجھے تھوڑی بہت معلومات ہے۔ میرے موقف کو جامع/معتبر نہیں سمجھا جانا چاہیئے۔ میں کمیونزم اور دیگر علوم جیسا کہ سماجی سائنس، شاعری، ادب، فلسفہ اور وغیرہ کا ماہر نہیں ہوں۔ میں بانیء پاکستان قائدِ اعظم کی جانب سے دی گئی

نظریہء پاکستان کی تشریح کو درست اور قابلِ بھروسہ سمجھتا ہوں اور نظریہء پاکستان کے حوالے سے دیگر تمام تشریحات جو انکے نقطہء نظر کے برعکس ہیں کو ثانوی سمجھا جانا چاہیئے۔ میں مہران رسالہ برائے جولائی، آگست، ستمبر 1976 دیکھ رہا ہوں۔ ''قائداعظم نمبر'' والے اس شمارے میں مولانا غلام محمد گرامی کا ایک مضمون ''قائداعظم سے قائد عوام تک'' شامل ہے جس میں قائداعظم کا 26 مارچ 1948 کا ایک مقولہ شامل ہے۔ یہ عدالت کے رکن جناب حبیب اللہ بھٹو نے ترجمہ کیا ہے۔ جب یہ کہا گیا کہ ''پاکستان کا معاشی نظام اسلامی سوشلزم کے انصاف اور برابری پر مبنی ہوگا تو یہ میرے اور پاکستان کے کروڑوں لوگوں کے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔'' اس مقولے سے واضح ہے کہ قائداعظم بھی پاکستان میں اسلامی سوشلزم چاہتے تھے۔ میں 18 نومبر 1982 کو روزنامہ امن کراچی میں ناصر منصور کا ''اسلام اور سوشلزم'' پر تحریر کردہ مضمون دیکھ رہا ہوں جو واضح کرتا ہے کہ اسلام اور سوشلزم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ کہنا درست ہے کہ نومبر 1976، اکتوبر 1977، جنوری، فروری، اپریل، مئی، جون، جولائی 1978 کے سرخ پرچم اور ہلچل کسی برآمدگی نامے میں شامل نہیں ہیں۔ رضا کارانہ طور پر کہتا ہے کہ وہ نظر کی بے احتیاطی کی وجہ سے عدالتی سوالات کی دوران شامل ہوئے۔

یہ درست ہے کہ اکثر ملزمان درست حقائق بیان نہیں کرتے اور تفتیش کو غلط سمت پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کوئی ملزم تفتیش کو غلط سمت پر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر ہم اسکی جانب سے بیان کیے گئے حقائق کی تصدیق کیلئے ثبوت جمع کرتے ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ شبیر شر اور احمد کمال وارثی نے جام ساقی اور کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی مالی معاونت کرنے والے دیگر لوگوں کو بچانے کی غرض سے تفتیش کو غلط سمت پر ڈالنے کی کوشش کی۔ بابن شاہ کالونی، پیپلز کالونی اور پاکستان کوارٹرس سے برآمدگی اور شبیر اور وارثی کے اعترافات کے علاوہ اس مقدمے میں جام ساقی کے خلاف کوئی دوسرا ثبوت موجود نہیں ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ کسی بھی استغاثہ کے گواہ نے سیکشن 161 کے تحت یہ نہیں کہا ہے کہ جام ساقی کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی مالی معاونت کرتا رہا ہے اور یہ کہ وہ اس پارٹی کا رکن ہے۔ میں سیکشن 161 کے تحت جام ساقی کا بیان دیکھ رہا ہوں اور یہ درست ہے کہ جام ساقی کے والد ایک پرائمری اُستاد ہیں۔ مجھے نہیں

معلوم کہ آیا جام ساقی کسی ملکیت یا زمین کا مالک ہے یا نہیں۔ میں نے کمیونسٹ پارٹی کی مالی معاونت کرنے کے معاملے میں جام ساقی کے ذرائع آمدنی کا نہ تو کوئی ثبوت ہاتھ کیا ہے اور نہ ہی اسکے متعلق کسی معلومات کا حامل ہوں۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ سرخ پرچم اور ہلچل سیکریٹری داخلہ نے نوٹیفکیشن کے ذریعے ممنوع قرار دیئے تھے، وہ اس مقدمے سے ماخوذ کسی گھر پر چھاپے کے دوران برآمد نہیں ہوئے اور نہ ہی اسکا کسی برآمدگی نامے میں ذکر ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں تمام مواد کا جائزہ لے چکا ہوں۔ کتاب ''سوویت یونین کے مسلمان'' ایگزبیٹ ایم-5 کیو میں کہا گیا ہے کہ مسلمان روس میں رہائش پذیر ہیں اور روس ایک کمیونسٹ ملک ہے۔ یہ درست ہے کہ وزارت اطلاعات حکومتِ پاکستان نے تمام صوبوں کے سیکریٹریز کو ایک خط ایگزبیٹ کے کے سے نوٹیفائی کیا کہ سرخ پرچم کے تمام پرچے جو سرکیولیشن میں ہیں ضبط کرنے کی کوشش کی جائے اور اسکے ناشر وغیرہ کی نشاندہی کیلئے اقدامات کیے جائیں اور انکے خلاف قانون کی خلاف ورزی کرنے پر کارروائی کی جائے۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ میں سرخ پرچم اور ہلچل کی ادارت اور اشاعت میں ملوث دیگر افراد کو حراست میں نہیں لے سکا اور میں اس وقت عدالت میں موجود ملزمان کو ہی گرفتار کرسکا۔

(عدالت کی سماعت 26 دسمبر 1982 تک ملتوی)

استغاثہ کی کارروائی مکمل ہوئی

ضمیمے

ایف آئی آر نقل برائے اگیزبیٹ وی

سرسری سماعت کی فوجی عدالت، ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریشن ہیڈکوارٹرس

نمبر236/80 تھانہ نارتھ ناظم آباد ضلع کراچی، غربی

1- تاریخ ووقتِ رپورٹ 30-7-80

20.30 بجے، ایس ڈی ای نمبر49 تھانے سے روانگی کی تاریخ 30-7-80

2- نام وسکونت اطلاع دہندہ ومستغیث: میجر طفیل احمد خان، ہیڈکوارٹرس، ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریشن، کراچی

3- مختصر کیفیتِ جرم (معہ دفعہ) ومال اگر کچھ کھویا ہے: سیکشن مارشل لا ضوابط (3)15/18 مجریہ 1977

4- جائے واردات: گھر نمبر سی-19، پیپلز کالونی، بلاک این، نارتھ ناظم آباد، کراچی، تقریباً ڈیڑھ میل جنوب مشرق

5- کاروائی متعلقہ تفتیش، اگر اطلاع درج کرنے میں کچھ توقف ہوا ہو تو اسکی وجہ بیان کی جائے: ہیڈکوارٹرس ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریشن کے ہاں سے خط موصول ہونے پر مقدمہ درج کیا گیا۔
آئی ایس آئی ڈائریکٹوریٹ مقدمے کی تفتیش کرے گا۔

عہدہ اے ایس آئی

نوٹ: اطلاع کے نیچے اطلاع دہندہ کا دستخط یا مہر یا نشانِ انگوٹھا ہونا چاہئے اور افسر تحریر کنندہ (ابتدائی اطلاع) کے دستخط بطور تصدیق ہونے چاہئیں۔

ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریشن ہیڈ کوارٹرس کراچی کا تحریر کردہ ایک خط بذریعہ ایس پی لیاقت آباد موصول ہوا، جو اس طرح تھا: ہیڈ کوارٹرس ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر سیکٹر 1، ایم پی اے ہاسٹل کراچی، فون نمبر 51656/320156 مارشل لا 30 جولائی 1980 بمخاطب ایس پی لیاقت آباد کراچی۔

موضوع: مقدمے کا اندراج

اطلاع موصول ہونے پر مجسٹریٹ کی سربراہی میں ایک چھاپہ مارنے والی ٹیم تشکیل دی گئی تاکہ گھروں پر چھاپہ مار کر تخریبی مواد تلاش کیا جائے۔ چھاپوں کے نتیجے میں بڑی مقدار میں تخریبی مواد کے علاوہ ٹائیپ شدہ اور سائیکلو اسٹائل مواد بھی جائے وقوعہ سے برآمد کیا گیا۔

شبیر شر ولد عبدالرزاق اور احمد کمال وارثی ولد عبدالوحید وارثی سکنہ سی -19، پیپلز کالونی، بلاک این، نارتھ ناظم آباد کراچی کو بھی چھاپہ مارنے والی ٹیم نے جائے وقوعہ سے حراست میں لیا۔

براہ مہربانی مقدمہ درج کریں اور تفتیش مکمل کریں۔

دستخط

میجر طفیل حسین خان

ڈی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹرس، کراچی

ایس ایچ او نارتھ ناظم آباد۔ براہ مہربانی مطابقت میں مقدمہ درج کریں اور مزید قانونی اقدامات اُٹھائیں۔ ایس پی لیاقت آباد 30 جولائی 1980۔ ڈیوٹی آفیسر مقدمہ درج کریں (آئی ایس آئی ڈائریکٹوریٹ مٹا کر تحریر کیا گیا) مارشل لا ٹیم تفتیش کرے گی۔

دستخط

ایس ایچ او، 80-7-30

پولیس اقدام۔ میں ڈیوٹی افسر اے ایس آئی امام بخش تصدیق کرتا ہوں کہ سیکشن 77(3)15/18 مارشل لا ضابطہ 15 بشمول مارشل لا آرڈر 77 کے تحت جرائم کے مندرجات والا مذکورہ بالا خط لفظ بہ لفظ نقل کیا گیا ہے۔ اس طرح ہدایات کے عین مطابق مقدمہ درج کر دیا گیا ہے۔ (آئی ایس آئی ڈائریکٹوریٹ مٹا کر تحریر کیا گیا) مارشل لا ٹیم مقدمے کی تفتیش کرے گی۔

دستخط

امام بخش

اے ایس آئی 30/7/80

پولیس اسٹیشن نارتھ ناظم آباد، کراچی

ملزمان کے خلاف چارج شیٹ

سویلین ملزمان (1) احمد کمال وارثی ولد عبدالوحید ساکن 3/458 ڈرگ کالونی کراچی (2) غلام شبیر شر ولد عبدالرزاق ساکن خیر پور (3) سید جمال الدین نقوی ولد سید اقبال نقوی ساکن سی-56، بلاک ایل، نارتھ ناظم آباد، کراچی (4) محمد سہیل سانگی ولد بدر اقبال ساکن حیدرآباد (5) امر لال ولد ٹھاکر داس، ساکن پنو عاقل، سکھر (6) محمد جام ساقی ولد محمد سچل ساکن حیدرآباد اور (7) بدر جمال الدین ابڑو کو اجتماعی طور پر موردِ الزام ٹھہرایا گیا ہے۔

پہلا الزام مارشل لا ضابطہ-4 زیادہ سے زیادہ 10 برس قید	مختلف طبقات وغیرہ کے درمیان منافرت کی ترویج کیلئے مواد شائع کرنا، تقسیم کرنا اور رکھنا اُس میں وہ، جولائی 1980 کے دوران کراچی میں ہلچل اور سرخ پرچم کے نسخوں سمیت ریاست دشمن مواد اپنے پاس رکھتے ہوئے پائے گئے اور انہیں ایسے مواد کی موجودگی کی مکمل معلومات تھی جو مختلف طبقات اور مذہبی فرقوں کے درمیان عداوت اور نفرت کے جذبات بھڑکانے کا باعث بنتا تھا، اور اس طرح مذکورہ بالا جرم کے مرتکب ہوئے۔
دوسرا الزام مارشل لا ضابطہ-13 زیادہ سے زیادہ 5 برس قید بمعہ 10 کوڑے	مسلح افواج کیلئے عدم اطمینان پھیلانا اُس میں وہ، جولائی 1980 کے دوران کراچی میں قابلِ اعتراض مواد اپنے پاس رکھتے ہوئے پائے گئے اور عوام الناس میں نفرت اور اشتعال پیدا کرنے کی غرض سے متعصّبانہ سرگرمیوں میں ملوث رہے اور اس طرح مذکورہ بالا جرم کے مرتکب ہوئے۔

تیسرا الزام

مارشل لا ضابطہ-18

سات برس قید بمعہ دس کوڑے

نظریۂ پاکستان سے متصادم نقطۂ نظر وغیرہ کی تشہیر

اُس میں وہ،

جولائی 1980 کے دوران کراچی میں قابلِ اعتراض مواد کی اشاعت، تشہیر اور تقسیم کے ذریعے نظریۂ پاکستان اور مارشل لا نافذ کیے جانے کے مقاصد سے متصادم انداز میں پروپیگنڈا اور عمل کرنے کی بنا پر، مذکورہ بالا جرم کے مرتکب ہوئے۔

متبادل الزام

مارشل لا ضابطہ-36

بخالف صرف ملزم نمبر 4،5 اور 7

طویل ترین معیادِ قید کا 1/3

کسی جرم کے ارتکاب کی حوصلہ افزائی کرنا

اس میں وہ،

جولائی 1980 کے دوران کراچی میں، مسلح افواج اور قانونی طور پر قائم حکومت کے خلاف عدم اطمینان پھیلانے کی کوشش میں اور عوام الناس کے ساتھ مختلف طبقات اور مذہبی فرقوں کے درمیان نفرت و اشتعال پیدا کرنے کی غرض سے شریک ملزمان کے ساتھ سازش میں ملوث ہو کر مذکورہ بالا جرم کے مرتکب ہوئے۔

چوتھا الزام

سیکشن 124/A/149

پاکستان پینل کوڈ

25 برس قید

بغاوت

اس میں وہ،

جولائی 1980 کے دوران کراچی میں، ریاست دشمن مواد رکھنے کے علاوہ قانونی طور پر قائم حکومت کے خلاف عدم اطمینان پھیلانے کے مرتکب پائے گئے۔

کراچی

بتاریخ: 12 جولائی 1981

(دستخط)

کرنل

برائے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر

(سید محمد حاتم زیدی)

اگزبیٹ وی

ڈیوٹی افسر! مقدمہ درج کریں۔ آئی ایس
آئی ڈائریکٹوریٹ تفتیش کرے گا
(دستخط)
30-7-80
(مندرجہ بالا نوٹ قلم سے تحریر کیا گیا ہے)

اگزبیٹ ڈبلیو

ہیڈکوارٹرس
ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر سیکٹر-II
ایم پی اے ہاسٹل کراچی
ٹیلی فون: 516756
320/56/ML
30جولائی1980

بنام ایس پی لیاقت آباد
کراچی

موضوع: مقدمے کا اندراج

1- اطلاع موصول ہونے پر گھروں پر چھاپے اور تخریبی مواد کی تلاشی کیلیئے ایک مجسٹریٹ کی سربراہی میں ایک چھاپہ مار ٹیم تشکیل دی گئی۔ انکے چھاپوں کے نتیجے میں، بڑی تعداد میں تخریبی مواد، بشمول ٹائپنگ اور سائیکلو اسٹائلنگ مواد وغیرہ جائے وقوعہ سے برآمد کیا گیا۔ غلام شبیر ولد عبدالرزاق اور احمد کمال وارثی ولد عبدالوحید وارثی سکنہ گھر نمبر سی-19، پیپلز کالونی، بلاک این، نارتھ ناظم آباد کراچی کو بھی چھاپہ مارنے والی ٹیم نے جائے وقوعہ سے حراست میں لیا۔

2- براہ مہربانی مقدمہ درج کریں اور تفتیش مکمل کریں۔

(قلم سے تحریر کردہ فوٹ)
ایس ایچ او نارتھ ناظم آباد
بموجب مقدمہ درج کریں
اور مزید قانونی کاروائی کریں
(دستخط)
ایس پی لیاقت آباد، کراچی
30/7

(دستخط)
میجر
برائے ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر
(طفیل حسین خان)

ایگزبیٹ اے اے

فردمقبوضگی 80-8-28وقت 00-12 بجے

روبرو گواہان ذیل، میں محمد حنیف ولد محمد اکرم خان اعوان ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ حیدرآباد، جناب DM (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) کے حکم کے مطابق بمعہ ایس ایچ او فیصل احمد باجوہ پولیس اسٹیشن لطیف آباد کے، بابن شاہ کالونی مکان نمبر 752 کے گھر کی تلاشی مالکان کی غیر موجودگی میں لی۔ مکان نمبر 752 کے اندر کمرے سے مندرجہ ذیل کتابیں، سیاہی، پنچنگ مشین وغیرہ جن میں حکومت پاکستان کے خلاف قابلِ اعتراض مواد تھا اپنے قبضے میں لیا۔ جسکی تفصیل الگ کاغذ میں اسکے ساتھ شامل ہے۔

نوٹ: یہ مشیرنامہ مشیروں کے روبرو تیار کیا گیا جنہوں نے پڑھ کر سُن کر اسے صحیح تسلیم کر کے دستخط کیئے۔

بقلم خود ہاشم علی خان
ولد مراد علی خان
مکان نمبر 759 بابن شاہ کالونی
حیدرآباد

(دستخط)

شمس الدین ولد امام دین
مقان نمبر 754، بابن شاہ کالونی
حیدرآباد

(دستخط)

ایگزبیٹ جے جے

دفتر برائے سپرنٹنڈنٹ آف پولیس، لیاقت آباد ڈویزن، کراچی

نمبر SPL/CB-II/80-0809-10

جناب ممتاز احمد برنی،

ایس ڈی پی روینیو کراچی

چونکہ مذکورہ بالا مقدمے میں مزید قانونی اقدامات ہمیں دیئے جا رہے ہیں، سو آپکو درخواست کی جاتی ہے کہ اس ضمن میں منتخب اہلکاروں کی ایک ٹیم تشکیل دیں۔ علاوہ ازیں، ایس ایچ او نارتھ ناظم اور ایس ایچ او منگھو پیر کو بھی مقدمے کی کاروائی میں آپکی ہمکاری کرنے کیلئے مقرر کیا گیا ہے۔ آپ مندرجہ بالا افسران کے علاوہ، کسی اور کا نام تجویز کر سکتے ہیں تا کہ انہیں نامزد کیا جا سکے۔

آپ پولیس ٹیم کے انچارج ہوں گے اور رابطہ کار کے طور پر بھی کام کریں گے۔ یہ بالکل واضع رہے کہ مذکورہ مقدمہ قانونِ شہادت اور سی آر پی سی سے مطابقت میں مکمل کیا جائے، جس دوران دیگر قانونی ضروریات وشرائط کو پیشِ نظر رکھا جائے گا۔ مقدمے کو مزید کسی تاخیر کے بغیر مکمل کیا جائے۔

یہ دفتر ہٰذا کی خط نمبر PL/CB-II/8-20005-08 1980، کے تسلسل میں ہے، جو کہ ایس ایچ او کو مخاطب ہے اور آپکی توثیق کا حامل ہے۔

دستخط

(منور علی)

سپرنٹنڈنٹ آف پولیس

لیاقت آباد ڈویژن، کراچی

نقل برائے ایس ایچ او منگھو پیر پولیس اسٹیشن برائے تعمیل

ایگزیبیٹ وائے Y

دو گواہان کی موجودگی میں، میں سید ممتاز احمد برنی سب ڈویژن پولیس آفیسر، نارتھ کراچی نے نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن، کراچی کے سیکشن 15/18(3) MLR R/W 77 MLO کے تحت داخل مقدمہ نمبر 236/80 کی تفتیش کے سلسلے میں گورنمنٹ اردو سائنس کالج کراچی کے پرنسپل سے ذیل درج دستاویزات حاصل کیے۔

دستاویزات کے تفصیل

1- پروفیسر جمال الدین نقوی کی اردو میں دستی تحریر والی درخواست، بتاریخ 17 نومبر 1977۔

2- پروفیسر جمال الدین نقوی کا بتاریخ 11 مارچ 1978 کو گورنمنٹ اردو سائنس کالج کے پرنسپل کو مخاطب کردہ انگریزی میں تحریر کردہ شمولیت کا خط۔

3- پروفیسر جمال الدین نقوی کی جانب سے 4 اگست 1973 تا 19 اگست 1973 کراچی سے باہر جانے سے متعلق پرنسپل گورنمنٹ اردو سائنس کالج کو 30 جولائی 1973 کو انگریزی میں تحریر کی گئی درخواست۔

4- پروفیسر جمال الدین نقوی کا 28/27 اگست 1973 کی درمیانی شب اپنی گرفتاری سے متعلق 22 دسمبر 1973 کو تحریر کیا گیا خط۔

5- پروفیسر جمال الدین نقوی کی جانب سے اپنی ذاتی معلومات کے سلسلے میں پُر کیا گیا فارم۔

گواہان

1- (دستخط) ایم شفیق خان

2- (دستخط) اے زمان خان بتاریخ 29 نومبر 1980

(دستخط)

(ایس ممتاز احمد برنی)

تفتیشی اہلکار

ایگزیبیٹ ایچ

خفیہ/فوری

دفتر برائے سپرنٹنڈنٹ آف پولیس، لیاقت آباد ڈویژن، کراچی

نمبر: ایس پی ایل/ سی بی II/80-21046-48-80

برائے

سیکریٹری محکمئہ داخلہ،

حکومتِ سندھ، کراچی

(بنام)

موضوع: کراچی کے احمد کمال اور غلام شبیر شر کی 'سرخ پرچم' اور 'ہلچل' کی خفیہ اشاعت/ تقسیم کے سلسلے میں گرفتاری

میمورنڈم

براہ مہربانی ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس، کراچی کو مخاطب کیے گئے اور دفترِ ہذا کو نقل کیے گئے اپنے خط نمبر SOJ/80)IV93) بتاریخ 8 اکتوبر 1980 کو ملاحظہ کیجئے۔

2- سید ممتاز احمد برنی ایس ڈی پی او نیو کراچی کو پہلے سے ہی نارتھ ناظم آباد پولیس اسٹیشن کے سیکشن (3)15/18 بشمول مارشل لا ضابطہ-77 کے تحت دائر مذکورہ مقدمے اور جلد از جلد تفتیش کو مکمل کرنے کی ہدایات جاری کی گئی ہیں۔

دستخط

(منور علی)

سپرنٹنڈنٹ آف پولیس

لیاقت آباد ڈویژن، کراچی

ایک نقل ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس، کراچی رینج، کراچی کی معلومات کیلئے انکے دفتر کی رسید نمبر CON/6280/Q-15(i)/80 بتاریخ 19 اکتوبر 1980 داخل کرائی گئی ہے۔فوری حوالہ جات کیلئے ذیل درج ملفوف بھی شامل کیے گئے ہیں۔

1- وزارتِ داخلہ،حکومتِ پاکستان، اسلام کی جانب سے خط نمبر 8/11/80-Poll-I(i) بتاریخ 28 ستمبر 1980 (دوصفحات)

2- سرخ پرچم اور ہلچل کی خفیہ اشاعت اور تقسیم میں شامل مشکوک افراد کی فہرست (کل تین صفحات)

نقل برائے سید ممتاز احمد برنی، ایس ڈی پی او، نیو کراچی برائے ضروری عمل درآمد۔ جیسا کہ پہلے ہی ہدایات جاری کی جا چکی ہیں کہ آپ ذاتی طور پر مذکورہ مقدمے کی تفتیش اپنے ذمے لیں اور جلد از جلد اسکو مکمل کریں۔

دستخط

(منور علی)

سپرنٹنڈنٹ آف پولیس

لیاقت آباد ڈویژن، کراچی

ایگزبیٹ کے کے

خفیہ/فوری

4117/76-P.I (3)

منجانب: جناب غالب لطیف
ڈپٹی سیکریٹری (ذرائع ابلاغ)
ٹیلی فون نمبر: 21404

حکومتِ پاکستان

وزارتِ اطلاعات ونشریات

اسلام آباد: اگست 1976

برائے:

1- سیکریٹری برائے حکومتِ
شمالی مغربی سرحدی صوبہ،
محکمۂ اطلاعات، سروسز اور عمومی
پشاور

2- سیکریٹری برائے حکومتِ پنجاب،
محکمۂ اطلاعات، ثقافت وسیاحت،
لاہور

3- سیکریٹری حکومتِ سندھ،
محکمۂ اطلاعات،
96-پاکستان سیکریٹریٹ،
کراچی

4- سیکریٹری حکومتِ بلوچستان،
محکمۂ داخلہ، قبائلی امور، سیاحت واطلاعات
(انفارمیشن سیکشن)
کوئٹہ

موضوع: ''سرخ پرچم'' کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا ایک جریدہ

جناب،

مجھے یہ کہنے کی ہدایت کی گئی ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا ''سرخ پرچم'' نامی ایک جریدہ فیڈرل انٹیلی جنس بیورو کی توجہ میں آیا ہے۔ اس پر کوئی پرنٹ لائن نہیں ہے اور اس وجہ سے یہ ایک خفیہ جریدہ لگتا ہے۔ ''سرخ پرچم'' کے مندرجات بھی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ محنت کش طبقات کے اتحاد کے نام کو اپنے بنیادی ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے کمیونسٹ پارٹی (روس نواز) کی ہی حکمت عملی پر کاربند ہے۔

2- میں اس لئے، درخواست کرتا ہوں کہ صوبائی حکومتیں ازراہ مہربانی ''سرخ پرچم'' کے طابع، ناشر اور ایڈیٹر کو تلاش کرنے کی غرض سے اقدامات کریں اور قانون کی خلاف ورزی پر ان کے خلاف تادیبی کاروائی کریں۔ صوبائی حکومت تقسیم شدہ ''سرخ پرچم'' کے تمام شمارے ضبط کرنے کے بھی اقدامات کرے۔

آپ کا تابعدار خادم

دستخط

(غالب لطیف)

حقیقی تصدیق شدہ نقل

دستخط

مہر- محمد علی شاہ

سیکشن آفیسر (ذرائع ابلاغ)

حکومتِ سندھ، محکمۂ داخلہ

خصوصی فوجی عدالت نمبر 5

کے ایم سی اسپورٹس کامپلیکس

کشمیر روڈ کراچی

ٹیلی فون نمبر 419380

ML/1/B6/C

18 ستمبر 1982

بنام

ملزم احمد کمال وارثی

ملزم غلام شبیر شر

ملزم سید جمال الدین نقوی

ملزم محمد سہیل سانگی

ملزم بدر جمال ابڑو

ملزم امر لال

ملزم محمد جام ساقی

موضوع: مقدمہ ریاست بخلاف احمد کمال وارثی اور دیگر

ایف آئی آر 236/80 پولیس اسٹیشن نارتھ ناظم آباد

عدالت ہدایت کرتی ہے کہ آپ اگلی سماعت بتاریخ 2 اکتوبر 1982 پر صفائی کے گواہان کی فہرست عدالت میں پیش کریں۔

دستخط

لیفٹیننٹ کرنل

صدر

(محمد عتیق)

استغاثہ کے پاس ملزمان کے خلاف کافی مقدار میں مواد ہے اور وہ اس حیثیت میں ہے کہ اس مواد سے ملزمان کے طبقاتی منافرت پیدا کرنے ،عوام الناس کے کم آمدنی والے پرتوں، مسلح افواج اور پولیس کی تضحیک، حکمرانوں اور رعایا کے درمیان تفریق/ تناؤ پیدا کرنے، چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر پر تنقید، کمیونسٹ نظریے، روسی/افغان نقطۂ نظر یا پاکستان کی افغانستان مہاجرین کیلئے حمایت کی تشہیر کے بنیادی مقصد وہدف کو ثابت کرے۔ غلام شبیر اور احمد کمال وارثی کے سیکشن 164 سی آر پی سی کے تحت اعترافی بیانات ریکارڈ کیے گئے ہیں اور وہ کچھ دیگر ملزمان کے ساتھ ملوث پائے گئے ہیں۔

کراچی

81-12-29

دستخط

(سید انور شورو)

اے پی پی

ملزمان سے برآمد شدہ اشیا کی فہرست

I- ایس پی لیاقت آباد کے حکم نامے نمبر SPL/CB-II/80-1948283 بتاریخ 17 ستمبر 1980 کی بجا آواری میں پولیس اسٹیشن نارتھ ناظم آباد کے سیکشن 15 اور 18 مارشل لاضوابط 1977، بشمول مارشل لاحکم نامہ 77 کے تحت دائر مقدمہ ایف آئی آر نمبر 236/80 کے ذیل درج کاغذات وصول کیے۔

1- ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ جنوبی (VII) رمضان لغاری کی موجودگی میں پولیس اسٹیشن آرٹلری میدان کے سب انسپکٹر اسلم نور کے تیار کردہ گھر نمبر سی-344 پاکستان کوارٹرس اور گھر واقع پیپلز کالونی، نارتھ ناظم آباد، کراچی کے برآمدگی نامے بتاریخ 29 جولائی 1980 (6 اوراق)۔

2- ملزمان (ا) نذیر عباسی (۲) پروفیسر جمال الدین نقوی کی جامہ تلاشی، گرفتاری اور سپردگی نامے بشمول پولیس اسٹیشن نارتھ ناظم آباد کے سب انسپکٹر زبیر احمد کی جانب سے برآمد کی گئی اشیا کا مشیر نامہ، بتاریخ 30 جولائی 1980 - ایک ورق۔

3- ملزم محمد سہیل سانگی کی جامہ تلاشی، گرفتاری اور سپردگی نامے بشمول پولیس اسٹیشن سولجر بازار کے اے ایس آئی غلام محمد کی جانب سے برآمد کی گئی اشیا کا مشیر نامہ، بتاریخ 31 جولائی 1980 - ایک ورق۔

4- اے ڈی ایل، سٹی مجسٹریٹ محمد حنیف ولد محمد اکرم خان کی جانب سے گھر نمبر 752 بابن شاہ کالونی، حیدرآباد کی تلاشی کا برآمدگی نامہ بشمول برآمدگی فہرست بتاریخ 2 اگست 1980 ۔ 6 اوراق۔

5- انسپکٹر خلیل احمد باجوہ، ایس ایچ او لطیف آباد، حیدرآباد، ہاشم علی خان ولد مراد علی خان اور شمس الدین ولد امام الدین کے بیانات، تین اوراق۔

II- تخریبی مواد، تصاویر، مختلف کاغذات، نقدی، سائیکلو اسٹائل مشین، ٹائپ رائٹر، سیاہی، اسٹیپلنگ مشین وغیرہ، جیسا کہ مشیر نامے میں بیان کیا گیا ہے، کی فہرست تیار کی گئی ہے۔ یہ تمام

اشیا مارشل لاٹیم کی تحویل میں ہیں اور خصوصی فوجی عدالت کے طلب کرنے پر پیش کی جائیں گی۔

سپردگی	وصولی
(دستخط)	(دستخط)
18/9/80	ایس ایچ او پولیس اسٹیشن نارتھ ناظم آباد
	18/9/80

31-7-80

سہ پہر ساڑھے تین بجے

فردگرفتاری وجامہ تلاشی وسپردگی ملزم

روبروگواہان ذیل من اے ایس آئی غلام محمد متعینہ تھانہ سولجر بازار دورانِ علاقہ گشت بمقام پاکستان کوارٹرز پہنچا تو کانسٹیبلان ولایت خان نمبر8936اور نیاز احمد نمبر4256 ماموره ڈیوٹی مکان نمبرای344 پاکستان کوارٹرس نے ایک شخص جس کا نام محمد سہیل سنگی (سانگی کے بجائے سنگی تحریر کیا گیا ہے) ولد محمد رمضان معلوم ہوا کو پیش کرتے ہوئے ظاہر کیا کہ ہماری ڈیوٹی مکان نمبری مذکورہ پرتھی کیونکہ ایک دوروز قبل اسی مکان سے چھاپہ کے دوران مارشل لاٹیم نے تخریبی مواد برآمد کیا تھا اوراسی سلسلہ میں مکانِ مذکورہ پرنگرانی کیلئے ہماری ڈیوٹی لگی ہوئی تھی لہٰذا مکان نمبری مذکورہ میں آنے والے شخص مسمی محمد سہیل سنگی کوپیش کرتے ہیں لہٰذا مجھ اے ایس آئی نے پیش کردہ شخص مذکورہ کی جامہ تلاشی بموجودگی مارشل لا ڈیوٹی اسٹاف حسبِ ضابطہ عمل میں لائی تو بہ تفصیل ذیل سامان برآمد ہوا۔

تفصیلِ سامان

1- ڈائری HBL،1980 رنگ براؤن

2- آڈنٹٹی کارڈ نمبر450-50-200197

3- UBL رسید اکاؤنٹ نمبر7701

4- چٹ جس پر4 نام درج ہیں

5- رقعہ مورخہ 19 اپریل 1980 ازعلی محمد (نام غلط درج کیا گیا ہے، رقعہ علی حسن کا تحریر کردہ تھا)

6- نسخہ ازڈاکٹر اے کے یوسفزئی

7- اردو تحریر وزیرِ اطلاعات کے جلسہ میں شرکت (جو کہ ہفت روز، معیار کیلئے تحریر کیا گیا تھا)

8- اردو تحریر ''یہ ریڈیو پاکستان حیدرآباد ہے۔''

9- انگریزی تحریر بنام ''جنرل ضیاء الحق'' (سندھ نیوز کے.... کے نام، ملازمین کو نکال رہے ہیں، انکو روکا جائے)۔

10- تحریر بابت حساب کتاب

11- رسید نمبر 59 مورخہ 21-7-80

12- لفافہ بنام عبدالمجید صحافی

13- تصویریں 3 اشخاص

14- نقدی مبلغ 135 روپے

ہٰذا فرد موقعہ پر مرتب کی گئی اور مذکورہ برآمدگی برائے فرد قبضہ میں لی گئی اور شخص مذکورہ کی گرفتاری حسبِ دفعہ 54.... عمل میں لائی۔ ملزم متذکرہ کو معہ فرد معہ سامان برآمد شدہ موجود مارشل لا اسٹاف سب انسپکٹر ظفر اقبال کے سپرد کیا گیا۔

تفصیلِ گواہان

(دستخط) 1- کانسٹیبل ولایت خان نمبر 8936 متعینہ تھانہ سولجر بازار کراچی

(دستخط) 2- کانسٹیبل نیاز احمد نمبر 4256 متعینہ تھانہ سولجر بازار کراچی

(دستخط) 3- سب انسپکٹر ظفر اقبال مارشل لا اسٹاف

4- اسسٹنٹ سب انسپکٹر غلام محمد متعینہ تھانہ سولجر بازار کراچی

(دستخط)

اے ایس آئی

31/7/80

پولیس اسٹیشن سولجر بازار

کراچی

نوٹ: ایگزبیٹ کیو 1

ایگزبیٹ کیو 2

اے ایس آئی اسکے شناختی کارڈ اور تصویر سے متعلق

بدر ابڑو کی حراست کے خلاف پٹیشن

بدر ابڑو کے بھائی اظہر جمال ابڑو کی درخواست پر سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس عبدالحئی قریشی اور مسٹر جسٹس افضل میاں پر مشتمل ڈویژن بینچ نے ایڈووکیٹ جنرل سندھ کو 4 دسمبر 1980 کو نوٹس جاری کیا۔ درخواست گذار کے مطابق اسکا بھائی بدر جمال ابڑو 3 نومبر کو لاپتہ ہوگیا تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ اسے ایس ایچ او منگھو پیر نے تھانے میں بند کر رکھا ہے جبکہ گرفتاری کی وجہ نہیں بتائی گئی ہے۔ ایس ایچ او کا یہ اقدام غیر قانونی ہے لہٰذا بدر جمال ابڑو کی رہائی کا حکم دیا جائے۔

ایف آئی آر نمبر 236/80

ریاست بخلاف بدر جمال ولد جمال الدین

سیکشن (3) 15/18 مارشل لا ضوابط 1977

بشمول مارشل لا حکم نامہ 77

پولیس اسٹیشن نارتھ ناظم آباد

ملزم کو آج صبح دس بجے سیکشن 164 سی آر پی سی (ضابطہ فوجداری قانون) کے تحت اپنا بیان درج کرانے کیلئے پیش کیا جاسکتا ہے۔

ملزم بدر جمال ابڑو نے بیان دینے سے انکار کیا اور کہا کہ وہ مقدمہ چلانے والی عدالت کے سامنے حقائق ظاہر کریں گے۔ اس لئے میں انکو 3 دسمبر 1980 تک چودہ روز کیلئے جیل وارنٹ کے تحت عدالتی تحویل میں دیتا ہوں، جب انہیں مقدمہ چلانے والی عدالت کے روبرو پیش کیا جائے گا۔

دستخط

اے سی ایم 2 (ویسٹ)

20 نومبر 1980

حمیدہ گھانگھرو کا کھلا خط!

محترم.........

سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن (SNSF) کے مرکزی صدر، فیڈرل یونین آف اسٹوڈنٹس کے وائس چیئرمین اور مزدور - کسان - طلبہ عوامی رابطہ کمیٹی کے رہنما جناب نذیر عباسی شہید کو فوج کے فیڈرل انویسٹی گیشن یونٹ اور پولیس کے کارندوں نے 30 جولائی 1980 کو کراچی سے گرفتار کیا۔ گرفتاری کے بعد انہیں ماری پور کے فوجی تفتیش کے مرکز میں 9 اگست 1980 کو بہیمانہ تشدد اور بے دردی کے ساتھ اذیتیں پہنچا کر قتل کر دیا۔

نذیر عباسی شہید آخری دم تک اپنے وطن کے تمام دکھی انسانوں اور کچلے ہوئے طبقات کو اندرونی اور بیرونی استحصال، استعمار اور آمریت سے نجات دلانے کی خاطر لڑتا رہا۔ متعدد بار قید و بند اور فوجی تفتیشی مراکز میں مصیبتیں برداشت کرتا رہا اور اپنے آدرشوں کی تکمیل کی راہ میں اپنی جان قربان کر دی۔

مجھے فخر ہے کہ میری شادی ہماری دھرتی کے ایک ایسے سپوت سے ہوئی جو انسان دوست تھا۔ فسطائیت اور جبر کے خلاف برسرِ پیکار تھا جو سامراجی قوتوں سے جنگ جاری رکھنا چاہتا تھا اور اپنے ملک سے اندھیرے ختم کر کے اجالوں کی فضا قائم کرنا چاہتا تھا۔

فاشسٹ درندے اس دھرتی کو سنوارنے کی جدوجہد کرنے والوں کو بے دردی سے قتل کر کے اور ان پر وحشیانہ جبر و تشدد روا رکھ کر شاید اس خوش فہمی میں ہیں کہ اس طرح ان کے فرسودہ نظام کی عمر شاید کچھ اور بڑھ جائے، لیکن مجھے یقین ہے کہ نذیر عباسی شہید کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب ہوگا۔

میں ملک کی تمام جمہوری قوتوں اور اس ملک سے سامراجی استحصال کے خاتمے کیلئے جدوجہد کرنے والی تمام ترقی پسند، روشن خیال اور باضمیر تنظیموں اور افراد سے اپیل کرتی ہوں کہ وہ اس ننگی اور بے شرم جارحیت کے خلاف اور ان اعلیٰ مقاصد کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لئے متحد ہو کر اُٹھ کھڑے ہوں، جن کی تکمیل کیلئے نذیر عباسی شہید نے اپنی جان قربان کر دی۔

منجانب: حمیدہ گھانگھرو — دستخط

بیوہ نذیر عباسی شہید — (حمیدہ گھانگھرو)

جناب اسٹیشن ہاؤس آفیسر (SHO) صاحب!
ڈفینس پولیس اسٹیشن
ڈفینس ہاؤسنگ سوسائٹی- کراچی

جانب اعلیٰ!

میں حمیدہ گھانگھرو بیوہ نذیر عباسی شہید ساکن شاہی بازار محراب پور جنکشن ضلع نواب شاہ سندھ فریادی ہوں کہ میں نذیر عباسی شہید کی بیوہ ہوں۔ میرے شوہر ایک ترقی پسند طالب علم تھے۔ وہ سندھ یونیورسٹی کے ایم اے سیاسیات کے طالب علم تھے اور سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے مرکزی صدر اور مزدور کسان طالبہ عوامی رابطہ کمیٹی سے منسلک تھے اور پاکستان فیڈرل یونین آف اسٹوڈنٹس کے وائس چیئرمین تھے۔ وہ موجودہ فوجی آمریت کے مخالف تھے اور ملک میں ایسے نظام کے قیام کے متمنی جو ہر قسم کے استحصال سے پاک ہو۔ میرے شوہر کے ان سیاسی خیالات کی وجہ سے کچھ عرصہ قبل فوج کے فیڈرل انوسٹی گیشن یونٹ نے انہیں گرفتار کیا تھا اور کوئٹہ میں ان پر تشدد کیا تھا اور یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر وہ اس تشدد کے بعد بھی سیاست میں حصہ لیں گے تو انہیں مار ڈالا جائیگا۔ ان حقائق پر مبنی انہوں نے سندھ ہائی کورٹ میں حلف نامہ بھی داخل کیا تھا۔

بتاریخ 30 جولائی 1980 میرے شوہر نذیر عباسی کو پاکستان کوارٹرز میں انکے ایک دوست کے گھر سے گرفتار کیا گیا اور ماری پور ملٹری انوسٹی گیشن سینٹر لے جایا گیا۔ میرے شوہر کو ایف آئی یو اور پولیس نے گرفتار کیا تھا۔ ماری پور انوسٹی گیشن سینٹر میں انہیں مسلسل اذیتیں دی جاتی رہیں اور ظلم وتشدد اور بہیمانہ عمل کے نتیجے میں 9 اگست 1980 کو نذیر عباسی کی موت واقع ہوگئی۔ یہ دانستہ قتل عمد جنرل ضیاالحق اور گورنر ایس ایم عباسی کی ہدایت پر فوجیوں نے کیا ہے کیونکہ جنرل ضیاالحق نے ببانگ دہل اپنے مجرمانہ ارادوں کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ وہ بائیں بازو کے لوگوں کو نہیں چھوڑیں گے اور انکو اُلٹا لٹکا دیں گے۔

جب مذکورہ بالا تشدد کے نتیجے میں میرے شوہر نذیر عباسی کی موت بتاریخ 9 اگست 1980 بوقت دوپہر واقع ہوگئی تو انکی لاش کو نیول اسپتال کراچی لے جایا گیا۔ ڈفینس پولیس اسٹیشن

کے سب انسپکٹر اختر نے دفعہ 174 ضابطۂ فوجداری کے تحت کاروائی کی اور لاش سول اسپتال کے مردہ خانے میں بھیج دی گئی۔ سول اسپتال میں میرے شوہر نذیر عباسی شہید کا پوسٹ مارٹم ڈاکٹر مجید اور ڈاکٹر قیصر رسول سے کرایا گیا۔ جرم کی پردہ پوشی کے لئے میرے شوہر کی لاش کسی بھی رشتہ دار کے حوالے نہیں کی گئی اور چونکہ اس جرم میں ملک کے اعلیٰ ترین حکام شامل ہیں، اس لئے صحیح اور درست پوسٹ مارٹم کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ جرم کی مزید پردہ پوشی کے لئے میرے شوہر کے دور کے رشتہ دار یعنی نذیر عباسی شہید کے بہنوئی کے بھائی کو جسکا نام ولی محمد ہے پولیس کی حراست میں مردہ خانے لے جاکر میرے شوہر کی لاش کی شناخت کرائی گئی اور اس دور کے رشتہ دار کے مطالبے کے باوجود میرے شوہر کی لاش انکے سپرد نہیں کی گئی۔ اور جیل میں بند کرنے کی دھمکی دے کر زبردستی ولی محمد سے چند کاغذات پر دستخط کروائے گئے۔ اسکے بعد نہایت خفیہ طور پر پولیس نے ایک لاوارث لاش کی طرح میرے شوہر کو ستار ایدھی سوشل ورکر کے ذریعے غسل کروایا اور کفن پہنایا گیا اور ستار ایدھی کے ساتھ پولیس نے میرے شوہر کی لاش تقریباً دو بجے سخی حسن قبرستان میں دفن کردی گئی۔

فریاد ہے کہ یہ قتل عمد جنرل ضیاالحق اور جنرل ایس ایم عباسی کے سوچے سمجھے منصوبے، انکے احکامات کے تحت کیا گیا ہے اور فوج یعنی ایف آئی یو اور ماری پور تفتیش کے مرکز کے اراکین شریک جرم ہیں۔ فریاد ہے کہ مذکورہ ملزمان کے خلاف قانون کے تحت کاروائی کی جائے۔

چونکہ مجھے اور میرے عزیزوں کو ہراساں اور پریشان کیا جارہا ہے۔ پولیس انہیں بے حد تنگ کررہی ہے اس لئے ذاتی جانی خطرے کی بنا پر میں یہ رپورٹ بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ ایس ایچ او ڈیفنس پولیس اسٹیشن، متعلقہ ایس پی اور ڈی آئی جی کراچی کو روانہ کررہی ہوں۔

(دستخط)

حمیدہ گھانگھرو

بیوہ نذیر عباسی شہید

ساکن شاہی بازار۔ محراب پور جنکشن

بیان

مسماۃ حمیدہ گھانگھرو بیوہ نذیر عباسی

B-1060، اسٹیل ٹاؤن، کراچی

میرا آبائی تعلق شاہی بازار، محراب پور جنکشن، ضلع نواب شاہ سے ہے۔ میرے شوہر نذیر عباسی سندھ یونیورسٹی میں ایم اے سیاسیات کے طالب علم تھے۔ وہ ترقی پسند اور سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے مرکزی صدر اور مزدور، کسان، طلبہ عوامی رابطہ کمیٹی سے منسلک تھے۔ وہ پاکستان فیڈرل یونین آف اسٹوڈنٹس کے وائس چیئرمین بھی تھے۔ وہ ملک میں اُس وقت موجود فوجی آمریت کے مخالف تھے۔ میرے شوہر کے سیاسی خیالات کی وجہ سے 1978 میں ایف آئی یو کے فوجیوں نے انکو گرفتار کیا، کوئٹہ میں رکھا اور اُن پر تشدد کیا۔ فوجیوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر انہوں نے اب سیاست میں مزید حصہ لیا تو انہیں مار ڈالیں گے۔ ان حقائق پر مبنی حلف نامہ انہوں نے سندھ ہائی کورٹ میں داخل کیا تھا۔

مورخہ 30 جولائی 1980 کو میرے شوہر کو ایف یو ایس اور فوج نے نارتھ ناظم آباد تھانہ کے علاقے سے گرفتار کیا اور انکے خلاف اُس تھانے میں ایک مقدمے میں ملوث کر کے ماری پور میں آئی ایس آئی کی حراست میں رکھا جسکے دوران میرے شوہر نذیر عباسی کو جسمانی تشدد اور ایذا رسانی سے فوجیوں نے قتل کر ڈالا۔ یہ واقعہ 9 اگست 1980 کا ہے۔ جس طرح مجھے اب تک معلومات حاصل ہوئی ہیں اسوقت کے آئی ایس آئی انچارج لفٹننٹ کرنل امتیاز کی ہدایت اور نگرانی میں میرے شوہر نذیر عباسی کو قتل کیا گیا۔ یہ کرنل امتیاز بعد میں آئی ایس آئی میں کافی عرصہ رہا اور برگیڈیئر ہو کر ریٹائر ہوا یہ قتل اُس وقت کے صدر جنرل ضیاالحق اور اسوقت کے گورنر سندھ جنرل عباسی کی خواہش پر کرنل امتیاز نے اپنے عملے کی مدد سے کیا۔

میرے شوہر نذیر عباسی کو اپنی حراست کے دوران قتل کر کے ان کی لاش پی این ایس شفا میں پہنچائی گئی، جہاں تھانہ ڈیفنس کے سب انسپکٹر اختر نے 174 کی کاروائی کر کے لاش کو سول

اسپتال پہنچایا۔ وہاں پوسٹ مارٹم ڈاکٹر مجید اور ڈاکٹر قیصر رسول سے کرایا گیا اور ان سے بھی قتل پر پردہ ڈالنے میں مدد لی گئی۔ لاش کو پولیس کے ذریعے ایدھی والوں سے رات کے اندھیرے میں سخی حسن قبرستان میں دفن کرادیا گیا۔ برائے نام لاش کی حوالگی مقتول کے بہنوئی کے بھائی ولی محمد کی نام دکھائی گئی۔

میں نے اس واقعہ کی فریاد کہ یہ قتل عمد جنرل ضیاالحق اور جنرل ایس ایم عباسی کے سوچے سمجھے منصوبے اور احکامات کے تحت کیا گیا تھا اور فوجی اور ماری پور تفتیش کے مرکز کے اراکین مجرم ہیں، ان کے خلاف کاروائی کیلئے تھانہ ڈیفنس کے ایس ایچ او کو بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ تحریری طور پر اپنے دستخط سے مورخہ 17 اگست 1980 کو بھیجی کیونکہ میں ذاتی طور پر اس لئے نہیں جاسکی کہ مقتول کے رشتہ داروں کو مجھ سمیت سخت ہراساں کیا جارہا تھا۔

اسکے بعد کوئی ایف آئی آر درج نہیں ہوئی اور وجۂ موت اس جرم کے ذمہ داروں نے جرم پر پردہ ڈالنے کیلئے اپنی خواہش کے مطابق بتائی۔ 176 کی کاروائی بھی میری تسلی یا قانونی تقاضوں کی پیروی کے بجائے ملزمان کو بچانے میں ختم کردی گئی۔ اب ایک درخواست جناب وزیرِ داخلہ پاکستان کے نام دی تھی کہ اب مجھے بیان دینے کیلئے ڈی ایس پی کرائم برانچ کے روبرو آنا پڑا۔ اس درخواست کی فوٹو کاپی دیکھیں جس پر میرے دستخط ہیں۔ اپنی درخواست بتاریخ 17 اگست 1980 کی سائیکلو اسٹائل نقل پیش کروں گی۔ بیان پڑھ کر سنایا گیا، لفظ بلفظ درست لکھا گیا ہے۔

(دستخط)

حمیدہ گھانگھرو

7/9/1994

(دستخط)

(فضل عباس شاہ) ڈی ایس پی، کرائم برانچ، کراچی

7.9.94

ایگزیبیٹ ایس　　　　　　نیا ایگزیبیٹ آر

غلام شبیر شر ولد عبدالرزاق شر کا اعترافی بیان

میں غلام شبیر ولد عبدالرزاق شر بیان دیتا ہوں کہ میں نے 1973 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ جس کی بعد میں نے پاکستان ورکس اینڈ بلڈنگس ڈپارٹمنٹ سکھر میں بطور کلرک ملازمت اختیار کی۔ اسی دوران میں نے اسلامیہ کالج سکھر کے آرٹس سیکشن میں اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ میں نے کالج میں تعلیم کے دوران سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں شمولیت اختیار کی۔ میں نے 1974 میں کالج چھوڑ دیا نتیجتاً سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے بھی رابطہ منقطع کرلیا۔ میں نے سندھی آرٹس کونسل بنائی، جس کے تحت سکھر میں پروگرام کیے جاتے تھے۔ دسمبر 1976 میں، میں نے بطور کلرک اپنا تبادلہ محکمۂ ہائی ویز میں کرایا۔ میں نے ڈرامہ آرٹسٹ کے طور پر ریڈیو سروس میں شمولیت اختیار کی۔ میں ''حاجی صاحب'' سے اپنے بڑے بھائی غلام حسین شر کے توسط سے فلیٹ نمبر ای-63 واپڈا کالونی سکھر میں ملا۔ مجھے محسوس ہوا کہ حاجی صاحب کوئی سیاسی شخص ہے۔ جنوری 1978 میں مجھے اپنے والد سے ایک خط موصول ہوا، جس میں لکھا گیا تھا کہ سکھر کے سب مارشل لا ایڈمنسٹریٹر میجر شاہ جہان نے غلام حسین کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کیے ہیں اور یہ کہ غلام حسین مفرور ہوگیا ہے اور خواتین سمیت خاندان کے افراد کو گرفتار کرنے کا حکم جاری کیا گیا ہے، اس لئے انہوں نے مجھے گھر پہنچنے کی ہدایت کی۔ میں گھر پہنچ گیا اور اپنے گھر کی حالت انتہائی ابتر صورت میں دیکھی۔ میں اپنے والد کے ہمراہ سکھر میں میجر شاہ جہان سے ملا اور اسکو بتایا کہ غلام حسین کا سراغ نہیں لگایا جاسکا ہے۔ میجر شاہ جہان نے ہمارے ساتھ براہ راست بدتمیزی کی اور ہمیں حکم دیا کہ غلام حسین کو ایک ہفتے کے اندر اسکے سامنے پیش کیا جائے ورنہ وہ خواتین اور بچوں سمیت پورے خاندان کو گرفتار کرلے گا۔ میں نے اور میرے والد نے خود کو گرفتاری کیلئے پیش کیا کیونکہ غلام حسین کو ہاتھ کرنا / گرفتار کرنا ممکن نہیں تھا، تاہم میجر شاہ جہان نے ایک مرتبہ پھر ہمارے ساتھ بدتمیزی کی جس کے بعد ہم گھر واپس آ گئے۔ بعدازاں میں ہائی کورٹ

میں رٹ پٹیشن داخل کرنے کیلئے کراچی آ گیا لیکن رقم کی عدم موجودگی کے باعث یہ داخل نہیں کرا سکا۔ اپنے گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ میرے بھائی نور علی کو گرفتار کیا گیا ہے جبکہ خاندان کے دیگر افراد کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے گئے ہیں۔ میں حیدر آباد میں اپنی ملازمت پر واپس آ گیا۔ غلام حسین مجھ سے حیدر آباد میں ملا تو میں نے اسکو خاندان کے ساتھ پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کیا۔ میں نے غلام حسین سے حاجی صاحب سے ملنے کی درخواست کی تاکہ میں انکی تنظیم میں شامل ہوسکوں۔ میں میجر شاہ جہان سے انتقام لینا چاہتا تھا جس نے میرے والد کے ساتھ بدکلامی کی تھی۔ مارچ 1978 کے پہلے ہفتے کے دوران، میں حاجی صاحب سے واپڈا کالونی میں ملا۔ میں نے حاجی صاحب سے اپنی تنظیم میں شامل کرنے کی درخواست کی تاکہ میں میجر شاہ جہان سے انتقام لے سکوں۔ حاجی صاحب نے مجھے سمجھایا کہ پورے ملک میں اس طرح کے کئی ایک شاہ جہان موجود ہیں اور ان سے انتقام کیلئے پہلے معاشرے میں تبدیلی لانا ضروری ہے۔ حاجی صاحب نے مجھے بتایا کہ ایک طالب علم نذیر عباسی کو اسکی شادی کے ایک ہفتے بعد گرفتار کرکے قلی کیمپ کوئٹہ میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا جبکہ اسکی بیوہ کو مچ جیل میں قید رکھا گیا۔ نذیر عباسی کے والد اس صدمے میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ اس طرح کے لوگوں سے انتقام لینا بے سود ہوگا۔ بحث مباحثوں کے دوران میں نے حاجی صاحب کو تنظیم میں شمولیت کیلئے اپنی خواہش سے آگاہ کیا۔ تاہم حاجی صاحب نے مجھے اس پر مزید غور و خوص کرنے کیلئے کہا اور دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا۔ مارچ 1978 میں حاجی صاحب سے دوبارہ واپڈا کالونی میں ملا۔ حاجی صاحب نے مجھے دو کتابیں ''پہاڑوں کی بیٹی'' اور ''دار و رسن کی آزمائش'' پڑھنے کیلئے دیئے۔ ہم نے پاکستان کی سیاسی صورتحال پر بات چیت کی۔ انہوں نے اپریل 1978 میں دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا۔ 15 اپریل میں ان سے واپڈا کالونی میں ملا اور انہیں بتایا کہ میں سندھی ٹائپ رائٹنگ سیکھ رہا ہوں۔ میں کراچی میں کوئی ملازمت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ حاجی صاحب نے 30 اپریل کو آنے کا وعدہ کیا۔ 30 اپریل کو اُن سے مل کر میں نے انہیں آگاہ کیا کہ میں نے سندھی ٹائپ رائٹنگ سیکھ لی ہے اور اب مجھے کراچی میں کوئی ملازمت چاہیئے۔ ہم نے سیاسی امور پر بھی

بات چیت کی۔ شام کو حاجی صاحب مجھے بابن شاہ کالونی میں واقع کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے دفتر لے گئے جہاں انہوں نے احمد کمال وارثی سے میرا تعارف کراتے ہوئے اسکو ہدایت کی کہ وہ مجھے پارٹی ڈسپلن اور سائیکلو اسٹائل مشین چلانا سکھائے۔ مجھے پتہ لگا کہ حاجی صاحب کا نام جام ساقی ہے۔ یہ میرے لئے انتہائی حیرت انگیز بات تھی کیونکہ اب تک میں جام ساقی کو بڑا آدمی سمجھتا تھا۔

میں اپنا سامان لیکر کمیونسٹ پارٹی کے دفتر آ گیا اور وہاں ڈیرہ جمایا۔ تیسرے روز جام ساقی دفتر آئے اور سائیکلو اسٹائل کرنے کیلئے پہلے سے تحریر شدہ چھ اسٹینسل کاغذ میرے حوالے کیے۔ میں نے بارہ سَو کاپیاں تیار کیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کاپیاں کس طرح ارسال یا تقسیم کی گئیں۔ بعدازاں یہ پارٹی دفتر کا ایک معمول بن گیا۔ اگست 1978 میں پارٹی دفتر میں پارٹی کے سیکریٹری جنرل کامریڈ امام علی نازش اور کامریڈ سمیع اللہ سے میری ملاقات ہوئی۔ اگست 1978 کے اواخر میں جام ساقی ایک سندھی ٹائیپ رائٹر دفتر لایا اور مجھے سندھی ''سرخ پرچم'' شائع کرنے کی ہدایت کی۔ اس نے مجھے ''ہلچل'' اور ''سرخ پرچم'' کے سندھی ایڈیشن کا ایڈیٹر بھی مقرر کیا۔ مجھے یہ اخبارات جاری کرنے تھے۔ کاغذ احمد کمال وارثی فراہم کرتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ عطیات کہاں سے حاصل کیے جاتے تھے۔ 10 دسمبر 1978 کو سہ پہر تین بجے جام ساقی دفتر آیا اور مجھے کسی ضروری کام کے سلسلے میں رات آٹھ بجے وہاں موجود ہونے کیلئے کہا۔ جام ساقی طئے شدہ وقت پر نہیں آیا۔ تیسرے دن، کامریڈ کمال وارثی نے مجھے ''آغاز'' اخبار دکھایا، جس میں جام ساقی کی گرفتاری کی خبر تھی۔ کمال وارثی بددل ہوگیا اور دفتر سے کچھ اہم فائلیں لے کر، مجھے یہ بتاتے ہوئے فرار ہوگیا کہ وہ فروری 1979 میں واپس آئے گا۔ وہ سائیکلو اسٹائل مشین اپنے ساتھ لے گیا۔ اُس نے مجھے ٹائیپ رائٹر پر کام جاری رکھنے کیلئے کہا۔ کامریڈ کمال وارثی ہر مہینے آتا اور سرخ پرچم کے سندھی ایڈیشن اور ہلچل کا میری جانب سے ٹائیپ کیا ہوا مواد لیکر چلا جاتا۔ میں نے جنوری 1979 میں ہائی ویز ڈپارٹمنٹ کی ملازمت چھوڑ دی اور ڈپٹی کنٹرولر امپورٹس اینڈ ایکسپورٹس حیدرآباد کے دفتر میں ملازمت کا تقرر نامہ حاصل کیا۔ کامریڈ کمال وارثی

کے احکامات پر میں نے ڈپٹی کنڑولر سے تین ماہ کی طویل چھٹی لی۔ کامریڈ کمال وارثی اور میں ٹائیپ رائٹر مشین اپنے ساتھ لائے۔ وہ مجھے کمیونسٹ پارٹی کے دفتر واقع نارتھ ناظم آباد لے آیا، جہاں ایک سائیکلو اسٹائل مشین پہلے سے موجود تھی۔ وہاں پر میں نے پارٹی دفتر کے انچارج پروفیسر جمال الدین نقوی کے ساتھ کام کیا۔ فروری کے دوران نذیر عباسی دفتر آیا۔ میں اُس سے پہلی مرتبہ مل رہا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ جام ساقی کی گرفتاری کی وجہ سے وہ پارٹی کی مدد کیلئے آیا ہے کیونکہ کارکنوں کی قلت تھی۔ مجھے پارٹی دفتر میں ایک کُل وقتی کارکن طور پر کام کرنے کی پیشکش کی گئی لیکن اپنے خاندان کی کفالت کرنے کی ذمہ داری کی وجہ سے میں اپنی ملازمت چھوڑنے کیلئے تیار نہیں تھا۔ بعدازاں میں نے امپورٹس اینڈ ایکسپورٹس کی اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور گلستان شاہ لطیف اسکول، سندھی مسلم کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی میں ملازمت کیلئے درخواست دی۔ میں نے تقریباً دو ماہ اس اسکول میں کلرک کے طور پر کام کیا۔ مارچ 1980 کے اواخر میں، میں نے اس ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ بعدازاں، میں نے عارفہ انٹرنیشنل ریکروٹنگ ایجنسی، الیوسف چیمبرز، نیو چالی، شاہراہِ لیاقت کراچی میں بطور کلرک کام کیا۔ میں کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں رہتا اور وہاں معمول کے مطابق کام کرتا رہا۔ 29 جولائی 1980 کو میں سندھی سرخ پرچم ٹائیپ کر رہا تھا جبکہ کامریڈ کمال وارثی میرے ساتھ بیٹھا تھا کہ تقریباً تین بجے دوپہر صرف ریوالور سے مسلح خانگی کپڑوں میں ملبوس ایک پارٹی دفتر آئی اور کمال وارثی اور مجھے گرفتار کر لیا۔ ہمیں پیروں اور ہاتھوں میں اس طرح زنجیر ڈالی گئی کہ ہم سو نہیں سکتے تھے۔ بعدازاں 30 جولائی کو مجھے کامریڈ کمال وارثی سے علیحدہ کر دیا گیا۔ مجھے ایک فوجی کیمپ میں رکھا گیا جہاں مجھے سونے کی اجازت نہیں تھی۔ مجھے آج چھاونی لے جایا گیا۔

آر او ڈی اے سی

(دستخط) شبیر شر

28/8/80

(دستخط)

28.8.80

مجسٹریٹ

احمد کمال وارثی ولد عبدالوحید وارثی کا اعترافی بیان

میں احمد کمال وارثی ولد عبدالوحید وارثی، ذیل طور بیان کرتا ہوں:

مجھے مارشل لا اختیاری والوں نے 29 جولائی 1980 کو گھر نمبر سی-19 پیپلز کالونی نارتھ ناظم آباد کراچی سے گرفتار کیا۔ میں قیدِ تنہائی میں تھا، جب مجھے نامعلوم جگہ پر لے جایا گیا تو میری آنکھوں کو کپڑے کی ایک پٹی سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ مجھے پیٹ (گردے کے درد) میں بیماری کی وجہ سے اسپتال لے جایا گیا۔

میں گذشتہ پانچ یا چھ برس سے کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سے وابستہ ہوں۔ میں کمیونسٹ پارٹی کا ماہنامہ اخبار ''سرخ پرچم'' جاری کرتا تھا، جو کہ اردو میں شائع کیا جاتا تھا۔ ایک ماہنامہ اخبار ''ہلچل'' سندھی میں شائع ہوتا تھا۔ مندرجہ بالا دونوں اخبارات گھر نمبر بی 752 بابن شاہ بخاری کالونی، حیدر آباد سے جاری ہوتے تھے، یہ گھر میرا تھا۔

جام ساقی، شمیم واسطی، شبیر شر اور قادر بخش حیدر آباد سے ''سرخ پرچم'' جاری کرنے میں میری مدد کرتے تھے، وہ ''ہلچل'' اخبار جاری کرنے میں بھی مدد کرتے تھے۔ جام ساقی، شمیم واسطی اور میں 1974 سے سرخ پرچم چلا رہے تھے۔ قادر بخش، جن کا تعلق کوئٹہ سے تھا، نے پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور وہ بھی اخبارات جاری کرنے میں ہمارے ساتھ کام کرنے لگا۔ 1977 میں واسطی ٹریڈ یونین آفس واقع گاڑی کھاتہ حیدر آباد چلا گیا۔ 1977 کے اواخر میں، شبیر شر جو کہ میرے ساتھ پیپلز کالونی، نارتھ ناظم آباد سے گرفتار ہوا، ہمارے ساتھ شامل ہوا۔ دسمبر 1978 میں جام ساقی گرفتار ہو گیا، جو مندرجہ بالا اخبارات کی تقسیم کا کام کرتے تھے۔ میں اسٹیشنری وغیرہ خرید کرتا تھا، اور مجھے مالی ادائیگی جام ساقی کرتا تھا۔ میں مضامین تحریر کرنے، شائع کرنے اور جلد سازی کیلئے ذمہ دار تھا۔ دیگر لوگ اس ضمن میں میرا ہاتھ بٹاتے تھے۔ دسمبر 1978 میں، جام ساقی کی گرفتاری کے بعد، ٹریڈ یونین سے متعلق کاغذات، ہلچل اور سرخ پرچم کے شمارے لیکر شمیم واسطی

کے پاس گیا، جنہوں نے ٹریڈ یونین سے متعلق کاغذات اپنے پاس رکھ کر، باقی ضائع کر دینے کا مشورہ دیا۔ میں نے مشورے کے مطابق مذکورہ شمارے اور دیگر کاغذات ضائع کر دیئے۔ گدو حسین آباد کے ایک کرایے کے گھر میں رہائش پذیر احمد نواز جام ساقی کا واقف تھا، اس گھر سے تقسیم کا عمل کیا گیا۔ 1979 میں، میں نے بیس ہزار روپوں میں پیپلز کالونی نارتھ ناظم آباد میں ایک گھر خرید کیا۔ میں نے یہ رقم پروفیسر جمال نقوی سے لی تھی، جو کہ اردو سائنس کالج میں پڑھاتے تھے۔ میں سائیکلو اسٹائل مشین، سندھی ٹائیپ رائٹر، انگریزی ٹائیپ رائٹر، ایک میز، پانچ کرسیاں، ایک چارپائی، ایک بکسہ، باورچی خانہ کی اشیا حیدر آباد سے لایا۔ مجھے اردو اخبار ''سرخ پرچم'' اور سندھی اخبار ''ہلچل'' اس گھر سے جاری کرنے تھے۔ مجھے اس گھر اور دیگر سرگرمیوں بشمول کاغذ کیلئے نذیر عباسی نے رقم فراہم کی۔ شبیر شر، نذیر عباسی اور پروفیسر جمال نقوی کراچی سے مذکورہ اخبارات جاری کرنے میں میری مدد کر رہے تھے۔ نذیر عباسی اور شبیر شر سندھی اور دیگر مضامین کا ترجمہ کرتے۔ میں نذیر عباسی کو اپنے گھر سی-19، بلاک این، نارتھ ناظم آباد پروفیسر جمال نقوی کے مشورے پر لایا تھا۔ نذیر عباسی کو تقسیم کا کام خود کرنا تھا۔ میں پارٹی کا ایک کُل وقتی کارکن تھا۔ میں ہر ماہ ڈھائی سَو روپے حاصل کرتا تھا۔ جام ساقی نے سائیکلو اسٹائل مشین کی خریداری کیلئے پروفیسر کے پاس دس ہزار روپے جمع کرائے تھے۔ یہ رقم اُن بیس ہزار روپوں میں شامل کی گئی جو پروفیسر جمال نقوی نے مجھے گھر کی خریداری کیلئے دیئے تھے۔ میں اردو اسٹینسل کاٹتا جبکہ شبیر شر یہی کام سندھی میں کرتا۔ مجھے سندھی اور انگریزی ٹائیپ رائٹرس جام ساقی نے حیدر آباد میں دیئے تھے۔ میں کمیونسٹ پارٹی کی کسی دوسری سرگرمی کے ساتھ منسلک نہیں تھا۔ میں صرف مذکورہ بالا اخبارات شائع کر رہا تھا۔ میں مندرجہ بالا کام اپنے ضمیر کے تحت رضا کارانہ طور پر کر رہا تھا۔ مجھ پر کسی کا بھی دباؤ نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے اس طریقے سے غریب لوگوں کی خدمت کی۔ میں لالچی نہیں ہوں۔ میں ملک میں جمہوریت چاہتا ہوں، جس کیلئے کام کر رہا ہوں۔ میں سماج میں تبدیلی لانا چاہتا ہوں، تاکہ غریب لوگوں کو انصاف فراہم ہوسکے۔ میں پارٹی کے کسی اور کارکن کو نہیں جانتا۔ میں صرف مندرجہ بالا افراد کے ساتھ ہی کام کر رہا تھا۔ میرے گھر سے برآمد ہونے والا بکسہ نذیر عباسی

اور پروفیسر جمال نقوی کا تھا۔ میرا اور شبیر شر کا اس بکسے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ہمیں علم بھی نہیں تھا کہ اس بکسے میں کیا ہے۔

(دستخط)
31 اگست 1980
مجسٹریٹ
کلاس 1
(جنوبی) کراچی

ایگزیبیٹ زیڈ

امرلال ولد ٹھاکرداس کا اعترافی بیان

میں سال 1968 میں پنو عاقل پرائمری اسکول کا طالب علم تھا۔ اُن دنوں ایوب خان کے خلاف ہنگامہ آرائی تھی اور مجھے بھی اسکول کے دیگر طلبہ کی طرح احتجاجی جلوسوں میں شرکت کرنے کیلئے کہا گیا تھا۔ عید گاہ، پنو عاقل کے مقام پر ایک عوامی اجتماع ہوا جس میں ولی خان، عطااللہ مینگل، میر غوث بخش بزنجو، حیدر بخش جتوئی، جام ساقی اور دیگر سیاستدانوں اور طالب علم رہنماؤں نے شرکت کی۔ میں بھی اُس اجتماع میں شریک ہوا تھا اور میں جام ساقی کی تقریر سے بہت متاثر ہوا تھا۔ میں اُن سے اسٹیج پر جا کر ملا تھا۔ اُس وقت عبدالقادر انڈھڑ اسٹیج پر آئے اور مجھ سے میرا اتہ پتہ معلوم کیا۔ عبدالقادر انڈھڑ جنہوں نے وہ اجتماع منظّم کیا تھا، سے میں اکثر و بیشتر ملنے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد میری والدہ کا انتقال ہوا تو عبدالقادر انڈھڑ نے نہ صرف میرے ساتھ ہمدردی کی بلکہ میری مدد بھی کی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول، پنو عاقل سے میٹرک پاس کرنے کے بعد، میں نے 1975 میں گورنمنٹ ڈگری کالج سکھر میں سالِ اول میں داخلہ لیا۔ میں نے کالج میں سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں شمولیت اختیار کی اور ایک رکن کے طور پر اس میں سرگرم رہا۔ بعدازاں میں حیدرآباد منتقل ہوا اور گورنمنٹ کالج، حیدرآباد سے انٹرمیڈیٹ کیا۔

ستمبر 1978 کے مہینے میں، میں اپنے گاؤں سے جامشورو آیا اور سندھ یونیورسٹی میں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی اس دوران میں اپنے ایک دوست الہ جڑیو سیال کے کمرے نمبر 66 انٹرنیشنل ہاسٹل میں رہا۔ چونکہ میں ملازمت حاصل نہیں کر سکا تھا اس لئے کچھ عرصے کیلئے اپنے گاؤں واپس چلا گیا اور دوبارہ اپریل میں واپس سندھ یونیورسٹی آیا۔ اس دوران میں کمرہ نمبر 86 انٹرنیشنل ہاسٹل میں رہا۔ میں نے دوبارہ ستمبر 1978 میں سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں شمولیت حاصل کی۔ مجھے فیڈریشن کی مرکزی کمیٹی میں نامزد کیا گیا۔ نذیر عباسی جو سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا مرکزی صدر بھی تھا، ہلچل اور سرخ پرچم کے بنڈل اپنے کمرے نمبر 67

انٹرنیشنل ہاسٹل لاتا تھا اور غسل خانے کے اوپر چھجے پر رکھ دیتا تھا۔ سرفراز میمن جو فیڈریشن کا سندھ یونیورسٹی میں صدر تھا، نذیر عباسی کا قریبی ساتھی تھا اور کھلے عام طلبہ میں سرخ پرچم اور ہلچل تقسیم کرتا تھا، جس کا یونیورسٹی میں ہر ایک کو علم تھا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ستمبر 1978 میں سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی مرکزی کمیٹی کا اجلاس تھا، جس میں میرا موقف تھا کہ چونکہ فیڈریشن کسی سیاسی جماعت سے منسلک نہیں ہے، اس لئے مذکورہ اخبارات/رسالے طالب علموں میں تقسیم نہیں کرنے چاہئیں۔ بعدازاں نذیر عباسی اور اسکا ساتھی سرفراز میمن غائب ہو گئے اور سندھ یونیورسٹی بند ہو گئی۔ جس کے بعد میں چانڈکا میڈیکل کالج چلا گیا جہاں گھنشام پرکاش جنرل سیکریٹری تھا اور سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی مرکزی کمیٹی کا رکن تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ہلچل سے متعلق کوئی مقدمہ تھا جس میں کچھ طلبہ گرفتار ہوئے اور بعدازاں آزاد کردیئے گئے۔ وہاں سے میں اپنے گاؤں پنوعاقل چلا گیا۔ دوبارہ 1979 میں، میں جامشورو واپس آیا ور بی اے پارٹ 1 میں داخلہ لیا۔ اُن دنوں میں نے سنا کہ کوئی سرخ پرچم اور ہلچل کو خفیہ طور پر تقسیم کر رہا ہے، جبکہ ایک پمفلٹ ''عوام اقتدار سنبھالنے کیلئے تیار ہو جائیں'' بھی تقسیم کیا گیا تھا۔ بعدازاں مارچ 1980 میں، مجھے سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا سینئر نائب صدر نامزد کیا گیا جبکہ بخشل لاکھو اور محمد خان سولنگی کو فیڈریشن کا جونیئر نائب صدر نامزد کیا گیا۔ نذیر عباسی کی موت کے بعد کراچی، حیدرآباد، لاڑکانہ کے طلبہ نے نذیر عباسی شہید اسٹوڈنٹس ایکشن کمیٹیاں بنائیں جبکہ مرکزی کمیٹی کراچی کی تھی۔ جبار خٹک کراچی کی کمیٹی کیلئے سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا نمائندہ تھا۔ اس کمیٹی کی جانب سے کچھ پمفلٹ بھی شائع کیے گئے۔ 18 ستمبر 1980 کو مجھے سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا قائم مقام صدر نامزد کیا گیا۔ سندھ یونیورسٹی میں میری زیرِ نگرانی عہدیداران نے عوام کے نام ایک اپیل تیار کی کہ نذیر عباسی کی موت کے اسباب کی جانچ پڑتال کی جائے اور اسکے ذمہ داران کے خلاف کاروائی کی جائے۔ میں یہ مسودہ کراچی لایا اور کراچی یونیورسٹی کے ہاسٹل میں اپنے دوست نرنجن کمار کے ہاں ٹھہرا۔ میں نے جبار خٹک کو اسکی اشاعت کیلئے مذکورہ مسودہ اور رقم مہیا کی۔ جس کے بعد میں 21 تاریخ حیدرآباد واپس چلا گیا۔ مجھے اُسی دن گرفتار کرلیا گیا۔ مجھے

معلوم ہوا کہ میرا دیا ہوا مسودہ کچھ ترامیم کے ساتھ شائع کر کے میرے ساتھیوں نے تقسیم کیا۔ ہماری تنظیم یا فیڈریشن کا کسی سیاسی جماعت سے کوئی سروکار نہیں ہے، نہ ہی یہ کسی بیرونی ملک سے ملحقہ ہے اور نہ ہی ہم نے کسی دوسرے ملک سے کوئی امداد حاصل کی ہے اور نہ ہی ایسا کرنے کا کوئی ارادہ رکھتے ہیں۔

درحقیقت ہم طالب علموں کے مسائل کے حل کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہمارا پندرہ نکاتی پروگرام اور آئین ہے۔ ہمارے مالیات کا ذریعہ طلبہ کی جانب سے حصہ داری ہے۔ ہم دیگر پبلیکیشنز خرید کر کے کمیشن کی بنیاد پر بھی فروخت کرتے ہیں۔

(دستخط)

13/10/80

ملزمان کی جانب سے طلب کردہ گواہان کی عبوری فہرست

نمبر	نام	حیثیت	برائے
1-	قاسم علی خوجہ	سپرنٹنڈنٹ، لانڈھی جیل	کمال وارثی
2-	اقبال جعفری	صحافی	=
3-	ڈاکٹر شمیم اختر	پروفیسر، بین الاقوامی تعلقات، کراچی یونیورسٹی	=
4-	قاسم علی خوجہ	سپرنٹنڈنٹ، لانڈھی جیل	شبیر شر
5-	حاصل بلوچ	چیئرمین، یونائیٹڈ اسٹوڈنٹس موومنٹ اور بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن	امر لال
6-	ناہید افضال	سابق صدر، این ایس ایف کراچی اور جوائنٹ سیکریٹری، تحریک استقلال	=
7-	غازی صلاح الدین	طالب علم، سندھ پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن	=
8-	وزیر علی	ایس ایچ او، جامشورو	
9-	سلیم واحدی	ایس پی، حیدرآباد	=
10-	محمد خان مینگل	سابق چیئرمین، بی ایس او	=
11-	محمود شام	صحافی	سہیل سانگی
12-	عبداللہ جے میمن	کمشنر، حیدرآباد	بدر ابڑو
13-	عبدالقادر ابڑو	ڈپٹی کمشنر، نوابشاہ	=
14-	افضال صدیقی	صحافی	سہیل سانگی
15-	ممتاز قاضی	سپرنٹنڈنٹ، کراچی جیل	جام ساقی
16-	قمرالدین عباسی	سپرنٹنڈنٹ، سکھر جیل	=

-17	محمد حسن شیخ	چیئرمین، شعبہ علم سیاسیات، سندھ یونیورسٹی	جام ساقی
-18	مجیب پیرزادو	پیپلز پارٹی کے سابق رکنِ سندھ اسیمبلی	=
-19	مسز نسیم شمیم اشرف ملک	صدر، انجمن جمہوریت پسند خواتین اور رکن مجلس عاملہ، پاکستان نیشنل پارٹی	=
-20	بیگم طاہرہ مظہر علی خان	جنرل سیکریٹری، انجمن جمہوریت پسند خواتین	=
-21	میر غوث بخش بزنجو	صدر، پاکستان نیشنل پارٹی	=
-22	سید محمد شاہ امروٹی	قائم مقام جنرل سیکریٹری، جمعیت العلمائے اسلام	=
-23	آلِ مقبول رضوی	وکیل	شبیر شر
-24	یوسف تالپور	پاکستان پیپلز پارٹی کے سابق رکن سندھ اسمبلی، سابق صدر، سندھ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین	جام ساقی
-25	فتحیاب علی خان	صدر، مزدور کسان پارٹی	=
-26	شیخ عزیز	صحافی	سہیل سانگی
-27	عبدالغنی درس	صحافی	=
-28	منہاج برنا	صدر، آل پاکستان نیوز پیپرز ایملائیز کنفیڈریشن	=
-29	معراج محمد خان	صدر، قومی محاذ آزادی	جام ساقی
-30	شیخ رفیق احمد	صدر، پاکستان پیپلز پارٹی، پنجاب اور سابق اسپیکر، پنجاب اسیمبلی	=
-31	خان عبدالولی خان	نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کے مرکزی رہنما	=
-32	مس بے نظیر بھٹو	پاکستان پیپلز پارٹی	=

ملزمان کی جانب سے فوجی عدالت کے روبرو متفرقہ درخواستیں

T-1

برائے خصوصی فوجی عدالت نمبر 5، کراچی

ریاست

بمخالف

پروفیسر جمال نقوی ودیگر

ذیل درج گذارشات کی جاتی ہیں:

1- کہ درخواست گذار/ملزم گذشتہ ڈیڑھ برس سے حراست میں ہے اور کسی بھی استغاثہ کے گواہ نے اپنے گواہی کے خلاصے یا اس مقدمے میں انکے خلاف کوئی بیان نہیں دیا ہے جو کہ کسی جرم کے تحت سزا دیے جانے کا باعث بن سکے۔

2- کہ استغاثہ کے ریکارڈ پر ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو ملزم/درخواست گذار کو کسی جرم کا مرتکب قرار دے سکے۔

3- کہ اس عدالت کے سامنے پیش ہونے والے گواہان کے علاوہ ایسا کوئی گواہ نہیں ہے جو استغاثہ کا مقدمہ مضبوط بنا سکے۔ یہی صورتحال گواہی کے خلاصوں کی ہے۔

4- کہ ملزم کو کسی جرم میں ملوث ہونے کا ثبوت مہیا کیے بغیر تحویل میں رکھ کر انتہائی ہراساں کیا گیا ہے۔

5- کہ اس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ملزم کو کسی بھی جرم کے تحت کوئی سزا دی جا سکے۔

اس لئے درخواست کی جاتی ہے کہ ملزم/درخواست گذار کو معزز عدالت کی جانب سے بری کر کے حراست سے رہا کر دیا جائے۔

(دستخط)

علی امجد ایڈووکیٹ

برائے جمال الدین نقوی

ملزم/درخواست گذار

تاریخ: 29 مارچ 1981

T-2

خصوصی فوجی عدالت نمبر 5، کراچی کے روبرو

ریاست بمخالف جام ساقی و دیگر

<u>ملزم بدر جمال ابڑو کی بریت کیلئے درخواست</u>

مودبانہ طور پر گذارش کی جاتی ہے کہ ملزم بدر جمال ابڑو کو ذیل درج بیان کیے گئے حقیقی بنیادوں پر بری کیا جائے۔

1- کہ زیادہ تر مرکزی گواہان کی جرح ہو چکی ہے تاہم استغاثہ کے کسی بھی گواہ نے بلایا بالا واسطہ ملزم بدر جمال ابڑو کے خلاف کوئی بیان نہیں دیا ہے۔

2- کہ ریکارڈ پر ایسا کوئی مواد نہیں ہے جس کی بنیاد پر مبینہ ملزم بدر جمال ابڑو کو زیرِ نظر مقدمے میں کسی طور شامل ہونے کا مرتکب قرار دیا جا سکے۔

3- کہ خود استغاثہ کے مقدمے میں بھی ملزم کے خلاف اس مقدمے کے ضمن میں کوئی الزام عائد نہیں کیا گیا ہے۔

4- کہ باقی ماندہ ثبوتوں / گواہان کی روشنی میں بھی ملزم کے ملوث ہونے کا ثبوت ملنے کا امکان نہیں ہے۔

5- کہ باقی ماندہ استغاثہ کے گواہ استغاثہ کے مقدمے میں کوئی اضافہ نہیں کریں گے۔

6- کہ یہ گذارش انصاف کے مفادات کے تحت کی جاتی ہے۔

کراچی

29 مارچ 1982

(دستخط)

محمد شفیع محمدی

وکیل

برائے

بدر جمال ابڑو

T-3

خصوصی فوجی عدالت نمبر 5 کے روبرو

ریاست

بمخالف

سہیل سانگی ودیگر

یہ مدعا بیان کیا جاتا ہے کہ یہ شفیق عدالت ذیل درج وجوہات کی بنا پر ملزم سہیل سانگی اور دیگر کی آزادی کیلئے انکی بریت کو زیرِ غور لانے کا اقدام کرے۔

<u>وجوہات</u>

1- کہ کسی بھی استغاثہ کے گواہ نے ملزم سہیل کے خلاف کوئی بیان نہیں دیا ہے۔

2- کہ ریکارڈ پر ایسا کوئی مواد نہیں ہے جو ملزم کے خلاف جاتا ہو۔

3- کہ خود استغاثہ کے مقدمے سے بھی ملزم کے خلاف کوئی جرم سامنے نہیں آتا۔

4- کہ ملزم پر مزید عدالتی کاروائی انکو ہراساں کرنے کا باعث بنے گی۔

5- کہ باقی ماندہ استغاثہ کے گواہ استغاثہ کے مقدمے کو تقویت فراہم نہیں کریں گے۔

6- کہ یہ عرض گذاری انصاف کے مفاد میں کی جاتی ہے۔

(دستخط)

وکیل برائے ملزم

بخدمت خصوصی فوجی عدالت نمبر 5، کراچی

مقدمہ   ریاست بخالف جام ساقی ودیگر

موضوع: عدالتی کاروائی روکنے کی استدعا

ہم مندرجہ بالا مقدمے کے زیردستخط مدعاعلیان ذیل درج گذارش کرتے ہیں:

1- کہ یہ عدالت پاکستان آرمی ایکٹ کے تحت قائم کی گئی اور کام کررہی ہے۔

2- کہ یہ عالم آشکار حقیقت ہے کہ پاکستان آرمی ایکٹ برطانوی سامراجی حکمرانوں کا بنایا ہوا ہے، جو ہندستانی کونوآبادیات بنانے اور یہاں کا استحصال کرنے کی غرض سے حکمرانی کرتے تھے۔

3- کہ پاکستان آرمی ایکٹ وفاقی شرعی عدالت میں اس بات کے یقین دہانی کے حوالے سے زیرِغور ہے کہ یہ کس حد تک غیراسلامی ہے۔

اس لئے استدعا ہے کہ اس عدالت کی کاروائی کو اس وقت تک روکا جائے جب تک حکومت خود اپنی مقرر کردہ وفاقی شرعی عدالت سے آرمی ایکٹ کے اسلامی ہونے کی منظوری نہ حاصل کرلے۔ اس ضمن میں روزنامہ ڈان، بتاریخ 18 جنوری 1983 کے صفحہ نمبر 2 کا تراشہ منسلک ہے۔

یہ استدعا انصاف کے عین مفادات کے تحت کی جارہی ہے۔

کسی متنازعے قانون کے تحت مقدمہ چلانا اسلام اور انصاف دونوں کے اصولوں کے برخلاف ہوگا۔

مدعاعلیان:

تاریخ 27 جنوری 1983

1- جام ساقی

2- امر لعل

3- کمال وارثی

4- شبیر شر

سہیل سانگی کی بریت کا سرکاری حکم نامہ

ذرائع ابلاغ میں مقدمے کی تشہیر

ڈاکٹر توصیف احمد خان

1977 کا سال پاکستان کی تاریخ کا بدترین سال تھا۔ پہلے منتخب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے اپنی آئینی مدت پوری کی اور مارچ 1977 میں عام انتخابات منعقد ہوئے۔حزب اختلاف کی جماعتیں پاکستان قومی اتحاد (PNA) کے پلیٹ فارم پر متحد ہوئیں۔ فوج کے سربراہ جنرل ضیاءالحق کی پالیسی کے تحت خفیہ عسکری ایجنسی آئی ایس آئی نے پی این اے کی انتخابی مہم کو منظّم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ امریکی حکومت نے پی این اے کی انتخابی مہم کے لیے مختلف ذرائع سے مالیاتی امداد فراہم کی۔ پھر انتخابات میں دھاندلی کا شور غوغا ہوا۔ پی این اے بھٹو حکومت کے خاتمے کے لیے احتجاجی تحریک چلائی مگر جب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو اور پی این اے کے رہنماؤں کے درمیان 4 جولائی 1977 کو رات گئے مذاکرات کامیاب ہوئے تو 5 جولائی کی رات شروع ہونے کے تھوڑی دیر بعد جنرل ضیاءالحق نے منتخب حکومت کا تختہ الٹ دیا اور ملک میں مارشل لاء نافذ کردیا۔ جنرل ضیاءالحق نے اپنی تقریر میں 90 دن میں انتخابات کرانے کا وعدہ کیا مگر پیپلز پارٹی کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو کی مقبولیت بڑھ گئی۔ جنرل ضیاءالحق کی حکومت نے اسلامی نظام کے نفاذ کا نعرہ لگایا اور ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کے مقدمہ میں ملوث کرکے سزائے موت دلوانے کی سازش پر عملدرآمد شروع کیا۔ 1978 میں افغانستان میں کامریڈ نور محمد ترائکی کی قیادت میں پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی نے سردار داؤد کا تختہ الٹ دیا۔ افغانستان کی عوامی حکومت نے افغانستان میں غریب عوام کے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے زرعی اصلاحات سمیت بنیادی اصلاحات نافذ کیں۔ افغانستان کی عوامی حکومت کی ان بنیادی اصلاحات سے افغان معاشرہ میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ امریکہ کے ماہرین کو یہ خدشہ پیدا ہوا کہ افغانستان میں بنیادی اصلاحات سے نہ صرف افغانستان ایک نئے سوشلسٹ

ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشہ پر ابھرے گا بلکہ پڑوسی ممالک بھی افغانستان کے انقلاب سے متاثر ہونگے۔ امریکہ خفیہ ایجنسی سی آئی اے نے افغانستان میں رونما ہونے والے انقلاب کو ناکام بنانے کے لیے ایک پروجیکٹ شرع کیا۔ پاکستان کی فوج نے اس پروجیکٹ میں حصہ دار ہوکر جنرل ضیاء الحق کی حکومت کے اس پروجیکٹ پر عملدرآمد کرتے ہوئے ملک میں جمہوریت کے حامیوں، ترقی پسندوں اور کمیونسٹ پارٹی کے خلاف آپریشن شروع کیا۔ اس دور میں ہزاروں سیاسی کارکنوں کو گرفتار کیا گیا۔ پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی۔ سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی۔ ترقی پسند اخبارات کو بند کردیا گیا۔ بہت سے ترقی پسند صحافیوں کو ملازمتوں سے برطرف کردیا گیا۔ اخبارات پر سنسر لگادیا گیا۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کی مزاحمتی تحریک کو کچلنے کے لیے صحافیوں کو کوڑوں کی سزائیں دی گئیں۔ کسان صبا، ٹریڈ یونین اور طلبہ یونین پر پابندی لگادی گئی۔ کمیونسٹ پارٹی نے جنرل ضیاء الحق کی آمرانہ حکومت کے خلاف مزاحمت کا فیصلہ کیا۔ کمیونسٹ پارٹی اور اس کی ذیلی تنظیموں نے اپنے اپنے محاذ پر مزاحمتی تحریک کو منظّم کرنا شروع کیا۔ کمیونسٹ پارٹی اخبار رسالہ سرخ پرچم اور ہلچل باقاعدگی سے شائع کرتی تھی۔ اخبارات پر سنسر لگادیا گیا تھا مگر سرخ پرچم اور ہلچل میں حقائق پر مبنی مواد شائع ہوتا تھا جس میں امریکہ اور پاکستان کی فوج، حکومت کے گٹھ جوڑ، فوجی حکومت کے خلاف سرگرم عمل مزاحمتی تحریکوں کے بارے میں خبریں اور تجزیے شائع ہوتے تھے۔ خطہ کی صورتحال، افغانستان اور دیگر سوشلسٹ ممالک میں عوام کی بہبود کے لیے پالیسیوں، سرمایہ دار ممالک کی عوام دشمن پالیسیوں کا پردہ چاک کیا جاتا تھا۔ پھر کمیونسٹ پارٹی فوجی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف مسلسل عوام میں آگہی کی مہم کے لیے کام کرتی تھی۔ جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے خفیہ عسکری تنظیم آئی ایس آئی کو کمیونسٹ پارٹی کے خلاف آپریشن پر معمور کیا۔ آئی ایس آئی کا فیلڈ انویسٹی گیشن یونٹ نے جس کے سربراہ بریگیڈیئر ۔۔۔۔ بلا تھے سندھ میں اس آپریشن کے انچارج تھے۔ آئی ایس آئی کے فیلڈ انویسٹی گیشن یونٹ (F.I.U) کو پیپلز کالونی کے ایک مکان پر چھاپہ مار کر پروفیسر جمال نقوی، احمد کمال وارثی، غلام شبیر شر، سہیل سانگی اور نذیر عباسی کو گرفتار کیا گیا۔ ایف آئی یو کے

اہلکاروں نے گرفتار افراد پر تھرڈ ڈگری تشدد کیا اور سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر نذیر عباسی کو ایف آئی یو کے اہلکاروں نے شہید کر دیا۔ 9 اگست کو اسلام آباد سے جاری ہونے والے ہینڈ آؤٹ میں کہا گیا کہ ایک خفیہ سیل کی زیر زمین سرگرمیوں کا پتہ چلایا گیا ہے جو کئی برسوں سے ایسا تخریبی لٹریچر تیار اور تقسیم کر رہا تھا جس کا مقصد پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو۔۔۔ تھا۔ مجسٹریٹ کی قیادت میں پولیس نے کراچی اور حیدر آباد کے کچھ مکانات پر چھاپے مارے۔ پولیس نے سائیکل، اسٹائل مشین، ٹائپ رائٹر اور خفیہ جریدوں سرخ پرچم اور ہلچل کے مسودات برآمد کر لیے۔ اس خفیہ سیل پر چھاپے اور خفیہ لٹریچر کی برآمد پر سیل کے کچھ ارکان کو حراست میں لیا گیا۔ ان میں غلام شبیر شر، احمد کمال وارثی، نذیر عباسی، پروفیسر جمال نقوی اور سہیل سانگی شامل تھے۔ سرکاری ہینڈ آؤٹ میں الزام لگایا گیا کہ اس سیل کو غیر ممالک سے امداد ملتی تھی۔ نازش امروہوی جو ایک غیر ملک میں مقیم ہیں اس گروہ اور ایک بیرونی ملک کے درمیان رابطہ کا کام کر رہے تھے۔ سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے بانی جام ساقی، سندھ یونیورسٹی کے طالب علم اور سندھ این ایس ایف کے قائم مقام صدر امر لعل، اردو سائنس کالج کے پروفیسر جمال نقوی، صحافی سہیل سانگی، ٹریڈ یونین رہنما حمد کمال وارثی، ٹیلی وژن فنکار شبیر شر، سندھی ادیب بدر ابڑو کے خلاف فوجی حکومت نے خصوصی فوجی عدالت میں مقدمہ چلانے کا فیصلہ کیا۔ روزنامہ امن کی 4 اپریل 1981 کی اشاعت میں شائع ہونے والی خبر میں کہا گیا کہ یکم اپریل 1991 سے خصوصی فوجی عدالت نے ان ملزمان کے خلاف مقدمہ کی سماعت شروع کی۔ ان افراد پر حکومت کے خلاف سرگرمیوں کی منصوبہ بندی کا الزام ہے۔ ان الزامات کے تحت ملزمان کو سزائے موت دی جا سکتی ہے۔ اس مقدمہ کی کارروائی پہلے کراچی سینٹرل جیل کے احاطے میں قائم کی گئی خصوصی فوجی عدالت کے بند کمرے میں شروع کی تھی۔ لاہور سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ویو پوائنٹ کی 3 دسمبر 1981 کی اشاعت سے ظاہر ہوتا ہے کہ پروفیسر جمال نقوی، جام ساقی، امر لعل، بدر ابڑو، سہیل سانگی، شبیر شر اور احمد کمال وارثی کے مقدمہ کی سماعت 14، 21 اور 24 نومبر کو ہوئی۔ پھر فوجی عدالت نے 12 دسمبر 1981 تک سماعت ملتوی کر دی۔ ملزمان کو لانڈھی جیل سے عدالت

میں پیش کیا گیا۔ ان ملزمان نے کہا کہ انہیں ابھی تک چارج شیٹ نہیں دی گئی۔ پروفیسر جمال نقوی چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھے۔ وہ۔۔۔۔ کے مرض میں مبتلا تھے۔ پروفیسر جمال نقوی کو طبی سہولت کی فراہمی کے لیے سول ہسپتال ریفر کردیا گیا۔ روزنامہ امن کی 30 دسمبر 1981 کی اشاعت میں بتایا گیا کہ امر لعل، جام ساقی، پروفیسر جمال نقوی، شبیر شر، سہیل سانگی، بدر ابڑو اور احمد کمال وارثی کا مقدمہ کشمیر روڈ کے ایم سی اسپورٹس کمپلیکس میں قائم خصوصی فوجی عدالت نمبر 5 میں منتقل کیا گیا۔ 29 دسمبر 1981 کو ہونے والی سماعت میں ملزمان پر فرد جرم عائد کی گئی مگر تمام ملزمان نے جرم کے ارتکاب سے انکار کیا۔ استغاثہ نے چالان میں امام علی، ڈاکٹر جبار خٹک اور نرنجن کمار کے ناموں کے ملزمان کی حیثیت سے اضافہ کیا۔ ان افراد کے نام پہلے چالان میں شامل نہیں تھے۔ ملزمان کی پیروی بیرسٹر ودود علی امجد اور رشید رضوی ایڈووکیٹ نے کی۔ کراچی کے شام کے انگریزی زبان کے اخبار اسٹار میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق خصوصی فوجی عدالت کرنل عتیق، میجر افتخار جلیس اور مجسٹریٹ محبّ اللہ بھٹو پر مشتمل ہے۔ خصوصی فوجی عدالت نے وکلاءِ صفائی کے اعتراضات کو مسترد کردیا۔ خصوصی فوجی عدالت نے ملزمان پر مارشل لاء ریگولیشن نمبر 4 کی خلاف ورزی کے الزامات لگائے ہیں۔ مارشل لاء ریگولیشن نمبر 4 کے تحت مختلف طبقات کے درمیان نفرت پھیلانے کے لیے مواد کی اشاعت اور تقسیم سنگین جرم ہے۔ ملزمان پر مارشل لاء جرائم کے تحت مسلح افواج کے خلاف نفرت پھیلانے کے الزامات ہیں۔ ملزم سہیل سانگی، امر لعل اور بدر ابڑو کو مارشل لاء ریگولیشن 36 کے تحت ملزمان کی مدد کرنے کا الزام لگایا گیا ہے ہفت روزہ معیار کی 9 جنوری 1982 کی اشاعت میں کہا گیا ہے کہ ملزمان کے وکلاء نے ایک مشترکہ درخواست عدالت کے سامنے پیش کی جس میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا کہ مارشل لاء آرمی ایکٹ 34 کے تحت خصوصی عدالت کو کھلی عدالت قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا ملزمان کے رشتہ داروں، وکلاء اور صحافیوں کو عدالت میں آنے کی اجازت دی جائے مگر فوجی عدالت نے یہ درخواست مسترد کردی۔ فوجی عدالت نے ان ملزمان کو جیل میں بی کلاس دینے کی درخواست مسترد کردی۔ روزنامہ حریت نے 3 جنوری 1982 کو ایک خبر میں بتایا کہ خصوصی فوجی عدالت میں استغاثہ کے ایک گواہ سب انسپکٹر

اسلم نورخان نے اپنا بیان ریکارڈ کراتے ہوئے کہا کہ 30 جنوری 1980 کو وہ آرٹیلری میدان تھانے میں تعینات تھا۔ اس تاریخ کو ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے اس کو تخریب کاروں کی گرفتاری کے لیے طلب کیا۔ وہ انچارج تھانہ فضل الرحمٰن، ہیڈ کانسٹیبل محمد فیض اور کانسٹیبل دوست خان کے ہمراہ ڈی ایم بی اے ہیڈ کوارٹر پہنچا۔ مدعی میجر طفیل نے اس پولیس پارٹی اور ایک مجسٹریٹ رمضان لغاری کی ۔۔۔ میں پیپلز کالونی نارتھ ناظم آباد کے مکان پر چھاپہ مارا۔ مکان میں موجود احمد کمال وارثی اور شبیر شر کو گرفتار کر کے سندھی زبان کا پرچہ ہلچل اور اردو زبان کا پمفلیٹ سرخ پرچم برآمد کرلیا۔ شبیر شر کی نشاندہی پر پاکستان کوارٹر کے ایک مکان پر چھاپہ مارا گیا۔ یہاں سے بھی اسی قسم کا مواد بھاری تعداد میں برآمد ہوا۔ اس موقع پر وکلاء صفائی نے عدالت سے درخواست کی کہ قابل اعتراض مواد عدالت میں پیش کیا جائے اور اس کی نقول وکلاء صفائی کو فراہم کی جائیں۔ گواہ اسلم نورخان نے یہ مواد پیش کرنے سے معذرت ظاہر کی۔ اس کا کہنا تھا کہ مذکورہ مواد کی نقول وکلاء صفائی کو مواد کی نقول پیش کرنے کے لیے حکام بالا سے اجازت حاصل کرنی ہوگی۔ عدالت نے ممنوعہ مواد فوری طور پر پیش کرنے کی ہدایت کی ہفت روزہ معیار کی 13 جنوری کی اشاعت میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق خصوصی فوجی عدالت نمبر 5 میں 22 جنوری 1982 کو جام ساقی اور پروفیسر جمال نقوی کے خلاف مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی تو استغاثہ کے گواہ سب انسپکٹر اسلم نورخان کے بیان پر وکیل صفائی یوسف لغاری نے جرح جاری رکھی۔ گواہ نے بتایا کہ اس نے شبیر شر اور احمد کمال وارثی کی گرفتاری کا مشیر نامہ تیار نہیں کیا۔ وہ یہ بھی بیان نہیں کرسکتا کہ کون سا قابل اعتراض مواد شبیر شر کا ہے اور کون سا کمال وارثی کا ہے۔ گواہ نے کہا کہ اس مقدمہ کی ڈائری نہیں لکھی گئی نہ ہی ملزموں کو کسی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر کے ریمانڈ حاصل کیا گیا۔ دنوں ملزمان سے پاکستان کوارٹرز پیپلز کالونی میں کوئی پوچھ گچھ کی گئی۔ گواہ نے کہا کہ اس نے برآمد ہونے والا تمام مواد نہیں پڑھا۔ اس لیے وہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ تمام مواد غیر قانونی ہے یا نہیں۔ گواہ نے ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ وہ نویں جماعت تک پڑھا ہے اور اردو ادب میں صرف این ۔۔۔ کے جاسوسی ناول پڑھے ہیں۔ گواہ نے جرح کے دوران ایک سوال کے جواب میں کہا

کہ وہ کمیونسٹوں سے سخت نفرت کرتا ہے اور اس لیے میں نے کمیونسٹ لٹریچر پڑھنے کی کبھی کوشش نہیں کی نہ ہی میں ان کی اصطلاحات سے واقف ہوں۔ حکومت کے خلاف جائز نکتہ چینی کو میں جرم نہیں سمجھتا۔ روزنامہ امن کی 8 جنوری 1982 کی اشاعت میں خصوصی فوجی عدالت کی شائع ہونے والے خبر کے مطابق خصوصی فوجی عدالت نے استغاثہ کے ایک اور گواہ سب انسپکٹر امام بخش کا بیان ریکارڈ کیا۔ امام بخش نے اپنے بیان میں کہا کہ وہ نارتھ ناظم آباد تھانے میں تعینات تھا۔ اس وقت 30 جولائی 1980 کو اس نے ڈپٹی مارشل لاء اسٹاف افسر میجر طفیل کا جو اس مقدمہ میں مدعی ہے دستخط شدہ خط ملنے پر ایف آئی آر اور مارشل لاء ریگولیشن سیکشن 15 اور 18(3) کے تحت عدالت میں موجود ملزمان کے خلاف مقدمات درج کیے۔ سب انسپکٹر امام بخش نے جراح کے دوران کہا کہ میجر طفیل کبھی بھی اس کے سامنے پیش نہیں ہوئے۔ اس نے یہ بات تسلیم کی کہ ایف آئی آر میں مبینہ جرم کا نہ تو وقت لکھا ہے اور نہ ہی تاریخ لکھی ہے جس سے ظاہر ہو سکے کہ ملزمان نے کب ارتکاب جرم کیا ہے۔ گواہ نے مزید تسلیم کیا کہ اس نے ایف آئی آر درج کرنے کے علاوہ کوئی تفتیش نہیں کی۔ اور یہ بھی درست ہے کہ ایف آئی آر پر مدعی کے دستخط نہیں ہیں۔ روزنامہ جنگ کے لندن ایڈیشن میں شائع ہونے والی خبر میں گواہ سب انسپکٹر امام بخش کے بیان کی مزید تفصیل شائع ہوئی ہے۔ سب انسپکٹر امام بخش نے انکشاف کیا کہ اس نے ایف آئی آر میں آئی ایس آئی ڈائریکٹوریٹ کے الفاظ ضرور درج کیے تھے لیکن بعد میں اعلیٰ حکام کی ہدایت پر آئی ایس آئی ڈائریکٹوریٹ کے الفاظ حذف کر دیئے گئے۔ ان حذف شدہ الفاظ کی جگہ ڈی ایم ایل اے کے الفاظ تحریر کیے گئے۔ گواہ نے مزید کہا کہ اس معاملہ کے بعد اس کو دوسرے پولیس افسروں کے ہمراہ ترقی دیدی گئی۔ روزنامہ 14 جنوری 1982 میں شائع ہونے والی خبر میں کہا گیا کہ استغاثہ نے قابل اعتراض مواد ہلچل جو سندھی زبان میں ہے اور سرخ پرچم نامی اردو زبان میں شائع ہونے والے پمفلیٹ کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں وکلاء صفائی کو اپنے خرچ پر ادائیگی کے بعد دیدی گئی۔ روزنامہ امن کی 17 جنوری 1982 کی اشاعت کے مطابق خصوصی فوجی عدالت میں گواہ سب انسپکٹر اسلم نور خان پر وکلاء صفائی کی جرح کی باری تھی کہ ایک ملزم شبیر شر عدالت میں بے

ہوش ہوگئے۔عدالت کے حکم پرڈاکٹر نے شبیر شرکوطبی امدادفراہم کی جس کے بعدمقدمہ کی سماعت دوبارہ شروع ہوگئی۔سب انسپیکٹر کی نشاندہی پرتخریبی مواد پرہوا۔ان گھروں کی تلاشی کے لیے مجسٹریٹ سے ورانٹ حاصل نہیں کیے گئے۔ یہ تمام کارروائیاں اس نے ڈی ایم ایل ہیڈکوارٹر سے ملنے والی ہدایات پرکی۔گواہ نے مزید کہا کہ جن جگوں سے تخریبی مواد برآمد ہواوہ آرٹیلری میدان تھانے کی حدود میں نہیں آتا۔اس نے تمام برآمدشدہ موادڈی ایم ایل اے ہیڈکوارٹر کے حوالے کیااورکوئی رسید حاصل نہیں کی۔ پولیس افسراسلم نورخان نے جرح کے دوران کہا کہ جس جگہ سے احمدکمال وارثی اورشبیر شرکوگرفتارکیا گیاوہاں سے ایسا کوئی۔۔۔برآمدنہیں ہواجس پرسرخ پرچم لکھا ہواہو۔گواہ سلم نورخان نے مزید کہا کہ وہ نظریہ پاکستان کی اصطلاح سے واقف ہے۔ اس کے نزدیک نظریہ پاکستان یہ ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پرقائم ہواہے۔گواہ نے مزید کہا کہ اسلام کے نام پرقائم رہے گااوراس کے نزدیک اسلام کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کاحکم مانواوراس کے رسول کاحکم مانو۔گواہ نے یہ تسلیم کیا کہ جولٹریچرعدالت میں پیش کیا گیااس میں کہیں نہیں لکھا کہ اللہ کاحکم نہ مانو،رسول کاحکم نہ مانو۔گواہ نے کہا کہ کمیونزم سے نفرت کرتا ہے کیونکہ کمیونسٹ خدا پریقین نہیں رکھتے۔گواہ نے بتایا کہ تمام نظاموں میں یہ خبرمشترک ہے کہ عدلیہ کا مقام حاکم سے بلند ہے۔حاکم عدلیہ کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔کسی حاکم کو یہ اختیارنہیں کہ وہ عدلیہ پر پابندی عائدکرے کیونکہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔سب انسپیکٹر اسلم نور نے وکیل صفائی بیرسٹر ودود کے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ جولٹریچر برآمد ہواہےاس میں سب قابل اعتراض نہیں ہے۔اس نے کہا کہ اس مضمون میں کہا گیاہے کہ سوویت یونین کے مسلمان ہم سے بہتر ہیں اوراچھی حالت میں ہیں۔ملزمان کے قبضہ سے برآمد ہونے والے قابل اعتراض لٹریچرمیں شامل مضمون بعنوان مارکسی فلسفہ اورکمیونسٹ مینی فیسٹوجولاہور سے شائع ہواہےاس بارے میں سرکاری گواہ نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ یہ لٹریچرلاہور سے شائع ہواہےاور بازاروں میں عام ملتاہے۔نہ مجھے یہ علم ہے کہ لاہور میں شائع ہونے والے اس لٹریچرکوشائع کرنے والوں کے خلاف کارروائی کی گئی۔ روزنامہ امن کی 14اپریل 1982 کی اشاعت میں بتایا گیاہے کہ جام ساقی اوران کے ساتھیوں

نے خصوصی فوجی عدالت کو درخواست دی کہ انہوں نے اپنے وکلاء کو ہدایات دینے سے انکار کر دیا ہے۔ درخواست میں کہا گیا ہے کہ ان کے ساتھی نذیر عباسی حوالات میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ ان کی موت کی تحقیقات کرائی جائیں۔ نذیر عباسی کی بیوی کی درخواست پر کارروائی کی جائے اور کورٹ کو اوپن کورٹ قرار دیا جائے اور خصوصی فوجی عدالت کی کارروائی کی اشاعت روکنے کا حکم واپس لیا جائے اور عدالت کی کارروائی کی تصدیق شدہ کاپیاں فراہم کی جائیں اور ملزمان کو جیل میں بہتر کلاس دی جائے۔ درخواست میں کہا گیا ہے کہ ان مطالبات کی منظوری تک عدالت مقدمہ کی سماعت ملتوی رکھے۔ درخواست میں مزید کہا گیا ہے کہ جب تک یہ مسائل حل نہیں ہونگے وہ اپنے وکلاء کو ہدایات نہیں دیں گے۔ اس درخواست پر جام ساقی، جمال نقوی، امر لعل، شبیر شر اور احکد کمال وارثی نے دستخط کیے ہیں۔ خصوصی فوجی عدالت نے یہ درخواست مسترد کر دی۔ روزنامہ امن کی 10 اپریل 1982 کی اشاعت کے مطابق خصوصی فوجی عدالت نے حکم دیا ہے کہ اگر 19 اپریل کو ملزمان کے وکلاء عدالت میں پیش نہیں ہوئے تو عدالت ان ملزمان کی پیروی کے لیے سرکاری وکیل مقرر کرے گا۔ روزنامہ امن کی 22 اپریل 1982 کی اشاعت میں شائع ہونے والی خبر میں بتایا گیا ہے کہ سندھ این ایس ایف کے رہنما ڈاکٹر جبار خٹک کو پشاور جیل سے سنٹرل جیل کراچی منتقل کر دیا گیا۔ ان کے خلاف خصوصی فوجی عدالت میں مقدمہ زیر سماعت ہے۔ روزنامہ اسٹار کی 5 مئی 1982 میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق خصوصی فوجی عدالت نے حکم جاری کیا ہے کہ عدالت کھلی ہوئی ہے، کوئی بھی شخص عدالت کی کارروائی سن سکتا ہے۔ اسٹار کی 9 مئی 1982 کی خبر کے مطابق خصوصی فوجی عدالت میں ایک اور سرکاری گواہ منگھو پیر تھانے کے ایس ایچ او مخدوم محمد حیات پر ایک ملزم بدر جمال ابڑو کے وکیل یوسف لغاری ایڈووکیٹ نے جراح کی۔ مخدوم محمد حیات نے تسلیم کیا ہے۔ بدر جمال ابڑے سے ضبط کیے جانے والے آرٹیکل نمبر 1، نمبر 5 اور نمبر 8 اور نمبر میں شائع شدہ مواد غیر قانونی نہیں ہے۔ مخدوم حیات نے مزید کہا کہ ملزم بدر ابڑو نے اقرار جرم پر مبنی بیان دینے سے انکار کیا تھا۔ اس بناء پر ملزم کو ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔ گواہ نے جرح کے دوران یہ بات تسلیم کی کہ مقدمہ کی دستاویزات کو سیل کیے بغیر عدالت

میں جمع کرایا گیا۔اس خبر میں یہ بھی بتایا گیا کہ پروفیسر جمال نقوی، جام ساقی اوراحمد کمال وارثی کے وکلاء آج بھی کمرہ عدالت میں موجودنہیں تھے کیونکہ ان ملزمان نے اپنے ساتھ نذیر عباسی کی حوالات میں ہلاکت کے معاملہ کی تحقیقات کرانے تک عدالتی کارروائی کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا ہے۔روزنامہ امن کی 13 مئی کی اشاعت کے مطابق پولیس اسٹیشن شمالی ناظم آباد تھانے کے ایس ایچ اوصفدر بھٹی فوجی عدالت کے سامنے جام ساقی اور دگر ملزمان کے خلاف ایف آئی آر کی اصل کاپی پیش کرنے میں ناکام رہے۔اس سے عدالت کی کارروائی کل تک ملتوی کردی گئی۔اب عدالت میں صرف سہیل سانگی اور بدرابڑو کے وکلاء موجود تھے۔عدالت کے حکم پرملزم احمد کمال وارثی کوگردے کے مرض کے علاج کے لیے سول ہسپتال کراچی بھیج دیا گیا۔روزنامہ امن کی 17 مئی1982 کی خبر میں بتایا گیا کہ سندھ میں این ایس ایف کے رہنما ڈاکٹر جبا ختک کوگلبرگ تھانے سے لیاقت آباد تھانے منتقل کیا گیا۔ڈاکٹر جبار ختک کو پمفلیٹ کیس میں گرفتار کیا ہے اور کرائم برانچ کا عملہ ان سے پوچھ گچھ کررہا ہے۔پمفلیٹ کیس منگھوپیر پولیس اسٹیشن میں درج کیا گیا۔روزنامہ امن کی 15 جون کی اشاعت میں استغاثہ کے گواہ ایس ایچ او نیوکراچی نے فوجی عدالت کے سامنے وفاقی وزارت داخلہ کا ایک خط پیش کیا جس میں صدر ضیاء الحق نے ہدایت کی ہے کہ ملزموں کے خلاف تفتیش اور مقدمہ جلدازجلد مکمل کیا جائے۔گواہ نے اس بات سے انکار کیا کہ اس نے مقدمہ کی تفتیش کی تھی مگر وہ خودکوتفتیشی افسر ظاہر کرتا رہا ہے۔گواہ سے ملزم احمد کمال وارثی کے بیان کے بارے میں معلوم کیا گیا۔گواہ نے بتایا کہ مذکورہ بیان مقدمہ کی فائل میں موجود تھامگراب وہاں سے غائب ہے۔وارثی کا بیان اور کیس غائب ہوا۔اس کے۔۔۔نہیں۔گواہ نے کہا کہ اس نے ملزم احمد کمال وارثی کوسب سے پہلے 18 ستمبر1980 کودیکھا تھا۔سماعت سے پہلے ایک ملزم شبیر شرکوآنکھ کے آپریشن کے لیے ہسپتال لے جایا گیا جہاں اس کا آپریشن ہوجا۔ بعد میں ملزم کوعدالت لایا گیا تواس کی آنکھ پر پٹی بندھی تھی۔چونکہ ملزم بیٹھ نہیں پارہا تھا تو عدالت نے ملزم شبیر شہر کو دوسرے کمرے میں لیٹنے کی اجازت دیدی۔روزنامہ اسٹار کی 15 جون 1982 کی رپورٹ میں کہا گیا کہ خصوصی فوجی عدالت کی کارروائی التواء کا شکار ہوگئی۔ملزمان شبیر شر کو

آنکھوں کے علاج اور احمد کمال وارثی کو گردے کے مرض میں مبتلا ہونے کی بناء پر سنٹرل جیل کراچی کے ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ عدالت نے ان ملزمان کی غیر موجودگی کی بناء پر ایس ایچ او صفدر علی بھٹی پر جرح 19 جون تک ملتوی کر دی۔ روزنامہ امن کی 22 جون 1982 کی رپورٹ کے مطابق نارتھ ناظم آباد تھانے کے ایس ایچ او بھٹی نے جرح کے دوران اس بات کا اقرار کیا کہ ایف آئی آر پر اوور رائیٹنگ ہے اور اس نے امر لعل کو جامشورو پولیس سے طلب نہیں کیا تھا۔ ایس ایچ او بھٹی نے امر لعل کی گرفتاری کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ صدر ضیاء الحق کی یہ ہدایت تھی کہ امر لعل اور امداد چانڈیو کو گرفتار کیا جائے۔ بدر ابڑو کے وکیل شفیع محمد کی جرح پر ایس ایچ او بھٹی نے کہا کہ اس مقدمہ کی تفتیش تین مراحل میں کی گئی۔ پہلے مرحلہ میں ملٹری انٹیلی جنس، ڈی ایم ایل اے اور ایم ایل اے کی ٹیموں نے کی۔ دوسرے مرحلہ میں خود اس نے کی اور تیسرے مرحلہ میں ڈی ایس پی کی ممتاز برنی نے خود تفتیش کی اور اس نے ایف آئی آر دیر سے درج کرنے کی وجہ نہیں لکھی۔ صفدر بھٹی نے کہا کہ جس دفعہ کے تحت ایف آئی آر درج کی گئی اور مقدمہ چل رہا ہے وہ دفعہ کس جرم کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ نہیں جانتا چونکہ اس کو مواد نہیں دیا گیا وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس مواد میں مذہبی یا۔۔۔ منافرت پھیلائی گئی ہے اور اس کو ایک گواہ بھی ایسا نہیں ملا جس نے دوران تفتیش ایسا مواد دیا ہو جس میں فوج کے خلاف منافرت پائی جاتی ہے۔ اس گواہ نے تسلیم کیا کہ وہ نظریہ پاکستان کی تفصیل نہیں جانتا نہ کسی گواہ نے ایسی شہادت دی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی ملزم نظریہ پاکستان کے خلاف ہے۔ خصوصی عدالت میں امر لعل، احمد کمال وارثی اور شبیر شر نے ایک عرضداشت میں مارشل لاء حکام سے استدعا کی کہ انہیں لبنان بھیج دیا جائے تاکہ فلسطینیوں کے ساتھ امریکہ اور اسرائیل کے خلاف لڑائی میں حصہ لیں۔ اگر وہ زندہ بچ گئے تو واپس آکر خود کو حکومت کے حوالہ کر دیں گے۔ روزنامہ امن کی 25 جون 1982 کی اشاعت کے مطابق جام ساقی کے فوجی عدالت سے درخواست کی کہ وہ فلسطینی بھائیوں سے یکجہتی کے لیے خون کا عطیہ دینا چاہتے ہیں۔ عدالت نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ سرکاری گواہ محمد یعقوب نے بتایا کہ پیپلز کالونی میں مکان پر چھاپہ کا واقعہ 6 سات سال پرانا ہے۔ استغاثہ کے مطابق یہ

واقعہ دوسال پرانا ہے۔ گوان نے بتایا کہ میرا بیان چھاپہ مارنے والے دن صفدر بھٹی نے لیا تھا۔ گواہ نے مزید بتایا کہ اس علاقہ میں مکان کے نمبر نہیں ہیں اس لیے پولیس کو کسی مکان کا نمبر نہیں بتایا۔ عدالت نے ریکارڈ دیکھا کہ گواہ کے بیان میں مکان نمبر درج تھا۔ گواہ نے شروع میں بتایا کہ اس کی چائے کی دکان اسی گلی میں ہے جہاں مذکورہ مکان ہے لیکن جرح کے دوران کہا کہ اس کی دکان ایک دور کی گلی میں ہے جہاں کے مکان کا نمبر یاد نہیں ہے۔ گواہ نے مزید بتایا کہ اس کا بیان ایک ہی دفعہ لکھا گیا اور اس میں دو آدمیون ایک داڑھی والے اور ایک بغیر داڑھی والے کا ذکر تھا۔ اس سے داڑھی والا شخص نذیر عباسی معلوم ہوا تھا لیکن آج اس نے عدالت میں کہا کہ داڑھی والا شخص شبیر شر تھا نذیر عباسی نہیں۔ گواہ نے بتایا کہ لوگوں نے بتایا کہ چھاپہ اور گرفتاری کا واقعہ انہوں نے دیکھا جبکہ خود اس نے یہ واقعہ نہیں دیکھا تھا۔ روزنامہ امن کی 30 جنوری 1982 کی اشاعت کے مطابق خصوصی فوجی عدالت نمبر 5 میں اردو سائن کالج کے اہلکار اور سرکاری گواہ اشفاق زمان نے وکیل صفائی کی جرح کے دوران کہا کہ پروفیسر جمال نقوی ایک اچھے شہری اور معزز آدمی ہیں۔ میں نے انہیں کبھی کالج میں نظریہ پاکستان کے خلاف منافرت پھیلاتے اور طبقاتی مذہبی منافرت پھیلاتے نہیں دیکھا نہ کسی طالب علم یا پروفیسر نے پروفیسر نقوی کے خلاف کوئی شکایت کی۔ وکیل صفائی شفیع محمد نے عدالت سے درخواست کی۔ پروفیسر جمال نقوی کی اردو سائنس کالج سے پرنسپل فائل منگوانی چاہئے مگر عدالت نے یہ درخواست مسترد کردی۔ سرکاری گواہ اشفاق زمان نے کہا کہ اردو سائنس کالج وفاقی حکومت کے ماتحت ہے۔ مرکزی حکومت نے کوئی ٹیم تفتیش کے لیے نہیں بھیجی۔ اشفاق زمان نے مزید کہا کہ جب میں پرنسپل پرفیسر اکرام الرحمٰن کے دفتر میں داخل ہوا تو ڈی ایس پی ممتاز برنی کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں تھا۔ عدالت میں جو کاغذات پیش کیے گئے وہ ڈی ایس پی ممتاز برنی کے پاس تھے۔ میں نے پرنسپل کے کہنے پر کاغذات کی رسید پر بطور گواہ دستخط کیے تھے۔ وفاقی اردو سائنس کالج کے پرنسپل پروفیسر اکرام الرحمٰن نے خصوصی فوجی عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ پروفیسر جمال نقوی کی پرنسپل فائل دیکھی ہے۔ پروفیسر جمال نقوی ان کے ساتھ گذشتہ دو برسوں سے تدریس کے فرائض انجام دے

رہے ہیں۔ پروفیسر نقوی کالج کی حدود میں حکومت کے خلاف کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا ۔روزنامہ امن کی 8 جولائی 1982 کی اشاعت میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق استغاثہ کے گواہ اے سی ایم سرور خان نے اپنے بیان میں کہا کہ ملزم اسرائیل نے کسی غیر قانونی کام میں حصہ نہیں لیا۔ استغاثہ کے ایک اور گواہ اے سی ایم نے جرح کے دوان کہا کہ اس نے پولیس پارٹی سمیت اے ڈی ایم کے محض زبانی احکامات پر حیدر آباد گھر کی تلاشی لی تھی۔ مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم کہ برآمد شدہ مواد میں سے کس پر پابندی ہے اور اس چھاپہ میں کوئی فرد گرفتار نہیں ہوا تھا۔ گواہ مالک مکان کا نام نہیں بنا سکا۔ ایک اور گواہ شمس قریشی نے اپنے بیان میں کہا کہ پولیس نے چھاپہ کے دوران علاقہ کے کسی معزز شخص کو نہیں بلایا تھا۔ روزنامہ امن کی 28 جولائی کی اشاعت کے مطابق ایک اور ملزم جبار خٹک کو ڈی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹر میں سرسری سماعت کی فوجی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا۔ جام ساقی مقدمہ میں ان کو مفرور قرار دیا گیا تھا۔ پھر ہری پور جیل سے انہیں سنٹرل جیل کراچی منتقل کیا گیا۔ روزنامہ اسٹار کی 12 اگست 1982 کی اشاعت میں بتایا گیا ہے کہ خصوصی فوجی عدالت میں جامشورو تھانے کے سابق ایس ایچ او شفیع سومرے نے جرح کے دوران کہا کہ جب حیدر آباد کے ہوٹل انڈس سے امر لعل کو گرفتار کیا گیا تو وہ موجود نہیں تھے۔ اس بناء پر وہ تصدیق نہیں کر سکے کہ ملزم امر لعل کو میجر غفور، میجر افضل، کرنل خضر حیات اور اے ایس آئی اعظم نے گرفتار کیا تھا۔ سرکاری گواہ نے کہا کہ اس نے امر لعل کی گرفتاری کی تاریخ 21 ستمبر کے بجائے 27 ستمبر تحریر کی تھی اور ڈی آئی جی حیدر آباد کے زبانی حکم پر امر لعل کو نارتھ ناظم آباد تھانے کراچی منتقل کیا گیا تھا۔ روزنامہ اسٹار کی 18 اگست 1982 کی اشاعت کے مطابق استغاثہ کے ایک اور گواہ ملک اشرف نے اپنے بیان میں کہا کہ بدر ابڑو نے دفتر سے قابل اعتراض پمفلیٹ برآمد ہوئے تھے۔ گواہ کو ضبط شدہ۔۔۔ رکھا گیا مگر اس میمو میں کوئی پمفلیٹ نہیں تھا۔ روزنامہ ڈان کی 2 ستمبر 1982 کی خبر کے مطابق پروفیسر جمال نقوی کو بیماری کی بناء پر خصوصی فوجی عدالت سے ہسپتال منتقل کیا گیا۔ روزنامہ اسٹار کی 25 اکتوبر کی خبر کے مطابق پروفیسر جمال نقوی کو تشویش ناک حالت میں جناح ہسپتال کے نیورولوجی وارڈ میں منتقل کیا گیا۔

روزنامہ اسٹار کی 6 ستمبر 1982 کی خبر کے مطابق جام ساقی کیس کے ملزم بدر جمال ابڑو کے وکیل شفیع محموی اپنے مؤکل سے ملنے سنٹرل جیل کراچی گئے تو جیل حکام نے ان کے مؤکل بدر ابڑو اور ہائی جیکنگ میں ملوث ناصر بلوچ سے ملاقات کی اجازت نہیں دی۔ جیل حکام نے کہا کہ شفیع محمدی محکمہ داخلہ کے حکام سے اجازت نامہ لے کر بھی مسٹر شفیع محمدی کا کہنا ہے کہ وہ محکمہ داخلہ سے رجوع نہیں کریں گے کیونکہ ماضی میں محکمہ داخلہ نے اجازت دینے سے گریز کیا ہے۔ وہ متعلقہ عدالت سے رابطہ کریں گے۔ 8 دسمبر 1982 کو روزنامہ اسٹار میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق خصوصی فوجی عدالت میں ڈی ایس پی ممتاز برنی نے عدالت کو بتایا کہ ملزم امر لعل نے تعزیرات پاکستان کی دفعہ 164 کے تحت اقبالی بیان دیا تھا۔ عدالت نے جب ممتاز برنی سے پوچھا کہ ملزم کا اقبالی بیان پیش کریں تو ڈی ایس پی کوئی بیان پیش نہیں کر پائے۔ عدالت کے حکم پر ملزم بدر جمال ابڑو نے اپنے دو گواہوں نواب شاہ کے ڈپٹی کمشنر عبدالقادر اور حیدر آباد کے کمشنر عبداللہ جے میمن کے نام پیش کیے۔ جام ساقی نے 120 افراد پر مشتمل صفائی کے گواہوں کی فہرست عدالت میں پیش کی۔ سرکاری گواہ جرح کے دوران ڈی ایس پی ممتاز برنی نے اقرار کیا کہ بدر جمال ابڑو کا کسی کمیونسٹ پارٹی سے تعلق نہیں ہے۔ ممتاز نے مزید کہا کہ کمیوسٹ بلاک کا مطلب سمجھتے ہیں مگر سوویت یونین کے علاوہ کسی دوسرے کمیونسٹ ملک کا نام نہیں بتا سکے۔ انہوں نے مزید کہا کہ جام ساقی کے خلاف کوئی شہادت نہیں ملی سوائے حیدر آباد کی بیسن شاہ کالونی اور پیپلز کالونی کے مکانات سے برآمد ہونے والے پمفلیٹوں کے گواہ ممتاز برنی نے جرح کے دوران یہ بات تسلیم کی کہ نظریہ پاکستان کی وہی تعریف تصدیق شدہ ہوگی جو قائداعظم نے کی ہے۔ گواہ کو مقامی اخبار کی 18 نومبر 1962 کی اشاعت میں ناصر منصور کا مضمون اسلام اور سوشلزم دکھایا گیا تو گواہ نے کہا کہ اس آرٹیکل کے تحت اسلام اور سوشلزم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ روزنامہ اسٹار کی 10 جنوری 1983 کی اشاعت کے مطابق خصوصی فوجی عدالت نے بے نظیر بھٹو کو بطور صفائی کے گواہ کے طلب کرنے سے انکار کیا۔ عدالت نے بیگم نصرت بھٹو، پاکستان میں فلسطین کے نمائندے بیسام عبدالرحمٰن اور کراچی بار ایسوسی ایشن کے صدر حفیظ لاکھو کو بھی صفائی کے گواہوں کی حیثیت سے طلب کرنے سے انکار

کیا۔ عدالت نے ملزمان کی جانب سے پیش کیے گئے صفائی کے 209 گواہوں میں سے صرف 15 کو طلب کرنے کا فیصلہ کیا۔ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ تعلقات عامہ کے ایسوسی ایٹ پروفیسر شمیم اختر، ملزم احمد کمال وارثی کے صفائی کے گواہ کی حیثیت سے بیان دیتے ہوئے کہا کہ حکومت پر تنقید کرنے والا فرد ضروری نہیں ملک دشمن ہو مگر اس بات کا فیصلہ فرد واحد کے بجائے عدلیہ کرسکتی ہے۔ گواہ نے جرح کے دوران کہا کہ کمیونزم تعلیمی ضرورت کے لیے پڑھایا جاتا ہے مگر ملک میں کمیونسٹوں کی سرگرمیوں پر پابندی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ سرخ پرچم کا اداریہ پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ حکومت اور رجعت پسند قوتوں کے خلاف ہے۔ ایک اور صفائی کے گواہ سینئر صحافی اقبال جعفری احمد کمال وارثی کے صفائی کے گواہ کے طور پر پیش ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ ثقافت اور مخالفت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اقبال جعفری نے مزید کہا کہ ان کے علم کے مطابق کمیونزم ملک کی تمام یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ مارشل لاء ایک نظام حکومت ہے۔ مسلح افواج ایک ادارہ ہے اور مارشل لاء حکومت پر تنقید کا مطلب مسلح افواج پر تنقید کرنا نہیں ہے۔ انہوں نے مزید۔۔۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل سے جام ساقی کیس کے ملزمان کو ضمیر کا قیدی قرار دیا ہے اور وہ بھی ایمنسٹی انٹرنیشنل کی اس رپورٹ سے متفق ہیں۔ اقبال جعفری نے استغاثہ کے وکیل کی جرح پر کہا کہ وہ ذاتی طور پر احمد کمال وارثی سے واقف نہیں ہیں۔ انہیں سرخ پرچم اور ہلچل کے کچھ حصے دکھائے گئے۔ اقبال جعفری نے کہا کہ ان کے خیال میں سرخ پرچم میں شائع شدہ آرٹیکل تخریب کاری کی تعریف میں نہیں آتے۔ روزنامہ امن کی 20 جنوری 1983 میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق خصوصی فوجی عدالت ٹی وی کی سابق کمپیئر مہتاب چنا، نیشنل سینٹر حیدرآباد کے ڈائریکٹر جوہر حسین، سندھ یونیورسٹی کے شعبہ صحافت کے خان محمد پنہور، پی ایس ایف حیدرآباد کے نائب صدر غازی صلاح الدین کو 31 جنوری کو صفائی کے گواہ کے طور پر طلب کیا ہے۔ روزنامہ اسٹار کی 27 جنوری 1983 کی اشاعت کے مطابق غوث بخش بزنجو کے صاحبزادے اور یونائیٹڈ اسٹوڈنٹس فرنٹ کے چیئرمین حاصل بزنجو نے ملزم امر لعل کے صفائی کے گواہ کے طور پر بیان ریکارڈ کراتے ہوئے کہا کہ طلبہ کو حکومت کی مخالفت کرنے پر گرفتار کیا گیا

ہے۔انہوں نے حال ہی میں گرفتار ہونے والے طالب علم رہنما گھنشام پرکاش کا حوالہ دیا جسے حراست کے دوران تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ جب صفائی کے گواہ کو کمیونسٹ پارٹی کا شائع کردہ آرٹیکل دکھایا گیا تو حاصل بزنجو نے واضح کہا کہ اس آرٹیکل میں تخریبی مواد نہیں ہے۔اپینک کے چیئرمین اور سینئر صحافی منہاج برنا صحافی سہیل سانگی کے صفائی کے گواہ کے طور پر عدالت میں پیش ہوئے۔روزنامہ امن 7 فروری 1983 کی خبر کے مطابق معروف شاعر فیض احمد فیض جام ساقی کیس کے بطور صفائی کے گواہ کے پیش ہوئے۔سینئر صحافی مظہر علی خان کی اہلیہ طاہرہ مظہر علی خان اور سینئر سیاسی کارکن شمیم اشرف ملک کو صفائی کے گواہ کے طور پر پیش ہوئیں۔ملزمان نے عدالت سے درخواست کی کہ خان عبدالولی خان، شیخ رشید اور غوث بخش بزنجو کو عدالت میں پیش ہونے کی اجازت دی جائے۔ ان رہنماؤں کے کراچی میں داخلہ پر پابندی ہے۔ روزنامہ امن کی 10 فروری 1983 کی اشاعت کے مطابق روزنامہ امن کے ایڈیٹر افضل صدیقی صفائی کے گواہ کے طور پر پیش ہوئے۔مسلم لیگ کے رہنما خواجہ خیرالدین نے بھی ملزمان کے حق میں گواہی دی۔ سندھ یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات کے چیئرمین محمد حسین شیخ نے اپنے بیان میں کہا کہ حکومت اور ریاست میں فرق ہے۔حکومت ریاست کا صرف ایک ستون ہے۔محمد حسین شیخ نے اپنے بیان میں مزید کہا کہ ان کے علم میں نہیں کہ کمیونسٹ پارٹی پر ملک میں پابندی ہے مگر پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں میں کمیونزم کو بطور مضمون پڑھایا جاتا ہے۔کالعدم پیپلز پارٹی کے رہنما مجیب پیرزادہ نے اپنے بیان میں کہا کہ حکومت تبدیل ہوتی ہے مگر ریاست تبدیل نہیں ہوتی۔ یہی حکومت اور ریاست میں فرق ہے۔کالعدم نیشنل پارٹی کے صدر میر غوث بخش بزنجو نے فوجی عدالت میں صفائی کے گواہ کے طور پر بیان دیتے ہوئے کہا کہ افغان مہاجرین کو پاکستان آنے کی اجازت دے کر سنگین غلطی کا ارتکاب کیا گیا ہے۔میر غوث بخش بزنجو نے کہا کہ جام ساقی محبِّ وطن ہیں۔انہوں نے جام ساقی کو کبھی وطن دشمن سرگرمیوں میں ملوث نہیں دیکھا۔انہوں نے مزید کہا کہ نظریہ پاکستان کی جنرل یحییٰ خان کے دور میں پہلی دفعہ دریافت کی گئی۔ جمعیت علمائے اسلام کے رہنما شاہ محمد امروٹی نے صفائی کے گواہ کے طور پر بیان ریکارڈ کراتے ہوئے کہا کہ مارشل لاء اسلام کے

خلاف ہے کیونکہ اسلام میں تنخواہ دار فوج کا کوئی تصور نہیں ہے اور سوشلزم ایک معاشی نظام ہے۔ کالعدم نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ نے صفائی کے گواہ کے طور پر اپنا بیان ریکارڈ کراتے ہوئے کہا کہ ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے نتائج خانہ جنگی کی صوت میں نکلیں گے۔ انہوں نے مزید کہا کہ موجودہ حکومت پر تنقید کو مسلح افواج پر نکتہ چینی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انہوں نے کہا کہ جام ساقی پر نظریہ پاکستان کے خلاف پرچار کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ یہ الزام مجھ پر بھی لگا اور حیدر آباد ٹربیونل میں مقدمہ چلایا گیا۔ روزنامہ اسٹار کی 15 فروری 1983 کی اشاعت کے مطابق بیگم طاہرہ مظہر علی خان نے اپنے بیان میں کہا کہ جام ساقی محبّ وطن ہے اور اس نے غریبوں کے لیے کام کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کمیونسٹ پارٹی پر آئین کے تحت پابندی نہیں لگائی گئی۔ لاہور سے آنے والی بیگم شمیم اشرف ملک نے بھی صفائی کے گواہ کے طور پر بیان ریکارڈ کرائے۔ روزنامہ امن کی 17 فروری 1983 کی خبر کے مطابق کالعدم مزدور کسان پارٹی کے سربراہ فتحیاب علی خان نے چار گھنٹے تک اپنا بیان ریکارڈ کرایا۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا کہ جام ساقی پر عائد الزامات غلط ہیں۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا کہ دستور کے مطابق فوج کا کردار متعین ہو گیا ہے۔ انہوں نے آرٹیکل 245 پڑھ کر سنایا اور تیسرے شیڈول میں فوج کا حلف بھی پڑھ کر سنایا اور عدالت کے ریکارڈ میں شامل کرایا۔ فتحیاب علی خان نے آئین کے آرٹیکل 6 کو قائداعظم کی 1948 میں کمانڈ اینڈ اسٹاف کوئٹہ میں فوجی افسروں کے سامنے کی گئی تقریر کو بھی عدالت میں پڑھا۔ روزنامہ امن کی 21 فروری 1983 کی اشاعت کے مطابق اپنک کے چیئرمین اور سینئر صحافی منہاج برنا نے اپنے بیان میں کہا کہ تمام کالعدم سیاسی جماعتیں اور تمام سیاسی مکاتب فکر مارشل لاء اور اس کی حکومت کے تسلسل کے خلاف ہیں۔ اس لیے مارشل لاء کو جرم نہیں سمجھا جا سکتا۔ انہوں نے کہا کہ سہیل سانگی سندھی کے چند اچھے صحافیوں میں ایک ہیں۔ پیپلز پارٹی پنجاب کے صدر شیخ رفیق نے اپنے بیان میں کہا کہ قائداعظم پاکستان کو ایک وفاقی جمہوری ریاست بنانا چاہتے تھے۔ یہی نظریہ پاکستان ہے۔ 28 فروری 1983 کو روزنامہ امن میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق کالعدم پیپلز پارٹی کی قائم مقام سربراہ بے نظیر بھٹو کو فوجی عدالت میں پیش ہو کر بیان ریکارڈ کرانا تھا۔ اس

موقع پر پیپلز پارٹی کے رہنما کشمیر روڈ اسپورٹس کمپلیکس کے باہر موجود تھے۔۔۔ بے نظیر بھٹو عدالت میں پیش نہیں ہوئیں۔انہوں نے عدالت سے استدعا کی کہ صفائی کے گواہ کے طور پر تیاری کے لیے انہیں ایک ہفتہ کا وقت دیا جائے۔روزنامہ اسٹار کی 16 مارچ 1983 کی اشاعت کے مطابق حیدر آباد سے سندھی زبان میں شائع ہونے والے اخبار روزنامہ آفتاب کے ایڈیٹر علی محمد شیخ نے اپنا بیان ریکارڈ کراتے ہوئے کہا کہ وہ سہیل سانگی کو 8 سال سے جانتے ہیں۔سہیل سانگی ایک ایماندار اور اپنے پیشہ سے وابستگی رکھنے والے صحافی ہیں۔ روزنامہ امن کی 19 مارچ 1983 کی اشاعت میں بتایا گیا کہ کالعدم پیپلز پارٹی کی قائم مقام چیئر پرسن بے نظیر بھٹو جام ساقی کیس میں تیاری کے لیے اپنے وکلاء شفیع محموی اور مجیب پیرزادہ سے 4 گھنٹے تک مشورہ کیا۔ روزنامہ جنگ کی 20 مارچ 1983 میں شائع ہونے والی خبر میں کہا گیا ہے کہ مقامی انتظامیہ اپنے گھر میں نظر بند بے نظیر بھٹو کو پولیس کی سیکیورٹی فراہم نہ کر سکی۔اس لیے وہ عدالت میں پیش نہیں ہوسکی۔روزنامہ امن کی 27 مارچ 1983 کی خبر کے مطابق بے نظیر بھٹو کا بیان سخت پہرے میں فوجی عدالت نے قلم بند کیا۔ اس موقع پر کشمیر روڈ کے تمام راستوں پر پولیس کی بھاری نفری تعینات کی گئی تھی۔ پولیس نے نہ صرف گاڑیوں کو کشمیر روڈ پر آنے کی اجازت نہیں دی بلکہ پیدل چلنے والوں کو بھی سڑک پر چلنے سے روک دیا۔سماعت میں اخباری رپورٹروں کو بھی جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ کچھ وقفہ کے بعد فوٹو گرافروں کو تصاویر بنانے کی اجازت دی گئی۔بی بی سی نے آج اپنی نشریات میں بے نظیر بھٹو کی جام ساقی مقدمہ میں صفائی کے گواہ کی حیثیت سے پیشی کی تفصیلی خبر نشر کی۔بی بی سی کے مطابق مس بے نظیر بھٹو کی آمد کے وقت غیر معمولی اقدامات کیے گئے تھے جو اس بات کی علامت ہے کہ فوجی حکومت انہیں سب سے بڑا خطرہ سمجھتی ہے۔روزنامہ امن کے رپورٹر نے لکھا کہ حکام نے بے نظیر بھٹو کی رہائش گاہ کو سب جیل قرار دیا تھا جہاں سے وہ کشمیر روڈ آئیں۔ بے نظیر بھٹو کا بیان صبح 9:30 بجے شروع ہوا اور شام 5:00 بجے تک جاری رہا۔اب بے نظیر بھٹو اپنا بقیہ بیان 29 مارچ کو قلم بند کرائیں گی۔ بی بی سی کے رپورٹر ایک گھنٹہ تک کمرہ عدالت میں موجود رہے۔بعد میں نشاندہی پر انہیں کمرہ عدالت سے نکال دیا گیا۔بے نظیر بھٹو نے

ایک سوال کے جواب میں کہا کہ اسلام میں صرف اور صرف خدا کی حکمرانی ہوتی ہے مگر مارشل لاء میں صرف کمانڈر کی حکمرانی ہوتی ہے۔ اسلام میں مارشل لاء کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بے نظیر بھٹو نے عدالت کے سوال پر اپنی عمر 29 سال بتائی۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں حقیقی کشمکش سرمایہ داروں اور ان کے ایجنٹوں اور پسے ہوئے عوام کے درمیان ہے۔ پاکستان تاریخی نہیں نظریاتی ملک ہے۔ انہوں نے کہا کہ آئین کے تحت کمیونسٹ پارٹی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ بے نظیر بھٹو نے مزید کہا کہ ملک کو کم سے کم نقصان پہنچائے بغیر اقتدار منتخب نمائندوں کو منتقل کیا جائے۔ جام ساقی نے فوجی عدالت میں درخواست دی ہے کہ 27 مارچ 1983 کو جنرل ضیاء الحق نے اپنے خطاب میں کہا ہے کہ نظریہ اسلام ہی نظریہ پاکستان ہے۔ ان کا یہ بیان ان کے مقدمہ پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔ لہٰذا عدالت سے درخواست ہے کہ جنرل ضیاء الحق کو عدالت میں بلایا جائے تاکہ ان پر جرح کی جائے۔ اگر وہ نہیں آسکتے پھر ان کے مشیر شریف الدین پیرزادہ اور اے کے بروہی کو عدالت میں پیش کیا جائے۔ روزنامہ سٹار کی 30 اپریل 1983 کی خبر میں بتایا گیا ہے کہ ملزم بدر جمال ابڑو کے وکیل شیخ محمدی ایڈووکیٹ نے اپنے حتمی دلائل میں کہا کہ استغاثہ کے گواہوں کے بیانات میں تضادات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے مؤکل بدر ابڑو پر لگائے گئے الزامات غلط ہیں۔ اسٹار کی 7 مئی 1983 کی خبر کے مطابق صفائی کے وکیل شفیع محمدی کا کہنا ہے کہ ملزم امر لعل بیمار ہے اور جیل کے ہسپتال میں داخل ہے۔ اس بناء پر فوجی عدالت نے مقدمہ کی سماعت ملتوی کردی۔ روزنامہ ڈیلی نیوز میں شائع ہونے والی خبر میں کہا گیا ہے کہ فوجی عدالت نے جام ساقی کیس کے تمام ملزمان کو بری کردیا۔ ملزمان نذیر عباسی شہید، جام ساقی، شبیر شر، بدر ابڑو، احمد کمال وارثی، سہیل سانگی، امر لعل، پروفیسر جمال نقوی اور جبار خٹک شامل ہیں۔ نذیر عباسی فوجی حراست میں تشدد کی بناء پر شہید ہوگئے تھے مگر جام ساقی مقدمہ میں بری ہونے کے باوجود ان افراد کو تین ماہ کے لیے نظر بند کردیا گیا۔ روزنامہ جنگ کی 17 جنوری 1985 کی خبر کے مطابق خصوصی عدالت نے جام ساقی کیس کا مقدمہ بناتے ہوئے ملزمان کمال وارثی اور شبیر شر کو 7,7 سال قید بامشقت کی سزا دی جبکہ جام ساقی کے خلاف فیصلہ محفوظ رکھا۔ باقی افراد کو رہا کرنے کا حکم دیا گیا۔

میری ماں اور غدار کی بیوی

کراچی میں ایم پی اے ہاسٹل کی بلند بالا عمارت، جس میں نیب ان دنوں کرپشن کی تلاش کر رہی ہے لیکن اس میں کئی کہانیوں نے جنم لیا جس میں ایک کہانی ہماری بھی ہے، پریس کلب جاتے ہوئے اسی سڑک سے گذر ہوتا ہے تو وہ سارے منظر نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔

''صبح کا وقت ہے ایم اے جناح روڈ سے ایک عورت دس سالہ بچے کو ساتھ لیکر پیدل چلتی آتی ہے، اس کی منزل ایم پی اے ہاسٹل ہے جہاں باہر موجود سیمنٹ کی بینچوں پر کئی لوگ ہاتھوں میں درخواستیں لیے بیٹھے ہیں، یہ دونوں بھی یہاں بیٹھ جاتے ہیں، دس بجے کے قریب لوہے کا سیاہ دروازہ کھلتا ہے اور ایک خاکی لباس میں افسر چھڑی کے ہمراہ درخواستیں لینا شروع کرتا ہے اور پڑھ کر اور سن کر یہ درخواست اردلی کے حوالے کر دیتا ہے۔

یوں چلتے چلتے وہ ان ماں بیٹے کے پاس پہنچ جاتا ہے اور درخواست لیکر پڑھتا ہے اور یہ خاتون جب شوہر کی رہائی کی درخواست کرتی ہے تو وہ تلخ سے جواب دیتا ہے کہ وہ تو غدار ہے۔ بچہ حیران کن آنکھوں سے دیکھتا ہے کیونکہ اس نے تو میر جعفر جیسے لوگوں کے بارے میں نصاب میں پڑھا تھا تو اس کا والد کیسے غدار ہوا۔

یہ عورت کچھ دیر خاموش رہتی اور پھر درخواست واپس لیکر کہتی ہے کہ وہ غدار نہیں اس ملک کے غریب اور پسے ہوئے لوگوں کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

یہ خاتون میری والدہ کلثوم تھیں اور بچہ میں اور غدار کا الزام میرے والد سہیل سانگی پر عائد تھا۔،جن کا تعلق کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سے تھا،ان کا مقدمہ فوجی عدالت میں چلایا گیا تھا۔

ویسے تو میری والدہ ایک عام سی گھریلو عورت تھیں، لیکن شوہر کی گرفتاری کے بعد وہ ایک سیاست بصیرت، خواتین حقوق سے بھی روشناس ہوئیں، وہ انجمن ترقی پسند خواتین کی رکن بھی رہیں۔

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب تھر میں قحط سالی کے بعد وہ حیدرآباد میں ہمارے تھری بھائیوں کے لیے دکانوں اور گپر روں میں جا کر چندہ اکٹھا کر رہی تھیں تو ایک مرتبہ ''سی آئی ڈی'' کے اہلکار گھر تک آ گئے ان کا کہنا تھا کہ یہ چندہ کمیونسٹ پارٹی کے لیے جمع کیا جا رہا ہے، اس کے بعد کئی ہفتے وہ پیچھا کرتے رہے۔

تھر کی غربت اور وہاں لوگوں کی ابدتر زندگی کا مشاہدہ پہلی بار اس وقت ہی ہوا تھا جب والدہ کے ساتھ امدادی سامان تقسیم کرنے کے لیے گوٹھ جنجھٹھی کے آس پاس کے گاؤں دیہاتوں میں جاتے تھے، یہ سفر اونٹوں پر ہوتا کبھی کبھار رات کو لوٹتے اور صبح پھر روانہ ہو جاتے۔

میسکم گورکی کا ناول ماں بھی وہ ہی رات کو پڑھ کر سناتی تھی، یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا کہ بابا نے اس کا سندھی میں ترجمہ کیا تھا۔

یقینن ایسی کہانیاں آج بھی اس ملک میں موجود ہیں، صرف جگہ اور کردار مختلف ہیں۔

- ریاض سہیل

مقدمے اور ملزمان کے ایامِ قید کے دوران کی تصاویر